

**PAGES MISSING
WITHIN THE
BOOK ONLY**

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224238

UNIVERSAL
LIBRARY

خطاب سے بھی سرفراز کیا۔

اس ماہ کا رسالہ ملاحظات کے لئے وقف ہے یعنی سلسلہ ۶ سے لیکر سلسلہ ۶ تک کے ملاحظات کا اقتباس کیجائی ورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ انتخاب و اقتباس میں دلکشی و افادیت دونوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور اسی لئے سیاسی سائل یا وقتی نقد و تبصرہ کی حیثیت رکھنے والے مباحث کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ادبی پہلو رکھنے والے ٹکڑے اکثر و بیشتر لئے گئے ہیں اور تنقیدات مذہبی کا بھی بڑی حد تک احاطہ کر لیا گیا ہے۔

اس میں دو مصلحتیں پیش نظر تھیں ایک تو یہ کہ وہ ناظرین نگار جو سلسلہ ۶ کے بعد نگار کے خریدار ہو سے ہیں! کے پاس مسلسل فائل موجود نہیں ہیں۔ ملاحظات کو یکجا طور پر دیکھ سکیں اور دوسری یہ کہ مذہب کے متعلق (علاوہ بالاستفسار اور دیگر مستقل مضامین کے) جو اظہار اس میں نے ملاحظات کے سلسلہ میں کیا ہے وہ ایک شیرازہ سے ابستہ ہو جائے اور لوگوں کو آسانی کے ساتھ نہ صرف اُن تمام تغیرات کا علم ہو سکے جو تدریجاً میرے مذہبی معتقدات میں پیدا ہوئے ہیں بلکہ ایک صحیح و سچے قائم کرنے کا بھی موقع ملے کہ میرا حقیقی مقصود ان سب مباحث سے کیا ہے اور میں اسلام تعلیمات اسلام کو کس نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں۔

شہوانیات یا تاریخ الفحشاء کی کتابت شروع ہو گئی ہے لیکن چونکہ کتاب کافی ضخیم ہے اس لئے اخیر فروری یا شروع مارچ سے قبل اس کی اشاعت دشوار نظر آتی ہے۔ جن حضرات کے خطوط اس کی طلبی میں آگئے ہیں وہ محفوظ ہیں اور بروقت اشاعت یہ کتاب ان کے پاس روانہ کر دیا جائے گی۔

میں ایک بار پھر عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب ان تمام بازاری مطبوعات سے بالکل علیحدہ ہے جو وزن و تعلقات جنسی پر عامیانہ و فاحشانہ طریقہ سے روشنی ڈالتے ہیں بلکہ یہ ایک مبسوط تاریخ ہے انسان کے جذبہ حیوانی کی جس پر ایم سے لیکر اس وقت تک کے تمام مدارج جنسیاتی پر مورخانہ و عالمانہ نظر ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس سلسلہ میں نظام تمدن و دست نے کیا کیا تدابیر اسناد و فحاشی کے لئے اختیار کیں اور ان کا کیا نتیجہ ہوا۔

دسمبر کے نگار میں چند نمونے اس کتاب کے دیدے گئے ہیں اور ان کے دیکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب اپنی موضوع کے لحاظ سے کس قدر بسیط و کس درجہ متنوع المباحث اور کتنی دلچسپ ہو گئی۔ اور اس موضوع پر یہ بالکل پہلی کتاب ہے اور نوادر تحقیق کا عجیب و غریب مجموعہ ہے۔

سلسلہ ۶ کے ملاحظات غلطی سے اپنی اصلی جگہ درج نہیں ہو سکے اس لئے سلسلہ ۶ کے ملاحظات کے بعد درج کیے گئے ہیں۔

نشر دارالترجمہ اسلامیہ
نگار

ادبیر:۔ نیاز فچوری

Checked 1988

شمارا	جنوری ۱۹۳۳ء	جلد ۲۳
-------	-------------	--------

جنوری ۱۹۲۶ء | جریدہ و رسائل کا دستور ہے کہ آغاز سال میں جب ایک سہ ماہی ختم اور دوسرا شروع ہوتا ہے
تو غیر مقدم و وداع کے مخلوط جذبات کو کسی نہ کسی پیرائے سے مندرجہ ظاہر کرتے ہیں ایک حد تک یہ رسم بڑی
نہیں ہے اور یوں بھی سالگرہ کی تقریب میں کچھ نہ کچھ چہل پہل کے اسباب پیدا کرنا امتدین دنیا کا دستور ہے۔
لیکن میں کہ میرے لئے ہر دن قطع منزل ہے اگر کوئی کام کر سکوں اور ہر روز رحمتِ تمہاری اگر بیکار صرت
ہو جائے اس رسم کے ادا کرنے کے لئے طیار نہیں، کیونکہ میرے لئے گزر جانے والے سال کی ناکامی یا آنے
والے سال کی کامیابی کا خیال نتیجہ کے لحاظ سے ایک ہی حکم رکھتا ہے: "مادرِ اقبال:-"

بگیر ز سعادت و نحوست کہ مرا

ناہم بغمزه کشت و مرتیخ بہ قمر

میں دیکھتا ہوں کہ جو دن گزرتا ہے، میرے اندر بجائے تفاؤل کے تشاؤم (Pessimism)
کی کیفیت بڑھتی جاتی ہے اور دنیا کی کسی کامیابی کا خیال میرے اندر کوئی ولولہ مسرت پیدا نہیں کرتا، پھر یہ
بات بھی نہیں ہے کہ میں جس کام کو اختیار کرتا ہوں اس میں کامیابی نہ ہوتی ہو بلکہ خدا کا احسان ہے کہ میں بڑی
عزائم کو بہت کم ناکام دیکھتا ہوں، لیکن یہ ضرور ہے کہ کامیابی دنیا کامی کے متعلق میرا معیار ضرور بدلتا
ہے، صبح جس نقطہ کو میں منزل سمجھ کر آگے بڑھتا ہوں، شام کو وہاں پہنچ کر محسوس کرتا ہوں کہ منزل

ن کہاں، اور آج جو حد کامیابی کی متعین کر لیتا ہوں کل اُس حد تک پہنچنے کے بعد حقیقت کو اور دور دیکھنے
اہوں۔

نگار کے دور کو اب پانچواں سال شروع ہوتا ہے اور گزشتہ چار سال کے اندر اس نے اس قدر
سیابی حاصل کر لی ہے کہ ہندوستان کا ایک رسالہ اس پر فخر کر سکتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابھی تک
نے حدود حقیقت کی طرف ایک قدم بھی نہیں اٹھایا اور جو معیار سیری نگاہوں کے سامنے ہے وہ ہنوز
کی دسترس سے بھی بہت دور معلوم ہوتا ہے۔

میں بار بار اسباب کی داستانِ پارینہ کو دہرانا نہیں چاہتا اور بغیر کسی امید و توقع کے بلا کسی خیال
سیابی یا اندیشہ ناکامی کے ایک راستہ پر چلا جا رہا ہوں اور کوئی چیز سوائے اس خیال کے میری ہمت
زانی کرنے والی نہیں کہ

متلے جمع کن شاید کہ غارتگر شود پیدا

۱۹۲۶ء | انسانی زندگی کے سب سے زیادہ تکلیف دہ، لیکن اسی کے ساتھ نہایت دلچسپ لحاظ وہ ہوا کرتے، جب
ادب روزگار اس کو اپنا نشانہ بنا نا ٹھہرائیں، یہی اکر وہ چیز جسے مذہب و تقویٰ کی زبان میں آزمائش و ابتلا کہتے ہیں
ادبی ذوق رکھنے والے فطرت کی شوخیوں سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن کاروباری دنیا اور مادی عالم میں جہاں خدا
سلۂ علت معلول کے سوا اور کچھ نہیں، طبیعیات کی یہ سستریاں اس قدر جوصلہ فرسا اور دل شکن ثابت
تی ہیں کہ نہ مذہب کی تاویل اس کا مداوا کر سکتی ہے اور نہ شاعرانہ قہمیر اس کے نتائج کی تلخیوں سے کٹ سکتی ہے
ہر شخص اپنی اپنی جگہ امن و سکون کی جستجو میں سرگرداں ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ قدرت کا محبوب ہوا
غلط ہی یہ ہے کہ وہ تدابیر کے صحیح لال کو برابر ہم پر ثابت کرتی رہے، عمارتوں کو ڈھائے اور نقوش کو مٹائے
راکثر و بیشتر اس کا نتیجہ ہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی "تعمیری" جدوجہد کو چھوڑ بیٹھتا ہے اور اپنے آپ کو "سپیل ٹا"
نے حوالہ کر دیتا ہے، لیکن کچھ سخت جان ایسے بھی ہوتے ہیں جو اخیر وقت تک ہاتھ پاؤں چلاتے رہتے ہیں اور یہ سیری
زدیک صرف برسپیل عادت ہوتا ہے۔ اگر کامیابی ہوگی تو خیر بند و فصل خ کے لئے ایک مثال و نمونہ بن گئے ورنہ
مادت تو قسمت میں لکھی ہی ہے۔

قدرت کی یہ عنایتیں مجھے اگست ۱۹۲۳ء سے شروع ہوتی ہیں اور اس وقت سے لیکر تارین و ماک
ایغ "از فکر و فشار" برسر نہیں ہوا، مسرت و نشاط کا کیا ذکر ہے لیکن میں نے ان تمام روحانی کلفتوں کے

نہیں ہونے دیا کہ بیکارسی بات ہے اور نہ اس وقت میں ان کی تفصیل آپ کو سنانا چاہتا ہوں کیونکہ اول تو کسی کو سیر ہمدردی کیوں ہونے لگی اور اگر ہو بھی تو کیا نتیجہ جسکے غم و الم کی تقسیم ممکن نہیں۔

۔۔۔۔۔

۱۷ اپریل کے رسالہ تجلی میں اس کے فاضل اڈیٹر نے اصغر گوندوی کے متعلق اظہار رائے کیا ہے کہ :-
 ”وہ بہت معمولی علمی لیاقت رکھنے کے باوجود اکثر ایسا اچھا شعر کہتے ہیں کہ روح موجود کرتی ہے لیکن ذہانت سے اچھا شعر کہنا ممکن ہے، بے عیب شعر کہنا ناممکن ہے۔ حال میں اصغر صاحب کی غزل جو بلی علی گڈھ کے مشاعرے میں سب سے بہتر قرار دی گئی اور انھیں ایک طلائی تمغہ پیش کیا گیا اس میں شک نہیں کہ غزل میں چند اشعار قابل داد ہیں۔ لیکن مقطع میں ایک ایسی فاش اور ناقابل تاویل غلطی موجود ہے جس کی بنا پر اہل نظر انھیں تمغہ تو کجا قابل شعر کی صفت میں جگہ دینے جانے کو بھی پسند نہ کریں گے۔ وہ مقطع یہ ہے :-

نہ میں دیوانہ ہوں اصغر نہ مجھ میں ذوقِ عریانی کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو
 اصغر صاحب اور ان کے تمغہ دہندوں کو یہ خبر نہیں کہ جیب و گریباں ایک ہی اسمی کے دو نام ہیں جیب عربی ہے گریبان فارسی کڑ
 معلوم نہیں حضرت وحشی شاہ جہاں پوری کا اصل مقصود اس تخریر سے اصغر صاحب کی کم علمی کو ثابت کرنا ہے
 یا صرف جیب و گریبان کی غلطی کو نمایاں کرنا۔ اگر مدعا صرف اس شعر کی اصلاح تھا تو ان کی کم علمی کا ذکر غیر ضروری
 تھا اور وہ بغیر اس دل آزاری کے بھی پورا ہو سکتا تھا اور اگر مقصود حقیقتاً یہی تھا کہ ان کی کم علمی کو ظاہر کیا
 جائے تو انسوس ہے کہ اس کے ثبوت میں جس شعر کو پیش کیا گیا ہے وہ کافی دلیل نہیں ہو سکتا۔
 یہ درست ہے کہ لفظ ”جیب“ کا مفہوم عربی میں وہی ہے جو گریبان کا فارسی میں ہے، لیکن فاضل نکتہ چین
 کو شاید اس حقیقت سے بھی انکار نہ ہوگا کہ مجازاً لفظ جیب، کیسے کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور اس کا وہی
 مفہوم ہوتا ہے جو پاکٹ کا ہے۔ اگر اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اردو میں کسی لفظ کے غلط مفہوم کا رائج ہوجانا
 سنداً پیش نہیں ہو سکتا، تو میں کہوں گا کہ لفظ جیب نہ صرف اردو بلکہ خود عربی زبان میں بھی پاکٹ کے معنی میں کثرت
 سے رائج ہے۔

حال ہی میں مصر کے ایک مشہور فاضل نے عربی زبان کا ایک پاکٹ سائز لغت مرتب کیا ہے اور اس کا نام
 ”قاموس الجیب“ رکھا ہے اسی طرح قاموس العصری میں لفظ جیب کے معنی پاکٹ کے بھی لکھے ہیں اور مثلاً
 ”معنی الجیب“ کا فقرہ درج کیا ہے۔ پھر جب اصل زبان میں اس لفظ کے معنی مجازاً یہ لئے جاتے ہیں تو اردو
 میں عموماً لفظ جیب کے معنی صرف کیسے کے لئے جاتے ہیں۔ کیوں نا جائز و ممنوع قرار دیا جاسکتا ہے
 صاحب نے کبھی اپنے علم و فضل کا دعویٰ نہیں کیا کہ مولانا وحشی کو اس کی تردید ضروری ہوتی، وہ

بے ایک شاعر کی حیثیت سے رونما ہوئے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے کلام پر تنقید کرنی چاہئے پھر اگر ان کے اکثر مارتے وحشی صاحب کی روح وجد کرنے لگتی ہے تو یہ کافی ثبوت اصغر کے شاعر ہونے کا نہیں ہے۔ رہتی قابل و اہل شعر کی تفریق وصف بندی سو یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی کہ کیونکر ایک شاعر کا کلام کلیتہً اغلاظ پاک ہو سکتا ہے اور محض زبان یا فن کی بعض غلطیوں کی وجہ سے کس طرح ایک حقیقی شاعر کو قابل شعر کی صفت نکال کر ناقابل شعر کی صفت میں جگہ ملنی چاہئے۔ اگر ایک شخص اچھا شاعر پیدا ہوا ہے تو وہ اپنی شعر گوئی کاظ سے قابل ہی شاعر شمار ہوگا خواہ وہ جاہل ہی کیوں نہ ہو اور اگر کوئی شخص فطرتاً شاعر نہیں ہے تو شخص سے بھی اس کو قابل شعر کی صفت میں جگہ نہیں مل سکتی خواہ کتنی ہی زبردست سند فضیلت اس کے میں موجود ہو۔

مجھے افسوس ہوا کہ وحشی صاحب نے اصغر کی کم علمی کا ذکر کر کے ایک ایسے جذبہ کا اظہار کیا جو ان سے بیدہ و متین انسان کے لئے کبھی موزوں نہیں ہو سکتا کم از کم وحشی صاحب کے متعلق یہ کبھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ انکا رہی ان لوگوں میں ہے جن کے متعلق ایک شاعر لکھ گیا ہے کہ۔

خانہ مشرع خراب است کہ ارباب صلاح
در عمارت گری گنبد دستار خودند

اس دوران میں جو کتابیں ریویو کے لئے موصول ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم ”نظریہ اصنافیت“ ہے، مہناج الدین صاحب ایم، ایس، اسی، پروفیسر طبیعیات اسلامیہ کالج پشاور نے مرتب کیا ہے۔ نظریہ اصنافیت (Relativity) زمانہ حال کا جدید ترین نظریہ ہے جسے جبرہنی کے ایک طبیعیات آئن اسٹین نے پیش کیا ہے یہ نظریہ کیا ہے، اس سے طبیعیات کے اصول میں کیا انقلاب پیدا ہوتا ہے اور ہم اس کی مدد سے کائنات کا کس قدر علم حاصل کر سکتے ہیں یہ وہ مسائل ہیں جنہیں فاضل پروفیسر نے ایت سہل و آسان زبان میں پیش کیا ہے۔ چونکہ نظریہ اصنافیت کے سمجھنے کے لئے طبیعیات کے بعض مدائی مسائل علی الخصوص علم الحریکت کا سمجھ لینا ضروری ہے اس لئے اس کتاب میں سب سے پہلے بیانات کے بعض ایسے ضروری مسائل کو سمجھا دیا گیا ہے تاکہ اسل مدعا کے ذہن نشین ہونے میں آسانی ہو جائے علاوہ دیا چہ اور مقدمہ کے یہ کتاب چار مقالوں میں تقسیم کی گئی ہے پہلے مقالہ میں مابعد الطبیعیات، اصنافیت، علم الحریکت، مادہ، فضا، مطلق، نظام عالم، نیوٹن کا کلیہ تجاذب، ٹوردا شیر اور نظریہ نیوٹن سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے اور تیسرے مقالہ میں نظریہ اصنافیت کی تشریح ہے اور مختلف ابواب

قائم کر کے اس کو سمجھایا گیا ہے چوتھے مقالہ میں ماہیت عالم سے بحث کر کے ایک تتمہ کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں نظریہ اضافیت پر جو اعتراض کئے گئے ہیں ان کا جواب دیا ہے۔ اس کے بعد اصطلاحات کا ترجمہ ہے اور پھر جدید اصول کے مطابق ایک مفصل انڈکس یا فہرست ہے۔

”نظریہ اضافیت“ چونکہ نیوٹن کے ”قانون تجاذب“ کو شکست دینا چاہتا ہے اس لئے اب ساری علمی دنیا اس طرف متوجہ ہے اور یورپ میں کثرت سے اس موضوع پر کتابیں لکھی جا چکی ہیں اردو میں اس وقت تک کوئی مفصل مضمون بھی اس بحث پر شائع نہیں ہوا تھا، چہ جائیکہ کوئی تصنیف، اس لئے ملک کو پر فہم منہاج الدین صاحب کا شکر یہ ادا کرنا چاہئے کہ انھوں نے اس معرکتہ الآرا نظریہ پر بے مثل تصنیف کر کے اردو داں طبقہ کے لئے اس موضوع کو قابل فہم بنا دیا۔

فاضل مولف کی محنت و کاوش کی داد حقیقتاً وہی شخص دے سکتا ہے جس نے کبھی اس نوع کی علمی مضامین کا ترجمہ کیا ہے۔ چونکہ میں نے گزشتہ سال نگار میں ایک مضمون اس موضوع پر لکھا تھا اس لئے میں اس کتاب کی اہمیت اور مولف کی غیر معمولی عمر بڑی وجہ نشانی کا اندازہ کر سکتا ہوں۔

- اصطلاحات کے ترجمہ میں بیشک مجھے کہیں کہیں اختلافات ہے ذیل میں چند الفاظ کی فہرست، ملاحظہ ہو۔
- | | |
|------------------------|---|
| 1. Aberration of light | اس کا ترجمہ شعاع کیا گیا ہے میری رائے میں ”انحراف نور“ زیادہ صحیح ہے |
| 2. Axiom | امریکی بہتر ہے۔ نزدیک یا ہمیشہ محقق بھی ہو اور اصطلاحی شان بھی لکھتا ہے |
| 3. Convergence | استدقاق بہت اذیت لفظ ہے، آجاء یا تقارب زیادہ مناسب ہے |
| 4. Co-ordinates | خطوط مرتبہ صحیح نہیں ہم مراتب ہونا چاہئے۔ |
| 5. Common Sense | عقل عام، عقل عامہ یا حس مشترک کے بجائے ذوق سلیم یا ذوق فطری بہتر ہے |
| 6. Electron | برقیہ درست ہے لیکن عربی میں اس کے لئے اصطلاحی لفظ نظرمان موجود ہے اس لفظ کے استعمال میں فائدہ ہے کہ نسبت کی صورت میں سکو کہ مافی کر سکتے ہیں اور برقیہ محدود ہے |
| 7. Ellipse | الیپسی لکھا ہے غالباً کتابت کی غلطی ہے اس کو ایلیپسی ہونا چاہئے |
| 8. Energy | توانائی بالکل غیر علمی لفظ ہے میری رائے میں قوت بہتر ہے۔ |
| 9. Focus | ماسکے کے بجائے اگر نقطہ احتراق ہو تو زیادہ مناسب ہے۔ |
| 10. Inertia | اس کا ترجمہ جمود میری سمجھ میں نہیں آیا استمرار ہونا چاہئے |
| 11. Latent energy | مخفی توانائی۔ اچھا ترجمہ نہیں ہے قوت کا منہ ہونا چاہئے یہی اصطلاحی لفظ ہے |
| 12. Natural | قدرتی سے زیادہ مناسب نظریہ ہے |

کروں گا کہ اس باب میں اس کی کوشش قانون ہئیت جماعتی کے لحاظ سے فرض عین ہے۔

۱۹۲۶ء

اس وقت ہندوستان جن دور سے گزر رہا ہے وہ اگر اس موج کا سانس نہیں ہے جو آنے والی بلندی موج کا پتہ دیتی ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس کے بعد جو رجحان آنے والا ہے وہ صرف منزل فنا کا ہے۔ اس وقت سارے کرہ ارض پر شاید ہی کوئی بد نصیب قطعہ زمین ایسا ہوگا جو اپنے وقار و خودداری کے لئے اور اپنے وزن کی تعین کے لئے ہر ممکن ایشار و قربانی سے کام نہ لے رہا ہو، لیکن ہندوستان کی حالت اس قدر شرمناک ہے کہ دنیائے احساس کی کوئی بے غیرتی ایسی نہیں جس کی نمائش اس نے نہ کی ہو اور غفلت و جمود کا کوئی منظر ایسا نہیں جو اس کے اندر بسنے والوں کی طرف سے ظاہر نہ ہو رہا ہو۔

ہندوستان کی سیاسیات پر دو مختلف نقطہ نظر سے بحث ہو سکتی ہے ایک متحدہ ہندوستان (United India) جس میں یہاں کی تمام اقوام کو ایک چیز سمجھ کر گفتگو کی جائے اور دوسرے ہندوستانی قومیات کہ یہ مختلف قوموں کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی مستحق ہے اس وقت ان دونوں میں سے کسی پر کوئی بیحد سیاسی مقالہ پیش نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ نہ ملاحظات کے محدود صفحات میں اس کی گنجائش ہے اور نہ اس نوع کی بحث مقاصد نگار میں شامل۔ لیکن اس حیثیت سے کہ اسی سلسلہ گفتگو میں تعلیمی بحث بھی آجاتی ہے میں مختصراً اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں جس کا تعلق صرف مسلمانوں کی جماعت سے ہے

یہ حقیقت مسلم ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی حالت بہ نسبت ہندوؤں کے بہت زیادہ گہری ہوئی ہو اور اس کا بڑا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی مالی حالت کمزور ہے، لیکن میرے نزدیک یہ توجیہ بالکل غلط ہے بلکہ اس کا سبب مسلمانوں کی ذہنی گسراہی ہے، یا بیجا تفاخر جس کا تعلق ہندوستان کی سر زمین سے نہیں ہے، ہندوؤں کی جماعت ایک ایسی جماعت ہے جس کی تمام تناؤں کا مرکز صرف سر زمین ہند ہے اور انھیں سیاست خارجیہ سے کوئی تعلق نہیں، اسی لئے ان کی جتنی کوششیں ہوتی ہیں وہ اپنے ہی ملک، اپنی ہی افراد سے وابستہ ہوتی ہیں۔ برخلاف مسلمانوں کے کہ ان کو سب سے پہلے ترکی افغانستان، ایران، مصر، نجد و حجاز کی طرف توجہ ہوتی ہے اور پھر جو وقت پختا ہے، اس میں ہندوستان کا بھی خیال آجاتا ہے۔

جس وقت اس خیال کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سوائے بیجا جذبہ افتخار کے، اور کوئی چیز شامل نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ بعض افراد کو اخوت اسلامی کا خیال اس پر مجبور کر دیتا ہو لیکن قبل اس کے کہ ہم اس نوع کی برادرانہ ہمدردی پر آمادہ ہوں ہمیں غور کر لینا چاہئے کہ کہیں یہ ہمدردی اس شخص کی ہی ہمدردی تو نہیں ہے جو اپنے مطلوب تک تو نہیں پہنچ سکتا، لیکن خود کشی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تمام مسلمان خواہ وہ کراہت کے کسی حصہ میں آباد ہوں ایک ہی جماعت میں داخل ہیں اور مذہب کا اتحاد انہیں ایک ہی رشتہ سے منسلک کئے ہوئے ہے اور یہ بھی فطری مجبوری ہے کہ جب ان میں سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچے تو تمام افراد بے چین ہو جائیں اور ہر ممکن امداد کے لئے آمادہ، لیکن سوال یہ ہے کہ آیا ہم فی الحقیقت اس قابل ہیں یا نہیں کہ بیرون ہند کے اسلامی و سیاسی مسائل کو سلجھاسکیں اور کوئی قابل نظر دوسری جگہ کے مسلمانوں کی کر سکیں، ہم نے اس وقت تک جو کچھ کیا وہ صرف یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً کچھ روپیہ بھیجتے رہے، لیکن جو مصیبت ہمارے عام اخلاقی انحطاط سے پیدا ہو چکی ہے وہ روپیہ سے دور نہیں ہو سکتی اور نہ سیاسیات مغرب کی مشرق کش پالیسی کا بیخ بدل سکتے ہیں جب تک ہم میں خود کوئی اجتماعی و قومی وزن پیدا نہ ہو جائے۔ پھر ہم اس کے لئے تو بقیاب ہو جاتے ہیں کہ دوڑ کر منزل تک پہنچ جائیں لیکن اس کی پرواہ نہیں کہ پاؤں میں طاقت رفتار کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔ سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ اندرونی و مقامی اصلاح ہے اور جب تک اس میں کامیابی نہ ہو جائے ہم دوسروں کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔

اس وقت بظاہر عالم اسلامی افتراق و انتشار کی حالت میں نظر آتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ انتشار ہی آئندہ اجتماع کا پتہ دیتا ہے، اگر کوئی جماعت اتنی بڑی اور منتشر الذا رہے کہ من حیث الکل وہ کسی امر پر متفق نہیں ہو سکتی تو پھر بہترین تدبیر یہی ہے کہ اس کو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اپنی اصلاح کرنی چاہئے کیونکہ آسانی اسی میں ہے، اگر ٹکڑے کی خلافت کے بارے آزاد ہو کر ایک ترکی قوم ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ کو ابھارنا چاہتا ہے، اگر مصر کے افراد اپنی قومیت علیحدہ قائم کر کے ترقی کرنا چاہتے ہیں اسی طرح اگر نجد و حجاز، ایران و افغانستان وغیرہ جدا جدا ہو کر اپنی اصلاح کے خواہش مند ہیں تو ہمیں مسرور ہونا چاہئے کہ حقیقتاً یہی صحیح طریق کار ہے اور اسی کی تقلید ہمیں بھی کرنی چاہئے، لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس نکتہ کو نظر انداز کر دیا اور شروع سے اس کلیہ کو فراموش کر دیا کہ اصلاح ہمیشہ گھر سے شروع ہوتی ہے۔“

مسلمانوں نے ”انجمن خدام کعبہ“ قائم کی ”خلافت کمیٹی“ کو برہ پاکیا لیکن آج تک انہوں نے کسی ایسی انجمن قائم کرنے کی کوشش نہیں کی جس کا تعلق خود ان کی اصطلاح سے ہوتا جس میں خود اپنے بچوں کی تعلیمی حالت مد نظر ہوتی، موجودہ سیاسی اضطرابات کے سلسلے میں سب سے بڑا کارنامہ مسلمانوں کا جس کا تعلق اصلاح تعلیمی سے تھا جامعہ ملیہ کا قیام ہے، لیکن جو حالت اس کی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اگر یہ بدعت کی تھی تو چاہئے تھا کہ اسے تکمیل تک پہنچاتے اور وسیع کرتے ہاں تک کہ تمام اسلامی بستیوں اور قصبوں میں اس کی شاخیں قائم ہو جائیں اور اس طرح ایک عام بیداری پیدا ہو جاتی۔

میں نے جامعہ کو دیکھا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جن اصول کے ماتحت اس کو قائم کیا گیا ہے وہ یقیناً قابل

تعمیر ہیں، لیکن وہی عیب جو مسلمانوں کے تمام کاموں میں پایا جاتا ہے یعنی "عدم تنظیم" یہاں بھی موجود ہے اور اس لئے اس کوئی ترقی نہیں کی یہ صحیح ہے کہ گزشتہ چند سال کا زمانہ خاص سیاسی اضطراب کا تھا، اور سکہ سوراخ عدم تعاون اور کھدر پوشی نے سب کی انکار کو اپنی طرف جذب کر لیا تھا۔ لیکن میں کہوں گا کہ یہ تمام مسائل خود از قبل وقت چھیڑ دئے گئے تھے اور اسی لئے وہ ایک ضعیف و ناقص تخم سے پیدا ہونے والے پودے کی طرح ضعیف ہی گرم ہو کی بھی تاب نہ لاسکے۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر ۳۲ کروڑ کی آبادی میں سے صرف چند ہزار انسان تعلیم کی برکات سے اس قدر بہرہ یاب ہو گئے ہیں کہ وہ آزادی کے برکات سے مستفید ہو سکتے ہیں، تو ناممکن ہے کہ وہ ملک کو آزاد کر سکیں ملک نام ان چند افراد کا نہیں ہے جو کالجوں میں تعلیم پارہے ہیں، ملک عبارت ان چند نفوس سے نہیں ہے جو اڈمیٹری کر سکتے ہیں اور نہ ملک سے مراد وہ ایک درجن لوگ ہیں جو کسی جلسہ میں اچھی تقریریں کر سکتے ہیں، بلکہ ملک بنتا ہے عوام سے قصبات و دیہات کی آبادی سے، سو اس کے احساس کا یہ عالم ہے کہ بمشکل حیوانات سے کوئی بلند درجہ اس کے لئے متعین ہو سکتا ہے۔ پھر جب تک آپ ان کے خیال میں وسعت نہ پیدا کریں تا وقتیکہ عام تعلیم کے ذریعہ سے ان کے دماغ کو روشن نہ بنائیں آپ کو "آزادی" کے نام لینے کا کیا حق حاصل اور آپ کس اعتماد پر غیروں سے اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمان کانگریس میں حصہ نہ لیں سکہ حجاز سے بے تعلق ہو جائیں، لیکن اس کے کیا معنی کہ آپ اپنے ان فرائض سے غافل ہو جائیں جو یقیناً کانگریس اور حجاز سے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں جب ترکوں نے خلافت کا جو اپنی گردن نکال پھینکا تو آپ نے وہ سب کچھ کر لیا جو آپ کے اختیار میں تھا لیکن نتیجہ کوئی نہ نکلا کیونکہ ترک بیوقوف نہ تھے کہ آپ کی غیر دانشمندانہ رائے تسلیم کر کے اپنا نقصان کرتے، اسی طرح اب حجاز کے معاملہ میں آپ کے وفد پر وفد چلے جا رہے ہیں، آپ جہازوں سے اپنے پیغامات لوگوں کو سنارہے ہیں، گویا اس سے زیادہ سخت ہم آپ کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتی اور شاید آپ ہی کی ذات پر سارے نظم عالم کا انحصار ہے لیکن ہمیں معلوم ہے جو نتیجہ اس کا ہونے والا ہے اور وہ وقت دو نہیں جب وہاں سے آپ واپس آئیں گے اس حال میں کہ آئے مشورے ٹھکرادئے گئے ہوں گے اور آپ کے پاس خفت مٹانے کے لئے کوئی ذریعہ نہ رہ جائے گا سوائے اس کے کہ ہندوستان کی بیوقوف پبلک کو آپ کسی اور وفد کی روانگی کا منتظر بنا کر چھوڑ دیں۔ اگر حجاز پر ابن سعود ملکیت قائم کر رہا ہے تو آپ کو کیا اور ترک خلافت کو مٹا رہے ہیں تو آپ کیوں بتیاب ہوئے جاتے ہیں، پہلے اپنے "کارڈز میں" کی طرف توجہ کیجئے اس سے بعد آسماں پر دازی "کا سودا بچائے گا، گھر کی حالت تو آپ کی یہ ہے کہ سر چھپانے کا ٹھکانا نہیں، دوسروں کے معاملات میں خواہ مخواہ مشیر و حکم بننے کے لئے

دوڑے جا رہے ہیں۔

خلافت کمیٹی کے تازہ ترین اجلاس کی کارروائی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے مقصود سے دور ہونے میں ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اور تبلیغ و تنظیم کی طرف توجہ کر کے اس غلطی کو اور زیادہ وسیع کرنا چاہا ہے، جو اب بھی ہندو مسلمانوں کے مابین کم وسیع نہ تھی۔ یہ صحیح ہے کہ بعض ہندوؤں کا طرز عمل قابل اعتراض ہے اور شاید ہی دستگشتن کی تحریک مسلمانوں کے اندر مذہبی ہیجان پیدا کر رہی ہے لیکن اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ اس کے مقابلہ میں تبلیغ و تنظیم کا علم بلند کیا جائے بلکہ اقتضائے وقت یہ تھا کہ بالکل سکوت اختیار کیا جاتا اور نہایت سکون کے ساتھ اس وقت کا انتظار کیا جاتا، جب شدہی اور دستگشتن کے محرک ہندو خود اپنی مضرت رساں تحریک سے واقف ہو کر اسے ترک کر دیتے۔ یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ مسلمان کسی ایسی تدبیر سے جو ہندوؤں کے دستگشتی جذبات میں اور زیادہ ہیجان پیدا کرنے والی ہو، کسی اچھے نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے اور نہ انہیں اس کو باز رکھ سکتے ہیں پھر جبکہ اصل مقصود اس فضا کا پیدا کرنا ہے جسے متحدہ ہندوستان کہتے ہیں اور جب یہ یقینی طور پر معلوم ہو کہ تنہا مسلمان کچھ نہیں کر سکتے تو پھر ہمارے فرض تھا کہ موجودہ کشمکش میں اور اصنافہ کرنے کے بجائے معاذ کو اسی کے حال پر چھوڑ دیتے۔ یہاں تک کہ ہندو اس کو محسوس کرنے لگتے کہ وہ بھی مسلمانوں سے علیحدہ ہو کر تنہا اپنا مدعا حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس وقت جو خونریزیاں ہندو مسلمانوں کے درمیان پوری ہیں وہ نتیجہ ہیں، صرف بعض فتنہ پرداز ہستیوں کی کوشش کا، اور یقیناً ہندوؤں کی ساری قوم کبھی اس کو بند نہیں کرتی اور نہ یہ ہمیشہ قائم رہنے والی ہیں، اس لئے اگر اس وقت ملک کی ضروریات شدہی و دستگشتن سے زیادہ بلند کسی اور چیز کی طالب ہیں تو ہم کو اسی پر نگاہ رکھنی چاہئے اور ان عارضی مناقشوں کو بالکل اس طرح طے کرنا چاہئے گویا کہ وہ بالکل غیر اہم چیزیں ہیں اور ان کی وجہ سے ہم کو وہ شاہراہ نہیں چھوڑنی چاہئے جسے ایک مرتبہ ہندو مسلمان دونوں باہم مل کر قائم کر چکے ہیں

بہر حال مسلمانوں کا موجودہ طریق کار یکسر قابل اصلاح ہے اور ضرورت ہے کہ جو حدود انہوں نے اپنی تدابیر کے مقرر کئے ہیں ان کو بالکل بدل دیا جائے چنانچہ سب سے پہلے تو خلافت کمیٹی کو ختم ہو جانا چاہئے کیونکہ جب خلافت کا وجود باقی نہیں رہا تو پھر خلافت کمیٹی کیسی؟

دوسرے یہ کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پر پبلک کو قابض ہونا چاہئے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کوئی اور انجمن قائم کرنا چاہئے جس کا تنہا مقصود مسلمانوں میں عام طور پر تعلیم کی اشاعت کرنا ہو اور اگر ہندو بھی اس مسئلہ میں ہنوا ہوں تو میری نزدیک فی الحال کانگریس ہی کا تنہا مقصود یہ قرار دینا چاہئے کہ ہندوستان کے ایک ایک بچہ کو تعلیم سے آشنا کیا جائے اور اس وقت تک کہ اس میں کامیابی نہ ہو اور تمام مسائل کو پس پشت ڈال دیا جائے جتنا روپیہ کانگریس کی تنظیم پر

ہندوستان کا صرف ہور ہا ہے، یا جتنا روپیہ خلافت کمیٹی کے ذریعہ سے مسلمانوں کا تباہ کیا جا رہا ہے یہ سب تعلیم پر صرف کیا جائے تو ایک ربح صدی کے اندر وہ انقلاب پیدا ہو جاتا ہے جو اس طرح بے اصولی کے ساتھ صدیوں میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اگست ۱۹۲۶ء | میرا ایک مضمون ”نقاب اٹھ جانے کے بعد“ جون کے رسالہ میں شائع ہوا ہے اس کے متعلق بعض تحریریں میرے پاس اس قسم کی آئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جس ہستی کا ذکر میں نے اس میں کیا ہے اس کو دو تہی کوئی ”موجودنی انجارج“ شخصیت سمجھا گیا ہے، حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے، میں نے اس میں صرف ایک خیالی شخص کو پیش کیا ہے اور اس کا نام ”ڈارث علی“ بغیر کسی غور و فکر کے میرے قلم سے نکل گیا ہے، لیکن دنیا کا کوئی فرضی نام ایسا نہیں ہے جس کا اسمی موجود نہ ہو اس لئے بعض اصحاب اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔

اس فسانہ سے میرا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہمارے یہاں کے طبقہ متصوفین و علمائے بعض ایسے ”نفوس مقدسہ“ بھی پائے جاتے ہیں جن کے ظاہر و باطن میں بالکل سفید و سیاہ کی نسبت ہوتی ہے اور اس لئے صرف ظاہر کو دیکھ کر باطن پر حکم لگانا قرین مصلحت نہیں کیونکہ بسا اوقات نتیجہ میں جو منظر ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ

چوں باز کنی مادر ماور باشد



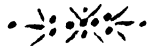
عام طور پر صوبہ یوپی میں اس امر کی شکایت کی جاتی ہے کہ پنجاب اپنی ”جریدہ خیز“ سرزمین سے اردو میں ناقص لٹریچر کا اضافہ کر رہا ہے اور وہاں کا ممتاز سے ممتاز رسالہ بھی زبان کی فاحش اغلاط سے پاک نہیں ہوتا یہاں تک کہ یوپی کے اہل قلم بھی وہاں پہنچ کر ظوطی درپس آئینہ ہو جاتے ہیں لیکن اس حقیقت کا اعتراف کبھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کس ”زندہ دلانہ“ طریقہ پر خدمت زبان کے لئے مستعد نظر آتے ہیں اور جس دلولہ نشاط کے ساتھ وہ کام کر رہے ہیں، اس سے کس درجہ ان کے تقدم ادبی پر روشنی پڑتی ہے۔

اگر وہاں بہت سے ناکارہ رسائل شائع ہوتے رہتے ہیں تو وہ بند بھی ہو جاتے ہیں، لیکن یہ ”اجراء و انقطاع“ وہاں کی فضا میں کوئی پردت پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ جس طرح ایک شاخ قلم ہونے کے بعد زیادہ قوت کے ساتھ نشوونما پاتی ہے اسی طرح وہاں بھی اگر ایک سالہ بند ہوتا ہے تو اس کی جگہ لے لیتے ہیں جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ تنقید صحیح کے ماتحت ہر جدید رسالہ کا معیار بلند ہوتا جائیگا اور ایک وقت آئیگا جب پنجاب اپنے رسائل کی ”کیست و کیفیت“ دونوں جہتوں سے ترقی یافتہ نظر آئے گا۔

اس سے قبل جون کے ہنگار میں یہ سلسلہ ملاحظات، پنجاب کے ڈرامٹیک کلب کے قیام کا ذکر آچکا ہے جس نے بہترین ڈراما کے لئے ایک ہزار روپیہ انعام کا اعلان کیا ہے اب لاہور کی انجمن ارباب علم نے ادبی مقابلہ کے لئے ۱۲۵۰ روپیہ کا انعام تجویز کیا ہے جس کے شرائط کی تفصیل آپ کو ملک کے مختلف اخباروں سے معلوم ہوگئی ہوگی اور ہنگار کی آئندہ اشاعت میں ہم بھی اسے درج کریں گے۔

اب اس کے مقابلہ میں یو۔ پی کی گرائونڈ کو ملاحظہ کیجئے کہ اہل علم و قلم کی ترغیب و تشویق کے لئے ماوی اعانت تو خیر بڑی چیز ہے، اس گوارہ زبان اور ہمداد میں جو چند رسائل نظر آتے ہیں انکا بھی یہ حال ہے کہ ہر مہینہ کا رسالہ اس طرح نکلتا ہے جیسے آخری سانس۔ تلخ نوائی معانت، کیا اسی کارگاہ عمل پر یہ ”طنطنہ اقعار“ ہے اور اسی حقیقت پر دعوائے ”اناد لا غیر“ زیب دیتا ہے، اسے

طلب بلند بانگ و در باطن سچ!



اپریل دہائی کے ہنگار میں ایک مضمون بہ عنوان ”ہندو مسلمانوں کے دور حکومت میں“ مسلسل شائع ہوا ہے اس پر سی ہندو فاضل کا ایک ناقدانہ مضمون اخبار شعاع بریلی میں نکل رہا ہے اس میں شک نہیں کہ قابل مضمون ہنگار نے پوری سعی نامشکور سے معاندانہ انداز تحریر کو چھپاتے ہوئے حق تنقید ادا کیا ہے، لیکن کیا یہ مناسب نہ تھا کہ وہ اس کو ہنگار ہی میں اشاعت کے لئے بھیجتے، تاکہ ہمیں بھی تحسین کا موقع ملتا جس قوت کے ساتھ وہ مسلمان بادشاہوں کی ستمانیوں کا ثبوت پیش کر رہے ہیں ہر چند وہ کوئی نئی چیز نہیں بلکہ

صد بار خواندہ دو گراں سرگرفتہ ایم

کی قبیل سے ہے، لیکن پھر بھی ہم اس ”زور باز و ناز مودہ“ کی داد دینے میں اپنے آپ کو کم حوصلہ ثابت کرتے، اگر اُس کا محل نمائش ہنگار کے صفحات کو قرار دیا جاتا۔

ماہ جون کی ڈاک میں سب سے زیادہ بڑ لطف تحریر لمبھی کے کسی اہل کلیہ بے مارٹن کی تھی جس میں صاحب موصوف نے مجھے مخاطب کر کے تحریر فرمایا تھا کہ۔

”سنا ہے آپ دین سچی کی طرت رجوع ہونا چاہتے ہیں اگر یہ سچ ہے تو میں خوش ہوں کہ اپنے دین حق کی طرت توجہ کی اور آپ جیسے قابل کی ضرورت بھی تھی سو خدا اور اس کا بیٹا بہت جلد پوری کرے گا“

لیکن اس تحریر میں قیامت کے فقرے تو یہ تھے۔

”دین اسلام ایک تنگ و ادہام پرست مذہب ہے، اس میں ابھر آپ روحانی ترقی نہیں کر سکتے“

مجھے حیرت ہے کہ میرے عزیز دوست کو کیونکر یہ اطلاع ہم پہنچی کہ میں ”دین سچی کی طرف رجوع“ ہونا چاہتا ہوں حالانکہ اس سے قبل کبھی مجھے دین سچی قبول کرنے کا شرت حاصل نہیں ہوا کہ مسلمان ہونے کے بعد پھر اس طرف ”رجوع“ کرتا، لیکن اگر اس رجوع کے فقرے سے ان کا مقصد مجھے دین سچی کی طرف دعوت دینا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سٹریجے مارٹن جو مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور جو عین شباب کے عالم میں ان کے مصلوب ہونے اور زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کے قائل ہیں وہ ایسے مرتد شخص کو اپنے مسلک میں داخل کر کے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو خود انجیل مقدس کی اسناد سے مسیح کو ایک انسان کا بیٹا سمجھتا ہے، جو اعتقاد رکھتا ہے کہ مسیح عظیمیٰ کو پہنچ کر عام انسانوں کی طرح اپنی موت سے مرے اور جو یقین رکھتا ہے کہ

دیگر اہم بکنڈ انجینئر میساجی کرد

البتہ اگر سٹریجے مارٹن یا اور کوئی عیسائی فاضل کسی صحیفہ مقدس سے یہ ثابت کر دے کہ میرا اعتقاد غلط ہے، تو میں مسیحی کیا معنی یہ دعا کرنے کے لئے تیار ہوں کہ -

خدا یا جو دمیرا نم
 رہا ان کا وہ فقرہ جس میں انھوں نے اسلام کو تنگ اوہام پرست مذہب بتا کر روحانی ترقی کا دشمن ظاہر کیا ہے، سو اس کے متعلق میں صرف یہ عرض کر دینا کہ

زخار خار محبت دل ترا جہ خیر
 کہ گل بہ جیب نہ کنجد قبائے تنگ ترا

آپ اور اسلام پر اوہام پرستی کا الزام ہے مارٹن صاحب اور دین محمد پر روحانیت کی دشمنی کا بہتان!!
 ایں بہ بیداری ست یارب یا بہ خواب

وہ شخص جس کے مذہب کی روحانیت کو مادہ پرستی ہمیشہ کے لئے محو کر چکی ہو، وہ اسلام کو روحانیت کا منافی خیال کرے وہ اسلام جس کے مقلدین میں بعض مادہ پرست لوگ بھی روحانیت کا واسطہ قائم کئے بغیر کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکتے ہوں، افسوس ہے کہ میرے معزز ناصح نے کافی غور نہیں کیا، ورنہ اس فقرے کو اپنے ہی مسلک کے لئے زیادہ موزوں پاتے -

ہر چند اسلام کے لئے یہ دور سخت انحطاط و زوال کا دور ہے، لیکن با اینہم جو ”محرّم باد صبا“ ہے وہ جانتا ہے کہ اسلام میں اب بھی

باوجود خزاں بوئے یاسمن باقی ست

اس نوع کی دعوت دیکر اس وقت کے پورے کہ مبادا کوئی ”رند زونیدہ مو“ سن لے اور اپنی ادنیٰ توجہ سے

کام لے کر آپ ہی سے کہلوائے کہ
”نکلا اک جام کی قیمت بھی نہ ایماں پنا“

ستمبر ۱۹۲۶ء | نگار اور ناظرین نگار کے مابین جو ادبی رشتہ قائم ہے، اس کا تقاضہ تو یہی ہے کہ شکوہ و شکایت کی راہ رسم سدود نہ کی جائے۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ اگر اسے جاری رکھا جائے تو بھی کیا فائدہ، جبکہ نتیجہ کے لحاظ سے اپنی ناکامی کی بہتر سے بہتر تاویل اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ :-

این راہ و رسم تازہ ز حرمان عہد ماست
عنقابہ روزگارسے نامبر بر بنود

پھر نہ میں ایسا شاعر ہوں جو صرف اس خیال سے کسب لذت کرنا ہوں کہ ”یاد آں چور و جفامی کیم دی گرمی“ اور نہ کوئی صوتی ہوں کہ صبر و شکر کی دیرانہ دادی کو کسی نہ کسی طرح ”ابلیہ بیانی کی صعوبتیں برداشت کر کے بغیر کسی شکایت کے گزر جاؤں، بل اگر اپنے دل کا خون کر دنگا تو آپ سے بھی یہ منالہ ضرور ہوگا کہ ”از مرثہ و آیتیں شناس“ اور اگر آپ توجہ نہ کریں گے تو یقیناً یہ تلخ شکایت بھی ہوگی کہ

گوش سخن شنو کجا، دیدہ اعتبار کو؟

پھر اگر فرصت ہو تو کسی وقت اس حقیقت پر بھی غور کیجئے کہ آپ نے اس وقت تک نگار کی کیا خدمت کی ہے، اور اس حال میں کہ آپ اس سے خدا جانے کیا کیا توقع رکھتے ہیں، ان توقعات کی تکمیل کے لئے آپ نے کیا اسباب فراہم کئے ہیں اس سے زیادہ واضح الفاظ میں کہنا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ

اسرار عشق آنچه تو ان گفت، گفتہ ایم

اور نہ کوئی ساکلا نہ لب و لہجہ اختیار کر دنگا، کیونکہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ مطالبہ ہے، نہ کہ کوئی گدایانہ التجا، اگر آپ چاہیں تو ادنیٰ توجہ سے تو سبب اشاعت کے فرض کو بخوبی ادا کر سکتے ہیں ورنہ یوں تو تیرا ہی حجام نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

•••••

جدید رسائل کا اجرا یقیناً قابل مسرت امر ہے، لیکن نہ یوں کہ ان کا وجود صرف کثکول گدائی پر منحصر ہو اگر کوئی صاحب تجارتی نقطہ نظر سے یہ مشغلہ اختیار کرنا چاہتے ہیں تو میں انہیں مشورہ دوں گا کہ
این جریدہ راز ساغر و بکر فرد برد
اور اگر مقصود صرف نمود و نمائش ہے تو پہلے اپنی اہلیت کا اندازہ کر لیں کہ وہ بغیر وقار خود داری کو صدمہ پہنچائے،

اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں یا نہیں، اب رہگئی تیسری صورت، جس کا نام ”خدمت ملک و زبان“ رکھا جاتا ہے سوا ب اس کا حال یہ ہے کہ

در کشور بتاں گنہش نام کردہ اند

مجھے روزانہ دو ایک خط ایسے ملتے ہیں جن میں مضامین کا تقاضہ ہوتا ہے، اور پھر ہفتہ نہیں گزرتا کہ یاد دہانی بھی آجاتی ہے، میں ان احباب کا ممنون ہوں جو مجھے اس قابل سمجھتے ہیں، لیکن شاید انھیں علم نہیں کہ میں کس قدر مصروف و منہمک، اور اسی کے ساتھ کس درجہ حزیں و طول زندگی بسر کر رہا ہوں، مگھار کا معاملہ تو ایسا ہے جیسے غالب کے لئے مقطع کی ”سخن گسترانہ بات“، بات کی تیج، طبیعت کی ضد، کئے کی شرم، جگ مہنائی کا اندیشہ ان سب مجھے پابزخیر کر دیا ہے، درنہ حقیقتاً زمانہ نے تو میرے دل و دماغ کو بیکار بنانے اور میری ہمت کو پارہ پارہ کر دینے میں اپنے ترکش کا کوئی تیرا یا نہیں ہے جو صورت نہ کر دیا ہو۔

پھر جب حالات یہ ہوں تو میں کیا اور کیوں کر دیگر رسائل کی قلمی اعانت کر سکتا ہوں۔



وہ حضرات جو جناب حضرت کے متعلق میری گفتگو سے برہم ہوئے ہیں وہ اشاعت حاضرہ میں اور زیادہ سامان کچی پائیں گے، حضرت علیسی کی نسبت گزشتہ اشاعت میں، میں نے بہ سلسلہ ملاحظات ضمناً اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، اس کو ایک کرم فرمانے دیکھا اور سنجیدہ برہمی کے ساتھ مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں اپنی، نامسلمانی، کو (ظاہر میں و کوتاہ اندیش حضرات کے نقطہ نظر سے) اس کے آخری حدود تک پہنچا دوں اگر اب بھی مجھے کوئی کافر نہ سمجھے تو میں اس کے ایمان کا ذمہ دار نہیں ہوں، بہر حال میری طرف سے کوتاہی نہیں ہوئی۔

ہم کعبہ و ہم بتکہ رہ با بود

رفتم و صنم بر سر محراب شکستیم

گزشتہ تیرہ سو سال سے مسلمانوں کی ذہنیت میں جو انحطاط رفتہ رفتہ پیدا ہوا ہے اس کی روشن مثال اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ جن مذہب کے متعلق ان کو فطری ہونے کا دعویٰ ہے اسی کے متعلق وہ کوئی بات ایسی نہیں سن سکتے جو واقعی ”فطرت آہنگ“ اور قانون قدرت کے مطابق ہو۔ پھر اگر مذہب نام ہے صرف عجوبہ پرستی اور دشمنی عقل و ہوش کا، اگر اسلام کوئی ایسی چیز ہے جو صرف متقدمین ہی کے عہد میں پایا جاتا تھا اور اب اس کا وجود بالکل ایک () کا سا وجود ہے اور اگر ہمارے مذہب ہی رہنما و داعیوں میں اتنی روشنی بھی پیدا نہیں کر سکتے کہ ہم اسلام کو ہر قوم و زمانہ کا مذہب سمجھنے کی اہمیت رکھیں تو میں کہتا ہوں کہ یارب زیل حادثہ طوفان رسیدہ باد بت خانہ کہ خالق شمس نام کردہ اند

اکتوبر ۱۹۲۶ء | اپریل دہائی کے نگار میں برسبیل تذکرہ میں نے اپنی بعض ذاتی پریشانیوں کا اظہار کیا تھا جس کو دیکھ کر اکثر اجاب نے میرے پاس ہمدردی کی تحریریں روانہ کیں، اور بعض نے حد درجہ اصرار کے ساتھ مجھ سے ان پریشانیوں کی تفصیل بھی دریافت کی۔

ہر چند میں نے فرداً فرداً سب کو جواب لکھ دیا ہے لیکن اس خیال سے کہ شاید بعض حضرات کی تحریریں نظر انداز ہو گئی ہوں میں نگار کے ذریعہ سے بھی ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، لیکن اپنے حالات کی تفصیل نہ میں نے خط میں کسی کو لکھی، اور نہ اس جگہ اس کا اظہار کروں گا، کیونکہ درد و غم ناقابل تجزیہ چیزیں ہیں اور اس کو میں کسی طرح تقسیم کر کے اپنے بوجھ کو ہلکا نہیں کر سکتا، اور نہ غیرت اس کی متقاضی ہے۔

میرے موجودہ زندگی بدستور "انتشار و فشار" میں گزر رہی ہے، اور شاید قدرت کا فیصلہ یہی ہے کہ میں دم واپس تک اس کی اس امانت کا حامل رہوں اس لئے میری حالت دریافت کرنا اور اس کے جواب میں کسی ابھی خبر کی توقع رکھنا غالباً فطرت کے فشار کے خلاف ہے۔

ماخانہ رمیدگانِ ظالمین
پیغام خوش از دیارِ مائیت

۔۔۔۔۔

شیخ شوکت علی صاحب بنی، لے 'ال' ال' بی، ساکن محلہ رکاب گنج لکھنؤ کی طرف سے ایک خط مجھے موصول ہوا ہے، جس میں شاید ایک وکیل کی حیثیت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ میں ان حالات کو ثابت کروں جو شاد وارث علی کاظمی قادری کے متعلق جو ان کے نگار میں یہ عنوان "ثقاب اٹھ جانے کے بعد" میں نے تحریر کئے ہیں۔ اس خط میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو اس کا نتیجہ میرے حق میں "جیل خانہ جانا ہوگا" (یہ انھیں کے الفاظ ہیں) اول تو میں اس تحریر کو شیخ شوکت علی صاحب کی تحریر یقین نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کے الفاظ نہایت ناشائستہ اور طرز عبارت بالکل عامیانا ہے، لیکن اگر ہو بھی تو قابل اعتناء نہیں سمجھتا، کیونکہ جب تک کوئی شخص "شاہ وارث علی کاظمی قادری" کی حیثیت سے میرے سامنے پیش نہ ہو، میں اپنے افسانہ کے ہیرو کو کبھی اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ خواہ مخواہ کسی معمولی "شاہ وارث علی" کا اسمی بننے کے لئے سامنے آجائے جس طرح وکیل صاحب موصوت اپنے فرضی موکل کی طرف سے یہ نوٹس دینے کے مجاز ہیں، بھی اپنے اس ہیرو کی پوزیشن محفوظ رکھنے کا ذمہ دار ہوں، جو اس وقت خدا جانے کن کن ناموں سے ہندستان کے اندر یاد کیا جاتا ہے۔

لیکن اگر اس سے مقصود یہ ہے کہ "خرقہ پوشان ساوس" کے متعلق نگار میں کچھ نہ لکھا جائے تو میں اس تحریر کے

کاتب سے خواہ وہ شیخ شوکت علی صاحب وکیل ہوں، یا کوئی اور بزرگ، ماہ نومبر کا نگار دیکھنے کی درخواست کرونگا جس میں ایک در ایسی ہی ہتی کو ”برا فگندہ نقاب“ پیش کیا گیا ہے۔

تصزیح جرم عشق ہے بے صدفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گندہ یاں سزا کے بعد

نومبر ۱۹۲۶ء | شاہ صدفی کا شعر ہے اور بہت پر لطف شعر ہے :-

ہر چہ با د اباد حمر نے چند می گویم پر اور
کار خود در عاشقی این بار یکسو می کنم
لیکن سوال یہ ہے کہ کیا داعی شاعر نے اس پر عمل کیا، کیا حقیقتاً وہ کوئی اخیر فیصلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا؟ مجھے یقین نہیں نہ اس خیال سے کہ شاعر کی بات کا اعتبار کیا، بلکہ محض اس بنا پر کہ کجبت انسان یا اس ہونے کے بعد بھی امید کا رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا چہ جائیکہ ایک عاشق جس کی زندگی کا ایک اک لمحہ اسی تقاضا پر قائم ہے۔ مرزا نوشہ لکھتے ہیں :-

نازم فریب صلح کہ غالب ز کوئی دوست
نا کام رفت و خاطر امید وار بود

یعنی ”فریب صلح“ نے دل میں امید پیدا کر دی، حالانکہ یہ بھی ”فریب امید“ ہے پہلے ہی اگر دل اس جذبہ سے خالی ہوتا تو ”فریب صلح“ کی توبت ہی نہ آتی۔

اس تہید سے مدعا یہ ہے کہ میں کبھی کبھی شاہ صدفی کی طرح ”کار خود این بار یکسو کنم“ کے لئے بالکل آمادہ ہو جاتا ہوں اور اپنے حالات میں وہ تغیر پیدا کر لینا چاہتا ہوں جو مجھے موجودہ طلسم ”بیم درجا“ سے نکال دے، لیکن بڑا ہوں اس خاطر ”امید وار“ کا کہ کبھی اس ارادہ میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اور باوجود اس کے کہ تکمیل عزم کے اکثر اسباب مہیا ہیں، لیکن جب سرے سے عزم ہی کا فقدان ہو تو پھر تکمیل کس کی۔

ہزار رخنے بدام و مرا از سادہ دلی

تمام عمر در اندیشہ رہائی رفت

خدا کرے نگار کا نیا سال اس حال میں طلوع ہو کہ میں سارے انکار سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو اسی کے لئے وقف کر چکا ہوں۔

نگار میں ایک مضمون ”غالب کی ذہنیت“ کے عنوان سے شایع ہوا ہے، میرے ایک عزیز دوست کو جنہیں عربی کی پوری استعداد حاصل ہے اور جو ماشاء اللہ ادیب بھی ہیں لفظ ”ذہنیت“ پر اعتراض ہے انہوں نے اپنی ایک تحریر میں مجھ پر ظن کیا ہے کہ ”ذہانت یا زکاوت کے فرق کو اگر محسوس کر لیا جاتا تو ذہنیت کا لفظ استعمال نہ کیا جاتا“ ان کا مدعا یہ ہے کہ لفظ ذہانت، ذہنیت کے مفہوم کو ادا کرتا ہے یا یہ کہ ان کے نزدیک ذہنیت غلط ہے۔

میں نے اس کے جواب میں ان سے دریافت کیا کہ براہ کرم (mentality) اور (Intellect) کے فرق سے آگاہ کیجئے اور اسی کے ساتھ ان کا ترجمہ بھی لکھ دیجئے، لیکن اس کا جواب انہوں نے نہیں دیا چونکہ میرے دوست غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں، اس لئے میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ انگریزی میں قریب قریب اسی مفہوم کے تین لفظ ہیں:۔ (1) mentality (2) Intelligence (3) Intellect اور ان کا ترجمہ اردو میں بالترتیب ان الفاظ سے کیا جاتا ہے ”ذہنیت“ ”زکاوت“ ”ذہانت“ اگر ان کے نزدیک لفظ ذہانت، ذہنیت کے مفہوم کو ادا کرتا ہے تو پھر انہیں (mentality) اور (Intellect) کے ترجمہ میں کوئی تفریق اس کے علاوہ کرنی چاہئے۔

میں اپنے فاضل دوست کو بتا دیتا چاہتا ہوں کہ (mentality) کا ترجمہ اہل مصر بھی ذہنیت ہی کرتے ہیں اور اب اردو کے تمام اہل قلم اسی ترجمہ پر متفق ہیں اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنی ذہنیت میں تھوڑا سا تغیر پیدا کر کے طوعاً یا کرہاً اس کو تسلیم کریں اور زیادہ ذہانت سے کام نہ لیں۔

اپریل ۱۹۲۷ء | اکاڈمی کے شعبہ اردو کے ممبروں میں سے علاوہ سٹر رشید احمد صدیقی ایم، اے کے سر عبد الرؤف صاحب الہ آبادی بھی شریک نہ ہو سکے، لیکن ان کی عدم شرکت نہ غیر متوقع تھی نہ باعث افسوس وہ اس لئے کہ کچھ عرصہ سے وہ دائم المرض ہیں اور یہ اس لئے کہ انہوں نے کبھی اردو ادبیات سے کچھ لینے کا دعویٰ اس سے قبل کبھی نہ کیا تھا، لیکن اس میں کلام نہیں کہ مولوی عبدالماجد دریا آبادی کا اس میں شرکت اختیار کرنا اور نہ صرف یہ بلکہ گورنر کے استقبال کے لئے دوسرے صفت بستہ ممبروں کے ساتھ ملکر کھڑا ہونا، کم از کم میرے لئے ضرور حیرتناک تھا، کیونکہ وہ اس جماعت کی ممبری کو (باوجود اس کے کہ خود ہی انہوں نے اس کو قبول کیا تھا) اپنی پیشانی کے لئے بدنامی سے تعبیر کر چکے تھے۔

جون ۱۹۲۷ء | گزشتہ ماہ کے رسالہ میں، جناب آرگس کے مضمون نے، جس میں ابن سینا اور حافظ شیرازی کی

شاعری کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، بعض حلقوں میں برہمی پیدا کر دی ہے، ایسا اختلاف جس کی بنیاد صرف تحقیق حق پر ہو، یقیناً نہایت مفید چیز ہے، لیکن کم ہیں جن کا امتحان تنقید صحیح ہوتا ہے اور زیادہ ہیں وہ جو صرف اپنے معتقدات کے نقطہ نظر سے ہر چیز کو دیکھنا پسند کرتے ہیں چنانچہ اس مسئلہ میں بھی اکثر حضرات کی "چین پستانی" کا باعث محض وہ جذبہ "عزم برستی ہے جو حافظ نہیں" بلکہ حافظ کے "بت" سے قائم ہے، اور "بت" بھی کونسا؟ دنیا کے تصورات کا، عالم "ہمہ دست" کا اور اس کا رگاہ نظن و تاویل کا، جہاں لے و بادہ کے معنی آب کو تر و سبیل، اور نسائی کے معنی مرشد کامل کے لئے جاتے ہیں، حالانکہ غریب بے خبر ہیں اس حقیقت سے کہ اگر حافظ کی زندانہ زبان 'بادہ پرستار' نہ غزل خوانی اس کی رامتگرانہ شاعری اور مذہب سے یکسر بے نیاز ذوق سخن کو اس کے حقیقی اور شیعہ رنگ میں دیکھا جائے تو وہ "بت" سے زیادہ ایک غیر فانی "خدا" ہے عالم کیف و سرور اور دنیا کے نعمہ درباب کا۔ کہ بت کو تو ادنیٰ اسی ضرب تیشکی توڑ سکتی ہے، لیکن خدا کی خدائی چھیننے کا خیال بھی کسی کے دل میں پیدا نہیں ہو سکتا۔

میں خود آرگس کے دلائل کو ان کے دعوے کے ثبوت کے لئے ناکافی سمجھتا ہوں، جیسا کہ میں نے اس مہینے کو باب الاستفسارات میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ظاہر کیا ہے لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ کوئی صرف فلسفہ دشنام کو پیش نظر رکھ کر جواب دینے کی کوشش کرے درانحالیکہ اس تلخی کے ساتھ "لعل شکر خا" کا ادنیٰ تصور بھی شامل نہ کر سکوں!

جو لائی ۱۹۲۴ء | جن لوگوں کو گرمی اور بارش کا زمانہ بھوپال میں بسر کرنے کا موقع ملا ہے وہ واقف ہیں کہ یہ دونوں موسم وہاں کے کس قدر ہلکے اور پر لطف ہوتے ہیں۔ اس لئے اب جو میں بارہ سال تک ان دونوں کا لطف اٹھانے کے بعد یہاں آیا ہوں، تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ گرمی شاید خدا کا کوئی عذاب ہے جو ہر سال بندوں پر نازل ہوتا ہے اور جس سے نجات پانے کی کوئی تدبیر انسان کے پاس نہیں ہے باوجودیکہ تمام وہ ذرائع جو تمدن کی اس عہد ترقی میں تمازت آفتاب اور برہمی موسم سے بچنے کے لئے مہیا ہو سکتے ہیں مجھے حاصل ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ گرمی خود اپنے اندر سے ابلتی ہوئی نظر آتی ہے اور حد درجہ ناکام دل کی نفس سرد بھی آہ زباں سوز ہو کر نکلتی ہے۔ پھر جس وقت یہ خیال کرتا ہوں کہ موت و حیات کے درمیان یہ کشمکش یہاں تقریباً اکتوبر تک اسی طرح رہیگی تو دل بیٹھنے لگتا ہے اور بے اختیار دل چاہتا ہے کہ بہار آنے سے پہلے ہی دامن گریبان کے فاصلہ کو کم کر دیا جائے حقیقت یہ ہے کہ جس ملک میں سال کا نصف حصہ اس طرح بسر ہو جہاں سال میں چار مرتبہ "تداخل فصلیں" آدمی کو مہینوں صاحب فرار رکھے، وہ ملک کیا خاک

ترقی کر سکتے ہیں اور وہاں کے بد نصیب افراد کیا داعی و ذہنی امتیاز حاصل کر سکتے ہیں۔ آخری کاپی لکھی جا رہی تھی اور میں گرمی کے خلاف ستیاگرہ کئے ہوئے بیکار پڑا ہوا تھا کہ مولوی نور الرحمن بی، لے (بچھرا یونی) کو جو حسن اتفاق سے آج کل میرے ہمان ہیں، بچھیر رقم آیا اور انھوں نے معلومات کا حصہ مرتب کر دیا۔ جب سے نگار جاری ہوا ہے، غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ ماحول سے متاثر ہو کر نگار کی ترتیب کی طرف میں نے اپنے آپ مشورہ پایا ہو، یہی سبب ہے کہ میں اس طبعیہ باب الاستفسار کی طرف بہت کم توجہ کر سکا۔

اکتوبر ۱۹۲۴ء | لکھنؤ کا موسم ابھی تک ناخوشگوار ہے گرمی ہر چند دلجوئی حالت میں ہے لیکن رقص بسمل کی طرح ناپائدار نہیں۔ آفتاب کا طلوع وغروب ابھی تک خط استوا سے ہٹ کر جنوب کی طرف نہیں ڈھلا اس لئے زمانہ بدستور عرفیاک ہے۔ سنتے ہیں کہ ۱۵ اکتوبر کے بعد سے یہاں نمایاں تغیر پیدا ہو جائے گا۔ لیکن ایفاء عہد کے خیال کے ساتھ طبعیہ کی تمنا بالکل غیر شاعرانہ بات ہے اس لئے میں کوشش کر رہا ہوں کہ عالم نامراد ہی میں زندہ رہنا سیکھ جاؤں۔

نومبر ۱۹۲۴ء | معاصر خیابان نے اگست (اکتوبر ۶) کی اشاعت میں نقطہ نظر کے استعمال کے متعلق ایک دلچسپ تحقیقی نوٹ لکھا ہے خیابان کے فاضل مدیر کو نقطہ نظر کی صحت میں شک تھا، اس لئے انھوں نے جناب طباطبائی کو حکم بنا کر اس کا فیصلہ چاہا اور صاحب موصوف نے پورے یقین کے ساتھ یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ :-

» نظر، انگریزی کے محاورہ میں لفظ ہو تو ہوا دو کے محاورہ میں تار نظر اور مد نظر کی ترکیب اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ہماری زبان میں نظر نقطہ نہیں ہے، خط ہے یہ خیال زبان میں فلاسفہ قدما کے ایک مذہب کی رو سے پیدا ہوا کہ وہ لوگ اس کے قائل تھے کہ رویت کی حقیقت یہ ہے کہ آنکھ سے تار نظر نکل کر مریات پر پڑتا ہے، گو بعد میں یہ مذہب غلط ثابت ہوا مگر زبان پر جو اثر پڑ چکا تھا وہ زائل نہیں ہو سکتا..... غرض نقطہ نظر کہنے کی کوئی صورت ہمارے محاورہ میں نہیں ہے، ہاں نظر کی صفت نکتہ دان، نکتہ میں، نکتہ سنج آتی ہے اس اعتبار سے نکتہ نظر کتنا درست ہے «

مجھے اس باب میں جناب طباطبائی سے سخت اختلاف ہے۔ نقطہ نظر انگریزی کے پوائنٹ آف ویو (Point of View) کا ترجمہ ہے اور اس کا مفہوم وہی ہے جو ہدف نظر یا نہتائے نگاہ

کا ہو سکتا ہے۔ اس میں حقیقتِ رویت سے بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور نہ اس کا اثر اُس پر پڑ سکتا ہے۔ جب ہم کسی طرف دیکھتے ہیں تو ہماری نگاہ کسی مخصوص و متعین چیز پر پڑتی ہے۔ اسی طرح جب ہم غور و فکر یا کوئی تمنا کرتے ہیں تو کوئی مخصوص امر سامنے ہوتا ہے جس کے سمجھنے یا حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور اسی مخصوص و متعین چیز یا امر کو نقطہ نظر و خیال یا ہدف نظر و خیال کہتے ہیں۔

جناب طباطبائی نے شاید اس پر غور نہیں کیا کہ نقطہ نظر میں نظر سے مراد نگاہ نہیں بلکہ خیال یا تمنا ہے اور اس صورت میں نظر کے نقطہ یا خط ہونے سے بحث کرنا یا خواہ مخواہ مناظر و مرایا کے ان مسائل کو اس کی تحقیق میں داخل کرنا جن کی حقیقت کی طرف سے شاید جناب طباطبائی خود بھی مطمئن نہ ہوئے ہوں گے بالکل دور از کار بات ہے۔ اسی کے ساتھ نکتہ نظر کے استعمال کو درست ظاہر کرتے ہوئے جو استدلال پیش کیا گیا ہے وہ بھی محل نظر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ نظر کی صفت چونکہ نکتہ داں یا نکتہ سنج ہوتی ہے اس لئے نکتہ نظر کہنا چاہئے۔ نکتہ جس زبان کا لفظ ہے اس میں اس کا مفہوم یہ ہے۔

(۱) النقطة السوداء فی الابيض ادا البيضاء فی الاسود (۲) الاثر المحاصل من نکت الارض (۳) المعلقة الدقیقة اخرجت بدلة نظود امان فکر۔ ظاہر ہے کہ جناب طباطبائی نے تیسرے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کیا ہے کیونکہ نکتہ سنجی وغیرہ اسی مفہوم سے پیدا ہے۔ لیکن ناضل حکم کی نگاہ اس طرف نہیں گئی کہ لفظ نکتہ اسم ہے اور جب تک کوئی لفظ مصدری معنی کا نظر کے ساتھ مضان نہ ہو نکتہ سنجی وغیرہ کا مفہوم پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر بجائے نکتہ نظر کے نکتہ سنجی نظر، وقت نظر کہیں تو بیشک درست ہو سکتا ہے۔

اب لفظ نقطہ کے مختلف محل استعمال پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ عربی میں اس کو انگریزی کے لفظ (point) کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ (Point of difference) کا ترجمہ نقطہ اختلاف اور (weak point) کا نقطہ الضعف زبان عربی میں رائج و مستعمل ہے۔ حالانکہ جناب طباطبائی کی تحقیق کے مطابق اس کو بھی غلط ہونا چاہئے کیونکہ ضعف یا اختلاف میں حقیقتاً نہ کہیں نقطہ کا وجود پایا جاتا ہے نہ خط کا میں نے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر اس لئے کیا کہ مبادا نگار کے حلقہ میں غلطی یا غلط نہی سے نکتہ نظر کا رواج ہو جائے۔

دسمبر ۱۹۲۳ء | اس اشاعت کے ساتھ نگار اپنی عمر کا چھٹا سال ختم کرتا ہے اور جنوری ۱۹۲۳ء کا پرچہ گویا اس کی ساتویں سالگرہ ہے۔

گزشتہ رسالوں کے تقریباً سات ہزار صفحات میں نگار کی طرف سے جو علمی و ادبی تاریخی و تنقیدی لٹریچر

پیش کیا جا چکا ہے اور استفسارات کے سلسلہ میں جن قدر تنوع مباحث آگئے ہیں وہ اگر ایک رسالہ کے لئے مایہ ناز نہیں ہو سکتے، تو کم از کم اس کا اعتراض کرنا ہی بڑے گام کا ایسا ناقابل افتخار سرمایہ بھی بازار کی جنس عام نہ تھا۔

ہندوستان کے رسائل ”بیوفانی حیات“ اور ”زندگی مستعار“ کے آئینہ دار ہونے میں بہت مشہور ہیں، اور اگر یہ تصور انھیں کا قرار پائے تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس سے انبار جنس کی عام سرد مہری کا جواز کیوں ثابت ہو سکتا ہے۔ نگار کو ہر چند منظر اول کے مطالعہ کا فخر ابھی تک حاصل نہیں ہوا لیکن دوسرے منظر کے تلخ نقوش سے وہ بھی ناواقف نہیں ہے۔

رسم شکوہ و شکایت اس قدر فرسودہ ہو گئی ہے کہ مجھے شک ہے۔ ان الفاظ کا کوئی مفہوم کبھی تھا بھی یا نہیں اس لئے اس باب میں سکوت ہی زیادہ ہے، گزشتہ دس سال کے اندر جو ذہنی انقلاب ملک میں ہوا ہے وہ اس قدر عجیب و غریب وراسدہ امید افزا ہے کہ مشکل سے کوئی توقع اس سے زیادہ قائم کی جاسکتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی کم متحیر کرنے والی نہیں ہے کہ مطالبات دماغ کے ساتھ ساتھ دل میں بت کم کٹائش نظر آتی ہے، اور وہ جو ایک مذموم عادت ”گدائی کے ذریعہ سے شکیل آرزو“ کی پڑھکی ہے، اس میں کوئی تفسیر پیدا نہیں ہوا۔

میں اس کے مقابلہ میں فریق مقابل کی کامیابیوں کا ذکر نہ کروں گا کہ اس مرثیہ کا یہی بند سب سے زیادہ غیر نصیح ہے، بہر حال گزشتہ چھ سال کی تجربات جو کچھ بھی ہوں، کم از کم یہ ضرور کہوں گا کہ نگار کی قدر دانی نہ صرف اس کو زندہ رہنے کی حد تک کی گئی، بلکہ اگر میں چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ یہ زندگی ”نامردانہ زینت“ نہ تھی اس لئے ہر نئے سال کا طلوع میرے لئے ایک دنیا سے امید ساتھ لاتا ہے اور میں ایک ایک جدید کارگاہ قائم کر کے اسپر کار بند ہونا چاہتا ہوں، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس باب میں بقدر شوق و ولولہ، کامیابی بہت کم ہوتی ہے، یہاں تک کہ اسی الجھن میں وہ سال گزر جاتا ہے اور میں منزل کے پہلے ہی حصہ میں اپنے آپ کو پاتا ہوں۔

خدا کرے ستھ سے زیادہ مبارک ثابت ہو اور میں بھی نگار کو ان تمام آرزوں کی تکمیل کی تصویر بنا کر پیش کر سکوں جو اجرا کار کی ابتدا سے میرے دل و دماغ میں موجزن ہیں۔

واقف امرونی الی اللہ

پایچ ۱۹۲۸ء | ایک نر کی شاعر اپنی محبوبہ کے پاس اپنی تصویر بھیجتا ہے اور اس پر ایک شعر لکھتا ہے جس کا مفہوم ”یہ ہے کہ“ اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ تو مجھے دیکھے بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میری چشم حیراں تجھے دیکھا کرے“

غالب کا شعر ہے :-

تا چھا آئینہ حسرت دیدار تو ام
جلوہ بر خود کن دمار ابہ نگاہ دوریاب

بہر حال میں اپنی تصویر پیش کرتے وقت نہ یہ دیکھ سکتا ہوں نہ وہ بلکہ دنیائے شاعری سے بالکل علیحدہ ہو کر مجھے نہایت سادگی کے ساتھ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس تصویر کی اشاعت اگر ایک طرف بعض اجاب کے حکم کی تعمیل مقصود ہے تو دوسری طرف یہ خیال بھی ہے کہ آپ جس شخص کی سیرت کا مطالعہ بہ وساطت اسکے آراؤد افکار کے سات سال سے کرتے چلے آ رہے ہیں اگر آپ اس کی صورت کو بھی ایک مرتبہ دیکھ لیں تو کیا حرج ہے۔

مکن ہے بعض حضرات اُس ذہنی تصویر کے لحاظ سے جو انہوں نے قائم کی ہوگی مجھے بہت مختلف پائیں، لیکن اب میں کہ میں خود آپ کے مواجمہ میں حاضر ہوں، سابق تصور و قیاس کے نتائج کو نحو کر ڈالنے اور اب پھر غور کر کے فیصلہ کیجئے کہ آپ کسی ایسے شخص سے تو معاملہ نہیں کر رہے ہیں جس کے ظاہر و باطن دونوں بالکل یکساں ہیں۔۔۔۔۔ آپ اپنی جگہ جو جی چاہئے فیصلہ کریں، لیکن اگر میرے سامنے یہ تصویر پیش کی جاتی تو میں صاحب تصویر کی سیرت کے متعلق ادل نگاہ میں فیصلہ کر دیتا کہ

”گوزشت روست اما طبع جمیل دارد“

اس سے قبل متعدد رسائل میں میری تصویریں شائع ہو چکی ہیں، لیکن وہ سب فن کے لحاظ سے اس قدر ناقص ہیں کہ ان کے دیکھنے کے بعد میرے متعلق کوئی صحیح حکم نہیں لگایا جاسکتا، کہیں موقف محل نے میری صحیح فطرت پر پردہ ڈال دیا ہے اور کسی میں نور و ظل کی عدم مناسبت نے وہ بات پیدا کر دی ہے۔ جو حقیقتاً مجھ میں نہیں ہے۔ بہر حال اس وقت جو تصویر پیش کی جا رہی ہے وہ میری تازہ ترین شبیہ ہے جس میں بطن کے چھپانے کی مطلق کوشش نہیں کی گئی۔ اس لئے میں ذمہ دار نہ ہوں گا۔ اگر آپ میرے متعلق یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے کہ

”ہے ولی پوشیدہ اور کا فر کھلا“

اپریل ۱۹۲۸ء | ترقیاں دو قسم کی ہیں، ظاہری و معنوی، جنہیں زیادہ اصطلاحی صورت میں مادی و روحانی کہہ سکتے ہیں۔ ظاہری ترقی کا معیار یہ ہے کہ دولت وافر ہو اسباب راحت فراواں ہوں، اور سامان عیش و تنعم کثیر معنوی ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ قلب پُر سکون ہو دماغ مطمئن ہو اور روح بے نیاز و مستغنی۔ ہر چند دونوں کا اجتماع محال

نہیں، لیکن کیا ب ضرور ہے۔ اس لئے جو لوگ زیادہ سنجیدہ اور متین ہیں، وہ ہمیشہ روح کو جسم پر ترجیح دیتے ہیں اور ویسا دحریر کی نرمی سے زیادہ خشونت گلیم کو پسند کرتے ہیں۔ یہ ہے فلسفہ اخلاقیین کا اور غالباً بڑی حد تک درست ہے۔ اڈمیں اور فورڈ کا مسلک اس سے بالکل جدا ہے ان کے ہاں مادی ترقی بھی روحانی ترقی کی طرح لا محدود شے ہے اور ان کا قول ہے کہ دولت کی فراوانی، ہدیت اجتماعی کا استحکام ہے اور یہی وہ مقصد اصلی فطرت کا ہے جسے نہ مسیح کا درس رہبانیت پورا کر سکا، نہ چنگیز و سکندر کی خون آشام تلوار۔۔۔۔۔۔ یہ نظریہ بھی بہت خوشنما اور قرین عقل معلوم ہوتا ہے مگر دنیا میں ایک جماعت اور بھی ہے جو نہ اس فلسفہ کی لذت آشنا ہے، نہ اس نظریہ کی یعنی نہ اس غریب کے پاس دولت ہے نہ روحانیت، نہ اسباب راحت روح ہیں نہ سماں عشرت جسم پھر لطف یہ ہے کہ وہ زندہ بھی رہنا چاہتی ہے اور لطف و آسائش کے ساتھ!۔۔۔۔۔۔

مارا ہنوز عہدہ باخولیشن بے ست

مئی ۱۹۲۸ء | وقت و موسم کی قوت مسلم ہے اور تمام عالم خلق کا تغیر بڑی حد تک اسی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، انسان کو شمش کرنا ہے کہ کسی طرح اس کے مضر و مکلف اثرات کا مقابلہ کرے، اور چونکہ فطرت کے ساتھ اس کی یہ جنگ ابتداء کائنات سے چلی آرہی ہے اس لئے اس قدر کہ نہ مشقی کا فائدہ صرف یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی وہ بقدر جبر حیات کا میاب بھی ہو جاتا ہے، لیکن اکثر نہیں۔ مدعا یہ ہے کہ لکھنؤ کا آفتاب موسم شروع ہو گیا ہے اور اب "دل راحت طلب" کو اکثر استادا وزیر کا یہ مصرع یاد آتا رہتا ہے کہ :-

زمین کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

جون ۱۹۲۸ء | گزشتہ ماہ کے رسالہ میں مدیر سچ (جناب عبدالماجد صاحب دریابادی) کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا اس پر آخر کار اخبار سچ مورخہ ۱۸ مئی ۱۹۲۸ء میں ۲۱/۲۲ کا لم کا ایک نوٹ شائع ہو ہی گیا۔ ہر چند کہ ادھر جناب

نصرت بلڈ انومی عبدالماجد دریابادی در نیار فنی پومی

جناب نصرت صاحب بی، بلڈانہ (صوبہ برار) کے کوئی بزرگ ہیں، جنہوں نے ہمارے محترم و فاضل دوست مولوی عبدالماجد دریابادی (مدیر سچ) کے نام ایک تحریر روانہ کی جو ۲۰ اپریل ۱۹۲۸ء (ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۹ میں)

یوسف کے غیر معمولی حسن و جمال سے انکار کرتا ہوں، مگر کوئی میرزاغش کوئی خواجہ زادہ اس کی پروا نہیں کرتا۔ میں بہشت و دوزخ کی مادی حیثیات کو نہیں مانتا، میں حشر اجساد کا قائل نہیں میں تمام مسائل شریعت کو وقت کے لحاظ سے قابل اصلاح و ترمیم کہتا ہوں، لیکن کوئی اسلام پرست اور محب اسلام مولن ان باتوں کے خلاف احتجاج نہیں کرتا، لیکن محمد حسین آزاد کے خلاف، یعنی ایک ایسے شخص کے خلاف جو کسی طرح اکابر امت میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ مختصر الفاظ میں انہما رائے کرتا ہوں، تو یہاں سے لیکر وہاں تک آگ لگجاتی ہے، در سگاہوں کے حجروں سے لیکر صحافت گاہوں کے ایوانوں تک ماتم بپا ہو جاتا ہے۔

گو یا کہ تازہ خون ز کفن بر چکیدن بست

یہ کیا تماشہ ہے!، یہ کیا عجیب و غریب منظر ہے۔!!

کیا بت پرستی کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہے، کیا شرک و بدعت کی تعبیر میں اس سے زیادہ کسی اور روشن مظاہرہ کی ضرورت ہے؟

کس قدر حسرتناک ہے اس قوم کی تہی مائیگی جو اپنے کسی فرد کے خلاف کوئی بات نہ سن سکے، صرف اس لئے کہ اس کو ناکارہ مان لینے کے بعد کوئی دوسرا اس جگہ پیش کرنے کے لئے موجود نہیں ہے۔

آزاد کی آبجیات کے متعلق جو مضمون شائع ہوا ہے اس کا جواب دینے میں جس وسعت نظر و نظریے کا کام لیا گیا ہے وہ یقیناً داد سے مستغنی ہے۔ کہنے والا کہتا ہے اور تذکرہ و تاریخ، روایت و درایت سے ثابت کرتا ہے کہ آزاد نے فلاں فلاں جگہ تحریف و اذیت کی صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح لکھنے میں اپنے پورے قصد و ارادہ کو صرف کیا، لیکن جو اب دینے والا ان باتوں کا ذکر ہی نہیں کرتا کیونکہ دلائل بالکل قطعی و اذغانی ہیں، بلکہ وہ اپنا دل مرن نچھے گا لیاں دیکر ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے، حالانکہ اگر مجھے جاہل کہنے سے آزاد کے سر سے یہ تمام الزامات اٹھ جاتے تو اس کی نوبت ہی نہ آتی، جب کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو یکسر معائب و نقائص پایا اور ظاہر کیا ہے۔ کیا ایک کو گالیاں دیکر دوسرے کی برتری ثابت کرنا ایسا زبردست کلیہ ہے کہ اس میں کوئی استثناء ہو ہی نہیں سکتا، یعنی میرے اور آزاد کے باب میں بھی نہیں!

بر تمنا ہائے عرفی خستہ می آید مرا

اگست ۱۹۲۸ء | آج مسکن نسائیات کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ”مدرسہ و خانقاہ“ کے گوشوں سے بھی اس پر رائے زنی کی جارہی ہے اور موج کارُخ یہ ہے کہ وہی کتب مذہبی جن سے پہلے عورتوں کو کلمے ”زنجیر سلاسل“ قید و بند کے احکام کا استخراج ہوتا تھا، اب انھیں سے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ موجودہ پردہ

ہو جائے۔

حال ہی میں جناب عبدالماجد صاحب کا ایک افتتاحیہ ”اخبار ہمدرد“ میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے نہایت کیا ہے کہ انگریزی ذہنیت کسی طرح ہندوستانی ذہنیت سے بالاد پرتر نہیں ہے اور اس کے ثبوت میں انہوں نے استدلال پیش کیا ہے کہ اس وقت تک ایک انگریز بھی ہندوستانی زبان میں وہ مہارت پیدا نہیں کر سکا جو ہندوستانیوں نے انگریزی زبان میں حاصل کی ہے اسی طرح علم و فضل کے سلسلہ میں انہوں نے چند نام اہل ہندوستان کے شمار کرائے ہیں، لیکن کیا اچھا ہوتا کہ اگر فضل و افتاحیہ نگار اسی سلسلہ میں یہ بھی بتا دیتے کہ جب ایک قوم نہ اپنے ذہنی اکتسابات کے لحاظ سے قابل لحاظ ہے اور نہ اخلاقی حیثیت سے لائق ذکر تو پھر اس کی ترقی کارا کیا ہو اور دوسری قوم جو علم و فضل میں بھی تفوق رکھتی ہے اور اخلاق و عادات میں بھی بلند مرتبہ والی ہے اس کے اخطا و زوال کا کیا سبب ہے۔

کلام عبید میں ارشاد ہوتا ہے:-

وعدۃ اللہ الذین اسنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قباہم

(یعنی جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں دنیا میں قیام عطا فرمائے گا جس طرح

اس سے قبل کے لوگوں کو قیام عطا ہوا)

پھر اگر استخلاف فی الارض سے مراد وہی ”چھ خور و باہرا و فرزندم“ والی حالت ہے تو یقیناً ہندوستانیوں سے زیادہ کوئی مستحق اس کا نہیں ہے اور یقیناً ممکن فی الارض انہیں کو حاصل ہے لیکن اگر استخلاف سے مراد حکومت و ثروت، جاہ و دولت فراغت و خوشحالی اور ہر وہ چیز ہے جس کو ”جنت عدن“ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے تو پھر یہ محمد کیونکر حل ہو سکتا ہے کہ استخلاف اور عمل صالح میں باہم کیا نسبت ہے۔ اگر استخلاف بغیر عمل نیک کے بھی ممکن ہے تو وعدۃ الہی بیکار ہو جاتا ہے اور اگر یہ ناممکن ہے تو پھر وہی صورتیں ہیں، یا تو استخلاف کا مفہوم دنیاوی نکتہ و ذلت قرار دیا جائے یا انگریزی قوم کو ممکن فی الارض کے لئے اصل تسلیم کیا جائے، تاہم اجراء سے لیکر اس وقت تک سچ کے جتنے پرچے شائع ہوئے ہیں اگر ان کو دیکھا جائے تو سوائے اس کے کچھ نہ نظر آئے گا کہ یورپ کے فلاں ملک میں اتنے جرائم ہوئے فلاں مقام پر سال میں اتنی طلاقیں ہوئیں، فلاں لارڈ کی لڑکی عریاں رقص کرتی ہوئی پائی گئی وہاں شراب کا اتنا صرف ہے، قمار بازی میں اتنا روپیہ منل ہوتا ہے، وہ تمہیر یہ ظلم توڑ رہے ہیں، لیکن اس کی توفیق نہ ہوئی کہ کبھی یہ بات بتائے کہ فلاں عالم نے یہ ایجاد کی، فلاں ڈاکٹر نے یہ اختراع پیش کی، وہاں علم و فضل کی کیا خدمت ہو رہی ہے، فلاح قومی کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں، ہمارے مظلوم ہونے کے کیا اسباب ہیں ہم میں

کیا ناقص ہیں اور ہم ان کو کس طرح دور کر سکتے ہیں۔
 کیا کلام مجید میں "استخلاص فی الاض" کے لئے جس عمل صالح کی شرط قرار دی گئی ہے وہ یہی ہے کہ ہرگز
 کی عیب چینی کی جائے اور اپنے معائب کو بھی محاسن کی صورت میں پیش کیا جائے تاکہ عبدالماجد صاحب بجائے اس
 سطحی مقالہ کے اصل مسئلہ کی طرف توجہ فرماتے اور غور کرتے کہ کیا ہندوستانی دماغ کی برتری ان حالات کے ماتحت
 سراہے جانے کے قابل ہے اور کیا سورہ احقاف میں خدا نے یہ کلیہ قائم کر کے کہ :-

فہل یھاذا الا القوم الفاسقون

ہم کو یہ نہیں بتا دیا کہ ایک قوم کی دماغی ذہنی بنی کا بغوت اگر ہو سکتا ہے تو وہ صرف اس کی ترقی ہے اور جو قوم ہلاک
 ہو رہی ہے وہ یقیناً فاسق ہے، ناقابل ہے اور اس کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ کو
 بہتر کر سکے۔ جناب عبدالماجد کی صحافت اور انشا کا اعجاز صرف اس پر ہے کہ ہل یورپ کے معائب کو نمایاں کیا
 جاسکے اور اس غلو کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کا لٹریچر ہی حاسدانہ نکتہ چینی ہو کر رہ گیا حالانکہ یہ حقیقت واضح ہے کہ دنیاؤ
 عمل میں اس طرز تحریر کو صرف "کو سنا" کہتے ہیں اور اسی لئے اس کو صرف اُس جنس کے لئے مخصوص سمجھا گیا
 ہے جس کے لبوں کی جنبش اس زہر کو بھی شیریں بنا کے پیش کرتی ہے۔ عبدالماجد صاحب سے یہ توقع نہیں کی
 جاسکتی کہ وہ باوجود سعی بسیار کے بھی کبھی اس نوع کی جا ذہبت اپنی جنبش لب میں پیدا کر سکیں گے۔

اکتوبر ۱۹۲۸ء | جناب عبدالماجد صاحب دریا بادی نے نہرو کمیٹی کی رپورٹ پر رائے زنی فرماتے ہوئے اس قدر

عجیب و غریب بات لکھی ہے کہ شاید ہی اس کی نظیر تاریخ تنقید میں کہیں مل سکے۔ آپ فرماتے ہیں کہ :-

"نہرو کمیٹی رپورٹ میں کیا کچھ نہیں۔ رعایا کے حقوق، حکومت کے اختیارات، برطانیہ سے اخلق، قانون ساز مجلسوں

کی ترکیب، ان مجلسوں میں مختلف قوموں کا تناسب، طریق انتخاب..... اور اسی قسم کے دوسرے

مسائل پر ذمیلی تبصرہ اور تحقیقی فیصلہ"

یعنی یہاں تک تو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ نہرو کمیٹی رپورٹ ایک بہترین سیاسی دستاویز ہے جس پر ہندو مسلمان وطنینا
 سے اپنے اپنے دستخط ثبت کر سکتے ہیں، لیکن اسی کے بعد ہی جس طرح کوئی بھولا بھو خواب یاد آجائے، چونکہ کر
 فرماتے ہیں کہ :-

"لیکن اس ۵۰ صفحہ کی کتاب میں شروع سے اخیر تک خدا کا نام نہیں لے پایا ہے، مادیت کی اس نفاذ خانہ

میں قوم کی روحانی و اخلاقی زندگی کی کہیں بنک تک نہیں چڑنے بائی ہے، حکومت کا اصلی اور اعلیٰ مقصد نامت

حکومت ہی کو رکھا گیا ہے، نہ کہ زمین پر خلافت الیہ یا خدمت اللہ کو وغیرہ وغیرہ"

اگر عبدالماجد صاحب ایک سیاسی رپورٹ میں 'خدا کا نام روحانی و اخلاقی زندگی خلافت الہیہ وغیرہ کی جستجو کرتے ہیں اور یہ باتیں اس میں نہ پا کر چین بے چین ہوتے ہیں تو نہرو کمیٹی رپورٹ والوں کو بھی اسی قسم کی تنقید کا حق حاصل ہے اور وہ بھی ہدایہ، شامی، جلالین، بخاری بلکہ خود قرآن میں یہ جستجو کر سکتے ہیں کہ ان میں کہیں ہندوستان کے متعلق سوراج، کھدر، چرخا، کولسل اسمبلی، اور نہرو کمیٹی کا ذکر ہے یا نہیں اور پھر اخیر میں یو س ہوکر ان کتابوں کے مفید ہونے سے انکار کر سکتے ہیں۔ کاشکے عبدالماجد صاحب خود ہی کوئی الہامی رپورٹ مرتب کرتے تاکہ دنیا کا ہر شخص اُسے "آیت من آیات اللہ" سمجھ کر تسلیم کر لیتا اور جس کی رو سے سیاسی اور سیاسی میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔

اسی کے ساتھ قیصر باغ، بلکہ پریس یعنی ملک کے صاحب فروت لوگوں کا ذکر انھوں نے جس جن کے ساتھ کیا ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں ہے کیونکہ وہ تو ان کے نزدیک ہمیشہ سے "ظاہر کلاب" میں داخل ہیں اور ایک دولت مند کے مقابلہ میں غریب آدمی تسکین رشک و حسد اسی طرح کیا کرتا ہے، سچ ہے۔

ہر ہونسا کے نہ دانہ جلم و سندان فتن

نومبر ۱۹۳۲ء جناب عبدالماجد صاحب دریا بادی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ نہرو کمیٹی رپورٹ میں مجرموں کو جہانی سزا دینے سے اختلاف کیا گیا ہے اور اس طرح گویا "مسلمان جو ری کرے گا، لیکن اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا، مسلمان زنا کرے گا اور سنگسار نہ ہو سکے گا، مسلمان شراب پیئے گا اور اس کے درے نہ لگائے جاسکیں گے، یعنی سات کرد مسلمان اپنی شریعت کی بجا رگی ہر منسٹ محسوس کر کے رہ جائیں گے۔"

غالباً یہاں یہ بحث بیکار ہے کہ ہاتھ کا کاٹا جانا، سنگسار کیا جانا اور درے لگانا کس حد تک سرقہ، زنا اور میخواری کا انسداد کر سکتا ہے اور اس وقت تک شدید یا خفیف جہانی سزائوں نے دنیا کے جرائم میں کتنی کمی پیدا کی ہے، لیکن جناب عبدالماجد صاحب سے یہ دریافت کرنے کو ضروری چاہتا ہے کہ اگر مسلمانوں کے لئے قانون میں ان کے تمام مطالب کی رعایت کر دی جائے تو پھر وہ اس میں کسی استثنائی دفعہ کا مطالبہ تو نہ کریں گے جس سے علماء اور رہبران قوم اس قسم کے تعزیروں سے محفوظ رہیں یا یہ کہ مفتیان اسلام کو تو کسی ایسے حیلہ شرعی پیدا کرینگی اجازت نہ ہوگی جو ایک ہی ناجائز بات ان کے لئے قابل معافی اور دوسروں کے لئے لائق تعزیر ہو؟ کیونکہ خود شریعت کوئی چیز نہیں ہے اگر اس کے نافذ کرنے والے فاروق جیسے انسان نہ ہوں پھر یہ تو سیاسی لطائف ہیں پھر کوئی شخص توجہ نہیں کرتا، لیکن واقعی سنجیدگی کے ساتھ جو اختلاف کیا گیا ہے وہ بھی میرے نزدیک بالکل لایعنی ہے یہاں تک کہ بہت سے اختلاف کرنے والے خود بھی نہیں بتا سکتے کہ وہ کیوں مخالف ہو گئے ہیں۔

ہم اس سے قبل ظاہر کر چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ انجمنوں کی کثرت کوئی

عمود طریق کار نہیں ہے اور مسلمانوں کی ان دو جمعیتوں کو جن کا نام تبلیغ و خلافت ہے یقیناً مٹا دینا چاہئے اول الذکر جماعت کا وجود سیاسیات ہند کے لئے بے انتہا مفرت رساں اور خود مسلمانوں کے لئے بھی مذہبی نقطہ نظر سے غیر مفید ہے۔

اول تو میں اس کے ماننے کے لئے تیار نہیں کہ تبلیغ کا نفرنس نے جماعت اسلامی میں کوئی قابل ذکر اضافہ کیا ہے اور اگر اسے تسلیم کر بھی لیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ اس وقت دنیا میں حصول ترقی کا ذریعہ کمیٹیاں ہیں بلکہ کیفیت ہے اور اس کا فقدان پہلے ہی سے کم نہیں ہے، یہی خلافت کمیٹی سو بہ حالت موجودہ جبکہ خلافت کا وجود باقی نہیں رہا، اس کی ایک ناکارہ یادگار قائم رکھنا قرین عقل و انصاف نہیں جس طرح دوران قیام خلافت میں اس کمیٹی کا رویہ نامناسب محل و موقع پر استعمال کیا گیا، اسی طرح اب بھی ہو رہا ہے چنانچہ سنا گیا ہے کہ کلکتہ میں نہرو کمیٹی رپورٹ کے خلاف پروپگنڈا کرنے کے لئے خلافت کمیٹی نے کافی مالی امداد دی ہے، جو یقیناً اس کے مقاصد و فرائض سے بالکل علیحدہ چیز ہے۔

مسلمانوں کو اگر اپنی کوئی مخصوص انجمن قائم کرنا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلم لیگ کو از سر نو زندہ نہ کیا جائے اور تمام قوتیں اسی کے اصلاح میں نہ صرف ہوں۔

دسمبر ۱۹۲۰ء | میں دیکھتا ہوں کہ مشاعرہ کی بدعت جذبہ شعرا سے گزر کر اسکولوں، کالجوں، ہوسٹلوں اور یونیورسٹیوں میں بھی پھیل گئی ہے اور شاید یہی کوئی سالانہ تقریب ایسی ہوتی ہو جس میں بزم مشاعرہ کا انعقاد ضروری نہ خیال کیا جاتا ہو، میں نے جہاں تک غور کیا، یہ نتیجہ ہے اس ادنیٰ قسم کی ذہنیت کا جو موجودہ نصاب تعلیم اور اصول تربیت کے ماتحت اس وقت ہندوستان کی بڑی سی بڑی درس گاہ میں پائی جاتی ہے، اگر کسی سالانہ ہفت روزہ کے موقع پر کسی سنجیدہ و مفید مشغلہ میں مصروف ہونا ممکن نہیں اور صرف سطحی تفریح مقصود ہے تو میرے نزدیک مشاعرہ سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ”رقص و سرود“ کا جلسہ منعقد کیا جائے یعنی شعر گوئی شعر نہی سے پہلے وہ سالانہ پیدا کیا جائے جو شعر کہنے اور سننے کا اہل بناتا ہے۔

اس مرتبہ جب الہ آباد یونیورسٹی کے بعض طلبہ نے انگریزوں کو نوکیشن کے موقع پر مشاعرہ میں شرکت کی دعوت بھیجی تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ وہ کیوں نہیں کوئی اس سے زیادہ مفید صورت سالانہ اجتماع کی قرار دیتے انہوں نے جواب دیا کہ ”مشاعرہ سے ان کا مقصود اردو زبان کی ترقی اور ہندو طلبہ میں اس کا ذوق پیدا کرنا ہے“ مجھے ان کے اس طفلانہ جواب پر بے اختیار ہنسی آگئی اور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ان کے جواب کے دوسرے فقرہ کی سیاسی اہمیت کو زائل نہ کرنے کے لئے خاموش ہی رہوں تو بہتر ہے۔ لیکن میں یہ کہنے سے بہر حال باز نہ رہ سکا ”جب آپ خود ہندی بھاشا کے

کہ اول تو وہ منزل بسے

”مرا کردہ اند آستکارا من“

کہتے ہیں خود کوئی ایسی بلند منزل نہیں جسکو شخص باوئی تامل نہ پاسکنا ہو چہ جائیکہ اس میں بھی ناصبری سے کام لیا جائے۔ اس لئے میں بے نیاز آنے انداز سے آگے بڑھا اور میں نے اپنی فطری دوولعیتوں میں سے ایک نہایت ہی ابتدائی منزل کی وولعیت کو بے نقاب کرنا چاہا۔ لیکن حیرت ہے کہ دنیا اسکے بھی سمجھنے کے لئے تیار نہیں اور حیرت میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ۔

”کے زابگینہ وساغریب آور م“

تو وہ مجھے بھونچھیر لیتی ہے، مجھے کافر کہتی ہے۔ دوسرے اور ملحد کے لقب سے یاد کرتی ہے اور اپنے جہل سے میرے علم کو مغلوب کرنا چاہتی ہے حالانکہ یہاں یہ عالم ہے کہ ”گرانی محل“ کا احساس حضورِ قومی ہوتا جاتا ہے، اسی اعتبار سے

”میر پرور را بولولہ استخم سزار بار“

اسلئے میں اپنے تمام احباب سے خواہ کسی مذہب مسلک کے متبع ہوں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرے شاہدِ مقصود کے سامنے یہ تمام نسبتیں، یہ جملہ اضافات و سی حقیقت رکھتی ہیں جو ”یارہ کتاں“ چاند کیسا منے اور عبد اللہ میں اس سے بہت بلند ہوں کہ اس ”نااستوار ہی تسبیح“ کا تار شہ نہ سمجھنے کیلئے اٹک لے کر بھی اپنی نگاہ تپتی کی طرف مائل کر دوں۔ دینا اگر اپنی صحرانوردیوں میں حضور کو راہبر بنا جاتی ہے تو نساے اور جنتک جی چاہے سلندر کی ناکامی کا انتقام اس سے لیتی رہے لیکن مجھے اس حجبِ بین دعوتِ شریکت نہ دے کہ۔

سیلاب را بہ باد یہ رہبر گرفتہ ام

اگر ایک طرف یہ عزم استوار ہے کہ تفسیرِ خواہ وہ معاشرت اخلاق سے متعلق ہو یا مذہب یا سیاست سے ہمیشہ بلند نقطہ نظر سے لونا جائے، تو دوسری طرف میں اپنی نظرت کی اس کمزوری سے بھی واقف ہوں کہ وہ کسی کا دل دکھانا گوارا نہیں کرتی، اور اسلئے جب مجھے اس کا علم ہو جاتا ہے کہ میری تحریر یا ننگار کے کسی مضمون سے کسی کو صدمہ پہونچ گیا ہے، تو میں بہت، ملوں ہو جانا ہوں، بنابر ان اگر گذشتہ ماہ کے ننگار سے کسی خاص شخص یا کسی مخصوص جماعت کو کوئی تکلیف پہونچی ہے تو میں اسکی معذرت میں صرف یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود کبھی تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوتا اور اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو جاتی ہے تو حدِ شکر اسلئے کہ۔

بستم جنایاں کہ گل شناسم ز نوک خار

اس سلسلہ میں مجھ کو برا کہنے والے دو قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ جو انتقام لینے کیلئے صرف اپنے اہلین سے چارہ سازی چاہتے ہیں، اور گالیوں کی آزار رسانی کے سوا ان کے پاس کوئی آلہ حرب نہیں ہوتا۔ اور دوسرے وہ جو میری تحریر میں بے حجابی، عریانی، فحاشی وغیرہ کے نقائص نکال کر اپنے پندار میں مجھے ذلیل و خفیف کرنا چاہتے ہیں۔ سوادل الذکر جماعت سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جس طرح انکا اہلین ان کے ساتھ ہے اسی طرح میرا بزدان بڑے ساتھ ہے، اور اسلئے مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں اور موخر الذکر جماعت کے ہمنور میں اپنے ذوق ادب و انشا کی طرف سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں عرض کر سکتا کہ۔

نظارہ خوبان دے دے غمہ حرام است

دیدم و شنیدم و سمعنا و الطعنا

میں نے اس وہ مطبوعہ اعلان آجاتے جسے کلنہ میں قائم سہ بنوالی "لیگ گینٹ ملازم" نے اپنے مقصد کی تبلیغ کیلئے شائع کیا ہے، اس لیگ کے روح رواں اور صدر مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی ہیں اور سید محمد عثمان فاضل نائب صدر اس لیگ کے قیام کا مدعا اس ذہنیت کی مخالفت ہے جو تنگ نظری، تنگ دلی، تقلید و جمود، تعصب و عدم رواداری کو مذہب کے رنگ میں پیش کرتی ہے اس ذہنیت کا اصطلاحی نام اس انجمن نے ملازم اور اس ذہنیت والوں کا ملا لٹھا ہے۔ اس اعلان کے آخری صفحہ میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ انجمن اکاد و دست کی حامی نہیں ہے۔ اور نہ ہر عالم دین کی مخالفت ہے بلکہ وہ صرف ان نام نہاد مذہبی پیشواؤں کے خلاف ہے جن میں یہ ذہنیت پائی جاتی ہے۔

جس حد تک الفاظ اعلان کا تعلق ہے، اس انجمن کے مقاصد نہایت ہی پاکیزہ اور قابل قبول معلوم ہوتے ہیں لیکن عملی حیثیت سے مجھے اسکے اندر چند در چند کمزوریوں کا محسوس ہوتی ہے جس وقت یہاں کے لوگوں نے یہ دعویٰ پیش کیا جاسکا کہ ملاؤں کی جماعت تنگ نظر سے متعصب ہے۔ تقلید کی پابندی سے تو لاجمالہ یہ سوال پیدا ہوا کہ ان کی تنگ نظری، تعصب اور تقلید مذہب کے اندر سے یا اس سے باہر ظاہر ہے کہ اس سے باہر نہیں ہو سکتی اور ہو تو بھی کون ماننا ہے۔ اسلئے وہ مذہب ہی سے متعلق ہوگی اور جس وقت آپ مذہبی مناظرہ کریں گے تو ان غیرت ناہی سلسلہ "قال قول" کا پیدا ہو جائے گا اور آخر کار وہ موقد حاصل نہ ہو سکے گا جسکے لئے یہ لیگ قائم کی گئی ہے۔

اگر یہ لیگ مذہب کے ساتھ ساتھ ملاؤں کی مخالفت کرنا چاہتی ہے۔ تو کوئی توقع کامیابی کی نہیں ہو سکتی اور نہ مذہب کی موجودہ مراسم کی حمایت کرتے ہوئے ملاؤں کے خلاف کوئی کامیابی

پر دیکھنا ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ یہ دعوے کریں کہ جو اسلام اس جماعت نے پیش کیا ہے۔ وہی شروع سے غلطی اور ان میں سے ایک بھی بلا استثناء مذہب اسلام کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھا تو بیشک یہ لگ بھگ سمیت اختیار کر سکتی ہے اور اصلاح کی بھی اس سے توقع ہو سکتی ہے۔ یہ بالکل خلاف اصول ہے کہ اس جماعت میں سے بعض کو علحدہ کر دیا جائے اور بعض کو لے لیا جائے، بلکہ ایک شخص سے ان سب کو صرف غلطی کی طرح مٹا دینا چاہیے۔ اور لوگوں کو اسلام کی حقیقت ذہن نشین کر کے بتانا چاہیے کہ اسلام نام سے صرف ترک مذہب کا، نسخہ ادیان کا، تفریق قومی کے مٹانے کا اور جامعہ انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا جس کا نام اخلاق اور صرف اخلاق ہے، اسلام سجد اور مندر کی تفریق سے بے بنیاد ہے، زنا اور تہیج کے امتیاز سے بالاتر ہے، مذہنا قوس و اذان کی تمیز اس کا نصب العین ہے نہ پیریاں اور طوائف کا تفریق اس کا مطلع نظر وہ تمام عالم کو، ساری کائنات کو، حجابہ تو بحیثیت بشری کو ایک رشتہ سے وابستہ کر کے صرف ایک نقطہ پر لانا چاہتا ہے، اور وہ اس مساوات کا مبلغ ہے جس سے زیادہ وسیع مساوات دنیا میں کسی مادی و دنیوی، کسی نبی و رسول نے اس سے قبل پیش نہیں کی۔

وہ نہ کسی کے نام کو دیکھتا ہے، نہ وضع و صورت کو، نہ وہ نسب کو وجہ امتیاز قرار دیتا ہے، جس کے نہ دولت اسکے نزدیک کوئی اہمیت رکھتی ہے نہ جاہ و ثروت۔ وہ دیکھتا ہے صرف رواداری کو۔ جذبہ اشارہ و فریاد کو، اور محض اس اضطراب کو جو بنی نوع انسانی کے ہر فرد میں دو سکھ فرد کی اعانت کے لئے پیدا ہونا چاہیے۔

پھر آج اسلام کا صحیح مفہوم بتانے کے لیے سے پہلے ضرورت ہے اس عنصر کو جو کر دینے کی اجوبہ اسلام کو اصطلاحی لفظ قرار دے کر اس کو اخوت عامہ کے مقصد سے علحدہ کر رہا ہے۔ اور موجودہ ضروریات تمدن و زمانہ کے لحاظ سے تمام ان اصول معاشرت و حیات پر نظر ثانی کرنے کی جو آج اسلام کے چہرہ کو نہایت بد نما صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ اگر زمانہ کے ساتھ لوگوں کے امیال و عواطف اور عقول و افکار میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ تو پھر یقیناً وہی مذہب حقیقی معنی میں خدائی مذہب کہلائے گا جو عہد و زمانہ کے لحاظ سے تمام عقول و اذمان کی رہبری کر سکے۔ اور اپنے اندر اس تغیر کو روار کھے جس کے بغیر "اخوت عامہ" کا مقصد عظیم حاصل نہیں سکتا۔

پھر آج اگر منزل تک پہنچنے کا صحیح راستہ ہو سکتا ہو تو وہ نہ وہ ہے جسے تمام علماء دین زمانہ سے صدیوں پیچھے کر رہے ہیں اور اس کی وہ تدبیر ہے جو کلکتہ کی اس لگ نے تباہی ہے۔

اس لیے جس ایثار و قربانی جس رسوخ و استواری کی ضرورت ہے، وہ ہم میں سے سب سے کم و منظور کی طلبگار ہے سقر اطہرین کی تجسس ہے، اور ان مردانِ خدا کی منتظر ہے جو تمہارے ہمہ تن لبکہ و آرزو پر اس راز کا اعلان کر سکیں جن بات اپنے اندر رکھتے ہوں

پھر اگر آج بعض نفوس مقدسہ اس قربانی کیلئے آدھ بوجھیں خدمتِ ہلام کیلئے اپنے تمام مصالح ذاتی کو پشت ڈالنے کیلئے تیار بوجھیں، تو بغیر کسی لبیک کے قائم کیے ہوئے حقیقی مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور دنیا اور خود ان مولوں، ان ملاؤں، ان علمائے دین، ان پیرانِ طریقت، ان تصوف پیشگانِ جم مرتب کے بتوں کو ٹھکرا دینے کیلئے آدھ ہو سکتی ہے۔

میں اس لبیک کے ارباب کار کو تانا چاہتا ہوں کہ میں جس نزل میں ہوں وہ انکے لبیک کے مقاصد سے بہت بلند ہے اور سرِ نژادِ ایک اس نوع کی جماعتوں یا انجمنوں کا قیام ایک طفلانہ نمائش تو ضرور ہی لیکن سنجیدہ و موثر تداویب سے اسکو کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا۔

اگر اس لبیک کو کچھ کرنا ہے تو میں مشورہ دوں گا۔ کہ

بیشاں دامن و آرادہ بر خیز

ور نہ لے دنیا مورا با چاہے کیونکہ جو ”باب نبرد“ نہی اس کو ”عشقِ نبرد“ کی دعوت پر لبیک کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے اس کا حکومت کے طرز عمل کیخلاف احتجاجاً فاقہ کی تر پاتاڑھ یا کر ملاک کر سبوالی صعوبتوں کو برداشت کر کے اس دنیا سے گزر جانا، گویا سہرا بہت معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھیں گے تو معلوم ہو گا کہ زمانہ ایسے ”مردانِ خدا“ جنہ سے زیادہ نہیں پیدا کر سکا۔

اس وقت یقیناً یہ سوال صرف آپ شخص، ایک معمولی انسان کے جان دیدیے گا، لیکن عاقبت میں نکالیں دیکھ سکتی ہیں کہ یہ سزا جہاں سے اکیسے اچھے کا، نجات سے، ایک ملک کی۔

دس نہیں مرا، بلکہ زندگی کا راز مکمل بتا گیا، اس کے جانے پر پھول نہیں برسائے گئے، بلکہ آزادی دہی دی وئی لئے توجہ تاج کو آراستہ کیا گیا اور اگر فطرت نے اپنے اصول نہیں بدلے ہیں تو کم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ہنظاری کی مدت کو قدر نصف صدی کم کر دیا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب ارتھی نرسوگ کے پھول پر طھانوں کے ہاتھ ”ملکہِ حریت“ کے جلوس میں سرست کی گلزاران کرتے ہوئے نظر آئیں گے موت نام سے دنیا سے محو ہو جانے کا پھر کون سے جو اس کو مردہ کہہ سکتا ہے۔ اہان اولیاء اللہ لا یموتون یقیناً اس اللہ کے اولیاء میں سے ایک لی تھا اور اگر مسلمان مجھے اس اظہارِ خیال پر سلام سے خارج کرنا چاہیں تو کر دیں، مجھے پر دہا نہیں

”منت کشِ حتم کہ حقیقت نگر آمد“

اور اگر وہ ولایتِ خداوندی کو صرف اپنے ہی لئے مخصوص جانتے ہیں تو کم از کم مجھے یقین نہ دلائیں کہ میرے اوپر تو اس کے خیال سے بھی موت کا ساجھو و طاری ہوئے لگتا ہے اور نہ اپنی قربانیوں کا ذکر کریں کہ۔

”دار و تعدادت آب شدن تا عمر ستم“

یہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ ہندوستان کا سیاسی تنگ و دو میں اس وقت تک کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا، نہ و مسلم تفریق کی وجہ سے ہے۔ اور یہ بھی غلط نہیں کہ اس تفریق کے قیام میں ہندوؤں کی تنگ نظری اور عصبيت بہت معاون ہوئی، لیکن کیا مسلمان اس باب میں بالکل موصوم ہیں کیا وہ ہندوستان کی سلسلہ آزادی کو دہی بہت، ہم سمجھتے ہیں اور کیا وہ سنی پوری توجہ اس طرف صرف

کر رہے ہیں، ممکن ہے بعض نفوس یہ دعویٰ کر سکیں، لیکن عام طور پر مسلمانوں کی ذہنیت اس درجہ انتشار و پراگندگی کھتی ہے کہ اس وقت تک یہی نہیں معلوم ہو سکا کہ ان کا مقصد کیا ہے۔ کبھی وہ مسئلہ تبلیغ کی کامیابی کو اپنے مرض کا علاج سمجھ کر اس طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، کبھی ”خدمتِ کعبہ“ کو وہ اس تہذیب و اخلاق کا نیکو نمونہ سمجھ کر اس پر اصرار کرتے ہیں۔ کبھی ”زوالِ خلافت“ پر مجلسِ عزامت کر کے اس کا نام ”خلافتِ کمیٹی“ رکھتے ہیں اور اب خیر سے فلسطین کے معاملے نے ایک ایسی چیرہ فلسطین کمیٹی کی بنیاد کا مواد فراہم کر دیا ہے۔ گویا ہندوستان کے مسلمان ساری دنیا کے ذمہ دار ہیں اور جب تک ہندوستان میں بھٹلہ کوئی رزلوشن پاس نہ کرینگے اس وقت تک عالمِ اسلامی کی کوئی مشکل حل ہو سکتی نہیں لیکن اس ”خاکِ بسترِ قوم“ سے کوئی پوچھے کہ۔ اس وقت تک ان تمام مذہبی، سیاسی اور اخلاقی غمبٹوں نے کیا کاربائے نمایاں انجام دئے اور ان تحریکات میں حصہ لینے کے بعد دوسروں کو کیا فائدہ پہونچایا اور خود کیا فائدہ حاصل کیا۔ خلافتِ ختم ہونے کے بعد خلافتِ کمیٹی قائم ہوئی اور دولت نے اندازہ ہندوستان کے غریب مسلمانوں سے جمع کی گئی، لیکن کیا حکومتِ حجاز نے اس مقدسہ سے یہود و نصاریٰ کے اثرات محو کرنے میں کوئی مدد کی، کیا وہ اس سلسلہ میں اپنی کسی حقیر سے حقیر آرزو کو بھی پورا دیکھنے میں کامیاب ہو سکے۔ اس طرح خدامِ کعبہ کی حیثیت سے وہ مسئول ہو سکتے ہیں کہ اس باب میں انکے خدمات کیا ہیں۔ کیا حاجیوں کی جماعت کو کمیٹی میں ٹکٹ خرید کر کے لایا، اسراخاؤں میں لاکر اکٹھا کر دیا اور جہاز پر سوار کر دیا۔ اناطرا کام ہے کہ اس سے زیادہ کوئی اور ذریعہ نجات ہو سکتی نہیں، ملتا جمعیتہ العلماء اور انکی تبلیغ کا ذکر فضول ہی کیونکہ اب اس جماعت اور اس کے اس مقصد کی لغویت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

اب اس ذہنیت کے ماتحت فلسطین کے مسئلہ میں ہنگامہ گدایا نہ بریا کیا جا رہا ہے، اور کیا عجب ہے کہ اسکے لئے بھی کوئی فہرست نہیں چن رہی کھول دی جائے، لیکن اس کا نتیجہ بھی جو کچھ ہو گیا ہے، کسی سے مخفی نہیں۔ یہاں تک مسلمان یہ نہیں سمجھتے کہ جب تک وہ خود اپنی ملکی و مقامی حیثیت کو مستحکم و بلند نہ کریں گے، ان کے وطن پریشانی، کو کون سنیگا اور انکے شور و شعوبے دنیا کے یہ اصول کیوں بدل سکتے ہیں کہ پہلے اس سے سر ٹکرا نا خود اپنے سر کو چرچ کرنا ہے۔ اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ وہ اپنی انکی آواز کو کوئی اہمیت دیا جائے تو انکا فرض یہ ہونا چاہیے کہ پہلے اندرونی ملکی سیاست میں اپنے اندر ایک جماعتِ مصالح کی سی اہمیت پیدا کریں اور جب خود اپنے گھر کو محفوظ کریں تو دوسروں کے گھروں کی آگ بجھانے کی کوشش کریں۔ گویا ہندوستان کے مسلمانوں کے باب میں ترکی، ایران، افغانستان، مصر، فلسطین، حجاز، سبکھ سے کوئی آواز بلند نہ کی جاتی ہے، کیا کبھی سنا گیا ہے کہ وہاں کی کسی جماعت نے کوئی بخیر اپنی حکومت کے ذریعہ سے حکومتِ برطانیہ کے پاس بھیجی ہو، پھر جب اس وقت حالت یہ ہے کہ ہر قوم و جماعت اپنے ہی تحفظ کی منزل سے نہیں گزری، تو ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ ”مخزنِ آرمیاں“ اور ”رزلوشن فرمایاں“ کیا اہمیت رکھ سکتی ہیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اور غالباً بری جماعت سارے اہل کی منظوری سے چین، جاپان، نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ اسمبلی کے بعض مسلمان ممبر احتجاجاً جاہاں سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ ہم نے مانا کہ صغریٰ کی شاویاں ہندوؤں میں زیادہ ہوتی ہیں اور یہ قانون

انہوں نے اپنی ہی معاشرت کی اصلاح کے لیے نافذ کرایا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب اصولاً مسلمان بھی اسکے مفاد کے منکر نہیں ہیں تو وہ کیوں مخالفت کرتے ہیں رہا شریعت اسلامی کا سوال، سو میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہندو تائین زنا کے جرم میں سیکونگا کیا جاتا ہے۔ کیا برقعہ کے اتکاب پر کیے جانے والے قطع کیے جاتے ہیں۔ کیا تہمت پر یہاں حد قذف جاری ہوتی ہے، کیا شراب خوار ہی مرد تھے لگائے جاتے ہیں، پھر مسلمان ان تعزیرات کو جو شریعت اسلامی کی جانب سے لگوائے گئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ سارے دامن پر چھان پاموں علی الخصوص اس وقت جبکہ مسلمان زمین بھی ہندوؤں کیساتھ میل جول رکھنے کی وجہ سے صغیرنی کی شادی کا رواج کچھ کم نہیں ہے۔

صغیرنی کی شادی کو روکنے والا قانون باوجود اس کے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت نے مخالفت کی نظیر یہ کیا اور سارے سے اس کا نفاذ بھی ہو جائے گا۔ جہاں تک عورتوں کی صحت کا تعلق ہے یہ قانون بہت مفید ہے اور معاشرتی حالت کی درستی میں بھی اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر عجز کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایک قانون اس سے بہت زیادہ ہم تھا جسکی طرف کسی نے توجہ نہیں کی اور جس کا نفاذ بقا عقل و جو اس اور تحفظ انسانیت و اخلاق کے لیے از بس ضروری ہے۔

اس وقت تمام اکناف ہند میں ایک کثیر جماعت ان لوگوں کی دیکھی جاتی ہے جو اپنے آپ کو عالم دین کہتے ہیں، صغیرنی راہ طہرت بتاتے ہیں، مجالس و وعظ میں سخت تباہ کن اور دشمن عقل و انصاف روایات بیان کرتے ہیں صرف اس لیے کہ روپہ کمائیں، جاہلوں اور اجنبیوں کو اپنے کاذب کثفت و مرقعہ سے دھوکہ دے کر اپنا گرویدہ بناتے ہیں تاکہ زندگی کے تمام نفاہیم و لذائذ اپنے لئے مخصوص کر لیں، در الخالیکہ انہوں نے کوئی محنت نہیں کی، کسی نجف کشی اور عرق ریزی سے کام نہیں لیا۔

اگر قانون تعزیرات ہند وغامین ان کو گرفتار نہیں کر سکتا، اگر ضابطہ فوجداری آوارہ گردی کے سلسلہ میں ان کو لٹیک چینی کا پابند نہیں بنا سکتا، اگر امتناع گدگری کا قانون ان پر نافذ نہیں ہو سکتا تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لیے، ایک علیحدہ قانون نہ مرتب کیا جائے، اور ان معزز گدگروں، ان ٹیڑھے لکھے بھکاریوں کو جو، دو سٹڈن الناس الحافا کی ایک مخفی مگر نہایت ہی سخت لعنت میں مبتلا ہیں و عظیم شکی اور پیرسی مرید ہی سے نہ باز رکھا جائے۔ نہ ان کے پاس کوئی جائیداد ہے نہ ریاست نہ یہ کہیں ملازمت کرتے ہیں، تجارت، لیکن دولت ہے کہ ان کے قبوں پر نثار کیا رہی ہے اور عیش و نشاط کی دیوی ہے کہ ہر وقت ان کے پہلو سے واسطہ نظر آتی ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ غریب اہل ہند کی وہ کمائی جو ہندوؤں میں بڑوب کر حاصل ہوتی ہے۔ کیوں بلا کسی محنت و مستحقان مزد کے ان مولویوں، پیروں، ابدالوں، پٹیلوں، جو لشیوں، اور برہمنوں کو دیدیجائے جو ایک معذی مرض کے جراثیم کی طرح صرف وبا اور ہلاکت پھیلانے کے لیے رونما ہوئے ہیں۔

کیا اسمبلی کے کسی ہندو یا مسلمان ممبر میں یہ جرأت ہو کہ وہ اس مسئلہ کو پیش کر کے تکمیل کی حد تک پہنچائے ؟

لفظاً نظرتے، اسے اکبر دئے خلوت دے فخر انجن، میرے پاس تو کافی الفاظ بھی نہیں کہ آپ کے اس مخلص نیت، اس اتاد و شفقت و کرم، اس مصلحانہ انداز و شاکل اور اس بزرگانہ خرم و نگہداشت کی داد دے سکوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کی جزا وغیر آپ کی داد و احترام کی طرف سے نہ ملی تو سب سے پہلا وہ شخص جو اس کے خلوت صدائے احتجاج بلند کرنا ہو، اسناداً و درہائاً آپ کے اس گلدستہ کو پیش کرے گا، وہ میں ہونگا، خواہ وہ کالائے بد اسکر بجائے آپ کے میرے ہی منہ پر کیوں نہ پھینک دیا جائے

سچ ہے اگر کالج کے طلبہ کو شروع ہی سے یہ درس نہ دیا جائے گا کہ محبت کے رموز کیا ہیں، معشوق سے کیونکر باتیں کی جاتی ہیں، ہجر و وصل کے شدید و لذائذ کیا ہیں، تو پھر قیس و فرہاد کی نسل کیونکر قائم رہے گی اور احسن صاحب اپنے عشق پیرانہ سری "کے خوش ہیں کس پر یہ غمزہ محبت صرت کرینگے کہ:-

قسم اپنی اتم اپنا، مری خواہش، مرانام یہی دو چار ہیں باتیں جو انھیں یاد نہیں
مجھے نہیں معلوم کہ وہاں جناب احسن کے سپرد کو کونسی خدمت ہے، لیکن میں اسے درخواست کروں گا کہ اگر کبھی اس کا موقعہ ملتا ہے
تو اپنے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے طلبہ کو کم از کم یہ ضرور بتادیں کہ آپ کے محبوب نے کیا قسم کھائی تھی جو یاد نہیں رہی اور آپ کی وہ کونسی
خواہش تھی جو پوری نہیں کی گئی۔

یہ ہے وہ شاعری جس کو الشعراء تلامیذ الرحمان اور ان من اشعر حکمہ دان من البیان شعر کی آڑ پر ذکر جناب احسن
کالج میں رواج دینا چاہتے ہیں۔ ملا عنینت کا

بکتاب می رود طفل پر یزاد مبارک یاد مرگ نو با استاد

کہنا آج تک بدنام ہے لیکن کس کے منہ میں زبان ہے جو جناب احسن مارہروی سے یہ باز پرس کرے کہ کالج کے حدود میں کس طلبہ کے سامنے
اپنے محبوب کی قسم اور اپنی خواہش کی داستان دہرانے کا اُن کو کیا حق حاصل ہے۔ کیا لوگ اپنے بچوں کو اسی یقین کے ساتھ وہاں بھیجتے ہیں کہ
ہاں کا اہم مشاعرہ سال میں دو چار مرتبہ ایسے پست و دنی مشاغل ایسے ذلیل و رومی جذبات ضرور ان میں رائج کرے گا

میں نے اسی دسمبر ۱۹۷۷ء کے رسالہ میں یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ "غریب بسم اللہ کے گنبد میں زندگی بسر کرنے والے نوجوان (طلبہ)
کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ہندوستان کا شاعر کس قدر عجیب و غریب چیز ہے اور اس کا اخلاق، نفسیات کے کتنے ناعمل شدہ مسائل اپنے اندر
پہاں رکھتا ہے۔" ہمارے احسن صاحب بانی محفل مشاعرہ علیگڑھ کو یہ فقرہ بھی بہت ناگوار ہوا اور وہ سمجھے کہ شاید میں نے اسی
سلسلہ میں ان کے اخلاق پر بھی حملہ کیا ہے۔ حالانکہ جو شخص شوق سندیلوی کی کتاب اصلاح سخن کا مطالعہ کر چکا ہے، وہ جانتا ہے
کہ جناب احسن مارہروی کے خطوط و رسالوں میں درج ہیں، ایسی معمولی دستاویزی شہادتیں نہیں ہیں جن کے ہوتے ہوئے مجھے
ان کے اخلاق پر روشنی ڈالنے کی یا اُن کو اپنے اخلاق سے روشنی ہٹانے کی جرأت ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب احسن مارہروی
کی یہ جسارت اس شخص کو بھی تھوڑی دیر کے لئے حیرت میں ڈال دینے والی ہے جو "بکفت چراغ دارد" کے نام سے بدنام ہے
رہا مجھے آئندہ مشاعرہ کے لئے "مٹہ ساز و سامان" کے شرکت کی دعوت دینا سو میں ان کے اس نوید کا ہر ممکن احترام ملحوظ رکھنے

ہوے نہایت افسوس کے ساتھ اس حقیقت کے اظہار پر مجبور ہوں کہ اگر علیگڑھ کا ہجوم مشاعرہ، فردوس ہو تو بھی میرا وہاں کیا کام جب آپ ایسے رهنواں نے پہلے ہی سے وہاں کی فضا کو داغدار و آلودہ بنا رکھا ہے
معاذ فریبے میں آپ کی لغزشِ مشائخ سے اپنے ارتعاشِ لبِ ناکام کا تبادلہ کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتا
تو دطوبی و باوقامت دوست فکر ہر کس بقدر ہمت ادست

جناب حسن مارہروی نے بہ مشورہٴ معائنہ بھی دیا ہے کہ جب کبھی میں علیگڑھ آؤں تو خسرو کے یہ دو شعر ضرور سن لوں کہ
نظم را علی تصور کن بذات خود تمام کان نہ محتاج اصول رسالت خلیاگر بود
در کفر مطرب است ان الا ان ہون ان ہون
چوں سخن بود ہم بنی دایتر بود

ہر چند میں شاعر نہیں لیکن چونکہ مشورہٴ صاحب ہے اسلئے میں بھکار کے ذریعہ سے تمام فنیاں اگر قسم کے شاعروں کو پہنچائے دیتا ہوں
لیکن اسی کے ساتھ میرا بھی ایک مشورہٴ احسن صاحب کا ضرور سنیں ہے اور اگر برائے نامیں تو عرض کر دیں کہ جب وہ طلبہ کو درس
مشائخ دینے کے بعد فارغ ہو جایا کریں تو سہمی کے یہ دو شعر وہ خود بھی ضرور پڑھ لیا کریں
گر یا بہ بخشائے بر حصال ما کہ ہستم اسیر کست و ہوا
نداہیم خمیر از تو فریاد رس توئی شاعران خطا بخش و بس

افسوس ہے کہ اس مہینہ میں زیادہ تفصیل کا موقعہ نہیں لیکن مادہ آئندہ میں اس گلہ سے کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد بتاؤنگا
کہ آپ ضرور کالج میں تلامیذا رحمان قسم کے شاعر پیدا کر رہے ہیں یا بیہتم الغاؤن نوعیت کے اور پھر آپ کے ”ابگینہ حصار“ میں آپ کی
”الہمانہ گریز“ کا تماشہ دیکھوں گا میں جانتا ہوں کہ یونیورسٹی کے ہر مازم کو ارباب یونیورسٹی کی نگاہ میں اپنے نشیئیں فرد منید ثابت
کرنے کے لئے بہت سی تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں اور جناب احسن عقیقتاً اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے کہ ہر سال مشاعرہ کا
ایک لغو بے معنی ہنگامہ پیدا کر کے اپنے خمدار ندان رزق کے سامنے اپنے وجود کی اہمیت کو ثابت کرتے رہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ
اُن کی اس ”کارگاہ معاشِ فریب“ کو دنیا کیوں برداشت کرے اور اُن کے مصالِح ذاتی پر فرزندانِ ملک کے اخلاق کی قربانی
کیوں چڑھائی جائے۔ اگر جناب احسن سوائے مشاعرہ سازی کے کسی اور خدمت کے اہل نہیں ہیں، تو اس کے یہ معنی تو نہیں
ہو سکتے کہ نوخیز طلبہ میں احسن صاحب کی اہمیت کے لحاظ سے مخصوص ذمہ دیت پیدا کی جائے۔ اور اس طرح نسل کی نسل کو تباہ
وہرباد کیا جائے

دیر کے لیے سلب کر لیتا ہے۔ سیری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ سر چکرانے لگتا ہے۔ اور زمین ایک بت کی طرح خاموش ہو جاتا ہوں۔

یقیناً مسلمانان ہند اس وقت اسی منزل سے گزر رہے ہیں جب ترقی و انحطاط کا نہیں بلکہ صرت ادوی عناصر حیات کے بقا و فنا کا سوال سامنے آتا ہے۔ اس لیے مجھے حیرت نہیں کہ وہ کیوں یہ سوال کہتے ہیں۔ بلکہ عبرت آتی ہے اس منظر پر کہ وہی قوم جس نے دنیا کو جینے کی نہیں بلکہ جلانے کی زندہ رہنے کی نہیں بلکہ زندہ کر دینے کی راہیں بنائیں۔ آج اسی کے افراد اس خوف سے کانپ رہے ہیں کہ کوئی انہیں ہلاکت نہ کرے اگر کوئی کہے کہ سچ کا سچہ جاں بخشی صرف شاعرانہ مبالغہ تھا، تو اسے باور کیا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی دعوت کرے کہ موسیٰ کے یہ بیٹیا کی روشنی صرف ایک افسانہ تھی، تو اس کا بھی یقین ہو سکتا ہے۔ اور اگر کوئی بتائے کہ یلیان کی سطوت شاہانہ محض ایک داستان پابینہ ہے، تو اس کے باور کرنے میں بھی تامل نہیں ہو سکتا۔ لیکن خدا را کوئی بتائے کہ اس کا یقین کیوں کر آسکتا ہے۔ کہ وہ قوم جس کا ایک ایک فرد سچی جان بخشوں اور موسیٰ نور اور فرزند اور سیانہ سطونوں سے بہت بلند دنیا کی جھنڈوں کو بردنے کا لاکر محض انسانی عظمت و جلال پر مہر دوام ثبت کرنے کا دعوت رکھتا تھا، وہ آج انحطاط کی اس منزل پر پہنچ گئی ہے کہ اس دنیا میں فلا مانہ سائنس جیتے ہوئے بھی اس کا کلیجہ ایک مجرم کی طرح کانپ رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ۔

کم ہونے ہیں زمانہ میں لیے بھی انقلاب

آج اگر بودھ اور زردشت کے ماننے والے رام و کرشن کی پوجا کرنے والے موسیٰ و سچے بتعین صفحہ عالم سے محو ہو گئے ہوتے تو جائے حیرت نہ تھی کیونکہ وہ اولیم ندرت و اخلاق جو اب سے کئی ہزار سال قبل دنیا کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ اس درجہ کل نہ تھی کہ وہ زیادہ عرصہ تک ارتقاء انسانی کا ساتھ دے سکتی اور اس لیے اس کو یقیناً بے روح ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن پیر زمان اسلام کا زوال جسے ابھی صرف ۱۳۵۰ سال کا زمانہ گزرا ہے۔ اور جس کی تعلیم کو تکمیل دین اور تمام نعمت سے تعبیر کیا جاتا ہے، یقیناً سخت حیرتناک نہ ہے اور ایک شخص کے لیے یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے اسباب کا سراغ کہاں اور کیوں کر لگا سکتا ہے۔ اسلام کے علاوہ جتنے مذاہب عالم میں گزرے ہیں، ان سب کی تعلیمات۔ دنیا کی طرف سے پہلے خالی الذہن ہو کر پیش کی گئی تھیں، یعنی وہ یہ تو چاہتے تھے کہ انسان حسن اخلاق سے اپنی الہی و قبائلی زندگی کو خوشگوار سبر کرے، لیکن نہ ان کے سامنے انسان کا وہ مستقبل تھا جسے سیاست و تجارت یا دولت و ثروت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور نہ وہ اس اصول ارتقاء کو جانتے تھے جو دماغ انسانی کو ایک جگہ قائم کر رکھنے والی چیز نہیں ہے۔ اور نہ اس کو صرف اسلام نے سمجھا۔ اور دنیا کو سمجھا یا کہ انسان نام گوشت و پوست کا نہیں ہے جو فنا ہو جائے

والی چیزیں ہیں۔ بلکہ انسان نام ہے اس کی فراست و بصارت کا، اقدام عمل کا، نہضت و ارتقاء کا، اور تمام کائنات پر نر زوا یا نہ انداز سے چھا جانے کا۔ اور یہی وہ حقیقت تھی جسے مذہبی زبان میں تشبیہ و استعارت جنت و فردوس، خلود و مسرت، اجناس نعیم، اور کورڈو سلسبیل سے تعبیر کیا گیا۔ آخرت دنیا سے ہمیشہ ایک قوم کا انجام و نتیجہ مراد لیا گیا۔ اور موت کے بعد بقاء کا مفہوم بھی انہیں روایات عروج کو بتایا گیا جو انسان کی حقیقی داستان حیات ہے۔ لیکن چونکہ ترقی و عروج حکومت و ثروت انسان میں ہمیشہ فرد و سرکشی اور انحطاط اخلاق کا باعث ہوا کرتی ہے۔ اس لیے اسی کے ساتھ اسلام نے وہ تعلیم بھی پیش کی جو مادی ترقی کے ساتھ اخلاقی صحت کو بھی قائم رکھتے والی تھی۔ اور وہ تعلیم عدل و مساوات تھی۔ عہد رسالت سے قبل اس نوع کی عملی تعلیم کا وجود کسی زمانہ میں نہیں پایا گیا اور عہد حاضر کی تمام ترقیاں اسی اصول پر استوار ہوئی ہیں۔

پھر قدرتی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دنیا کی تمام ترقیاں اسلام ہی کے وضع کردہ اصول پر قائم ہو رہی ہیں تو وہ مسلمان کیوں اس سے محروم رہے اور ہیں۔ ممکن ہے کوئی شخص اس کے جواب میں تاریخ انسانی کو پیش کر کے مسلمانوں کی گزشتہ ترقی کو بقدر ثبوت سامنے لائے، لیکن مجھے اس میں کلام سے کہہ دینی چھی۔ لڑائیوں نے کوئی ترقی ایسی کی جس کو ہم اسلامی اصول کی پابندی کا نتیجہ بنا سکیں، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کا دور ترقی دو تین سو سال سے زائد قائم نہ رہ سکا۔ حالانکہ اگر اصول ترقی وہی ہوتے تو اسلام سے زیادہ ترقی تھی تو جو ترقی ہوئی تھی اور نہ صرف یہ کہ علیٰ حالہ، قائم رہتی بلکہ آج ساری دنیا پر چھائی ہوئی نظر آتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی اس سبب بہا تعلیم پر کسی نہ کسی حد تک صرف ۳۳ سال تک عمل رہا اور اس عہد کے تحت ثابت ہونے لگی عدل و مساوات کا قانون باطل اٹھ گیا اور اس کی جگہ استبداد و قہرمانیت نے لیلی پھر اس کے بعد مسلمانوں نے جو ترقی کی وہ صحیح اسلامی ترقی نہ تھی بلکہ لوکانہ تسلط تھا۔ جو دنیا کے مختلف حصوں پر قائم ہوا اور چند دن میں اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر فنا ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ جس تعلیم کو پورے تین سو سال بھی بچتے ہوئے نہ لے سکیں نہ ہوں، وہ کیوں نکر دنیا میں استوار ہو سکتی تھی۔ اور کس طرح اس کا اثر قوم کے تمام افراد پر پڑ سکتا تھا، علیٰ الخصوص اس وقت جب کہ اولین وقت اور شاہان عصر کی تمام ستمانیوں اور بے اعتدالیوں کا ساتھ دینے کے لیے ہمارے عمل، ازم کی ساری جماعت موجود تھی اور جو چھوٹی طاقتیں وضع کر کے، لغو و مہمل فقہی مسائل گڑھے گڑھے کر کے، اور کورڈو سلسبیل سے تعبیر کیا گیا، ظاہر ہے کہ جب عہد نبوی سے قریب تر زمانہ میں ہمارے

رہبروں کا یہ حال رہا جو تو زمانہ اب میں اس کی دنات کس حد تک نہ پہنچ گئی ہوگی۔ چنانچہ آپ ہندوستان، ایران، مصر، ترکی، اسپین کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہاں حکمرانی کا انداز کیا تھا اور کیا حقیقتاً ان میں اصول عدل و مساوات پر قانون بہانہ کی بنیاد قائم کی گئی تھی جو اسلام سے بتائے تھے؟ نہ انہوں نے اسلام کی صحیح تعلیم کو سمجھا، نہ انہوں نے قانون و شریعت کے اصول پر نگاہ کی نہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ فطرت اور تمدن کا باہمی رشتہ کیا ہے اور نہ انہوں نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا کہ زمانہ کا راجح دینے کیلئے خود اپنے آپ میں کس قدر تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس کا ہوندر ترقی نتیجہ پیدا ہونا چاہیے تھا، وہی ظاہر ہوا، یعنی اسلام نام ہو گیا، صرف مخصوص لباس و وضع کا مقررہ رسم و رواج کا اور علماء کرام نے اس سادہ فطری مذہب کو، اس دور وحشت کا مذہب بنا دیا جب انسان مذہب کے نام سے صرف علم الاضنام پیدا کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ آج اگر کوئی غیر مذہب والا۔ اسلام کی ان کتابوں کو دیکھے جو ہمارے ہاں کے علماء فقہاء اور محدثین نے تصنیف فرمائی ہیں تو وہ حیران رہ جائے گا کہ کیا انہیں روایات و مسائل کی بنا پر اسلام کو فطری مذہب اور محمد کو خاتم النبیین ثابت کیا جاتا ہے۔ بہر حال اس دور نامرادی میں یہ شکوہ و شکایت بیکار ہے۔ کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔

اب تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آئندہ کے لیے ہمارا ”لا اللہ علیٰ“ کیا ہونا چاہیے جو اس کا جواب تم مولویوں سے نہ چاہو جو تبلیغ کے نام سے نہایت ہی غیر مصلحانہ فضا پیدا کر رہے ہیں۔ نہ ان مدعیان ترقی و اصلاح سے جو تنظیم کانفرنس وغیرہ کی مصرت رساں تحریک سے حکومت کی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔ اس کا جواب خود اپنے آپ سے چاہو، اس جذبہ نشانی سے طلب کرو جو سب سے پہلے انسان کو رشتہ و وطنیت سے وابستہ کرتا ہے۔

مذہب اور مذہبیت کا دور ختم ہو گیا، اب صرف زمانہ وطن پرستی کا ہے۔ اس لیے اگر مسلمان اپنے آپ کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھ کر آگ کی دوسری قوموں سے مل جانا چاہیے اور ہر اس تحریک میں پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا چاہیے جو ملک کی ترقی و آزادی کی ضامن ہے۔ مذہب بالکل ذاتی و انفرادی اطمینان کا نام ہے، اس لیے اس کو مذہبیت اجتماعی کی بنیاد نہ بناؤ اور اس کو استخوان جنگ قرار نہ دو کہ مذہب کی گذشتہ تاریخ پہلے ہی بہت کافی خون سے رنگین نظر آتی ہے اور اس میں اب کسی اور خون کی اضافہ کی ضرورت نہیں۔

جون ۱۹۳۱ء

جس زمانہ میں کانپور کا خونیں ہنگامہ رونما ہوا، میں جبر آباد میں تھا۔ اور انجاریا

کے بیانات دیکھ کر سخت متروک تھا کہ دیکھے یہ فرقہ وارانہ آویزش اس وقت جب کہ ہندوستان کو حصول آزادی کے لئے ایک متحد محاذ پیش کر چکی ضرورت ہے۔ کیا نتائج پیدا کرتی ہے۔ لیکن جب سب آخر میں ٹامس آف انڈیا نے ایک انگریز کے چشم دید واقعات شائع کیے اور ہندوؤں کے ہاتھ سے مسلمان بچوں اور عورتوں کے سفاکانہ و بہیمانہ ذبح و قتل کے حالات معلوم ہوئے، تو میں رات بھر بے چین رہا۔ اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے ایک شدید جذبہ نفرت و انتقام میرے اندر پیدا ہونے لگا۔ اور مقوڑھی ویر کے لئے اس حقیقی معصوم کو بھی بھول گیا جو یقیناً اس نوع کے جذبات سے زیادہ ملن رہے۔

اس کے چند دن بعد جب میں لکھنؤ واپس آیا تو مختلف ذرائع سے واقعی حالات معلوم کر چکی تھی کہ ہندوؤں اور آخر کار خود میں نے کانپور پہنچ کر ان مقامات و مکانات کو دیکھا جن کی تباہیاں و بربادیاں ناصیہ انسانیت کا بدترین داغ کہی جاسکتی ہیں۔ میں وہاں مزدوری پیشہ جماعت سے لے کر حکمران طبقہ کے افراد تک سب سے ملا۔ اور آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا کہ کانپور کی داستان خونین شکل ہی سے کبھی پوری بیان کی جاسکتی ہے۔ اور اس واقعہ نے ناک کی فضا کو جس قدر خراب کر دیا ہے اس کا مداوا آسان نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمانوں نے قتل و ذبح میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یقیناً انھوں نے بھی کافی خون و درندگی کا ثبوت دیا، نکالوں کو جلایا۔ مندروں کو توڑا، انسانوں کو ہلاک کیا، لیکن معصوم بچوں اور بے دست و پا عورتوں کو انتہائی بے دردی کے ساتھ پارہ پارہ کرنے کا فرض صرف ہندوؤں ہی نے محال کیا۔ اور اگر اس ساری داستان میں کوئی ٹکڑا میرے لئے قابل مسرت ہے تو صرف اتنا ہی کہ مسلمانوں نے باوجود انتہائی غیظ و غضب کے کسی ایسی بہمت کا ثبوت پیش نہیں کیا جو ان کی قدیم روایات اخلاق کے خلاف ہو۔ جس طرح بے شمار شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ اگر کسی ہندو نے الحاح و زاری سے کام لے کر جانبری چاہی تو مسلمانوں نے اسے چھوڑ دیا یا کچھ روپیہ دے کر اس کو جانے دیا، اسی طرح متعدد شہادتیں اس تلخ حقیقت کے بھی مل سکتے ہیں کہ ہندوؤں نے عورتوں کو پناہ دینے کے بہانے سے اپنے گھر وغیرہ بلا کر بچوں کے ساتھ اظہار بے دردی کرتے ہوئے ان کے سروں پر دست شفقت پھیر پھیر کر ایسی ہمدردی کے ساتھ انھیں ہلاک کیا کہ سخت سے سخت قلب انسانی بھی اس کو سننے کے بعد کانپ کانپ اٹھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ پھر یہ درندگی صرف شہری تک محدود نہیں رہی، بلکہ بعض دیہات تک پہنچ گئی۔ جہاں عموماً مسلمانوں کی آبادی چند گھروں سے زیادہ نہیں ہوتی، اور یہاں بھی ہندوؤں نے اسی بی رحمی کے ساتھ اپنی جرات کا ثبوت دینے ہوئے بعض مسلمان خاندانوں کو بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کو ذبح کر کے ہمیشہ کے لئے محو کر دیا۔ یقیناً یہ جنگ تعلیم یافتہ افراد کی نہ تھی، یہ بھی سچ ہے کہ دونوں جماعتوں کے

رب و شایعہ لوگ اس میں شریک نہیں ہوئے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے بہت سے برہمنوں
 پجاریوں نے بھی اس میں پورے جوش کے ساتھ حصہ لیا۔ اور مسلمانوں میں کوئی ایک شخص
 ایسا نہ تھا جو کسی طرح کی شرافت حسبِ نسب کا مدعی ہو۔ پھر کیا یہ امر قابلِ غور نہیں کہ ایک طرف
 شریف ترین افراد بھی ضعیفوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے میں دریغ نہیں کرتے اور دوسری
 طرف غیر شریف افراد بھی ایک پناہ چاہنے والے دشمن پر ہاتھ نہیں اٹھاتے، خواہ وہ ان کے کسی عزیز
 کا خون بہا کر کیوں نہ آیا ہو۔ دنیا اس کو جس نگاہ سے چاہے دیکھے، لیکن میں اس میں مسلمانوں
 مستقبل کے لیے ایک عجیب و غریب جھلک امید کی پاتا ہوں اور مسرد رہوں کہ سنو، ان کی وہ
 بصیرت لطف و شفقت جو ایک شجاع قوم میں پائی جانا چاہیے بدستور باقی ہے۔ پھر اگر آئندہ
 ہندوستان میں خانہ جنگی کی نوبت آئی، جس کا مجھے قومی اندیشہ ہے، اور اگر واقعی کسی جنگ
 حقیقی کا یہابی اسی فریق کو حاصل ہو سکتی ہے جو اپنی اخلاقی فحشی کو دنیا سے تسلیم کر سکے، تو میں
 ان کی قسمت کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں اور یقین کامل رکھتا ہوں کہ ان کے مقابلہ میں کبھی وہ قوم
 اب نہیں ہو سکتی، جسکی بہادری کا انتہائی کارنامہ عورتوں، بچوں، اور ضعیفوں کو ذبح
 کیا ہو۔

کابور کے اس دردناک ہنگامہ کی تفصیل فراموش کیا سکتی ہے۔ مندروں، اور سجدوں
 و اوقاتِ انہدام جلائے جاسکتے ہیں، آتش زنی اور غارتگری کے واقعات بھی دلوں سے محو ہو سکتے
 ہیں، لیکن ہندو قوم کی اس داستانِ شجاعت کو کبھی صفحہ تاریخ سے نہیں مٹایا جاسکے گا کہ اس نے مسلمان
 وں کو نیاہ دینے کے بہانہ سے اپنے گھروں میں بلایا، اور پھر مکان کے اندر بند کر کے ان کے بچوں
 بن کے سامنے ذبح کر کے انکو بھی انتہائی بے دردی و شقاوت کے ساتھ تڑپا تڑپا کر ہلاک کر
 دیا، حیران ہوں کہ اگر ایک انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والی جماعت اس نوزح کی ذمہ داری
 اٹالت، اس قسم کا ذلیل کمینہ پن اور اسی طرح کی وحشت و درندگی کا اظہار کر سکتی ہے تو ایک
 نسل سے پیدا ہونے والے بچے اور کن خصوصیات کو لے کر پیدا ہوں گے اور دنیا ان دونوں
 درمیان کیونکر خط امتیاز کھینچ سکے گی۔

کابور میں اس خوزری حکومت نے کیوں جاری رہنے دیا۔ اس پر بحث کرنا بیکار ہے
 دنیا اس کی حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہو چکی ہے۔ اسی طرح یہ جتنو کہ ہندو مسلمانوں میں زیادہ اتان
 اس فریق کا ہوا، اب کوئی معنی نہیں رکھتی، لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں ضرور توجہ کی مستحق ہیں ایک یہ کہ

ہندوستان کی تمام ہندو جماعت نے اس واقعہ کو کس نگاہ سے دیکھا اور دیکھ کر یہ کہ اس ہنگامہ کے نتیجے میں کیا تھے امر اول کے متعلق مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوؤں نے اس وقت میں بیداری سے کام لیا ہی تھا۔ لیکن ہندوستان کے اور ہندوؤں نے بھی اپنی خاموشی اور سکوت سے کام لے کر کچھ کم شقاوت کا ثبوت نہیں دیا۔ میں نے کسی ہندو اخبار یا قلم کار کو اس درندگی پر اظہارِ ملامت کرتے نہیں دیکھا بلکہ برخلاف اس کے جو بیانات ادھر سے دیئے گئے ہیں اور جو رائیں ظاہر کی گئی ہیں، ان میں حقیقت کو چھپانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ ٹھیک جس وقت کانپور میں یہ ہنگامہ برپا ہو رہا تھا، کانگریس میں تمام قائدین کا اجتماع ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں مصروف تھا، لیکن ان میں سے کسی نے اس واقعہ کی اہمیت پر اظہارِ خیال نہیں کیا۔ اور ان ہندو افراد کو کوئی سرزنش نہیں کی گئی۔ جنہوں نے اس کمینہ نظرت کا ثبوت دیا۔

اب رہا دوسرا امر جو اس فساد کے اسباب سے متعلق ہے، وہ کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے اور اس کا اہل برائے معلوم کرنے کے لئے ہم کو اب سے ۲۳ سال قبل پہنچنا پڑے گا جب تک میں مسلمانوں کے وفد کو حدِ اگانہ انتخاب کی لعنت کا طریق مرحمت ہوا تھا۔ یہ حکومت کی اتنی زبردست خیال تھی کہ نہ اس وقت تک مسلمانوں نے اس کو سمجھا اور نہ اب سمجھنے کے لئے طیارہ ہیں۔ یوں تو بہ ظاہر مسلمانوں کے لئے نہایت امید افزا بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ کونسلوں کی نیابت میں ان کا انتخاب بالکل جداگانہ کر دیا گیا اور ان کی آبادی کو اس طرح گویا مخصوص اہمیت دی گئی، لیکن یہ نہ دیکھا گیا کہ یہ رعایت حقیقتاً اسی قسم کی رعایت تھی جو ایک مرہن کے لئے اس کو ایک مضر غذا کھانے کی اجازت دے کر رکھی جائے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم جماعتوں میں آہستہ آہستہ باہم اختلاف پیدا ہونے لگا اور عصبیت و فرقہ واریت مستحکم ہونے لگی۔ پھر چونکہ ہندوؤں کی جماعت یہاں زیادہ ہے اس لئے انکو زیادہ موقع ستانے کا ملا اور چین۔ دنیاں میں عام طور پر مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف سے عدم رواداری اور عصبیت و تشدد کی شکایت پیدا ہونے لگی۔ مسئلہ سے قبل جب حدِ اگانہ انتخاب کا وجود نہ تھا، نہ کبھی ناخوشی و اذان پر جھگڑا ہوتا تھا۔ نہ باجہ اور قربانی پر کہیں نزاع ہوتی تھی۔ کیونکہ ایک کے مفاد دوسرے سے متعلق تھے اور ہر فرقہ مجبور تھا کہ دوسرے فرقے کے ساتھ صلح و آتش سے کام لے۔

پھر چونکہ کانپور میں ہندوؤں کی جماعت تعداد و اقتصاد بہ لحاظ سے زیادہ قوی ہے

یہاں کے مسلمانوں کو زیادہ تکلیفیں پہنچیں اور برابر ۱۳ سال تک وہ ان کو برداشت
 نہ رہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ ابھی اور کتنے عرصہ تک ضبط سے کام لیتے رہتے، اور اگر اسی
 بران میں تنظیم کانفرنس کی ملعون تحریک نے ان کے بذبات کو مشتعل نہ کر دیا ہوتا۔ نساو سے
 لندن قبل کانپور کے گلی کوچوں میں اس کانفرنس کے جلسوں مسلمانوں کی طرف سے نکالے جانے
 تھے اور علامہ ”ہم کفر کی ہستی کو دنیا سے مٹا دینگے“ کے نعرے بلند کیے جاتے تھے۔ پھر اس وقت
 کی تاویل خواہ کوئی کچھ ہی کیوں نہ کرے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں لفظ کفر کے
 عطلاقی معنی صرف ”ہندو دیت“ کے ہیں اور وہ جماعت جو اس نعرہ کو بلند کرتی تھی وہ یقیناً اس
 ہندوؤں کی جماعت کو مراد لیتی تھی۔ پھر چونکہ کلکتہ، بمبئی کے بعد کانپور ہی ایک ایسا مقام ہے جہاں
 خاڑوں کے مزدور کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ہندو مسلمانوں کے درمیان یہاں زبردست
 اور صورت اختلاف کی پیدا ہو گئی تھی اور وہی غیر ذمہ دارانہ جوش جو مزدوروں کی جماعت میں پیدا
 سکتا ہے، یہاں دونوں جماعتوں میں کافی خطرناک حد تک پہنچ گیا تھا۔ ایک طرف یہ تمام
 شے گیراؤہ چیخ ہو چکا تھا کہ سوراخوں سے بھگت سنگھ کو بچاؤشنی پرچیہ بایا گیا اور ہندوؤں میں
 غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ جس وقت ہندوؤں نے بھگت سنگھ کی بچاؤشنی کے خلاف
 ہرہ اور ہرتال کرنے کا ارادہ کیا، ان کا ارادہ براہ راست مسلمانوں پر حملہ کرنے کا نہیں تھا اور
 صرف اس حد تک تشدد برتنا چاہتے تھے کہ ہرتال ہرنج سے کامیاب ثابت ہو۔ چنانچہ وہ لوگوں
 سا نکل سے اتارنے تھے، موٹروں کو روک دیتے تھے۔ ٹراموں کو چلنے سے باز رکھتے تھے، لیکن
 لوجب یہ خیال عوام میں زیادہ وسعت کے ساتھ پھیلا تو فرط جوش میں ہاتھ روڈ پر انگریزی ہال
 مت کرنے والوں کی ددکانوں پر پتھر پھینک گئے۔ اور بعض فرنگیوں پر حملے بھی کیے گئے۔ یہ ایک
 وقت تھا کہ اگر قہری حکومت عسکری حکومت سے کام لے کر اس گروہ کو منتشر کر دینی یا گرفتار لاتی
 ما وہیں کامیاب ختم ہو جاتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ
 کا ایسا نہ کرنا محض اضطراب و بزدلی کا نتیجہ تھا یا کسی اور صلحت کا، بہر حال سبب جو کہ
 عوام کے اس جوش کو بڑھنے دیا گیا، اور جب عین اسی عالم غیظ و غضب میں کسی طرف
 یہ آواز بلند ہوئی کہ مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملہ کر دیا ہے تو ہندوؤں کا رخ حال ہی
 فرنگی آبادی کی طرف سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور آخر کار وہ آگ جو گزشتہ
 سال سے دبی ہوئی چلی آ رہی تھی دفعتاً جھڑک اٹھی اور دنیا بھر کو دیکھ لیا کہ جہاں کا انتخاب

ہندوستان کے لیے کیا کرتیں اپنے ساتھ لایا ہے اور وہ ایک انسان کو درندگی کی کسی حد تک پہنچا سکا اس کے بعد کانپور میں کیا ہوا اس کی تفصیل نہایت دردناک ہے مختصراً یوں سمجھ لیں چاہیے کہ تین دن تک مسلسل وہاں سوائے وحشت و بربریت کے کسی کی حکومت نہ تھی اور ایک از دوسرے انسان کو اس طرح بھاڑ کر کھاتا رہا تو یا جنگل سے بھیڑیوں کی ہجرت شہر میں گھس آئی۔ اور سوائے خون پینے کے انھیں اور کوئی مشغلہ ہی نہیں ہے۔

پھر کس قدر حیرتناک امر ہے کہ بنا رس میں ہندو مسلم فساد رونما ہوتا ہے اور مرزا پور میں ہم آدیش نظر آتی ہے، اور پھر کانپور میں یہ محشر قائم ہوتا ہے، لیکن اب بھی ملک میں بعض ایسے صاحب نام تبصرہ نگاران موجود ہیں جو جداگانہ انتخاب کی حمایت میں آواز بلند کر رہے ہیں اگر یہ لوگ ہمارے دوش میں تو خدا ایسے دوستوں سے بچائے اور اگر دشمن ہیں تو خدا ہم پر رحم کرے کہ ہم یہ سب کچھ جان بوجھ اپنی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں دے رہے ہیں۔

جولائی ۱۹۳۳ء اگر آپ نے کبھی سمندر کے ساحل پر کھڑے ہو کر طوفانی حالت میں پانی کے تہیز دیکھا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تلاطم نام سے سطح آب کے اس ارتفاع کا جو انتہائی حنیض کے بعد رونما ہوتا ہے اور لہروں کا سلسلہ عبارت ہے اسی نشیب و فراز سے، اسی صعود و سقوط سے اور ابھیر کر گرنے اور گر کر ابھرنے سے۔ بالکل یہی حالت ملکوں اور قوموں کے عروج و زوال کی ہے۔ اگر آج کوئی قوم انتہائی زوال کی حالت میں ہے تو سمجھ لو کہ اس کے مستقبل میں بلند پنہاں ہے۔ اور اگر کسی کو بلند ترین نقطہ عروج پر دیکھو تو جان لو کہ اس کا زوال دور نہیں ہے۔ فرق اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ موجوں کا نشیب و فراز ہم کو حلد حلد نظر آجاتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کے لیے قرون اور صدیوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ملکوں کے جزائیں اسی طرح بدلتے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔ قوموں کی تاریخیں اسی طرح بنی ہیں اور بنتی رہیں گی اور آج کے تمام آثار حقیقہ زندہ شہادتیں ہیں فطرت کے اسی انقلاب پسند ذوق کی جو ذرے سے کراہت اب تک ہر جگہ برچھینی ہیں اور ہر وقت یکساں طور پر موثر نظر آتا ہے۔ فائرنگا ہیں آنے والے انقلاب کو بہت پہلے سے دیکھ لیتی ہیں اور جن کی نظر بالغ و دور رس ہے وہ سب سے آخری پردے کے اٹھنے کی منتظر رہتی ہیں۔ روس کی اشتراکیت کی رجحان، اطالیہ کا انقلاب اور بالکل تازہ پیزہ پانی کے دور ملکیت کا خاتمہ یہ سب

آثار و مناظر ہیں جن کا علم ہمیں اس وقت ہو جب یہ رونما ہو کر واقعہ حقیقت میں تبدیل ہو گئے، لیکن جاننے والے پہلے ہی سے جان چکے تھے کہ زار روس کے دور قہرمانیت کو فطرت اس سے زیادہ بڑا نہ کر سکتی تھی قیصرِ روس کے پیمانہ کبر و غرور کا چھلک پڑنا ناگزیر تھا، اٹلی کی دشمنی انسانیت، سیادت مذہبی کا ختم ہو جانا ضروری اور اسپین کے دور امارت کا مٹ جانا بالکل اٹل اور یقینی تھا۔

پھر جو کچھ گزر چکا اس کو گزر جانے دو۔ آؤ دیکھو کہ موجودہ فضا میں بھی تمہیں کوئی آثار اضطراب نظر آتے ہیں، کیا آج کی ساعتوں میں آنے والے کل کے نشانات کا کچھ پتہ ملتا ہے مغرب کی علمی و اقتصادی، سیاسی و تجارتی تفوق کی داستانوں میں شرق نے اپنی اہلیت اپنی استعداد ترقی اور اپنی اخلاقی برتری کی خصوصیات کو ہمیشہ نظر انداز کیا لیکن سوال یہ ہے کہ کس ننگائیوں کی خیرگی کے اسباب اب بھی اسی طرح قائم ہیں، کیا ظاہری نقش و نگار کی خوبیوں سے گزر کر بطوں کی حقیقت کو ہماری نظروں نے اب بھی نہیں پہچانا؟ — وہ چیز جو ہمیں مغرب میں جاہ و ثروت نظر آتی تھی آج اس کے استعماری خط و خال بے نقاب ہیں، وہ یورپ کے ابتر سال دولت کے ترانے جن سازوں کے ذریعے ہم تک پہنچاتے جاتے تھے ان کی بے آہنگی آج کسی سے مخفی نہیں اور اس سر زمین ایجاد و اختراع کے مصالح و معال جس کا نصب العین صرف رہبرنی و قزاقی تھا، آج ویران و برباد نظر آتے ہیں۔ وہ ایلوہائے تجارت جن کا گوشہ گوشہ ہر وقت روپے کی جھنکار سے گونجتا رہتا تھا اب سہماں ہیں۔ وہ کارخانے جہاں عفت پر یکا مشینیں ہر وقت رعد آسا آوازیں بلند کرتی رہتی تھیں ویران و برباد ہیں۔ اور وہ مہکتیں وہ بینک جہاں دولت ہر وقت پانی کی طرح بہتی نظر آتی تھی خاموش و غیر آباد ہیں۔ وہی یورپ جس کے قول کے انانوں نے ہم کو مرعوب بنا رکھا تھا آج اسی کے دولت مند فرزندوں کا یہ حال ہے کہ افلاس سے پریشان ہیں، خود کشی کے لیے آمادہ ہیں، بے روزگاری نے انہیں دیوانہ بنا رکھا ہے اور اس وقت وہاں کا بڑے سے بڑا حکیم و فیلسوف چارہ کار کی جستجو میں نا کام نظر آتا ہے۔

اگر ایشیا تباہ ویران ہے تو جہاں شکایت نہیں کیونکہ وہ جاہل ہے نا تراشیدہ ہے اگر مشرق اور بارتھنل میں مبتلا ہے تو کس کو مجال گفتگو ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ سیاہ فام ہے، غیر مذہب سے، دیوانہ مذہب سے۔

لیکن خسار انکوئی تباہی کے آج یورپ جو اپنے آپ کو مخزنِ علم جانتا ہے جو تہذیب و شایستگی

کے نتائج تحقیق پر تنقید کی جاتی ہے تو وہ سکون دل کے ساتھ اسے سنتی ہے غور کرتی ہے اور پھر از سر نو سعی و عمل، جدوجہد میں مصروف ہو جاتی ہے یہاں تک کہ دنیا کو اس کی صحت و تکمیل پر ایمان لے آنا پڑتا ہے لیکن یہ حضرات اس کے دوسری جماعت کی حالت یہ ہے کہ جب اس کے مفروضات پر گفتگو کی جاتی ہے تو وہ برسہا برس ہو جاتی ہے اور اساطیر الادلین کی تمام حکایتیں منطق و فلسفہ کے تمام مغالطے، خرافیات تاریخی کے جملہ واقعات سامنے رکھ کر جواب دیتی ہے کہ کیا ان کے مقابلے میں کسی کو دم مارنے کی مجال ہو سکتی ہے کیا کوئی انسان اس ذہن و دماغ کا پیدا ہو سکتا ہے جو تحقیقاً باضیہ کے سامنے سالقبون الاولون کے علی الرغم لب کھول سکے؟ کیونکہ نہ اب روح القدس باقی ہے نہ اس کا فیض، اور اس لیے کس کو یہ کہنے کی عزت ہو سکتی ہے کہ

دیگراں ہم بخت سدا انجہ میجای کرد

اس وقت اگر ان دونوں جماعتوں کا صریح و واضح مطالعہ کرنا ہے تو مغرب و مشرق کے علماء کا مطالعہ کیجئے اور اپنی بے بصیری و بیجا رگی پر جتنا ماتم بھی ہو سکتا ہو کر لیجئے کیونکہ اب اس کے بعد کوئی دوسرے منزل فنان تک پہنچنے کے لیے ہم ٹوٹے کرنا نہیں ہے۔

اب سے چند سال قبل تان اہل مغرب کا ایمان تھا کہ اتیتر تمام فضا میں پایا جاتا ہے اور زمین کی کشش بہ وقت کارفطی ہے۔ لیکن ایک شخص نیشٹین نامی اٹھتا ہے اور تمام گذشتہ تحقیقات کو باطل کر کے ایٹھ کے وجود کو مہل اور زمین کی کشش کو لغو قرار دیتا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ اعوجاجِ زماں (متناہوہ معتناہوہ) کا عجیب و غریب نظریہ پیش کرتا ہے لیکن نہ کوئی شخص اسے مردود و ملعون قرار دیتا ہے نہ اس پر مضحکہ اڑاتا ہے بلکہ ہر شخص غور کرتا ہے سمجھتا ہے حتیٰ کہ اس کا جدید نظریہ اضافیت (Relativity) مسلمات میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں ہمارے یہاں کے علماء کو دیکھئے کہ اگر ان سے کہا جائے کہ "ہکدیر سعیدتیر" میں جو دلائل گردش زمین کے ابطال میں پیش کیے جاتے ہیں وہ لغو ہیں " "شکر جعتمنی" میں جو مسائل بہت کے تباہ جاتے ہیں وہ تقویم پاریسی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تو آستین جڑھا لیتے ہیں اور اس کو کفر و الحاد قرار دے کر مذہبِ ہوسائی سے علیحدہ کر دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک اب انسان سے غور و فکر، اختراع و ابداع، تحقیق و اجتہاد کی قوت چھین لی گئی ہے اور وہ نجیور ہے کہ اس سے قبل جو لچے قد نالکھ گئے میں ان پر بے چوں و چہرا ایمان لے آئے۔

حال ہی میں اس ذہنیت کا نہایت پر لطف منظر دیکھنا ہو تو اس بحث کو دیکھیے جو جناب ابو ہریرہ کی موافقت نقل مرتد کی حمایت اور نگار کے مسلسل مضمون ”مطالعہ حدیث“ کی مخالفت میں معلوف اور سچ کے صفحات میں نظر آرہی ہے۔

صفحے کے صفحے اس تحقیق میں صرف کر دیئے گئے ہیں کہ جناب ابو ہریرہ نہایت ذی فہم و ذی ہوش تھے عہد نبوی میں نہ عاقل و بالغ کی حیثیت رکھتے تھے، رجال میں بڑے پائے کے ثقہ راوی مائے جاتے تھے، قہمانے ان کے اقوال کو ہمیشہ صحیح باور کیا وغیرہ وغیرہ، لیکن کسی ایک جگہ بھی مضمون کی اصل روح سے بحث نہیں کی گئی جو ابو ہریرہ پر چرخ کی باعث ہے اور کوئی ضعیف سی وسٹش بھی ان الزامات کے دور کرنے کی نہیں کی گئی جو ابو ہریرہ پر اصولاً و درایتاً روایات و احادیث کی نوعیت کو دیکھ کر دار و مدار دہوتے ہیں گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ وہ رسول اللہ کو صرف ابو ہریرہ کے ذریعے سے سمجھنا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں اگر رسول اللہ کے خلاق پر کوئی حرج آئے ان کی تعلیمات پر اعتراض دار و مدار ہو تو اس کے تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ انتہائی حد ہے اس کو راند قلب و اسلاف پرستی کی جہیں آج کل خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کا مولوی مبتلا نظر آتا ہے۔ یہ یہ گوارا کر سکتا ہے کہ رسول کی تفتیص ہو جائے، اسے یہ تسلیم سے کہ تعلیمات اسلامی مسخ نظر آئیں، وہ یہ منظور کر سکتا ہے، کہ مذہب کا تعلق عقل و فہم سے بالکل نہ رہے، لیکن ابو ہریرہ کو کوئی کے تو یہ اس کی برداشت سے باہر ہے، کیونکہ اس کے نزدیک یہی اک شہر میں قائل رہا ہے

مولویوں کی وہ جماعت جو تصنیف و تالیف سے کوئی تعلق نہیں رکھتی اور صرف تقریر و مواعظ سے جاہل مسلمانوں کو تباہ و برباد کر رہی ہے۔ یقیناً بڑی خطرناک چیز ہے لیکن میرے نزدیک اس سے زیادہ ہلاک و ہجرت سے جو بدقسمتی سے تصنیف و تالیف کا بھی کچھ ذوق رکھتی ہے اور جو خدا معلوم کب سے غیر صلاح ذخیرہ اپنی تحقیقات باطلہ کا فراہم کرتی چلی آرہی ہے۔ ہر چند اس کے اثرات عوام پر تو زیادہ نہیں ہیں لیکن متوسط طبقہ جو کچھ لکھنا پڑھنا سانتا ہے ان کے تصانیف سے برسی طرح اثر پذیر ہوتا ہے اور خود چونکہ اس طبقے میں کوئی اہلیت تفکر و تفتیش کی نہیں ہوتی اس لیے وہ ان موٹی موٹی کتابوں سے جس میں ہر چار سطر کے بعد ایک سطر عربی کی ضرور نظر آتی ہے اور جس کے فنٹ نوٹ میں بیسیوں حوالے خدا معلوم کن کن قدیم و عجیب و غریب کتابوں کے درج ہوتے ہیں مرعوب ہو جاتا ہے، علاوہ مذہب کو کتابوں سے کیا واسطہ، اطمینان نفس کے لیے اس دفتر بے معنی کی کیا حاجت؟ مولوی

آج سے کئی صدی قبل جب مذہب نام نفس و ضمیر کے سکون کا تھا، جب قرآن کا مفہوم ایک مولوی کے مواعظ و ارشاد است
 بلند تھا، جب دین صنیف میں جبراً گراہ کا ذرا سا بھی شائبہ گوارا نہ کیا جاتا تھا، اور جب عمد بنی عباس میں آزادی کے ساتھ ہر شخص کو
 اسلام کا صحیح مفہوم جاننے کیلئے جج و مقید کی اجازت تھی۔ اس وقت کفر و ارتداد کا مفہوم صرف یہ تھا کہ اصول اخلاق کو پس پشت ڈال کر
 انسانیت کی ترقی کو روک دیا جائے۔ لیکن اب یہ معیار بہت بلند ہو گیا ہے، اس قدر بلند کہ میں تو خیر کیا چیز ہوں، اگر آج غزالی اور رازی
 زندہ ہوتے تو ان کا دامن بھی مولوی کے ہاتھ میں ہوتا، گو مولوی کی عبا ان کے ہاتھ... نہ آسکتی، غضب خدا کا، میں بارگاہ چکاہوں کہ خدا
 کی عظمت و جبروت، اور اسکی قوت و قدرت کا اس طرح قائل ہوں کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ہزار بار لکھ چکا کہ رسول کی صداقت بلندی قوت
 پر بطرح میں بیان لایا ہوں شاید ہی کوئی اور ایمان لایا ہو لیکن باوجود اس اقرار کے بھی میں کافر ہوں، محمد ہوں، مرتد ہوں! پھر اگر اسی قول
 و عقیدہ کا نام کفر و الٹا دے تو نازم بہ کافر ہی کہ بہ ایساں برابر است
 دوسری دنیا کی بیدینی مجھے دیدو، تمام عالم کا ارتداد میرے حوالہ کر دو۔ اور کائنات کے ہر گوشہ کا الحاد میرے قلب میں بھرد کر اس وقت کے
 ساتھ تو مجھے جہنم بھی اس فردوس سے زیادہ عزیز ہے جہاں ایک مولوی مسلمان کو کافر بناے بغیر نہیں جاسکتا۔ آہ

ایں چہ شورے ست کہ درد و بر قمری بنیم!!

اس دوران میں ہندوستان کے مختلف مقامات سے زیادہ منظم طور پر میری بیدینیوں کے خلاف تبلیغ و اشاعت کی گئی، یہاں تک
 بعض انجمنوں نے جو مقامی ”مولوی جماعت“ کے زیر اثر تھیں میرے اور نگار کے الحاد کو ناقابل برداشت قرار دے کر نگار کی خریداری سے
 کس کو باز رکھنے کی کوشش کی، صوبہ بہار کے کوئی بزرگ مولوی عبدالحکیم یا حکیم الدین صاحب ہیں انہوں نے اپنے صوبہ کے اخبارات میں
 ایک خطیبانہ مقالہ کے ذریعہ سے اجاد وطن کو نگار کے فتنہ سے آگاہ کر کے اسکے مطالعہ کو حرام و ناجائز قرار دیا۔ یہاں تک کہ ہمیں لکھنؤ میں بعض
 بار قوم و مذہب نے جلسہ کر کے یہ بھی ارادہ کیا کہ میری اس عارضی زندگی ہی کو ختم کر دیا جائے بعض حضرات نے متعدد خطوط اس نوع کی تحریر
 کر سب کے بھی میرے پاس روانہ کئے۔ مقامی اخباروں میں روزنامہ بہت اور ہفتہ وار پتے نے اس کا رٹو اب میں زیادہ اہتمام و توجہ سے
 لیا، الغرض اس دوران میں وہ سب کچھ ہوا جو صحافت و پردہ پانگندہ کی مدد سے ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے ان تمام حلوں کے جواب میں
 برن سکوت سے کام لیا، کیونکہ ان تمام حضرات میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جسے نگار کا بالاستیغاب مطالعہ کرنے کے بعد کوئی راس
 علم کی ہو۔ اور مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ کہا جاتا ہے۔ یہ سب ظن و قیاس اور عوام کی ہوا کا نتیجہ ہے جو ہمیشہ بے معنی ہوا کرتی ہے پھر وہ دہشت
 ان حقیقت ہے اور... میرے خلاف میری ہی تحریر کی غلط تعبیر جو ممکن ہے اصول جنگ کے لحاظ سے ان کی شرع متین میں جائز
 و رویدی گئی ہو جنہوں نے بمصداق ”اس کا ثواب نذر کروں گا حضور کی“ شاید میرے خلاف تبلیغ و اشاعت ہی کے ذریعہ سے اس سال
 دس میں ایک قصرتازہ کی تعمیر کا غم راسخ کر لیا ہے

ہمارے مسٹر عبدالمجید صاحب دریا بادی زبان پر بار خدایا یہ کس کا نام آیا!، نگار کی الحاد پر وہی کا ذکر تو اکثر کرتے رہتے ہیں
 من کیا کبھی کوئی صنیف سی کوشش انہوں نے اس امر کی بھی کی ہے کہ وہ عصیبت سے علیحدہ ہو کر میرے خیالات پر غور فرمائے اور پھر فیصلہ

کہتے کہ میرا حقیقی مقصود، اسلام کی خدمت ہے، اس کی تخریب و توہین۔ مجھے حیرت ہے کہ باوجود اینہم دعوائے ادریت و فلسفہ تصنیف برہمی کے زیر اثر یہ بھی نہ غور کر سکے کہ جن مضامین کے اقتباسات وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں، انہیں ایسا تو نہیں ہے کہ انہیں سے انکی تردید ہوتی ہو۔ میرے بگائی کے دکا ہی مضمون میں خدا کے متعلق جو خیالات پریشان ظاہر کئے گئے ہیں وہ ایک دیوانہ یا مجبوط انکو اس کی طرف سے ہیں جیسا کہ مضمون کی ابتدا میں ظاہر کر دیا گیا ہے اور مضمون سے جو نتیجہ پیدا کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ انسان خدا کو جو چاہے کہ جس اصول کے ماتحت چاہے مطالعہ کرے لیکن آخر کار وہ خدا ہے اور وہی کرتا ہے جو اسے منظور ہوتا ہے۔۔۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس ”وانتہ سکارینا“ کو علیحدہ کر کے صرف ”الافتراء والصلوۃ“ پیش کر نیوالی ذہنیت جناب عبدالماجد صاحب دریا بادی کو کس مدرسہ میں زائونے ادب نہ کرنے سے حاصل ہوئی ہے۔ اسی طرح انھوں نے دوزخ و جنت کے متعلق میرے خیالات کو سمجھنے میں غلطی سے کام لیا ہے لگو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ غلطی قصداً ارادہ کے ماتحت تھی یا تصعب و نا انصافی کی بنا پر۔ میرا مقصود ان مضامین سے یہ تھا کہ جن غلط روایات کی بنا پر دوزخ و جنت کا مفہوم عام طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ کس قدر مضحک اور اسلام کی شان کے منافی ہے۔ پھر جب تک کہ جناب دریا بادی یا انھیں کس طرح کوئی اور حامی دین یہ نہ ثابت کر دے کہ واقعی دوزخ و جنت کا تعلق مادی لذات سے ہے، اس وقت تک میرے ان مضامین کو توہین مذہب یا مخالفت اسلام کی صورت میں کس طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔

یہ کہنا بھی سخت غلط بیانی ہے کہ میں امام بخاری کا مخالف ہوں۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ نہ صرف بخاری بلکہ تمام کتب حدیث بحالت موجودہ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر کلیتہاً اعتماد کر کے کسی مذہب کے اصول کو پیش کیا جاسکے علی الخصوص مذہب اسلام جو دنیا کا تہما فطری مذہب ظاہر کیا جاتا ہے۔ کیا جناب دریا بادی کے پاس اس امر کا کوئی ثبوت ہے کہ صحاح ستہ میں صحتی احادیث درج ہیں واقعی وہی ہیں جو انکے جامعین نے فراہم کی تھیں اور ان میں بعد کو تیس دو تحریف، حذف و اصفافہ کچھ نہیں ہوا۔ یقیناً اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا ہے اس لئے میری مخالفت نہ امام بخاری سے ہے نہ انکے مجموعہ احادیث سے بلکہ صرف اس خیال سے کہ کیوں جو تفسیر فقہ کے ہر قول کو رسول اللہ سے منسوب کر کے مذہب و رسول کی توہین کی جائے اور کیوں ایک ایسے شخص کو جو بغیر سمجھے ہوئے احادیث کو احادیث ماننے کیلئے بناوینے کا مذہب کا مخالفت قرار دیا جائے۔ بخاری کے درس سے ترک مذہب کا درس اسی لحاظ سے کہا گیا کہ یہ حالت موجودہ اگر شروع سے لیکر اخیر تک تمام احادیث کو صحیح تسلیم کرنے پر انسان کو مجبور کیا جائے تو اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ مذہب کا خیال ترک کر دے گا۔ اور اگر ایسا نہ کرے گا تو پھر وہ جس مذہب کا پیرو ہوگا اُسے اسلام تو کسی طرح نہیں کہہ سکتے اور جو نام چاہے اس کا قرار دے لیجئے

اسی طرح جناب عبدالماجد صاحب نے ۲۵ ستمبر کے پیج میں میرے خلاف اور جو الزامات قائم کئے ہیں وہ سب تحریف مفہوم کا نتیجہ ہیں۔ اور میرے مقصود سے بالکل علیحدہ۔ میں نے جن اکابر ملت کی طہارت و عصمت کی داستانوں کا ذکر کیا ہے۔ ان سے مراد صرف آجکل کے بعض ایسے نام نہاد علماء کرام ہیں جو صداقت کو مخور کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اور جن کا باطن انکے ظاہر سے بالکل مختلف ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سلسلہ میں انھوں نے اہل صنیفہ وغیرہ کو کیوں شامل کر لیا، کیا سہارت کے سیاق و سباق سے وہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ میری مراد اکابر ملت سے کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اگست ۱۳۳۲ھ کے ملاحظات میں اپنا ذکر دیکھا کہ وہ بیتاب ہو گئے۔ اور فرط غضب میں

محض انتقام لینے کے لئے انہوں نے میرے فقرہ کا محل بدل کر خواہ مخواہ ایسے منی پیدا کئے جو لوگوں کو مشتعل کر دینے والے ہوں۔

پھر یہ سب کچھ جانے دیجئے میں مانتا ہوں کہ جو کچھ میں لکھتا ہوں یا جو مضامین ”نگار“ میں شائع ہوتے ہیں وہ کیسے الحاد و شرک ہیں۔ لیکن خدا نا کبھی ان کا جواب دینے کی بھی توسی فرمائیے۔ میرے اضطراب کو تو دور کیجئے۔ فرض محال یہ بھی مان لیجئے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ غیر مسلم ہونے کی حیثیت سے کہتا ہوں، تو کیا آپ کا فرض یہ حیثیت ایک مسلم ہونے کے یہ نہیں ہے کہ میرے شہادت کو دور کریں جگے راہ راست پر لائیں۔ یا یہ فرض صرف اس طرح پورا ہو جاتا ہے کہ مجھے متحد و مرتد بنا کر خدا کے حوالہ کر دیا جائے۔ اور نگار کے مطالعہ کو حرام قرار دیکر میری تاریک ذہنیت میں اور اصنافہ کیا جائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ یہ کس نوع کی خدمت اسلام ہے یہ کس انداز کی تبلیغ ہے تمام رسائل میں صرف معارف ہی ایک رسالہ ایسا ہے جو کبھی کبھی جواب دینے کی زحمت گوارا کرتا ہے۔ اور محض ”دکھڑگی“ کو ذریعہ حرب و دفاع قرار نہیں دیتا، لیکن افسوس ہے کہ نگار میں جس نقطہ نظر سے گفتگو ہوتی ہے۔ اس سے وہاں بھی اعتنا نہیں کیا جاتا اور اس لئے میری قشتہ کامیاں بدستور باقی رہتی ہیں

میرا دعویٰ یہ ہے کہ تمام مذاہب عالم میں، اسلام ہی صرف ایک مذہب ایسا ہے جو وقت و زمانہ کا ساتھ دینے والا ہے۔ اور یہی ایک تمنا مسلک ہے جس نے اخوت عامہ اور انسانیت کبریٰ کو منزل حقیقی ترار دے کر پیاری دنیا کو اشتراک عمل کی دعوت دی، اور اسی اعتقاد و یقین کے ساتھ میں تمام اصول و شعائر پر نگاہ ڈالتا ہوں۔ یوں تو ایک سو لوی بھی بظاہر یہی کہتا ہے کیونکہ حسب تکاب وہ یہ دعویٰ نہ کرے مذہب اسلام کا امتیاز اور اس کی ہمہ گیری کیونکر ثابت ہو سکتی ہے، لیکن جب وقت اصول و عقائد، شعائرہ عمل کا سوال آتا ہے تو پھر اس کا چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ جو یقیناً کسی پیر و اسلام کا نہیں ہو سکتا

اس لئے اس وقت جو برہمی علماء کرام کی میرے خلاف ہے، اس کا سبب حقیقتاً یہ نہیں ہے کہ میں اسلام کا مخالف ہوں۔ بلکہ اس کا وجہ صرف یہ ہے کہ میں کیوں انکے سامنے سر بہ سجود نہیں ہوتا، اور میں کیوں اسلام کو ان کے عقول کا پابند نہیں سمجھتا جن حضرات نے کار کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں اگر اسلام نام صرف یزداں پرستی کا ہے تو اس کے متعدد شواہد اس میں نظر آسکتے ہیں، لیکن اگر اسلام کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اب پھر کہتا ہوں اور فاش و بربلا کہتا ہوں میں ہرگز مسلمان نہیں ہوں اور نہ دنیا میں کوئی انسان مسلمان ہو سکتا ہے

آج زمانہ جس دور اضطراب سے گزر رہا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ پھر کوئی بت شکن نبی پیدا ہو۔ بلکہ وہ یہ پاجتا ہے کوئی مذہب شکن رسول آئے اور اس نیا سے اس نہ ہیت کی گرا بناری کو دور کر دے جس نے دنیا کا امن سکون غارت کر رکھا ہے پھر اگر آپ

باب الاستفسار

(سلسلہء سابق)

جوش ملیح آبادی اور ان کی بعض حرکات مذبحی

گزشتہ ماہ کے باب الاستفسار میں علی اختر اور جوش کی شاعری پر جو اظہار خیال کیا گیا تھا وہ حقیقتاً صرف تہیدی تھا اس تفصیل و تشریح کا جس کے بیان کو میں فی الحال منوی رکھتا اگر تنقید مذکور کی اشاعت پر جناب جوش کی بعض حرکات کی بجھے اس سلسلہ کو بہرہ جاری رکھنے پر مجبور نہ کر دیتیں۔

قبل اس کے کہ میں اصل مدعا کی طرف آؤں بطور مقدمہ چند ایسے واقعات کا اظہار ضروری ہے جس سے معلوم ہو سکے گا کہ تنقید جناب جوش کے لئے کیوں اس درجہ تلخ و ناگوار ثابت ہوئی۔

یہ حقیقت شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ جوش اُس بلند سطح کے شاعر نہیں ہیں جو "ستائش وصلہ" یا "قادر حسین" نزل سے گزر کر صرف اپنے مذہب احساس شاعرانہ پر مست و بچہ درہا کرتے ہیں، بلکہ ان کا شمار اُن ادنیٰ سطح کے شاعروں میں ہے، جن کی شاعری کو ذرا بعد "عزت و شہرت" سمجھ کر ہی مفہم ایک خاص پر دو پا گنڈا میں مصروف رہتے ہیں اور اگر کوئی چیز ان کی ان اتنے لاکھ عمل میں کبھی خائل ہو جاتی ہے تو ان کے کرب و تکلیف کا وہی عالم ہوتا ہے جو ایک سود خوار مہاجن کا جب وہ رقم کو ٹو و بنتا ہوا محسوس کرے۔۔۔ حیدرآباد پہنچنے سے قبل جن جن ذرائع سے انھوں نے اپنی شاعری کی نمائش کی ان کا اظہار اس وقت ضروری نہیں، لیکن حیدرآباد جا کر انھوں نے جو طریق کار اپنی نمود و شہرت کے تمام ذوق کیلئے کیا اس کا مختصر بیان یقیناً ضروری ہے کیونکہ وہ اس داستان کی ایک ضروری کڑی ہے۔

اب سے تقریباً ۱۰-۱۱ سال قبل جب جوش صاحب عا د الملک مرحوم کے نام ڈاکٹر اقبال کی تحریر سفارش لیکر آبا و پونے تو ایک شاعر ہی کی حیثیت سے وہ روخناس ہوئے اور چونکہ شاعر ہونے والی اہلہ ادبی حیثیت کو تسلیم نہ کرنے کے لئے کسی ایسی ہی خدمت کی جستجو ہوئی جو "ادب و انشاء" سے تعلق رکھتی ہو اور اس طرح آخر کار وہ وہاں کے مترجمہ میں ادبیات انگریزی کی مترجم کی حیثیت سے فخر ہو گئے۔ جوش لاکھ پر خود غلط انسان ہوں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ مفوضہ کی اہمیت و دشواری کے مقابلہ میں اپنی نااہلیت کا علم نہ رہا ہو۔ کیونکہ وہ شخص جس نے انگریزی زبان لکھ اسکول کی چند ابتدائی کتابوں سے زیادہ نہ کیا ہو، جو عربی فارسی کا کوئی علم نہ رکھتا ہو اور جو اردو میں ایک بھی سنجیدہ و شایستہ نثر کا نہ لکھ سکتا ہو، ظاہر ہے کہ وہ انگریزی ادبیات کو اردو میں کیونکر منتقل کر سکتا ہے۔ اس لئے میں نے اس کی کو صرف اپنی شاعری کے پر دو پا گنڈا سے پورا کرنا چاہا اور کوشش کی کہ ان کی شاعری کا اثر وہاں کے

لوگوں پر بس درجہ قائم ہو جائے کہ ان کی اہمیت طازمت کا سوال اگر کبھی اٹھے ہی تو بے نتیجہ رہے، چنانچہ انہوں نے وہاں کی ہر ادنیٰ و اعلیٰ صحبت و مشاعرہ میں جا جا کر، لوگوں کے گھروں پر پہنچ کر راستہ چلتے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اور محبوب کی مہندی سے لیکر ہمدی کے آستانہ محبوب تک ہر جگہ اپنی شاعری کی نمائش شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ پھر وہاں میں یہی بھی پھر اپنا نشان چھوڑ جاتی ہے چہ جائیکہ انسانی کوشش، کوئی وجہ نہ تھی کہ اس تبلیغ و اہتمام کا کوئی اثر نہ ہو اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتے۔ پھر چونکہ تحفظِ شہرت میں ہمیشہ سابقت کا کھٹکا انسان کو لگا رہتا ہے اسی لئے جوش صاحب نے اپنی کارگاہ عمل کو صرف بیجا نمود و نمائش ہی کی حد تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اسی کے ساتھ انہوں نے وہ بھی کیا جو ہر ناقص و نااہل کا شعار رہا ہے یعنی انہوں نے دوسروں کی برائیاں بھی شروع کر دیں اور اپنے نقائص کو وہ اس حد تک کھینچ لے گئے کہ ایک طرف خود اپنے استاد جناب عزیز لکھنوی پر کتہہ چینیوں شروع کر دیں تو دوسری طرف اپنے محسن ڈاکٹر اقبال کو ایک جھک مارنے والے «شاعر سے زیادہ حیثیت دینا انہوں نے گوارا نہ کیا حالانکہ فنِ شعر میں جو علم و مرتبہ عزیز و اقبال کو حاصل ہے وہ جوش کو سوا بارہم مر کر جینے کے بعد بھی میسر نہیں آ سکتا۔

اتفاق سے ان کے حیدرآبادی صلحہ احباب میں جس سے وہ اپنی شاعری کی داد حاصل کیا کرتے تھے ایک شاعر علی اختر بھی تھے جو بہ اعتبار زمانہ بر چند جوش سے مقدم تھے، لیکن دنیا ان سے واقف نہ تھی کیونکہ وہ نہ بروپا گنڈا کے فن سے آگاہ تھے، اور نہ وہ اپنی شاعری کو ذریعہ شہرت قرار دینا پسند کرتے تھے۔ مخصوص صحبتوں میں یہ بھی جوش صاحب کو اپنی نظیں سنایا کرتے تھے اور جوش صاحب کی ظاہری «واہ واہ» کو انتہائی خلوص پر محمول کرنا خوش ہو لیا کرتے۔ اسی حال میں ایک زمانہ گذر گیا اور جوش صاحب سرزمینِ دکن میں «اتا و لا خیری» کا دم بھرا رہے۔ لیکن چونکہ قدرت دنیا میں کسی استعداد کو زیادہ عرصہ تک گوارا نہیں کر سکتی اس لئے وہ وقت آیا کہ قدرت کبر و غرور کا سر نیچا کرنے کے لئے اسباب فراہم کرنا شروع کر دیے اور غالباً ستمبر ۱۹۳۳ء میں مولانا ہوش بگرامی نے اولیٰ مرتبے ذریعہ تحریر جناب علی اختر کی شاعری کی طرف متوجہ کیا اور ان کی ایک نظم بھی روانہ کی۔ یہ واقعہ ہے کہ مشکل ہی سے کوئی نظم میری توجہ اپنی طرف مائل کر سکتی ہے لیکن علی اختر صاحب کی اس نظم میں، میں نے ایک خاص سنجیدہ و متانت پائی، اور میں نے مختصر الفاظ میں اس کی داد دیتے ہوئے نگار میں شائع کر دیا اور علی اختر صاحب کو متوجہ کیا کہ قدرت کی اس ودیعت کو وہ نایگان نہ جانے دیں اور ملک میں اپنے خیالات کی افشاحت کریں کہ اس وقت ضرورت اسی نوع کی شاعری کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے نگار میں مسلسل نظیں لکھنا شروع کر دیں اور پھر گذشتہ چار ماہ سال کے اندر ملک کے اکثر جہاں رسایل میں ان کے افکار شعری شائع ہونے لگے۔

اول اول تو جوش صاحب نے علی اختر کے ظہور کو سمجھی بات سمجھا، لیکن جب رفتہ رفتہ لوگوں کے دل و دماغ اس طرف زیادہ متوجہ ہوتے نظر آئے تو ان کا نقشہ اُترتا اور انھیں اندیشہ پیدا ہوا کہ یہ زبردست مگر کیا

نئی جگہ سے انھیں متزلزل نہ کر دے۔ ورنہ انھیں لیکہ علی اختر کی شاعری کوئی کاسہ گداہی نہ تھی کہ بھیک کی تقسیم کا اندیشہ نہ صاحب کو اس کے توڑ دینے پر مجبور کر دیتا، لیکن وہ آتش رشک و حد جو ہمیشہ ایک غیر کامل الفن شخص میں بہت جلد رک اوٹھتی ہے، جو ش صاحب میں مشعل ہو کر رہی اور تمام تعلقات مودت و خلوص کو بالاسے طاق رکھ کر انھوں نے اختر کے خلاف لوگوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ ”ان کی شاعری کی بنیاد تو صرف میری نظموں کا سرقہ و اخذ ہے“ ان کے ساتھ انھوں نے یہ کوشش بھی کی کہ ایک پمفلٹ کے ذریعہ سے یہ پروپاگنڈا کیا جائے، چنانچہ جوش صاحب خود جاگہ سے نکل کر گزشتہ جلد میں اسی غرض سے لیکے، لیکن بعض احباب کے مشورہ سے یہ خیال ترک کر دیا گیا۔ علی اختر اسب کو مختلف ذرائع سے یہ خبریں پہنچتی رہتی تھیں، لیکن وہ کبھی اس کا یقین نہ کرتے تھے کہ جوش سے ایسی منافقانہ بات سرزد ہو سکتی ہے الغرض جوش صاحب کے اس پروپاگنڈا کو بھی کافی زمانہ گزر گیا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ جب گزشتہ ماہ ستمبر میں حیدرآباد پہنچا تو متعدد حضرات نے مجھ سے زبانی و تحریری استفسارات اس باب میں کئے اور میں نے نومبر ۱۹۲۱ء کے نگار میں مختصراً ان استفسارات کا ذکر کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ دسمبر میں اپنے خیالات علی اختر اور جوش کی شاعری کے متعلق ظاہر کروں گا۔ اس خبر کا شائع ہونا تھا کہ جوش صاحب کے ایوان شاعری میں ایک نزلہ نسوس ہوا اور سنبھلے اور بہت سے وسائل دفاع کے ایک ذریعہ انھوں نے یہ بھی اختیار کیا کہ میری تنقید شائع ہونے قبل ہی وہاں کے ایک مقامی اخبار (صبح دکن) میں جس کے ایڈیٹر کو جناب جوش کے ”ہم پیالہ“ ہونے کا فخر حاصل ہے، مقالے کے عنوان سے ایک غیر متین نوٹ شائع کر دیا جس میں مجھ پر بہت سے تعلقے کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا تھا کہ اس وقت تک حیدرآباد میں کوئی سوال علی اختر و جوش کی شاعری کے تقابلی کا پیدا نہیں ہوا اس لئے ایڈیٹر نگار کا اس مسئلہ کو چھیڑنا صرف اس لئے ہے کہ دستوں کے درمیان مخالفت پیدا کی جائے۔

اور اگر کوئی شخص اس تقابلی کا خیال بھی کرے تو حتمات ہے کیونکہ علی اختر کا جوش کے مقابلہ میں نام لینا ہی درست نہیں ہے اس نوٹ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، کیونکہ مجھے تو اعتماد تھا اپنی تنقید پر جو دسمبر کے نگار میں آنے والی تھی اور پتا تھا کہ اس نوع کے ”قیل و قال“ سے کیا وہ پتھر بٹایا جاسکتا ہے جس کے اندیشہ نے جوش صاحب کو اس قدر اہم سمجھ کر رکھا ہے۔

آخر کار دسمبر کا نگار شائع ہوا اور اس کے دیکھنے کے بعد جو جو مذہبی حرکات جوش صاحب سے سرزد ہوئیں وہ مستقل بیان کی محتاج ہیں۔ سب سے پہلے تو انھوں نے میری بیچ میں ایک نظم لکھی جس میں مجھے ”بدشوار“ بدخصال“ ”پولیس کا شیل“ وغیرہ کے مہذب الفاظ سے یاد کیا گیا تھا، لیکن انسوس ہے کہ اس نظم کی اشاعت کی جرات ان کو نہیں ہوئی، اور پھر اس خیال سے کہ کہیں یہ مسئلہ تنقید ان کی شاعری کو اور زیادہ بے نقاب نہ کر دے، انھوں نے علی اختر صاحب کو ایک عہدہ بھیجی جس میں اپنے انتہائی خلوص کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے اختر اذ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ مدعا یہ تھا کہ

کلی اختر صاحب خود مجھے اس سلسلہ کے غم کو دینے پر مجبور کریں لیکن چونکہ جوش صاحب کے صحیح خط و حال علی اختر صاحب بالکل ظاہر ہو چکے تھے اس لئے یہ آڑی حیران پر کارگر نہ ہوا اور علی اختر صاحب نے وہ کمرہ میرے پاس بھیج دیا۔
بیچنے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

میاں لڑکے غم کن ہاتھوں میں کھیل رہے ہو، ان ہاتھوں کو تمہیں مس کرنے کا کوئی حق نہیں، یہ بات ناپک ہیں، اچھے بچے، تم اس گود سے آزاد یہ کھلائی بڑی علامہ ہے، تمہیں بڑی بڑی باتیں سکھا دیں گی، — سنا ہوں تم اس معنوں سے بہت خوش ہو، پھولوں نہیں سماتے، اس معنوں کے کھلونے کو تم نے لیے پھرتے ہو، یہ دیکھو ہمارا اچھا اچھا کھلونا، اتانے دیا ہے، اور کھیلنے کھیلنے اکثر معنوں بھی لکھتے ہو۔ استفسار اللہ۔ تم جانتے ہو یہ ساری اچھل کود کس بات کی ہے؟ میاں آنکھیں کھولو، یہ بھاری مثبت نہیں، میری عداوت ہے، چہ نسبت علی تمکھے ہو، وہ بغض معاد یہ ہے، کچھے؟ میری نہیں سی جانی! کچھے؟

ارے یہ معنوں۔ یہ معنوں، تو بہ تو بہ، لکھنے والے نے اتنا جلی انتظار نہیں کیا کہ جوش پر آیا ہوا غصہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو کھوں، وہ نہ معنوں کی غایت ہی مفعود و معدوم ہو جائیگی، کیا اہل دنیا اتنے آلو کے چٹھے ہیں کہ اس معنوں کی روح تک آن کی آن میں نہ پہنچ جائیں گے، ادب کان کھڑے کر کے یہ سوال نہ کر بیٹھے کہ یہ دیوانے کو کسے چھیر دیا ہے کہ غصے میں جنیں مار رہا ہے؟ کیا تم نہیں دیکھتے کس معنوں میں عداوت کی آگ بھڑکی ہوئی ہے، سطوں غصے سے آڑی نظر آ رہی ہیں، الفاظ کا منہ تھمایا ہوا ہے، وارے کف در دہاں ہیں، اور کشیش، بار غیظ سے دُہری ہوئی چلی جاتی ہیں۔

اس معنوں کی علت یہ ہے کہ (۱) اس خطا پر کہ میں صاحب معنوں کو خیر و فردو مایہ کھتا ہوں، مجھے نظروں سے گرا دیا جائے (۲) میری ادب بھاری جدائی ہو جائے، یہ دوسری مٹا دینا بھاری کچھ میں نہ لے، اسلئے کہ تم اس بے پایاں خواہشات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ بعض لوگوں کو دو دستوں میں نفاق ڈال دینے سے مرزا آتا ہے،

میاں اختر تم جانتے ہو میں بھارا ہیضہ سے ملح رہا ہوں، میں تمہارے شاعرانہ جوہروں کا دل سے قدر ماں ہوں، اور میرا ہونگا میں تمہارا ہوں، تم میرے ہو، — اچھے بچے! یہ تحریر جا کر صاحب معنوں کے مفہ پر مارے جوش کی یہ خور ہے، وہ مجھ سے جدا نہیں ہو سکتا ہم اتنے بوندے نہیں کہ ایک کو ایک پر ترجیح دینے سے ہم تقابلیں مانتے لگیں، ہب ہب ہر کرنے لگیں۔ شاعری ان اہل معنوں باڑیوں سے بہت بلند ہے، اگر شاعری کسی کو لیکر آ رہی ہے تو کوئی قوت اسے گرا نہیں سکتی، جاہد چکنا رہتا ہے، کتے بھونکتے رہتے ہیں، البتہ اگر کسی کی شاعری ہی کمزور ہے تو تمام دنیا کی بھرتیاں اس کے لئے بیکار ہیں، اسے گرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ صاحبزادے، تمہیں مجھے کوئی چھین نہیں سکتا، میں کبھی تمہارا عقابہ نہیں کر دگا، خاک کھاؤں، دھول کھاؤں، کچھا بچے کو کھا جاؤں، کیا میں اُن بو سے ہی گیا کھلا ہوں،

نیاز مستند جوش "ناہتہ دوم"

ارے ہنسی کے مارے دم نکلو جاتا ہے، "ناہتہ" "ناہتہ" ات کوئی لنگڑاے ڈالتا ہے، ارے مرزا مرزا، یہ بغض آواز کس سے آ رہی ہے، دیکھو کوئی ایٹونی تو جیاں تم تسلیم نہیں ہو رہا ہے،

آپ نے دیکھا یہ ہے کہ ہر اُس شاعر اعظم کی جو اپنی ادبیت و انشاء کا اتنا زبردست پر و پاگنڈا دنیا میں کر رہا ہے۔ یہ ہے عبارت اس شخص کی جو حیدرآباد ایسی عظیم المرتبت و مردم شناس ریاست کی ایک علمی اکادمی میں تصحیح عبارت و درستی انشاء کے لئے "ناظر ادب" کی حیثیت سے مامور ہے، یہ ہے انداز بیان اس فاضل بے بدل کا جو دقیق ترین علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ درست کرنے کے لئے متعین ہے، اور یہ ہے شاہکار اُس ادیب جلیل کا جس کی فصاحت و بلاغت سے متمتع ہونا جامعہ عثمانیہ ایسی تہمت پر نشان درگاہ کے "شعبہ تصنیف و تالیف" کے لئے ازل سے مقوم ہو چکا تھا اس تحریر کی سنجیدگی و متانت کا مرتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ اس پر اظہار رائے کیا جائے اور نہ جوش صاحب کی طرح بغیر حد و درجہ مجبوری کے ذاتیات میں پڑنا میرا شعار ہے۔ البتہ اگر انھوں نے اسی قسم کے خیالات ظاہر کر کے جرات پھر کبھی کی تو پھر بیشک میں آزاد ہوں گا اور جوش صاحب کو اس وقت سے ڈرنا چاہئے جب میں اپنی تمام مخلوقات ان کی حیدرآبادی زندگی کے متعلق ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاؤں کیونکہ مجھے ان کے اخلاق بلند کے وہ تمام حالات بھی معلوم ہیں جنہوں نے ان کے احباب کے دلوں میں ناسور ڈال دیے ہیں اور ان کے یہ خیالات بھی میرے علم سے باہر نہیں جن کا اظہار وہ حیدرآباد کے بعض نہایت ہی اوجھے گھرانوں اور عظیم ترین شخصیتوں کے متعلق "بسا فرخاؤں" اور عام جلسوں میں بیٹھ کر کیا کرتے ہیں۔ یقیناً میں اُن کی نگاہ میں حقیر و فرود یا یہ ہوں لیکن اس کے اظہار سے ان کو ڈرنا چاہئے تھا کیونکہ اگر ان کے اخلاقی کارنامے کسی وقت دنیا کے سامنے آگئے تو پھر خود جناب جوش کے لئے "حقیر و فرود" کے علاوہ وہ کون سے مناسب الفاظ ہوں گے جن سے دنیا اُن کو یاد کرے گی

اس قدر لکھنے کے بعد اب میں ان کی شاعری کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ کس کس قسم کی غلطیاں ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

دسمبر کے شمارے میں ایک عمومی تبصرہ جوش کی شاعری پر کرتے ہوئے ظاہر کر چکا ہوں کہ ان کے کلام میں عمق کم ہے اور سطح زیادہ، یعنی وہ الفاظ تو یقیناً نہایت پاکیزہ جمع کر دیتے ہیں لیکن ان سے کوئی مفہوم ایسا پیدا نہیں ہوتا جو دماغ انسانی کو جا کر مس کرے۔ زندانہ جوش و سرستی کی ان کے یہاں کمی نہیں، خیال کی دلشکنی و دلآویزی بھی کافی پائی جاتی ہے، لیکن سنجیدگی و متانت، تصویر می عمق اور معنوی وزن کی بہت کمی ہے، اس لئے ان کے شعاریں اکثر و بیشتر وہی غلطیاں نظر آتی ہیں جو اچھے الفاظ کی جامع کر دینے والے شاعروں کے کلام میں عموماً پائی جاتی ہیں۔ وہ تو ایک خاص جوش کے عالم میں اپنی جگہ ہی سمجھتے ہیں کہ مفہوم ادا ہو گیا لیکن چونکہ سننے والا صرف الفاظ کی مدد سے مفہوم تک پہنچنا چاہتا ہے اور الفاظ اس مقصد میں اس کے مساعدا نہیں ہوتے۔ جوش صاحب کے یہاں اس قسم کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ان کا ایک شعر۔

مے ناز کی نزدیک سے پھلکا کے دم رقص بود در سے مہکی ہوئی زلفوں کی سگھادی

پہلا مصرعہ بالکل گھنوی وضع کا ہے کہ پہلے تو نازداد کو لے قرار دیا اور پھر اس کو چھلکتا ہوا دکھایا۔ اس کے
 اگر اس مصرعہ کا لقص و تکلف علیحدہ کر کے پورے شعر کو صاف الفاظ میں سمجھایا جائے تو یوں کہیں گے کہ۔
 ”نزدیک سے اس نے رقص کر کے دور سے ہنسی بولی زلفوں کی نگاہی“
 اور اس طرح اس شعر کا اہمال ظاہر ہے۔ علاوہ اس کے بوقریب سے نگھائی جاتی ہے نہ کہ دور سے اور ناز رقص
 دور سے زیادہ لطف دیتا ہے نہ کہ قریب سے۔ اگر یوں کہا جاتا کہ ”دور سے عشوہ رقا صانہ دکھایا اور قریب آکر زلفوں
 کی بونگھادی“ تو بیشک درست ہو سکتا تھا۔ چھلکائے کے بجائے اگر چھلکا دی کہا ہوتا تو اتنا لقص نہ پیدا ہوتا۔
 اسی نظم کا دوسرا شعر یہ ہے۔

سر نشہ میں تھوڑا سا جھکا اور اٹھی آنکھ

گویا درمیانہ کی زنجیر ہلا دی

شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ ”نشہ کی حالت میں سر جھکا کر کسی کا نگاہ اٹھا دینا گویا درمیانہ داکر دینا ہے لیکن
 دوسرے مصرعہ سے یہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ درمیانہ کی زنجیر ہلانے اور درمیانہ داکر دینے میں جو فرق ہے وہ اہمال
 سے مخفی نہیں۔

اس نظم کا آخری شعر ملاحظہ ہو۔ پیانہ تراگرم رہے جوش کہ تونے

رندوں کو شب قدر کی تسویر دکھادی

پیانہ تراگرم رہتا بالکل خلاف محاورہ ہے۔ محفل دہزم کے لئے لفظ گرم استعمال ہوتا ہے نہ کہ پیانہ کے لئے۔ پہلا
 مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا

ساغر تراگردش میں رہے جوش کہ تونے

ایک نظم انھوں نے صلیح کی رات پر لکھی ہے۔ اس کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:-

حریم صلیح میں قائم تھا ایک مرکز پر

مزاج عشق و تقاضاے حسن عربہ جو

اس شعر میں بھی الفاظ تو نہایت پاکیزہ جمع کر دیے گئے ہیں لیکن مفہوم کا کہیں پتہ نہیں۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ
 حسن و عشق دونوں آشتی پسند حالت میں تھے، لیکن شعر سے اگر کوئی مفہوم بُری کوشش و کاوش کے بعد پیدا ہوتا ہے تو
 اس کے بالکل مخالف۔ ایک طرف تو حسن عربہ جو (یعنی جنگ) ہے جس کا تقاضا سوائے جنگ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا،

۱۵۸ ایک معیاری شعر اسی خصوصیت گھنوی کا ملاحظہ ہو:-

انگور میں یہ سے تھی پانی کی چار بونیں پر جب سے کھینچ گئی ہے تو اور ہنسی ہے (امیر میمنائی)

دوسری طرف مزاج عشق ہے جس کی صفت غم و وفا کے اور کچھ نہ ہوتا چاہئے۔ پھر جب یہ دونوں ایک مرکز پر جمع ہو جائیں گے تو ظاہر ہے کہ دونوں سے اپنی اپنی صفت کا اظہار پوری قوت سے ہوگا اور اس عالم میں صلح و آشتی کا یہاں ذکر۔ اسی طرح کا مہل ایک شعر اور اسی نظم کا یہ ہے

وفا کی اجمن ناز میں تھی شیر و شکر

جراحت دل صد چاک و تیغ صاعقہ خو

اول تو اجمن ناز کے ساتھ وفا کی نسبت بالکل نفوذ مہل ہے۔ علاوہ اس کے جراحت دل اور تلوار کا شیر و شکر ہو جانا مفہوم صلح کا حامل کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے خلاف یہ مفہوم پیدا کرتا ہے کہ تلوار پوری طرح کاٹ کر رہی تھی اور جراحت دل انتہائی تحمل سے اسے برداشت کر رہی تھی۔ دوسرے مصرعہ میں ایک اور محضوی نقص یہ بھی ہے کہ پہلے ٹکڑے میں »جراحت دل صد چاک« لکھ صرف ایک کیفیت کا اظہار کیا گیا ہے اور دوسرے ٹکڑے میں تیغ کا لفظ ہے جو ایک ادبی و مرئی چیز ہے۔ بالکل اسی طرح کی غلطی غالب نے بھی ایک شعر میں کی ہے۔ لکھتا ہے

کہیں نظر نہ لگے ان کے دست و بازو کو

یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

دوے مصرعہ میں۔ زخم جگر سے واقعی زخم مراد نہیں ہیں جو کھال کو کاٹ کر خون جاری کر دیتا ہے بلکہ ایک کیفیت مراد ہے لیکن پہلے مصرعہ میں دست و بازو کا ذکر کر دیا گیا جس کا اس کیفیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی نظم کا ایک اور شعر جناب جوش کا ملاحظہ ہو

ہو اکی جیب میں تھا تیرا زکماں رفتہ

کشش کے دام میں تھی کاوشِ رم آہو

کماں سے چھوٹے ہوتے تیر کا ہو اکی جیب میں ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ کاوشِ رم آہو کا کشش کے دام میں جانا کوئی مفہوم پیدا کرتا ہے۔ اگر مدعا یہ ظاہر کرتا ہے کہ کماں سے جدا ہو کر تیر ہوا میں ایک جگہ قہم کر رہ گیا تھا اور آہونے منت درمیدگی کی کیفیت چھوڑ دی تھی تو اول لہذا کر ٹکڑے کا اہمال ظاہر ہے اور موخر لہذا کر مفہوم شعر سے متبادر نہیں۔ ایک اور شعر اسی نظم کا:-

لساط عیش پہ خوابیدہ تھا غمِ دوراں

شرابِ ناب کی موجوں میں غرق تھے آنسو

دوسرے مصرعہ سے شاعر یہ مفہوم ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ آنسوؤں کا کہیں پتہ نہ تھا یعنی اُس وقت روناد ہونا رونق تھا حالانکہ مصرعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر رونور ہا تھا لیکن اس کے آنسو شرابِ ناب میں ڈوبتے جاتے تھے۔

مقطع سے پہلے ایک شعر اسی نظم کا اور قابل ملاحظہ ہے:-

ادھر اڑا ہوا طول شب فراق کا رنگ
ادھر شباب پر آرائش خم گدیو

ادل تو پہلے مصرعہ میں لفظ طول بالکل زاید و بیکار ہے۔ شب فراق کا رنگ اڑنا تو خیر ایک بات ہے لیکن طول شب کا رنگ اڑنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ علاوہ اس کے جب ذکر صلح کی رات کا ہوا ہے اور دوسرے مصرعہ میں یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ آرائش خم گدیو کے ساتھ محبوب شاعر کے پاس موجود تھا تو شب فراق کا وجود ہی کہاں باقی رہا یہ اجتماع اصدا کیسا؟

ایک نظم کا عنوان ہے راز و نیاز کی رات۔ اس کا تیسرا شعر یہ ہے:-

ترانہ ریز تھی نبض حیات کی جنبش ضمیر شب میں وہ ہنسا خوردش و دولہ تھا

دیکھئے الفاظ کتنے خوبصورت و دلکش ہیں لیکن مفہوم کا کہیں پتہ نہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ضمیر شب کس چیز کا نام ہے اور ضمیر شب سے اُس نبض حیات کی جنبش کو کیا لگاؤ جس کا تعلق شاعر کی ذات سے ہے۔ مقصود صرف یہ کہ رات کے رات کا سماں ایسا دولہ خیز تھا کہ نبض حیات میں جنبش سی سوس ہر رہی تھی، لیکن خواہ مخواہ غیر ضروری الفاظ استعمال کر کے شعر کو اصل مفہوم سے بیگانہ کر دیا

اس کے بعد کے دو شعر تو اس سے بھی زیادہ اعلیٰ ہیں۔ ملاحظہ ہوں:-

تہاں تھا دائرہ چرخ و عالم اوداح نیا نہ و نا ز میں کیا جانے کیا معاملہ تھا
کبھی ہلال چمکنا تھا اور کبھی خمبر میان حُسن و محبت خمچہ بادل تھا

اول تو علمی نقطہ نظر سے دائرہ چرخ بالکل اہل سی بات ہے اور اگر یہ مان لیا جائے کہ بوش صاحب کی شاعری کو علم و عقل سے کوئی لگاؤ نہیں تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ نیاز و نا کے درمیان کیوں ایسا معلوم ہو سکتا ہے جس سے دائرہ چرخ اور عالم اوداح ترپنے لگیں۔ اسی طرح دوسرے شعر میں ”ہلال و خمچہ کا چمکنا“ بالکل لایعنی سی بات ہے و دوسرے مصرعہ میں مرحلہ معاملہ کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جو صحیح نہیں۔ علاوہ اس کے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ معاملہ حُسن و محبت میں ہلال و خمچہ کا چمکنا کیا معنی رکھتا ہے اور اس سے شاعر کا کیا مقصود ہے۔ اگر یہ کوئی اشارہ ہے تو کس چیز سے اور اگر حقیقت کا اظہار ہے تو کیونکر

(باقی)

(نوٹ)۔ یہ سلسلہ برابر ایک سال تک جاری رہے گا اور اس ضمن میں اکابر ہند کے وہ تمام خطوط بھی شائع کئے جائیں گے جو شاعر کا شاعری کے متعلق میری ہم آہنگی میں وصول ہو رہے ہیں)



تصانیف حضرت نیاز پختوری

<p>نگارستان حضرت نیاز کے بہترین ناولی مقالات اور داستانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو دم قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے حوالہ مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے۔ قیمت ۱۰/-</p>	<p>گوارہ تمدن مولانا نیاز کی وہ معرکتہ آلود کتاب جس میں تاریخ اور سہ نظیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیاؤ تہذیبیں شائستگی کی کس قدر غنوں پرورد میں باکلی پہلی</p>	<p>شہنا کی سرگزشت حضرت نیاز کا وہ عدم نظیر افسانہ جو اردو زبان میں باکلی پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا جس کی زبان اسکی تخیل کی زراکت بیان کی بلندی و مضبوطی اور اسکی اعلیٰ ہر مہر مہر کے وہ یکجا ترقی ہے۔ قیمت ۱۰/-</p>	<p>فرست الید مولفہ نیاز پختوری جس کے مطالعہ سے ہر شخص باکلی پہلی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیر لکیر کو دیکھ کر اپنے بارے میں شخص کو مستقل سیرت عروج و زوال ہو سکتا ہے۔ قیمت ۱۰/-</p>	<p>شاعر کا انجام جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عبق کی تمام نقشہ کشی کیفیات اس کے ایک عجز میں جو ہر زبان و لہجہ میں اپنے پلاٹ اور انشائیہ کو لکھا ہے۔ قیمت ۱۰/-</p>	<p>خداات بھاشا جناب نیاز نے ایک دلچسپ کہنید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے ترجمہ پیش کر کے ایک نئی شہرت کی ڈک دلہن بنا دی ہے۔ قیمت ۱۰/-</p>
<p>صحابیات جس میں ہندو سادات کی ۵۰ عورتوں کے سندرہ حالات بیان کر دیے گئے ہیں اس کا مقصد مولانا نے خاص اپنی انشائیہ میں لکھا ہے اس کتاب میں سہولتوں سے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہیں طباعت و کتابت نہایت نفیس۔ قیمت ۱۰/-</p>	<p>تذاکرات یعنی حضرت نیاز کی آرزوی جو ادبیات و عقیدہ عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت ۱۲/-</p>	<p>فلا سلفہ قدیم اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین لکھے گئے ہیں۔ فلسفہ قدیم کی روجوں کے ساتھ ۱- ماد میں کا مذہب ۲- حرکت کے کرشمے ۳- نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ۱۰/-</p>	<p>تاریخ الودو لیبین بروزی زبان کے تاریخ نگار اسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ عربی میں ہے۔ عربی اور یورپ و ایشیا کے سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے جو علمی ادب کی یہ کتاب ہر زبان و لہجہ میں شہرت حاصل کی ہے۔ قیمت ۱۰/-</p>	<p>المسئلۃ الشرعیہ مصطفیٰ کامل پاشائی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ یہ وہ کتاب ہے جس میں یورپ و ایشیا کے سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے جو علمی ادب کی یہ کتاب ہر زبان و لہجہ میں شہرت حاصل کی ہے۔ قیمت ۱۰/-</p>	<p>تذاکرات یعنی حضرت نیاز کی آرزوی جو ادبیات و عقیدہ عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت ۱۲/-</p>

<p>فرست التحریر مکمل یعنی اردو اور انگریزی رسم خط اور قواعد تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت چال چلن مستقبل اور کام حالات معلوم کرنے کا فن اردو میں باکلی پہلی کتاب ہے۔ قیمت ۸/-</p>	<p>دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں مثنوی زہر عشق مرتبہ جنھل ڈو رکھ پوری جس میں ملک کے بھلے بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویریں دی گئی ہیں ایک تصویر پر قیمت ۸/-</p>	<p>مذکرہ خندہ گل مولفہ عبدالباری آسی جس میں ۲۰ صفحات سے زائد اردو و فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات و معانی کے لطائف و ظرائف و نقاب کلام کے درج ہیں قیمت ۸/-</p>	<p>مثنوی لالہ رخ طاس مور کی معرکتہ آلود مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ قیمت ۸/-</p>
--	---	---	---

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے
 رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائے گا
 سالانہ قیمت پانچ روپیہ - سشٹماہی تین روپیہ
 بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۳ فرست مضامین فروری ۱۹۳۳ء شمارہ ۲

۲	ملاحظات
۹	واقعہ معراج کے متعلق اسلامی عقائد کی تحلیل
۲۳	سبزو کلیو پیٹرا (سلسلہ)
۴۰	جوش ملیح آبادی کی اہمال سرانیاں
۵۲	آفرینش کی عجوبہ نامیاں
۵۵	یورپ کا فطری انسان
۵۹	ایک نسل کی زندگی کے کچھ واقعات
۶۳	باب الاستفسار
۶۹	آثار انقلاب (نظم)
۷۱	درس حقائق
۷۲	قطعات
۷۳	دو شیزگان دہقان
۷۵	میری طرح
۷۶	امید کی کشتی
۷۷	معلومات
۱۵۲	تذکرہ معرکہ سخن (سلسلہ)
۱۷۷ تا ۱۸۲	آسی الہی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نگار

ادیٹر:- نیاز فتحپوری

شمار ۲	فروری ۱۹۳۳ء	جلد ۲۳
--------	-------------	--------

ملاحظات

- آپ ایک سو دس سال قبل کے انسان کو زندہ کر کے دریافت کیجئے کہ کبھی تم نے اپنی جوانی میں
- ۱۔ بحری تار کا نام سنا تھا؟
 - ۲۔ ہوائی جہاز کو آسمان میں اُڑتے دیکھا تھا؟
 - ۳۔ ٹیلی فون کے ذریعہ سے گفتگو کی تھی؟
 - ۴۔ نمبرین کیس کا حال معلوم تھا؟
 - ۵۔ جراثیم کا کچھ علم حاصل تھا؟
 - ۶۔ نظریہ نشو و ارتقاء کا چرچا ہوتے کیس دیکھا تھا؟
 - ۷۔ کبھی یہ بات ذہن میں بھی آئی تھی کہ کس جنگ میں ۶ کروڑ مسیح آدمی شریک ہو سکتے ہیں؟

۸۔ کیا تصور میں بھی یہ بات کبھی آسکتی تھی کہ سیاسیات کی اہمیت اقتصادیات کی اہمیت پر منحصر ہوگی؟
 تو وہ یہ سوالات سن کر یا تو تمہیں احمق سمجھ کر ہنسنے لگے گا یا فرط حیرت سے پھر فوراً اسی کا دم نکل جائے گا۔ لیکن
 آپ گزشتہ ۸۰ سال (۱۸۵۱ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک) علمی، سیاسی، اقتصادی و صنعتی انقلابات پر نگاہ ڈالئے
 تو معلوم ہوگا کہ یہ سب کچھ اسی مختصر زمانہ میں ہوا اور شاید ہی تاریخ عالم پر کوئی ایسا دور آیا ہو جس نے عقول انسانی میں
 بالکل کا یا پلٹ دی ہو۔

اب آئیے ساتھ ہی ساتھ اس عہد کے سیاسیات، اقتصادیات و اجتماعیات پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں تاکہ اس اجرام
 کی ضروری تفصیل ہاتھ سے نہ جائے۔

(۱) ۸۰ سال سے وطنیت یا قومیت یورپ کے اندر ایک لی ہوئی چنگاری کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھی
 مگر اس کو مشتعل ہونے کا موقع نہ ملا تھا۔

اطالیہ عمارت تھا ان ممالک و ولایات کے مجموعہ سے جہاں آسٹریائی فوجیں حکومت کر رہی تھیں۔ اور آسٹریا ہی کی
 سیاست برسرِ اقتدار تھی۔ جرمنی کا مفہوم اس سے زائد نہ تھا کہ مستقل صوبوں میں مستقل فرمانروا اور حکمرانی دے ہے
 تھے۔ ترک کی دول بلقان کے بڑے حصے پر قابض چلا آ رہا تھا۔ اور پولینڈ کی سلطنت کا تو بجز افسیہ میں کہیں وجود ہی
 نہ تھا۔ لیکن گزشتہ ۸۰ سال کے اندر یورپ کی سرزمین نے استقلال قومی کے کیا کیا مناظر دیئے؟ تاریخ عالم
 ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

۱۸۵۱ء اور ۱۸۶۱ء کے درمیان جو سلسلہ جنگوں کا شروع ہوا تو اس وقت تک ختم نہ ہوا۔ جب تک جرمنی
 اور اطالیہ کے تمام متفرق صوبے ایک دوسرے سے متحد ہو کر مستقل سلطنتوں میں تبدیل نہ ہو گئے، اسی طرح دول بلقان
 نے اس وقت تک ہتھیار نہ رکھے۔ جب تک ان کی مستقل قومی حیثیت عطا نہ کر لی گئی، پھر جنگ عظیم میں جو کچھ
 ہوا وہ بھی کسی سے مخفی نہیں کہ پولینڈ ایسے مختصر حصہ زمین نے بھی ایک مستقل حکومت کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور آسٹریا ہنگری
 کی ملوکیت مختلف اجزاء قومی میں منتشر ہو گئی جن سے اس کی تشکیل ہوئی تھی۔ اسی طرح جاپان نے کمانڈر پری کے
 متعینہ اصول پر عمل کر کے مغرب کی قومی تحریک کو اپنا دلیل راہ بنایا۔ چین نے سن میٹ سن کی زعامت میں، ہندوستان
 نے گاندھی کی قیادت میں، ترکی نے مصطفیٰ کمال کی سیادت میں ایران نے رضا شاہ کی حکومت میں اور مصر و سوریہ وغیرہ
 تمام ممالک شرق ارضے مختلف مسلمانوں کے زیر اثر اسی استقلال قومی کی بنیاد مستحکم کی جس کی روح وسط مغرب سے پھیل کر
 آہستہ آہستہ روئے زمین کے ہر ہر قطرہ آبادی کو بیدار کرتی چلی آ رہی تھی، یہاں تک کہ اس وقت آکر لینڈ سے لے کر
 ایران تک اور ایران سے لے کر ان نام تک کوئی ایک حصہ زمین بھی ایسا نہیں جہاں گزشتہ ۸۰ سال کے اندر قومیت کی روح
 پیدا نہ ہو گئی ہو۔ لیکن اسی کے ساتھ بہ احر بھی کم حیرت ناک نہیں کہ اس روح قومیت کے ساتھ ساتھ ملوکیت

جذبہ بھی قومی ہوتا گیا اور ایک قوم نے دوسری قوم کو مغلوب محکوم بنانے میں کوئی دقیقہ کو ششش کا نہ اٹھا رکھا۔ اسیویں صدی کے اول نصف حصہ میں استعماری توسیع کی رُوح بالکل ابتدائی حالت میں تھی، اور بہت کم قومیں مغرب کی ایسی تھیں جنہوں نے ایشیا کی طرف قدم بڑھایا ہو۔ افریقہ کا اکثر حصہ سوائے مصر اور بعض مغربی و مشرقی مستعمرات ساحل کے مجھول و غیر معلوم حالت میں تھا۔ برطانیہ نے تو بیشک ہندوستان، زیلینڈ سنکاپور اور ہانگ کانگ کو بھی اپنی مستعمرات ایشیا میں شامل کر لیا۔ لیکن دوسری مغربی حکومتیں البتہ برطانیہ کی طرح خوش قسمت نہ ثابت ہوئیں کیونکہ فرانس، اسپین، اور پورٹوگال کے قدیم مستعمرات بھی جو شمالی و جنوبی امریکہ میں تھے ہاتھ سے نکل گئے۔ لیکن ۱۸۷۰ء کے بعد سے ایک مزید استعماری دور کی ابتدا ہوئی۔ اور دنیا کا جغرافیہ بدلنا شروع ہوا یعنی روس نے ایشیا میں شرقاً و جنوباً پنخوریا، منگولیا اور ایران تک اپنا تصرف وسیع کیا، جرمنی نے افریقہ اور مشرقی جزائر ہند میں ایک لاکھ مربع میل زمین اپنے لئے مخصوص کر لی۔ فرانس ۱۸۸۰ء میں ٹیونس سے برسر پیکار ہوا اور ۱۸۸۳ء میں ٹونگین سے لڑا، پھر ۹۰ ہزار مربع میل زمین ایشیا میں اور ۲۶ لاکھ مربع میل افریقہ میں حاصل کر لی۔ اسی دور ان میں برطانیہ نے ۴۰ لاکھ مربع میل زمین کا اپنی سلطنت میں اضافہ کر لیا۔ جاپان نے بھی اقوام یورپ کی تقلید میں جزیرہ فارموسا اور پنخوریا و کوریا کا ایک حصہ اپنے قبضہ میں کر لیا۔

اس استعماری توسیع کے سلسلہ میں اگر ایک طرف تھوڑا سا فائدہ یہ ہوا کہ بعض نامعلوم و مجھول حصے زمین کے علم انسانی میں آگئے تو دوسری طرف نقصان عظیم یہ بھی ہوا کہ باہم سلطنتوں میں جنگ و نفاق کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور اسی طرح ۱۸۵۱ء سے ۱۸۷۰ء کے درمیان ایک سلسلہ بین الاقوامی جنگوں کا شروع ہو گیا۔ چنانچہ فرانس و آسٹریا کی جنگ ۱۸۵۱ء میں۔ امریکہ کی خانہ جنگیاں ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک۔ فرانس اور پروشیا کی جنگ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۱ء تک۔ پھر اس کے بعد چین و جاپان کی لڑائی ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۵ء تک۔ اسپین و امریکہ کی جنگ ۱۸۹۸ء میں، جنگ بوریو ۱۹۰۰ء میں روس و جاپان کی لڑائی ۱۹۰۲ء میں اور پھر گزشتہ جنگ عظیم بہ سبب اس استعماری حرص و طمع کا نتیجہ تھیں۔

پھر جب استعماری حرص و آرزو نے یہ صورت اختیار کر لی اور ہر ملک و قوم امن و سکون کی اس خرابی سے اپنی تجارتی و اقتصادی حالت کو نظرہ میں دیکھنے لگی۔ تو ۱۸۵۶ء میں تمام دول کبریٰ (سوائے امریکہ اور اسپین کے) نے آپس میں ایک ایسا معاہدہ کیا جس کی رو سے دوران جنگ میں تجارت کو محفوظ کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۶۷ء میں جب امریکہ خانہ جنگیوں میں مبتلا تھا دول یورپ نے معاہدہ جینیوا کی رو سے جمعیتہ صلیبِ احمر کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۷۰ء میں موٹور کن کا اجتماع ہوا تاکہ روس، برطانیہ، اور آسٹریا ہنگری کے درمیان عہد نامہ مصالحت ہو جائے۔ پھر ۱۸۸۵ء میں امریکہ بھی عہد نامہ جینیوا میں شریک ہو گیا اس کے بعد ۱۸۹۹ء میں زار روس نے قولانٹانی نے ایک موٹور لاہانی میں طلب کی، ۱۹۰۰ء میں رئیس روز ولٹ نے پھر اجتماع کیا جس میں ۴۴ حکومتوں کے نمائندے شریک ہوئے اور ہر چند اسلحہ کے مسئلہ میں کسی متفقہ نتیجہ پر نہ پہنچ سکے تاہم بین الاقوامی

قانون میں کچھ ضروری ترمیمیں کر دی گئیں۔

اسی اثنا میں دول کبریٰ نے دیکھا کہ مصلحت عامہ کا اقتضایہ ہے کہ تجارت و مواصلات کے باہمی طریقوں کو منظم کیا جائے۔ اس لئے ۱۹۱۵ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان ڈاک رسائی کے متعلق اتحادی صورت پیدا کی گئی جس میں ۶۰ قوموں نے حصہ لیا اور بارہ حکومتوں نے معاہدہ برن کے ذریعہ سے حقوق طبع کی حفاظت کو تسلیم کیا۔ اسی کے ساتھ مخترعین کے حقوق اور اتحاد تلغرافی کے متعلق معاہدے مرتب کئے گئے۔

جنگ عظیم کے بعد جمعیت الائم قائم کی گئی اور اس میں ۴۵ حکومتوں نے شرکت کر کے پوری کوشش کی کہ جو مسئلہ موخرین لاہای سے طے نہ ہو سکا تھا اسے طے کیا جائے اور ملکوں کے مسلح ہونے کی ایک خاص حد مقرر کی جائے۔ الغرض حکومتیں ہر ممکن خطروں کو مٹا کر اپنی اپنی جگہ ملوکیت و استبداد کے لئے راہیں صاف کر رہی تھیں، مگر اسی کے ساتھ ذہن کا انقلاب آہستہ آہستہ دیمقراطی طرز حکومت کے طرف بھی مائل ہو رہا تھا اور یہی وہ میلان تھا جس نے ۱۹۱۵ء سے اپنی قوم کا مظاہرہ شروع کیا اور بعض حکومتیں قطعی جمہوری ہو گئیں۔ خود انگلستان میں بھی پارلیمنٹ کو یہ قانون نافذ کرنا بڑا مشکل نواب میں داخل ہونے کے لئے امارت کی شرط غیر ضروری ہے، اور ۱۹۱۶ء میں انتخابات عامہ میں رائے دہندگان کی تعداد میں اضافہ کیا گیا اور رفتہ رفتہ اس میں اس قدر اضافہ ہوا گیا کہ آخر کار ہر مرد و عورت کو جس کی عمر ۲۱ سال سے زائد ہو جائے وہ کا حق حاصل ہو گیا۔ جاپان جہاں قرون وسطیٰ کی کسی اقطاعی حکومت پائی جاتی تھی وہ بھی ۱۹۱۹ء میں دستوراً حکومت میں آ گیا۔ اسی طرح فرانس، جرمنی، روس، چین، برازیل، آسٹریا ہنگری، ترکی اور اسپین بھی دستوراً حکومتوں میں تبدیل ہو گئی۔

(۲) اب اقتصادیات کی تاریخ پر بھی نظر ڈال کر دیکھئے کہ گزشتہ ۸۰ سال میں کیا کیا انقلابات رونما ہوئے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مہتم بالشان انقلاب ترقی علوم کے وجہ سے ہوا۔ اور گزشتہ نصف صدی کے اندر حیرت انگیز تغیرات رونما ہوئے۔ ایٹم انجن ۱۹۱۹ء میں ایجاد ہوا تھا لیکن اس پر ایک صدی کا زمانہ بھی نہ گزرا تھا کہ ۱۹۵۸ء تک آگے و پیشہ کارخانے ایٹم انجن ہی سے چلنے لگے۔ اسی دوران میں تار کی ایجاد ہوئی، سینے کی مشین بنائی گئی۔ دھاتی جہاز اور ریلوے انجن وغیرہ کثرت سے چل پڑے۔

۱۹۵۸ء کے قریب بسم نے ایک خاص طریقہ فولاد بنانے کا ایجاد کیا جس سے فولادی صنعتوں میں بڑا انقلاب پیدا ہوا۔ ۱۹۶۱ء کے قریب قوسی لور کربائی ایجاد ہوا اور کھیت کاٹنے کی ایسی مشین بن گئی جو خود ہی گٹھے بھی بانڈھتی تھی چھینٹ چھاپنے کا طریقہ معلوم کیا گیا اور یورپ و امریکہ کے درمیان تار برقی کا سلسلہ قائم ہو گیا۔

۱۹۶۱ء کے قریب آلات گیس، ٹیلی فون، کربائی لمپ وغیرہ ایجاد ہوئے، ۱۹۶۸ء کے قریب بجلی کا موٹر استعمال ہونے لگا، چھاپنے کی لینوٹائپ مشین بنائی گئی۔ اومینیم کربائی طریقہ پر اپنی معدن کے اندر سے نکالا گیا، موٹر کارط

ہوئی اور پھر اس کے بعد جو سلسلہ اختراع و ایجاد کا شروع ہوا اولاً اسکی ٹیلی فون، کبر الصوت، ٹیلی ویژن وغیرہ سیکڑوں جدید چیزیں جو دنیا میں آئیں جنہوں نے صنعت و تجارت دونوں کے اصول بدل کر ان کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا۔ لیکن اسی کے ساتھ جو سب سے زیادہ اہم انقلاب ہوا وہ یہ تھا کہ تجارت و صنعت افراد سے متعلق ہونے کے بجائے جماعتوں سے وابستہ ہو گئی اور مشترکہ سرمایہ سے کمپنیاں قائم ہونے لگیں۔ اس کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ عوام میں بھی اس کا شوق پیدا ہوا، دوسرے ملکوں کا اثر وسیع و قوی ہو چلا اور تیسرے یہ کہ دنیا کا ہر ملک دوسرے ملک سے وابستہ ہو گیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج جب تاوان جنگ کی ادائیگی کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو ٹوکیو، نیویارک، لندن اور پیرس کے سرمایہ دار اس کے حل کرنے کے لئے طلب کرتے جاتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں جو بہت اہم انقلاب ہوا وہ تنظیم عمال قضا یعنی مزدوروں اور کام کرنے والوں میں بیداری پیدا ہوئی۔ اس تنظیم کی ابتداء بھی ۱۸۵۶ء میں ہوئی اور رفتہ رفتہ ایک لاکھ مزدور برطانیہ کی اس تحریک میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد ۱۸۶۶ء میں امریکہ کے مزدوروں نے بھی اپنے آپ کو منظم کیا اور رفتہ رفتہ یہ تحریک اس قدر وسیع ہوئی کہ اس وقت ایک کروڑ لاکھ مزدور اس تنظیم سے وابستہ ہیں۔ اس تعداد میں امریکہ شامل نہیں جہاں ۳۰ لاکھ کی تعداد اس کے علاوہ ہے اور نہ روس و جنوبی امریکہ شامل ہیں۔

(۳) اب اجتماعات کی طرف توجہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں ترقی تعلیم نے کی۔ ۱۸۵۱ء میں برطانیہ ۱۰ لاکھ گنی سے بھی کم ملک کی تمام پبلک مدارس پر صرف کرتا تھا، لیکن اب صرف لندن کے مدارس پر جو کچھ صرف ہوتا ہے وہ بھی اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔ یہی حال امریکہ کا تھا کہ ۳۰ ملین آبادی کے لیے صرف ۱۰۰ مدرسے قائم تھے، لیکن اب ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔ پھر یہی نہیں ہوا کہ ثانوی تعلیم کے تحت رجوع ہوا بلکہ کالج و تالم کئے گئے، یونیورسٹیوں کی بنیاد پڑی، کتب خانے بڑھائے گئے، تالیفات و تصنیفات کی کثرت ہوئی، اخبارات و رسائل میں اضافہ ہوا اور یورپ و ایشیا ہر جگہ اس کو محسوس کیا جانے لگا کہ عام تعلیم ہی بنیاد ہے ایک قوم کے استقلال و ترقی کی۔

اسی سلسلہ میں عورت کی ترقی پر بھی نگاہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ گزشتہ ۸۰ سال میں وہ بھی خدا جائے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ امریکہ میں اول اول عورتیں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل نہ ہو سکتی تھیں۔ لیکن ۱۸۶۵ء میں ان کی ایک بڑی جماعت مردوں کے دوش بدوش علمی تجربات میں حصہ لینے لگی اور ۲۰ فی صدی وظائف ان کو ملنے جانے لگے۔ پھر رفتہ رفتہ انہوں نے جتنی ترقی کی وہ کسی سے مخفی نہیں اور وہ کونسا علم و فن کون سی صنعت و حرفت ایسی ہے جس میں وہ پیش پیش نہیں ہیں۔ یورپ کی عورت نے بھی امریکہ ہی کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا اور اب وہاں بھی وہی عالم ہے جو امریکہ میں نظر آتا ہے۔ غیر مغرب میں اگر یہ انقلاب رونما ہوا تھا تو جاکے جہت نہ تھی، لیکن تعجب

تو یہ ہے کہ مشرق کی عورت بھی بجلی نہ بیٹھ سکی اور چین و جاپان، ترکی، مصر، اور بلاد عرب میں بھی وہ سیاسی و اجتماعی، علمی و صناعی، اقتصادی و تجارتی تحریکوں میں برابر کا حصہ لینے لگیں۔

اسی کے ساتھ علم طب کی ترقی کو دیکھنے کے مختلف امراض کے جراثیم کی تحقیق شروع ہوئی، بہت سے لاعلاج امراض قابل علاج قرار پائے اور تعداد اموات ۱۹ فی ہزار کی نسبت سے کم ہو گئی۔ دیگر علوم عقلیہ کو دیکھنے کے علم الگیمیا، طبقات الارض، فلکیات وغیرہ میں کیسے کیسے اضافے ہوئے، ڈارون کی کتاب ”اصل النواع“ اسی زمانہ میں شائع ہوئی، اسپنسر کا ”فلسفہ ترکیبہ“ اسی عہد کی چیز ہے، ”رائجن شعل“ اسی دور میں دریافت ہوئی، ریڈیم انھیں ۸۰ سال کے اندر دریافت ہوا اور انیشٹین کا نظریہ نسبت بھی اسی زمانہ کی چیز ہے۔

الغرض گزشتہ ۸۰ سال کا زمانہ اپنی علمی، سیاسی، اجتماعی و اقتصادی ترقیوں کے لحاظ سے ایک ایسا عجیب و غریب زمانہ تھا کہ اس کی نظیر تاریخ گزشتہ میں نہیں ملتی اور اگر کوئی قوم دنیا میں ایسی ہے جو ہنوز محو خواب ہے تو ہم کو نہایت آسانی سے اس کے فنا ہو جانے کا حکم لگا دینا چاہئے کیونکہ علم کی اس تیز روشنی میں یہ گراخوابی، بندگی گراں خوابی نہیں ہے بلکہ موت کا جمود ہے، موت کی غفلت ہے، جو نہ کبھی دور ہوئی نہ ہو سکتی ہے۔

حال ہی میں کسی اخبار (غالباً انصاف امرتسر) نے مولویوں کی ایک جماعت کی طرف سے یہ صدائے احتجاج ہمارے کانوں تک پہنچائی تھی کہ ترکی کے متعلق جو خبریں شائع کی جاتی ہیں وہ اکثر و بیشتر غلط ہوتی ہیں یعنی نہ وہاں زبان ترکی زبان میں ہوتی ہے نہ خطبہ وغیرہ غیر عربی زبان میں سنایا جاتا ہے۔ ہر چند یہ طفلانہ باتیں اس قابل نہیں ہیں کہ کوئی سنجیدہ شخص ان کی طرف توجہ کرے (اور اس جماعت کی جتنی باتیں ہوتی ہیں وہ سب ایسی ہی لغو و مہمل ہوتی ہیں) لیکن اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس جماعت کی ذہنیت کیا ہے۔ چونکہ یہ لوگ فروع مذہب میں بھی کسی قسم کی تبدیلی کو خواہ وہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہو کفر کا مترادف سمجھتے ہیں اور اسی کے ساتھ اگر ان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی ایسی مسلم جماعت جس پر ان کی ”کفرگری“ کا حربہ اثر نہیں کر سکتا، ان کے موعومات کے خلاف اصلاح مذہب کی حامی ہے، تو انتہائی بیخسی و بیچارگی کے ساتھ صرف یہی مدافعت کیا کرتے ہیں۔ کہ ”اس طرح کی خبریں غلط ہیں، دشمنوں کا پروپیگنڈا ہیں اور ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے“

اگر یہ ”برخود غلط“ جماعت مصر و عرب اور خود ترکی کے اخبارات کا مطالعہ کرتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ وہاں نہ صرف اذان و خطبہ ہی ترکی زبان میں ہوتا ہے بلکہ نماز میں قرأت قرآن بھی عربی میں نہیں ہوتی، چنانچہ حال ہی میں استنبول کا ہنگامہ صرف اسی وجہ سے ہوا تھا اور اسی ہنگامہ کی وجہ سے بہت سے علماء و مشائخ کو پکڑ کر مصطفیٰ کمال نے قید و بند میں ڈال دیا۔ میرے پاس جو عربی اخبارات آتے ہیں ان میں اس وقت کی تصاویر موجود ہیں جب

بذلِ اولِ ترکی زبان میں نماز ادا کی گئی تھی، پھر اس کو غیروں کا پروا لگنا کیونکر کہہ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ غالباً ہندوستان کے علماء کرام یہ سن کر اور زیادہ مایوس ہوں گے کہ حکومت ترکی نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ سلطنت کے تمام رخص و طول میں سخت احکامات نافذ کر دئے گئے ہیں کہ عربی زبان کا ایک لفظ بھی استعمال نہ کیا جائے۔ اور اس کے لئے نہیں قائم ہوئی ہیں۔ تاکہ وہ موجودہ ترکی لٹریچر کو عربی سے پاک کر کے خالص ترکی الفاظ اس کی جگہ تلاش کر کے لغات کتاب میں مرتب کریں۔

پھر اگر مصطفیٰ کمال اور ترک قوم اپنی ان تمام آزادیوں کی وجہ سے واقعی دائرہ اسلام سے خارج ہو چکی ہے تو ہمارے علماء کو نہایت صفائی سے اس کا اظہار کر دینا چاہئے۔ اس دنائت و کم ہمتی کی کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ حقیقتوں کو الزامات بجا قرار دے کر ان کی صفائی کی جائے۔۔۔۔۔ اگر اسلام کی قوت و عزت کا انحصار کسی مخصوص قوم یا ملک کے مسلمان پر ہے تو اسلام کی حقیقت معلوم اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیوں ہندوستان کے مسلمان علماء ترکوں کو کافر و مشرک قرار دے کر ان سے تبراً و بیزاری کا اعلان نہیں کر دیتے۔ مگر چونکہ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں۔ کہ ان کی اس مزخرفات کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نہ اب ان کا جذبہ ایمانی جوش میں آتا ہے اور نہ خدا کی راہ میں وہ اپنی "پلٹن" نے کر نکلنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کی کارگاہِ عمل تو ہندوستان ہی کی جبل پر در و واہمہ پرست سر زمین میں قائم ہو سکتی ہے۔ جاں اب بھی "فرمودہ مولوی" "سرمودہ خدا" کی حیثیت رکھتا ہے

جنوری کا نکار نہ صرف یہ کہ غیر معمولی تعویق سے شائع ہوا بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ حد سے زیادہ غلطیاں اس میں پائی جاتی ہیں۔ اس کا سبب تو یہ ہوا کہ کاتب دھوکا دے کر دفعہ غائب ہو گئے اور عرصہ تک مسودات وغیرہ بھی ان سے نہ مل سکے، اس کا سبب منبر کی حدیم القرصتی۔۔۔۔۔ کہ کاپیوں کی صحت کا انتظام نہ کر سکے۔ میں حیدرآباد میں تھا۔ اس لئے خود کوئی انتظام نہ کر سکتا تھا۔۔۔۔۔ فروری کا پرچہ بھی ۸۔ ۱۰۔۔۔۔۔ دن کی تعویق سے شائع ہو رہا ہے۔ اور اس کا سلسلہ غالباً دو چار ماہ اور رہے گا کیونکہ ہر مہینے اسی طرح دو دو چار دن کی تاخیر کو دور کیا جائیگا۔ تاریخ الفحشاء کی طباعت شروع ہو گئی ہے، لیکن چونکہ کتاب کا حجم زیادہ ہے اس لئے مارچ کے اخیر ہفتہ تک اس کی اشاعت کا انتظار رکھئے

جن حضرات نے اس کتاب کے سلسلہ میں کچھ رقم پیش کی بھیج دی ہے وہ دی پی کی روانگی کے وقت وضع کر دیجائیگی۔ ابھی تک قیمت کا تعین نہیں ہو سکا غالباً ماہ آئندہ میں اس کا اعلان ہو سکے گا

واقعہ معراج کے متعلق اسلامی عقاید کی تحلیل

ایک انگریز مستشرق ڈاکٹر اسٹڈل اور ہرزہ سرائیاں

اسلامی ادبیات کے ہر شعبہ میں اسری و معراج کا کچھ نہ کچھ واقعہ ضرور ملتا ہے، قرآن و حدیث تفسیر و تصوف، تاریخ و شاعری یہاں تک کہ آرت اور فنون لطیفہ میں بھی اس کے بعض نقوش نظر آتے ہیں اس موضوع پر دستوں نے بھی نیاز کیشیوں کا ہدیہ پیش کیا اور مخالفوں نے بھی معاندانہ تنقیدیں کیں عقول انسانی کے مختلف مراتب اور فکر و نظر کے مختلف زاویوں کے اعتبار سے اس پر بہت سی حاشیہ آرائیاں کی گئیں اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ مصوروں نے اس کو نقوش میں ظاہر کیا، عہد صفویہ کی مصوری کا یہ ایک دلچسپ موضوع تھا چنانچہ اس کا ثروت آج خمسہ نظامی کے ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۵۲۹-۳۰ء سے ملتا ہے جو برٹش میوزیم میں ہے، اس میں عہد صفوی کے بہت سے نامی گرامی مصوروں کے شاہکار ہیں اس نایاب نسخہ کی تمام تصویروں میں سب سے بہتر وہ مرقع ہے جس میں آں حضرت کا واقعہ معراج پیش کیا گیا ہے، آں حضرت براق پر سوار ہو کر نیلگوں آسمان پر تشریف لجا رہے ہیں آپ کے چاروں طرف ایک شہابی رنگ کے نور کا ہالہ ہے آپ جس وقت زمین سے عالم بالا کا رخ کرتے ہیں تو لاکھوں پران کی جماعت سطح سحاب کے نیچے آپ کو گھیرے ہوئے ہے، لورنس بنین لکھتا ہے، کہ واقعہ معراج تو اس عہد کی مصوری کا عام موضوع ہے لیکن اس نقش میں جو اشیری شکوہ نمایاں ہے، کسی دوسری جگہ نہیں پایا جاتا

قرآن و حدیث کے سیدھے سادے واقعہ پر اسی طرح مورخوں اور مفسروں نے خیال آرائیاں کیں صوفیہ نے کچھ اصناف کیا، اور تفسیر و تاریخ کی شکل سے کوئی ایسی کتاب ملیگی جس میں اس پر بحث و تخیص نہ کی گئی ہو یہاں تک کہ خاص اس موضوع پر علامہ نجم الدین مغیظی نے "حاشیہ الدرر علی قصتہ المعراج" لکھی اسی طرح الکردی نے "صوۃ السراج فی فضل رجب و قصتہ معراج" لکھی یہ کتابیں مصر میں چھپ گئی ہیں اور عام طور پر ملتی ہیں،

محدثین کے جزوی مباحث، مورخین کے اصنافی حاشیوں، اجنبی اقوام سے ربط و اختلاط اور مذاہب فلسفہ کی سینہ زداریوں کی بدولت خود مسلمانوں میں اس کے متعلق اختلاف عقاید شروع ہو اور آج مختلف افکار کی تحلیل کرنے کے بعد اسکے متعلق تین عقاید پائے جاتے ہیں۔

پہلی جماعت تو ان حضرات کی ہے جن کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت آسمان پر بسم اطر کے ساتھ تشریف لے گئے چنانچہ جہود حدیثین و فقہا کا یہی مذہب ہے، حضرت ابن عباس اس کے سرگروہ ہیں،

دوسری جماعت ان لوگوں کی ہے، جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف روحانی اعتبار سے معراج ہوا، آپ جسم کے ساتھ آسمان پر تشریف نہیں لے گئے چنانچہ بی بی عائشہ اور امیر معاویہ کا یہی عقیدہ تھا حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے، ابن اسحق کہتے ہیں

عن عائشہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم
آں حضرت کی بی بی حضرت عائشہ کہتی تھیں کہ آپ کا
کانتا ققول ما نقل جسد نہول للہ صل اللہ علیہ وسلم
جسم غایب نہیں ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو معراج
دلکن اللہ اسرا بہ
عطا فرمایا

امیر معاویہ سے معراج کے متعلق سوال ہوا آپ نے فرمایا کانتا روایا من اللہ تعالیٰ صادقہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو روایا صادقہ ہوا)

تیسری جماعت صوفیہ کی ہے، حضرت محی الدین ابن عربی کا خیال تھا کہ قرآن میں جس اسری یا معراج کا تذکرہ ہے وہ روحانی تزکیہ کے متعلق مجازی اور استعاری طرز بیان ہے، پہلے عقیدہ کے مقلد سوائے ابن عباس کے قیاس (جیسا کہ روایا عین) کے علاوہ کوئی ایسی مستند حدیث نہیں پائی جاتی جس سے معراج کو جسمانی مانا جائے، قرآن مجید میں محض اس قدر ہے،

سبحان الذی اسری عبداً کایلاً من المسجد اعواء
پاک ہے وہ ذات جبروت کے وقت اپنے بندہ کو مسجد
الی المسجد الاقصی الذی برکاتہ حول المنزید من
حرام سے مسجد اقصیٰ میں لے گئی جس کے گرد گردہم نے کہیں
آیاتنا
رکھی ہیں تاکہ ہم اسکو اپنے عجائبات قدرت دکھائیں،

اس میں کہیں نہ تو اس معراج جسمانی کا تذکرہ ہے جس کے متعلق بخاری اور دوسری حدیثوں میں روایتیں ملتی ہیں اور نہ یہ تذکرہ ہے کہ آپ جسم کے ساتھ آسمان پر تشریف لے گئے، قرآن مجید سے صرف ”اسری“ ثابت ہے، احادیث سے معراج کا حال معلوم ہوتا ہے، معراج اور اسری کی حدیث کے راویوں میں عبد اللہ ابن مسعود ابو سعید خدری، عائشہ صدیقہ، امیر معاویہ، ام ہانی بنت ابی طالب، حسن بن ابی الحسن، ابن شہاب زہری اور قتادہ وغیرہم کے اسماء گرامی پائے جاتے ہیں معراج جسمانی ماننے والی جماعت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ ”عبد“ جموعہ ہوتا ہے، جسم و روح کا اس لئے قرآن مجید میں ”اسری بعبدہ“ سے جسمانی سیر مراد ہے، نہ کہ محض روایے صادقہ، اگر آپ کو معراج محض خواب میں ہوئی، تو پھر معجزہ کیا ہوا خواب میں تو عام لوگ بھی مناظر و مرایا کے عجائبات کا مشاہدہ کرتے ہیں پھر اس حضرت کی خصوصیت کیا ہوئی، دوسری جماعت کہتی ہے کہ معراج جسمانی کا عقیدہ تجاہل و مشاہدات کے خلاف ہے، اور وہ بی بی عائشہ کی پرورد حدیث

ادب نبی ام ہانی کی اہم روایت سے استدلال کرتے ہیں ابن اسحق کہتے ہیں

عن ام ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہا واسمہا
 ہند فی مسری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانت
 تقول ما اسری برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا
 ہونی بیتی نایم تلك اللیلة فصلی العشاء الاخرة
 ثم نام وفتنا فلما کان قبیل الفجر اہنبا رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم فلما صلی الصبح وصلینا
 معه قال یا ام ہانی لقد صلیت معکم العشاء
 الاخرة کما س ایتا بھذا الوادی ثم جئت
 بیت المقدس فصلیت فیہ ثم قد صلیت صلاة
 الغداة معکم الآن کما ترین

اور ام ہانی بنت ابی طالب سے جن کا نام ہند تھا معراج
 نبوی کے متعلق روایت ہے کہ جس رات کو معراج
 ہوا آپ میرے گھر پر میرے نزدیک سوئے تھے، آپ نے آخری
 عشا کی نماز پڑھی اور سو گئے اور ہم لوگ بھی سو رہے صبح کے
 قبل آپ نے ہم لوگوں کو اٹھایا جب آپ صبح کی نماز پڑھ چکے
 اور ہم لوگوں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھ لی، تو آپ نے فرمایا کہ
 اے ام ہانی! میں نے عشا کی نماز تمہارے ساتھ اس میدان
 میں پڑھی جیسا کہ تم نے دیکھا پھر بیت المقدس میں آیا
 اور اس میں نماز پڑھی اور اب تمہارے ساتھ صبح کی نماز
 ادا کی جیسا کہ تم دیکھتی ہو،

آپ گھر سے روانہ ہوئے تاکہ لوگوں سے اس کا تذکرہ کریں حضرت بی بی ام ہانی نے بر بنائے محبت آپ کی چادر پکڑ لی اور
 عرض کیا، اس کا تذکرہ نہ فرمائے لوگ آپ کی تکذیب کریں گے، آپ نے نہیں مانا بی بی ام ہانی نے ایک حبشیہ لونڈی کو آپ کے
 پیچھے روانہ کیا اور کہہ دیا کہ دیکھ لوگوں کے سامنے یہ واقعہ بیان کرتے ہیں تو وہ کیا کہتے ہیں آپ نے یہ واقعہ بیان کیا لوگوں
 کو سبب ہوا اور انھوں نے کہا،

ما آیت ذلک یا محمد فانہ منہج ہمیش هذا اقط
 محمدیہ کوئی نشانی ہے، جسے تو کبھی اس قسم کا واقعہ سنا نہیں
 آپ نے بیعت المقدس کے ماحول، مختلف مناظر، وہاں کے قبائل کے حالات اور ان کے اعمال شبانہ کے واقعات
 بیان کرنا شروع کئے،

عن جابر بن عبد اللہ قال سمعت النبی
 صلی اللہ علیہ وسلم یقول لما کذبی بنی قریظ
 قمت فی الحجر فحلی اللہ لی بیت المقدس
 فطفقت اخبر ہم عن آیاتہ وانا انظر النیر

جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا میں نے
 رسول سے سنا آپ فرماتے تھے جب قریظ نے میری تکذیب
 کی تو میں حجر کے نزدیک کھڑا ہوا، اللہ نے بیت المقدس کو
 میرے پیش نظر کر دیا، میں نے اس کی نشانیاں بیان
 کرنا شروع کیں گویا کہ میں اس کو دیکھ رہا ہوں،

نبی بی عائشہؓ اور ام ہانیؓ کی احادیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ آپ پر خواب کی سی کیفیت طاری ہوئی اسی عالم میں آپ بیت المقدس تشریف لے گئے اسی کو قرآن مجید نے ”اسری“ بیان کیا ہے، ابن اسحق کی روایت کے مطابق ابو سعید خدریؓ اسی ”اسری“ کے ساتھ معراج کا واقعہ ہونا بتاتے ہیں

انذ قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم
 يقول لما فرغت فما كان في البيت المقدس
 اتى بالمعراج
 آپ نے کہا میں نے رسول اللہ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ
 جب میں بیت المقدس کی چیزوں کو دیکھ کر فارغ ہوا تو
 معراج میں گیا،

اسی طرح مالک ابن صعصہ کی روایت سے معراج کی جو طویل حدیث مذکور ہے، اس میں ہے آنحضرت نے فرمایا
 افاعد البيت بين النائم واليقظان
 میں گھر میں بیداری اور خواب کے درمیان حالت میں تھا

روایات بالا کے مقابلہ میں صرف حضرت ابن عباس کا تیسرا ہے، قرآن مجید نے اس کو ”سورۃ“ سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے، وما جعلنا الرويا التي ارايناك الا فتنة للناس بخاری کی منقولہ بالا حدیث کے مطابق حضرت ابن عباسؓ تو ”رویا“ سے ”اسری و معراج“ مراد لیتے ہیں لیکن ہی ”سورۃ“ (یہ مشاہدہ بیداری کا تھا، کا اضافہ کرتے ہیں، جو بی بی ام ہانی اور حضرت عائشہ کی روایات کے مقابلہ میں زیادہ زور دار نہیں قرآن مجید میں ”رویا“ کا استعمال دوسرے مقام میں ”خواب“ ہی کے معنی میں ہوا ہے، لقد صدق الله رسوله الرويا بالحق (فتح) خیر یہاں تک تو تنقید روایات کی بحث تھی، آئے اب ذرا معراج جسمانی اور روحانی پر عقلی حیثیت سے غور کریں آج علوم جدیدہ سے روشناس ہو جائیے بعد ایک شخص کہہ سکتا ہے، کہ معراج جسمانی کا عقیدہ محض اساطیری اور خرافی پہلو رکھتا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ خدا کی قدرت سے بعید نہیں کہ اس نے آں حضرت کو آسمان پر جسم اترنے کے ساتھ بلایا ہو، تو پھر قوموں کی خرافیات اور ملتوں کے افسانوں کو ماننے میں کیا مضائقہ رہتا ہے، مصر کے گلگیش اور خرافیات ہند کے ہنومان کے عجیب کارناموں پر ایمان لانے میں کیا عذر ہے؟ لیکن سوال یہ ہے کہ سائنس اور فلسفہ کے اکتشافات، جدیدہ آج سے کئی صدیاں قبل ”خوارق عادات“ نہیں سمجھے جاتے تھے، لاسکلی خبریں، اور لاسکلی نئے آج ہماری روزانہ زندگی کے مشاہدات ہو گئے ہیں، ہم ان پر تعجب نہیں کرنے، آج طیاروں کی سرعت، روانگی کا معائنہ کرتے ہیں تو ہم انکار نہیں کرتے، سائنس کا ایک عالم سیاروں کی بے انتہا تیز حرکتیں اور ایک قطرہ خون میں ہزاروں جوائیم کے وجود کو ہم سے تسلیم کر لیتا ہے، لیکن ایک صادق اور امین کی زبانی جسمانی سیر کا غیر معمولی واقعہ ہم سنتے ہیں تو نہیں مانتے، سائنس اور اکتشافات جدیدہ نے آج دنیا والوں سے بہت سی ایسی باتیں منوالی ہیں جن کا قدیم انسانوں کو مطلق علم نہ تھا یہی باتیں جو آج روزانہ زندگی کا مشاہدہ سمجھی جاتی ہیں قدما کے لئے ”خوارق عادات“ نہیں تھیں؛ آج ہم اپنے مکان میں بیٹھ کر مالک یورپ و امریکہ کے

حافلِ رقص و سرود اور مجامعِ علمی و سیاسی کی آوازیں سناتے ہیں اور قدرت کی اس چھپی ہوئی طاقت کے یکایک دریافت کرنے کے بعد ایک معمولی درجہ کا آدمی بھی ان واحد میں دور دراز آبادی کے رہنے والے انسانوں کی آوازیں سن لیتا ہے۔ مانہ آئے گا جب سائنس کی اختراع فایقہ پروردہ بھی ہٹا دیگی اور مشرق و مغرب کے درمیان آواز کی طرح جسم کا بھی اتصال ہوا کرے گا، سائنس ہم سے ایسی عجیب عجیب باتیں منوار ہا ہے، جن کو ہم پہلے خرافیات سمجھتے تھے، پھر کیا وجہ ہے کہ نواسی فطرت کا مکمل علم حاصل کئے بغیر ہم کسی ایسی روایت کی تکذیب کر دیں جو ایک صادق انسان کی طرف منسوب ہو، حالانکہ نواسی فطرت کے مقابلہ میں نہ تو ہمارا دیدہ بینا ہی مکمل ہے، نہ ہمارا گوش شنوائی

اسی کے ساتھ اگر معراج کو روحانی مانا جائے تو بھی آپ کا معجزہ برقرار رہتا ہے، انبیاء پر خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں وحی نازل ہوتی ہے، خود قرآن مجید میں حضرت ابراہیم اور آل حضرت کے ان خوابوں کا تذکرہ ہے جن کو وحی بتایا جاتا ہے، انبیاء، حجرات، روحانیات اور نفسیات کے ماہرین آج ”عجیب بینی“ (clairvoyance) اور ”ویسے الہامی“ (Psychic dream) پر زور دیر رہے ہیں ان حضرات کو خواب میں اگر یہ معراج ہوتی تو بھی آپ کا یہ معجزہ تھا کیونکہ آپ کی زکات و بصیرت سے آپ کے اس ارتقائے روحانی کا ثبوت ملتا ہے، جس کی نظیر نبیادرس کے علاوہ عوام کی زندگی میں میسر ہونے والی چیز نہیں،

قرآن مجید نے جس سادہ پیرایہ میں واقعہ معراج پر روشنی ڈالی ہے، اس پر تو کسی کو اعتراض کا موقع نہ تھا لیکن احادیث و تاریخ کی روایات کو پیش نظر رکھ کر ایک بہت بڑے معاند اسلام ڈاکٹر ٹسڈل نے جو ہرزہ سرایاں کی ہیں وہ قابلِ غور ہیں، وہ لکھتا ہے،

”ابن اسحق سند حدیث کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ محمد کی پیاری بیوی حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ پیغمبر کا جسم (اظہر) غایب نہیں ہوا بلکہ خدا نے آپ کی روح کو معراج عطا فرمایا، دوسری حدیث میں ہے کہ محمد خود فرماتے تھے ”سیری آنکھیں سو رہی تھیں اور میری روح بیدار تھی“ مشہور صوفی مفسر حضرت محی الدین ابن عربی نے پورے واقعہ کو مجازی حیثیت سے تسلیم کیا ہے، یہ یقین ہے کہ جمہور مفسرین و محدثین کا عقیدہ ہے، کہ محمد حقیقتاً مکہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے، اور آسمانوں کی سیر بھی کی اور جو کچھ آپ نے کیا اور دیکھا اس کے متعلق وہ طویل واقعات پیش کرتے ہیں جو مسلمانوں کے لئے حد درجہ دلچسپ ہے، یہی حدیث ہے جس کے متعلق ہم بحث کرنا چاہتے ہیں اور ہم بتائیں گے کہ اس کی مخصوص باتیں قدیم روایات خزانہ بالخصوص مذہب زردشت سے لی گئی ہیں، ہم پہلے ابن اسحق کی روایت نقل کرتے ہیں کیونکہ یہ تمام روایتوں سے جو ہم تک پہنچی ہیں قدیم ہے، اس کا مرتب ابن ہشام لکھتا ہے، ”محمد کا دعویٰ

۵ نوت از او تیر۔ اگر آپ اس کے قائل ہیں کہ معراج جہانی بھی انہیں اسباب و ذرائع کے ماتحت عمل میں آئی جو آج کل ماسکلی وغیرہ کے

نال کا باعث ہوتے ہیں تو پھر کوئی ٹھیکر باقی نہیں رہتا۔

تھا کہ معراج کے لئے دو مرتبہ جبریل میرے پاس تشریف لائے اور دو نومرتبہ مجھے نیند آگئی، اسی طرح تیسری بار وہ میرے پاس آئے تب انھوں نے مجھ کو اپنے پیر سے مس کیا اور میں اٹھ بیٹھا، تب وہ مسجد کے دروازہ تک لے گئے اور وہاں ایک سفید جانور تھا جو صورت میں خچر اور گدھے کے درمیان تھا اس کے بازو میں دو پرتھے جس سے وہ اپنے اگلے پیروں پر قبضہ رکھتا ہے، اپنا اگلا پیر وہ نہتائے نظر تک قائم رکھتا ہے، انھوں نے مجھ کو اس پر سوار کیا تب وہ میرے ساتھ چلے اس طور سے کہ نہ تو وہ مجھ سے آگے نکلے اور نہ میں ان سے آگے نکلا جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ چیخا جبریل نے اپنا ہات اس کے ایال پر رکھا تب انھوں نے کہا اے براق! کیا تو جو کر رہا ہے، اس سے شرمندہ نہیں؟ اے براق خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں محمد کے قبیل کوئی ایسا بندہ تجھ پر سوار نہیں ہوا جو خدا کے نزدیک زیادہ مغز ہو اس پر براق ایسا شرمندہ ہوا کہ اس کو پسینہ آگیا تب وہ چپ چاپ کھڑا ہو گیا اور میں اس پر سوار ہوا، حسن نے حدیث روایت کی ہے، کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور آپ کے ساتھ جبریل بھی گئے یہاں تک کہ آپ ان کے ساتھ بیت المقدس میں پہنچے یہاں آپ نے انبیا کی ایک جماعت کے ساتھ حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ کو بھی دیکھا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے امامت کی اور ان کے ساتھ نماز ادا کی، اس کے بعد جبریل دوبارہ لائے، ایک میں شراب تھی اور دوسرے میں دودھ تھا آپ نے دودھ کا ظرف اٹھالیا اور پی گئے، اور شراب کا برتن چھوڑ دیا اس پر جبریل نے کہا اے محمد! آپ فطرت پر ہیں اور لوگ فطرت ہی پر واقع ہوتے ہیں شراب آپ پر حرام کی گئی ہے، تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم جدا ہو گئے، اور صبح کے وقت آپ قریش کے پاس گئے اور ان کو اس کی اطلاع کی، بہت لوگوں نے کہا کہ واللہ یہ معاملہ تو صاف ہے، بخدا ایک قافلہ ایک ماہ میں مکہ سے شام میں پہنچتا ہے، اور ایک ماہ میں مراجعت کرتا ہے، اور یہ صاحب (محمد) مکہ سے ایک رات میں جاتے ہیں، اور واپس آجاتے ہیں،

”اس روایت کے مطابق ایک رات میں محمد مکہ سے صرف بیت المقدس گئے اور واپس ہوئے اس کے بعد

کی حدیثیں اس سفر کو زیادہ بتاتی ہیں، یہ تمام حدیثیں خود محمد نے بیان کیں مشکوٰۃ المصابیح، میں مفصلہ ذیل روایت پائی جاتی ہے

”پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب میں سورا تھا ایک آنے والا آیا تب اس نے اس کے اور اس کے درمیان کھولا اور میرا دل نکالا، اس نے میرا دل دھو کر پھر جگہ پر رکھ دیا میں اپنے میں آگیا تب میرے لئے ایک سفید جانور آیا جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے لانا تھا اس کا نام براق ہے، اور وہ اپنا اگلا پیر اپنی حد نظر کے آخر تک

مشکوٰۃ المصابیح کی پوری حدیث جس کا تسدیل نے حوالہ دیا ہے، بخاری (کتاب الصلوٰۃ) اور سلم (کتاب الایمان) میں مذکور ہے، اور شراب کے برتنوں کے متعلق کتاب التفسیر بخاری (سورہ بنی اسرائیل) میں بھی حدیث پائی جاتی ہے،

رکھتا ہے، میں اس پر سوار ہوا، اور جبرئیل مجھ کو اٹے چلے، یہاں تک کہ میں آسمان کے سب سے نیچے طبقہ تک پہنچا جبرئیل نے داخل ہونا چاہا سوال ہوا کون ہے؟ انھوں نے کہا ”جبرئیل“ سوال ہوا تمہارے ساتھ کون ہے، انھوں نے کہا ”مخ“ پوچھا گیا کیا آپ کو بلایا گیا ہے، کہا ”ہاں“ کہا گیا ان کو مرحبا ہو، آپ کی تشریف آوری بہت خوب ہے، ایک دن دروازہ کھول دیا جب میں داخل ہوا تو حضرت آدم وہاں تشریف رکھتے تھے، میں نے آپ کو سلام کیا آپ نے جواب سلام دیا، ”مرحبا اچھے بیٹے اور اچھے نبی“ اس کے بعد اسی قسم کے واقعہ کا اعادہ ہے، ہر طبقہ آسمان پر اسی قسم کا سوال و جواب ہوا اور آپ داخل ہوئے دوسرے طبقہ پر آپ نے یوحنا اور عیسیٰ کو دیکھا، تیسرے پر یوسف کو چوتھے پر ادریس کو پانچویں پر ہارون کو اور چھٹے پر حضرت موسیٰ کو دیکھا، موسیٰ رونے آپ سے سبب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ محمد کی اُمت میری اُمت کی بہ نسبت زیادہ تعداد میں جنت میں داخل ہوگی، ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم سے ملاقات ہوئی، اور انھوں نے دُعا مبارکباد دی، اس کے بعد ”سدرۃ المنتہی“ تک گیا اس کے پھل کھار کے برتن کی طرح رکھے، اور اس کی پتیاں ہاتھی کے کان کی طرح تھیں جبرئیل نے کہا یہ ”سدرۃ المنتہی“ ہے اس کے بعد چار دریا تھے، دریا داخلی اور در خارجی میں سے کہا اسے جبرئیل یہ کیا ہیں، انھوں نے کہا یہ دو نو داخلی جنت کے دریا ہیں، اور دو خارجی دریاؤں میں نیل و فرات ہیں،

اب ہم کو پتہ لگانا ہے، کہ وہ کون سے ماخذ ہیں جن سے محمد کے اس معراج کا خیال لیا گیا ہے یہ بہت ممکن ہے، کہ یہ قصہ جس کو پہلے پہل خود محمد نے روایت کیا ایک خواب پر مبنی ہو، اور جس میں معراج کا کوئی ذکر نہ ہو اگر سوتہ بنی اسرائیل کو آخری زمانہ سے متعلق سمجھیں، لیکن ہم لوگ اس روایت سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو احادیث میں مذکور ہے، اور ان حدیثوں میں واقعہ معراج کی جزئیات پائی جاتی ہیں یہ یقین کرنے کے لئے جیسا کہ آئندہ پتہ چلے گا کافی سبب موجود ہے کہ یہ قصہ اسلئے گڑھا گیا، کہ محمد کو تمام انبیاء سے زیادہ سرفراز ثابت کیا جائے، ممکن ہے اس کے اجزاء مختلف اطراف سے لئے گئے ہوں لیکن معراج کا خاص خاص واقعہ ”ارتادرات“ کے واقعہ معراج پر مبنی ہے، یہ کتاب پہلوی زبان میں ہے، اور اس کا نام ”ارتادرات نامک“ ہے آرد شیر با بکان (شاہ فارس کے دور میں یہ کتاب لکھی گئی، اگر مذہب زردشت کے پیروں کی روایت یقین کر لی جائے تو اسکی تصنیف کا زمانہ محمد کی ہجرت سے چار سو برس قبل گزرا ہے، اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ جب گبروں کے پیشواؤں نے دیکھا کہ حکومت ایران میں لوگوں کے دماغ سے زردشت کے مذہب کا اثر زائل ہو رہا ہے، تو انھوں نے تازہ شہادتوں سے اپنے دین کے فروغ کے لئے کوشش کی جسے آرد شیر کے جوش نے اور تقویت پہنچائی، اس لئے انھوں نے ایک نوجوان عالم کا انتخاب کیا جو ایک بزرگ کی طرح زندگی گزارتا تھا

آرد شیر خاندان ساسانیہ کا بانی گذرا ہے، اس خاندان نے ایران پر چار سو پندرہ برس تک حکومت کی، آخری فرمانروا یزدجرد کے زمانہ میں بن دقاہن نے فتح کیا رہٹری آت پر شیا صر جے میلکم

اور اس کو بہترے تقریبات پاکیزگی سے معراج آسمان کے لئے تیار کیا تاکہ وہ دیکھے کہ وہاں کیا ہے اور وہاں سے پتہ لگائے کہ آیا یہ واقعات ان کی مذہبی کتابوں سے ملتے ہیں یا نہیں روایت کی جاتی ہے، کہ جب اس ارتادراف پر بخودی مکی کیفیت طاری ہوئی، اس کی روح نے قدیم فرشتہ ”سروش“ کی رہنمائی میں آسمان کی طرف صعود کی، اور ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ تک گزری تو اسکی روح بلندتر بجھتے ہوئے ”ارمزد“ کے حضور میں پہنچی، جب ارتادراف نے اس طرح سے آسمان پر ہر چیز دیکھ لی، اور وہاں کے باشندوں کی خوش باشانہ زندگی کا معائنہ کیا تو ارمزد نے اس کو اپنا پیغمبر بنا کر زمین پر واپس جانے کا حکم دیا، تاکہ جو کچھ اس نے دیکھا تھا، پیردان زردشت سے بیان کرے، اس کے تمام مشاہدات پوری طرح اس کتاب میں مذکور ہیں جو اسی کے نام پر ہے، تمام و کمال اسکو نقل کرنا غیر ضروری ہے، لیکن چند اقتباسات سے پتہ چلے گا، کہ کس طرح صاف طریقہ سے یہ مسلمانوں کے یہاں محمد کے قصہ معراج کے لئے نمونہ قرار دیا گیا،

”ارتادراف نامک“ میں لکھا ہے

اور میں پہلا قدم طبقہ انجم یا ”ہومت“ پر بڑھاتا ہوں، اور ان مقدس حضرات کی روحوں کو دیکھتا ہوں جن سے روشن ہمارہ کے مثل روشنی بھیلتی ہے، اور وہاں بہت روشن، بلند اور پر شکوہ تخت اور نشستا گاہ ہے، میں نے مقدس ”سروش“ اور فرشتہ ”آذر“ سے دریافت کیا ”یہ کون سا مقام ہے اور یہ کون لوگ ہیں؟“ عبارت بالاکئی تشریح میں یہ بات قابل ذکر ہے، کہ طبقہ انجم مذہب زردشت کے عقیدہ کے مطابق جنت کا اولین اور بہترین دربار ہے، آذر“ اس فرشتہ کا نام ہے جو آگ پر متصرف ہے، ”سروش“ فرشتہ اطاعت ہے، اور مقدس اباب ابدی یا دین زردشت کے قدیم ملائکہ میں سے ہے، اور وہ مختلف آسمانوں پر ارتادراف کا بدرقہ رہتا ہے، جیسا کہ جبرئیلؑ محمد کے بدرقہ ہوتے ہیں

اس روایت سے پتہ چلتا ہے، کہ کیونکر ارتادراف طبقہ قرم یا دوسرے طبقہ، اور طبقہ شمس یا محلات آسمانی کے تیسرے طبقہ میں پہنچتا ہے، اسی طرح وہ طبقاً عن طبعی گزرتے ہوئے ارمزد کے حضور میں پہنچتا ہے، اس ملاقات کا حال مفصلہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :-

”آخر کار قدیم فرشتہ بہمن اپنے جڑاؤ تخت سے اٹھا اور میرا ہات پکڑ کر مجھے ”ہومت“ اور ”ہوخت“ اور ”ہورست“ میں لایا، اسی طرح ارمزد، ملائکہ قدیم، دوسرے مقدس لوگوں، اور پاک خیال زردشت کی روح اور اسی طرح کے دوسرے دیندار آدمیوں، اور خاصان دین سے ملاقات ہوئی ان لوگوں سے زیادہ منور اور بہتر ہستیاں میں نے نہیں دیکھیں، بہمن نے کہا کہ ”یہ ارمزد ہے“ اور میں نے اس کو سلام کرنا چاہا اور اس نے

سن پوری بحث ڈاکٹر ٹنڈل کی کتاب ”ماخذ قرآن“ سے لی گئی ہے

کہا اسے ارتادرات تم پر سلام، مرحبا، تم عالم فانی سے اس مہر اور منور مقام پر آئے ہو، اور اس نے مقدس ”سروش“ اور فرشتہ آذر کو حکم دیا کہ ارتادرات کو بجاؤ، اور نگو کاروں کا تخت اور انعام اور بدرگداروں کی عقوبت دکھاؤ آخر کار مقدس سروش اور آذر فرشتہ نے میرا ہات پکڑا اور وہ لوگ مجھے ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے گئے اور میں نے ان قدیم ملائکہ اور دوسرے فرشتوں کو دیکھا ہے“

اس کے بعد مفصلاً ارتادرات کی زیارت بہشت اور معائنہ دوزخ کا حال، اور جو کچھ اس نے ان کے اندر دیکھا ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کی سیر دوزخ کے بعد قصہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے،

”آخر کار مقدس سروش اور آذر فرشتہ میرا ہات پکڑ کر اس تار یک، خطرناک اور مہیب مقام سے باہر لائے اور ار مزد اور ملائکہ قدیم کے زمرہ میں پہنچایا، اس جگہ نور برس رہا تھا، میں نے ار مزد کو سلام کرنا چاہا، اور وہ مہربان تھا، اس نے کہا اسے وفادار بندہ! ارتادرات! ار مزد کے پرستاروں کے سپنیر! ادا دی دنیا میں جا، مخلوقات سے حق و صداقت کے ساتھ بیان کر، جیسا کہ تو نے دیکھا اور جانا ہے، کیونکہ میں ار مزد یہاں ہوں، جو کوئی صداقت کے ساتھ بولتا ہے، میں سنتا ہوں، تو عقلمندوں سے جا کر گفتگو کر، اور جب ار مزد اس طرح سے بول رہا تھا، میں تعجب کھڑا رہا، چونکہ میں نے ایک رزنی دیکھی، اور جسم نہیں دیکھا میں نے ایک آواز سنی اور جانا کہ یہی ار مزد ہے“

محمد کے قصہ معراج سے ان واقعات کو کیسی ملالت ہے، اس کے بتانے کی ضرورت نہیں

”زردشت نامہ“ میں جس کی تصنیف کا زمانہ غالباً تیرھویں صدی مسیحی ہے، ایک قصہ مذکور ہے، کہ خود زردشت

ارتادرات سے صدیوں قبل آسمان پر گیا اور اس کے بعد اس کو دوزخ کا معائنہ کرنے کی اجازت بھی ملی، وہاں اس نے اہرمن کو دیکھا جو قرآن کے ابلیس کے ساتھ بہت قرین ہے،

یہ قصص آریہ دنیا کے صرت ایرانی حصہ تک محدود نہ تھے، سنسکرت میں بھی اسی قسم کے قصے پائے جاتے ہیں جن میں ایک کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو ”اندرالو کا گینم“ یا ”اندر کی دنیا کا سفر“ کے نام سے مشہور ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ بطل (ہیرو) ار جن نے آسمانوں کا سفر کیا جہاں اس نے اندر کی آسمانی مقام ”ویوتی“ کا معائنہ کیا جو ”ندائم“ نامی گلستان میں واقع ہے، ہندوؤں کی کتاب سے پتہ چلتا ہے، کہ یہاں ہمیشہ جاری رہنے والے چٹے ان تازہ اور سرسبز نباتات کی آبپاری کرتے رہتے ہیں جو اس خطہ جمیل میں آگے ہیں اشجار و نباتات کے درمیان ایک درخت ہے، جس کا نام ”پنشا جاتی“ ہے اور جس کے پھل کو ”امرت“ (بقا) کہتے ہیں اس کو جو شخص کھالیتا ہے، مرتا نہیں ہے، اور جو کوئی اس کے نیچے آرام کرتا ہے، اس کے دل کی جو آرزو ہوتی ہے، پوری ہو جاتی ہے،

پیردان زردشت بھی ایک عجیب درخت کے وجود کا تذکرہ کرتے ہیں جس کو ”ادستا“ میں ”ہواپا“ اور

پہلوی میں ”ہمایا“ کہا جاتا ہے، دو نوعیت سے اس کے معنی ”اچھے پانی پر قبضہ رکھنے والے“ یا ”اچھی طرح سے سیراب ہونے کے ہیں“ ”دندیلہ“ میں اس کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے،

پاک شفا پانی ”پوتیسکا“ سمندر سے ”داؤردکاشا“ سمندر میں بہتا ہے، اور ہمیں سے یہ پانی ”ہو پاپا“ میں پہنچتا ہے، یہاں ہر قسم کے نباتات اگتے ہیں ”ہو پاپا“ اور ”پکشا جاتی“ مسلمانوں کی بہشت کے ”طوبی“ یا ”شجر نیلی“ سے مشابہ ہیں۔

یہ امر قابل لحاظ ہے، کہ اسی قسم کے قصص بعض ہی کتابوں بالخصوص ”ویسیو پالی“ اور ”عہد نامہ ابراہیم“ میں بھی پائے جاتے ہیں ”ویسیو پالی“ میں بتایا گیا ہے، کہ کس طرح پولوس آسمان پر گئے اور بہشت کی چار دریاؤں کو دیکھا اس طرح ”عہد نامہ ابراہیم“ میں بھی ابراہیم کی سیر سادی کا حال بتایا گیا ہے، دو نوکے بارہ میں مذکور ہے، کہ انھوں نے جو کچھ وہاں دیکھا اور تاربان اور محمد کی طرح واپس آکر اہل زبان سے بیان کر دیا حضرت ابراہیم کے متعلق کہا گیا ہے کہ ”اور قدیم فرشتہ میکائیل آپ کو ایک گاڑی پر سوار کر کے ادھر لے گئے اور ان کو آسمان کی فضا میں بلند کیا اور ابراہیم انکو اور فرشتوں کے ساتھ لے کر ابراہیم نے سواری پر ساری سر زمین آباد میں سیر کی“

مسلمانوں کے قصہ میں یہ سواری دوسری صورت اختیار کرتی ہے، چونکہ محمد ”بران“ نامی ایک جانور پر سوار ہوتے ہیں کیونکہ عربوں میں سوار ہونا گاڑی چلانے سے زیادہ متداول ہے لفظ ”براق“ غالباً عبرانی لفظ ”بارق“ (بجلی) سے مشتق ہے جو عربی زبان میں برق ہو گیا گو یہ بھی ممکن ہے، کہ یہ پہلوی زبان سے مشتق ہو،

اب دوسرے امور پر بحث کرنے سے پہلے یہ بات قابل غور ہے، کہ کتاب ”یوحنا“ میں زمین، جہنم، اور آسمان کے عجائبات کی ایک سہولت فرست ہے، جنہیں یوحنا نے اپنے خواب میں دیکھا، اس غیر مستند کتاب نے بلاشبہ ”ویسیو پالی“ اور ”عہد نامہ ابراہیم“ پر اثر ڈالا ہے، اور اس طور سے مسلمانوں کی کہانی پر بھی، لیکن یہ قیاس نہیں کر سکتے کہ ”ارتادراف“ ناکہ، کوہیں ان کتابوں نے اثر پذیر کیا،

بارغ عدن کے شجریات... کے متعلق یہ عجیب و غریب افسانے رکھتے ہیں یہ افسانے اکا دین نصوص سے لئے گئے ہیں جن سے ”مقدس شجر ایتوا“ کی روایت کا پتہ چلتا ہے، ڈاکٹر ہسپرکٹ نے ”نیپور“ کے نزدیک بعض قدیم ترین کتبے پائے ہیں جن میں اس درخت کا تذکرہ پایا جاتا ہے، تفصیل کے ساتھ میں ان واقعات پر بحث کرنا نہیں چاہتا یہودی قصص نے مسلمانوں کی جنت سادی کی روایت کو اثر پذیر کیا مسلمانوں کا عقیدہ ہے، کہ جنت عدن آسمان پر ہے، اس لئے وہ جنت سادی کو اسی صورت میں منتقل کرتے ہیں جس صورت میں یہود نے جنت ارضی کو پیش کیا ہے، اس طور سے ان کو یہی مذہب کی غیر مستند کتابوں سے بھی غلط فہمی ہو گئی ہوگی، کیونکہ چار دریاؤں کا بیان جو ”ویسیو پالی“ میں ہے، بظاہر اسی عجیب و غریب وہم کی پیداوار ہے، یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ ان غیر مستند کتابوں کو یہی مذہب کے کسی فرقہ نے مستند اور وقیح تسلیم نہیں کیا تو ان میں بعض نے کسی زمانہ میں جہلا کی جماعت میں

بہت زیادہ مقبولیت حاصل کر لی تھی، بعض عرصہ سے مشہور ہیں بعض صدیوں گم ہو کر حال میں دستیاب ہوئی ہیں اس کی تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کے درخت طوبیٰ کا واقعہ مذہب زردشت سے ماخوذ ہے، یا یہودیوں سے لیا گیا ہے، یا دونوں سے، کیونکہ مذہب زردشت اور یہود دونوں کے قصص شجر ایک ہی ماخذ کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں لیکن یہودی افسانہ کا اثر اس قصہ پر نہیں پڑا ہے، چار دریا جو محمدؐ نے دیکھے ”ویسپو پالی“ سے لے گئے ہیں ویسپو پالی کے چار دریاؤں کا تخیل عدن کے چار دریاؤں کے مشابہ ہے، اور یہ اس غلط فہمی کی بنا پر حبل سطور بالا میں تبصرہ ہو چکا،

یہ سوال ہو سکتا ہے، کہ بائبل میں یوحنا، ایلیا اور ہمارے آقا (سج) کے معراج کا جو واقعہ مذکور ہے وہ تمام ان قصوں کا جن کا تذکرہ ہوا ہے، ماخذ تو نہیں؟ جن ایرانی اور ہندوستانی قصص کا بیان ہو چکا ہے، ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے سبھی عقیدہ معراج کے متعلق یہ قیاس کرنا مشکل اور غیر ضروری ہے، گو یہ ممکن ہے، کہ بعض ایسے دوسرے افکار و عقاید مسیحیت سے ماخوذ ہیں لیکن اگر یہ ہو بھی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ محمدؐ کے معراج کا قصہ، ان کے متعلق بعض دوسرے قصص کی طرح دوسرے واقعات کے نمونہ پر جیسا کہ ”ارتادرات نامک“ میں مذکور ہے گڑبیا گیا ہے، تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے، کہ وہ بعض حیثیت سے حضرت سح اور دوسرے انبیاء سے جو ان سے قبل گزرے ہیں ملتے ہوئے ہیں۔ گو یہ بیہمت مجموعی مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق آپ تمام انبیاء سے افضل ہیں،“

ڈاکٹر ٹنڈل کے ان سارے ہفتوات کا ماخذ حاصل یہ ہے کہ

(۱) حضرت علیؑ اور انبیاء کے سلف کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے کے لئے معراج کا واقعہ مسلمانوں نے محمدؐ کی وفات کے بعد گھڑ لیا ہے،

(۲) معراج کا واقعہ زردشت مذہب کی ایک کتاب ارتادرات نامک سے ماخوذ ہے، اور اس کے بعض عناصر یہودی اور سکی مذہب کی نامعتبر کتابوں ”ویسپو پالی“ اور ”محمد نامہ ابراہیم“ سے لئے گئے ہیں

(۳) حضرت علیؑ، ایلیا وغیرہ کے واقعہ معراج کو جن کا انجیل مقدس میں تذکرہ ہے، محمدؐ کے معراج سے نسبت نہیں،

انسان مجبور ہے، متضاد عناصر کا وہ اپنے سارے پندار فضل اپنے تمام دعاوی علم و نظر کے باوجود ایک گہری ارکی میں ہے، اور اُس وقت جبکہ تقلید اور عصبیت کے مرض میں وہ مبتلا ہوتا ہے، تو اس کی بصیرت اور بھی ناکارہ ہو جاتی ہے، ہمارے ڈاکٹر صاحب مسیحیت کی کورانہ تقلید، اور اسلام کے ساتھ جعلی تعصب میں یہ بھی خیال نہیں فرماتے کہ آیا جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں ان کی عالمانہ خودداری اور فاضلانہ دعویٰ تحقیق کے منافی تو نہیں؟ یہ کیا ظلم ہے کہ کسی بات کا مضحکہ اڑانے کے لئے تو ایک راوی سے استناد کیا جائے، اور پھر اسی کو مزقہ پرنا معتبر اور غیر ثقہ کہہ دیا جائے، وہ معراج کا واقعہ قرآن کے علاوہ حدیث اور تاریخ سے نقل کر دیتے ہیں اور اس پر اچھی طرح زہر فشاں کیا کرتے ہیں لیکن پھر بھی

یہ کہتے ہیں کہ واقعہ معراج متاخرین نے گھڑ لیا ہے، حالانکہ جس سیرت ابن ہشام اور مشکوٰۃ المصابیح سے وہ واقعہ معراج کی جزئیات پیش کرتے ہیں انہیں کتابوں میں یہ روایت آن حضرت سے مرسل بیان کی گئی ہے، معراج کی حدیثیں ان بزرگان دین اور صالحات عبادات سے مروی ہے جنہوں نے خود آن حضرت کو دیکھا تھا معلوم ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے تمام زبانیں تو سیکھیں لیکن حدیث کے اقسام انہیں معلوم نہوے، معراج کا واقعہ خود آن حضرت نے بیان فرمایا اور پھر حدیث کے مطابق اس کے ماننے میں کوئی عذر کی وجہ نہیں اگر آپ محض خیال کی بنا پر حضرت ابو سعید خدریؓ حضرت عائشہؓ ابن عباسؓ، نبی بی ام ہانیؓ کی شہادتوں کو نہیں مانتے تو پھر میں آپ کی اس تمام کا داد خاد مہ فرسانی کو کیوں تسلیم کرنے لگا، حدیث اور تاریخ کی روایات کو چھوڑے صرف قرآن کے بیان کردہ واقعہ پر تبصرہ کیجئے، لیکن ایک ہی راوی سے ہر ایک وقت آپ کا انناد کرنا اور دوسرے وقت اس کو نامعتبر بتانا علم و ادب سے کس قدر کھلا ہوا تخریب ہے، اگر ڈاکٹر صاحب قرآن کے علاوہ معراج کی جزئیات و احادیث و تاریخ سے پیش کرتے ہیں تو ان کو ماننا پڑے گا کہ معراج کا واقعہ خود آن حضرت نے بیان فرمایا تھا اور متاخرین نے اس کو گھڑا نہیں ہے،

۳۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال بھی عصبیت کا نتیجہ ہے، اور وہ جوش عناد میں روایات کی تطبیق سے کسی صحیح نتیجہ نہیں پہنچتے، آپ نے بلند بانگ دعویٰ کے ساتھ یہ تو سپرد قلم فرمادیا کہ واقعہ معراج "ارتاداران نامک" سے ماخوذ ہے اور اس کے بعض عناصر دیسیو پالی اور عمد نامہ ابراہیمؒ سے لئے گئے ہیں لیکن یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ اسلامی معراج کا واقعہ زردشت مذہب کی اس کتاب سے کیونکر لیا گیا اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں، یا تو "ارتاداران نامک" جس کی تصنیف کا زمانہ ڈاکٹر صاحب آن حضرت کی ولادت سے چار سو برس قبل بتاتے ہیں، ان کی روایت عربوں میں قدیم زمانہ سے مشہور ہو، یا پھر آن حضرت پہلوی زبان کے ماہر ہوں، اور آپ نے بطور خود اس کا مطالعہ کیا ہو، چونکہ اگلے سطور میں یہ ثابت کر دیا گیا ہے، کہ واقعہ معراج خود آن حضرت نے بیان فرمایا تھا، یہ متاخرین کی افسانہ تراشی نہیں ہے تاہم سچ و درایت کے لحاظ سے دونوں صورتیں مستبعد ہیں اگر ارتاداران نامک کے واقعہ سے عرب واقف ہوتے تو آن حضرت کے بیان کی تکذیب اور اس سے استہزائیوں کرتے، حضرت بی بی ام ہانیؓ کی حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے عربوں کے سامنے معراج کا واقعہ پیش کیا تو ان کو تعجب آیا وہ کہنے لگے میں نے ایسا قصہ تو کبھی سنا ہی نہیں پھر آپ حضرت صدیق کے پاس گئے اور ان کو اپنا دمساز بنانے کے لئے تعجب کے ساتھ سارا قصہ بیان کیا جناب صدیق اکبر نے آن حضرت کی تصدیق کی اور اسی دن سے آپ کا لقب "صدیق" ہو گیا، قریش اور کفار کے بڑے بڑے لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا چنانچہ ان میں بعض لوگوں کے نام ابن ہشام نے درج کئے ہیں؛

اسود بن مطلب بن اسد ابو زمعہ (۲) اسود بن عبد یغوث بن وہب بن عبد مناف بن زہرہ (۳) ولید بن

مغیرہ بن عبد اللہ بن عمر بن مخزوم (۴) عاص بن وائل بن ہاشم بن سعید بن ہم (۵) حرث بن طلطلہ بن عمرو بن الحارث

بن عبد عمرو بن ملکان :-

ان لوگوں کی استہزا اور مشرانگیزیوں پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی

فاصلع بما تو مروا دعرض عن المشركين انالفيناك
المستكبرين الذين يجعلون مع الله الها آخر

فسوف يجعلون
کا شریک ٹھراتے ہیں، پس قریب ہے کہ جان لیں

اگر ”ارتادراف نامک“ کی روایت عربوں میں مشہور ہوئی تو کفار و کعب کا اظہار کیوں کرتے، ایسے موقعہ پر تو صرف ”اساطیر
الادین“ کہہ کر مالدیتے، کفار کے تعجب اور استہزا سے صاف معلوم ہو رہا ہے، کہ وہ زردشت مذہب کی اس روایت سے بالکل
نااہل تھے،

دوسری صورت یہ رہ جاتی ہے، کہ آں حضرت پہلوی زبان کے ماہر ہوں گے اس پر بجز مہینے کے ڈاکٹر صاحب سے کیا
کہا جائے، آپ نے کبھی فارس کا سفر بھی نہیں کیا جہاں زردشت مذہب کی یہ مشہور روایت سننے، الغرض ڈاکٹر صاحب کا
یہ لکھنا کہ واقعہ معراج ”ارتادراف نامک“ سے ماخوذ ہے، روایت و درایت دونوں لحاظ سے مستبعد ہے، لہذا ویسیو پانی او
عبدالمنہ ابراہیم سے استفادہ، تو ڈاکٹر صاحب نے محض چار دریاؤں اور درخت طوبی کی حدیث کو ان کتب سے ماخوذ بتایا ہے
معراج کے پورے واقعہ کو وہ ”ارتادراف نامک“ ہی سے استفادہ بتاتے ہیں

(۳) سچیت کے اس پرستار نے اپنے اس دعویٰ میں کچھ ایسی ہٹ دھرمی اور مغالطہ سے کام لیا ہے کہ ایک غیر جانبدار
فاری حیران رہ جاتا ہے، کہ اتنا بڑا نکتہ چین اور نقاد مذاہب اپنے پرستار نہ شفقت میں اس قدر گم کردہ راہ کیونکر ہو گیا
ڈاکٹر صاحب نے بہت بڑا ظلم تو یہ کیا کہ یہ بحث انہوں نے اس مضمون کے فسط لوزٹ میں درج کی ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے،
وہ انجیل مقدس کے بیان کردہ واقعات معراج (عیسیٰ، الیسا وغیرہ) کو منصفہ شہود پر لانا نہیں چاہتے تھے، شاید بعض ثابت
اندیش پادریوں کے مشورہ اور اعتراض سے انہوں نے ضمناً یہ قصہ بھی چھپڑ دیا حالانکہ ضرورت اس کی تھی کہ انجیل مقدس
سے پورے واقعہ معراج کو پیش کیا جاتا اور اس کے بعد آں حضرت کے واقعہ معراج سے اس کا فرق دامتیاز دکھایا جاتا لیکن
ایسا نہیں کیا گیا اور نہ ایسا کیا جاسکتا تھا کیونکہ اس صورت میں ڈاکٹر صاحب کی تمام خردہ بینوں کی داستان صرف قرآن
کے ایک جملہ ”ان هذا الفی الصحت الاولی“ سے بالکل بے معنی بن کر رہ جاتی

عبدالمالک آردی

دنگار، ڈاکٹر ٹسڈل نے واقعہ امرئی یا معراج پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کا جواب دینا اس قدر آسان نہ تھا
جتنا ہمارے دوست مولوی عبدالمالک نے سمجھا۔ سب سے پہلی اصولی غلطی جو جواب دینے میں کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ

جواب کی شان وہی مذہبی دروایتی ہے جسے ایک مسلمان تو مان لیکتا لیکن دوسرا ماننے پر طیار نہیں ہو سکتا۔ اصل اعتراض یہ ہے کہ معراج نبوی کے جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں بالکل اسی طرح کے واقعات قبل اسلام کے دیگر مذاہب میں بھی نظر آتے ہیں اور اس لئے قوی گمان یہی ہے کہ پیروان رسول نے بعد رحلت نبوی اپنے پیغمبر کی اہمیت قائم کرنے کے لئے ویسی ہی روایات گھڑالی ہوں۔ اس لئے جواب کی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ سر سے اس بات کا انکار ہی کر دیا جائے کہ دیگر مذاہب میں اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں لیکن چونکہ یہ ممکن نہیں اس لئے اب دوسری صورت صرف یہی رہ جاتی ہے کہ دیگر مذاہب کی روایات کو بھی صحیح مان کر یہ جواب دیا جائے کہ جس طرح دیگر انبیاء کو معراج ہوئی رسول اللہ کو بھی ہوئی۔ مولوی عبدالملک صاحب نے جو صورت جواب کی اختیار کی ہے وہ نہایت کمزور و غیر تشفی بخش ہے کیونکہ ان کے جواب کی اصل روح صرف یہ ہے کہ واقعہ معراج کو رسول اللہ کے بعد لوگوں نے نہیں گھڑا بلکہ خود رسول اللہ نے بیان کیا اور میرے نزدیک جواب کی یہ صورت بہت زیادہ خطرناک ہے کیونکہ اس سے تو خود رسول اللہ پر الزام قائم ہوتا ہے اور کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اگر تم یہ کہتے ہو تو پھر اس کے معنی یہ ہوتے کہ (معاذ اللہ) خود بخود رسول نے غلط بیانی سے کام لیا۔

دوسرا جواب کہ رسول اللہ کو دیگر مذاہب کی یہ روایتیں کیونکر معاذ اللہ ہو سکتی تھیں جب کہ اُمی تھے اور جبکہ اس وقت عرب میں بھی ان روایتوں کا کہیں چرچا موجود نہ تھا۔ الزام کو دفع نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ یہ سرت آپ ہی کا بیان ہے اور دوسرا اس کا ماننے کے لئے طیار نہیں، علاوہ اس کے معترض کو اس بحث میں پرکھی ضرورت بھی کیا ہے جبکہ اسے واقعہ معراج کے اصل ماخذ کو سامنے لاکر رکھ دیا اور جس سے انکار کرنے کی آپ کو بھی جرات نہیں ہو سکتی۔

اس قسم کے اعتراضات کا جواب اگر روایات سے بالکل ہٹ کر محض اصول و روایت سے نہیں دیا جا سکتا اور ایک غیر مسلم کو اس سے تشفی نہیں ہو سکتی تو ان میں اچھٹنا ہی بیکار ہے۔

نیاز

شہوانیات تاریخ الفخشاء

زیر طباعت ہے اور مارچ ۱۹۳۲ء کے اول ہفتہ میں شائع ہو سکے گی قیمت کا اندازہ معہ محصول عیار کیا جاتا ہے خریداران ننگار کو معہ محصول صرف عاریں ملے گی۔

منیجر ننگار

سیر و کلیو پیرا

(ڈرامہ بر نارڈشا)

تیسرا ایکٹ

(سلسل)

ہیں۔ اپالوڈورس، چوبیس سال کا ایک خوشرو نوجوان ہے۔ حال، فنیات کے جلو میں، سنتری کے پیچھے ہو کر، گھاٹ پر سے گذر جاتے ہیں اور محل تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر وہ اپنی گھڑیوں کو نیچے رکھ دیتے ہیں۔ اور پالتھی مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اپالوڈورس ان کے ہمراہ زمین تک نہیں جاتا بلکہ ٹھہر جاتا ہے اور سنتری کے انہماک سے تفریح حاصل کرتا ہے۔

اپالوڈورس :- (سنتری کو مخاطب کر کے) کون جاتا ہے؟

سنتری :- (بیتابی سے چونک کر، حملہ کرنے کے لئے اپنا ٹلم اٹھاتا ہے) وہ ایک بستہ قدم منہنی نوجوان ہے۔ اسکے بال ٹیلے رنگ کے ہیں۔ اور چہرے سے عمر رسیدگی اور احساس فرضی نمایاں ہے۔

”یہ کیا حرکت ہے۔ کھڑے رہو۔ تم کون ہو؟“

اپالوڈورس :- ”میں سسلی کا اپالوڈورس ہوں۔ ارے میاں، تم لوگ کیا خواب دیکھا کرتے ہو۔ جب سے میں تمہاری بارک میں، اس گول کمرے کے پاس سے داخل ہوا ہوں، اس وقت سے میں اور میرے ہمراہی، تین سنتریوں کے پاس سے گذر چکے ہیں۔ لیکن سب کے سب، منارہ

شاہی محل کے سامنے، گھاٹ کا ایک کناہہ، جہاں سے مغربی ہمت میں، اسکندریہ کی مشرقی بندرگاہ کے آگے، جزیرہ فاروس نظر آتا ہے۔ اس جزیرہ کے اختتام پر وہ مشہور منارہ روشنی ہے۔ جسے ایک تنگ فصیل جزیرہ سے ملاتی ہے۔ یہ سفید سنگ مرمر کا ایک عظیم الشان ستپیل منارہ ہے۔ جو اوپر کی طرف، منزل بہ منزل چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ اس کی آخری منزل پر ایک دھات کا بنا ہوا چراغ ہے۔

گھاٹ کے وسط میں، ایک رومن سنتری، پہرا سے رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ٹلم ہے۔ وہ منارہ کی جانب آگے بھاڑ بھاڑ کر دیکھ رہا ہے اور اپنے بائیں ہاتھ سے آنکھوں پر پھنجی کے ہوسے ہے، ٹلم ساڑھے چار فٹ کی ایک مضبوط لکڑی ہے جس پر تین فٹ لابی لوہے کی ایک نوکدار سلخ لگی ہوئی ہے۔ سنتری اس قدر منہمک ہے کہ وہ ان چار مصری حوالوں کی آمد کو بھی محسوس نہیں کرتا۔ جو گھاٹ کے شمالی حصے سے نزدیک آتے جا رہے ہیں۔ وہ لپٹے ہوئے تین لاسہے ہیں۔ اور ان کے آگے آگے فنا، اپالوڈورس چلے آئے

میرا طرح نظریہ ہے کہ فن کو فن کے لئے اختیار کرنا چاہئے
سنتری :- تمہارا یہ بیان تو کلمہ اجازت نہیں ہے۔

ایپالوڈورس :- یہ ایک عام اجازت نامہ ہے۔

سنتری :- مجھے عام اجازت کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ یا

تو مجھے آج کا کلمہ اجازت بتاؤ۔ یا پھر اپنی دوکان پر

واپس جاؤ۔ (فتاویٰ اس کے کرخٹ لہجے سے غضب ناک ہو کر

چیتے کی سی تیز رفتاری سے دوڑ کر گھاٹ کے سرے پر سے گذر کر

اس کے پیچھے ہوتی جاتی ہے)

ایپالوڈورس :- اگر میں دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہ

کروں تو کیا ہو ؟

سنتری :- تو میں یہ نیزہ تمہارے بدن میں بھونکتا دنگا۔

ایپالوڈورس :- تمہاری مرضی۔ (وہ اپنی تلوار سونت لیتا ہے۔

اور اپنی حفاظت پر تیار ہو جاتا ہے)

فتاویٰ :- (اچانک پیچھے سے سنتری کے ہاتھ پکڑ کر) ایپالوڈورس

اپنا چاقو اس کتے کے حلق میں اتار دو (ہمارا ایپالوڈورس

ہنستے ہوئے اپنے سر کو جنبش دیتا ہے۔ اور سنتری کے پاس سے

اچانک کر محل کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اور اس کے نیزہ کی نوک

جھکا دیتا ہے)

سنتری :- (بے سود کشمکش کرتے ہوئے) تم پر خدا کی مار۔ مجھے

جانے دو۔ اوہ۔ مدد۔ مدد۔

فتاویٰ :- (اسے زمین سے اٹھا کر) اس رومی سانپ کو مار ڈالو

اس کو اپنی تلوار کی نوک پر اٹھا لو۔ (درومی سپاہی

ایک صوبیدار کے ساتھ شمالی گھاٹ کے کنارے سے دوڑتے

ہوئے آتے ہیں وہ اپنے ساتھی کو چھڑاتے ہیں۔ اور فتاویٰ کو دیکھ

دیتے ہیں۔ جو چکراتی ہوئی سنتری کی بائیں جانب گر پڑتی ہے۔)

کی روشنی کے دیکھنے میں اس قدر منہمک ہیں کہ ان میں سے کسی

نے بھی مجھے نہ رد کیا۔ کیا ردیوں کا انتظام ایسا ہی ہو؟

سنتری :- ہم یہاں سمندر کے دیکھنے پر متعین ہیں، خشکی

کے دیکھنے پر نہیں۔ سیرز ابھی فاروس میں اترا ہے

(فتاویٰ کی طرف دیکھ کر) ارے یہ کون ہے۔ اس جبین کی گڑبیا

کا کیا نام ہے؟

فتاویٰ :- ایپالوڈورس، اس رومی کتے کو دہمکاؤ۔ اور اسے

حکم دو کہ اپنی زبان کو، ملکہ کے محل کی مالکہ، فتاویٰ کے

سامنے لگام دے کر رکھے۔

ایپالوڈورس :- میرے دوست۔ یہ ایک جلیل القدر خازن

ہے۔ جسکی سیرز بھی عزت کرتا ہے۔

سنتری :- (غیر متاثر انداز سے قالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

اور یہ کیا چیز ہے۔ ؟

ایپالوڈورس :- ملکہ کا محل آراستہ کرنے کے لئے قالین ہیں۔

میں نے ان کو دنیا کے بہترین قالینوں میں سے انتخاب

کیا ہے۔ اور ملکہ ان قالینوں میں سے اپنی پسند کے مطابق

خود منتخب کر لگی۔

سنتری :- تو تم قالین کے سوداگر ہو۔ ؟

ایپالوڈورس :- میرے دوست میں ایک شریف آدمی

ہوں۔

سنتری :- ایک شریف۔ ایک شریف جو قالین کی دوکان

رکھتا ہے۔

ایپالوڈورس :- میں دوکاندار نہیں ہوں۔ میں پرستار

حسن ہوں اور میرا یہ فرض ہے کہ خوبصورت اختیار کا

خوبصورت شہرہ یوں کے لئے انتخاب کیا کروں۔

صوبیدار :- (ایک پنجاہ سالہ - سخت زبان اور بد تہذیب آدمی ہے - جو ہاتھ میں ایک انگور کی لکڑی کا ڈنڈا لئے ہوئے ہے) کیا ہوا؟ یہ کیا گڑ بڑ ہے؟

فتاتا :- (اپالوڈورس سے) تم نے اس پر کیوں حملہ نہیں کیا۔ اور وقت ہاتھ سے جانے دیا۔

اپالوڈورس :- صوبیدار - میں ملکہ کے حکم سے یہاں

صوبیدار :- (بات کاٹ کر) ملکہ - ہاں - ہاں - (سنتری سے)

اس کو اندر جانے دو۔ بازاری آدمیوں کو ان کے تمام

سامان کے ساتھ ملکہ کے پاس اندر جانے دو۔ لیکن یہ

خیال رہے۔ کہ کوئی ایسا شخص باہر نہ جانے پائے جسے

تم نے اندر نہیں جانے دیا۔ حتیٰ کہ ملکہ تک نہ نکلنے پائے۔

سنتری :- یہ بوڑھی عورت بہت خطرناک ہے۔ اور تین

آدمیوں کے برابر طاقتور ہے۔ وہ سوداگر سے کہہ

رہی تھی کہ مجھ پر چاقو سے حملہ کرے۔

اپالوڈورس :- صوبیدار - میں سوداگر نہیں ہوں۔ میں

ایک شریف آدمی ہوں۔ اور مختلف آرٹ کا ماہر

صوبیدار :- کیا یہ عورت تمہاری بیوی ہے؟

اپالوڈورس :- (خوفزدہ ہو کر) نہیں - نہیں - (اپنے لہجے کو

زخم کرتے ہوئے) وہ میری بیوی نہیں ہے۔ ایک عالی

وقار خاتون ہے۔

فتاتا :- (صوبیدار سے) رومی - میں ملکہ کے گھر کی مہترہ ہوں۔

صوبیدار :- محترمہ ہمارے سپاہیوں سے ذرا علیحدہ ہو

ورنہ مجبوراً مجھے تم کو یہیں ساحل پر دفن کر دینا پڑے گا۔

خواہ تم دس آدمیوں کے برابر طاقتور کیوں نہ ہو۔

(اپنے آدمیوں سے) اپنی اپنی جگہ پر جاؤ (وہ اپنے آدمیوں

کے ساتھ جدہرے آیا تھا اسی طرف چلا جاتا ہے)

فتاتا :- (دفرت آلود نگاہوں سے دیکھ کر) مجھے دیکھنا ہے۔ کہ

آئی سس دیو تا سب سے زیادہ کس سے محبت کرتا ہے

اپنی خادمہ فتاتا سے یا روم کے ایک کتے سے۔

سنتری :- (اپالوڈورس سے، اپنے ڈنڈے کا سر اچھل کی طرف اٹھا کر)

ادہر جاؤ۔ (فتاتا سے مخاطب ہو کر) میرے پاس آ۔ اد

گھڑیال کی خالہ، میں یہ ڈنڈا تیرے حلق میں ڈالوں گا۔

کلیو پیٹرا :- (محل سے پکار کر) فتاتا - فتاتا۔

فتاتا :- (گھبرائے ہوئے لہجے میں) کھڑکی سے ہٹو۔ کھڑکی سے

ہٹ جاؤ۔ یہاں آدمی ہیں۔

کلیو پیٹرا :- میں نیچے آ رہی ہوں۔

فتاتا :- (مضطرب ہو کر) نہیں، یہ تم کیا خواب دیکھ

رہی ہو۔ اپالوڈورس اپنے آدمیوں سے کہو کہ سامان

اٹھا کر جلدی جلدی میرے ساتھ چلیں۔

اپالوڈورس :- ملکہ کے منتظمہ حکم کی تعمیل کرو۔

فتاتا :- (مزدوروں سے) جلدی کرو۔ جلدی (کلیو پیٹرا محل

سے باہر نکل کر گھاٹ پر آجاتی ہے) اوہ - کاش میں

پیدا نہ ہوتی۔

کلیو پیٹرا :- (آرزو مند نگاہوں سے) فتاتا میں نے کچھ سوچا

ہے مجھے فوراً ایک کشتی کی ضرورت ہے۔

فتاتا :- ایک کشتی - نہیں نہیں - تمہیں نہیں مل سکتی۔

اپالوڈورس، ملکہ سے ملو۔

اپالوڈورس :- (خاص انداز سے) حسین ملکہ - میں

سستی کا باشندہ ہوں۔ اور آپ کے لئے دنیا کے

بہترین قالین لایا ہوں۔ آپ اس میں سے خود انتخاب

فرالیں۔

کلیو پیٹرا:- آج قالین کے انتخاب کی مجھے فرصت نہیں، مجھے ایک کشتی کی ضرورت ہے۔
فتانا:- یہ کیا جنون ہے تم شاہی جہاز کے سوا اور کسی چیز پر سمندر میں نہیں جاسکتیں۔

ایالو ڈورس:- بادشاہت جہاز میں نہیں رہتی۔ بلکہ خود ملک میں موجود ہے (کلیو پیٹرا سے) آپ کے قدموں کے چھو جانے سے بدترین کشتی بھی شاہانہ جہاز بن سکتی ہے۔ (وہ ساحل کی طرف پلٹ کر بکارتا ہے) او ملو، ادھر آؤ۔

کلیو پیٹرا:- ایالو ڈورس آج سے تم میرے سردار ہو۔ اور میں اپنے قالین ہمیشہ تمہارے ہی ذریعہ سے خرید کر دوں گی (ایالو ڈورس سر تسلیم خم کرتا ہے۔ گھاٹ کے پاس ایک پتوار اور ایک ملاح نظر آتا ہے جس کا چہرہ دہوپ کی بیش سے سیاہ پڑ گیا ہے، وہ پانی سے نکل کر پتوار ہاتھوں لئے ہوئے سنتری کی رہائی جانے پر خوش رہا ہے اور کہتا ہے) ایالو ڈورس (کرتا ہے) ایالو ڈورس کیا تم کشتی بنا سکتے ہو! ایالو ڈورس:- میرے بازو ہر ضرورت کے لئے حاضر ہیں۔ کس طرف چلنے کا قصد ہے؟

کلیو پیٹرا:- روشنی کے بیٹار کی طرف (وہ اترتی ہے) سنتری:- (اپنے ہونٹوں سے روک کر) کھڑی رہو۔ تم نہیں جاسکتیں۔

کلیو پیٹرا:- (دیر، ہم دوں) تجھے بہ جرات کیونکر ہوئی۔ کیا تو نہیں جانتا کہ میں ملکہ ہوں؟ سنتری:- تجھے یہی علم تھا کہ تم نہیں جاسکتیں۔

کلیو پیٹرا:- اگر تم نے نہ جانے دیا تو میں سیر سے کہہ کر تم کو قتل کرادوں گی۔ سنتری:- اگر میں اپنے حاکم کا حکم مال دوں تو وہ میرے ساتھ اس سے بھی برا سلوک کرے گا۔ کلیو پیٹرا:- فتانا! اس کو پکڑ لو۔

سنتری:- (بہوت ہو جاتا ہے۔ اور نہایت غصے سے فتانا کو گھورتے ہوئے اپنا نیزہ اٹھا کر) بس وہیں کھڑی رہو! کلیو پیٹرا:- (ایالو ڈورس کے پاس پہنچ کر) ایالو ڈورس، اپنے غلاموں سے کہو کہ میری مدد کریں۔ ایالو ڈورس:- ملکہ مجھے ان کی امداد کی ضرورت نہیں۔

(تلوار میان سے کھینچ لیتا ہے) اسے سپاہی بتا کہ تلوار کا مقابلہ تلوار سے کرے گا یا بھالے سے؟

سنتری:- رومی، ایک سسلی کے مقابلے میں! تجھ پر نرا نزل ہو۔ سنبھل جا۔ (وہ اپنے بھالے سے ایالو ڈورس پر وار کرتا ہے۔ جو تیزی سے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے۔ بھالا اس کے سر پر سے سنسناتا ہوا زمین پر گر پڑتا ہے۔ ایالو ڈورس سنتری کا ایک لغزہ لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور سنتری پر تلوار کرتا ہے سنتری بھی تلوار کھینچ کر مقابل کرتا ہے۔ اور جلتا ہے) او حافظ۔ مدد۔ مدد۔

کلیو پیٹرا:- بھاگ کر محل میں اس مقام پر تھاہ لیتی ہے جہاں مزدور سامان کے پاس کھڑے ہوئے ہیں۔ اور ملاح جو فزہ سیر ہیوں کی طرف دوڑتا ہے۔ لیکن نرائی دیکھنے کی غرض سے آخری سیر ہی پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور سنتری فتانا کے حملہ کے خوف سے گھبرایا ہوا۔ اور وہ اپنی تلوار سے اچھی طرح کام نہیں لے سکتا۔

طرح جڑ نہیں دے گئے۔

اپالوڈورس :- (متانت سے) میرے فوجی دوست میں ایک ایسے بھدے ہتھیار سے قتل کئے جانے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہوں۔ اگر میں شکست بھی کھاؤں گا تو اس (تلوار میان سے کھینچ کر) سفید ہتھیاروں کی ملکہ سے۔ اور یہی ایک ہتھیار ایک آرٹسٹ کے لئے موزوں بھی ہے مگر اس وقت جبکہ تم کو یقین ہو گیا ہے۔ کہ ہم رومی حدود سے باہر نہیں جانا چاہتے۔ تو مجھے اجازت دو۔ کہ میں تمہارے سنتری کا خاتمہ کر دوں۔ اور ملکہ کو لے کر چلا جاؤں۔

رسالہ دار :- (سنتری غصہ سے منہ بنانے لگتا ہے) خاموش رہو کلیو پیٹر انجے شاہی احکام کی تکمیل کرنا ہے۔ اس لئے اب تم محل میں جاؤ۔ اور قالینوں کا انتخاب کرو۔ کلیو پیٹر :- (سہل لہجے میں) نہ جاؤں گی۔ میں ملکہ ہوں۔ سیزر مجھ سے اس طرح گفتگو نہیں کرتا۔ جیسے تم کرتے ہو۔ کیا سیزر کے رسالہ دار نے اپنی تہذیب کھودی ہے؟

رسالہ دار :- (زہمی سے) ملکہ میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔ اور یہی میرے لئے اطمینان کا باعث ہے۔

اپالوڈورس :- ملکہ جب کوئی بزدل انسان ایسا کام کرتا ہے جس پر اسے منفعل ہونا چاہیے۔ تو ہمیشہ ہی کہہ دیتا ہے کہ یہ میرا فرض ہے۔

رسالہ دار :- (غصہ سے) اپالوڈورس —

اپالوڈورس :- (بات کاٹ کر نہایت غوی سے) میں اس توہین کا انتقام کسی وقت ضرور اپنی تلوار سے لوں گا۔ کلیو پیٹر سے سننے کے لئے جب تک سیزر کا فرمان ان لوگوں کے پاس

کیونکہ اسے بار بار پیچھے بھی مڑنا پڑتا ہے۔ تاکہ فتا تا کو اپنے پاس نہ آنے دے۔ صوبیدار کئی سپاہیوں کے ساتھ واپس آتا ہے۔ اپالوڈورس کلیو پیٹر کی طرف ہٹ جاتا ہے۔ کیونکہ نئے سپاہیوں کی آمد سے وہ خوفزدہ ہے۔ صوبیدار :- (سنتری کے داہنے جانب آکر) یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہوا ہے؟

سنتری :- (ہانپتے ہوئے) اگر یہ عورت نہ ہوتی تو میں تنہا اس کا جواب دیتا۔ اس کو مجھ سے ڈر رکھو۔ بس بٹھے اتنی ہی مدد کی ضرورت ہے۔

صوبیدار :- سپاہی تم بیان کرو کہ کیا ہوا؟ فتا تا :- صوبیدار اس نے ملکہ کو قتل کر ڈالا ہوتا۔ سنتری :- غلط ہے میں نے چاہا تھا کہ ملکہ یہاں سے نجانی پائے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ کشتی لے کر مینار جانا چاہتی ہے۔ چونکہ مجھے حکم دیا گیا تھا۔ اس لئے میں نے اسکو روک لیا۔ اس پر اس نے اس آدمی کو سیرت پیچھے لگا دیا۔

رسالہ دار :- (کلیو پیٹر سے) کلیو پیٹر میں تم کو بچانے کا ذمہ دار ہوں۔ لیکن سیزر کی اجازت کے بغیر تم باہر نہیں جاسکتیں۔

اپالوڈورس :- یہ بتاؤ کہ جہاں سیزر مقیم ہے وہ رومی حدود میں ہے یا نہیں۔

کلیو پیٹر :- ہاں، ہاں، اب میں پڑے تو اس کا جواب دو۔ رسالہ دار :- (اپالوڈورس سے) جہاں تک تمہارا تعلق ہے اپالوڈورس، تم کو دیوتاؤں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ کہ تم اس ڈنڈے کی مار سے محل کے دروازے میں کیل کی

کی جھنکار آتی ہے، یہ دیکھو ملکہ نے تم سب کے لئے انعامات
بھیجے ہیں۔

سنتری :- (ہمت رکھائی سے، تم نے رسالدار کے احکام
سن لئے۔ بس جاؤ۔ اپنا کام کرو۔

پہلا مددگار :- ہاں تم کو جلد جلا جانا چاہیے۔ جاؤ چل جاؤ
دوسرا مددگار :- (تھیلی کو لپٹائی نظروں سے دیکھ کر) ایک
غریب آدمی کو لالچ نہ دلاؤ۔

اپالوڈورس :- (کلیو پیٹر سے) شہزادوں کی سرتاج۔

رسالدار قریب ہے۔ اور جب رومی سپاہی کا افسر
قریب ہو تو وہ بے ایمانی نہیں کر سکتا۔ مجھے تمہارا
پیغام سیزر کے پاس لے جانا چاہئے۔

کلیو پیٹر :- (جو قالینوں کے درمیان بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی
کیا یہ قالین بہت بھاری ہیں؟

اپالوڈورس :- بھاری ہونے سے کیا حرج ہے۔ یہاں
بہت سے مزدور ہیں۔

کلیو پیٹر :- قالین کشتیوں میں کس طرح رکھتے ہیں؟
کیا ان کو کشتی کے نیچے ڈال دیتے ہیں؟

اپالوڈورس :- نہیں ملکہ چھوٹی کشتی میں نیچے رکھنے سے
کشتی ڈوب جائے گی۔

کلیو پیٹر :- تاہم اگر میں سیزر کو صرف ایک قالین بھیجوں
تو تم اس میں لیجا سکتے ہو؟

اپالوڈورس :- یقیناً۔

کلیو پیٹر :- تم اس کو آہستہ آہستہ لے جانا اور رات
میں اس کی پوری حفاظت کرنا۔

اپالوڈورس :- آپ مجھ پر اعتماد رکھئے۔

نہ آجائے آپ ان کی قیدی ہیں۔

اپالوڈورس :- آپ مجھے اپنے پیغام اور تحفے کے ساتھ سیزر

کے پاس جانے کی اجازت دیجئے۔ اور قبل اس کے کہ
آفتاب سطح بحر کے نصف حصے تک پہنچے گا۔ میں

آپ کی رہائی کا فرمان سیزر کے پاس سے لیکر آجاؤنگا
رسالدار :- (اس کو نفرت سے دیکھ کر) اور اس میں شک
نہیں کہ وہ تحفہ تم خود ملکہ کے ہاتھ فروخت کر دو گے۔

اپالوڈورس :- رسالدار، وہ تحفہ میں بلا معاوضہ ملکہ کی

خدمت میں پیش کروں گا۔ جو مصری حُسن کی بارگاہ
میں ایک پر خلوص دل کا نذرانہ ہوگا۔ اور وہ تحفہ

قالین کا ہوگا۔ جو ان تمام قالینوں میں سب سے
عمدہ قالین ہے۔

کلیو پیٹر :- (تعریف کرتے ہوئے رسالدار سے) اب تم کو مسلم
ہوا کہ تم کیسے جاہل آدمی ہو؟

رسالدار :- (دہم ہوا کر) ہاں ایک بیوقوف اور اس کا
سامان دونوں ایک دوسرے سے بہت جلد جدا

ہو جاتے ہیں۔ (اپنے سپاہیوں کی طرف بھڑک کر) دیکھ دو
آدمی یہاں مقرر کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اس آدمی اور

اس کے سامان کے سوا یہاں سے اور کوئی نہ جانے
پائے۔ اگر وہ پھر یہاں آکر اپنی تلوار سے دہمکائے تو

اس کو قتل کر ڈالنا۔ جاؤ، اپنی اپنی جگہ جا کر پہرہ دو۔
(دو دو اور مددگاروں کو مقرر کر کے چلا جاتا ہے)

اپالوڈورس :- (دوستانہ لہجے میں) میرے دوستو کیا تم محل
میں آکر ان جھگڑوں کو شراب کے پیالوں میں دفن نہ

کر دو گے؟ (وہ اپنی تھیلی نکالتا ہے جس میں روپیوں

ایپالوڈورس :- تو پھر ان کو انجام کیوں نہیں دیتے ؟ وہ دیکھو وہاں کیا ہو رہا ہے (جنوب کی طرف اشارہ کرتا ہے) سنتری :- مجھے تم ایسوں کی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔

ایپالوڈورس :- (شور کرتا ہے) رسالدار۔ دوڑو۔ دوڑو۔ سنتری :- اپنی مجذوبانہ بڑکومت کر (شور مچا کر) ہو ہو۔ خطرہ۔ خطرہ۔

پہلا اور دوسرا مددگار :- خطرہ۔ خطرہ۔ دوڑو۔ دوڑو۔ (رسالدار اپنے محفظوں کو لے کر آتا ہے)

رسالدار :- کیا گڑبڑ ہے۔ کیا بوڑھی عورت نے بھر تم پر حملہ کیا۔ (ایپالوڈورس سے) کیا تم ابھی یہیں ہو؟ ایپالوڈورس :- (اشارہ کر کے) ادھر دیکھو مصری حرکت کر رہے ہیں۔ اور خشکی اور تری دونوں طرف سے حملے کریں گے۔ خشکی پر تو بڑے پل کی طرف سے۔ اور تری میں مغربی ساحل کی طرف سے۔ میرے دوستو جاؤ شکار نکل گیا۔ (متعدد بگلوں کی آوازیں مختلف سمتوں سے آتی ہیں)

رسالدار :- (تیزی سے) دونوں زائد آدمی جنوبی مھاٹا پر جا کر اس خطرہ کی اطلاع دیں، ایک آدمی یہاں پہرہ دے۔ اور باقی سب میرے ساتھ جلد چلو۔

دوہوں مددگار سنتری جنوب کی طرف دوڑتے ہیں۔ رسالدار اور اس کے ہمراہی شمالی جانب جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہی بگل کی آواز آتی ہے۔ چاروں مزدور قالین لے ہوئے۔ فتاتا کے ہمراہ محل سے برآمد ہوتے ہیں)

سنتری :- (ایپالوڈورس کو سنبھال کر) تم بھرنکے (مزدور ٹھہرتے ہیں)

کلیو پیٹرا :- بہت حفاظت سے ! ایپالوڈورس :- اپنی جان سے زیادہ، ملکہ، کلیو پیٹرا :- بہت خوب۔ فتاتا، ادھر آؤ۔ (فتاتا اس کے پاس آتی ہے ایپالوڈورس اسے قالین محل میں لے جانے کو کہتا ہے) نہیں ایپالوڈورس تم کو نہ آنا چاہئے۔ میں خود ہی قالین کا انتخاب کر لوں گی۔ تم کو پسین ٹھیرنا چاہئے۔ (وہ محل میں چلی جاتی ہے)

ایپالوڈورس :- (مزدوروں سے) اس خاتون کے حکم کی تعمیل کرو۔ (مزدور اٹھ کر کام میں لگ جاتے ہیں) فتاتا :- (مزدوروں کو مخاطب کر کے) اس طرف مگر سیرٹھی پر پاؤں رکھنے سے پہلے جو تے اتار ڈالو۔ (وہ قالین لے ہوئے مزدوروں کے ساتھ اندر جاتی ہے۔ اس اثناء میں ایپالوڈورس پل کے کنارے جاتا ہے اور ساحل کی طرف دیکھتا ہے۔ سنتری اس کو نفرت سے دیکھتے ہیں)

ایپالوڈورس :- (سنتری کو مخاطب کر کے) میرے دوست۔ سنتری :- خاموش رہو۔

پہلا مددگار :- اپنی زبان بند کرو۔ دوسرا مددگار :- (پل کے شمالی کنارے کی طرف دیکھ کر) کیا تم ایک لمحو کے لئے ٹھہر سکتے ہو۔ ؟

ایپالوڈورس :- صبر سے کام لے تین سروالے گدھے (وہ آپس میں چمی گولیاں کرنے لگتے ہیں لیکن ایپالوڈورس اس سے خوفزدہ نہیں ہوتا) سنو۔ یہ بتاؤ کہ تم یہاں میری نگرانی کے لئے مقرر کئے گئے ہو یا مصریوں کی؟ سنتری :- ہم اپنے فرائض بخوبی جانتے ہیں۔

فتاتا :- رومی جوان صبر کر۔ اب تو تنہا ہی اپالوڈورس!
یہ قالین کلیو پیڑائے تیزر کو بطور تحفہ بھیجا ہے اس
کے اندر دس بہت نفیس بلوریں جام ہیں۔ اور
مقدس نیلے کبوتر کے ایک ہزار انڈے ہیں۔ میں انہیں
تھکے حوالے کرتی ہوں۔ اس میں سے ایک بھی
ٹوٹنے نہ پائے۔

اپالوڈورس :- میں ذمہ دار ہوں۔ (مزدوروں سے)
چلو اس کو حفاظت سے لے کر کشتی میں رکھو۔
(مزدور بیڑہی پر سے قالین لے کر اترتے ہیں)

پہلا مزدور :- کشتی کو دیکھ کر ان انڈوں میں سے تقریباً
ہر ایک، ایک پونڈ سے زیادہ وزنی ہے۔ یہ کشتی
اتنے بھاری بوجھ کو نہیں اٹھا سکتی۔

ملاح :- (تعب سے نیرٹھیوں پر دوڑ کر) ادا حق مزدور
اد اوشنی کے بچے (اپالوڈورس سے) جناب میری
کشتی ایک دفعہ میں پانچ آدمیوں سے زیادہ لے
جاتی ہے۔ کیا یہ آپ کو اور کبوتر کے انڈوں کو
نہیں لے جا سکتی۔ (مزدور سے) او شریر اوشنی کو
بچے۔ دیوتا تجھے اس حاسدانہ شرارت کی سزا
دیں گے۔

پہلا مزدور :- اس وقت میں تجھے ٹھیک کرنے کے لئے
اپنا کام نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن ٹھیر جا۔ کل تجھے
اس کا مزہ چکھاؤں گا۔

اپالوڈورس :- (بیچ بچاؤ کر کے) ٹھیر جاؤ۔ گرد بڑنہ کرو۔
اگر کشتی ایک ہی تختے کی ہوتی تو بھی میں اس پر تیزر
کے پاس پہنچتا۔

فتاتا :- (پے چینی سے) خدا کے لئے اپالوڈورس اس گٹھری
کی خاطر، خطرہ میں نہ پڑو۔

اپالوڈورس :- محترم خاتون، ڈرو نہیں۔ (مزدوروں سے)
چلو اس کو اٹھا کر پیچھے چلو۔ آہستہ آہستہ وزن
دس دن تک خاک پھاکننا پڑے گی۔ (ملاح گٹھری
لئے ہوئے مزدوروں کے ساتھ سیرٹھیوں سے پیچھے اترتا ہے)

فتاتا اور اپالوڈورس اوپر سے دیکھتے رہتے ہیں)

اپالوڈورس :- آہستہ آہستہ میرے لڑکے۔ میرے بچے۔
دیکھا ایک خوفزدہ ہو کر آہستہ اٹھاؤ۔ اس کو پیچھے رکھ دو۔
اس طرح۔ ہاں اب ٹھیک ہے۔

فتاتا :- (ایک مزدور پر غصہ ہو کر) اس پر پاؤں مت لگا۔
اس پر پاؤں مت رکھ۔ او جانور۔

پہلا مزدور :- (گٹھری پر جڑھتے ہوئے) بی صاحبہ غصہ
نہ ہو سب ٹھیک ہے۔

فتاتا :- (ہانپ کر) سب ٹھیک ہے، تو نے تو میرا
کلیجہ ہلا ڈالا۔ (وہ قریب کی دیوار پر کھڑی ہے۔۔ چاروں
مزدور اب ادھر آ جاتے ہیں۔ اور اجرت دیے جانے کا
انتظار کرتے ہیں)

اپالوڈورس :- ادھر آؤ۔ بھوکو۔ (وہ پہلے مزدور کو کچھ دیتا

ہے۔ جو ہاتھ میں لے کر دوسرے مزدوروں کو دکھاتا ہے۔ سب
جریمانہ دوڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کی
دریادلی سے مسرور ہو جاتے ہیں۔)

پہلا مزدور :- او سخی شہزادے۔

دوسرا مزدور :- اوبازار کے مالک۔

تیسرا مزدور :- اودیوتاؤں کے منظور نظر۔

جو تھا مزدور :- اور مزدوروں کے مربی -

سنتری :- (حاسد اپنے گز سے ان کو دھمکا کر) بھاگ جاؤ کتو۔ یہاں سے منہ کالا کرو۔ (وہ شمال کی جانب پل کی طرف بھاگنے لگتے ہیں۔)

ایلوڈورس :- خدا حافظ فلتا۔ میں مینار پر مصریوں سے قبل ہی پہنچ جاؤں گا۔ (سیر پھوں سے اترتا ہے۔)

فلتا :- جا، دیوتا تجھے جلد پہنچائیں۔ اور میری بیٹی کو محفوظ رکھیں۔ (سنتری جو مزدوروں کا نائب کر رہا تھا واپس آتا ہے اور کشتی کی طرف نظر دوڑاتا ہے جو پیر ہی سے ملی ہوئی کھڑی ہے۔ تاکہ فلتا بھاگ نہ جائے)

ایلوڈورس :- (کشتی چلتے وقت پیچھے سے) خدا حافظ۔ ای گرز مار بہادر،

سنتری :- خدا حافظ سوداگر، ای دوکاندار۔

ایلوڈورس :- ہاں، ہاں، جلدی کر، اے دلیر طاح جلدی کر۔ (وہ پتواری کی آواز کے ساتھ ساتھ گانے لگتا ہے)

سنتری :- (فلتا کو دھمکا کر) اب بی صاحبہ اپنے مرغی خانے کو تشریف لے جائے۔

فلتا :- (گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلاتے ہوئے) اے سمندر کے دیوتاؤ۔ اس کو حفاظت سے ساحل تک پہنچا دو۔

سنتری :- (تعب سے) کسے حفاظت سے پہنچا دو۔ تم کس کی بابت کہہ رہی ہو۔

فلتا :- (نفرت سے دیکھ کر) جاؤ اب تم اس رومی احمق کو ایک کتے کی طرح نکل لو۔ کیونکہ اس نے میری

بیٹی کو سمندر میں جانے سے نہیں روکا۔

سنتری :- کبخت۔ کیا وہ کشتی میں ہے؟ (وہ سمندر کی طرف منہ کر کے شور کرتا ہے) اوطاح۔ اوطاح۔

(اس اثناء میں روفیو۔ صبح کی جنگ کے اختتام کے بعد، مینار کے دروازے کے باہر ایک بڑے لٹھے پر بیٹھا ہوا کھجور کھا رہا ہے۔ اس کا کھجور سے بھرا ہوا خود اس کے دونوں گھٹنوں کے بیچ میں دبا ہوا ہے۔ اور ایک چمڑے کی شراب کی صراحی قریب رکھی ہوئی ہے۔ اس کے پیچھے مینار کے چوڑے چاروں طرف پانی سے بھرا ہوا ہے۔ جس کے اطراف میں ایک فصیل ہے۔ اور بیچ میں دو سیر پھیاں ہیں۔ ایک بوجھل زنجیر روشن مینار سے اس کے سر پر لٹکی ہوئی ہے۔ سیر باہر کی طرف مضطربانہ انداز سے دیکھتا ہوا۔ جو ترے کی سیر پر کھڑا ہوا ہے۔ اور بظاہر بہت بے چین معلوم ہوتا ہے۔)

برئی ٹینس مینار کے دروازے سے برآمد ہوتا ہے)

روفیو :- میرے برطانوی دوست، کیا تم مینار کی چوٹی تک گئے تھے؟

برئی ٹینس :- ہاں میرا خیال ہے کہ دو سو فیٹ بلند ہے۔ روفیو :- وہاں اور کوئی بھی ہے؟

برئی ٹینس :- صرف ایک جر تھیل کو چلانے والا بڈھا اور اس کا بیٹا۔ جس کی عمر تقریباً ۱۴ سال کی ہے۔ روفیو :- کیا کہا۔ ایک بڈھا۔ اور اس کا بیٹا یہ کام کرتا ہے۔ کیا تمہارا مطلب بیس آدمیوں سے ہے۔

برئی ٹینس :- صرف دو۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ ان کے پاس ایک مشین ہے۔ جس میں اُبلتا ہوا پانی

بھرا رہتا ہے۔ یہ مشین میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ کیسے کام کرتی ہے۔ یہ برطانوی طرز کی نہیں ہے۔ وہ اس مشین سے تیل کے پیپے اور لکڑی کے لٹھے ادھر اٹھاتا ہے۔

ہیں۔

رونیو:۔ لیکن۔۔۔

بری ٹینس:۔ مجھے معاف کیجئے۔ جزیرے سے بعض پیغامبر ہمارے پاس آ رہے ہیں۔ مجھے دیکھنا ہے کہ وہ کیا پیغام لاتے ہیں (وہ تیزی سے مینار کے باہر جاتا ہے)۔

سیزر:۔ (غور غور ہونے چوتھے سے اتر کر آتے ہوئے) رونیو، یہ ایک دیوانوں کا سفر رہا۔ ہم کو شکست اٹھانی پڑے گی۔ کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ میرے آدمی جو ٹیلے کے اس پار ہیں، کس طرح کام انجام دے رہے ہیں۔

رونیو:۔ (غصے سے) کیا میں کھانا چھوڑ دوں۔ اور بھوک کا شکار بن کر تمہارے لئے اطلاع ہم پہنچانے جاؤں۔

سیزر:۔ (تسکین دیتے ہوئے) نہیں رونیو نہیں۔ کھاؤ۔

میرے بچے کھاؤ۔ (وہ دوسری طرف بلاتا ہے۔ رونیو بدستور کھجور کھانے لگتا ہے) مصری اتنے بیوقوف نہیں ہو سکتے۔

کہ ہماری جائے پناہ کو تہہ بالا کر کے ہم کو نہ آدبوچیں۔

یہ سب سے پہلا موقع ہے کہ میں ایک خطرہ میں گھر گیا ہوں۔ مجھے مقررہ آنا چاہئے تھا۔

رونیو:۔ ایک گھنٹہ قبل آپ صرف فتح مندی کا اظہار کر رہے تھے۔

سیزر:۔ (معذرت خواہی کے انداز سے) ہاں۔ میں ایک بیوقوف تھا۔ یہ حماقت تھی رونیو۔ لڑکپن تھا۔

رونیو:۔ لڑکپن! ذرا نہیں۔ یہ لو۔ (وہ مٹھی بھر کر کھجور

سیزر کو دیتا ہے)

سیزر:۔ یہ کس لئے ہیں؟

رونیو:۔ کھانے کے لئے۔ تم کو اس کی ضرورت ہے جب ایک رومی تمہاری عمر کو پہنچتا ہے تو وہ اپنے دو بہن کے کھانے کو بھول جاتا ہے۔ کھاؤ یہ وہاں پر بھر دوسرے موقع کی تلاش کرو۔

سیزر:۔ (کھجور نیکر) میری عمر۔ (وہ سر ہلاتا ہے اور ایک کھجور کو دانت سے کاٹتا ہے)۔ ہاں رونیو۔ میں ایک بڑھا آدمی ہوں۔ اور بالکل شکستہ حال۔ (اس کے دماغ پر منجم خیالات کے بادل چھا جاتے ہیں۔ (وہ کھجور کھانے لگتا ہے) اچیلٹس ابھی جوان ہے۔ ٹالمی ایک بچہ ہے (وہ دوسرا کھجور کھاتا ہے) ہاں ہر شخص کا ایک وقت ہوا کرتا ہے۔ اور مجھے بھی اپنا وقت نصیب ہو چکا ہے۔ میں اس کے لیے شکوہ نہیں کر سکتا۔ (بری ٹینس بے حد خوف زدہ ایک صندوق لے کر آتا ہے۔ سیزر اپنے ہوش و حواس پر قابو پالینا ہے۔) کیا خبر لائے؟

بری ٹینس:۔ ہمارے دلیر، ہوڈیائی ملح نے ایک خزانے پر قبضہ کر لیا ہے یہ دیکھو۔ (دو چمڑے کا صندوق سیزر کے پیر کے قریب پڑا دیتا ہے) ہمارے دشمن ہمارے قبضہ میں آ گئے ہیں

سیزر:۔ اس تھیلے میں؟

بری ٹینس:۔ جب تک آپ پوری بات سن لیں صبر سے کام لیں اس خزانے میں وہ تمام مراسلت بند ہی جو پمپئی کے فریق اور یہاں کی معاذ

فوج کے مابین ہوتی تھی۔

سیزر:۔ اچھا

بری ٹینس:۔ (سیزر کی اس سستی سے بچپن ہو کر اس نے صل و افہ کو

نین تاڑا) ہاں تو ہکو اب یہ معلوم ہو جائیگا کہ ہمارے دشمن کون ہیں

ہر اس شخص کا نام جسے آپ کے خلاف سازش کی ممکن ہو ان کا غارت میں ہے۔
سیزر :- ان کو آگ میں بھونک دو۔

بری ٹینس :- ان کو آگ میں ...؟ (وہ ہانپنے لگتا ہے)

سیزر :- ہاں آگ میں! کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنی زندگی کے تین سال ان آدمیوں کی تحقیق اور چھان بین میں صرف کر دوں، جو اس وقت میرے دوست بن جائیں گے جب میں یہ ثابت کر دوں گا۔ کہ یہ دوستی بیٹی کی دوستی سے زیادہ قیمتی ہے یا کیتو کی دوستی سے زیادہ اہم ہے۔ اور جاہل برطانوی کیا میں بل ڈال رہا ہوں۔ کہ محض اس غرض سے جنگ کی تلاش کروں۔ کہ میرے

بچے بہت سخت ہیں؟

بری ٹینس :- لیکن سرکار آپ کی عزت میں روم کی عزت ہے۔

سیزر :- میں اپنی عزت پر انسانی قربانیاں نہیں کرتا۔ اگر تم ان کو نہیں جلاتے تو میں پانی میں غرق کر سکتا ہوں۔ (وہ کاغذات کا تھیلا اٹھالتا ہے۔ اور چوڑے پر سے بچے سمندر میں پھینک دیتا ہے)

بری ٹینس :- سیزر۔ آپ بہت ضبط سے کام لیتے ہیں کیا باغیوں کو بالکل آزادی اس لئے دے دی جائے۔ کہ ان کا ظاہر اور باطن مختلف ہے۔

روفیو :- (کھڑے ہوتے ہوئے) جب جزیرہ کا باشندہ اپنا غلط ختم کر دے تو مجھے بلانا۔ میں اس وقت ابلتے پانی کی مشین دیکھنے جا رہا ہوں۔ (وہ مینار پر چلا جاتا ہے)

بری ٹینس :- او سیزر، میرے بڑے آقا۔ کاش میں آپ کو صرف اس امر پر راغب کر سکتا کہ آپ زندگی پر

سنجیدگی سے غور کریں۔ اسی طرح جس طرح میرے ملک میں لوگ کھرتے ہیں۔

سیزر :- بری ٹینس، کیا وہ حقیقت میں ایسا ہی کرتے ہیں۔ بری ٹینس :- کیا آپ وہاں نہیں رہے؟ کیا آپ نے ان کو نہیں دیکھا؟ ایک برطانوی کیسی گفتگو کرتا ہے۔ جیسی آپ اپنے لمحات فرصت میں کرتے ہیں۔ کون برطانوی مقدس عبادتوں میں شریک ہونے سے بے اعتنائی کرتا ہے، کون برطانوی بچا نیلے رنگ کے آپ کی طرح مختلف رنگ کے کپڑے پہنتا ہے۔ یہ ہمارے لئے اخلاقی سوالات ہیں۔

سیزر :- اچھا اچھا۔ میرے دوست، جب میں گھمبے چین سے بیٹھوں گا۔ تو شاید ایک چغہ بنواؤں گا۔ اس وقت تک مجھے اپنی رومی ہی وضع قطع میں رہنے دو۔

(اپالوڈورس مینار کے پاس آتا ہے۔) کہو کیسے آئے؟
بری ٹینس :- (تیزی سے پلٹ کر افسرانہ تکنت سے اجنبی سے استفسار کرتے ہوئے) یہ کیا ہے، تم کون ہو؟
اپالوڈورس :- گھبراؤ نہیں میرے دوست۔ میں تم کو کھانا نہ جاؤں گا۔ میں اسکندریہ سے سیزر کے لئے ہمیشہ قیمت قالین کا تحفہ لایا ہوں۔

سیزر :- اسکندریہ سے!

بری ٹینس :- یہ سیزر ہیں۔

روفیو :- (مینار کے دروازے پر آتے ہوئے) کیا

قصہ ہے۔؟

اپالوڈورس :- مبارک۔ سیزر اعظم۔ میں سسلی کا ماہر

فنون لطیفہ، اپالوڈورس ہوں۔

برمی ٹینس :- ماہر فنون ! انھوں نے اس مکار کو آئے کیوں دیا۔؟

سیر :- بھلے آدمی آپالوڈورس مشہور ماہر فنون لطیفہ کو برمی ٹینس :- (دکھائی ہے) میں جناب سے معافی مانگتا ہوں

(سیر سے) میں نے سمجھا کہ وہ خود کو ایک پیشہ ور بتا رہا ہے۔ (کسی قدر منہ بگاڑ کر وہ اپالوڈورس کو سیر کے پاس آنے

کی اجازت دیتا ہے۔ اور خود ہٹ جاتا ہے۔ روٹیو، اپالوڈورس کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر دوسری طرف جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

سیر :- اپالوڈورس ! میں تم کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ تم کس لئے یہاں آئے ہو؟

اپالوڈورس :- آپ کی خدمت میں ملکہ کی طرف سے تحفہ پیش کرنے کے لئے !

سیر :- وہ کون ملکہ ہے؟

اپالوڈورس :- ملکہ مصر۔ کلیو پیٹر۔

سیر :- (انتہائی مہماندہ انداز سے) اپالوڈورس یہ تحفہ تحائف پیش کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ملکہ کے پاس جاؤ۔ اور

اس سے کہو کہ یہاں کے حالات اطمینان بخش رہے تو شام تک محل واپس آؤں گا۔

اپالوڈورس :- سیر۔ میں واپس نہیں جاسکتا۔ جوہنی کہ میں اس دشمن مینار کے پاس پہنچا۔ کسی بیوقوف نے ایک چمڑے کا تھیلہ سمندر میں پھینک دیا۔ جس

سے میری کشتی کا ایک سرائوٹ گیا۔ اور مجھے ذرا بھی موقع نہ ملا کہ میں کنارے پہنچ کر اس کو ڈبٹے

سے بچاؤں۔

سیر :- اپالوڈورس۔ مجھے افسوس ہے۔ اس نالائق کو سزا دی جائے گی۔ خیر۔ مگر یہ تو جادو کہ تم میرے لئے کیا تحفے لائے ہو؟ اگر میں ان کو نہ دیکھوں گا تو ملکہ کو صدمہ ہوگا۔

روٹیو :- کیا ہمارے پاس اتنا فضول وقت ہے۔ کہ اس کھیل میں ضائع کریں۔ ملکہ تو بالکل بچہ ہے۔

سیر :- ہاں ایسا ہی ہے۔ اسی لئے تو ہم کو اس کی دل شکنی نہ کرنی چاہئے۔ اپالوڈورس۔ کیا تحفہ ہے؟

اپالوڈورس :- سیر! یہ ایک ایرانی قالین ہے۔ اور اس کے اندر، جیسا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے۔ کبوتر کے انڈے، شراب کے بلوری جام اور بہت سی قیمتی چیزیں ہیں۔ مجھے اس کو اس سیرٹھی پر سے لیجانے کی ہمت نہیں پڑتی۔

روٹیو :- تو اسے جرتھیل کے ذریعہ اٹھاؤ۔ انڈے ہم باورچی کے پاس بھیج دیں گے۔ شراب ان پیالو میں نوش کر لیں گے۔ اور قالین پر سیر لیٹا کرے گا۔

اپالوڈورس :- کیا کہا۔ ہر جرتھیل۔ سیر۔ مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں اس قالین کو اپنی جان کے برابر سمجھ کر آپ کے حوالے کروں۔

سیر :- (متر سے) تو بہتر ہے تم بھی اس کے ساتھ لٹک جاؤ۔ تاکہ اگر زنجیر ٹوٹ جائے تو کبوتر کے انڈوں کے ساتھ تم بھی فنا ہو جاؤ، (وہ زنجیر کے پاس جاتا ہے اور اسکو غور سے دیکھنے لگتا ہے۔)

سیزر:- میرے بچے رو فیوڈر و نہیں۔ جب پہلا مسری اپنا پہلا قدم پل پر رکھے گا تو طیل آگا ہی بنے گا۔ اور ہم دونوں اپنے اپنے کونے سے نکل کر قتل اس کے کہ مصری اپنے گھروں سے نکلے وہاں پہنچیں اور بچے کے پاس پہنچ جائیں گے، ہم دونوں، میں جو کہ ایک بڑھا آدمی ہوں اور تم جو اس کے سب سے بڑے بیٹے ہو۔ اس لئے چپ لہو۔ اور لاؤ مجھے چند کھجوریں اور دو۔

اپالوڈورس:- (بچے سے) ہاں۔ اوپر کھینچو۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔ (زنجیر ادھر کھینچتی ہے۔ اور پھر مینار کے پیچھے سے سامنے آجاتی ہے۔ اپالوڈورس قالین کے ایک کنارے سے چمٹا ہوا۔ ہوا میں لٹکتا رہتا ہے۔ اور جیسے جیسے وہ فصیل سے ادھر جاتا ہے گانا شروع کرتا ہے۔) ہاں اب ٹھیک ہے۔ ٹھیک جاؤ ایک چکر اور۔ (چلا کر) اب نیچے جھکاؤ۔ (زنجیر نیچے اترنے لگتی ہے۔)

اپالوڈورس:- (زور سے) آہستہ آہستہ، انڈوں کا خیال رہے۔

رو فیو:- (زور سے) بس ٹھیک ہے۔ آہستہ آہستہ۔

(اپالوڈورس مع قالین کے پلیٹ فارم پر آہستہ سے اتار دیا جاتا ہے۔ رو فیو اور سیزر اپالوڈورس کو زنجیر سے علیحدہ ہونے میں مدد دیتے ہیں۔)

رو فیو:- ادھر کھینچ لو۔

(زنجیر ایک کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ان کے سر پر اٹھتی ہے بری ٹینس مینار سے باہر آکر قالین کی رسیاں کھولنے میں مدد دیتا ہے۔)

اپالوڈورس:- (رسیاں کھلنے کے بعد) اب ذرا ادور کھڑے

اپالوڈورس:- (بری ٹینس سے) کیا سیزر سنجیدگی سے کہہ رہا ہے؟ بری ٹینس:- اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ کیونکہ وہ اطالوی ہے۔ لیکن جو کچھ وہ کہتا ہے بے معنی نہیں ہوتا۔ اپالوڈورس:- سنجیدہ ہو یا نہیں۔ اس نے ٹھیک کہا ہے اب مجھے ایک فوجی دستہ دو۔ تاکہ جرنیل سے کام لیا جائے۔

بری ٹینس:- جرنیل کو مجھ پر پھوڑ دو۔ جاؤ۔ اور زنجیر کو نیچے آنا ہوا دیکھو۔

اپالوڈورس:- بہت خوب۔ تم مجھے وہاں لمحہ بھر میں ایک سورج کی طرح اپنا خزانہ لئے ہوئے طلوع ہوتا ہوا پاؤ گے (وہ جس طرف سے آیا تھا اسی طرف اہل جاتا ہے۔ اور بری ٹینس مینار میں داخل ہوتا ہے)

رو فیو:- (بے پروائی سے) سیزر، کیا تم ان احمقانہ باتوں کے لئے یہاں ٹھہرے رہو گے؟

سیزر:- (جرنیل کے متحرک ہونے وقت پیچھے ہٹ کر) کیوں نہیں؟

رو فیو:- یہ مصری آپ کو، کیوں نہیں؟ کا مزہ چکھائیں گے، اگر ان کی سمجھ میں آگیا کہ قبل اس کے کہ ہم اپنی مورچہ بندی ختم کر چکیں۔ وہ ہم پر حملہ کر دیں تو پھر کچھ کرنے دھرتے نہ بن پڑے گا۔ ہم کس قدر بے وقوف ہیں کہ یہاں ایک کبوتر کے انڈوں سے بھرے ہوئے قالین کو دیکھنے کے لئے بچوں کی طرح ٹھہرے ہوئے ہیں۔ (زنجیر بہت بلند ہو جاتی ہے۔ تاکہ فصیل میں نازک سکے۔ بھر وہ مینار کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔)

اوپر گر اور کشتی ڈوب گئی۔ اور پھر میں ادھر لٹکانی گئی اور پتے اتاری گئی۔

سینئر:- ریٹھ پر ہاتھ بھیر کر جب وہ اٹھ کر سیزر کے گلے سے لٹ جاتی ہے۔ خیر اس کا خیال نہ کر۔ تم اب یہاں بالکل محفوظ ہو۔ ہر طرح مطمئن رہو۔

روفیو:- اچھا اب یہ یہاں پہنچ گئی تو ہم اس کے ساتھ کیا سلوک کریں؟

برمی ٹینس:- سیزر وہ بغیر کسی خادمہ کے یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔ کلیو پیٹرا:- (سیزر سے جو بے مدتیجہ ہو جاتا ہے) کیا تم مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوئے؟

سینئر:- نہیں۔ نہیں۔ میں بہت خوش ہوا ہوں۔ مگر روفیو بہت غصتہ ہو رہا ہے اور برمی ٹینس خیر ہے۔

کلیو پیٹرا:- (دفتر سے) تم ان کے سر قلم کر سکتے ہو۔ کیا نہیں؟

سینئر:- میری سمندری جڑیا۔ یہ سر قلم کرنے کے بعد اتنے مفید ثابت ہوں گے، جتنے اب ہیں۔

روفیو:- (کلیو پیٹرا سے) اب ہم کو فوراً جا کر تمہارے بعض مصروفوں کے سر قلم کرنا پڑیں گے۔ اگر ہم شکست کھا کر تم کو تنہا چھوڑ دیں اور تمہارے چھوٹے بھائی کو یہ موقع دیں کہ وہ تم کو گرفتار کر لے تو تم اس امر کو کن نظروں سے دیکھو گی؟

کلیو پیٹرا:- لیکن تمہیں مجھ کو اکیلا نہ چھوڑنا چاہئے۔ سیزر تم مجھے اکیلا نہ چھوڑ دے۔ کیا چھوڑ دو گے؟

روفیو:- کیوں نہیں! جب بگل بجے گا۔ اور ہماری جانیں سیزر پر منحصر ہوں گی کہ وہ مورچہ پر مصروفوں کے پہنچنے سے قبل پہنچ جائے۔ اؤنٹ؟

ہو جاؤ۔ میرے دوستو۔ اور سیزر کو دیکھنے دو۔ (وہ قالین کھول دیتا ہے)

روفیو:- بس صرف شال کا ایک گٹھرا اور انڈے؟

اپالوڈورس:- سیزر قریب آؤ۔ اور ان دو شالوں میں ان کو تلاش کرو۔

روفیو:- (تلوار کھینچ کر) ہوں۔ دغا بازی۔ سیزر پتے کھڑے رہو۔ میں نے ان دو شالوں میں ایک حرکت سی محسوس کی ہے۔ اس کے اندر ضرور کوئی زندہ چیز ہے۔

برمی ٹینس:- (تلوار کھینچ کر) اس کے اندر سانپ ہے۔ اپالوڈورس:- کیا سیزر میں اتنی جرأت ہے کہ جہاں سانپ حرکت کرتا ہو۔ وہاں اپنا ہاتھ ڈال دے؟

روفیو:- (اس سے مخاطب ہو کر) دغا باز کتے۔

سینئر:- خاموش رہو۔ اپنی اپنی تلواریں میان میں رکھ لو۔ تمہارے سانپ کا نفس باقاعدہ معلوم ہوتا ہے (وہ اپنا ہاتھ دو شالوں میں ڈال دیتا ہے۔ اور ایک عڑیاں ہاتھ باہر نکالتا ہے۔) یہ ایک چھوٹا حسین سانپ ہے۔

روفیو:- (دوسرا ہاتھ نکال کر) ہم کو دوسرا ہاتھ بھی نکالنے دو۔ (دونوں کلیو پیٹرا کی دونوں کلاٹیاں پر ہر طرف دیکھتے ہیں۔ اور اسے بیٹھا ہوا پاتے ہیں۔ برمی ٹینس خوفزدہ ہو کر اپنی تلوار میان میں رکھ لیتا ہے۔)

کلیو پیٹرا:- (ہانپتے ہوئے) اوہ۔ میں بالکل گرد میں دفن ہو گئی۔ اوہ سیزر۔ ایک آدمی کشتی میں تجھ پر کھڑا ہوا۔ اور ایک بڑا بھاری تھیلا آسمان سے میرے

برمی ٹینس :- (فصیل کے ادب سے) سیزر، ہم بڑی طرح
پھنس گئے، مصری مغربی ساحل کی طرف سے
ہمارے اور مورچے کے درمیان اتر آئے ہیں۔
روفیو :- (دیکھنے کو دوڑتا ہے) - سچ ہے ہم ایک چوہے کی
طرح پھنس گئے ہیں۔

سیزر :- (لڑی سے) روفیو۔ ڈوئیو۔ افسوس ہے۔ کہ
میں نے اپنے مورچے کے آدمیوں کو مار ڈالا۔
روفیو :- (فصیل سے ترکر سیزر کی دائیں جانب آکر) ہاں اور
یہ نتیجہ ہے۔ اس لڑائی کے ساتھ کھیلنے کا۔

ایالوڈورس :- (فصیل کی طرف دیکھ کر سیزر۔
سیزر :- ہم نے دیکھ لیا۔ میرے دوست اب ہم کو یہاں
حفاظت کرنی چاہئے۔

ایالوڈورس :- میں نے سیزر ہیوں کو سمندر میں پھینک
دیا ہے۔ وہ بغیر اس کے یہاں نہیں آسکتے۔
روفیو :- ہاں اور ہم باہر نہیں جاسکتے۔ کیا تم نے یہ بھی
سوچا تھا۔؟

ایالوڈورس :- کیوں نہیں جاسکتے؟ مشرقی بندر پر
جہاز موجود ہیں۔

برمی ٹینس :- (امید افزا انداز سے) یہ ہوڈیا کے جہاز
ہمارے لئے تیار کھڑے ہیں (سیزر فوراً برمی ٹینس
کے پاس جا پہنچتا ہے)

روفیو :- (ایالوڈورس سے) اور یہ تو بتا کہ ہم ان جہازوں
تک کس راستے سے جائیں؟

ایالوڈورس :- اس سڑک سے جو ہر طرف جاتی ہے
(وہ اپنا کوٹ اور ٹوپی پھینک دیتا ہے اور تلوار کے ساتھ باندھ لیتا ہے)

لیویو پیرا :- انھیں مر جانے دو۔ وہ صرف سپاہی ہیں
سیزر :- (سنجیدگی سے) کلیویو پیرا۔ جب بگل بجتا ہے
تو ہم میں سے ہر ایک کو اپنا سر ہتیلی پر رکھنا پڑتا
ہے۔ اور اسے موت کے منہ میں ڈال دینا پڑتا ہے
اور اپنے سپاہیوں میں سے جنھوں نے مجھ پر کابل
اعتماد کیا۔ ایک بھی ایسا نہیں ہے۔ جس کا ہاتھ
میں تمھارے سر سے زیادہ مقدس سمجھ کر نہ پکڑوں۔
کلیویو پیرا گھبرا جاتی ہے اس کی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہیں،
ایالوڈورس تم کو چاہئے۔ کہ ان کو واپس محل لے جاؤ
ایالوڈورس :- کیا میں کوئی جھپٹی ہوں کہ ابھی پیٹھ پر
جو ان عورتوں کو بٹھا کر لے جاؤں؟ میری کشتی
تو ڈوب گئی۔ اور آپ کی کشتیاں یا تو مورچے پر
ہیں یا شہر واپس جا چکی ہیں۔

لیویو پیرا :- (آنسو بہاتے ہوئے) میں واپس نہ جاؤں
گی۔ کسی کو میری پروا نہیں ہے۔

سیزر :- کلیویو پیرا۔

لیویو پیرا :- تم چاہتے ہو کہ میں مار ڈالی جاؤں؟
سیزر :- میری بھولی لڑائی۔ (زیادہ سنجیدگی سے) اس

وقت یہاں تمھاری جان کی وقعت تمھارے
سوا۔ اور کسی کو نہیں ہے (اس امر سے شکستہ دل
ہو کر وہ نیچے گر پڑتی ہے۔ اور رونے لگتی ہے۔ بیکار بہت
دور بگل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اور ایک شور بلند ہوتا
ہے۔) روفیو ادھر آؤ۔

لیویو پیرا :- (گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس سے چہیتے ہوئے) سیزر
مجھے تمہارا چھوڑو (وہ اس کا دامن مضبوط پکڑ لیتی ہے۔)

سیرت :- روئیو- آڈ میں ایک ہفتہ کی تنخواہ کی شرط یہ کہ
تھامے ساتھ جازنگ دوڑوں گا۔

کلیو پیٹرا :- لیکن میں میرا کیا انجام ہوگا؟
سیرت :- میں تم کو ڈالین مچھلی کی طرح اپنی پیٹھ پر لیجاؤں
روئیو :- جب تم مجھے سطح پر ابھرتے دیکھو تو اسے اندر ڈالنا
پھر میں بتاؤں گا۔ تم دونوں۔

کلیو پیٹرا :- نہیں۔ نہیں۔ نہیں میں ڈوب جاؤں گی۔
بری ٹینس :- سیرت میں ایک آدمی ہوں، ایک برطانوی
ہوں، مچھلی نہیں۔ مجھے کشتی کی ضرورت ہے۔ میر
اس کے بغیر نہیں تیر سکتا۔

کلیو پیٹرا :- اور نہ مجھے تیرنا آتا ہے۔
سیرت :- (بری ٹینس سے) تو پھر یہاں اکیلے ٹھہرو۔ جب
تک کہ میں یلنار پر دوبارہ قبضہ نہ کر لوں۔ تم کو فراموش
نہ کروں گا۔ اچھا روئیو۔

روئیو :- کیا تم نے اس حماقت کی تکمیل کا ارادہ کر لیا؟
سیرت :- ہاں اس کے سوا یہاں اور کیا کرنا ہے۔

(وہ سیرتھیوں پر سے چڑھ کر کنارے پہنچ جاتا ہے)
بری ٹینس :- (بے صبری سے) سیرت صرف ایک آڑ
لفظ۔ جب تک تم اپنے کپڑے نہ تبدیل کر لو۔
اسکندر یہ کے کسی حصہ میں سے نہ گذرنا۔

سیرت :- (سمندر کی طرف زور سے) اپالو ڈورس (وہ
آسمان پر سفیدی کی طرف اشارہ کرتا ہے)

اپالو ڈورس :- کیا نیچے سبزہ پر انخوانی رنگ ہے؟
سیرت :- (تعریف کرتے ہوئے) آہا۔ (وہ کود پڑتا ہے)

کلیو پیٹرا :- (سیرتھیوں پر خوفزدہ ہو کر دوڑتے ہوئے) اوہ

روئیو :- تم کس کا ذکر کر رہے ہو؟
اپالو ڈورس :- میں تم کو دکھاتا ہوں (بری ٹینس کو پکار کر)
سب سے قریب جہاز یہاں سے کتنی دور ہے؟
بری ٹینس :- بچاس گز۔
سیرت :- نہیں۔ نہیں وہ بہت دہ ہیں۔ کم سے کم ریب میل
اپالو ڈورس۔

اپالو ڈورس :- خوب۔ تو جب تک میں تم کو اس جہاز
سے ایک کشتی روانہ کروں تم یہیں اپنی حفاظت
کرتے ہو۔

روئیو :- تمہارے پر دار باز وہیں شاید؟
اپالو ڈورس :- ہاں، ہیں دیکھو، (سیرت اور بری ٹینس
کے درمیان کی سیرتھیوں پر چڑھ کر فیصل کے کنارے پہنچ
جاتا ہے۔ اور سر نیچا کر کے سمندر میں کود پڑتا ہے)

سیرت :- (ایک مدرسہ کے طالب علم کی طرح متعجب ہو کر) اوہو
اوہو۔ (کوٹ اتار کر) زہرہ کی قسم میں بھی ایسا
ہی کروں گا۔

روئیو :- (اسے بکرا کر) تم دیوانے ہو۔ تم نہیں کر سکتے۔
سیرت :- کیوں نہیں کر سکتا۔ کیا میں اس کی طرح
نہیں تیر سکتا؟

روئیو :- کیا ایک بڑھا ایک جوان کی طرح ہاتھ پاؤں مار
کر تیر سکتا ہے؟ اس کی عمر صرف پچیس سال
کی ہے۔ اور تمہاری بچاس برس کی۔

سیرت :- (بھڑاتے ہوئے) بڑھا۔!
بری ٹینس :- (بھرت زدہ ہو کر) روئیو۔ تم اپنے آپ کو
بھول گئے ہو۔

جراثیم کی دنیا کا مطالعہ کیجئے تو عقل انسانی اور زیادہ حیرت زدہ رہ جاتی ہے کیونکہ بعض جراثیم ایسے ہیں جنکی عمر صرف بس منٹ کی ہوتی ہے، لیکن اس کے بعد وہ پھر زیادہ تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر فنا ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک برابر جاری رہتا ہے۔ جب تک ایک معتدل درجہ حرارت کا ان کی پیدائش کے لئے باقی رہتا ہے۔ پھر کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ اگر ایک پیالی زراب دودھ کی پانچ دن تک رہنے دی جائے تو اس میں کتنے جراثیم پیدا ہو جائے ہیں کہ اگر ان سے ایک فلاف طیار کیا جائے تو کرہ زمین سے زیادہ بڑے کرے کو ڈھکنے کے بعد بھی پخت رہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب آپ اس خراب دودھ کو زمین پر پھینک دیتے ہیں تو جراثیم فنا ہو جاتے ہیں اور دس ارب جراثیم میں سے کوئی ایک جراثیم باقی رہ جاتا ہے جو پھر رفتہ رفتہ اپنی نسل کو اسی طرح بڑھاتا ہے اور پھر قدرت اسے فنا کر دیتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہی منظر بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ جوں جوں، نباتات و حیوانات میں ترقی ہوتی جاتی ہے ان کی پیداوار بھی گھٹتی جاتی ہے۔ تاریخ انسانی کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک وہ وحشی و غیر تمدن ہوا۔ اولاد کثرت سے ہوتی اور مرتی رہی، لیکن رفتہ رفتہ تہذیب و تمدن کے ساتھ ولادت و وفات دونوں میں کمی پیدا ہونے لگی۔

ترقی یافتہ حیوانات میں آپ ہاتھی کو دیکھئے کہ عمر بھر میں اس کے چند ہی بچے ہوتے ہیں۔ لیکن ماں باپ دونوں ان ساتی حفاظت کرتے ہیں کہ مرتے نہیں دیتے۔ بعض بچے درجہ کے حیوانات میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ پانی کا ایک کپڑا ہے جسے نیرس کہتے ہیں۔ یہ سال میں صرف چند انڈے دیتا ہے لیکن اپنی اور انڈوں کی حفاظت کے لئے ایک نلکی سی طیار کر لیتا ہے۔ اور ہر وقت اپنی دم کو حرکت دیتا رہتا ہے تاکہ پانی کی کافی مقدار اندر آتی رہے۔ اور انڈے زراب نہ ہونے پائیں۔ کھٹل کو دیکھئے کہ کیسے محفوظ مقامات میں انڈے دیتا ہے اور چھپنے میں کیسی مہارت رکھتا ہے۔ اسی طرح بعض نباتات کی حفاظت کا بھی انتظام قدرت نے کیا ہے۔ چنانچہ کوکو اور درخت کے بیج کو دیکھئے۔ کہ اس کے اوپری خول کے نیچے ہوا بھری ہوتی ہے اور وہ اس کو عرصہ تک خراب نہیں ہونے دیتی۔ یہ درخت اکثر ساحلوں پر ہوتا ہے اس لئے جب اس کے تخم گر کر کر سمندر یا دریا میں پہنچ جاتے ہیں تو یہی خول حفاظت کرتا ہے۔ اور تخم کو مٹرنی نہیں دیتا۔ پھر جب پانی کی موجیں اسے کسی اور ساحل پر پہنچا دیتی ہیں تو یہ ہفتوں بلکہ مہینوں تک اسی طرح بڑا رہتا ہے۔ اور خول کی سختی کی وجہ سے اسے کوئی جانور کھاتا نہیں، پھر رفتہ رفتہ زمین کے اندر پہنچ کر اس کا خول بھٹتا ہے اور درخت نمودار ہوتا ہے۔

ایک اور درخت ورتاسم ہے جو سال میں سات لاکھ بیج پیدا کرتا ہے اور جن میں سے ۶ لاکھ بیج نشوونما کی ملاحیت رکھتے ہیں جنہیں ہوا اطراف عالم میں اڑا کر لے جاتی ہے، لیکن ان میں سے صرف سو تو اگتے ہیں باقی فنا ہو جاتے ہیں۔ پھر جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے یہ نسبتاً کم ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ چند سال کے بعد صرف ایک یا دو تخم ایسے

پائے جاتے ہیں جو بار آور ہوتے ہیں ورنہ سب فنا ہو جاتے ہیں۔
 تاریخ حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بہت سے درخت یوں ہی رفتہ رفتہ فنا ہو جاتے ہیں۔
 اسی طرح بہت سے جانور بھی صفحہ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ چنانچہ دنیا سورا جانور جو کسی وقت لاکھوں کی تعداد میں
 پایا جاتا تھا۔ اب اس کا کہیں وجود نہیں ہے۔ اور کسی کسی مقام پر اس کے صرف ڈھانچے یا برف کے پیچے دبے ہوئے
 انڈے نظر آ جاتے ہیں۔ اس وقت کے جانوروں میں چیتا کی نسل بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اور بہت جلد یہ بھی صفحہ ہستی
 سے محو ہو جائے گا۔

قدرت کے اسی اصول پر نگاہ کر کے بعض علماء نے یہ نظریہ بھی قائم کیا ہے کہ جس طرح نباتات و حیوانات کی بہت
 سی نسلیں فنا ہو گئیں اور ہوتی جا رہی ہیں۔ اسی طرح موجودہ انسان کی نسل بھی محو ہو جائے گی۔ اور ایک وقت آئے گا۔
 جب مستقبل کی فضائی مخلوق انسان کے ڈھانچوں کو بھی زیر زمین دیکھ کر کھا کرے گی کہ یہ بھی کیسا بھیانک جانور تھا۔
 اور غالب کے اس مصرعہ کا دھرانے والا کوئی نہ ہو گا کہ
 خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ نہاں ہو گئیں

چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی وحوں کے ساتھ

اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا کے امن و سکون کا راستہ معلوم کریں تو اسکو ملاحظہ فرمائے۔

مادہ میں کامدہیب

وجود باری کے ثبوت میں بے مثل مضمون

حرکت کے کرمے

اگر آپ قدرت کے کرموں کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے ملاحظہ فرمائیں تینوں ایک ہی جلد میں قیمت مع محصول

پینچر نگار لکھنؤ

یورپ کا فطری انسان

اور

حوا کی بیٹیوں کی خلد فروش عریانیات

”نوجوان لڑکیوں کے گورے گورے سڈول بدن کو بالکل عریاں دیکھنا،

ایک ایسی لذت ہے، جس میں دماغ و نگاہ دونوں برابر کے شریک ہیں“

اقتصادی دشواریاں کتنی ہی بڑھ جائیں، جنسی آزادیاں خواہ کسی حد تک وسیع ہو جائیں، لیکن یہ بات ذہن انسانی کی کبھی نہیں آسکتی تھی کہ یورپ کا انسان جو تصنیفات کا پتلا اور یورپ کی عورت جو اسباب آرائش و زیبائش کی پرستار ہو، سی وقت تکلفات زندگی سے اس درجہ بیزار ہو جائے گی۔ کہ جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی اسے گوارا نہ ہوگا۔ یقیناً یہ نتیجہ طرز اکت کا نہیں ہے بلکہ کرشمہ ہے اس نظام قدرت کا جو ایک بار ماضی کو بھی گردش میں لا کر حال بنائے بغیر نہیں ہوڑتا۔

انسان کے عریاں پھرنے کا زمانہ وہ ہے جسے ہم ”عمد قبل تاریخ“ سے تعبیر کرتے ہیں، جب وہ کچا گوشت کھاتا تھا، ننگوں میں آزاد پھرتا تھا، جو پایوں کی طرح دوڑتا پھرتا تھا۔ لیکن آج دنیا کے روشن ترین عہد کو بھی آخر کار اسی عہد تاریک کا سہارا لینا پڑا۔ اور انسان کی فطری خواہشوں نے اسے نہ صرف بلبوس سے بے نیاز کر دیا بلکہ مختلف اوروں سے یہ آوازیں بھی آنے لگیں کہ انسان کو غلہ و گوشت خام حالت ہی میں کھانا چاہئے۔ اور قیام صحت کے لئے جانور و طرح چاروں ہاتھ پاؤں ٹیک کر روزانہ کچھ دیر چلنا اذیس ضروری ہے۔

اس سے قبل نگار میں بعض مقالات مغرب فلسفہ ”عریانیات“ پر شایع ہو چکے ہیں۔ اس لئے آج کی صحبت میں یہ ناغالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ یورپ میں یہ ذوق اس درجہ عام ہوتا جا رہا ہے کہ گزشتہ دو سال کے اندر لاکھوں بچوں نے اپنے کپڑے اتار پھینکے اور اسی حمام میں داخل ہو گئے جہاں سے ”آدم و حوا“ ابتداء آفرینش کے زمانہ میں ابھرتے تھے۔

خیال کیجئے کہ اگر کسی جگہ لاکھوں سہیں تن، نازک کمر۔ اور بقول غالب۔ ”قیامت قامتوں، مہرگاں درازاں“ کا

ہجوم ہو، اس حال میں کہ نہ ان کا چہرہ رہیں غازد ہے، نہ گیسو منت کش شانہ، نہ کوئی ہیکل زیب گلو ہے نہ کوئی چوڑی رنجہ، ساعدیں۔ جسم پر کپڑے کا ایک تار نہیں، سرکش شباب کے سامنے کوئی حجاب نہیں۔ — واقعی خیال کیجئے کہ اگر ایسا ہو تو کوئی کیا کرے، دل و دماغ کی کیا کیفیت ہو، نگاہ کی گستاخیوں کا کیا عالم ہو۔ — یہ ہم اس وقت یہاں تک نہیں مشرق پر سوچ رہے ہیں۔ جہاں عورتوں کو عام طور سے ”مستورات“ ہی کہتے ہیں اور حجاب و نقاب نے عورت کو ”جلوہ کوہ طور“ بنا رکھا ہے، لیکن مغرب کی دنیا میں جہاں کی ہر خلوت راز ایک ”انجن برطانیہ“ کا حکم رکھتی ہے، یہ خیال کوئی معنی رکھتا ہی نہیں اور یہی سبب ہے کہ وہاں مرد عورت کا لباس اتار کر پھینک دینا گویا ایک لحاظ سے صرف پردہ مجاز کو ہٹا دینا ہے۔

غالباً آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جرمنی میں اس وقت ۳ لاکھ مذہب و شائستہ پڑھے لکھے انسان بالکل ننگے رہتے ہیں اور اگر ان کے تمام اعوان و انصار کو جو تمام قرب و جوار کے ممالک یورپ میں پائے جاتے ہیں ان میں شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد ایک کروڑ سے کم نہیں ہوتی۔ الغرض یہ تحریک یورپ میں رفتہ رفتہ نہایت قوی ہوتی جا رہی ہے۔ اور اگر کہیں ایک جنگ اور ہو جائے تو پھر رفتہ رفتہ تمام یورپ کا شنگا ہو جائے بالکل یقینی ہے۔ جرمنی میں سب سے پہلے اس تحریک کا سبب یہی ہوا کہ گزشتہ جنگ میں سب سے زیادہ وہی متاثر ہوا تھا اور اقتصادی دشواریوں نے پچھلے دیگر تغیرات معیشت و معاشرت کے اس تغیر کو بھی پیش نظر کر دیا۔ پھر چونکہ اس میں خیال و عقائد صحت کا بھی شامل تھا۔ اور مختلف ماہرین فن نے کھلی ہوئی فضا کی کھلی ہوئی اشاعتوں سے مختلف اعتراض کا علاج بھی شروع کر دیا تھا۔ اس لئے ایک اور قوی محرک شامل ہو گیا، یہاں تک کہ جرمنی میں اب ایک مستقل کالونی انھیں نانگوں کی قائم ہو گئی اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو عہدِ وحشت کی یاد نہ دلاتا ہو۔

۱۰۔ میں یہی گفتگو کر رہا تھا کہ میرے ایک دوست نے جو بے موقدہ اشارہ پڑھ دینے میں یدِ طولی رکھتے ہیں، یہ سکر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور فرمایا کہ ”یہ نہ پوچھو کہ کیا ہو۔ آہ“

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ

ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے۔

یاد رہے پیرے نعل اشعار پڑھنے میں نواب محمد اسحاق خاں مرحوم بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے ایک واقعہ سنئے۔ علیگڑھ میں آپ سکرٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور ہر شے پر آپ کی نگاہ ہے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں مطب کا انتظام غیر معمولی طور پر خراب ہو گیا اور لوگوں نے جا کر شکایت کی کہ کسی دن ٹنٹنگ ہال میں تو آکر ملاحظہ فرمائے کہ چائیاں کس قدر حسین پاک کر آتی ہیں۔ نواب صاحب یہ سن کر دوسرے دن صبح کھانے کے وقت پہنچ گئے۔ دیکھا تو واقعی چائیاں نایت خراب تھیں۔ آجے فوراً داروغہ مطب کو طلب کیا اور پوچھا کہ اس کا کیا سبب ہے۔ اسے مختلف عذرات پیش کرنے شروع کئے۔ نواب صاحب نے روک کر کہا کہ ”داروغہ صاحب، فضول باتیں نہ بنائے، مجھے سارا حال معلوم ہے۔ رات کا خواب الٹی توبہ آپ سینگا تو شرمائے گا“ (دیباچہ)

ہمبرگ میں ایک باغ انھیں کے لئے مخصوص ہے جہاں مدارس کے طلبہ بالکل ننگے کھیل کود میں مصروف نظر آتے ہیں برلن میں ایک ورزش گاہ ایسی ہے جہاں لوگوں کو ریاضت جسمانی کے تماشے مفت دکھائے جاتے ہیں۔ یہیں دو حوض ایسے ہیں جو انھیں ننگوں کے لئے مخصوص ہیں۔ اسی طرح بحر شمالی جزیرہ سلیٹ میں عام اجازت ہے کہ جس کا جی چاہے ننگا پھرے۔ حال ہی میں امریکہ کے دو سیاحوں نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے ”ننگوں کے درمیان“ اس کتاب میں انھوں نے جرمنی کے تمام شمالی حصہ کا دورہ کر کے بعض بہت دلچسپ حالات قلمبند کئے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

”جس وقت ہلو گلیو اپنے کپڑے اتار کر آگے بڑھے تو ہم شرم سی تو ضرور معلوم ہوتی تھی لیکن وہ پ میں ننگے بدن پر جو ہوا لگتی تھی وہ نہایت خوشگوار تھی۔ ان لوگوں نے ہماری حد درجہ محبت کے ساتھ زیرانی کی اور یہ دیکھ کر کہ ان میں سے کسی کی نگاہ ہمارے عریاں جسم پر تجسس نہ پڑتی تھی۔ ایک گونہ سکون سا ہم کو حاصل ہوا، لیکن ہم مشکل سے اپنی نگاہوں کی جھجک چھپا سکے جو بکروں نوجوان لڑکیوں کی عریانی کو اپنا ہدف بنائے ہوئے تھی۔“

ان سیاحوں نے بیان کیا ہے کہ ”اس عریاں کالونی کے رہنے والے نہایت صحیح و توانا اور اچھے دل و دماغ کے ہیں۔ انکی بیویاں، لڑکیاں، بچے اور بوڑھے سب نہایت ہی مسرور زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور آپس میں شادی بیاہ بھی اسی عریاں سادگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہمارے دور ان قیام میں ایک دن ہمبرگ کا ایک دو لقمند شخص مع اپنی بیوی کے یہاں آیا جو نہایت قیمتی لباس اور زیور سے آراستہ تھی، وہ یہاں آکر ایک ہوٹل میں ٹھیرے، تھوڑی دیر کے بعد جب وہاں سے نکلے تو پہچانا دشوار ہو گیا کیونکہ دونوں ننگے تھے۔ اور حد درجہ مسرور نظر آتے تھے

اس میں شک نہیں کہ سوائے جرمنی کے یورپ کے دیگر ممالک میں بھی تک عملاً اس آئادی کا رواج نہیں ہوا۔ لیکن فکر و احساس کے لحاظ سے یہ لہر ہر جگہ دوڑ گئی ہے۔ اور وہ وقت یقیناً آنے والا ہے۔ جب سر زمین مغرب میں ہر عورت کا جسم عریاں طلوع آفتاب کا منظر ہو کر رہ جائے گا۔ خود جرمنی میں بھی اوّل اوّل جب ایک عریاں عورت ہوٹل میں داخل ہوئی تو پولیس نے اس کی مزاحمت کی تھی، لیکن آج خود حکومت کی طرف سے اسی حوا کی بیٹی کے لئے وہ تمام انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ جو اس کے ذوق عریانی کو تسکین پہنچانے والے ہوں۔

مشرقی ممالک میں بھی مغربی تہذیب بڑی وسعت و قوت کے ساتھ پھیل رہی ہے، یہاں تک کہ سر زمین عرب میں بھی جو انبیاء و رسل کا مہبط رہا ہے بہت سی لڑکیوں کے گیسو ”تابنا گوش“ سے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کی عورت میں جو ذہنی انقلاب پیدا ہوا ہے وہ بھی اپنے اندر سخت اضطراب انگیز مستقبل چھپائے ہوئے ہے۔ اور کسے خبر ہے کہ حکومت مغرب کے برکات دو تین نسلوں کے بعد یہاں کی عورت کو کیا سے کیا بنا دینے والے ہیں اس لئے اس وقت ہندوستان میں کسی کا یہ سوال کرنا کہ پردہ و تعلیم عورت کے لئے ضروری ہے یا نہیں بالکل ایسا ہی سوال ہے۔ جیسے کمان سے تیر جدا ہونے کے بعد یہ پوچھا جائے کہ تیر چلا جائے یا نہیں۔ بلکہ اب تو اس سوال کا وقت ہے کہ مرد کو

پنی وفاداری کا امتحان دینے کے لئے بچوں کو دو دھڑلانے اور چولہے پر جا کر روٹیاں پکانے کی خدمت کس طرح انجام دینا پڑے گی۔

تاریخ سلطنتہ انسانی کے لحاظ سے دنیا پر مختلف دور گزر چکے ہیں، سب سے پہلا دور نظام استالی کا تھا۔ جب عورت مرد پر حکومت کرتی تھی، اس کے بعد نظام بطریق پھیلا۔ جب مرد برسر اقتدار ہوا، اور دنیا کا کوئی ظلم ایسا نہ تھا۔ جو اس نے عورت پر نہ توڑا ہو۔ اب خدا جانے کتنی صدیوں کے بعد پھر وہی اولین دور آرہا ہے۔ اور عورت کا اقتدار بڑھتا جا رہا ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ایک طرف علمی دور کے لحاظ سے تو یہ زمانہ ”برق و نور“ کا سمجھا جائے۔ اور دوسری کیفیت سے عورت کی حکومت کو قبول نہ کیا جائے۔ جو اگر برق و نور نہیں تو ”زائیدہ برق و نور“ ضرور ہے۔

کابل۔ سرمہ۔ چورن منجن

(اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دو اولوں کا اطمینان کر کے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے، دوسری تازہ سنہ ملاحظہ :- سرمہ ضعف بصارت وغیرہ کے لئے بہت مفید ہوا۔ ایک شیشی اور بھیج دیجئے۔
(سید رضا، زیر سو پنتھ۔ یوت محل)

کابل۔ آشوب، سُرخ، ضعف بصارت کے لئے از بس مفید ہے ایک ڈبہ کی قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول) سرمہ۔ یہ بیش بہا سرمہ ۲۰ دن میں جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر تیار کیا جاتا ہے۔ جالاً۔ دھند۔ موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ اور بارہا آدایا ہوا ہے۔ قیمت فی پڑیا (عمر) علاوہ محصول چورن۔ یہ وہ کسیری چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیرٹ کا درد۔ قبض۔ نفخ و یابح کا پیدا ہونا، سوز، ہضم دستوں کا آنا۔ یک تخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبہ ۸ تولہ (عمر) علاوہ محصول منجن۔ اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ ۸ تولہ (عمر) علاوہ محصول منوط :- سب چیزیں منگائے والوں کو محصول ڈاک معاف۔

مہتمم۔ ذریعہ دفتر نگار کھنڈو

ایک نینلسٹ کی زندگی کے کچھ واقعات

شہاب نے اسٹرا میز پر رکھ کر اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ”واقعہ یہ ہے کہ واڑ ہی موندنا بھی عجیب لذت ہے۔“ اس کی آنکھوں سے اطمینان برس رہا تھا، چہرہ پر عجیب قسم کی شگفتگی تھی اور آنکھوں میں ہلکا سا تبسم۔ اس نے یہ کہہ کر ایک دفعہ کی خاموشی کے بعد میز سے اسٹرا وغیرہ بکس میں رکھا۔ اور سامنے کی کرسی پر تبسم کی طرف مستفسرانہ انداز سے دیکھ کر غالب کا یہ شعر گنگناتے ہوئے۔

بر لبِ یاعلیٰ سرے بادہ روانہ کردہ ایم
مشرَبِ حقِ گزیدہ ایم عیشِ معانہ کردہ ایم

کہا۔ ”فرمائے نیم صاحب کیسا مزاج ہے“

شہاب کی عمر ۴۰ سے متجاوز ہو چکی تھی اور ہر چند زمانے نے اُسے کبھی ”لطف فراغ“ سے آشنا نہ کیا تھا، لیکن اس کے چہرہ کے اعصاب سے کسی کو یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ ”تنازع للبقا“ میں اس کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ابھی تک اس کے خردِ خال میں کافی نرمی باقی جاتی تھی۔ اور یوست، جو ایک زمانہ کی شکایت کرنے والے کے چہرہ پر بالعموم پیدا ہو جاتی ہے، اس میں بہت کم پیدا ہوئی تھی۔ دنیا اس کی صحت پر تعجب کرتی تھی۔ اور سمجھتی تھی کہ وہ یقیناً کافی مالدار ہے۔ لیکن اس کا اصل راز تھا جیسے وہ بارہا ان الفاظ میں ظاہر کر چکا تھا۔ کہ ”افلاس نام مادی مجبوری کا نہیں بلکہ قلب و ضمیر کی مجبوری کا ہے۔ وہ بے انتہا آزاد خیال، حد درجہ آزاد مشرب تھا اور ایک چیز کا مطالعہ، فطرت کے اس نقطہ نظر سے کیا کرتا تھا۔ جب وہ طلوعِ آفتاب میں مجھو ہو، غروب“ کے باب میں وہ اس کا ہم آہنگ کبھی نہ ہوتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ فطرت سے زیادہ بے حس اور سنگدل کوئی چیز نہیں، اس لئے اس کا مقابلہ بھی اسی بے حسی سے کرنا چاہئے۔ قدرت کا بڑا حربہ افلاس میں مبتلا کرنا ہے یا پھر بیماریوں میں مبتلا کر کے مار ڈالنا، پھر اگر یہ اس کا انتقام ہے تو براست کرنا ناگزیر۔ اور اگر کوئی درس ہے تو اس سیداد کے خلاف احتجاج کی صورت یہی ہے کہ اس درس کو رد کر دیا جائے اور گدایانہ گریہ و زاری سے انسانی خودداری کو صدمہ نہ پہنچایا جائے۔ ایک امیر کے سامنے مکر بستہ جھکنے والے وہی ہیں جن کے پیٹ نہیں بلکہ دل بھوکے ہیں جس کو ”آن“ کی فکر نہیں وہ ”آنداتا“ کا محتاج کیوں ہو۔۔۔۔۔ الغرض شہاب عجیب و غریب اصول کا انسان تھا۔ اور اپنے اعتقاد کے لحاظ سے وہ عرف عام میں ایسے سخت ”کفر و الحاد“ کا مبلغ تھا کہ مشکل ہی سے دنیا میں ایسی مثالیں ملتی ہیں۔

نسیم نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”مزاج کا حال نہ پوچھے، کاروبار کی خرابی سے اب تو آبرو و سنبھالنا بھی مشکل ہے۔“
 نسیم، شہاب کے دوستوں میں سب سے زیادہ نوجوان دوست تھا۔ اور شہاب کے اصول و عقاید سے ہر چیز
 اس کو بالکل اتفاق تو نہ تھا۔ لیکن ایک حد تک اس سے مرعوب ضرور تھا۔ وہ کبھی کبھی اس کے پاس ضرور آتا۔ کیونکہ اوّل
 تو اس کے بعض مشورے بہت صائب ہو کر ملتے تھے۔ اور جو امداد اس کے اسکان میں ہوتی اس سے کبھی دریغ نہ کرتا۔ دوسرے یہ
 کہ نسیم ایک حد تک ”نہلسٹ“ خیال کا انسان تھا۔ اور شہاب کی گفتگو سے اسے بہت کچھ مواد اپنے اس عقیدہ کی پختگی کے
 لئے مل جاتا تھا۔

شہاب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ آبرو؟ یعنی زندگی و معاشرت کے ایک خاص معیار کو قائم رکھنا۔“

نسیم۔ ”ہاں، اور کیا؟“

شہاب۔ ”لیکن یہ معیار تو آپ نے خود ہی قائم کیا ہے، اس لئے آپ اسے بدل بھی سکتے ہیں“

نسیم۔ ”یہ صحیح ہے، مگر جس چیز کا انسان عادی ہو جائے اس کا ترک کس قدر دشوار ہوتا ہے، پھر شہادت ہمسایہ الگ
 شہاب۔ ”ہاں، یہی حال مذہب والوں کا بھی ہے کہ شہادت ہمسایہ کا حال بہت سی سمجھ میں آنے والی باتوں پر۔“

ان کو قائم رکھنے ہوئے۔ مگر تم تو شاید نہلسٹ اعتقاد کے انسان ہو؟“

نسیم۔ ”ہاں، ہوں تو، مگر اس سے اس کو کیا تعلق؟“

شہاب۔ ”خوب، سچا نہلسٹ تو وہی ہے جو سب سے پہلے اپنے خیال و اعتقاد کے خلاف بناوت کرے۔ نہلسٹ ہونا
 بُت شکن ہونا ہے، پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ اپنے دل و دماغ میں بسنے والے بتوں کو تو برقرار رکھیں
 اور دوسروں کے بتوں کے سامنے ”تیشہ ابراہیمی“ لے کر کھڑے ہو جائیں؟“

نسیم۔ ”اچھا تو بتائے اس پر سائنٹی کے بت کو کیسے توڑا جائے، جس کے اصول کی پابندی نے اس قدر پریشان
 کر رکھا ہے؟“

شہاب۔ ”معاف کیجئے ابھی ہندوستان نے اتنی ترقی نہیں کی کہ سوسائٹی کا کوئی بت قائم ہو گیا ہو۔ یہاں جس چیز کا
 نام سوسائٹی رکھا گیا ہے، میں اسے حماقت و بزدلی کہتا ہوں۔“

نسیم۔ ”یعنی؟“

شہاب۔ ”میں یعنی وہ سب کچھ نہیں جانتا۔ مجھے تو صرف اس قدر معلوم ہے کہ جب تک جسم میں ایک لنگوٹی باندھے۔ اور
 دو دو دن کا فاقہ کرنے کے بعد بھی زندہ رہنے کا مقدور باقی ہے، جسے جائے اور چلتے پھرتے رہے۔“

نسیم۔ ”مگر دنیا بسنے کی نہیں“

شہاب۔ ”آپ اس سے زیادہ ہنسئے۔ آپ کو کس نے باز رکھا ہے۔“

نسیم۔ ” اور اگر اس طرح زندہ رہنے کا بھی مقدور نہ ہو تو؟“

شہاب۔ ” یہ کون سی بڑی بات ہے مر جائے۔ آپ کے مرتے سے دنیا کو کونسا ایسا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ کہ وہ آپ کے لئے ہائے واٹے کرتی پھرے گی۔“

نسیم۔ ” شہاب صاحب، انسان تنہا ہو تو سب کچھ کر سکتا ہے، علائق سے کس طرح جدا ہو، بیوی بچوں کو کیا کہئے“

شہاب۔ ” اچھا کوئی اور ذکر کیجئے۔ اب آپ وہی تیسرے درجے کے آدمیوں کی باتیں کرنے لگے۔“

نسیم۔ ” میں ہوں ہی تیسرے درجے کا آدمی، پھر باتیں کیوں نہ ویسی کروں۔“

شہاب۔ ” ہوش میں آؤ، جب تم مر گئے تو پھر تمہیں کیا فکر کہ تمہارے پس ماندگان کس طرح زندگی بسر کریں گے، زندگی

نام ہے اس فصل کا جو ایک عدم کے کنارے سے لے کر دوسرے عدم کے کنارے تک پایا جاتا ہے۔ قطرہ اسی وقت

تک قطرہ ہے جب تک دریا سے نہیں ملا۔ علائق کے خیال سے مرتے میں ضرور تھوڑی سی تکلیف ہو سکتی ہے،

سو یہ چند لمحوں کی بات ہے، اس کے لئے ساری زندگی خراب کرنا کہاں کی عقلندی ہے۔ تم تو ایک حد تک مذہبی

انسان بھی ہو اس لئے تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ

” روئے کشادہ باید دیدیشانی فراخ ہوا آجا کہ لطمہ زیدالمدعی زندہ“

یہ کہہ کر اس نے سامنے کی الماری سے ایک شیشہ نکالا اور ایک گلاس میں تھوڑی سی شراب ڈال کر سوڈے کی

بوتل کھولی اور گلاس لبریز کر کے اسے غور سے دیکھنے لگا۔ ” نسیم، دیکھتے ہو ان چھوٹے چھوٹے بلبلیوں

کو جو شہاب ثاقب کی طرح نیچے سے اوپر کی طرف بیتابانہ دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک معمولی انسانی

زندگی کا بھی بالکل یہی فلسفہ ہے۔ ایک بے اختیارانہ صعود، ایک مضطربانہ اقدام، ایک والمانہ استعلاء اور

ایک مجنونانہ تنگ و دو۔ یہ ایک لمحہ کا بقا بلبلیوں کی ساری عمر پر حاوی ہے۔ درانحالیکہ ہماری ایک نگاہ

بھی پوری طرح اس سے آسودہ نہیں ہوتی۔ اگر خدا اتنا ہی اہم ہے، اتنا ہی ذوالجلال ہے جتنا تم کہتے ہو،

تو اس کے نزدیک نہ صرف انسان کی عارضی زندگی، بلکہ ساری کائنات کی ابدیت (اگر واقعی اس لفظ

کا کوئی مفہوم ہے) کو ان بلبلیوں سے بھی زیادہ غیر اہم و ناقابل لحاظ ہونا چاہئے۔ غالب کا یہ شعر تم نے سنا ہے:-

سر اپارہن عشق و ناگزیر الفت ہستی

عبادت برق کی کرتا ہوں اور انوس حاصل

حیرت ہے کہ شاعر ہو کر تم غالب کے اس طعن سے بے خبر ہو۔ درانحالیکہ مذہب و شعر دونوں کی جان ہی اعتقاد

والعتراف ہے، اور یہی وہ کشمش ہے جو مایوسی سے ڈرنے والوں کو معاد و آخرت کے یقین کی طرف متوجہ

کر دیتی ہے۔ سچ ہے محمد و نئے دین ہونا بھی بڑے کلجہ والوں کا کام ہے۔ (اب اس کی کیفیت

بڑھتی جاتی تھی) — حور و قصور کی طمع میں ہلاک ہو جانا اور بغیر کسی خیال مزداجرت کے جان سے گزر جانا کیا ان دونوں کے فرق کو تم محسوس نہیں کر سکتے ہو،

”میں کر سکتا ہوں اگر کسی حد تک انسانیت سے گزر جاؤں“

شہاب۔ ”(دوسرا چڑھ لیتے ہوئے) کیا انسانیت سے گزر جانا انسانی زندگی کی کوئی بڑی بچڑی ہے جس سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ انسان جب تک انسان ہے یعنی جب تک سوسائٹی میں وہ صرف انسان رہ کر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ ہنوز گوارا ہے میں ہے۔ اس کا عنفوان شباب اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب اس قید و بند سے آزاد ہونے کی خواہش اس میں پیدا ہوتی ہے۔ اور سن و قوت تک پہنچتے پہنچتے تو وہ اس جگہ ہوتا ہے جسے شاعرانہ زبان میں ”ماورا سرحد ادراک“ کہتے ہیں۔ انسان، انسان ہی اس وقت ہوتا ہے۔ جب وہ انسانیت سے گزر جائے، مذہبیت و اخلاق سے گزر جائے۔ تمدن و تہذیب سے گزر جائے بلکہ حدود الوہیت سے بھی گزر کر وہاں پہنچ جائے۔ جہاں ازل وابد نام ہے صرف ایک ”نگاہ غلط انداز“ (دہلی)

ایک رزاں سودا

ان سب کتابوں کی مجموعی قیمت علاوہ محصول

عمر	فراست الید	عمر	جواب و خیال
۸	انتخاب گللابی اردو	عمر	عرب اور اسکاستقبل
۱۳	مذاکرات نیاز	عمر	زہر عشق
عمر	فلاسفہ قدیم	۱۱	شاعر کا انجام
۱۳	خدیجات بھاشا	عمر	شوہنہار
۵	نقابہ ٹھہ جانے کے بعد	عمر	بجز قسم
عمر	لالہ رخ	عمر	فلسفہ مذہب
عمر	فراست التحریر مکمل	عمر	موج تبسم
		عمر	تذکرہ خندہ گل

منبر نگار لکھنؤ

ضروری ہے۔

میری طرح

کس کی تخلیق میں ہے رنگ فنا میری طرح کون ہے بسمل پیکانِ قضا میری طرح
 کون ہے میری طرح پیکرِ اندوہ طلب کس کی تصویر میں ہے رنگِ دعا میری طرح
 کون اتنا ہے ترے حُسنِ کرم پر نازاں کون ہے سرخوش صہبائے غنا میری طرح
 کون ہے میری طرح خستہ اندوہ و فنا جرمِ الفت کی ملی کس کو سزا میری طرح
 خاک، ناکامی، پیسہ نے بنایا کس کو کون بربادِ رہِ عشق ہوا میری طرح
 غرضہ دہریں ہے کون اسیر ہستی خستہ کشمکشِ بیم و رجا میری طرح
 موت کس کو نظر آتی ہے حیاتِ جاوید کون بیمار ہے بیزارِ شنا میری طرح
 کیوں زمانہ مری حیرت پہے انگشتِ نما کوئی دیکھے تو سہی اس کو ذرا میری طرح

کم نہیں حُسنِ لطفِ کرم سے کوکت

کوئی پیدا تو کیے ذوقِ وفا میری طرح

کوکت شاہجہا پوری

امید کی کشتی

نا اُمیدی کے تند موجوں کے تھکے پر اپنی تقدیر کے سہارے پر
تیز موجوں میں ڈگمگاتی ہوئی خوفِ طوفان سے تھر تھراتی ہوئی
بہہ رہی ہے امید کی کشتی

یاس و چراغاں کے چھاؤں میں بادل غرق کرنے کو آئے ہیں بادل
کوئی تدبیر چل نہیں سکتی یعنی تقدیر ٹل نہیں سکتی
دوب مرتے کا کچھ طال نہیں پار اترنے کا بھی خیال نہیں
کاش! ساحل تو دیکھ لیتائیں اپنی منزل تو دیکھ لیتائیں

تند موجوں نے گھیر کر آخر سائے دریا میں پھیر کر آخر
دامِ گرداب میں بھنسا ہی دیا موت کا راستہ دکھا ہی دیا
آہ! دریا میں غرق ہوتی ہو یاس اُمید کو ڈبو تی ہے
میرے اللہ مجھے بچا لینا

باقی صدیقی (سہام)
راولپنڈی

پنچہ موت سے پھرنا لینا

معلومات

تاریخ عالم میں سرے بڑا جھوٹا انسان | یونو تو جھوٹے ہر زمانہ اور ہر ملک میں پائے گئے ہیں اور دنیا کے بہت سے مشہور لوگوں تھے اور آخر کار کھل کر رہے لیکن تاریخ کے صفحات میں ایک ایسا کذاب عظیم بھی نظر آتا ہے جس کا مثل اس سے قبل کبھی پیدا ہوا۔ اور نہ آئندہ توقع ہے۔ اسکا جھوٹ ایک ایسا جھوٹ تھا جو اپنے بعد نہ ملنے والے نقوش و آثار چھوڑ گیا ہے۔ اور اسی کے بدولت وہ زبردست مشہور مسوؤں میں شمار ہونے لگا۔

اس کا اصل نام تو کسی کو معلوم نہیں لیکن وہ نام جس سے وہ مشہور ہوا۔ جارج بسالما نازار تھا۔ یہ نام جو آشوریہ کے بادشاہوں کی وضع کا ہے خود اسنے اپنے لئے گھڑا تھا۔ اور اسی نام سے وہ ہمیشہ پہچانا گیا۔ ۱۶۹۹ء میں فرانس کے ایک قصبہ میں یہ شخص پیدا ہوا۔ اس قصبہ کا نام لانسڈوک ہے جو یورپ بھر میں کذب کے وجہ سے مشہور ہے اور یہاں کے لوگ اسپر فخر کرتے ہیں کہ دنیا میں ان سے بہتر جھوٹ کوئی نہیں بول سکتا۔ ہمارے ہیرو کی عمر چھ سال کی تھی جب وہ مدرسہ میں داخل ہوا۔ اس کا باپ بیوی بچوں کو چھوڑ کر جرمنی چلا گیا تھا اور اسکی ماں حد درجہ عسرت میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ چند سال کے بعد ماں نے اس کو مرسیلیا بھیجا تاکہ وہاں مذہبی تعلیم حاصل کرے راہبانہ زندگی اختیار کرے۔ مگر چونکہ یہ شہرت کا طالب تھا اسلئے وہ یہاں سے چلا گیا اور شہر افینون کے ایک سیرگھرانے میں پڑھانے پر ملازم ہو گیا۔ اسوقت اسکی عمر سولہ سال کی تھی۔ گھر کی مالکہ اس سے محبت کر نیکی لیکن جب اسکی طرف سے خاطر خواہ بریرانی محبت کی نہ کی گئی تو اسکو علیحدہ کر دیا۔ یہ زمانہ اس کیلئے نہایت افلاس و تنگدستی کا تھا۔ یہ فرانس کے مختلف مقامات میں چکر لگا رہا تھا۔ اور کہتا پھرتا تھا کہ میں آر لینڈ کا رہنے والا ہوں اور حکومت انگلستان نے مجھے میرے مذہبی معتقدات کی وجہ سے نکال دیا ہے۔ اس بنا پر یہ "شہید آر لینڈ" کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ پھر یہ اپنے باپ کی جستجو میں جرمی گیا۔ اور اسکو ڈھونڈ نکالا لیکن اسکی حالت اس سے بھی زیادہ اتر و سقم تھی۔ اسلئے اسنے فیصلہ کیا کہ کذب و نفاق کے علاوہ اب کوئی اور صورت حصول شہرت و زر کی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اسنے مشہور کیا کہ میں جاپانی ہوں لیکن دین مسیحی اختیار کرنے کی وجہ سے بھاگ آیا ہوں کیونکہ اہل جاپان مسیحی کو ذبح کر ڈالتے ہیں۔ اسوقت اسنے اپنا نام بسالما نازار رکھا۔ اور مشہور کیا کہ میں جاپانی زبان کا ماہر ہوں، درانحالیکہ وہ کبھی جاپان نہیں گیا تھا۔ اور اس زبان کا حرف شناس بھی نہ تھا۔ بعض انگریزی و ہالینڈی افسران فوج نے یہ حالات معلوم کر کے اس سے خواہش ظاہر کی کہ جاپانی زبان کی ایک کتاب تحریر کرے۔ چنانچہ یہ فوراً آمادہ ہو گیا۔ اور اسی تاریخ سے اسکا وہ کذب شروع ہوتا ہے۔ جسکی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ یعنی اسنے جزیرہ فاروسا کی تاریخ لکھی اور وہاں کے لوگوں کے حالات و مراسم درج کئے۔ اسنے محض اس کتاب کے لکھنے کیلئے ایک زبان گھڑی یا خاص خط ایجاد کیا اور وہ معلوم کس کس قسم کے جھوٹ و نفاق کے جزیہ فاروسا کے حالات لکھے اور نقشے و تصاویر بھی بنا کے یہ کتاب باطبع ہوئی۔ اور کثرت فروخت ہوئی درانحالیکہ اس نے بان کا جاننے والا دنیا میں کوئی تھا بعد کو لندن کی ایک علمی انجمن نے اسکو دعوت دی کہ وہ جزیرہ فاروسا کی حالات پر لکھ دئے۔ چنانچہ اسنے بسید لکھ دئے جو کبھی کذب و نفاق کا مجموعہ تھے اور سطح وہ تمام یورپ میں مشہور ہو گیا۔ اسنے انجمن علمی کی خواہش پر فاروسا کی زبان پر ایک کتاب گرامر و دبانڈانی کی بھی لکھی اور کسی پر یہ اذنیہ نکلا کہ جس زبان کی اسنے ایجاد کی ہو اسکا وجود کبھی پایا ہی نہیں جاتا۔

عمر و عیار کی گلیم کا حال تو معلوم ہی ہے کہ جس وقت وہ سر پر ڈال لی جاتی تھی تو آدمی لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتا تھا۔ بہر حال یہ تمام باتیں سنتے تھے مگر اعتبار نہ آتا تھا کہ ایسا ہونا کیوں کر ممکن ہے۔ لیکن غباروں اور ہوائی جھاڑوں نے اول الذکر دو چیزوں کا یقین دلایا تھا، گلیم عمر و عیار البتہ ابھی تک طیارہ نہ ہوئی تھی۔ مگر اسپین کے ایک مہندس نے آخر کار اسے بھی پیش کر ہی دیا، یعنی اس نے ایک خاص قسم کا کپڑا ایسا طیارہ کیا ہے کہ اس کے پہننے کے بعد انسان نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتا ہے۔

طاؤسوں کی حکومت | کالیفورنیا کے جنوب میں ایک شہر ہے جس کا نام ارکاڈیا ہے، یہاں طاؤسوں کی اس قدر رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ شکار کرنا تو کجا، ان کو کوئی چھو بھی نہیں سکتا، ٹوک بھی نہیں سکتا۔ وہ ہر جگہ باغوں میں، جنگلوں میں، سڑکوں پر آدمی سے رقص کرتے پھرتے ہیں۔ اور مطمئن ہیں کہ ان کے حسن و جمال کی ہیبت کسی کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

حکومت بلدیہ نے ان کے فراغ و اطمینان کا اس حد تک انتظام کر دیا ہے کہ جس طرح سڑکوں پر راہگیروں اور موٹر چلانے والوں کے لئے جا بجا تختیاں تنبیہ و خطرہ کی نصب کر دی جاتی ہیں، اسی طرح ان مقامات اور راہوں پر جہاں طاؤسوں کی کثرت ہے۔ جا بجا یہ تختیاں نصب کر دی گئی ہیں کہ۔ ”خبردار، طاؤس اس راہ سے گزرتے ہیں“

آدم ثانی | کمبر لینڈ (امریکہ) میں ایک خاندان ہے جس کا نام وب ہے۔ اس کی کثرت اولاد کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کے مورث اعلیٰ کو آدم ثانی کہا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا۔ اس خاندان کا سردار اس وقت جو سولہ ب ہے۔ جس کی عمر ۸۴ سال کی ہے۔ اس کے ۱۹ لڑکے پیدا ہوئے۔ اور ۱۷ بولتے، ان پوتوں کی اولاد ۱۵۰ ہوئی۔ اور ان کی ۱۰۰۔ گویا ایک آدمی کی نسل سے ۴۴۴ آدمی وجود میں آئے،

اس کا ایک بھائی ہے جس کا نام ملزوب ہے جس کی عمر ۸۰ سال کی ہے اور اس کے ذریعات کی تعداد ۰۰۰۴ نفوس تک پہنچتی ہے، ان کی ایک بہن (بولی وب) کا خاندان ۲۳۰ نفوس پر مشتمل ہے۔ اور دوسری بہن (سالی وب) سے جس کی عمر ۷۰ سال کی ہے ۱۳ بیٹے، ۸۰ بولتے، ۶۵ پڑپولتے۔ اور ۵۰ سگڑ پوتے پیدا ہوئے۔ تیسری بہن (لیبی وب) کے ذریعات ۲۱۱ ہیں۔ اس طرح گویا صرف دو بھائی اور تین بہنوں سے ایک ہزار چار سوترانوے (۱۴۹۳) بیٹے پوتے وغیرہ اس وقت تک پیدا ہو چکے ہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان بچہ پیدا کرنے والی مشینوں سے آئندہ مردم شماری تک ایک پورا نیویارک نہ طیارہ ہو جائے گا۔

کتے کی روح | مغرب میں عموماً اور امریکہ میں خصوصاً روجوں کے بلانے کے لئے حضرات کا عمل کرنا بہت کثرت سے رائج ہے۔ یہاں تک کہ کینن ڈائل اور آلیور لاج ایسے انسان بھی اس عمل کی صحت کے قابل تھے اور ان کو یقین تھا

کہ جو روحیں معمول یا واسیط کے ذریعہ سے آتی ہیں۔ وہ واقعی متوفی کی ارواح ہوتی ہیں۔ اور اپنے پیغامات اہل دنیا تک پہنچاتی ہیں۔۔۔۔۔ لیکن ناظرین نگار غالباً یہ سن کر متحیر ہوں گے کہ حضرات کا عمل صرف انسانوں ہی کی ارواح تک محدود نہیں رہا بلکہ اب جانوروں کی روحوں کو بھی طلب کر کے ان سے سرف کلام حاصل کیا جاتا ہے۔

انگلستان میں ایک صاحب پروفیسر لٹل جون ہیں جو عمل حضرات کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں دن ٹن ٹن کتے کی روح کو بلانا چاہا۔ واضح ہو کہ رن ٹن ٹن کتا دنیا کے سینما کا نہایت مشہور کتا تھا جو حال ہی میں مرا ہے۔۔۔۔۔ اس خبر کے سنتے ہی اخباروں کے نمائندے پہنچ گئے۔ تاکہ کتے کے پیغامات جو عالم ارواح سے بھیجے والے ہیں، معلوم کریں۔

پروفیسر موصوف نے سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ۔۔۔۔۔ کیا مرنے کے بعد کتوں کو کافی ہڈیاں ملتی ہیں؟
جواب ملا کہ۔۔۔۔۔ "میں اب ایک اور کتے کی صورت میں آ گیا ہوں۔ اور غذا بہت کافی ملتی ہے۔"
پھر سوال کیا گیا کہ۔۔۔۔۔ کیا اس نئی دنیا میں تم خوش ہو؟

جواب ملا۔۔۔۔۔ "کہ اُن مقام لوگوں سے جو مجھ سے محبت کرتے ہوں کم دو کہ میری جگہ اب دوسرا کتا پیدا ہو گیا ہے اور میں اب ایسی جگہ رہتا ہوں جہاں سایہ دار درخت ہیں۔ اور غذا بہت وافر ہے۔"
اس کے بعد سوال کیا گیا کہ "تمھاری جگہ کس نے لی ہے؟" جواب ملا کہ "جہاں میں مرا تھا وہیں فریب ہی وہ کتا رہتا ہے۔"

اس خبر کے سننے کے بعد کون ہے جو عالم ارواح ویوم آخرت پر ایمان نہ لائے گا۔ اور وہ خدا جو ایک کتے کی روح کو بھی فنا نہیں ہونے دیتا۔ وہ انسان ایسے مہتمم بالشان حیوان کی روح کو کیوں فنا کرتے لگا۔

جرمنی کے مشہور فلسفی شاعر گوٹے

کا مشہور ناول "در تھر کی داستان غم" مارچ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو جائے گا۔ اس میں شاعر نے شباب کی روحانی کیفیت کی جو نفیس تصویر کھینچی ہے وہ فلسفہ شباب کا ایک اہم ورق جو پڑھے اور لطفت اٹھائے۔

حجم قریب ۲۰۰ صفحہ قیمت ۵۰/-
ترجمہ مع مقدمہ و ضروری حواشی ریاض الحسن۔ ایم۔ اے۔
ملنے کا پتہ۔ لٹریچر سٹڈی کیسٹ۔ بیلی روڈ نمبر ۱۔ الہ آباد۔

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

ناول، ڈرامے اور افسانے

تاریخ و سوانح خیریاں

لغات و ادب

گوڈر کا لال	فرافض مادی	۱۲	قطرات اشک	۱۲	موتی	۱۲	تاریخ مغرب	۱۲	بازاری زبان	۱۲
شوکت آبادی	انفار و جہاں	۱۲	چندر ناتھ	۱۲	درد ع ظفر	۱۲	مختصر تاریخ اسلامی	۱۲	لغات سعیدی	۱۲
حصہ سوم	اقبال و وطن	۱۲	بس کار و کھ	۱۲	یاسین شام	۱۲	حصہ ۲	۱۲	لغات کنوری	۱۲
سعیدہ کے خطوط	حسن معاشرت	۱۲	فانہ سعید	۱۲	طوفان اشک	۱۲	حصہ ۱۰	۱۲	تجلیہ تحقیق جلد ۱	۱۲
بیاری ہیلی	دیامی	۱۲	خونک کی گیتی	۱۲	شاہین دوراج	۱۲	حصہ ۳	۱۲	غیر اللغات فارسی	۱۲
فیضی بیاری ہیلی	سولہ کہانیاں	۱۲	سیلاب اشک کا تصویر	۱۲	درس عشق	۱۲	الصاحیات	۱۲	معارف نسوان	۱۲
میرتوں کی ہنشا	سترہ کہانیاں	۱۲	بے زبان دوست	۱۲	گرد پتی چور	۱۲	امت کی بانیں	۱۲	جو اہر اللغات	۱۲
انسان نسوان	سولہ قصے	۱۲	جال ہم نشین	۱۲	تین بندوق باز	۱۲	الزہرا	۱۲	گوہر اللغات	۱۲
سورہ الکہفی	مراۃ العروس	۱۲	تفسیر عصمت	۱۲	کرشمہ رقابت	۱۲	اسوہ حسنہ	۱۲	چراغ سخن	۱۲
زینت زندگی	بناۃ النعش	۱۲	بوہر قدامت	۱۲	انقلاب قسطنطنیہ	۱۲	ہند و شعراء	۱۲	دکنی لغت	۱۲
مذہبات تہذیب	توبۃ النہوج	۱۲	تائید غیبی	۱۲	شاہد رضا	۱۲	شونہار	۱۲	جو اہر اللغات لفظیہ	۱۲
مذہب الہدی	کنیز فاطمہ	۱۲	پراسرار قتل	۱۲	دیباچہ کی سرگزشت	۱۲	سوانح اکبر الہ آبادی	۱۲	عربی لغات	۱۲
مذہب الانبیا	پاکھڑیاں	۱۲	املان آزادی	۱۲	نگو نہ صحبت	۱۲	سفر نامہ عراق	۱۲	تذکرہ کبریٰ	۱۲
سیرۃ عائشہ صدیقہ	تیسرے کا کچھیرلی	۱۲	سرگزشت ہاجرہ	۱۲	نسوانی زندگی	۱۲	تاریخ افانہ	۱۲	تاریخ اردو کے قدیم	۱۲
مذہب السلمات	برکات سلطان	۱۲	فہمہ زندگی	۱۲	ولایتی شخص	۱۲	اسلام اور غیر مسلم	۱۲	دکن میں اردو	۱۲
سید الجناں	ابن الوقت	۱۲	قلب حزیں	۱۲	شہیم خاوش	۱۲	سیر اہل بیتین جلد ۱	۱۲	منتخب کلام ہندی	۱۲
مذہب کی پرورش	چند پند	۱۲	عروس کر بلا	۱۲	شب زندگی کاں	۱۲	حصہ ۲	۱۲	رباعیات عمر خیام	۱۲
مذہب طفلان	منتخب حکایات	۱۲	شہید مغرب	۱۲	مودودہ	۱۲	تاریخ اسلام جلد ۵	۱۲	منتخب کلام ہندی	۱۲
مذہب نسوان	تندرستی	۱۲	ماہ عجم	۱۲	چندر کلا	۱۲	اخبار الاندلس جلد ۱	۱۲	اردو کے اساتذہ	۱۲
ہندی کی تعلیم	حفظ صحت	۱۲	تخی کمان	۱۲	گلستان خاتون	۱۲	خلافت موحدین	۱۲	تصريح الاغلاط	۱۲
ہندی کی تربیت	طبیب نسوان	۱۲	سراب مغرب	۱۲	صبح زندگی	۱۲	خلافت مولرین	۱۲	فیض اردو	۱۲
تربیت اطفال	رہبر صحت	۱۲	مندانل سائرہ کمال	۱۲	شام زندگی	۱۲	عرب اور اسکا مستقبل	۱۲	لغات امجدہ	۱۲

دواوین فارسی

دواوین اردو

دواوین شمس تبریز	کلیات غالب	۱۲	دواوین غنی کبیری	۱۲	کلیات ظفر	۱۲	کلیات نظیر اکبر الہ آبادی	۱۲	صنعتیہ بحث	۱۲
کلیات عراقی	کلیات صاحب	۱۲	دواوین ہلالی	۱۲	کلیات مومن	۱۲	گلزار داغ	۱۲	فریاد داغ	۱۲
دواوین حافظ	دواوین ناصر علی	۱۲	اسرار غنی ہوزے	۱۲	دواوین ناسخ	۱۲	دواوین رند	۱۲	عالم خیال با تصویر	۱۲
دواوین بیدل	کلیات سعیدی	۱۲	زبور مجسم	۱۲	کلیات سیر	۱۲	دواوین ذوق	۱۲	دواوین سعیدی	۱۲
دواوین عربی	کلیات حزیں	۱۲	پیام شرق	۱۲	کلیات سودا	۱۲	گلدہ عزیز	۱۲	کلیات اکبر الہ آبادی	۱۲
کلیات جامی	دواوین عنصری	۱۲	قصائد عربیہ جلد ۱	۱۲	کلیات اشا	۱۲	مرآة الغیب	۱۲	نور دل شہ جہان پوری	۱۲

ذیل کی کتابیں نگار بک کلبی سے طلب فرمائے

تذکرہ و تاریخ	چاسویں کناول	مراتی	ناول سجاد حسین	ظفر عمرنی لے	ناول مشہور
پہلی نظر	شرکال ہومز	مراتی دہیر	احسن الذی	چندوں کا کلب	چند بھداوی
شب معراج	غاصرہ پیرس	مراتی انیس کمال	عاجی ہنزل	نیلی چھتری	مخدرات
سراج منیر	شیخ جلی	مراتی ضمیر	پیاری دنیا	ہیرام کی گرفتاری	جو پیلے سحر
پہلی نظر علم	ہیرام کی واپسی	مراتی ہنس	کاپا پلٹ	ادبی کتابیں	عبت جہینا
سوانح حضرت تارجل	افتاب فرانس	مراتی دیگر	پیشانی چھری	ادبی کتابیں	فاج و مفتوح
سید المرسلین	بھگتی تفریق	پہلی نظر	طرح دار لوٹدی	سکھو تھو جوان غالب	پاک فوری
سید رسالہ	تفریق جاسوس	پہلی نظر	طلسمی فالوس	پہلی نظر	ایم عرب
سیرت النبی	لوکی حرم سرا	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	پہلی نظر	قیس زینبی
سیرت ان خطاب	جنگ ہرا پور	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مشاطہ سخن	یوسف و زلیخا
ابو بکر صدیق	ہیرام چور	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	زوال اللہاد
انور اسلام	نور ہست	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	حسن کا ڈاکو
انجیل	تختی کاراز	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	ہیرام چور
عمر بن عبد العزیز	سیرت الامم	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	میتا بازار
دولت نامہ	عروس سحر	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	قدس نازیں
مکمل سوانح نبی کریم	سیلاب خون	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	رومہ الکبریٰ
مذکرہ اویا	سیاحت زمین	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	چاپانا
مذکرہ اولیاء	سیاحت ہوا	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	شوقین ملک
مرآة الکونین	نازنین ماکش	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	شوقین ملک
تصویر الانبیاء مکمل	سمنگ سیر	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	شوقین ملک
سفر نامہ حسین	اسرار باغ غوثیم	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	شوقین ملک
تفحیص التواریخ	روح بیلی	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	شوقین ملک
مخاتون جنت	امین بک	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	شوقین ملک
مخاترات الصوفیہ	مجاج بن یوسف	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	شوقین ملک
مختصر گورہ	یوسف باشا	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	شوقین ملک
مختصر نسوان	الغلاب عثمانی	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	شوقین ملک
مختصر جہد	ہیرام کی واپسی	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	شوقین ملک
مخدرات تیور	ہیرام کی آزادی	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	شوقین ملک
بیمات بکال	ہیرام کی سرگذشت	پہلی نظر	ناول جولا پر شاہ	مکاتیب حسن الملک	شوقین ملک

ناول سرشار

مولانا شبلی نعمانی

کلام شبلی اردو	سیرۃ النبی جلد اول	سیرت سار
کلام	دوم	خدا کی فوجدار
علم و کلام	سوم	جام سرشار
شعر العجم جلد اول	انفرادی	الف لیلہ بجز ناول
دوم	الغزالی	کامنی
سوم	المانوں	سوانح عمر و حیار
چام	رسالہ شبلی	
چشم	موازنہ انیس دہیر	

نگار بک کلبی



mei

تصانیف حضرت نیاز بختوری

<p>نگارستان حضرت نیاز کے بہترین کلامی مقالات اور مفاہون کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے حدود معنائیں غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت ۱۰/-</p>	<p>گوارہ تمدن مولانا نیاز کی وہ معرکتہ آلود کتاب جس میں تاریخ اور ہنر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا بڑا دست حصہ لیا اور دنیا کی تہذیبیں شاکستلی اسکی کون قدر ممنون ہو رہی ہیں بالکل اپنی کتاب قیمت ۱۰/-</p>	<p>شہاد کی سرگزشت حضرت نیاز کا وہ علم لپیٹیر افسانہ جو اردو زبان میں پہلا پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی تالیف اسکی جنین اسکی نزاکت بیان اسکی ہندی معنوں اور اسکی نظریہ علیہ سیرت کے وہ کئی کئی نکتے ہیں۔ قیمت ۱۰/-</p>	<p>فرست الیوم مولانا نیاز نے خود ہی جس کے مطالعہ سے ایک شخص یا سائنس دانہ کی شناخت اور اسکی ترقی کو دیکھ کر اپنی وہ شخصیت منتقل سیرت اردو ذوال موت بنی صحت دیاری غیر تکنیکی طرز کے متعلق صحیح مشین گوئی کر سکتا ہے قیمت ۱۰/-</p>	<p>شاعر کا انجام جناب نیاز کے عنوان شباب کا کھا ہوا فلسفہ حسن و خلق کی تمام نقطہ نظر کیفیات اس کے ایک جلد میں موجود ہیں، پینسٹراٹے پلاٹ اور انشا کو محقق سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ نہیں سکتی۔ قیمت ۱۰/-</p>	<p>خبرات بھاشا جناب نیاز نے ایک ایک کلمہ کی تہذیب کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے اسکی بدیسی تشریح کی ہے کہ دل شاعر جو جانتا ہے وہ اس میں ہی رہتا ہے۔ قیمت ۱۰/-</p>
---	---	--	---	---	---

<p>صحابیات میں میں ہمدردی کی ۵۰ علامتوں کے مستند حالات بیان کر دیے گئے ہیں اس کا مقصد مولانا کے خاص اپنی انشا میں لکھا ہے اس کتاب میں سہا صحابیات سے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہیں مہارکت و کتابت نہایت نفیس پیمت علاوہ محصول ۱۰/-</p>	<p>نقاب ٹھہ جائیکے بعد میں انشاؤں کا مجموعہ جن میں بتایا گیا ہے کہ اگر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں۔ زبان و طاق انشا اور تخیل کے لحاظ سے تشریف فضول ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی شناخت ہے قیمت ۱۰/-</p>	<p>مذاکرات نیاز یعنی حضرت نیاز کی آڑی جو ادبیات و عقیدہ علمی کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک بڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی قیمت کم جلد میں باقی رہی ہیں۔ قیمت ۱۰/-</p>	<p>فلاسفہ قدیم اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین اور چند نکتے فلاسفہ قدیم کی دعوں کے ساتھ ۲۔ ماد میں کا مذہب ۳۔ حرکت کے گوشے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت ۱۰/-</p>	<p>سیاح الدولتین جو سی زیادوں کے تاریخ مشہور عالم کتاب کا ترجمہ ہے وہ کتاب ہے جس نے یورپ و ایشیا کے سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے جو سی اذہان کی یہ کتاب بیرون ایشیا کی ترکی و مصر عرب و حجاز شہرت حاصل کی ہے اور قیمت ۱۰/-</p>	<p>المسئلہ الشرعیہ مصطفیٰ کامل ہاشمی شہور عالم کتاب کا ترجمہ ہے وہ کتاب ہے جس نے یورپ و ایشیا کے سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے جو سی اذہان کی یہ کتاب بیرون ایشیا کی ترکی و مصر عرب و حجاز شہرت حاصل کی ہے اور قیمت ۱۰/-</p>
--	--	---	---	---	--

<p>فرست التحریر مکمل یعنی اردو اور انگریزی اور ہم خط اور ہندو تحریروں کی سیرت چال چلن معقول اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب۔ قیمت ۱۰/-</p>	<p>دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں تقویٰ زہیر عشق مرتبہ جنوں گوڑہ پوری جس میں ملک کے بھارتیوں اور بیوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویریں دی گئی ہیں ایک تصویر پیمت ۱۰/-</p>	<p>تقویٰ لالہ سیخ خاص طور کی حرکت آلا را مشنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ قیمت ۱۰/-</p>	<p>مذکرہ خندہ گل مولانا نیاز کی آڑی میں ۳۰ صفحات سے زائد اردو و فارسی کے لطیف شاعروں کے حالات معاصر کے لطیف و طرائف و انجلیات کلام کے درج میں قیمت ۱۰/-</p>
--	---	---	--

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے
 رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
 سالانہ قیمت پانچ روپیہ - ششماہی تین روپیہ
 بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمارہ	فہرست مضامین پانچ حصہ ۶	جلد ۲۳
۲	ملاحظات	
۹	فراعنہ مصر کی خوابگاہیں	
۲۲	سینر و کلیو پیٹرا (مسلل) ————— محشر عابدی	
۳۳	جوش کی شاعرانہ خامیاں	
۴۰	تاریخ بغاوت ہند کا ایک گمشدہ ورق	
۴۴	موسیقی عہد نبوی و خلفاء راشدین میں	
۴۸	شاعروں کے حیرت انگیز استعمالات	
۵۴	مطبوعات موصولہ	
۶۳	جنگ مستقبل کا دور بینی مطالعہ	
۶۶	حضرت نیاز کے چند خطوط	
۷۳	باب المرسلۃ والمنظرۃ	
۷۸	معلومات	
	(نوٹ) جب تک پرچہ کی اشاعت اپنے وقت پر نہ آئے گی تذکرہ معرکہ اسخن ملتوی رہے گا۔ غالباً مئی کا پرچہ اپنے وقت پر اول ہفتہ میں شائع ہو جائے گا۔	

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نگار

ادیٹر:۔ نیانہ فتحپوری

شمارہ ۳	ماہِ چ ۱۹۳۳ء	جلد ۳۳
---------	--------------	--------

ملاحظات

ہماری علمی درسگاہوں کی تنگ ذہنیت
دارالعلوم ندوہ کو موجودہ ناظم کا جاہلانہ تقشف

آپ دنیا کی کسی قوم سے سوال کیجئے کہ علم و مذہب میں کوئی فرق ہے یا نہیں تو وہ بلا تردد، بغیر ایک لمحہ کا پس و پیش کئے ہوئے جواب دے گی کہ علم و مذہب میں وہی فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے۔ کیونکہ ایک کا تعلق صرف اخلاقیات سے ہے اور دوسرے کا ذہنیات سے۔ اس کا دائرہ عمل اگر اصلاح تمدن ہے تو اس کا ترقی تمدن یا زیادہ علمی زبان میں یوں سمجھئے کہ اگر ایک مابعد الطبیعیات سے تعلق رکھتا ہے تو دوسرا طبیعیات سے یعنی اگر یہ عملی زندگی کی کشمکش ہے تو وہ خیالی دنیا کی داستان ہے، اگر یہ ذہن انسانی میں اضطراب عمل پیدا کرنے والا ہے تو وہ روح

کو سکونِ خواب میں محو کرنے والا۔۔۔۔۔ الغرض ان دونوں میں حال و مستقبل کا فرق ہے، ہاں اور نہیں کا فرق ہے۔۔۔۔۔ لیکن دنیا میں ایک قوم ایسی بھی ہے جو اس فرق و امتیاز کی قائل نہیں، جو حیات انسانی کے تمام اعمال کو صرف مذہب ہی سے متعلق کرنا چاہتی ہے اور جو اس کا رگاہ عمل اور کشاکش زندگی کے ہر پہلو کو اسی خواب آلود نگاہ سے دیکھنا چاہتی ہے جو مذہب کی غلط تعبیر سے اس نے حاصل کی ہے۔۔۔۔۔ وہ دنیا کے تمام علوم و فنون کا مرکز و ماخذ مذہب ہی کو سمجھتی ہے، وہ واقعات تاریخی کو بھی مذہب ہی کا جزو جانتی ہے، وہ وقتی احکام کو بھی دوام و استمرار دینا چاہتی ہے اور اس کے نزدیک دنیا میں نہ ماحول کوئی چیز ہے اور نہ اس کی تبدیلی سے انسانی ذہنیت پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے۔۔۔۔۔ اس کے سامنے صرف مذہب ہے اور اس کی دار و گیر، دین ہے اور اس کا تقشف، عبادت ہے اور اس کا پندار اور وہ اس دنیا کی زندگی کو اس مسافر کی طرح بسر کر دینا چاہتی ہے جو صرف ایک لوٹاوا کھل لے کر شام کو سرائے میں آتا ہے اور صبح کو چلا جاتا ہے۔۔۔۔۔ آپ کو معلوم ہے وہ قوم کون سی ہے؟ وہ قوم ہمارے علماء کرام کی ہے، جو اپنے آپ کو اسلام کا سب سے بڑا حامی و علمبردار سمجھتے ہیں در انحالیکہ ان سے زیادہ دشمن اسلام اس وقت دنیا میں کوئی نہیں، جو اپنے کو مذہبی روایات کا سب سے بڑا محقق و دانشمند باور کرتے ہیں در انحالیکہ

نہ محقق بود نہ دانشمند

چار پائے برو کتابے چند

آئے ہم آپ کو اس قوم کے ایک فرد کی عجیب و غریب ذہنیت کا ایک واقعہ سنائیں اور ہم آپ دونوں مل کر غور کریں کہ اس واقعہ کے اندر ہمارے اور ہماری قوم کے لئے کیا کیا درس عبرت و بصیرت پنہاں ہیں۔

اس وقت ہندوستان میں شاید ہی کوئی پڑھا لکھا مسلمان ایسا ہوگا جو دارالعلوم ندوہ سے واقف نہ ہو اور وہ حضرات جو تعلیمی معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ دارالعلوم ندوہ اور مسلمانوں کی دوسری درسگاہوں میں کیا فرق ہے۔۔۔۔۔ مشرقی ہند میں سب سے بڑی درسگاہیں علوم عربیہ کی چار تھیں یا ہیں۔ ایک مدرسۃ العلوم دیوبند، دوسری مدرسۃ عالیہ رام پور، تیسری مدرسۃ فرنگی محل اور چوتھی دارالعلوم ندوہ۔۔۔۔۔ ان میں دو درسگاہیں (دیوبند اور فرنگی محل کی) تو مخصوص تھیں۔ علوم مذہبیہ کے لئے اور اب تک ان کی یہ خصوصیت کم و بیش قائم ہے۔ باقی دو درسگاہیں علوم و فنون کے لئے مخصوص تھیں اور ایک طالب علم کو مذہبی انسان بنا کر نکالنا ان کا مقصد نہ تھا بلکہ ایک عالمانہ و محققانہ ذوق پیدا کرنا ان کا مدعا تھا۔۔۔۔۔ خیر مدرسۃ عالیہ رام پور تو موجودہ نواب رام پور کے جدید نظم و نسق اور تعصب پر قربان ہو گیا اور اس کا وجود ہی باقی نہیں رہا، لیکن دارالعلوم ندوہ ہنوز موجود ہے مگر اس شان کے ساتھ کہ اگر ہم اس کے گزشتہ دور کو موجودہ دور کے ساتھ مقابلہ

کر کے دیکھیں تو جو بآ اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ

وشتان ما بین نخل و خمر

اس کے دور اولین میں جب مولانا فاروق چریا کوٹی اس کے پرنسپل تھے، اس کی فضا باوجود ایک نئی درسگاہ ہونے کے بڑی حد تک خالص علم و فضل کی فضا معلوم ہوتی تھی اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی تھی کہ شاید ایک وقت ایسا آئے گا جب مسلمان بچوں کو ان کی ذہنی و عقلی آزادی کو مجروح کئے بغیر علوم مذہبیہ و حکمیہ کی تعلیم دی جائے گی اور اس میں شک نہیں کہ اس کے دور ثانی میں جب مولانا شبلی مرحوم نے عنان سیادت اپنے ہاتھ میں لی اس درسگاہ کی یہ خصوصیت بہت زیادہ نمایاں ہو گئی، لیکن ان کے بعد کا دور جو فی الحقیقت ”کبر نامورت الکبریٰ“ کا دور تھا ایسا ناکام ثابت ہوا اور مقاصد و نصاب کا انحطاط اس منزل تک پہنچ آیا کہ ”ڈاکٹر سید عبدالعلی“ سے بہتر کوئی ناظم اسے لکھنؤ بھر میں نہ مل سکا۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر عبدالعلی ندوہ کے تعلیم یافتہ ہیں، سائنس کے گریجویٹ اور لکھنؤ ٹیکل کالج کے ”ام بی۔ بی اس“ ہیں، لیکن ان اسناد کو نظم و نسق کی قابلیت سے کیا واسطہ، جبکہ اس کے لئے صرف ایک قائدانہ دماغ، ایک معملیانہ ذہنیت، اور کارفرمایانہ قابلیت کی ضرورت ہے سید عبدالعلی، ممکن ہے اچھے طبیب و ڈاکٹر ہوں، یہ بھی ناممکن نہیں کہ وہ کچھ لکھنا پڑھنا جانتے ہوں، لیکن کیا دنیا کا ہر طبیب و ڈاکٹر، ہر لکھنا پڑھنا انسان، ایک درسگاہ کا کامیاب ناظم بن سکتا ہے۔ پھر اگر یہ عہدہ انھیں صرف اس لئے تفویض نہیں کیا گیا کہ ان کے والدینہ رگوار بطور وراثت ان کے لئے چھوڑ گئے تھے، تو یقیناً ان کی دوسری اہلیت سوائے اس کے اور کچھ نہ ہو سکتی تھی کہ وہ نہایت ہی منقشہ قسم کے مسلمان ہیں اور کارکنان ندوہ کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس درسگاہ کو نہایت ہی سخت متعصب مذہبی درسگاہ بنا دیا جائے۔ جس کا ثبوت ذیل کے ایک واقعہ سے ملے گا۔

۱۹۲۶ء میں یونان سے علوم عربیہ کا ایک شایق طالب علم (عنایت علی) ہزاروں میل سفر کر کے لکھنؤ آیا اور دارالعلوم ندوہ میں داخل ہو گیا۔ چونکہ موسیقی کا بھی اسے فطری ذوق تھا اس لئے وہ رات کو خارج اوقات میں میوزک کالج جا کر اس شوق کو بھی پورا کرتا تھا۔ برابر تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن جب ناظم ندوہ ڈاکٹر عبدالعلی کو اس کا علم ہوا تو اپریل ۱۹۲۶ء میں انھوں نے اس غریب کو مدرسے علیحدہ کر دیا اور کوئی عہدہ ان کی بارگاہ میں پزیرا نہ ہوا۔ بظاہر یہ معاملہ نہایت معمولی نظر آتا ہے، لیکن حقیقتاً یہ سوال صرف کسی مخصوص طالب علم اور مخصوص ناظم کا نہیں، بلکہ ایک ایسی درسگاہ کا ہے جس کا تعلق پبلک کے مفاد سے ہے۔ اور اس اصول کا ہے جس کے ماتحت اس کا موجودہ نظم و نسق جاری ہے۔

پھر کیا میں ڈاکٹر عبدالعلی (موجودہ ناظم ندوہ) سے یہ سوال کر سکتا ہوں کہ کیوں انھوں نے اس طالب علم کو

در سگاہ سے خارج کیا اور وہ کون سی حجت شرعی ہے جو اس اخراج کو واجب ٹھہرانے والی تھی۔ فرض کیجئے کہ کوئی عیسائی یا ہندو طالب علم محض علوم عربیہ پڑھنے کے لئے ندوہ میں آکر داخل ہو تو کیا اس کو صرف اس حجت پر باہر نکال دیا جائے گا کہ وہ صلیب کی پرستش کرتا ہے یا شام کو مندر میں جا کر ناقوس بجاتا ہے۔ یقیناً نہیں۔ تو پھر کیا اس سے زیادہ حیرت انگیز مثال کسی اسلامی در سگاہ کے مستبدانہ نظم و انتظام کی کوئی اور ہو سکتی ہے کہ ایک طالب علم باوجود مسلمان ہونے کے صرف اس بنیاد پر تعلیم سے محروم کر دیا جاتا ہے کہ اسے موسیقی سے رغبت ہے اور وہ در سگاہ کے اوقات کے علاوہ اس کے سیکھنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ کیا موسیقی کا فن کی حیثیت سے سیکھنا ناجائز ہے؟ کیا رسول اللہ اور صحابہ نے گانا نہیں سنا اور کیا تاریخ سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ بہت سے اکابر اسلام کو موسیقی کے ساتھ حد درجہ شغف حاصل تھا اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو مان لیا جائے کہ فرط تقویٰ کا اقتضا یہی تھا۔ کہ اس طالب علم کو اس شوق سے باز رکھا جاتا تو کیا ڈاکٹر عبدالعلی بتا سکتے ہیں کہ انھوں نے اس احتیاط کو خود اپنی ذات کے لئے بھلی کبھی صرف کیا ہے یا نہیں اور وہ کون سی حجت شرعی ہے جس کی بنا پر وہ روزانہ مستعد وغیر محرم عورتوں کے جسم میں ہاتھ لگانے سے اجتراز نہیں کرتے۔ اور وہ تقویٰ کیسا ہے جو انھیں بہت سی ایسی دوائیں تجویز کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جن میں شمول الکحل کا ان کو یقین ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنے پیشہ کے لحاظ سے مجبور ہیں تو براہ کرم یہ بتایا جائے کہ ان جیسے متقی شخص کو ایسا ہمیشہ اختیار کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی اور کیا وہ کسی مسجد میں اذان و امامت کی خدمت انجام دینے پر قانع نہ رہ سکتے تھے۔

پھر یہ کس قدر حیرتناک امر ہے کہ ڈاکٹر عبدالعلی کے لئے تو محض پیشہ کی مجبوری نہیں بلکہ صرف مادی نفع کی غرض سے عورتوں کو ہاتھ لگانا اور مسلمانوں کو شراب آلود دوائیں پلانا تک حلال و مباح قرار دیا جائے (جو کبھی رسول اللہ نے جائز نہیں رکھا)۔ اور ایک غریب طالب علم کو ایک روحانی ذوق کی تسکین کے لئے موسیقی سیکھنا بھی حرام قطعی قرار دے کر مدرسہ سے باہر نکال دیا جائے (در انحالیکہ خود رسول اللہ کا گانا سنا اور اس سے لطف اٹھانا تاریخ سے ثابت ہے)۔

گر من آلود دامنم چه عجب
ہمہ عالم گواہ عصمت اوست

اسی طالب علم نے قبل موسیقی سیکھنے کے ایک استفتاء بھی ”علماء دین و مفتیان شرع متین“ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اور جو فتویٰ اس سے ملے یہ دیا گیا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے :-
۱۔ ابوالعلاء محمد شبلی مدرس دارالعلوم نے جواب دیا کہ :-

”علم موسیقی علم ریاضی کی ایک قسم ہے اور علم ریاضی کا مجموعہ اقسام سیکھنا مباح ہے بشرطیکہ ایسے مسائل جو خلافت شرع ہوں اس پر عامل نہ ہو بلکہ صرف علمی حیثیت سے سیکھ لیا ہے۔۔۔۔۔ بعض علوم ایسے ہوتے ہیں کہ اس کے سیکھنے والے کو معصیت کی طرف پہنچا دیتے ہیں جس کی وجہ سے اعتقاد اور عمل خراب ہو جاتا ہے۔ ان میں سے موسیقی بھی ہے اس وجہ سے ”ممنوع لغیرہ“ ہے۔“

۲۔ محمد شفیع حجت اللہ الانصاری فرنگی محلی کا ارشاد ہے :-

”فن شعر گوئی اور دیگر فنون لطیفہ کی طرح علم موسیقی کی تحصیل بھی فی نفسہ مباح ہے۔ البتہ اس قسم کے علوم و فنون کی تحصیل کے بعد ان کی عملی شوق کا جواز ضرور مشتبہ ہے۔“

۳۔ محمد اعظم شاہ مفتی آگرہ فرماتے ہیں :-

”علوم و فنون سب مباح ہیں۔۔۔۔۔ خصوصاً وہ علوم جنہیں جذبات مخفیہ کا اشتعال لازم ہے ان کی تحصیل یقیناً منجر بہ فساد ہے۔۔۔“

قطع نظر اس امر سے کہ جوابات کس زبان و عبارت میں دئے گئے ہیں صرف اس پر غور کیجئے ان سے کوئی صاف و صریح نتیجہ سائل کو مطمئن کر نہ سکتا ہے یا نہیں۔ اور اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر جب ہم ان جوابات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مفتی محلی پہلے تو موسیقی سیکھنا مباح قرار دیتا ہے لیکن بعد کو اسے ”ممنوع لغیرہ“ قرار دیتا ہے۔ اس اصطلاح سے ان کی مراد یہ ہے کہ موسیقی چونکہ انسان کے اخلاق خراب کر دیتی ہے اس لئے اپنے اس نتیجہ کے لحاظ سے ممنوع ہے۔ یہی مدعا غالباً مفتی محلی کا بھی ہے۔

فائنل مفتی نے اگر یہ نتیجہ صرف اپنے ہی رجحانات فطرت کو پیش نظر رکھ کر نکالا ہے تو کسی کو تردید کا حق حاصل نہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ موسیقی کو محض اخلاق کٹنا اتنی بڑی نادانی ہے کہ دارالعلوم ندوہ کے ایک مدرس کو اس سے شرم کرنا چاہئے۔ اگر مفتی حقیقتاً ہندوستانی موسیقی کے اصول، اور اس کی تاریخ سے بیخبر نہ ہوتا تو سمجھ سکتا کہ موسیقی حقیقتاً ایک عبادت ہے، ایک نیایش و گرایش ہے جو جو ارج ظاہری نہیں بلکہ صرف روح کی طرف سے فطرت کے حضور میں پیش کی جاتی ہے۔ اور اگر اس کو ”ممنوع لغیرہ“ قرار دیا جاتا ہے تو نماز و روزہ بھی ”ممنوع لغیرہ“ ہو، اگر اس کا نتیجہ کمزور یا اشتقادت قلبی نکلے، وہ مفت پلاؤ تو رومہ بھی ”ممنوع لغیرہ“ ہے جسے کھا کھا کر تخرم و ہیضہ کو دعوت دی جاتی ہے اور ڈاکٹر عبدالعلی کا پیشہ طبابت تو بدرجہ اولیٰ ”ممنوع لغیرہ“ ہے جس میں غیر محرم عورتوں کو ہاتھ لگانے کے مواقع روز پیدا ہوتے ہیں اور ایک انسان کی ”خیالی معصیت“ کے علاوہ ”عملی معصیت“ کا بھی بہت زیادہ امکان پایا جاتا ہے۔

مفتی محلی نے علم موسیقی کو علم کی حیثیت سے سیکھنا تو جائز قرار دیا ہے لیکن اس کی ”عملی شوق“ کے جواز

کو مشتبہ ظاہر کیا ہے معلوم نہیں "عملی شوق" سے ان کی مراد کیا ہے۔ اگر اس سے مقصود "بازاری پیشہ" کی طرح اس کو اختیار کرنا ہے تو مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ خود ماہرین موسیقی بھی اس حرکت کو ناجائز قرار دیتے ہیں، لیکن صرف اس دلیل پر کہ کسی فن کو ایک شخص بڑی طرح استعمال کر سکتا ہے اسے ناجائز کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے۔ علم الہمیہ حاصل کرنا ناجائز نہیں لیکن اگر کوئی شخص اس سے کام لے کر صرف زہر بنا لے اور لوگوں کو زہر دے دے کر ہلاک کیا کیسے تو کیا ایک خاص شخص کے اس فعل سے علم الہمیہ کا سیکھنا حرام قرار دیا جاسکتا ہے؟

علم الفقہ سیکھنا ہر مولوی کا فرض ہے لیکن اگر کوئی مفتی یا مولوی اس سے کام لے کر صرف ناجائز نکاح و طلاق کے شرعی بہانے تراشنے کا پیشہ اختیار کرے تو فقہ پر کیا الزام عاید ہو سکتا ہے اور اس کے حصول کو کیونکر ناجائز ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ — متعدد مثالیں ایسے اطباء اور ڈاکٹروں کی ملتی ہیں جنہوں نے محض اپنے فن طبابت کے ذریعہ سے ساری عمر فحاشی و اوباشی میں بسر کر دی، لیکن کیا اس سے اس فن کی تحصیل کو حرام قرار دے سکتے ہیں لیکن اگر مفتی مذکور کا مدعا "عملی شوق" سے یہ ہے کہ موسیقی کا کتابی علم تو جائز ہے اور عملی ناجائز، تو

مجھے مولانا کی واقفیت پر ماتم کرنا پڑے گا، کیونکہ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ موسیقی ان علوم میں سے ہے جن کا تعلق صرف عمل سے ہے۔ اور محض کتاب پڑھ لینے سے یہ فن حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ علم آواز کا ہے اور جب تک منہ سے آواز نہ پیدا کی جائے۔ اس کے اصول کیا بتائے جاسکتے ہیں۔ پھر اگر کوئی تدبیر مولانا کے نزدیک ایسی ہے کہ بغیر سامعہ کو متاثر کئے آواز پیدا ہو جائے یا بغیر آواز کے آواز نکل سکے تو اس کا اظہار کرنا چاہئے، جتنا کہ اس عجیب و غریب اکتشاف سے دنیا محروم نہ رہتی۔

موسیقی کو کتابی علم قرار دے کر اس پر کفایت کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے مولانا کسی کو وضو و نماز کے طریقہ زبانی بتادیں اور کہیں کہ بس اب تمہارے لئے وضو و نماز کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ محض ان طریقوں کا جان لینا گویا وضو کر کے نماز پڑھ لینا ہے۔

الغرض اس طالب علم کے معاملہ میں اگر ایک طرف "مفتیان شرع متین" نے فتویٰ دینے میں کم فہمی سے کام لیا تو دوسری طرف دارالعلوم ندوہ کے ناظم نے ایسے استبداد سے کام لیا جو ایک پبلک درسگاہ کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا۔

اس کا جواب کارکنان ندوہ کی طرف سے صرف یہ دیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی درسگاہ کے لحاظ سے عمل میں اس کو ناجائز قرار دیا ہے کہ کوئی طالب علم ایک ہی وقت میں علوم دینیہ بھی حاصل کرے اور موسیقی بھی۔ لیکن اگر اس امتناع کا سبب یہ ہے کہ علوم دینیہ اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں تو اس میں صحت کا کوئی نشانیہ نہیں اور اگر محض انتظامی نقطہ نظر سے اس کو ضروری قرار دیا گیا تو کیا یہ بتایا جاسکتا ہے کہ ایک پبلک درسگاہ کے نظم و

اہتمام میں اس نوع کے استبداد کو ضروری قرار دینا کن ارباب علم و فضل کی روشن دماغی کا نتیجہ ہے اگر یہ فعل موجود ناظم کے شخصی اجتہاد و فیصلہ کا مظاہرہ نہیں

۲۱ جنوری کو بعد مغرب جامع شمسی بدایوں میں مسلمانوں کی ایک جماعت طلب کجانی ہے تاکہ جامع مسجد کی مرمت کے لئے تدابیر

مولوی عبدالقدیر بدایونی اور مولوی عبدالحمید بدایونی
تو گوئی کہ مرغان شاطر بہ جنگ

سوچی جائیں۔ جناب عبدالقدیر بدایونی جو ”مولانا“ قوم کے ایک نہایت ہی سربرآوردہ فرد ہیں صدر قرار پاتے ہیں۔ ایک صاحب مفتی سخاوت حسین کھڑے ہو کر مشورہ دینا چاہتے ہیں کہ جلسہ ابھی شروع نہ کیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ ابھی اکثر محلوں کے لوگ جمع نہیں ہوئے، لیکن مولانا نے صدر کا پندار اس کو برداشت نہیں کرتا کہ ان کی صدارت کی کار فرمائیاں ایک لمحہ کے لئے بھی معطل حالت میں بڑھی رہیں

باہمی اختلاف کی وجہ سے کچھ ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہمارے مولانا برافروختہ ہو کر ایک صاحب مولوی محمد سلیمان کو نہایت درشت لہجہ میں سخت و سست کہنے لگتے ہیں اور مولوی عبدالحمید وغیرہ اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ لیکن مخالفت ذاتی کا یہ منظر خدا کی ایک عبادتگاہ میں اسی جگہ پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس میں اضافہ مار پیتا اور عمر ”کفش کاری“ کا بھی ہوتا ہے۔ بعد کو دوسرے دن کسی کو یکارے سے گرا کر زد و کوب بھی کی جاتی ہے اور دوسرے قادر یہ میں چاقو چلنے کا بھی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔

یہ بیان ہے وہیں کے ایک مقامی اخبار العدل کا جس میں اعتبار و بصیرت کے لئے نہ کسی تفسیر و شرح کی ضرورت ہے اور نہ ”مولاناؤں“ کے اخلاق اسلامی پر کسی مزید روشنی ڈالنے کی۔ اسی کے ساتھ معاصر مذکور نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ ۳۳ فروری کو مولوی عبدالقدیر اور مولوی عبدالحمید کو دو فریق مقرر کر کے حکام کی جانب سے چمکے لئے گئے اور دفعہ ۱۰ کی کارروائی کے لئے اور فروری عدالت نے مقرر کی۔ یہ ہیں کارنامے ہمارے علماء کرام اور مذہبی رہنماؤں کے اور یہ ہیں اخلاق قوم کے ان مشائخ کے جو اپنی درازنباؤں میں خدا جانے کتنے افسانے اپنی ”کوہ آستینوں“ کے پہناؤں سے دیکھتے ہیں۔ یہ ظاہر انکی صورت دیکھنے تو معلوم ہوتا ہے کہ انکے اندر ”روح القدس“ حلول کر گئی ہے، لیکن انکے معاشری اخلاق اور انکا بطون ایک ایسا ہادیہ ہے جہاں طبع و خود غرضی کے شعلوں کے سوا کسی اور نور کا پتہ نہیں اور انکے اعمال کی داستان حقیقتاً عصیان کاری کے ایسے ایسے نادر ٹکڑے اپنے اندر رکھتی ہے کہ ہم زندان بادہ خوار کا خیال بھی اس حد تک نہیں پہنچ سکتا سچ ہے

کیمیائے ست عجب معرفت در گریار خاک آگشتم و چندیں در جاتم دادند

فراعینہ مصر کی خوابگاہیں

رُودنیل کی آغوش میں

(اہرام مصر کو دیکھ کر)

ایک بالکل جدید نظریہ

” اسے ازلی وابدی اہرام۔ اسے ماضی کے اسرار عظیم۔ اسے حال کی چبستاں۔ اور آئندہ آبنوالی

نسلوں کی لٹلٹلایہ حیرت و استعجاب!“

یہ ہیں وہ الفاظ جو ایک ادیب سیاح نے اہرام مصری کے متعلق لکھے ہیں۔

اہرام کا پہلا نظارہ | جب کوئی سیاح عروس البلاد قاہرہ سے رُودنیل کے مشرقی کنارہ پر اہرام کا پہلا نظارہ کرتا ہے تو فاصلہ کی وجہ سے وہ زیادہ دلچسپ تو نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس کے دل میں کچھ اور تاثرات

بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ چار پانچ میل کے فاصلہ سے وہ ایسے نظر آتے ہیں گویا قریب ہی ہیں۔ اور جوں جوں سیاح آگے بڑھتا جاتا ہے وہ دور ہوتے جھلے جاتے ہیں۔ اور دیکھنے والے کو ان عجیب عمارتوں کی عظمت و شان پر غور کرنے کا کافی موقع ملتا ہے۔ یہ خاص اثر کچھ تو اہرام کی عظمت کی وجہ سے ہوتا ہے اور کچھ ان کی وضع قطع کے سبب سے۔ چونکہ اہرام بہت عظیم الشان اور چار برابر قاعدوں کے بڑے بڑے ٹوکے ہیں۔ اس لئے ان میں ایسے چھوٹے چھوٹے ٹھکے نہیں ہیں جن پر سیاح کی نظر جم سکے۔

صبح صادق کی دھندلی روشنی میں جب ان اہرام پر پہلی نظر ڈالی جاتی ہے تو وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا عجیب ہیئت کے پہاڑ ہیں اور ہر م اعظم ایک ایسا پہاڑ معلوم ہوتا ہے جس کے نیچے کی زمین ایک طرف سے دب گئی ہے۔ اور وہ ایک طرف کو زیادہ جمع گلیاں ہے۔ جب سیاح ان تین بڑے اور ایک چھوٹے ہرم کے قریب پہنچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین کا یہ حصہ بے اختیار اندر کی طرف ابھرا جا رہا ہے۔ اور جب وہ تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر رہ جاتا ہے تو اس قدر قریب معلوم ہوتے گویا آگے بڑھ کر ان کو چھو لیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب سیاح اور زیادہ قریب پہنچتا ہے تو ان کی عظمت کا نہایت گہرا اثر اس پر پڑنے لگتا ہے۔ اور جب وہ ان کے ڈھلوان پہلوؤں پر نظر دوڑا کر ان کی چوٹیوں پر نظر ڈالتا ہے تو ٹوپی سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے

بعض مرتبہ ان اہرام کو دیکھنے والوں کے جذبات اس قدر ہیجان میں آتے ہیں اور اس قدر وحشت و ہمت طاری ہو جاتی ہے۔ کہ لطف کے بجائے تکلیف پیدا ہو جاتی ہے اور غالباً اسی وجہ سے ان کے متعلق لوگ یہ بیان کیا کرتے ہیں۔ کہ ان کو وہ صورت اور بدہمت تو دوں کی تعمیر میں نہ کوئی ذوق سلیم نظر آتا ہے نہ خوبصورتی۔ ہرم اعظم کی بائیں میں کھڑا ہو کر اگر کوئی شخص اس پر نگاہ ڈالے تو اس سر بفلک جلیل القدر یادگار کو دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ عرب رہنا جس اس پر چڑھ کر ادھر ادھر پھرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیڑے رینگ رہے ہیں۔ جب کوئی شخص ہرم پر چڑھنا شروع کرتا ہے اور دم لینے کے لئے کھڑا ہو کر نیچے کی طرف دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ نیچے کھڑے ہوئے ہیں وہ مشرقات الارض سے زیادہ بڑے نہیں۔ اور پھر جب وہ ہرم کی چوٹی کی طرف نظر اٹھاتا ہے تو اس کی عظمت و شان کی حقیقت کھلتی ہے۔ عرب رہناؤں کی مدد سے ہرم اعظم پر چڑھنے میں نصف گھنٹہ کے قریب وقت صرف ہوتا ہے

ہرم اعظم | ہرم اعظم ان اہرام میں سے ایک ہے جو شہر قاہرہ سے جانب جنوب تھوڑے سے فاصلہ پر دریائے نیل کے کنارے واقع ہیں۔ تمام اہرام میں سے ہرم سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ کیونکہ یہ بلحاظ حجم سب سے بڑا بھی ہے۔ اور اس کے متعلق بہت سی دلچسپ روایات بھی بیان کی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں اس کے اندر بہت سے پوشیدہ راستے، سُرنگیں اور کمرے بھی ہیں۔ ہرم اعظم کے اندر بڑے بڑے وسیع ایوانات شاہی بنے ہوئے ہیں۔ جن میں طویل راستوں اور غلام گردشوں کے ذریعہ سے پہنچنے ہیں۔ ان راستوں کا داخلہ نہایت ہوشیاری سے پوشیدہ رکھا گیا تھا، حتیٰ کہ ان کے اندر صدیوں تک کوئی شخص داخل نہ ہو سکا۔ مگر اتفاق سے ان راستوں کا راز افاش ہو گیا تب لوگوں کو اندرونی زمین دو زمروں کا حال معلوم ہوا۔ ان کمروں میں داخل ہونے کے لئے سطح زمین سے اس قدر بلند و طویل راستے کیوں بنائے گئے، یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہرم اعظم کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً بڑی گیلری کا راستہ زمین سے تقریباً ۲۸ فٹ بلند ہے۔ اور ڈھلوان ہوتا ہوا۔ ایوان شاہی کی طرف چلا گیا ہے اگر اس راستہ کا مقصد صرف یہ ہوتا کہ بادشاہ کا تابوت ایوان شاہی میں پہنچا دیا جائے تو آٹھ فٹ اونچا راستہ بھی کام لے سکتا تھا، دروازہ کو اس قدر بلند بنانے کی کیا ضرورت تھی، یہ وہ مسئلہ ہے جو پچھلے دیگر اسرار ہرم اعظم کے ہنوز حل طلب ہے۔ ان اسرار پر ہم آئندہ بحث کریں گے۔ سب سے پہلے ہم اس کے عجیب و غریب تاریخی حالات درج کرتے ہیں۔

تاریخی حالات | ہرم اعظم ملک خوف فرعون مصر نے تعمیر کیا تھا۔ جسے انگریزی زبان میں کیولیس (C. K.) کہتے ہیں۔ اس فرعون کے عہد کی تاریخ کے بارہ میں اگرچہ ابھی تک کسی قدر شبہ باقی ہے لیکن اس قدر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کم از کم ۲۹۰۰ سال قبل مسیح پایا جاتا تھا، اور بعض کے نزدیک اس کا زمانہ اس سے بھی ایک ہزار سال قبل تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خوف فرعون مصر نے یہ ہرم اپنے مقبرہ کے لئے تعمیر کیا تھا۔ اور اس امر کی بھی کافی شہادتیں موجود ہیں کہ فرعون مذکور نہایت تزک و اعتشام کے ساتھ ایوان شاہی میں مدفون کیا گیا تھا۔

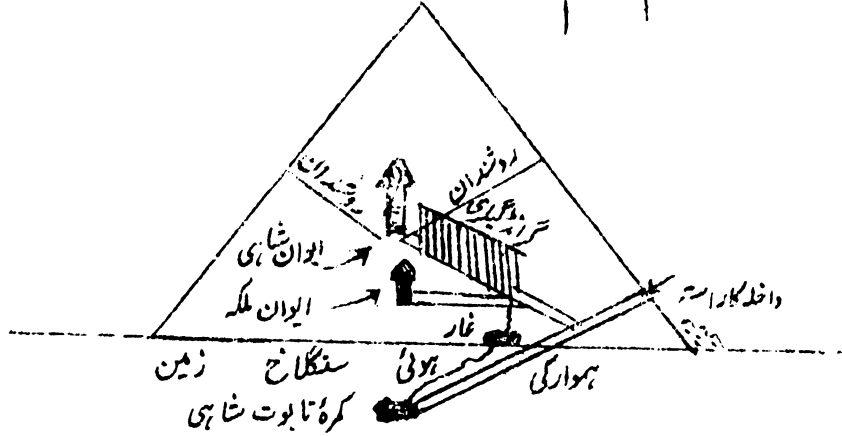
اس ہرم کی تعمیر میں کھوکھا غلام لگائے گئے تھے۔ اور سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد تعمیر ہوا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ تمام کاریگروں اور مزدوروں کو ایک ایک لاکھ کی نین جماعتوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر جماعت کو نین ماہ تک کام کرنا پڑتا تھا۔ اور بقیہ دونوں جماعتیں اس جماعت کو سامان رسد پہنچانے کے علاوہ اپنا اپنا کام کرتی تھیں

اس مقبرہ کی تعمیر میں سب سُرخ اور سنگ آہک (چونے کے پتھر) سے کام لیا گیا تھا۔ سب سُرخ مصر سے سات سو میل کے فاصلہ پر بتام سائینہ کھودا گیا تھا۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ تعمیر ہرم کے لئے اس قدر بے حد فاصلہ سے اتنے بڑے بڑے پتھر کے ٹکڑوں کو کیونکر لایا گیا تھا۔ دوسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ آلات جرنقیل موجود نہ تھے ان بھاری پتھروں کو سطح زمین سے اٹھا کر ان کی جگہ پر نصب کیونکر کیا گیا، جبکہ ہرم اعظم کی بلندی ۴۸۱ فٹ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہرم اعظم کے اندر ۲۳ لاکھ عظیم پتھر کی سلیں نصب ہیں اور ہر سلی اندازاً ستر من کی ہے

تعمیر کے متعلق مختلف نظریے

اس بارہ میں مختلف نظریے قائم کئے گئے ہیں کہ ہرم اعظم کی تعمیر میں جو کتنے بڑے بڑے پتھر کام آئے ہیں انھیں زمین سے اٹھا کر ان کے مقام تک کیونکر پہنچایا گیا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ ان پتھروں کو بلند کرنے کے لئے عظیم الشان منجینقوں سے کام لیا گیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ موٹے موٹے ریشوں میں باندھ کر مزدوروں نے اٹھایا تھا۔ لیکن صحیح قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریائے نیل کے کنارہ سے ہرم اعظم کی بنیاد تک ایک ڈھلوان راستہ بنایا گیا تھا۔ اور ہزار ہا مزدور ایک ساتھ زور لگا کر ان پتھروں کو گشتیوں سے اٹھا کر راستہ پر لڑھکاتے یا کھینچتے ہوئے موقع پر پہنچا دیتے تھے۔ اور جب ہرم کی زیریں منزل مکمل ہو جاتی تھی تو اس سڑک کی سلامی اور زیادہ کر دی جاتی تھی۔ جب ہرم اعظم مکمل ہو گیا تو یہ سڑک توڑ دی گئی اور اس کا ملبہ کسی دوسرے مقام پر پہنچا دیا گیا۔ اس سڑک کے آثار اب بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔

ہرم اعظم کے ایوان اور راستے



ہرم اعظم کے متعلق دلچسپ معلومات | ہرم اعظم کے جزائی وقوع کے متعلق بعض بہت سی دلچسپ باتیں

بیان کی جانی ہیں مثلاً :-

یہ کہ ہرم اعظم سے جو خط طول البلد و عرض البلد گزرتا ہے۔ اس پر دنیا بھر میں سب سے زیادہ خشکی کا حصہ پایا جاتا ہے یا یہ کہ مصر زبریں کے جس علاقہ میں ہرم اعظم واقع ہے وہ تمام دنیا کی آباد زمین کا مرکزی حصہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہرم اعظم کے مشرق و مغرب کی طرف جس قدر خشکی کا حصہ ہے اگر اس کا حساب مربع میلوں میں لگایا جائے۔ اور بالائی اور زبریں گوشوں کے مابین خط کھینچے جائیں تو یہ دونوں خط عین اس مقام پر قطع ہوں گے جہاں ہرم اعظم واقع ہے جس مقام پر ہرم اعظم واقع ہے وہاں سے تقریباً ۳۰ درجہ عرض البلد شمالی کا خط گزرتا ہے۔ گویا وہ خط استوا اور قطب شمالی کے درمیان ایک ثلث فاصلہ پر واقع ہے۔ ہرم اعظم کے اطراف یا چاروں پہلو بالکل صحیح شمال، جنوب، مشرق و مغرب کی طرف واقع ہیں اور انھیں اس قدر صحت کے ساتھ تعمیر کیا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ لہذا کرہ ارض کا خط محور براہ راست اس جگہ کے پینے سے گزرتا ہے۔ جہاں بادشاہ کا کمرہ ہے۔ ہرم اعظم ایک صاف اور ہموار شدہ سنگلاخ زمین کی سطح پر تعمیر کیا گیا ہے۔ جو غالباً ریگ صحرا دور کرنے سے نکالی گئی ہوگی۔ ہرم اعظم کے اطراف اس کی چوٹی سے ۵۵ درجہ کا زاویہ بنائے ہیں۔ اس کی بلندی ۸۱ فٹ ہے۔ اور ٹھوس پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ جس کے اندر بہت سے پوشیدہ کمرے ہیں۔ اور ان کمروں تک ڈھلوان راستے جاتے ہیں۔ ہرم اعظم کے جانب شمال اندر داخل ہونے کا صرف ایک راستہ ہے۔ جو چار فٹ کے قریب اونچا اور تین فٹ پانچ انچ سے کسی قدر زائد چوڑا ہے۔ یہ دروازہ سطح زمین سے پتھروں کی ساٹھیس تہ یا منزل پر واقع ہے۔ راستہ پینے کی طرف کچھ دور تک ڈھلواں چلا گیا ہے۔ بعد ازاں اس کے دو حصے ہو جاتے ہیں۔ ایک راستہ اوپر کی طرف چلا جاتا ہے اور دوسرے مسلسل طور پر زمین دوز ایوان میں پہنچتا ہے جو سطح زمین سے بہت نیچا اور بالکل صحیح طور پر ہرم کی چوٹی کے پینے واقع ہے اوپر جانے والا راستہ کچھ دور کے بعد ایک عظیم الشان چھتہ یا "گراند گیلری" میں پہنچتا ہے۔ جو اٹھائیس فٹ بلند اور ۵۸ فٹ طویل ہے۔ چھتہ کے سرے پر ایک چھوٹا سا راستہ اور ہے جو گیلری میں سے گذر کر ایک تنگ دروازہ تک پہنچتا ہے۔ یہ دروازہ ایوان شاہی کا ہے۔ جس میں بادشاہ کا تابوت رکھا گیا تھا۔ اسی ایوان کے قریب سے دوسرا رخ بطور روشندان ہرم کی بیرونی سطح تک گئے ہیں، ایوان شاہی کے اوپر بعض خالی مقامات ہیں۔ اور ان میں جو سب سے اونچا مقام ہے اس پر دو بڑے بڑے پتھر رکھے ہیں جن کا مقصد غالباً یہ ہے کہ ایوان شاہی کے اوپر جو پتھروں کا زبردست بوجھ ہے اس کو سہاریں۔ گراند گیلری کے عین پینے شمالاً جنوباً ایک افقی سیدھا راستہ اور ہے جو اس کمرہ میں داخل ہوتا ہے جو ملکہ کا ایوان کہلاتا ہے۔ (نقشہ دیکھنے سے یہ تفصیلات بخوبی سمجھ میں آجائیں گی) اس سیدھے راستے کے شروع میں ایک اور ناہموار سرنگ ہے جو اس مقام پر پہنچتی ہے جسے زمین دوز "غار" کہتے ہیں۔ اس غار سے ایک سرنگ سب سے نیچے والے ایوان میں اترتی ہے۔ اور اسی ایوان میں راستہ کے دہانہ سے ایک سیدھا سلامی دار راستہ بھی پایا جاتا ہے۔ اس وقت تک ہرم اعظم کے اندر جو کمرے معلوم ہوئے ہیں وہ یہی ہیں۔ آگے چل کر ہم ان کمروں اور خود ہرم اعظم کے متعلق جو پہلی باتیں اور معلومات درج کریں گے وہ بہت دلچسپ ہوں گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خفیہ راستے اور ایوان کیونکر معلوم ہوئے اور کس نے معلوم کئے؟ ہم جانتے ہیں کہ ہرم اعظم جب مکمل ہو گیا تھا تو اس کو بند کر کے تمام راستے چھپاؤٹے گئے تھے۔ یہ گویا ولادت عیسیٰ سے صدیوں بلکہ ہزاروں برس پیشتر کا واقعہ ہے۔ اور یہ ہرم ہزاروں برس اسی طرح سر بہرہ رہا۔ اس کا اندرونی راز قدام کو بھی معلوم نہ تھا۔ ابتدا میں ہرم اعظم کے اطراف پر ایک قسم کے سیمینٹ کی گچ کاری تھی۔ اور اس کے سب پہلو بالکل صاف اور چکنے تھے۔ مگر بعد میں یہ بلا سٹر دور کر دیا گیا اور اسے دیگر تعمیر کاموں میں لگا دیا گیا۔ اسی طرح ہرم کی جوٹی کے پتھر بھی اکھاڑ کر دوسری تعمیروں میں لگا دیے گئے۔ کیونکہ پہلے ہرم کی جوٹی نوکدار تھی۔ مگر اب اس کی سطح ۳۳ فٹ مربع کی ہے۔ جو میری طرح معلوم ہوتی ہے۔

خلیفہ المامون عباسی اور ہرم اعظم | اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ ہرم اعظم کے خفیہ راستے اور کس نے کیونکر معلوم ہوئے۔ خلیفہ المامون بن ہارون الرشید پہلا شخص تھا جو سن ۸۰۲ء کے اوائل میں راستہ توڑ کر داخل ہوا۔ اس نے اپنے مزدوروں کو حکم دیا کہ وہ شمالی پہلو کے وسط میں توڑ کر راستہ بنائیں مگر چونکہ اس کا راستہ عین وسط میں نہیں بلکہ ۴۴ فٹ بلند جانب مشرق ہٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس لئے ماموں کے کاریگروں کو انتہا سے زیادہ محنت کرنا پڑی۔ اور بالآخر وہ چلا اٹھے کہ اس عجیب و غریب ہرم کا کھودنا ان کے قابو سے باہر ہے مگر چونکہ مامون عزم راسخ کر چکا تھا اس لئے مجبوراً کام جاری رہا لیکن اس قدر مست رفتاری کے ساتھ کہ چھ مہینے میں صرف سو فٹ کی سڑنگ کھودی جاسکی اور راستہ کا پتہ پھر بھی نہ ملا۔ بعض کاریگروں کو ہرم اعظم کے متعلق یہ پڑانی روایات یاد آئیں۔ کہ مصر کے کسی پڑنے بادشاہ سے یہ کہا تھا کہ اگر وہ مصر کی تمام دولت بھی اس کام میں لگا دے گا۔ تب بھی وہ کسی ہرم کو توڑ نہیں سکے گا۔ لیکن اسی اثنا میں ان سے چند فٹ ایک طرف کسی خالی جگہ میں کوئی بڑا پتھر گرا۔ بس آواز کا سننا تھا کہ ان کی ہمتیں بندہ گئیں۔ اور انہوں نے نہایت سرگرمی کے ساتھ اپنی سڑنگ اسی طرف کو دوڑانا شروع کر دی جس طرف سے پتھر گرنے کی آواز سنائی تھی۔ اور آخر کار ایک خالی مقام تک اپنی سڑنگ پہنچا ہی دی۔ یہ مقام حد درجہ تاریک اور دشوار گزار تھا۔ یہ ایک سلامی دار راستہ تھا جو انہوں نے معلوم کیا تھا۔ اور اسی کے اندر چھت سے اکھڑ کر پتھر گرا تھا۔ اسی واقعہ سے یہ بات ثابت ہو گئی۔ کہ چھت میں جہاں سے وہ پتھر گرا تھا، ایک دوسرا راستہ شروع ہو کر ہرم اعظم کے اندر گیا ہے

چونکہ ان لوگوں کو یقین تھا کہ ہرم کے اندر بے شمار خزانہ بھرا ہوا ہے اس لئے وہ لوگ بے صبری کے ساتھ آگے بڑھے یہ راستہ صرف ۴۴ فٹ اونچا اور ۲۱ فٹ چوڑا تھا۔ اسی کے اندر دیکھتے ہوئے وہ لوگ چلتے رہے اور بالآخر ایک طویل اور بلند چھت کے اندر ہو گئے جہاں شبِ دیبورا کی سی تاریکی اور قبر کا سا سکوت طاری تھا۔ یہ راستہ یا چھت ان لوگوں کو اس سنگین قید خانہ کے اندر لے گیا۔ جب وہ لوگ اس ”گراڈ ٹیکلری“ کے اندر داخل ہو گئے تو انہوں نے اپنے اپنی طرف ایک نہایت عمیق کنوں کا منہ دیکھا جو ۱۲۰ فٹ گہرا تھا۔ مگر اس سے آگے اسی چھت کا سلسلہ برابر چلا گیا تھا۔ چنانچہ وہ لوگ اس لالچ میں اور آگے بڑھتے چلے گئے کہ شاہانِ قدیم کا بے شمار خزانہ ان کے ہاتھ آجائے گا۔ یہ راستہ تنگ ضرور تھا کیونکہ صرف ۶ فٹ چوڑا تھا۔

اور زمین پر صرف تین ہی فٹ چوڑا تھا۔ مگر اس کی بلندی ۲۸ فٹ تھی اور اس کی دیواروں کی سطح سنگ مرمر کی طرح صاف چمکنی اور چمکدار تھی۔

ان لوگوں نے یقین کر لیا کہ واقعی دینہ کار راستہ یہی ہے۔ الغرض وہ اس راستہ پر جو ۲۶ درجہ کا زاویہ بنانا ہے۔ آگے بڑھتے رہے۔ اور ڈیڑھ سو فٹ اور آگے پہنچ گئے۔ اس کے بعد سامنے ایک تین فٹ بلند سیڑھی راہ میں حائل ہوئی۔ اسکے بعد ایک تنگ دروازہ ملا جس کے اندر انھیں گردنیں جھکا کر گھٹنیاں اڑا۔ پھر ایک اور تنگ راستہ ملا، بعد ازاں سنگ مرمر کا ایک اور تنگ دروازہ ملا۔ لیکن اس کے بعد وہ ایوان شاہی کے اندر داخل ہو گئے۔ اور یہی وہ منزل تھی جس کے لئے یہ تمام سرفراک اور عجیب و غریب عمارت تعمیر کی گئی تھی۔

ایوان شاہی میں ان لوگوں نے کیا دیکھا؟ صرف ایک شاندار کمرہ۔ ۳۴ فٹ طویل اور ۷ فٹ عریض اور ۱۹ فٹ بلند۔ جو صاف اور چمکدار سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ اس کے تمام پتھر بالکل چو کو را در پالش شدہ تھے۔ جو حد درجہ خوبصورتی کے ساتھ نصب کئے گئے تھے۔ مگر اس کے اندر خزانہ کالمیں وجود نہ تھا۔

جب یہ خیر خلیفہ ماموں الرشید کو ملی تو وہ حیران و ششدر رہ گیا۔ وہ بھی اپنے کاریگروں اور مزدوروں کی مدد سے ایوان شاہی تک پہنچ گیا تھا۔ مگر وہاں اس کو ایک تابوت کے سوائے کچھ بھی نہ نظر آیا

نی الحقیقت یہ دنیا کے غیر العقول اسرار میں سے ہے کہ آخر اس فرعون مصر کی لاش کہاں گئی جس کے لئے یہ تابوت بنایا گیا تھا اور جو اس سنگین مقبرہ میں اس قدر حفاظت کے ساتھ رکھی گئی تھی۔ یہ باور کرنے کی ہر وجہ موجود ہے کہ فرعون کی حنوط شدہ لاش ضرور اس تابوت کے اندر رکھی گئی تھی۔ اور بعد ازاں تمام اندرونی و بیرونی راستے پوری طرح احتیاط کے ساتھ سر بہر کر دیے گئے تھے۔ کیونکہ اگر فرعون کی حنوط شدہ لاش تابوت میں نہ رکھی گئی ہوتی تو پھر راستوں کے بند کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر جب ماموں کے لوگ کمرہ میں داخل ہوئے تو انھوں نے فرعون کی لاش کو غائب پایا اور اسی کے ساتھ تابوت کا ڈھکنا بھی۔ یہ چیزیں کیا ہوئیں یا ان کو کون لے گیا؟ یہ راز آج تک حل نہیں ہوا۔

جب سنہ ۱۸۶۶ء میں خلیفہ الماموں باللہ عباسی کے کاریگروں نے ہرم اعظم کا پہلو توڑ کر راستہ مغربی مستشرقین بنایا اس وقت سے گذشتہ صدی کے آغاز تک ہرم اعظم کس پیرسی کی حالت میں پڑا رہا۔ لیکن سنہ ۱۸۶۳ء میں آکسفورڈ کے مشہور ماہر فلکیات پروفیسر جان گریوس نے اس کی سیرکی اور اندرونی و بیرونی حصوں کے بہت سی مقامات کی پیمائشیں لیں۔ اس کے بعد مسٹر جان بلڈر ولادت سنہ ۱۸۶۱ء وفات سنہ ۱۸۶۷ء نے آکر دیکھا اور پیمائشیں لے کر بہت سے نظریے قائم کئے جن کی بعد میں پروفیسر پیلاڈمی اساتھ نے بہت سی تفصیلات بیان کیں۔ سنہ ۱۸۶۳ء میں کرنل ہارڈوولس نے بھی اس کی بہت کچھ دیکھ بھال کی اور یہی پہلا شخص تھا جس نے وہ دونوں سو راج دریافت کئے جنھیں روشندان کہتے ہیں اور جو ایوان شاہی کے اطراف سے نکل کر ہرم کے باہر تک گئے ہیں۔ اور اسی شخص نے وہ خالی کمرے معلوم کئے جو ایوان شاہی

کی چھت بنتے ہوئے چلے گئے ہیں۔ اور جن کی تعمیر کا مقصد غالباً یہ تھا کہ اوپر کے حصہ کا بوجھ سہا سکیں۔
 یقیناً دنیا پر و فیسر پیازی اسمائیکھ کی ممنون ہے جن کی بدولت ہرم ... اعظم سے عوام کو اس قدر دلچسپی پیدا ہوئی۔
 کیونکہ یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے نہایت محنت اور احتیاط سے اس تعمیر کے ہر حصہ کی تفصیل دار پیالیٹ کی۔ مگر افسوس ہے
 کہ پرو فیسر مذہبی خیال کے آدمی تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنے بیانات میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ ہرم اعظم ایک الہامی
 تعمیر ہے۔ اور یہ عظیم الشان عمارت خداوند تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے کی ایک ابدی آیت ہے جو ہذا رب العالمان انسان پر نازل
 ہوئی تھی۔ پرو فیسر صاحب نے اپنا یہ قول ہرم کی پیالیٹوں پر مبني کیا۔ جن سے ان کے نزدیک یہ بات ثابت ہوتی تھی
 کہ "بانیان ہرم اعظم نے اپنے علم سے زیادہ عمارت بنائی۔" پرو فیسر صاحب نے یہ بات بھی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کہ
 ہرم اعظم فرانسسیسی بیانہ عشری پر نہیں بلکہ انگریزی بیانہ فٹ اور اینج کے حساب سے تعمیر کیا گیا ہے۔ پرو فیسر صاحب کی
 پیالیٹیں واقعی حیرت انگیز ہیں۔

بعض دلچسپ اعداد و شمار

دنیا جانتی ہے کہ دائرہ کے قطر اور اس کے محیط میں جو نسبت ہے اسے
 یونانی حروف "پائی" π سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی صحیح عدد نہیں ہے۔
 بلکہ اعشاریہ کی پانچ حد تک جو عموماً تمام کاموں کے لئے ٹھیک سمجھا جاتا ہے۔ اس کی قیمت اعدادی ۱۷۱۵۹ : ۳ ہے۔
 لیکن اس کی قیمت لا انتہا مقامات اعشاریہ تک نکالی جاسکتی ہے۔ ۱۸۶۳ء میں مسٹر ٹینکس نے اس کی قیمت اعدادی سات
 سو مقامات اعشاریہ تک نکالی تھی۔ یہی باعث ہے یعنی چونکہ ہم کو "پائی" π کی صحیح عددی قیمت معلوم نہیں اس لئے
 دائرہ کو مربع نہیں بنایا جاسکتا۔

اب ملاحظہ فرمائے کہ ہرم اعظم کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس کی اصلی اونچائی کو اس کے قاعدہ کے دو گئے سے وہی
 نسبت تھی جو دائرہ اور قطر کے درمیان ہوتی ہے۔ یعنی "پائی" π کی بالکل صحیح عددی قیمت۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکالا گیا
 تھا کہ ہرم اعظم کے تعمیر کرنے والے علم المساحت کے اس مسئلہ سے بخوبی واقف تھے۔ اور گویا انھوں نے "پائی" π کی قیمت
 عملاً حل کر دی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک سال ۳۶۵ دن سے کسی قدر زیادہ کا ہوتا ہے۔ وقت کو پورا
 کرنے کے لئے ہر چوتھے سال ایک دن بڑھا دیا جاتا ہے۔ اور وہ سال "سال کبیسہ" کہلاتا ہے میں ہر سال ۳۶۵ : ۲۲ : ۲۲
 دن اور اعشاریہ کے لا انتہا مقامات ہوتے ہیں۔ اور ہر سال کبیسہ میں ۳۶۶ دن ہوتے ہیں۔ اب خیال فرمائے کہ ہرم اعظم
 کا جو مربع قاعدہ ہے اس کی ہر طرف کی پیالیٹ یا لمبائی کو اگر ۳۶۶ حصوں میں تقسیم کیا جائے تو ہر حصہ لمبائی میں کرہ ارض
 کے نصف محور کا ایک حصہ کے قریب یا ۲۵ اینج انگریزی کے قریب ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہرم اعظم کا جو انجنیر
 تھا اس نے اس کے قاعدہ کی بنیاد رکھتے ہوئے ایک ایسا بیانہ استعمال کیا ہوگا جو طول میں ۳۵ اینج لمبا تھا۔ اور اس وقت

اس کے ذہن میں سال کے دن اور اس کی کسر ہوگی۔ اس طرح گویا اس نے اس پیمانہ کے ذریعہ سے ہرم اعظم کے قاعدہ کی ہر سمت سال کے دنوں پر شمار کی تھی۔ اور یہ پیمانہ (یعنی ۲۵ انچ انگریزی) کرہ ارض کے نصف محور کا ایک لاکھ حصہ ہے، اس لئے اگر اسے ۲۴۲، ۳۶۵ (سال شمسی کے دنوں کی تعداد) سے ضرب دیا جائے تو ہرم اعظم کے ربع قاعدہ کی ہر طرف کی صحیح پیمائش نکل آئے گی۔ اسی قسم کے واقعات سے مسرز بٹلر اور اسماٹھ نے یہ نتیجہ نکالا کہ تعمیر ہرم اعظم میں فٹ اور انچ کے پیمانہ سے کام لیا گیا تھا۔ پڑائے مصری "ہاتھ" کے پیمانہ سے کام نہیں لیا گیا تھا جو اندازاً ۲۰.۶ انچ انگریزی کا ہوتا ہے۔ درحقیقت ہرم اعظم کی تعمیر کا پیمانہ وہ تھا جسے "ہرمی اینچ" کہتے ہیں۔ جو انگریزی اینچ سے خفیف سا مختلف ہے۔ مگر عملی کاموں کے لئے قریب قریب دونوں برابر ہیں۔ لہذا انگریزی اینچوں کے تمام مضروب "ہرمی اینچوں" کے مضروب ہیں۔ یہ امر بد نظر رکھتے ہوئے یہ بات واقعی دلچسپ ہے کہ چونکہ ہرم کے قاعدہ میں چار ضلع ہیں۔ اس لئے ان سب کی مجموعی لمبائی ۲۶۵۲۴ ہرمی اینچ ہوتی ہے یعنی تقریباً سو اینچ فی یوم۔

مسرز پیٹری (Perry) نے یہ بھی دکھایا ہے کہ اگر ۵۸۱۳ ہرمی اینچوں کو انگریزی اینچوں کی صورت میں منتقل کیا جائے اور انھیں ۱۰۹ میں ضرب دے کر ان اینچوں کے میل بنائے جائیں تو ہمیں کرہ ارض اور آفتاب کے درمیان کا صحیح فاصلہ معلوم ہو جاتا ہے۔ یعنی تخمیناً نو کروڑ ۲۰ لاکھ میل۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ہرم اعظم کے تعمیر کرنے والوں کو یہ بھی علم تھا کہ کرہ ارض اور ہمارے مرکزی منبع نور کے درمیان صحیح طور پر کتنا فاصلہ ہے۔

اسی قسم کے دیگر واقعات سے جو ہرم اعظم کے بیرونی حصص کی پیمائش پر مبنی ہیں یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ہرم اعظم کی تعمیر الہامی طور پر ہوئی تھی۔ اور پھر ہرم کے اندرونی راستوں اور خفیہ ایوانوں کی مختلف پیمائشیں کر کے اس خیال کی مزید توثیق کی گئی۔

مسرز جوزف اے سیس (J. S. Searcy) نے اپنی کتاب "معجزہ سنگین" میں بعض اہم پیمائشیں درج کی ہیں مثلاً:-

اگر ہم ایوان شاہی کی لمبائی ۴۱۳۱۳۲ اینچ لیں اور اسے ایک دائرہ کا قطر سمجھیں اور پھر اس دائرہ کا رقبہ نکال کر اس رقبہ کو مربع کی صورت میں منتقل کریں تو اس طرح ہرم اعظم کا صحیح قاعدہ نکل آئے گا۔ اور قاعدہ کے ہر ضلع میں اتنے ہی "ہرمی ہاتھ" ہوں گے جتنے سال بھر میں دن ہوتے ہیں۔

پھر اسی عدد کو کسی مربع کا ایک ضلع فرض کیجئے۔ اور اس مربع کا رقبہ نکالئے۔ بعد ازاں اس رقبہ کو دائرہ کی صورت میں منتقل کیجئے تو اس دائرہ کا جو نیم قطر ہوگا۔ اس کی لمبائی اتنے ہی "ہرمی ہاتھ" ہوگی جتنی ہرم کی اونچائی ہے۔ علاوہ ازیں اگر ایوان شاہی میں اس کی شمالی یا جنوبی دیوار کے پتھروں کا پورا دور لیا جائے۔ اور اسے ایوان کی لمبائی سے تقسیم کر دیا جائے تو "پائی π" یعنی ۳.۱۴ حاصل ہوگا۔ اور گرانڈ گیلری اور ایوان شاہی کے درمیان جو ایک اور عقبی کرہ ہے

اس کے بھی عرض و طول اور دیگر پیمائشوں میں اسی طرح "پانی" پلے کا استعمال پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس عقبی کمرہ کے فرش کی پوری لمبائی کو اگر پلے سے ضرب دیا جائے تو سال کے پورے دنوں کی تعداد نکل آتی ہے۔ اس عقبی کمرہ میں جو پتھر کا پردہ ہے اسکو اگر صاف کناروں تک ناپا جائے تو اس کی پیمائش ۱۰۰۰۰۰۰۰ یعنی پلے × ۱۰۰۰۰۰۰۰ نکلتی ہے۔ اسی طرح ملکہ کے ایوان میں جو طاق مشرقی دیوار میں ہے اگر اس کی اونچائی کو پلے × ۱۰ میں ضرب دیا جائے تو ہرم اعظم کے قاعدہ کا ایک ضلع نکل آتا ہے۔ اگر ملکہ کے ایوان کی آخری دیوار کی اونچائی کو دس میں ضرب دیا جائے اور پھر اس کا جذبہ نکالا جائے اور پھر اسے طاق کی اونچائی سے تقسیم کر دیا جائے تو پلے نکل آتا ہے۔ پھر اگر پہلے سلامی دار راستہ کی لمبائی لی جائے۔ اور اس میں پڑے چھتہ کی لمبائی جمع کر دی جائے۔ یا پورے سلامی دار راستہ کی لمبائی کو پلے سے تقسیم کیا جائے۔ تو داخلہ کے راستہ کی اس قدر لمبائی نکل آتی ہے جو دہانہ سے لگا کر پہلے چڑھنے والے راستہ تک ہے۔

ہرم اعظم کی تعمیر میں ایک اور بات دیکھنے کے قابل ہے یعنی اس میں سنگین چوکوں کی چھتیسویں منزل کی موٹائی اوپر یا نیچے والی منزلوں کی اونچائی سے دوگنی ہے۔ اور اسی چھتیسویں منزل کا قاعدہ عقبی کمرہ کی اونچائی سے دس گنا ہے۔ اس عمارت کے عمودی مرکز کا فاصلہ اس بلندی کے دونوں اطراف کے قریب ترین نقطہ تک اگر دس سے تقسیم کیا جائے تو ایک سال کے دنوں کی تعداد نکل آتی ہے۔ اور اگر اسی فاصلہ کو اس نقطہ کی عمودی بلندی سے تقسیم کیا جائے تو پلے یعنی دائرہ کے محیط اور قطر کی نسبت نکل آتی ہے۔

اسی طرح بڑے صندوق میں بھی وہی پلے موجود ہے۔ صندوق کی اونچائی اور اس کی لمبائی میں وہی نسبت ہے جو ایک اور پلے میں ہے۔ اگر صندوق کی گہرائی کو اس کی ایک لمبی طرف کے رقبہ سے ضرب دیا جائے تو پلے ہوتا ہے۔ یہی حال ہرم اعظم کے بعض بڑے بڑے اندرونی حصص ایوان شاہی اور صندوق کا ہے۔ ہر چیز کی صورت ایک ہی اصول پر قائم کی گئی ہے یعنی اگر دو بڑی طرفوں کی لمبائی جمع کر کے دیکھا جائے تو وہ مجموعہ تیسری طرف کی لمبائی کا پلے گنا ہوگا۔ مثلاً ہرم اعظم کی لمبائی اور چوڑائی اس کی اونچائی اور پلے کا حاصل ضرب ہے۔ ایوان شاہی کی لمبائی اور چوڑائی کا مجموعہ اس کی اونچائی اور پلے کا حاصل ضرب ہے۔ اور صندوق کی لمبائی اور چوڑائی کا مجموعہ اس کی اونچائی اور پلے کا حاصل ضرب ہے

ہرم اعظم کے حجم اور وزن کے متعلق بھی بہت سے حساب لگائے گئے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ہرم کے اندر ۹۵ لاکھ ہاتھ (مکعب) سالہ پایا جاتا ہے (ہر ہاتھ کی لمبائی ۲۵ انچ ہے) ہرم کی تعمیر میں مختلف قسم کا سالہ اور سامان صرف ہوا ہے جن کا نسبتی وزن مختلف ہے۔ بہر حال ان جملہ امور کو تہ نظر رکھتے ہوئے اندازاً حساب لگایا گیا ہے کہ ہرم اعظم کا کل وزن ۵۲۷۳۸۵۴ ٹن ہے (ایک ٹن ۲۸ من کے قریب ہوتا ہے)

ہرم کے اندر کا ٹیڑھ بچر کم و بیش یکساں قائم رہتا ہے۔ اور بیرونی ہوا کے ٹیڑھ بچر سے بہت زیادہ کم ہے۔ مگر باہر ہرم

کے اندر سخت گرمی ہوتی ہے۔ مسٹر ایل۔ ڈاؤ کو یٹلٹن نے ایک روشندان کی سڑنگ کو جو ایوان شاہی سے نکلی ہے۔ صاف کرایا تھا۔ اس سے ہرم کا ٹیپر بچر مستقل طور پر کئی درجہ کم ہو گیا ہے۔ اس کے متعلق مصر کے عربوں میں یہ روایت ہے کہ اگر دوسرا روشندان بھی اسی طرح صاف کر دیا جائے تو ہوا کی آمد و رفت سے رباب جیسا نغمہ پیدا ہونے لگے گا۔ اور اندرونی ٹیپر بچر اور بھی زیادہ سرد ہو جائے گا۔ لیکن تا وقتیکہ روشندان کی سڑنگ صاف نہ ہو اس قول کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہرم اعظم کیوں تعمیر کیا گیا تھا؟ کیا یہ عظیم الشان تعمیر محض ایک مقبرہ تھی؟ اگر یہی مقصد تھا تو پھر اس کے اندر یہ گرانڈ گیلری اور دیگر راستے اور ایوان کیوں بنائے گئے؟ کیا ان کا کوئی اور مقصد تھا؟ اگر تھا تو وہ کیا تھا؟ ان سوالات کے لوگوں نے مختلف جوابات دیے ہیں۔ جن کا مختصر خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

اہرام اعظم کی تعمیر کے بارہ میں جو مختلف نظریے پڑنے زمانہ میں قائم کئے گئے تھے۔ ان میں سے چند حسب

ذیل ہیں:

- (۱) اہرام مصر کی تعمیر کا مقصد یہ ہے کہ ریگستان کی طرف سے جو ریت اُڑ کر آئے اس کو روکا جائے۔ تاکہ قاہرہ اور رودیل کی دوسری بستیاں محفوظ رہیں
- (۲) ان کی تعمیر اس غرض سے ہوئی تھی کہ اس زمانہ کے علماء دین کی جو پڑا سراسر تعلیم تھی وہ محفوظ رہے۔ اور اگر دوسرا طوفان نوح آئے تو غرقاب نہ ہو
- (۳) اہرام کی تعمیر کا مقصد یہ تھا کہ ان کے اندر عمدہ فصلوں کے زمانہ میں غلہ بھر لیا جائے تاکہ خشک سالی میں کام آئے
- (۴) اہرام کی تعمیر کا مقصد محض یہ تھا کہ فراعنہ مصر کی شوکت و عظمت اور قدیم مصر کے علم و ہنر کی نمائش کی جائے
- (۵) تعمیر اہرام کی غرض و غایت یہ تھی کہ اونھیں مصری اوزان اور پیمانوں کا معیار بنایا جائے
- (۶) ان عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر بذریعہ الہام ہوئی تھی۔ اور ان کی تعمیر سے اہل مصر کی زبردست روحانی قوتوں کا اظہار مقصود تھا

بہر حال ایک مقصد تو اہرام کی تعمیر کا ضرور ظاہر ہے یعنی یہ کہ وہ شاہی مقبرے تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ایوان شاہی میں ایک تابوت موجود ہے گو اس کے اندر سے لاش اور اوس کے اوپر کا ڈھکنٹا غائب ہیں۔ ملک ٹو فرعون مصر کا مقصد یہ تھا کہ اس کی لاش ان پتھروں کے عظیم الشان حجرہ میں ہمیشہ تک محفوظ رہے۔ اسی لئے اس نے اپنی عظمت و جلالت کے مطابق یہ عظیم الشان مقبرہ تیار کرایا تھا۔ جس ہوشیاری اور سلیقہ کے ساتھ ہرم میں

داخل ہونے کے مختلف راستے معنی رکھے گئے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاش اور ان خزانوں کو جو اس کے ساتھ رکھے گئے پوری طرح محفوظ رکھنا مقصود تھا۔ حال ہی میں مقبرہ قوت انخ آسن فرعون مصر کے مقبرہ سے جس قدر ریش بہا خزانوں برآمد ہوئے ہیں۔ ان سے اس امر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ملک خوف فرعون مصر کی لاش کے ساتھ کس قدر خزانوں مقبرہ میں رکھے گئے ہوں گے۔ یہ خزانوں یقیناً ایوان شاہی اور عقبی کمرہ میں محفوظ کر کے ہرم میں داخل ہونے کی تمام راستے پوشیدہ اور سر بہرہ کئے گئے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ ملکہ کے ایوان میں بھی خزانوں ہوں۔ مگر افسوس ہے کہ وہ بیش بہا خزانوں قطعی ڈاکوؤں یا عرب چوروں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہے۔ الغرض یہ تو ثابت ہے کہ تعمیر ہرم کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ مقبرہ شاہی کا کام دے۔ لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اندر جو اٹھائیس فٹ اونچی عظیم الشان گیلری بنی ہوئی ہے اس کا مقصد کیا تھا؟

اس کے متعلق یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے کہ مقبرہ کے علاوہ ہرم اعظم کی تعمیر کا مقصد یہ بھی تھا کہ اسے ایک عظیم الشان صحنہ بنایا جائے۔ اور اس گرانڈ گیلری کا مقصد مشاہدہ فلکیات تھا۔ یہ گویا ہماری عظیم الجثہ دور بینوں کی طرح ٹھوس پتھروں سے بنائی ہوئی ایک دور بین تھی۔ جس میں شیشے (معدنہ) نہیں تھے۔ الغرض ایوان شاہی کی حد تک ہرم اعظم کی تعمیر اسی نظریہ پر ہوئی تھی۔ ایوان شاہی گرانڈ گیلری پر واقع ہے۔ اس کے بعد ملک خوف فرعون مصر کی وفات تک تعمیر کا کام بند کر دیا گیا۔ اور اس کے اوپر کی سطح ایک ہموار میز کی طرح رہ گئی۔ بعد ازاں جب فرعون خوف کا انتقال ہو گیا۔ تو ایوان شاہی میں اس کی لاش رکھ کر ہرم اعظم کے بالائی حصہ کی تعمیر کر دی گئی۔ اس خیال کے اثبات کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں

ہرم اعظم خط عرض البلد شمالی درجہ ۳۰ کے بہت قریب تعمیر کیا گیا ہے یا بالفاظ دیگر اس عرض البلد پر

نظریہ رصد گاہ کے اثبات میں شہادتیں

جہاں سے آسمان کا صحیح قطب خط افق سے نقطہ سمت الراس تک کل فاصلہ کے ایک تہ پر واقع ہے۔ یعنی جہاں ٹھیک فصل بہار یا فصل خزاں کے زمانہ میں آفتاب نصف النہار اس فاصلہ سے دو تہائی دوری پر ہوتا ہے جو خط افق اور نقطہ سمت الراس کے درمیان ہے۔ ایسے رصد خانہ میں جس کا ٹھیک محل وقوع یہ ہو بعض حسابات اور اقاہدہ سی اشکال جن کی مسائل فلکیات میں ضرورت پڑتی ہے بہت زیادہ آسان ہو جاتے ہیں۔ نہایت تحقیق و تدقیق کے بعد اس امر کی تصدیق کی جا چکی ہے کہ ہرم اعظم اس مقام سے جو صحیح طور پر منتخب کیا جاتا صرف چند گز ہٹ کر تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان زمانہ کے لوگوں کے آلات پیمائش اور طریقہ زیادہ صحیح نہ تھے۔ انھوں نے اپنی رہنمائی کے لئے صرف ایک خاص ستارہ منتخب کیا جو نکال یعنی قطب ستارہ۔ عمارت کا محل وقوع منتخب کرنے کے بعد اس کی وضع قطع کا مسئلہ پیدا ہوا اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہرم اعظم کے چاروں رخ صحیح شمال صحیح جنوب صحیح مشرق اور صحیح مغرب کی طرف واقع ہیں۔ اس قدر صحت حاصل کرنے کے لئے ٹھوس چٹان میں ایک لمبی اور اسلامی دار ٹرننگ کھود کر قاعدہ ہرم کا بنیادی خط قائم کیا گیا ہوگا۔ چنانچہ ایسی رنگ موجود ہے جو زمین دوز کمرہ کے اندر اترتی ہے۔ جب اس طرح پوری صحت کے ساتھ سمت شمال معلوم کر لی گئی تو عمارت کی

وضع قطع اور تعمیر کا کام شروع کیا گیا۔ اور یہ صحت صرف علم نجوم کے ذریعہ سے حاصل کی گئی ہوگی۔ بعد ازاں سنگین لیس نہایت صحت اور خوش اسلوبی کے ساتھ تعمیر ہونا شروع ہوئیں۔ گرانڈ گیلری کا نقشہ تیار ہو کر وہ تعمیر کی گئی۔ اول اول ہرم اعظم صرف اس قدر تعمیر کیا گیا تھا جہاں تک ایوان شاہی موجود ہے۔ اب آئندہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس گرانڈ گیلری کا کیا راستہ ہے۔

گرانڈ گیلری کا راستہ

اس کے متعلق مشہور ماہر فلکیات رچارڈ اے پراکٹر تحریر فرماتے ہیں :-
 ”یہ امر یقینی ہے کہ جن لوگوں کو دور بین کا کوئی علم حاصل نہ تھا۔ اور جو ہمارے زمانہ کے ماہرین فلکیات کی طرح صحت کے ساتھ سمجھنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے یہی طریقہ رکھا ہو گا جو ہرم اعظم کی عمارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی انہوں نے ٹھوس چٹانوں میں طویل راستے بنائے اور جہاں ضرورت ہوئی معمولی انحراف شعاع کے ذریعہ سے خط نظر بدل دیا۔ اس خیال کی اس وقت اور بھی زیادہ وضاحت ہوگی جب ہم گرانڈ گیلری کے معاملہ پر غور کریں گے۔ کیونکہ ایک ماہر فلکیات کے نزدیک اس تعمیر کا سب سے زیادہ ہیئت Astronomic ہے۔ آپ اس مسئلہ پر کسی قدر غور فرمائیں کہ ہیئت دان جو ایک ہی وقت میں ماہر تعمیرات بھی ہو وہ اس شگاف یا سٹریکٹ سلامی دار کو کیا شکل دیتا جس میں سے وہ اجرام سماوی کی شکل و حرکت دیکھ سکتا۔ ہیئت دان کی حیثیت سے تو وہ ایک بہت بلند گرننگ مقام پر بیٹھا پسند کرتا مگر بحیثیت ایک ماہر تعمیرات کے وہ جانتا کہ وہ مقام بالکل عمودی نہیں ہو سکتا۔ گرانڈ گیلری کے عمودی لکھن یا کٹاؤ کی صورت یہ ظاہر کرتی ہے کہ ہرم اعظم کے تعمیر کرنے والے میں ہیئت دانی اور فن تعمیر سے کمال کا ہی دونوں خوبیاں موجود تھیں۔ دیواروں کا ہر حصہ قطعی عمودی ہے، باہمہ دیواریں بہ ہیئت مجموعی سلامی دار میں اگر ہم شروع ہی سے اس ہرم اعظم کا ہیئت نقشہ نہ دیکھ پاتے اور ہم کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ اس قسم کے نقشہ کا تعلق علم ہیئت سے ہے، تو بھی ہم کو اس گرانڈ گیلری کی دوہری نوعیت سے صاف معلوم ہو جاتا کہ وہ مشاہدات فلکی کے لئے تعمیر کی گئی ہے۔ اور صرف ایک ہیئت دان کسی ماہر تعمیرات کے سامنے ایسا مسئلہ پیش کر سکتا تھا۔“

اگر یہ نظر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ گرانڈ گیلری مشاہدات فلکی کے لئے تعمیر کی گئی تھی تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس قدر سلامی دار گیلری میں جس کا فرش اس قدر چکنا اور جھکا ہوا ہے لوگ کس طرح بیٹھ کر مشاہدات فلکی کرتے ہوں گے؟ اس کا جواب وہ سنگین کنارے دے سکتے ہیں جو گیلری کے دونوں طرف بہت دور تک سلامی دار چلے گئے ہیں۔ یہ کنارے سلامی دار فرش سے مناسب بلندی پر واقع ہیں۔ اور اگر ان پر مضبوط چوبی تختے رکھ دیے جائیں تو ان تختوں پر بہت سے آدمی ایک دوسرے کے پیچھے بیٹھ کر مشاہدات فلکی کر سکتے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کی غلطیاں بھی معلوم کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح ایک ہی وقت میں آدمی فلکیات کے متعلق آلات سے مسلح ہو کر مشاہدات فلکی کر سکتے ہیں۔

الفرض اس عظیم الشان رصد گاہ میں اجرام سماوی کی نقل و حرکت دیکھی جاسکتی تھی۔ اور علم ہیئت کے متعلق صحیح نتائج اخذ کئے جاسکتے تھے۔ رصد گاہ کا نظریہ ہم اس لئے صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ بہرم اعظم کے تمام خفیہ راستوں اور گرانڈ گیلری کی جملہ تفصیلات کی تطبیق اسی نظریہ سے ہوتی ہے اور اگر یہ نظریہ تسلیم نہ کیا جائے تو بہت سی باتوں کی صحیح توجیہ و تاویل نہیں کی جاسکتی۔ لہذا بہرم اعظم کی تعمیر کا اول حصہ تو رصد خانہ تھا۔ مگر بعد کو جب ملک خوفو کا انتقال ہو گیا تو اسی میں اس کا مقبرہ بھی بنا دیا گیا۔

علم احکام النجوم کا اثر اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک خوفو فرعون مصر کو مشاہدات فلکی سے ایسی کیا دلچسپی تھی جو یہ رصد خانہ تعمیر کیا گیا؟ اس کا ایک معقول جواب یہ ہے کہ اس زمانہ میں بھی آج کل کی طرح علم احکام النجوم یا جوتش پر زبردست عقیدہ رکھتے تھے۔ اس زمانہ کے جوتشیوں کا ہونے تھا کہ وہ نہ صرف اجرام سماوی کی نقل و حرکت کا مطلب سمجھتے ہیں بلکہ جو کچھ اثر ستاروں کی گردش کا حیات انسانی پر پڑتا ہے اس سے بھی واقف ہیں۔ ان لوگوں کا یہ دعویٰ نہیں تھا کہ وہ واقعی اجرام سماوی پر حکومت رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ یہ کہتے تھے کہ ستاروں کی چال دیکھ کر وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ اس کا حیات انسانی پر کیا نیک و بد اثر پڑے گا۔ اور بد اثر سے کیوں نکرناج سکتے ہیں۔ ان کا یہ محض دعویٰ ہی نہیں تھا بلکہ زمانہ احوال کے لاکھوں کرڈوں آدمیوں کی طرح وہ اس عقیدہ پر ایمان بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ ملک خوفو فرعون مصر کا اعتقاد تھا کہ وہ اس رصد خانہ کے ذریعہ سے اجرام سماوی کی نقل و حرکت دیکھ کر مستقبل کے حالات معلوم کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی جان سکتا ہے کہ دشمنوں پر کیونکر فتح حاصل ہو۔ اس لئے اس نے یہ عظیم الشان رصد خانہ تعمیر کرایا تاکہ اس کی سلطنت کے معاملات احکام سماوی کے مطابق انجام پذیر ہوں

دیگر اہرام اس وقت مصر میں کم از کم چھتیس ہرم اور بھی موجود ہیں۔ لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس کے اندر بہرم اعظم کی طرح راستے، خفیہ ایوان اور گیلریاں وغیرہ ہوں اور نہ ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی دلچسپی یا قدیم روایت متعلق ہے۔ انھیں معمولی مگر عظیم الشان مقبرہ سمجھنا چاہئے۔ ان کے متعلق کوئی ثبوت ایسا نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ ان کی تعمیر کا مقصد مقبرہ کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔

فراست التحریر مکمل

یعنی اردو اور انگریزی رسم خط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت، چال چلن، مستقبل اور تمام حالات معلوم کر نیکافن اردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت علاوہ محصول ۸ روپے

فیجر نگار

سیر و کلیو پیٹرا

(ڈرامہ برنارڈشا)

(مسل)

کلیو پیٹرا:۔ کیا تم میں سے کوئی میرا دل بہلا سکتا ہے؟ کیا تم کو کوئی خبر یا کمائی یاد ہے؟

ایرا اس:۔ فنانا۔

کلیو پیٹرا:۔ اونچو۔ فنانا، فنانا، ہمیشہ فنانا ہی کا ذکر رہتا ہے، کوئی نئی کمائی سناؤ۔

ایرا اس:۔ نہیں اس مرتبہ فنانا بڑی خوش قسمت نکلی۔

(سب عورتیں ہنس پڑتی ہیں غلام چپ رہتے ہیں)

کلیو پیٹرا:۔ (غصہ ہو کر) مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ اس بربط نواز لڑکی کو کتنے سونے کے سکے دینے پڑیں گے؟

ایرا اس:۔ یہ ہم آسانی سے معلوم کر کے آپ کو بتا سکتے ہیں۔ (سب عورتیں ہنس پڑتی ہیں)

کلیو پیٹرا:۔ (غضبناک انداز سے) تم ہنس رہی ہو۔ لیکن میں کسی وقت بتا دوں گی کہ اسی طرح میری اطاعت

کی جانی چاہئے؟ جیسے سیر کی کی جاتی ہے

چار میاں:۔ لمبی ناک والی (سب ہنس پڑتی ہیں)

کلیو پیٹرا:۔ (غصہ سے) خاموش۔ اے چار میاں! ہو تو پھوٹی لڑکی نہ بن۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ میں تم سب

موسیقار:۔ اونچو۔ وہ تو صرف ایک کنیز ہے، وہ تو ایک کتے کی طرح سیکھتی ہے۔

کلیو پیٹرا:۔ اچھا تو میں بھی ایک کتے کی طرح سیکھوں گی

کیونکہ وہ تم سے اچھا بجاتی ہے تم روزانہ ایک عشرہ تک مجھے سبق دیا کرو۔ (موسیقار جلدی سے کھڑا ہو کر

آداب شاہانہ بجاتا ہے) اس کے بعد اگر میں کوئی غلطی کر جاؤں تو تم کو ڈرے لگائے جائیں گے

اور اگر میں اس کثرت سے غلطیاں کروں کہ تازیا

لگانے کا موقع نہ رہے تو تم کو دریائے نیل میں ڈال دیا جائے گا۔ تاکہ گھڑیاں نکل لیں۔ اس لڑکی کو ایک

اشرفی دے کر ان سب کو رخصت کرو،

موسیقار:۔ (بہت گھبرا کر) لیکن ایک سچے ماہر فن پر اس قدر دباؤ نہ ڈالنا چاہئے۔

فنانا:۔ (دھکا دیتے ہوئے) یہ کیا ہے ملکہ کو جواب دیتا ہوں نکل باہر۔ کجنت۔

(فنانا سے دھکے مار کر باہر کر دیتی ہے لڑکی اس کے پیچھے اپنا

ساز لے ہوئے جاتی ہے اور غلاموں اور عورتوں کا ایک قافلہ ان کے پیچھے بلند ہوتا ہے)

اگر میں تم کو اجازت دوں تو تم دن بھر اپنے باپ کے دیوتاؤں کو شہادت دینے کے لئے پکارتی رہو گی تاکہ وہ آکر تمہاری خوبیوں پر دغظا کہیں، جاؤ رشوت لو۔ اور پوٹھینس کو حاضر کرو (فتانا جواب دینا چاہتی ہے، جواب نہ دو جاؤ۔)

(فتانا۔ باہر چلی جاتی ہے کلیو پیٹرا اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اور کسی سوچ میں دروازہ سے کرسی تک ٹٹلنے لگتی ہے۔ سب کھٹے ہو جاتے ہیں)

ایرا اس :- (انگھے ہوئے) ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ سیزر روم واپس چلا جائے۔

کلیو پیٹرا :- (دہمکار) جب وہ جائے گا تو وہ دن تمہارے لئے قیامت کے برابر ہوگا۔ تم کیوں یہ چاہتی ہو کہ وہ یہاں سے چلا جائے؟

چار میاں :- کیونکہ وہ تم کو خوفناک حد تک عقلمند، سنجیدہ، عالم اور فلسفی بنائے دے رہا ہے اور اس عمر میں یہ ہمارے لئے بہت خطرناک ہے۔

(سب عورتیں ہنس پڑتی ہیں)

کلیو پیٹرا :- بس اب زبان بند کرو۔

چار میاں :- (طنز بہ اعتراف سے) خوب۔ خوب۔ خوب ہوگو سیزر کے ساتھ رہنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

(سب ہنستی ہیں کلیو پیٹرا زیادہ براہم ہو جاتی ہے۔ فنانا پوٹھینس کو لے کر واپس آتی ہے)

فتانا :- (دروازہ پر سے) پوٹھینس التجا کرتا ہے کہ۔

کلیو پیٹرا :- وہیں۔ وہیں۔ بس کافی ہے۔ اس کو اندر آئے دو (وہ اپنی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور پوٹھینس

کو کیوں اس قدر گستاخانہ گپ شپ کرنے دیتی ہوں حالانکہ مجھے تمہارے ساتھ فنانا کا سلوک کرنا چاہئے چار میاں :- کیونکہ آپ ہر بات میں سیزر کی نقل کرنا چاہتی ہیں۔ اور وہ ہر شخص کو اجازت دیتا ہے۔ کہ جو چاہے کرے۔

کلیو پیٹرا! نہیں ایک دن اس سے میں نے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے تو اس نے کہا "اپنی عورتوں کو باتیں کرنے دو۔ ان کی گفتگو سے تم کو کوئی خاص بات معلوم ہو جائے گی۔ مجھے ان سے کیا معلوم ہوگا۔؟ میں نے پوچھا "ان کی حقیقت" اس نے جواب دیا۔ اور ہاں جیسے ہی کہ اس نے یہ کہا تم نے اس کی آنکھیں دیکھی ہوں گی او کم ظرفو۔ (سب ہنسنے لگتی ہیں۔ وہ غصہ سے ایرا سے مخاطب ہوتی ہے) تم کس پر ہنس رہی ہو؟ جھپھریا سیزر پر؟

ایرا اس :- سیزر پر!

کلیو پیٹرا :- اگر تم بیوقوف نہ ہوتیں تو مجھ پر ہنستیں۔ اور اگر تم ہزدل نہ ہوتیں تو مجھ سے یہ کہتے ہوئے نہ ڈرتیں (فتانا واپس آتی ہے) فنانا یہ سب مجھ سے کہتی ہیں کہ تم نے پوٹھینس کو میرے حضور میں پیش کرنے کے لئے رشوت لی ہے۔

فتانا :- (قسم کھا کر) میں اپنے باپ کے دیوتاؤں کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔

کلیو پیٹرا :- (قطع کلام کرتے ہوئے) کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ کسی جھوٹ بات کو چھپایا نہ کرو۔

کلیو پیٹرا :- وہ سچ کہتی ہے۔ پوتھینس اس کے بعد جب تم ساحل سے آلو گے تو تمہارے دماغ سے بہت سے خیالات پریشاں رفع ہو جائیں گے۔

(عورتیں ہنستی ہیں کلیو پیٹرا کھڑی ہوتی ہے) جاؤ تم سب یہاں سے چلی جاؤ۔ میں پوتھینس سے خلوت میں گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ ان سب کو باہر نکال دو۔

فتاتا :- (وہ سب ہنستی ہوئی بھاگتی ہیں فتاتا ان کے جائیکے بعد دروازہ بند کر دیتی ہے) تم سب کس بات کی منتظر ہو؟

فتاتا :- یہ مناسب نہیں ہے کہ ملکہ اکیلی —

کلیو پیٹرا :- (قطع کلام کرتے ہوئے) معلوم ہوتا ہے۔ کہ فتاتا اب مجھے تمہاری قربانی تمہارے باپ کے دیوتاؤں پر کرنا پڑے گی تاکہ وہ تم کو بتائیں کہ میں مضر کی ملکہ ہوں۔

(وہ دروازہ بھیرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔)

کلیو پیٹرا :- (پھر بیٹھے ہوئے) ہاں پوتھینس یہ بتاؤ کہ تم نے میرے پاس آنے کے لئے فتاتا کو رشوت کیوں دی؟

پوتھینس :- (سنجیدگی سے اس کا مطالعہ کرتے ہوئے)۔

کلیو پیٹرا :- سچ ہے کہ تم بہت بدل گئی ہو۔

کلیو پیٹرا :- کیا تم روزانہ چھ مہینہ تک سیز سے گفتگو کر چکے ہو؟ اگر کرد تو تم بھی تبدیل ہو جاؤ گے۔

پوتھینس :- یہ ایک عام بات ہے جو تم اس بے وقوف بڑھے سے کہہ رہی ہو۔

کلیو پیٹرا :- یہ وقوف بنا ہوا یہ وقوف اکاش میں بھی

سوا سب بیٹھ جاتی ہیں۔ پوتھینس کمرہ کے بیچ میں آتا ہے فتاتا :- (اپنی پہلی جگہ پر کھڑی ہو جاتی ہے) پوتھینس تمہارے باغی دوستوں کے تازہ واقعات کیا ہیں بیان کرو۔

پوتھینس :- (تکنت سے) میں باغیوں کا دوست نہیں ہوں۔ اور ایک قیدی کو تازہ خبریں نہیں سنائی دیتیں۔

کلیو پیٹرا :- تم مجھ سے زیادہ قیدی نہیں ہو۔ اور نہ سیزر سے زیادہ۔ گذشتہ چھ مہینے تک ہم لوگ رعایا کیوجہ سے محل میں محصور رہے۔ اب تم بالکل آزادانہ ساحل پر فوجوں کے ساتھ جا سکتے ہو۔

پوتھینس :- تم ابھی ایک بچہ ہو کلیو پیٹرا اور واقعات کو نہیں سمجھ سکتیں۔

(عورتیں ہنستی ہیں کلیو پیٹرا اسے غور سے دیکھتی ہے)

چار میاں :- پوتھینس مجھے معلوم ہوا کہ تم کو تازہ خبریں نہیں معلوم؟

پوتھینس :- ہاں تم بتاؤ کیا ہے؟

چار میاں :- یہ کہ کلیو پیٹرا اب بالکل بچ نہیں ہے کیا میں تم کو بتاؤں کہ بہت زیادہ مہم کس طرح بن سکتے ہیں؟ اور بہت زیادہ عقلمند صرف ایک ہی دن میں کیوں ہو سکتے ہیں۔

پوتھینس :- میں عقلمند بننے کو ترجیح دوں گا۔

چار میاں :- اچھا تو روشن مینار کی چوٹی پر جاؤ۔ اور اپنے ساتھ کسی آدمی کو بھی لیتے جاؤ کہ وہ تمہارے سر کے بال پکڑ کر تم کو سمندر میں پھینک دے۔

(عورتیں قہقہہ مارتی ہیں)

ایسی ہی ہوتی۔

پوتھینس :- تم چاہتی ہو کہ تم بے وقوف بنائی جائیں
یہ کیوں؟

کلیو پیٹرا :- جب میں بیوقوف تھی تو میرا جو دل چاہتا
تھا کرتی تھی۔ سوائے اس وقت کے جب فنا تاجھے
بیٹھی تھی۔ اب جبکہ سیزر نے مجھے عقلمند بنا دیا ہے تو
میری پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے کسی کام کا تعلق
ہی نہیں رہا کیونکہ اب میں وہی کرتی ہوں جو مجھے کرنا
چاہئے۔ یہ عظمت ضرور ہے مگر سترت نہیں۔ اگر سیزر
چلا جائے تو مجھے توقع ہے کہ میں مصریوں پر حکومت کر سکو
گی۔ کیونکہ جو اہمیت سیزر کی میری نظروں میں ہے
وہی میرے ارد گرد جمع رہنے والے بیوقوفوں میں
میری ہے۔

پوتھینس :- (غور سے دیکھ کر) کلیو پیٹرا ممکن ہے کہ یہ جوانی
کا غرور ہو۔

کلیو پیٹرا :- نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے،

پوتھینس :- (ہاں میں ہاں ملا کر) ممکن ہے ایسا ہی ہو۔
کلیو پیٹرا :- اچھا تو کہ تم مجھ سے کیا کہنے آئے تھے؟

پوتھینس :- (پریشان ہو کر) میں! کچھ نہیں۔
کلیو پیٹرا :- کچھ نہیں!

پوتھینس :- بس صرف اپنی — آزادی کے لئے التجا
کرتے۔ اور کچھ نہیں۔

کلیو پیٹرا :- اس کے لئے تم کو سیزر کے حضور میں ہر تسلیم
ختم کرنا تھا۔ نہیں پوتھینس تم کسی اور تدبیر
سے آئے ہو۔ جس کا انحصار کلیو پیٹرا پر ہے۔ اب

کلیو پیٹرا ملکہ ہے اس لئے تمہاری تدبیر اب جا رگر
نہ ہوگی۔

پوتھینس :- (تعظیماً سر جھکا کر) ایسا ہی ہے۔

کلیو پیٹرا :- (دسرور ہو کر) بیشک

پوتھینس :- (غور سے آنکھیں کلیو پیٹرا پر جھکا کر) تو کیا درحقیقت

کلیو پیٹرا ملکہ ہے۔ اور سیزر کی قیدی اور غلام نہیں؟

کلیو پیٹرا :- پوتھینس ہم سب سیزر کے غلام ہیں —

ہم سب جو مصر میں ہیں — خواہ ہم اس کو

پسند کریں یا نہ کریں۔ اور وہ جو اس کو سمجھنے کی

کافی اہلیت رکھتی ہے سیزر کے جانے کے بعد یہاں

حکومت کرے گی۔

پوتھینس :- تم سیزر کے جانے پر خوش ہوتی ہو۔

کلیو پیٹرا :- ہاں اگر میں خوش ہوتی بھی ہوں تو کیا؟

پوتھینس :- کیا وہ تم سے محبت نہیں کرتا؟

کلیو پیٹرا :- مجھ سے محبت کرتا ہے! پوتھینس! سیزر

کسی سے محبت نہیں کرتا۔ وہ کون ہیں جن کو ہم

چاہتے ہیں۔؟ وہی جن سے ہم کو نفرت نہیں ہوتی

اس کی فطرت میں نفرت نہیں ہے۔ وہ ہر ایک

سے کتے اور بچوں کی طرح گھل جاتا ہے اس کی

مہربانی دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا ہے۔ ماں باپ، آنا،

دایاں کبھی میری اتنی خبر گیری نہیں کی۔ جتنی وہ

کرتا ہے۔ یا کسی نے اپنے خیالات اس آزادی سے

بیان کئے ہوں۔

پوتھینس :- اچھا تو کیا یہ محبت نہیں؟

کلیو پیٹرا :- کیا جب وہ روم جانے لگے گا اور کسی لڑکی

پوٹھینس :- یہ آدمی میری سمجھ میں نہیں آتا۔

کلیو پیٹیرا :- (نفرت سے) تم سیزر کو سمجھنا چاہتے ہو؟ تم کس طرح سمجھ سکتے ہو (تمکنت سے) میں سمجھتی ہوں۔

پوٹھینس :- (ایک منٹ سوچنے کے بعد) حضور نے آج مجھے باریابی کا شرف بخشا اب میرے لئے کیا حکم ہو؟ کلیو پیٹیرا :- تم خیال کرتے ہو کہ میرے بھائی کو بادشاہ بنا کر مصر میں حکومت کرو گے، کیونکہ تم اس کے سرپرست ہو۔ اور وہ ایک نادان بچہ ہے۔

پوٹھینس :- ملکہ کو اختیار ہے جو چاہیں فرمائیں۔

کلیو پیٹیرا :- ہاں تو ملکہ کو یہ بھی کہنے کا اختیار ہے کہ سیزر

تم کو اور اچلیس کو نکل جائے گا۔ اور میرے بھائی

کو بھی، جیسے ایک بی جو ہوں کو نکل جاتی ہے۔ اور

وہ مصر کو اس طرح اپنے قابو میں کرے گا۔ جیسے ایک

گڈریا اپنی کملی کو بغل میں ڈالیتا ہے۔ اور جب وہ

سب کچھ کر چکے گا تو ردم واپس جائے گا۔ اور

کلیو پیٹیرا کو اپنا وزیر بنا کر ہمیں چھوڑ دے گا۔

پوٹھینس :- (غصت سے جلا کر) یہ وہ تمام عمر نہ کرے گا اس

کے دس کے مقابلے میں ہمارے پاس ہزار موجود

ہیں۔ اور ہم اس کو اور اس کی بھکاری فوج کو مار کر

سمندر پار اتار دیں گے۔

کلیو پیٹیرا :- (انداز نفرت سے جانے کے لئے کھڑی ہوتی ہی)

تم نے بالکل ایک کمینہ کی سی باتیں کی ہیں۔ جاؤ

اور اپنے ہزاروں کو لڑنے پر آمادہ کرو۔ بہت جلد

کیونکہ ہر گام اس سیزر کی اعانت کے لئے قریب

سے طاقت کرے گا۔ اور اس سے بھی ایسا ہی

سلوک کرے گا تو یہ محبت ہوگی؟ اس کے غلام

برہی ٹینس سے پوچھو۔ وہ اس کو بہت عزیز ہے

نہیں خود اس کے گھوڑے سے دریافت کرو۔ اس

کی یہ عنایت مجھ پر میری کسی خصوصیت کی بنا پر نہیں

ہے۔ بلکہ اس کی فطرت ہے۔

پوٹھینس :- لیکن یہ تم کیونکر یقین سے کہہ سکتی ہو کہ وہ

تم سے ایسی محبت نہیں کرتا جیسے اور مرد اور عورتوں

سے کرتے ہیں؟

کلیو پیٹیرا :- کیونکہ میں اُسے حاسد نہیں بنا سکتی میں

نے بار بار آزما یا ہے۔

پوٹھینس :- تو شاید اب مجھ کو یہ سوال کرنا چاہیے۔ کہ

کیا تم کو اس سے محبت ہے؟

کلیو پیٹیرا :- کیا کوئی ایک دیوتا سے محبت کر سکتا ہے؟

اس کے علاوہ مجھے ایک اور آدمی سے محبت ہے

وہ جس کو میں نے تیز زور سے بہت

پہلے دیکھا تھا۔۔۔۔۔ دیوتا نہیں بلکہ ایک

آدمی۔۔۔۔۔ وہ جو محبت بھی کر سکتا ہے اور

نفرت بھی۔ وہ جس کو میں ضرر پہنچا سکتی ہوں اور

جو مجھے بھی صدمہ پہنچا سکتا ہے۔

پوٹھینس :- کیا سیزر کو یہ بات معلوم ہے؟

کلیو پیٹیرا :- ہاں۔

پوٹھینس :- اور یہ سن کر اُسے غصہ نہیں آیا؟

کلیو پیٹیرا :- اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اُسے میری

دل بستگی کے لئے بھیجے گا۔

آپہنچا ہے۔ سیزر نے تم کو خلیج کے کنارے دو فوجی دستوں سے روک رکھا ہے اب ہم کو دیکھنا ہے کہ وہ بیس فوجی دستوں سے کیا کرتا ہے

پوٹھینس :- کلیو پیٹر ا۔

کلیو پیٹر ا :- بس۔ بس۔ سیزر نے تمہاری طرح کمزور اور مہمل باتیں کر کے مجھے برباد کر دیا ہے (وہ جلی جاتی ہے۔ پوٹھینس غصہ کا ساہرہ بنا لے ہوئے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ مگر فنانا داخل ہو کر روک لیتی ہے)

پوٹھینس :- مجھے اس ذلیل مقام سے نکل جانے دو۔

فنانا :- تم غصہ کیوں ہوتے ہو ؟

پوٹھینس :- خدا کرے مصر کے تمام دیوتاؤں کا قہر اس پر نازل ہو۔ اس نے اپنا ملک رومی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

فنانا :- بے وقوف کیا اس نے تم سے یہ نہیں کہا کہ سیزر یہاں سے چلا جائے تو اچھا ہے ؟

پوٹھینس :- کیا تم نے سنا ہے ؟

فنانا :- مجھے پہلے ہی سے فکر تھی کہ جب تم اس کے ساتھ تنہا ہو تو کسی ایماندار عورت کا بھی قریب رہنا ضروری ہے۔

پوٹھینس :- خدا کی قسم —

فنانا :- بس کرو، اپنے خداؤں کو۔ یہاں سیزر کے خدا سب سے زیادہ طاقتور ہیں۔ کلیو پیٹر ا کے پاس آنے سے تم کو کوئی فائدہ نہیں۔ تم صرف ایک مصری ہو وہ اپنے نسل والوں میں سے کسی کی بھی نہ سنے گی وہ ہم سب بچوں کا سا برتاؤ کرتی ہے۔

پوٹھینس :- خدا کرے وہ غارت ہو جائے
فنانا :- (بد عادی بنے) خدا کرے تمہاری زبان اس خواہش کی دعا کرنے میں سڑ جائے۔ جاؤ اور لوٹیں
پیٹھی کے قاتل کو بلو او۔ وہ ایک رومی ہے ممکن ہے کہ کلیو پیٹر اس کی سُن لے۔ جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔

پوٹھینس :- مجھے معلوم ہے کہ اب کس کے پاس جانا چاہئے۔

فنانا :- (شہ کرتے ہوئے) کس کے پاس ؟

پوٹھینس :- لوسیئس سے بڑے آدمی کے پاس مگر وہ بات یاد کرو۔ جب تم نے سیزر کے آنے سے قبل سوچا تھا کہ مصر پر تمہاری حکمرانی ہو۔ اوز میں اس کی مخالفت پر آمادہ ہوا تھا۔

فنانا :- (قطع کلام کر کے) تاکہ تم خود اس پر حکومت کرو۔
پوٹھینس :- خیر ہم ہوں یا تم۔ دونوں ایک ایسی عورت سے ہر لحاظ سے بہتر ہیں جس کا دل رومی ہو۔ جب تک میں زندہ ہوں وہ حکومت نہیں کر سکتی۔ اس لئے تم اپنی رہنمائی آپ کرو۔

(وہ چلا جاتا ہے)

کھانے کا وقت قریب آتا جاتا ہے محل کی چھت پر میز بچھی ہوئی ہے۔ روفیو او پر چڑھ رہا ہے اس کے ساتھ ساتھ ایک غلام تپائی لئے ہوئے آ رہا ہے۔ متعدد سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ چھت پر پہنچ جاتے ہیں، ہلکے ہلکے پردے شمالی اور مشرقی تونوں پر دھوپ روکنے کے لئے پڑے ہوئے ہیں۔

مضطرب ہے۔

روفیو:۔ ہاں تو کیا۔ یہ میرے خوش کرنے کے لئے ہے؟
سیریز:۔ (پیدا سے) نہیں میرے بچے روفیو۔ بلکہ خود
کو خوش کرنے کے لئے۔ اپنی سالگرہ منانے کی
خاطر،

روفیو:۔ (دفرت سے) تمہاری سالگرہ۔ تمہاری
سالگرہ تو ہمیشہ اس وقت ہوتی ہے جب کوئی
حصین لڑکی مل جاتی ہے۔ یا کسی ایچی سے دوستی
پیدا کرنا مقصود ہو۔ گذشتہ مہینے میں تقریباً سات
سالگرہ ہوئیں۔

سیریز:۔ (اعتراف کرنے ہوئے) یہ سچ ہے روفیو اب
میں خود کو کبھی ان فریبوں میں گرفتار نہ کروں گا۔
روفیو:۔ ہمارے ساتھ کلیو پیرا کے سوا اور کون
کھانا کھائے گا؟

سیریز:۔ سسلی کا اپا لوڈورس۔

روفیو:۔ وہ ظریف۔ مسخرا۔ پاپن ہے۔

سیریز:۔ پاپن ہے ایک دلچسپ کتاب ہے۔ کہانی
کتاب ہے۔ گانا گاتا ہے اور ملکہ کی خوشامد کرنے سے

ہم کو بچاتا ہے اُسے بڑھے سیاست دانوں اور ہم
جیسے جنگلی رکھوں کی کیا پروا ہے۔ نہیں اپا لوڈورس
ایک اچھا رفیق ہے۔

روفیو:۔ ہاں۔ لیکن اگر اُسے یہ معلوم ہو جائے کہ زبان
کس طرح بند رکھنی چاہئے تو شاید وہ بدترین ثابت
ہو۔

سیریز:۔ خدا کی قسم اُسے کبھی اس کا علم نہ ہو۔ اُف،

افسر۔ روفیو کو ان میں سے ایک سادہ دار مقام پر
لے جاتا ہے۔ پر دوں کو الگ الگ کھینچنے کے لئے
ایک رستی ستونوں کے درمیان لٹکی ہوئی ہے۔
افسر:۔ (بھٹک کر) رومی سردار کو یہاں سیریز کا انتظار
کرنا چاہئے۔

(غلام بالکل جنوبی ستونوں کے قریب تپائی رکھ دیتا ہے۔ اور
پردہ کے اندر غائب ہو جاتا ہے)

روفیو:۔ (بیٹھے ہوئے) افوہ یہ بڑی جڑھالی تھی۔ ہم کس
قدر بلندی پر پہنچ گئے ہیں۔

افسر:۔ ہم محل کی چھت پر ہیں۔

روفیو:۔ خوب۔ اب ہم کو اور سیرٹھیاں چڑھنا
نہیں ہیں۔

(مخالفت سمت سے ایک اور افسر داخل ہوتا ہے)

دوسرا افسر:۔ سیریز آ رہا ہے۔

سیریز غسل کے بعد ایک ارغوانی رنگ کے ریشمی لباس
میں داخل ہوتا ہے اس کے پیچھے دو غلام ہیں جو ایک گئے
دار کرسی لارے ہیں۔ وہ اسے بالکل شمال میں دو ستونوں
کے بیچ میں رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پردوں میں
ردپوش ہو جاتے ہیں۔ اور دونوں سردار سر جھکا کر چلے جاتے
ہیں۔ (روفیو سیریز کے اتھن بال کو کھڑا ہو جاتا ہے۔)

سیریز:۔ (اس کے قریب آ کر) کیوں روفیو؟

(اس کے لباس کو استعجاب سے دیکھ کر) ایک نیا لباس
تلوار کے لئے ایک نئی سنہری میان۔ اور تم نے
اپنے بال بھی ترشوا سے ہیں، لیکن دارٹھی نہیں
دوہ روفیو کی دارٹھی سونگھتا ہے ہاں اولپس کی قسم۔

یہ فوجی زندگی۔ یہ بوجھل بے رحم علی زندگی، ہم
رومیوں کی بڑی شامت ہی ہے۔ ہم صرف کام
کرنے والے مزدور ہیں۔۔۔۔۔ ایک کھیوں
کا گروہ جن کو آدمی بنا دیا گیا ہے کاش مجھے ایک اچھی
باتیں کرنے والا مل جائے۔۔۔۔۔ ایسا جسکی
باتوں میں خوش مذاقی اور تخیل آرائی اتنی ہو کہ بغیر
کچھ اور کئے ہوئے زندہ رہ سکوں۔

روفیو:- ہاں کھانا ختم ہونے کے بعد اُسے تم سے گفتگو
کرنے کا بہت اچھا موقع ملے گا۔ کیا تم نے اس بات
پر غور کیا کہ میں وقت سے پہلے آیا ہوں؟
سیر:- اہا ہا۔ میں نے سوچا کہ اس کا ضرور کوئی مطلب
ہے؟ کیا ہے بلو؟

روفیو:- کیا یہاں ہماری باتیں کوئی اور سن سکتا ہے؟
سیر:- اس نخلہ کے لئے پردہ ڈالنے کی ضرورت ہو
میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں

(وہ تالی بجانا ہے۔ پردے ڈال دے جاتے ہیں۔ چھت کے
بیچ میں ایک میز نظر آتی ہے جو چار آدمیوں کے لئے ہے سیر
اور روفیو کے قریب شراب کے بوریں جام اور مراجاں
رکھی ہیں۔ ایک بار عب سردار متعدد غلاموں کے ساتھ

انتظام میں مصروف ہے۔ یہاں سے مغرب کی جانب جو داران
ساجلا گیا ہے اس کے آخر میں کھڑکی سی ہے۔ جس سے آسما
نظر آتا ہے اس کے بیچ میں آکا جسم ہے) اب ہر شخص ہکو
دیکھ سکتا ہے کوئی ہماری باتیں سننے کا ارادہ نہ کریگا
دوہ غلاموں کے قریب گدے دار کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

روفیو:- (بتانی پر بیٹھے ہوئے) بوٹھینس تم سے گفتگو کرنا چاہتا

ہے۔ میں تم کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اس سے ملو۔ یہاں
عورتوں میں سازشیں ہو رہی ہیں؟

سیر:- بوٹھینس کون ہے؟
روفیو:- جس کا سر گلہری کی کھال کی طرح ہے۔ چھوٹے پائوں
کا سر پرست جس کو تم نے قید کر رکھا تھا۔
سیر:- (گھبرا کر) اور کیا وہ فرار نہیں ہو گیا؟
روفیو:- نہیں۔

سیر:- (اٹھتے ہوئے) کیوں، تم دشمن کی نگرانی کرنے کے
بجائے اس شخص کی حفاظت کرتے رہے۔ کیا میں نے
تم سے ہمیشہ نہیں کہا کہ قیدیوں کو بھاگ جانے دو۔
جب تک اس کے خلاف تم کو کوئی حکم نہ دیا جائے۔
کیا اور بہت سے کھانے والے نہیں ہیں؟

روفیو:- ہاں۔ اور اگر تم میں ذرا ابھی سمجھ ہے۔ اور مجھے اس
کی گردن الگ کرنے کی اجازت دو تو تم اس کا
حصہ بچا سکو گے۔ بہر کیف وہ پنج کر نہیں جاسکتا۔
تین سنتریوں نے اس سے کہا کہ اگر وہ پھر دکھائی دیا
تو اس کی خیر نہیں۔ اس کے سوا وہ اور کیا کر سکتے ہیں
مگر وہ یہاں ٹھہر کر پوشیدہ طور پر ہمارے حرکات و نقل
دیکھنا چاہتا ہے۔

سیر:- (بیٹھے ہوئے) تو وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔
روفیو:- ہاں میں اس کو اپنے ساتھ لایا ہوں۔ وہ پردہ میں
بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔

سیر:- اور تم چاہتے ہو کہ میں اس سے ملاقات کروں۔
روفیو:- مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں دعوے
سے کہتا ہوں کہ جو تمہارے دل میں آئے گا وہی

کرو گے۔ مجھے شامل نہ کرو۔

سیزر:- اچھا۔ اچھا اُسے آئے دو۔

روفیو:- (پکار کر) او محافظ۔ اپنے آدمی کو چھوڑ دے

اور یہاں آئے دے (اشارہ سے) یہاں آؤ۔

(پوٹھینس آکر دونوں کے بیچ میں کھڑا ہوتا ہے۔ اور کبھی

ایک کو اور کبھی دوسرے کو دیکھنے لگتا ہے۔)

سیزر:- (منانت سے) پوٹھینس میں تم کو خوش آمدید کہتا

ہوں کیونکہ کیا خبر لائے؟

پوٹھینس:- سیزر! میں تم کو ایک خطرہ سے آگاہ کرنے

آیا ہوں۔ اور ایک نذر پیش کرنے کو حاضر ہوا

ہوں۔

سیزر:- خطرہ کا خیال نہ کرو۔ نذرانہ پیش کرو۔

روفیو:- نذر کا خیال نہ کرو۔ خطرہ سے آگاہ کرو۔

پوٹھینس:- سیزر تمہارا خیال ہے کہ کلیو پیٹر تمہاری

پرستار ہے۔

سیزر:- (منانت سے) میرے دوست میں جو کچھ سوچتا

ہوں، جانتا ہوں۔ تم نذر پیش کرو۔

پوٹھینس:- میں صاف صاف کہتا ہوں۔ مجھے معلوم

نہیں تم نے کون عجیب دیوتاؤں کی مدد سے محل اور

ساحل کو محفوظ رکھا۔ اب ہم کو یہ معلوم ہو گیا ہے

کہ ہم تمہارے دیوتاؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور

ان پر فتح نہیں پاسکتے۔ میں اب تم کو دھمکاتا

نہیں۔

روفیو:- (طنزاً) یہ آپ کی عنایت ہے

پوٹھینس:- دیوتاؤں نے شمال مغربی ہواؤں کو

اس لئے بھیجا تھا کہ ہم تم کو اپنے قبضہ میں رکھیں لیکن

تم ان ہواؤں سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئے۔

سیزر:- (نہایت اخلاق سے درخواست کرتے ہوئے۔ کہ وہ

اصل موضوع پر آئے) ہاں میرے دوست پھر؟

روفیو:- بھلے آدمی جو کچھ کہتا ہے کہ ڈالو۔

پوٹھینس:- مجھے یہ کہنا ہے کہ تمہارے خیمہ میں ایک باغی

موجود ہے۔ کلیو پیٹر۔

سیجر ڈٹو:- (اطلاع دیتے ہوئے) ملکہ تشریف لارہی ہیں

(روفیو اور سیزر کھڑے ہو جاتے ہیں)

روفیو:- (پوٹھینس کے کان میں) تم کو پہلے ہی سب کچھ بک

ڈالنا تھا۔ اب وقت گزر گیا۔

(کلیو پیٹر نہایت قیمتی لباس میں داخل ہوتی ہے۔ اور سیزر

کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اس کی سہیلیاں فٹاتا کی نگرانی میں

میز کے پاس آکر جمع ہو جاتی ہیں۔ سیزر کلیو پیٹر کی خاطر اپنی

نشست خالی کر دیتا ہے جس کو وہ قبول کر لیتی ہے)

کلیو پیٹر:- (بڑی سے پوٹھینس کو دیکھ کر) یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔

سیزر:- (اس کے قریب انتہائی شہقا نہ انداز سے بیٹھ کر)

تمہارے متعلق مجھ سے کچھ کہنے جا رہا ہے۔ تم ابھی خود

سنو گی۔ ہاں تو شروع کرو پوٹھینس۔

پوٹھینس:- (آزردہ خاطر ہو کر) سیزر (اس کی زبان لگت

کرنے لگتی ہے)

سیزر:- ہاں کہو۔

پوٹھینس:- جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں صرف تمہارے

کالوں کے لئے ہے۔ ملکہ کے لئے نہیں۔

کلیو پیٹر:- (غصہ ٹور دکتے ہوئے) یہاں ایسے ذرا لے بھی

ہیں جو تم کو بولنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ اس کا خیال رہے۔

پوتھینس :- سیرز ان ذریعوں کو عمل میں نہیں لاتا۔

سیرز :- میرے دوست۔ جب ایک آدمی کو اس دنیا

میں کچھ کنا ہوتا ہے تو مشکل یہ نہیں ہوتی کہ اس سے

کھلایا جائے۔ بلکہ اسے بار بار کہنے سے روکا جائے۔

مجھے اپنی سالگرہ کی ٹھیک اس طرح کرنا ہے کہ تم کو رہا

کردوں۔ جاؤ خدا حافظ۔ اب ہم آئندہ پھر نہ ملیں گے۔

کلیو پیٹر :- (غصہ سے) سیرز یہ رحم ہو قوفی کی دلیل ہے۔

پوتھینس :- (سیرز سے) کیا آپ تنہائی میں میری دو باتیں سننا

پسند نہ کریں گے۔ ممکن ہے کہ آپ کی زندگی کا اخصاً

اسی پر ہو (سیرز کھڑا ہو جاتا ہے)

روفیو :- (آہستہ آہستہ پوتھینس سے) گدھے۔ اب ہم کو

کچھ دلیری کے منظر دیکھنے پڑیں گے۔

سیرز :- پوتھینس

روفیو :- (قطع کلام کرتے ہوئے) سیرز کھانا بنا رہا ہو جائیگا،

اگر تم اپنی زندگی اور موت پر خطبہ پڑھنے کو بیٹھے رہو گے۔

کلیو پیٹر :- خاموش رہو روفیو۔ میں سیرز کی باتیں سننا

چاہتی ہوں۔

روفیو :- (جیسے اس نے نہیں سنا) ملکہ نے اس کو پہلے بھی

سماعت فرمایا ہے۔ آپ نے اپنا لوڈورس سے

گذشتہ ہفتہ ارشاد فرمایا تھا۔ اور اس نے سوچا کہ یہ

سب آپ ہی کا تھا (سیرز کی نکت کو صدمہ ہو جاتا ہے)

وہ بیٹھ جاتا ہے اور کلیو پیٹر کو گھورنے لگتا ہے۔ جس کے

چہرے سے غصہ کے آثار ہو رہے ہیں۔ روفیو بدستور کہتا ہے)

اور محافظ اس قیدی کو نکل جانے دو۔ وہ رہا کر دیا

گیا ہے (پوتھینس سے) یہاں سے چلے جاؤ تم نے

اپنا موقع کھو دیا۔

پوتھینس :- (غصہ سے مغلوب ہو کر) میں بولوں گا۔

سیرز :- (کلیو پیٹر سے) تم دیکھ رہی ہو۔ سختی سے وہ ایک

لفظ بھی منہ سے نہ نکالتا۔

پوتھینس :- سیرز تم نے کلیو پیٹر کو وہ اصول بتا دئے

ہیں جن سے رومی دنیا پر حکومت کرتے ہیں۔

سیرز :- افسوس وہ خود اپنے آپ پر حکومت نہیں

کر سکتے۔ پھر اس کا نتیجہ؟

پوتھینس :- اس کا نتیجہ! کیا تم اُس کے حسن سے اس قدر

متاثر ہو چکے ہو کہ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ وہ تنہا

مصر پر حکمرانی کرنے کے لئے بے چین ہے۔ اور اس

کا دل تمھاری واپسی کا متمنی ہے۔

کلیو پیٹر :- (اٹھتے ہوئے) جھوٹا۔

سیرز :- (جبریت زدہ ہو کر) کیسے اعتراضات، کیسے اختلافات؟

کلیو پیٹر :- (شرمندہ ہو کر غصہ سے کانپتے ہوئے) نہیں مجھ

میں انکار کرنے کی جرأت نہیں اس کو کہنے دو۔

(وہ بیٹھ جاتی ہے)

پوتھینس :- میں نے خود اس کی زبان سے سنا ہے۔ کہ

اس کے بھائی کے سر سے تاج اتار کر خود اس کے سر

پر رکھو گے۔ اور خود اپنے کو بھی اس کے رحم و کرم پر

چھوڑ دو گے

سیرز :- (خاموشی سے) اچھا میرے دوست اور کیا یہ

بالکل فطرت کے مطابق نہیں ہے؟

پوتھینس :- فطری ؟ کیا مکاری پر تمہیں غصہ نہیں آتا۔

سیرز :- غصہ۔ او بے وقوف مصری۔ مجھے غصہ کر کے کیا کرنا ہے ؟ کیا مجھے ہوا پر غصہ آتا ہے جب وہ سارے جسم میں لرزہ پیدا کر دیتی ہے۔ کیا میں اس سے برہم ہوتا ہوں جب اس کی تاریکی میں اکثر ٹھکڑے کھا کھا کر مجھے گرنا پڑتا ہے۔ یا میں جوانی کو قہر کے انداز سے دیکھتا ہوں جب وہ چلی جاتی ہے۔ مجھ سے ایسی باتیں کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے یہ کناکھ کل سولج طلوع ہوگا۔

کلیو پیٹرا :- (برداشت نہ کرتے ہوئے) لیکن یہ غلط ہے یہ جھوٹ ہے۔ میں قسم کھاتی ہوں۔

سیرز :- گو تم نے ہزاروں دفعہ قسم کھائی اور جو قسم کھائی اس پر میں نے یقین کیا، تاہم یہ سچ ہے۔

(وہ بے حد مضطرب ہو جاتی ہے۔ اسے بردہ کے اندر پھپھانے کی غرض سے وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور پوتھینس کو ردیفوں کے پاس لے جا کر کہتا ہے) ادھر آؤ ردیفو۔ مجھے پوتھینس سے کچھ کہنا ہے (وہ ردیفو اور پوتھینس کو ساتھ لے کر باتیں کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔) پوتھینس اپنے دوستوں کو سمجھاؤ کہ میں ایک معمول اور مناسب فیصلہ کی مخالفت نہ کروں گا

(سب لوگ سنتے ہوئے چلے جاتے ہیں)

کلیو پیٹرا :- (چپکے سے) فنانا۔ فنانا۔

فنانا :- (میز کے قریب سے اٹھ کر اس کے پاس جاتی ہے اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ بھر کر) میری بچی۔ گھبراؤ نہیں

اطمینان کی سانس لو۔

کلیو پیٹرا :- (قطع کلام کرتے ہوئے) کیا وہ لوگ ہماری باتیں سن سکتے ہیں۔

فنانا :- نہیں۔ میرے دل کے ٹکڑے۔ نہیں۔

کلیو پیٹرا :- تو غور سے سنو۔ اگر وہ محل سے زندہ چلا جا تو پھر کبھی میری صورت نہ دیکھنا۔

فنانا :- وہ ؟ اُف۔

کلیو پیٹرا :- (منہ پر مارتے ہوئے) اس کو اس طرح مارو جیسے میں تمہارے منہ پر مار رہی ہوں۔ اس کا سر

دیوار سے ٹکرا دو۔ اس کو پتھروں پر گر کر بڈیلوں

کو ریزہ ریزہ کر دو۔ اس کو مار ڈالو۔ ہلاک کر دو۔

فنانا :- (دستی دکھا کر) کتنا مارا جائے گا۔

کلیو پیٹرا :- اگر تم اس میں ناکام رہو تو ہمیشہ کے لئے کالا منہ کر لینا۔ مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔

فنانا :- بہتر ہے، جب تک اس کی آنکھیں نہ پھوڑ ڈالی جائیں تم میری صورت نہ دیکھنا۔

(سیرز زرق برق لباس میں ردیفو اور پاپوڈورس کے

ساتھ آتا ہے)

کلیو پیٹرا :- (فنانا سے) جلد آؤ۔ جلد فنانا ایک لمحہ کے لئے اپنی معنی خیز نگاہیں اس پر ڈالتی ہے۔ پھر

دانت میسٹی ہوئی۔ آا کے پاس سے گذر جاتی ہے

دکلیو پیٹرا ایک غزال رعنا کی طرح سیرز کے پاس دوڑ

جاتی ہے)

سیرز :- تم پھر میرے پاس آگئیں۔

(باقی آئندہ)

نانا صاحب کے قہر میں ایک میں سال کی حسین نوجوان لڑکی تھی جسے نانا صاحب کے باپ نے پرورش کیا تھا۔ نانا صاحب بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس لڑکی نے ہر چند اسی قصر ظلم و استبداد میں پرورش پائی تھی، لیکن قدرت نے اُسے عجیب طرح کا درد مند دل عطا کیا تھا۔ اور وہ عایا کی دردناک حالت دیکھ کر بہت کڑھا کرتی تھی۔ اگر کبھی وہ نانا صاحب سے اس کا ذکر کرتی اور اس کو لوگوں کی تباہ حالت کی طرف توجہ دلاتی تو وہ جواب دیا کرتا کہ ”میں زندگی کی جس راہ سے گزر رہا ہوں اس کا حال تجھے نہیں معلوم، لیکن تو عنقریب دیکھے گی کہ نانا صاحب خائن نہیں ہے جیسا کہ لوگ اسے سمجھتے ہیں اور نہ وہ انگریزوں کا کاسر لیس بننا چاہتا ہے جیسا کہ گمان کیا جاتا ہے۔“

نانا صاحب ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوا تھا اور زمانہ کا سرد گرم کافی دیکھ چکا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ رعایا کا کیا حال ہے وہ اچھی طرح واقف تھا کہ غریب ہندوستان اپنے سر پایہ دار مالک کے لئے کیوں کھرا اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے۔ اور اس نے عہد کیا تھا کہ اپنی قوم کو اس عذاب سے ضرور نجات دلائے گا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں ۱۸۲۵ء کا ہنگامہ عذر شروع ہوا اور یکے بعد دیگرے ہندوستان کے تمام حصوں میں آگ شعل ہو گئی۔ نانا صاحب نے بھی اس فرصت کو غنیمت جان کر اپنے خواب آزادی کی تعبیر ڈھونڈنا چاہی، لیکن اس نے بجائے اعلان بغاوت کے خود اپنی ہی قوم کے لوگوں کو ستانا شروع کیا اور انگریزوں کی اعانت کی تاکہ وہ اور پامال کرے۔ اس میں نانا صاحب کا کیا راز مستور تھا؟ اس نے کیا تدبیر سوچی تھی؟ اس کا علم کسی کو نہ تھا۔

شہر کی سڑکوں پر آریشی جھنڈیاں اڑ رہی ہیں، پھولوں سے دروازے آراستہ کئے جا رہے ہیں۔ اور ایک بڑے میدان میں کسی جلسہ کا اہتمام ہو رہا ہے۔ کوئی بڑا انگریزی افسر آنے والا ہے، اور نانا صاحب کے حکم سے تمام مخلوق اس کی بزیرائی کے لئے میدان میں جمع ہو رہی ہے۔ وقت معینہ پر انگریز افسر آیا، نہایت تزک و احتشام کے ساتھ نانا صاحب نے اس کا استقبال کیا اور بلند چوترہ پر اس کو بٹھا دیا۔ نانا صاحب داہنی طرف بیٹھا ہوا تھا اور وہ لڑکی بائیں جانب۔ فوج چاروں طرف احاطہ کئے ہوئے تھی

انگریز افسر کھڑا ہوا اور یوں مخاطب ہوا:—

”حاضرین! ہم آج تمہاری سرزمین میں فاتحانہ داخل ہوئے ہیں اور جس جس نے تم کو سرکشی کی ہے اس کو پوری سزا دے چکے ہیں۔ لیکن آج میں بتانا تھا کہ سردار نانا صاحب کے بلانے پر آیا ہوں جو ہمارا دوست و حلیف ہے اس لئے بتاؤ کہ تم صلح کے خواہشمند ہو یا جنگ کے تاکہ ہم دوستانہ ہاتھ بڑھائیں اگر تم امن کے طالب ہو یا آگ اور خون برسائیں اگر جنگ چاہتے ہو“

یہ سننے کے بعد مجمع میں بچل پیدا ہو گئی اور چاروں طرف سے برہمی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ انگریز افسر نے یہ سمجھ کر کہ اسنے لوگوں کو ڈرانے میں غالباً احتیاط سے کام نہیں لیا، اپنی تقریر کا رخ بدلنا چاہا، لیکن نانا صاحب فوراً اٹھرا ہو گیا اور اس نے قوم کو مخاطب کر کے کہا:-

” تم لوگ بزدل ہو، ذلیل ہو، بے غیرت ہو، افسوس ہے کہ غیروں کی حکومت کا جو انھاری گردن میں بڑا ہوا ہے۔ اور تم اس لعنت کے طوق پر مطمئن معلوم ہوتے ہو، اگر کچھ بھی شرم کا احساس ہے تو اپنی آواز میں بلند کرو اور مقابلے کے لئے

طیار ہو جاؤ“

لوگوں نے یہ سنا اور ایک آواز ہو کر جواب دیا کہ ”تو خائن ہے، تو نمک حرام ہے اور ہم تیرا ساتھ دینے کے لئے آمادہ نہیں“

مجمع کی حالت اب ایسی تھی کہ شاید وہ نانا صاحب پر حملہ کر کے فنا کر دے گی، لیکن عین اسی وقت ایک ضعیف العمر انسان اپنی لاٹھی پر ٹیک لگائے ہوئے دفتہ کھڑا ہوا۔ یہ ایک بھومی تھا نہ جس کا نام لوگوں کو معلوم تھا نہ وطن سے واقفیت تھی۔ یہ گاؤں گاؤں پھرا کرتا تھا اور عبادت و ریاضت روحانی کی تعلیم لوگوں کو دینا کرتا تھا۔ نانا صاحب کی ربیبہ (لڑکی) اس کی بڑی عزت کرتی تھی اور یہ بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ لڑکی نے انگریز افسر سے کہا کہ ”اس بڑھے کو کینے دو جو کچھ کہنا چاہتا ہے“ افسر یہ سن کر خاموش ہو گیا اور بڑھے بھومی نے یوں خطاب کیا:-

”اے میرے عزیزو، کمال پچاس سال ہوئے کہ میں صحراؤں، پہاڑوں اور جنگلوں میں پھر رہا ہوں، تم دیکھتے ہو کہ میرے ناخن کتنے بڑھے ہوئے ہیں۔ تم یہ بھی دیکھ سکتے ہو کہ میری اونگھیاں اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہیں جیسے کسی طائر کا سینہ تیروں سے چھلنی ہو جائے۔ ایک زمانہ مجھ پر اس حال میں گزر گیا کہ سیلاب کے سیلاب میرے اوپر سے گزر رہے تھے اور میں اپنی بڑھی ہوئی تشنگی بجھانے کے لئے ایک قطرہ بھی اُن سے حاصل نہ کرتا تھا۔ سالہا سال میں نے اپنی زندگی کے اس طرح بسر کر دئے ہیں کہ پتے ہوئے صحرا میں میرے غریاں جسم پر گرم آفتاب کی شعا میں پڑ پڑ کر میرے عروق کے اندر خون کو خشک کر تی جلی جا رہی ہیں اور میں نے سایہ کی تلاش میں ایک برگ خشک کی جھی جتو نہیں کی۔ یہ پھر یہ بھی سن لو کہ کمال دس سال میں نے جنگلوں میں اس طرح صرف کردئے ہیں کہ جب بہت بھوکا ہوتا تھا تو ان کی چھال چاٹ لیتا تھا اور جب بہت پیاس

لگتی تھی تو رات کے آنسوؤں سے جنھیں تم بنہم کہتے ہو تسکین کر لیتا تھا، درندوں نے مجھ سے وحشت ترک کر دی تھی اور چڑیاں میرے الجھے ہوئے بالوں میں آکر بسیرا لیا کرتی تھیں۔“

نانا صاحب ہاتھ میں کوڑا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ارادہ کیا کہ اسے خاموش کر دے، لیکن انگریز افسرنے کہا کہ نہیں اس کو اپنی تقریر ختم کر لینے دو۔

بڑھے پنجومی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:-

”یاد رکھو کہ دنیا کی کوئی سمجھتی مجھے نہیں ڈر سکتی، کسی ضرب کا مجھ پر اثر نہیں ہو سکتا کیونکہ میرا جسم تو پتھر ہو گیا ہے اور اس پر جو ٹوٹوں کا اتنا ہی اثر ہو گا جیسے پتھر کی چٹانوں سے ہوا گزر جائے۔۔۔۔۔۔ ہاں، تو ایک طویل زمانہ میں نے ایسی فضا میں بس کر دیا جس کی تاریکی نہایت شدید اور جس کا سکون حد درجہ خوفناک تھا۔ میں اس تاریکی میں گھرا ہوا تھا، اس سیاہ چادر نے میری بصارت و بصیرت دونوں پر پردہ ڈال رکھا تھا کہ دفعۃً ایک دن یہ پردہ پھٹا اور ایک آسمانی کراک نے مجھ کو بیدار کر کے کہا کہ اٹھ کھڑا ہو اور چل! مگر کہ کادن آگیا ہے۔ چل اور اپنے راستے میں اُن سُرخ بچوں کو بھرتا جا جو تیری مٹی میں بند ہیں۔ چل، اپنی کرخت راگنیوں کو فضا میں بلند کر اور پکار پکار کر سب کو بلا اور کہہ کہ ”آؤ ان غومیں کھیتوں کو کاٹیں، اے کابل و ناعا بقت اندیش کسا نو، دن طلوع ہو گیا ہے اور آفتاب اپنے خنجر لے کر بلند ہو چلا ہے، آؤ، چلو، بڑھو اور ان سُرخ کھیتوں کو کاٹنا شروع کرو۔“

یہ کہہ کر اُس نے انگریز افسر اور اس کی سُرخ پوش فوج کی طرف اشارہ کیا۔۔۔۔۔۔ نانا صاحب یہ سنتے ہی بیچ اڑھا۔ ”اے میرے دوست تو نے بالکل صحیح کہا، کھیتی کاٹنے کا وقت آگیا ہے۔۔۔۔۔۔ ایک گھنٹہ نہ گزرا تھا کہ انگریزی افسر مع اپنی فوج کے قید خانہ میں پڑا ہوا تھا۔ اور جوق در جوق جماعتیں جنگ کے لئے آمادہ ہو کر چلی آ رہی تھیں

اس واقعہ سے تو تاریخ کے صفحات خالی ہیں، لیکن اس کے بعد کا حال سب کو معلوم ہے کہ کامل دو سال تک نانا صاحب نے انگریزوں سے جنگ کی اور جب وہ کانپور میں پوری بے رحمی کے ساتھ اس ”مُرخ کھیتی“ کو کاٹ چکا تو ۱۸۵۹ء میں اپنی اہلیہ اور احباب و اعمان کے ساتھ کسی طرف کو نکل گیا۔ انگریزوں نے یہ خبر شہور کی کہ نانا صاحب پارگنا اور عنقریب اسکا سر دہلی کے بازاروں میں گشت کرایا جائیگا لیکن اسکی تکمیل کبھی نہیں ہوئی اور آج تک کسی کو نہیں معلوم کہ نانا صاحب کو آسمان کھا گیا یا نہیں۔۔۔

موسیقی عہد نبویؐ و خلفاء راشدین میں

قبل عہد اسلام ایام جاہلیت میں موسیقی عربستان کے تمام بڑے بڑے مقامات میں رائج تھی۔ مکہ، یثرب، طائف، خیبر، وادی القری، دومتہ الجندل، مسقط، عدن، حضرموت، حیرہ، انبار، اہواز، دمشق، بلبلک اور بصرہ وغیرہ میں ہر جگہ مختلف لحن و لہجہ کے ساتھ گانے کا رواج پایا جاتا تھا۔ لیکن جب فلور اسلام ہوا تو لوگوں کا ذوق موسیقی کی طرف سے ہٹ کر قرآن مجید کی طرف منتقل ہو گیا اور بجائے شعر و غنائے اصلاح اجتماعی اور فتوحات ملکی کی طرف مائل ہو گئی۔ رسول اللہ کے سامنے جب شعر و شاعری کا ذکر آتا تھا یا کوئی شاعر اپنا کلام سنانا تھا تو آپ اس کے جواب میں صرف قرآن پاکی کی آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ طفیل بن عمرو السدوسی (مشہور شاعر) جب رسول اللہ کے پاس آیا اور اسلام اس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا کہ میں مرد شاعر ہوں جو کچھ میں کہتا ہوں پہلے سے سن لو۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ تو چند شعر عربی کے پڑھے۔ رسول اللہ نے سنکر سوہ اخلاص پڑھی اور آخر کار یہ سلمان ہو گیا۔ ایطرح جب خلیفہ ثانی نے کوفہ میں معمر بن شعبہ کی طون اپنے عامل کو بھیجا اس نے کہا کہ تمہارے شہر کے شعرا نے اسلام کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اسے سناؤ۔ پس معمر نے اصحاب تعلقات میں سے کسی کو عبید العامری کے پاس بھیجا جو اس وقت کوفہ میں موجود تھا۔ اس سے کہا گیا کہ اسلام کے بارہ میں جو کچھ تم نے لکھا ہے سناؤ۔ یہ سنکر نبی نے سورہ بقرہ پیش کر دی اور کہا کہ اسلام نے شعر و شاعری کی جگہ ہم کو یہ چیز دی ہے۔ لبید بڑا مشہور شاعر عہد جاہلیت کا تھا لیکن اسلام لانے کے بعد اسے شاعری ترک کر دی تھی۔ اور سوائے ایک شعر کے دوسرا شعر نہیں کہا۔

۱۔ وہ اشعار یہ ہیں:-
 لا اوالہ الناس نالہم حر بہم
 ولو حادبتنا مسہب وبنو فہم
 ولما یکن یوم نزول انجومہ
 تطیوبہ الرکیان ذونیاہ فہم
 اسما علی نصف ولست بنمالہ
 وما لی من ورق اذ اجاعنی حتی
 فلا سلم حتی یخضر الناس بیغہ
 یصبح طیرک انساہ علی لحمی

۲۔ وہ شعر یہ ہیں:-

الحمد لله اذ لم یاتنی اجل
 حتی اکتسبت من الاسلام ناسر

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ رسول اللہ کو موسیقی سے نفرت تھی یا غناء کو آپ نے حرام کر دیا تھا کیونکہ ولیمہ عرس کے موقعہ پر خود آپ نے عورتوں کو گاتے ہوئے سنا اور منع نہیں فرمایا۔ اسی طرح جب آپ مکہ سے یثرب کی طرف ہجرت کر کے تشریف لے گئے تو انصار کی عورتوں نے آپ کے استقبال میں دف بجا بجا کر گانا گایا اور آپ نے اسے سنا۔ رسول اللہ اچھی آواز کو بہت پسند فرماتے تھے اور بلال حبشی کو اذان کی خدمت پر مامور محض ان کے حسن آواز کی وجہ سے تھا۔ آپ بلال سے اکثر قرآن سنا کرتے تھے اور آپ کو بہت لطف آتا تھا۔

خود فن قرأت و تجوید کو ملاحظہ کیجئے کہ وہ لحن کے مختلف طریقوں اور تال کے منظم وقفوں سے پیدا ہوا ہے۔ اور اس فن کی اصطلاحیں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً صرف ایک مد کو لکھئے کہ فن تجوید میں اس کی چار قسمیں کردی گئی ہیں طبعی متصل - منفصل - لازم - اور یہ قسمیں حقیقتاً موسیقی کے گھٹاؤ بڑھاؤ ہیں جن کا علیحدہ نام رکھ دیا گیا ہے۔ اسی طرح اصطلاحات ادغام، اظہار، انحاء، اقلاب، غنہ، حروف ہمس و جہر، استفالہ و ترقیق تغنم و رخو، شدت و لوسط، صغیر و اطباق، انفتاح و اذلاق، قلقہ و وقف وغیرہ... کو دیکھئے کہ فی الحقیقت ان سب کا تعلق لحن و موسیقی سے ہے لیکن اس خیال سے کہ یہ فن اہو و لعب میں داخل ہو جائے موسیقی سے علیحدہ اس کی اصطلاحیں مقرر کی گئیں۔

خود قرآن کو بھی ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا حکم ہے۔ اور ترتیل کی تفسیر میں امام نیشاپوری نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مخصوص وقفوں کے خوش الحانی سے الفاظ کو ادا کرنا ہی ترتیل ہے۔ بہر حال جس حد تک نفس خوش الحانی و حسن صوت کا تعلق ہے اسلام نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ بعض حالات میں رسول اللہ نے غناء کی طرف ترغیب بھی دلائی ہے۔ چنانچہ ایک بار انصار میں سے کسی کی لڑکی کی شادی ہوئی تو رسول اللہ نے جناب عائشہ سے یہ بات فرمایا کہ کیا تم لوگوں نے اسے رخصت کر دیا جو اب رہا ہاں، آپ نے پوچھا کہ تم لوگوں کے ساتھ کوئی گانے والا بھی تھا۔ آپ بولیں نہیں۔ رسول اللہ نے فرمایا کیا تمہیں نہیں معلوم کہ انصار کی قوم گانے کو بہت پسند کرتی ہے۔ کیا تم میں سے کوئی اس کے ساتھ ایسا نہ تھا جو کتاب۔ ایتنا کہ ایتنا کہ خیرنا الخیریکم۔ ولولا الحجة السماء لم نخلع لواءیکم

لہ گیت یہ تھا:-

طلع البدر علینا من ثنایات الوداع
و حسب الشکر علینا ما دعا الله داع
ایمان المبعوث فینا جئت بالاموالطاع

ایک بار رسول اللہ ایک کنیز کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ وہ گارہی تھی

ہل علیٰ ویتحمون ان لہوت من مرج

تو آپ نے یہ نکر فرمایا ” لاخرج النشاء اللہ“

ایک مرتبہ رسول اللہ نے رات کے وقت بلال کو یہ اشعار گاتے سنا اور پسند فرمایا۔

الابیت شعری ہل ابیتن لیلۃ بکۃ حولی اذخر و جلیل

وہل اردن یوما میاہ مجنۃ وہل یبدون لی شامۃ و طفیل

حضرت عمر بن الخطاب اور عبداللہ بن رواحہ رسول اللہ کے ساتھ ساتھ سفر میں ہیں۔ چونکہ منزل طویل

تھی اس لئے رسول اللہ نے جاہک اذرت کو تیز چلایا جائے اور عبداللہ بن رواحہ سے کہا کہ اگر اذرت ”حدی خوانی“

سے تیز چل سکتا ہو تو شروع کرو۔ وہ فرط حیا سے خاموش رہے، لیکن حضرت عمر نے کہا کہ تم رسول اللہ کا کہنا نہیں

مانتے اس پر عبداللہ نے یہ شعر گائے شروع کئے :-

واللہ لوکالہ ما اہتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا

الکافرون قد بغوا علینا اذا امراد و قنتہ افینا

ونحن عن فضلك استلینا فنبت الاقدۃ ان لا قینا

وانزلن مسکینۃ علینا

ایک بار کسی اعرابیہ نے نذر مانی کہ اگر رسول اللہ غزوہ سے صحیح و سلامت واپس آجائیں گے تو میں دن پرگانا

گاؤں گی، چنانچہ جب آپ واپس تشریف لائے تو آپ نے اس کو حضور ہی کی اجازت دی اور اس کا گانا سنا،

اسلم حضرت عمر کا غلام تھا اس سے روایت ہے کہ ”ایک بار میں اور عاصم دونوں گارہے تھے کہ حضرت عمر

اس طرف سے گزرے اور ٹھہر کر سننے لگے۔ جب گانا ختم ہوا تو فرمایا کہ پھر گاؤ، چنانچہ ہم نے پھر اعادہ کیا۔ اور پوچھا

اے امیر المومنین ہم میں سے کون بہتر گاتا ہے۔ جواب دیا کہ تم دونوں گدھے ہو، پوچھا کہ ہم میں کون

گدھا برتر ہے۔ آپ نے فرمایا ”یہ بھی وہ بھی“۔ میں نے کہا کہ ”میں ان گدھوں میں غالباً اول گدھا ہوں۔ آپ نے

فرمایا کہ نہیں تمہارا درجہ دوسرا ہے۔۔۔۔۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ موسیقی کے نقاد بھی تھے اور

برگانے والوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔

مدینہ منورہ میں سعد بن وقاص صحابی کا ایک غلام ”قند“ تھا جو نہایت اچھا گانے والا تھا۔ اور جناب عائشہ محض

گانے کی وجہ سے اس کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ ایک بار سعد بن وقاص نے اسے مارا تو آپ خفا ہو گئیں۔ اور کہا کہ جب

تک سعد بن وقاص، قند کو راضی نہ کر لیں گے میں ان سے بولوں گی نہیں۔۔۔۔۔ چنانچہ سعد بن وقاص نے

اس کو راضی کیا اور اس کو بعد آپ اُن سے ہم کلام ہوئیں۔
 الغرض جس حد تک گانے کا تعلق ہے موسیقی و غناء اسلام میں حرام نہیں ہے بعض نے اس کی حرمت کا فتویٰ
 دیتے ہوئے اس آیت کو استدلالاً پیش کیا ہے :-

”ومن الناس من يفتري لهوا الحدیث یضل عن مبدل اللہ

بغیر علم ویتخن ہاھن واولئک لھم عذاب مہین۔“

کیونکہ ان کے نزدیک غناء لہو الحدیث میں داخل ہے حالانکہ یہ آیت نصر بن حارت کے حق میں نازل
 ہوئی تھی جو فارس سے قدیم سیر و تاریخ کی کتابیں لاکر ترجمہ کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ یہ قرآن سے بہتر ہیں۔ گانے سے
 اس آیت کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ ابتداً عہد اسلام میں چونکہ صرف اجتماعی و اخلاقی
 اصلاح پیش نظر تھی اس لئے اس فن کی ترقی کا کوئی موقع نہ تھا۔

فنون لطیفہ از خود ایک قوم کی تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ نشوونما پاتے ہیں۔ اس لئے ابتدائی حالت میں کسی
 ملک یا قوم کا ان کی طرف متوجہ ہونا کبھی فنی لحاظ سے مفید نہیں ہو سکتا۔ خود تاریخ اسلام کو اٹھا کر دیکھئے تو معلوم
 ہوگا کہ جب رسول اللہ کے بعد فتوحات وسیع ہونے لگیں اور تمدنی ترقی کے آثار پیدا ہونے لگے تو ساتھ ہی ساتھ موسیقی
 کو بھی ترقی ہوئی۔

عہد بنی امیہ میں عود، طنبور اور دف کے ساتھ قصاید و اشعار گانے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ اور عہد بنی
 عباس میں تو موسیقی نے ایک مستقل علم و فن کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ نئی نئی راگنیاں ایجاد ہو رہی تھیں، گانے
 کے مختلف طریقے سوچے جا رہے تھے اور ابھریں کی ایک جماعت مستقلاً اسی فن کی خدمت کر رہی تھی، چنانچہ یونس،
 احمد ابن الملکی، عمرو بن باند، بذل المغنیہ، اسحاق موصلی، اس عہد کے خاص ابھریں موسیقی تھے۔ اور مولفین
 میں جو شہرت یعقوب بن اسحاق الکندی، ابو نصر فارابی اور ابو علی بن سینا کو حاصل تھی وہ بھی ارباب تاریخ سے مخفی نہیں۔

ضرورت بڑے شادی

میرے ایک مرحوم دوست کی دختر کی کتھرائی کے لئے ایک تندرست برسر روزگار ۲۳ تا ۲۴ سالہ لڑکے کی ضرورت ہے۔
 لڑکی تندرست خشکس کارخانہ میں ہو شیار ہے۔ قوم پٹھان صحیح النسب اور نہایت شریف خاندان۔ خط و کتابت مندرجہ ذیل پتہ
 پر کیجئے۔

ڈاکٹر کانتی پرشاد درما۔ بی۔ اے۔ - شری گاندھی آشرم خیراتی دواخانہ۔ میرٹھ شہر

سماجوں کے حیرت انگیز استعمالات

انکشاف جرائم کی ایک نئی راہ

حال ہی میں نیویارک (امریکہ) کے ایک جرائم پیشہ گروہ نے نہایت ہی معمولی قسم کا عطر تیار کیا اور فکر یہ کی کہ بازار کے قیمتوں سے قیمتی عطر کی طرح فروخت ہو۔۔۔ انھوں نے کامل غور کے بعد یہ تدبیر اختیار کی کہ بازار سے عطر کی ایک شیشی جس کی قیمت ۲۰ گنی تھی لے کر، شیشیاں بنائیکے کارخانہ میں گئے اور اس کو آمادہ کیا کہ بالکل اسی قسم کی شیشیاں تیار کر دے۔ جب شیشیاں تیار ہو گئیں تو ان میں نہایت ہی معمولی قسم کا عطر بھر دیا اور ان پر بالکل اسی قسم کا لیبل چھپوا کر جپان کر دیے جو اس قیمتی عطر کی شیشی پر پایا جاتا تھا۔۔۔ جب یہ شیشیاں بازار میں پہنچیں اور لوگوں نے انھیں خریدا تو دکان داروں سے شکایت کی گئی کہ عطر میں میل کیوں کیا جاتا ہے اور عمدہ عطر کے دام لے کر خراب عطر دیے کا کیا سبب ہے۔

دکان دار غریب حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے اور ان کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہ آتی تھی کہ بند شیشیوں کے اندر اچھے اور خراب عطر کی تیز کیونکر کی جائے۔۔۔ آخر کار یہ معاملہ مقامی پولیس تک پہنچا اور ڈاکٹر ہرحان سے مشورہ طلب کیا گیا جو سماجوں کے ذریعہ سے کشف جرائم میں خاص مہارت رکھتا تھا۔۔۔ یہ شیشی لے کر اپنی تجربہ گاہ میں گیا اور فوق البنفسجی شعاعیں اس پر ڈالیں اس کے بعد اور متعدد شیشیاں لے کر تجربہ کیا تو معلوم ہوا کہ اچھے عطر کی شیشی سے جو شعاعیں گزرتی ہیں وہ نیلگوں ہوتی ہیں اور خراب عطر کی شیشی سے گزرنے والی شعاعیں زرد ہوتی ہیں۔۔۔ اسی طرح اس نے لیبل پر بھی شعاعیں ڈالیں تو معلوم ہوا کہ اصلی شیشی کا لیبل چھپانے کے لئے جو سیاہی استعمال کی گئی ہے وہ اور ہے اور نقلی شیشی کا لیبل کسی اور سیاہی سے چھاپا گیا ہے۔۔۔ آخر کار دکانداروں نے یہ آلہ خرید کر اپنی دکان کی تمام شیشیوں کا امتحان کر لیا اور جتنی خراب عطر کی شیشیاں تھیں ان کو علیحدہ کر دیا۔

چند موٹر ڈرائیورسٹریک کے ایک جانب کھڑے ہوئے مارت درست کر رہے تھے کہ قریب ہی ایک خندق میں نہیں

لاش نظر آئی جس کے سر سے گولی گزری تھی۔ دیکھ بھال سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص سے اس کا جھگڑا ہوا تھا کیونکہ کفالت کے نشان وہاں موجود تھے۔ اسی کے ساتھ ایک سرخ ریشمی رومال بھی لگا اس پر پڑا ہوا ملا جو غالباً قاتل کا تھا اور بھاگتے وقت گھیرا ہٹ میں وہیں چھوٹ گیا تھا۔ مقتول ایک نہایت مشہور رنجیل زمیندار تھا جو اپنے کاشتکاروں کو بہت تکلیف پہنچایا کرتا تھا اور کاشتکار اس کے پاس شدید و تخوین کے خطوط بھی بھیجا کرتے تھے۔ پولیس نے خیال کیا کہ یقیناً انھیں بڑوس کے مزارعین میں سے کسی نے اس کو ہلاک کیا ہوگا اور اسی یقین کی بنا پر تفتیش شروع کر دی گئی۔ دوران تفتیش میں جب رومال پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں جا بجا مٹی کے دھبے بھی موجود ہیں جیسے پسینہ پونھنے سے پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ رومال ایک ماہر فن کے پاس بھیجا گیا۔ اس نے جب رومال پر شعاع ڈالی تو رومال کے دھبے چمکنے لگے۔ اس نے کہا کہ اس مٹی میں کوئی ایسا مادہ ہے جو فاسفورس کی طرح چمکتا ہے۔ پولیس نے تمام مزارعین کے کھیتوں اور مکانوں کی مٹی کو امتحان کے لئے بھیجا تاکہ جس مزارع کے کھیت یا مکان کی مٹی ویسی ہی چمکتی ہوئی نظر آئے گی اسی کو مجرم گردانا جائے گا، لیکن پولیس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب کسی مزارع کے کھیت کی مٹی اس طرح کی نہ نکلی۔ جستجو سے معلوم ہوا کہ جانے قتل کے مرتب ہی ایک بڑا گڑھا ہے جس کے اندر سے کنکر نکلے ہیں اور چینی کا برتن بنانے کے لئے۔ مزدور یہاں سے مٹی لے جا کر فروخت کرتے ہیں۔ جس وقت اس خندق کی مٹی کا امتحان لیا گیا تو وہ بالکل اسی طرح چمکنے لگی جس طرح رومال کے دھبے چمکتے تھے۔ آخر کار تمام مزدور طلب کئے گئے اور قاتل گرفتار ہو گیا۔ اس نے بعد کو بیان کیا کہ مقتول مٹی لے جانے سے اسے روکتا تھا اس لئے غصہ میں آکر اس نے پستول کا فیر کر دیا

امریکہ کے اخباروں میں یہ خبر شائع ہونے لگی کہ فلاں مجرم جس کا نام کابونی ہے سزایاب نہیں ہوا بلکہ اس نے ایک اور شخص کو جو بالکل اسی کا ہم شکل ہے۔ اپنی جگہ قید خانہ میں بھیج دیا ہے اور خود آزاد پھر رہا ہے۔ کابونی کے چہرہ پر بھی زخم کا سا ایک داغ تھا اور جو شخص اس کی جگہ قید خانہ گیا تھا وہ بھی ویسا ہی داغ رکھتا تھا، لیکن فرق یہ تھا کہ کابونی کا داغ بہت پُرانا تھا اور دوسرے شخص کا جدید۔ اس لئے ماہر فن نے کہا کہ اس شخص کے داغ پر شعاعیں ڈال کر دیکھنا چاہئے۔ اگر داغ پُرانا ہوگا تو چمکداری نیا نظر آئے گا ورنہ نہیں۔ چنانچہ یہ تجربہ کیا گیا اور اخباروں کی تمبر بالکل صحیح نکلی۔ بعد کو اصل مجرم ڈھونڈ کر گرفتار کیا گیا اور اس کو سزا دی گئی۔

ایک بار سڑک پر ایک لاش ملی جس کے پاس کپڑے کے بہت سے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ خیال کیا گیا کہ غالباً کسی موٹر سے ٹکر کھا کر یہ شخص مرا ہے اور کپڑے کے ٹکڑے موٹر کے لمپ کے ہیں۔ اتفاق سے تلاش کرتے پر قریب ہی کسی گراچ میں ایک موٹر نظر آیا جس کا لمپ آگے کی جانب کاٹوٹا ہوا تھا اور کپڑے کے وہ ٹکڑے جو لاش کے پاس ملے

تھے قریب قریب اس کا بیج سے ملے جلتے تھے۔ جو لمپ میں لگا ہوا رہ گیا تھا۔ علاوہ اس کے یہ بھی تحقیق ہو گیا کہ گزشتہ شب کو موٹر ڈرائیور اسے لے گیا تھا اور راستہ میں شیشہ بھی ٹوٹا تھا۔۔۔۔۔ الغرض اس قدر تحقیق کے بعد موٹر ڈرائیور گرفتار کیا گیا۔ اس نے کہا کہ ” بیشک میں رات کو موٹر لے گیا تھا اور لمپ بھی راستہ میں ٹوٹا لیکن کسی آدمی سے ٹکرا کر نہیں بلکہ ایک اور موٹر سے ٹکرا کر جو نہایت تیزی سے گزر رہی تھی “ آخر کار کا بیج کے وہ ٹکڑے جو لاش کے پاس پڑے تھے اور وہ ٹکڑے جو لمپ میں لگے ہوئے رہ گئے تھے۔ ماہر فن کے پاس بھیجے گئے اور اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ لاش کے پاس جو کا بیج کے ٹکڑے ملے ہیں وہ موٹر کے لمپ نہیں ہو سکتے، کیونکہ ان سے شعاعیں سبز ہو کر نکلیں اور لمپ کے شیشہ سے کسی اور رنگ کی۔ آخر کار یہ چھوڑ دیا گیا اور بعد کو جسٹو سے اصل مکتب جرم کا گرفتار کیا گیا

چکاگو کے جو این ایک چور تھا جو رات گئے آنے جانے والی عورتوں کو ریلوے اور کافر کر کے روک لیتا تھا اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا تھا لوٹ لیتا تھا، اور پھر فوراً ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر منہ چوم لیتا تھا اور چھوڑ دیتا تھا۔ لیکن ہاتھ میں اس کے دستانہ ضرور رہتا تھا تاکہ عورتوں کے چہرہ پر اس کے ہاتھ کا نشان نہ پایا جائے

ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا لیکن کسی طرح گرفتار نہ ہو سکا۔۔۔۔۔ پولیس نہایت سرگرمی سے اس کی جستجو کر رہی تھی کہ اتفاق سے ایک رات ایک نوجوان جو نہایت اچھے ملبوس میں تھا۔ اسی مقام پر ملا جہاں گزشتہ رات اسی قسم کا ایک واقعہ ہو گیا تھا۔ اس کو گرفتار کیا گیا لیکن اس نے ثابت کر دیا کہ جس وقت واقعہ ہوا ہے وہ یہاں موجود ہی نہ تھا، پولیس نے اسے تو ضمانت پر چھوڑ دیا لیکن اس کے دستانے امتحان کی غرض سے لے لئے۔۔۔۔۔ جس وقت ان دستانوں پر شعاعیں ڈالی گئیں تو معلوم ہوا کہ داہنے ہاتھ کے دستانے کے وسط میں ایک مستطیل سا نشان ایسا ہے جس سے شعاعیں عجیب رنگ کی گزرتی ہیں۔ اب مزید جستجو کے سلسلہ میں وہ لڑکی طلب کی گئی جس پر آخری بار حملہ کیا گیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر لگی ہوئی سُرخمی کا امتحان لیا گیا تو اس سے بھی بالکل وہی رنگ پیدا ہوا جو دستانے کے داغ سے پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ اس سے ثابت ہو گیا کہ دستانہ اسی لڑکی کے ہونٹوں سے مس ہوا تھا اور مجرم کو سزا دی گئی

شہر کوپن ہاگن سے قریب خندق میں ایک عورت کی لاش ملی جس کے دونوں پاؤں پنڈلیوں سے کٹے ہوئے تھے۔ پولیس نے غائب ہو جانے والے لوگوں کی فہرست میں جستجو کی لیکن کچھ پتہ نہ چلا کہ یہ عورت کون ہے۔ پولیس نے عکس ریزا (X-Rays) کے ذریعہ سے اس کے اندرونی اعضاء کی تصویر لی تو معلوم ہوا کہ اس کے پیچھے میں سہل کی بیماری کے داغ کثرت سے پائے جاتے ہیں، پولیس نے یہ دیکھ کر ان شفاخانوں کی جستجو کی جہاں اس بیماری کے مریض رکھے جاتے ہیں اور آخر کار ایک شفاخانہ میں ایک پیچھے کی تصویر ملی جو بالکل عورت کے پیچھے کی طرح تھی

اور پتہ چلا کہ اس عورت کا یہ نام تھا یہ پتہ تھا اور دوہفتے ہوئے کہ وہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔ پولیس اس کے مکان پر پہنچی اور مختلف کاغذوں اور کپڑوں کی جیبوں کے سلسلہ میں اونگلیوں کے نشان بھی کسی کسی چیز پر نظر آئے اور انھیں نشانوں سے پتہ چلا کہ مقتول واقعی وہی عورت تھی بعد کو قاتل بھی ملا اور اس کو سزا ہوئی

اوپر کی چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ فوق البنفسجی شعاعوں سے تحقیق جرائم میں کتنی زبردست مدد ملتی ہے۔ اور ان شعاعوں کے اثرات و نتائج کس درجہ قابل یقین ہوتے ہیں۔ ماہرین فن کا بیان ہے کہ اس طریق سے ہزاروں قسم کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور دنیا کی کوئی دو چیزیں ایسی نہیں ہیں جن میں ذرا سا بھی کسی قسم کا اختلاف ہو اور اس طریق عمل سے ظاہر نہ ہو جائے۔

ڈاکٹر گوڈمین نے جو اس کے بڑے ماہر ہیں اس وقت تک ۲۰ ہزار نمونے ان شعاعوں کے منضبط کر لئے ہیں اور انکا بیان ہے کہ اگر کسی جرم کی جائے وقوع پر کاغذ یا چمڑے کا کوئی ٹکڑا یا بال کا کوئی حصہ نظر آئے تو وہ بھی اکتشاف جرم کے لئے کافی ہے کیونکہ شعاعی عمل کے ذریعہ سے فوراً معلوم ہو سکتا ہے کہ اس چمڑے کی دباغت کس طرح ہوئی ہے۔ اور مختلف دباغتوں کے مختلف رنگ پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح کاغذ کے ٹکڑے کا امتحان کرنے سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کاغذ کہاں کہاں رہا ہے اور وہ کن کن چیزوں سے مس ہوا ہے۔ بال کا بھی یہی عالم ہے کہ ہر چند بظاہر تمام بال ایک ہی قسم کے معلوم ہوتے ہیں، لیکن شعاعی تجربہ سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف لوگوں ہر قوموں کے بال سے کتنے رنگ مختلف پیدا ہوتے ہیں۔

اس طریقہ سے اصلی نقلی سنگ مرمر، اچھے اور بُرے ریشم کی بھی پہچان ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ آٹا کس قسم کی چکی کا پسا ہوا ہے، چنانچہ ایک چور کے کپڑوں پر آنے کے ذرات نظر آئے اور شعاعی تحقیق سے پتہ چل گیا کہ یہ آٹا فلاں چکی کا پسا ہوا ہے۔

شعاعی تجربہ سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک عورت کے بالوں کا حُسن قدرتی ہے یا مصنوعی، کیونکہ قدرتی حُسن والے بالوں سے تقریباً ۱۲ قسم کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور مصنوعی طور سے جو حُسن پیدا کیا جاتا ہے وہ ہمیشہ ایک ہی قسم کی شعاع پیدا کرتا ہے البتہ یہ ضرور معلوم ہو سکتا ہے کہ بالوں میں کس قسم کا سالہ، تیل، یا عطر استعمال کیا گیا ہے۔ فرض کیجئے کسی کمرہ کے اندر کوئی مقتول نظر آیا اور ماحول کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمیوں میں باہم ضرور کشاکش ہوئی ہے اور بظاہر کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے قاتل کا پتہ چل سکے تو آپ سوائے خاموش رہنے کے اور کیا کر سکتے ہیں، لیکن امریکہ کی پولیس مقتول کے ناخنوں کو دیکھے گی کہ آپس کی نوچ کھسوٹ میں قاتل کی کھال کا کوئی حصہ تو بچ کر نہیں آگیا اور پھر شعاعی تجربہ سے فوراً معلوم کر لے گی کہ قاتل کس قوم و جنس کا تھا۔ چنانچہ امریکہ میں ایک بار

بالکل ایسا ہی اتفاق پیش آیا اور پتہ چلا کہ قاتل زنگی تھا اور چونکہ قتل کا واقعہ جاڑوں میں ہوا تھا۔ اس لئے یہ سمجھ لیا گیا کہ قاتل ضرور جنوب کی طرف سے آیا ہوگا اور آخر کار اس کا پتہ چل گیا۔

پھر یہ تمام نتائج اتفاقی نہیں ہیں بلکہ حقائق علمی کی صورت رکھتے ہیں جو مختلف ممالک یورپ میں متعدد ماہرین فن کے ہزاروں تجربہ کے بعد حاصل ہوئے ہیں۔ چنانچہ اڈمون لوکار جو فرانس کا مشہور ماہر فن ہے اس نے اسی شعاعی عمل سے فرانس کے تمام مصنوعات کا تجربہ کر کے معلوم کر لیا ہے کہ فلاں کارخانہ کے غبار سے کس قسم کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح آگسٹ باسینی نے جو شکاگو میں علمی ذرائع سے کشف جرائم پیمامور ہے، معدنی اشیاء کی تحقیق کر کے بہت سے جرائم کا اکتشاف کیا ہے۔ اس نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں تمام زہروں کا شعاعی تجربہ کر کے نتائج درج کئے ہیں۔

نیویارک کے ڈاکٹر گوڈمین نے عورتوں کے اسباب زہیائش و آرایش کی تحقیق کی ہے اور معلوم کیا ہے کہ مختلف تیلوں، عطرروں، پوڈروں، غازوں سے کتنی مختلف رنگ کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور اس طرح اس نے ۲۰۰ جرائم کا اکتشاف کیا۔ اسی طرح شعاعی عمل سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک ناخن کا ٹکڑا کتنے عرصہ کا گناہوا ہے۔

گزشتہ سال باسینی کے معائنہ کی میاومی نے اعلان کیا تھا کہ قو قازی جنس کے آدمیوں کے دانت اگر گھسے جائیں تو ان سے نیلگوں شروع پیدا ہوتی ہے، مشرقی لوگوں کے دانتوں سے زرد اور زنگیوں کے دانتوں سے سرخ شعاع نکلتی ہے۔ چنانچہ شکاگو کے کسی گندے نالہ میں ایک لاش پائی گئی جو بالکل پھول کر خراب ہو گئی تھی اور اس کی شناخت مشکل تھی۔ سرالبتہ ڈٹا ہوا تھا اس لئے اس کے مقتول ہونے کا یقین ضرور تھا۔ اب جستجو یہ ہوئی کہ آیا اسے چوروں نے ہلاک کیا ہے یا چینی آبادی میں قتل کیا گیا ہے۔ اس کا ایک دانت امتحان کے لئے بھجوا گیا اور اسے گھس کر شعاعی تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ مقتول مشرقی جنس کا ہے اور آخر کار اسی تحقیق سے یہ اکتشاف ہوا کہ چینیوں نے اسے مار کر نالہ میں پھینک دیا تھا۔

امریکہ میں ایک ماہر فن نے اسی شعاع کا آلہ بنا کر بازار میں پیش کیا ہے اور ہر شخص اسے خرید سکتا ہے، چنانچہ بنکوں میں عام طور پر اس کا استعمال شروع ہو گیا ہے اور نہایت آسانی سے کھرے کھوٹے سکے اور اصلی نقلی نوٹ کا پتہ چل جاتا ہے۔ یورپ کے بھی اکثر بنکوں میں اس قسم کے لمپ رکھے رہتے ہیں تاکہ جعلی نوٹ اور کاغذ مالی کا پتہ ان سے چلایا جائے۔ کیونکہ اصلی نوٹوں سے نیلگوں شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور نقلی نوٹوں سے

سبزی ہائل

مثلثی شیشوں سے جو شعاعیں نکل کر اپنی موجات منتشر کرتی ہیں۔ وہ بھی فواید سے خالی نہیں ہیں اگر

خورد بین تبر و عزائی کے ساتھ ان کا استعمال کیا جائے۔ چنانچہ ایک بار کوئی امریکی فلاح اپنے داماد کے ساتھ موٹر پر سوار ہو کر گیا۔ راستہ میں موٹر الٹ گیا اور بڈھا فلاح ایک پتھر سے ٹکر کر مر گیا۔ تفتیش کی گئی تو داماد نے بیان کیا کہ جس وقت پتھر سے موٹر ٹکرایا تو میں گود کر علیحدہ ہو گیا لیکن بڈھا فلاح نہ نکل سکا اور پتھر کے تصادم سے مر گیا۔ چند دن کے بعد معلوم ہوا کہ اس فلاح کو حال ہی میں کسی بیمہ کمپنی سے بڑی رقم ملی تھی اس لئے کچھ شبہ پیدا ہوا اور شعاعی عمل کیا گیا جس سے یہ پتہ چلا کہ بڈھے سر سے جو ریزے پتھر کے نکلے ہیں وہ اس پتھر کے ریزوں سے بالکل مختلف ہیں جس سے موٹر کا ٹکرا جانا بیان کیا جاتا تھا اور اس طرح اخیر میں یہ معلوم ہوا کہ داماد نے خود اپنے خسر کو ہلاک کر کے صورت ایسی پیدا کی تھی کہ کسی کو شبہ نہ پیدا ہو۔

الغرض یہ دور شعاعوں کا ہے اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اہل مغرب اسی سے کام لے رہے ہیں۔ لیکن ہندوستان کی کم علمی و جہل کا یہ عالم ہے کہ یہاں کی آبادی کا بڑا حصہ ابھی تک عمدمجری کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور اُسے بالکل خبر نہیں کہ قدرت کے کتنے عطیات کی طرف سے وہ محروم زندگی بسر کر رہا ہے۔

چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی رُوحوں کے ساتھ

اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا کے امن و سکون کا راستہ معلوم کریں تو اس کو ملاحظہ فرمائیے۔

ماذہب کا مذہب

وجود باری کے ثبوت میں بے مثل مضمون

حرکت کے کرشمے

اگر آپ قدرت کے کرشموں کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے ملاحظہ فرمائیں۔ تینوں ایک ہی جلد میں قیمت معہ محصول ایک روپیہ آٹھ آنے

منیجر نگار لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

طلسم زندگی | مجموعہ ہے اُن مختصر مضامین کا جو گزشتہ پندرہ سال کے اندر میاں بشیر احمد صاحب نے لکھے اور رسالہ ہمایوں میں شائع ہوئے۔

ان مضامین کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ مناظر کا عنوان رکھتا ہے، دوسرا حصہ صدائے روح کی سُرخی سے شروع ہوتا ہے، تیسرے حصے کا نام صدائے دل ہے۔ چوتھا جدوجہد سے موسوم کیا گیا ہے، پانچویں حصے میں سرگوشیاں ہیں اور چھٹا خیالات پریشاں کا مجموعہ ہے۔

یوں تو پنجاب میں اس وقت بہت سے انشا پرداز پائے جاتے ہیں، لیکن میاں صاحب نے اپنی سنجیدہ و متین روش کئی بنا پر وہاں کے مخصوص ادیبوں میں بھی ایک خاص درجہ امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ میاں صاحب آکسفورڈ کے گریجویٹ ہیں، بیرسٹر ہیں، اپنی معاشرت و معیشت کے لحاظ سے اچھے خاصے مغربی انسان ہیں، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ان کا دل مشرقی ہے، ان کا احساس و تاثر مشرقی ہے اور وہ اپنے ملک کی روایات قدیمہ کا احترام کرنے میں اگر ہندوستانی نہیں تو مسلمان ضرور ہیں۔ اور ان کی یہ خصوصیت ان کی تمام تحریروں میں پائی جاتی ہے، چنانچہ یہ کتاب بھی جس کا بہترین نام میری رائے میں صرف ”مجموعہ پریشانی“ ہونا چاہئے تھا، باوجود ادائے بیان کی مغزیت کے مشرقی روح سے خالی نہیں۔

اس کے اکثر مضامین اس انداز کے ہیں کہ اُن کو دیکھتے ہی انسان ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ شاید یہ انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں، لیکن جب طرز اداک کی اجنبیت سے کچھ انس پیدا ہو جاتا ہے تو ذہن انسانی الفاظ سے ہٹ کر معنی و مفہوم کو اہمیت دینے لگتا ہے جن کی نرمی و لطافت اور نزہت و پاکیزگی میں یکسر مشرقی ذوق کی ”بوئے خوشدلی“ محسوس ہوتی ہے۔

جو لوگ میاں صاحب کی بلند فطرت، سلجھی ہوئی طبیعت اور ستھرے ذوق سے واقف ہے۔ وہ اس مجموعہ کو دیکھنے کے بعد یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ

“He has put much of himself into it”

اس میں بارہ رنگین و سادہ تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں جو سوائے ایک دو کے سب کی سب نہایت پاکیزہ اور فنی نقطہ نظر سے قابل داد ہیں۔ اس زیبائش و تجمل کے علاوہ جا بجا رنگین لوجوں سے بھی دعوت نظر کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ اور طباعت و کتابت کی پاکیزگی اور جلدوں خوشنائی نے تو اور بھی عروس جمیل و لباس حریر کا منظر پیش کر دیا اس کی قیمت پانچ روپیہ، مسلمانوں کی اقتصادی پستی کے لحاظ سے ممکن ہے زیادہ ہو، لیکن دل پر شوق "رومانی" میں اس سے بھی زیادہ قربانیاں کر سکتا ہے۔

مجموعہ ہے جناب مانی جالسی کی غزلوں اور نظموں کا جسے خود انھوں نے شائع کیا ہے اور اس **نقوش مانی** احتیاط کے ساتھ کہ "جس کتاب پر مصنف کے دستخط نہ ہوں وہ مشروطہ تصور ہوگی۔" — یہ گویا قانونی جواب ہے۔ دیوان ظہیر فاریابی کے اس شعر کا جس میں "در مکہ بذر درگربابی" کی ترغیب دی گئی ہے۔

ابتدا میں چند صفحات مانی صاحب نے اپنے حالات زندگی کے لئے وقف کئے ہیں اور پھر "فلسفہ عشق" کی نظم سے اس مجموعہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ جو دسمبر ۱۹۵۷ء میں جناب مانی نے لکھی تھی۔ سب سے آخری صفحہ نومبر ۱۹۵۷ء کی لکھی ہوئی غزل پائی جاتی ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب میں ۱۹ سال کا مجموعہ انکار "بین الدفتین" کیا گیا ہے۔ یوں تو ۱۹ سال کی عمر عنفوان شباب کی عمر سمجھی جاتی ہے، لیکن ایک شاعر کو اتنے زمانہ بغیر بوڑھے ہوئے میسر نہیں آتا اس لئے باوجود اس کے کہ جناب مانی نے اپنی تاریخ پیدائش کے بیان سے احترا کیا ہے (شاید اس لئے کہ "عالم امکان" سے ابھی تک ان کی بہت سی توقعات جمیل وابستہ ہیں) یہ راز کھلے بغیر نہیں رہتا کہ اس وقت جناب مانی کا شمار پختہ تر عمر شعرا کے سلسلہ میں ہونا چاہئے۔ اور اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر ان کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

مانی صاحب ملک کے ان شعرا میں سے نہیں ہیں جو ہند کے ہر گوشہ میں معروف و مشہور ہیں۔ اور نہ غالباً کچھ انھوں نے اس کی کوشش کی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ بعض مخصوص حلقوں میں ان کی شاعری کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور مشاعرہ میں بھی وہ کافی داد حاصل کر لیتے ہیں وہ نظموں بھی لکھے ہیں۔ اور

۱۔ پنجاب میں اب عام طور پر "نکتہ نظر" لکھتے ہیں۔ اگر یہ خرابی صوتی (Phonetic) قسم کی ہے یعنی اہل پنجاب نقطہ کو جو نکتہ بولتے ہیں۔ اس لئے لکھتے بھی ایسا ہی ہیں تو خیر، ورنہ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ بالکل غلط ترجمہ (Point of view) کا ہے۔ تفصیل کے لئے 'جنوری ۱۹۵۷ء' کا شمار ملاحظہ ہو۔

غزلیں بھی، تفسیریں کا بھی انھیں شوق ہے اور قطعات کا بھی، لیکن سب میں ان کا وہی ایک رنگ ہے جو ایک ایسے عاشق کا ہوا کرتا ہے۔

یقیناً ان کے کلام جوش و سرسستی نہیں ہے، رندی و بیباکی نہیں پائی جاتی، معنی آفرینی و بلند خیالی مفقود ہے، ندرت ادا و جدت بیان کا پتہ نہیں، جدید تعبیرات شاعرانہ کا نشان نہیں، لیکن ایک قسم کا سوز و گداز ضرور ہے جس میں بجائے فتادگی کے انقباض کی کیفیت زیادہ نمایاں ہے۔ اور غالباً اسی لئے ان کی شاعری دل کو متاثر تو کرتی ہے لیکن بیتاب نہیں بناتی۔ ایک اور خصوصیت ان کی شاعری کی جس میں کمتر شعراء ان کے ہمسر نظر آتے ہیں، اس کا فنی غلطیوں سے پاک ہونا ہے۔ ان کا کلام دیکھنے کے بعد انسان پر کوئی اور اثر ہو یا نہ ہو لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ شاعر جو کچھ کہتا ہے بہت سمجھ بوجھ کر کہتا... ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کا کلام اغلاط و اسقام سے پاک ہو۔

آپ لکھنؤ اسکول کے شاعر ہیں لیکن صحیح رنگ تغزل کے نمونے بھی آپ کے کلام میں کافی نظر آتے ہیں۔ مثلاً :-

میں نہیں سمجھا خدا کے واسطے سمجھائے آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کیا کہدیا کیا کر دیا

نہیں فرصت تہوگی کشمکشائے تمنائے مگر جی چاہتا ہے یہ کہ تم ہو میرے تابو میں

اجازت دیجئے رفیقی اب تو دل کی حالت پر بہت اچھا میں آمادہ ہوا ترک محبت پر

گلہ بیجا بھی کرتا ہوں کہ اُس جلوہ کا شایان ہو ندامت سے جو اک دن آپ کے روتے حسین پڑھا

جانبر نہ ہوا میں یہ جدا بات ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ہر شام کی ہوتی ہو سحر بھی

جاؤ بالیں سے اٹھو تو، موت کو آنے تو دو چین سے بیٹھیں نہیں دیتے ہو، مریاں تو دو

یہ مجموعہ مجلد شائع ہوا ہے اور دو روپیہ میں دفتر رسالہ تسنیم آگرہ سے مل سکتا ہے۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۶۴ صفحات کا ہے اور کتابت و طباعت کافی دلکش ہے۔

قیام جمہوریت اور موجودہ دور ترقی کے حالات وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کی ترتیب میں پوری کاوش سے کام لیا ہے اور ترکوں کی قدیم ذہنیت سے لیکر موجودہ ذہنیت کے عہد تک جو انقلابات تاریخی و سیاسی رونما ہوئے ہیں ان کا پوری طرح استقصاء کیا گیا ہے۔ اس وقت تمدن و معاشرت میں جو انقلاب پیدا ہوا ہے اس سے بھی بحث کی گئی ہے لیکن زیادہ آزادی کے ساتھ نہیں، غالباً اس لئے کہ مصنف بہ حیثیت ملازم ہونے کے کوئی ایسی بات نہ کہہ سکتے تھے جو عام مسلمانوں کو ان سے بدظن کر سکے۔ بہر حال کتاب مطالعہ کے لائق ہے اور جو حضرت ترکی کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کتاب میں کافی سامان دلچسپی موجود ہے۔ قیمت پندرہ روپے اور ملنے کا پتہ — مکتبہ جامعہ ملیہ قرون باغ دہلی۔

یہ کتاب حکیموں لال بی اس بی کی تصنیف ہے جو عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں بیچوں کی ساخت، ان کے نشوونما، جڑوں کے اقسام وغیرہ تمام ان مسائل پر گفتگو کی ہے جو مبادی علم نباتات کہلاتے ہیں۔ کتاب نہایت دلچسپ انداز بیان میں لکھی گئی ہے اور جابجا نقوش و تصاویر سے مسائل کو بہت زیادہ قریب الفہم بنا دیا گیا ہے۔

مبادی نباتات

اصطلاحات کا ترجمہ بھی صاف و سلیس کیا گیا ہے۔ اور عبارت کا تسلسل بھی کافی دلچسپ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کی کتابیں نہ صرف لڑکوں بلکہ لڑکیوں کے نصاب میں بھی داخل کی جائیں تاکہ ان میں شروع ہی سے اصول فطرت کی جستجو کا ذوق پیدا ہو۔ اس کی قیمت ۱۰ روپے اور مصنف سے مکان ۱۰ رزیدنسی حیدرآباد کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

معاشیات کی ابتدائی کتاب ہے جسے آغا محمد اشرف صاحب بی۔ اے نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کے چار حصے ہیں اور بارہ ابواب۔ پہلے حصہ میں معاشیات کی تعریف،

مبادی علم المعیشت

دولت کے مفہوم اور ضروریات زندگی پر گفتگو کی ہے۔ دوسرے حصہ میں پیداوار دولت اور عاقلین پیدایش سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرے حصہ میں زر، تبادلہ اور بنک کا بیان ہے، چوتھے میں تقسیم دولت کو مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انداز بیان بہت صاف و سلیس ہے اور اصطلاحات کا ترجمہ بھی اچھا کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ معاشیات کے ابتدائی مسائل سے طلبہ کو ثانوی تعلیم ہی کے سلسلہ میں آگاہ کیا جائے اور اس مقصد کے لئے یہ کتاب بہت اچھی ہے۔ اس کی قیمت ۱۲ روپے اور شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتی ہے۔

یہ ترجمہ ہے جے۔ سی مکن ریپا کی اس مشہور کتاب کا جس میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ اقتصادی

مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب

حالت پر مالیات عامہ نے کیا اثرات پیدا کئے ہیں۔ ترجمہ قاضی محمد حسین صاحب نے کیا ہے اور بہت آسان ہے۔ اس کتاب میں متعدد لفظی دئے گئے ہیں، جن سے ہندوستان کی تناسب آبادی۔ زراعتی پیداوار، درآمد برآمد، تجارتی تعلقات اور انتظامات ملکی، وغیرہ کا حال معلوم ہوتا ہے۔ فن معاشیات کا ذوق رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قریب باغ دہلی سے مل سکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

جموعہ ہے اس۔ آر۔ خاتون کے تیرہ افسانوں کا جو مقاصد و نتائج کے لحاظ سے سنجیدہ و متین ہیں اور زبان کے لحاظ سے ناقابل اعتراض۔ اخیر میں ایک ڈرامہ بھی ہے جس کا تعلق عمدہ عبا سے ہے۔ کاشکہ ان افسانوں کی زبان میں وہی لوج اور عبارت میں وہی مساختہ پن ہوتا جس کی توقع ایک عورت سے کی جاتی ہے۔ کتابت و طباعت بہت پاکیزہ ہے اور پیر میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے مل سکتا ہے۔

کیمیاگر اور دوسرے افسانے محمد مجیب صاحب (آگسٹ) انچارج پریس جامعہ ملیہ دہلی کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو مجیب صاحب کے افسانے ملک میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک خاص مقصد و نتیجہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان کے افسانہ نویس کی خصوصیت ان کی سیرت نگاری ہے جو معمولی گفتگو اور معمولی واقعات کے ذریعہ سے پیش کی جاتی ہے۔ ہلکا سا مزاحی رنگ بھی ان کے افسانوں میں پایا جاتا ہے جو دور حاضر کی افسانہ نگاری کی جان ہے۔ یہ مجموعہ جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

مختصر سا ڈرامہ ہے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پروفیسر جامعہ ملیہ کا جس میں بتایا گیا ہے ہے کہ اگر شریر بچوں کی تربیت شروع سے صحیح اصول پر کی جائے تو ان کی شرارت سے بھی مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ زبان کی سلاست اور پلاٹ کی خوبی کے لحاظ سے کسی تنقید کی ضرورت نہیں کہ فاضل مصنف کا نام اس کی کافی ضمانت ہے۔ یہ ڈراما جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

صد زبول مختصر سا ڈرامہ ہے جناب اشتیاق حسین قریشی کا جس میں مسئلہ ازدواج پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور بغیر کامل تراشی طرفین کے جو بڑے نتائج پیدا ہوتے ہیں ان پر روشنی ڈالی ہے۔ فاضل ڈرامہ نگار کا مقصد اس ڈرامہ سے یہ ہے کہ لڑکیوں کو پوری جسارت سے کام لے کر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرنا چاہئے اور سوسائٹی کے موجودہ ظالم اصول کو توڑنا چاہئے۔ اشتیاق صاحب اس وقت کے بہترین ڈرامہ نگاروں میں سے ہیں اور زبان و پلاٹ ہر لحاظ سے وہ نہایت مکمل چیز پیش کرتے ہیں۔ یہ ڈراما نہایت سخت قسم کی ٹیڈی ہے۔ اور نہ صرف لڑکیوں بلکہ لڑکیوں کے والدین کے لئے بھی اس کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ ان

کے استبداد کے نتائج کس حد تک دردناک بن سکتے ہیں۔۔۔۔۔ ملنے کا پتہ جامعہ ملیہ دہلی ہے۔ قیمت درج نہیں۔

خواجہ محمد عبدالحی فاروقی کی تالیف ہے جس میں آدم سے لے کر مسیح تک ۱۵ پیغمبروں کے مختصر حالات درج کئے گئے ہیں۔۔۔۔۔ اس تالیف کا مقصد بچوں کے اخلاق پر اثر

بیبوں کے قصے

ڈالنا ہے ذہبیات کے ذریعہ سے جس میں عقل کو مطلق دخل نہیں ہے۔۔۔۔۔ میرے نزدیک اب دنیا کو اس قسم کی کتابوں کی ضرورت نہیں ہے اور نہ بچوں کی عقلیں کند کرنے کے لئے ان کو مافوق الفطرت باتوں کا یقین دلانا کسی طرح مفید ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ اگر ان قصوں میں صرف اتنے حصوں سے بحث کی جاتی۔ جن کا تعلق محض واقعات یا اخلاقیات سے ہے تو کوئی حرج نہ تھا۔۔۔۔۔ قیمت ۲ روپے اور ملنے کا پتہ جامعہ ملیہ دہلی

اس کتاب میں مرحومہ سیدہ خاتون نے یورپ و امریکہ کی ان چند خواتین کے حالات

دیکھے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی دوسروں کی خدمات کے لئے وقف کر دی تھی۔ موضوع کے لحاظ سے کتاب نہایت مفید اور عبارت کے لحاظ سے بہت پسندیدہ ہے۔۔۔۔۔ اس مجموعہ میں گیارہ خواتین کے حالات درج ہیں اور ان میں جامعہ ملیہ سے مل سکتا ہے

خادات خلق

میر حسن صاحب مدیر مجلہ عثمانیہ حیدرآباد نے یہ کتاب تالیف کی ہے۔۔۔۔۔ موضوع نام سے ظاہر ہے اور افادیت اسکی موضوع سے مترشح۔ وہ لوگ جو خالص ادبی ذوق رکھتے ہیں اور مشرق و مغرب دونوں جگہ کی شاعری پر متقابلاً نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے یہ کتاب خصوصیت کے ساتھ قابل قدر ہے۔۔۔۔۔ اس کی متعدد نظموں کا ترجمہ بھی شونٹا پیش کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ اچھا ہوتا اگر فٹ نوٹ میں ساتھ ہی ساتھ انگریزی نظمیں بھی درج کر دی جائیں۔۔۔۔۔ کتاب مجلہ شائع ہوئی ہے۔ اور پھر میں نکتہ ابراہیم حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

ورڈ سوئور تھ اور اس کی شاعری

نظامی عروضی سمرقندی کا چہار مقالہ فارسی کی نہایت مشہور کتاب ہے جو ساتویں صدی کی ابتدا میں لکھی گئی۔۔۔۔۔ یہ کتاب چار مقالوں پر مشتمل ہے جس میں دوسرا مقالہ علم شعر پر ہے۔ یہ کتاب نہایت اہتمام کے ساتھ سیڈن میں بھی چھپ چکی ہے لیکن اب رام نرائن لال کتب فروکش الہ آباد نے اسے شائع کیا ہے اور مولوی محمد رفیع صاحب نے مختلف نسخوں سے مقابلہ کر کے اس کو مرتب کیا ہے۔۔۔۔۔ چونکہ یہ کتاب فارسی امتحانات میں داخل نصاب ہے اس لئے ضرورت تھی کہ کوئی دستاگر صحیح نسخہ اس کا پیش کیا جاتا۔ امید ہے کہ مولوی صاحب موصوف کی یہ کاوش محنت و نظر استحسان دیکھی جائے گی۔ کتاب مجلہ شائع ہوئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ ہے۔

چہار مقالہ

تاج آفرینش | مصر کی ایک خاتون ملک خانم کے چند نسوانی اصلاحی مقالات کا ترجمہ مولوی

ابوالحمید نعمانی نے اس نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں زیادہ تر مضامین اردو واجی زندگی کے متعلق پائے جاتے ہیں اور مصری خاتون کے جدید دور اصلاح و بیداری کے آثار و علامتوں میں سے ہیں۔ ابوالحمید صاحب کو عربی مقالات کے ترجمہ کرنے کا کافی ملکہ حاصل ہے اسی لئے ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے اور مفہوم کو پوری طرح جا دمی ہے۔ یہ کتاب دائرہ اجمل بمبئی کے سلسلہ مطبوعات کی پہلی کتاب ہے اور ۱۰۰ میں وہاں سے مل سکتی ہے۔

آیات مبینات سلسلہ تالیفات تعلیم القرآن کا یہ نواں رسالہ ہے جسے مفتی مولوی محمد الدین صاحب وکیل گجرات نے مرتب کیا ہے۔ اس رسالہ میں نماز کی حقیقت، اس کا مقصد اور اس کے شرائط و ارکان سے بحث کی گئی ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ ہر چیز علمی نقطہ نظر سے دیکھی جا رہی ہے اس قسم کی تصانیف کا پیش کیا جانا یقیناً ایک حد تک مفید ہے کیونکہ اسی سلسلہ میں ایک وقت وہ بھی آئے والا ہے جب منقولات سے بالکل علیحدہ ہو کر صرف منقولات پر مذہب و ارکان مذہب کی بنیاد قائم ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ یہی ذوق تالیف و تصنیف ایک دن اس خدمت کو بھی پورا کر سکے۔ قیمت ۸ روپے اور مفتی نذیر احمد - دائرہ بلوچاں گجرات سے مل سکتی ہے۔

سرکار دو عالم سیرۃ ہے آنحضرت کی جسے مولوی محمد حسین صاحب ندوی نے مرتب کی اور مکتبہ جامعہ قزول باغ دہلی نے شائع کی۔ یہ کتاب ایک مختصر سا رسالہ ہے، ۱۰۰ صفحات کا لیکن اس کے دیکھنے سے یہ بات نہیں معلوم ہوتی کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ اور کس خاص نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر اس کو مرتب کیا گیا ہے۔ غالباً بچوں کے لئے اس کو مرتب کیا ہے لیکن اس مقصد کے لئے بھی کسی کتاب میں اس سے قبل اس موضوع پر شائع ہو چکی ہیں۔ قیمت ۸ روپے۔

خلفاء اربعہ خواجہ محمد عبدالحی صاحب فاروقی نے خلفاء اربعہ کے مختصر حالات اس ۱۴۸ صفحہ کی کتاب میں یکجا کر دئے ہیں۔ وہ لوگ جو مختصر طور پر خلفاء کے حالات سے آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب اچھی ہے۔ قیمت ۱۰ روپے ملنے کا پتہ جامعہ ملیہ دہلی

بچوں کا انصاف محمد عبدالغفار مدہولی کا لکھا ہوا۔ ۴۰ صفحات کا ڈرامہ ہے جو بچوں ہی کے پڑھنے کے لائق ہے۔ ۴ روپے میں مکتبہ جامعہ ملیہ سے مل سکتا ہے۔

حقیقت علمی شاعری یہ ایک مثنوی ہے جس میں جناب مولوی نصیر الدین حسین صاحب بیہسٹر عظیم آبادی نے شاعری کی حقیقت، اس کی تاریخ، مختلف ملکوں کی شاعری کی خصوصیات بیان کر کے آخر میں اردو شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ایسے علمی موضوع پر نظم میں کوئی کتاب لکھنا آسان نہیں لیکن اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف اپنے فرض سے بہت خوبی کے ساتھ عمدہ برآ ہوئے ہیں اور ان کی قدرت شاعری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ قیمت ۵ روپے اور غالباً

معارف پریس اعظم گڑھ سے مل سکتی ہے۔

قاتلان حسین کا مذہب مولوی سید علی نقی صاحب مجتہد کا ایک مضمون اخبار سر فراز میں مسلسل درج ہوا تھا، اسی کو اب امامیہ مشن لکھنؤ نے رسالہ کی صورت میں شائع کیا ہے۔ موضوع نام سے ظاہر ہے اور اس میں شک نہیں کہ طرز استدلال کی خوبی اور انداز بیان کی سلاست و روانگی قابل داد و ستایش ہے۔ اس رسالہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قاتلان حسین اسلام سے دور کا بھی علاقہ نہ رکھتے تھے اور بڑی حد تک وہ اس کے ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اگر اسلام نام ہے واقعی خدا اور رسول کے علاوہ کسی اور ہستی پر بھی ایمان لانے کا۔ ہر میں دفتر سر فراز لکھنؤ سے یہ رسالہ مل سکتا ہے۔

وجود حجت یہ رسالہ بھی مولوی سید علی نقی صاحب کے اجتہاد و فکر کا نتیجہ ہے۔ اس میں مہدی موعود کی پیشین گوئی کو حقیقت ثابتہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور امام غائب کے وجود سے انکار کو ایک لغو و مہمل خیال بتایا گیا ہے۔ مہدی موعود کا ظہور اسلام کے تمام فرقوں نے مانا ہے اور کثرت سے منقوی دلائل اس باب میں پیش کئے جاتے ہیں، لیکن روایات سے ہٹ کر کوئی ایک دلیل بھی اس وقت تک ایسی پیش نہیں کی گئی جو ایک غیر مسلم کو قائل کر سکے۔ مذہبیات کے سلسلہ میں اس وقت ایسی کتابوں کی ضرورت نہیں۔ جو روایات کو دہرانے والی ہوں بلکہ ضرورت ہے ایسی کتابوں کی جو روایات کو بالکل پس پشت ڈال کر صرف عقل انسانی سے اپیل کرنے والی ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کام نہ آسان ہے، نہ ممکن اس لئے مسلمان علماء کا محبوب مشغلہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ ایک ہی راگ کو مختلف سازوں سے بلند کرتے رہیں خواہ سننے والا اس کی یکسانیت سے بیزار ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اسکی قیمت ۴ روپے اور دفتر سر فراز لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

ہمارا دین سید نواب علی رضوی ام۔ اے پرنسپل بہار الدین کالج جو ناگڑھ نے ۲۲ صفحات کے اس رسالہ میں ارکان خمسہ اسلام کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ حیرت ہے کہ اتنا اہم موضوع کیونکر چند صفحات میں سما سکا۔ میرے خیال میں یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ ہے۔ قیمت ۲ روپے اور غالباً مصنف سے مل سکتا ہے۔

فلسفہ رمضان اس رسالہ میں کسی صاحب مولانا احمد نے رمضان کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ شکر ہے کہ اب مذہبی معاملات میں فلسفہ کا شمول ہونے والا ہے۔ معلوم نہیں یہ احترام مذہب کا ہے یا فلسفہ کا۔ یہ رسالہ ریاض توحید نواب گنج دہلی سے مفت ملتا ہے۔

جنگِ مستقبل کا دُورینی مطالعہ

۱۳ اگست ۱۹۴۰ء کا ایک تار

(جو میدانِ جنگ سے ایک اخبار کے نمائندہ نے پھینچا)

کل شہر نیویارک اور مضافات کے ۶۰ لاکھ آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس کی مختصر داستان یہ ہے کہ کل اتحادیوں کے ۶۰۰ طیارے دفعۃً نمودار ہوئے اور انہوں نے ڈایونل کلور وارسین اور کاگوڈیل ایسوسیانید گیسوں کی نہایت کثیف چادر تمام فضا میں پھیلا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام غورتیں، مرد اور بچے ہلاک ہو گئے کوئی جانور بھی نہ بچا۔ اور نباتات بھی خشک ہو گئے۔ اس کے بعد جب ہوا چلی اور زہریلی گیس پھیلی تو دُور دُور کی بستیوں کے بھی ۲۰ لاکھ آدمی فنا ہو گئے۔ اسی طرح دنیا کے اور مختلف شہروں میں بھی گزشتہ دس گھنٹے کے اندر ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ آدمی زہریلی گیس سے فنا ہو چکے ہیں۔

آج نیویارک، لندن، چارلس، بروکسل، برلن، اور وائنا کھنڈر ہو کر رہ گئے ہیں۔ کیوں کہ طیاروں کے ہجوم اور گیس کے حملے نے وہاں بھی کسی تنفس کو زندہ نہیں چھوڑا۔ اس جنگ کا سبب یہ ہوا کہ بندرگاہ سائیک کے متعلق دُول ارض میں اختلاف تھا اور کامل پانچ دن سے گفت و شنود ہو رہی تھی۔ امریکہ بالکل غیر جانبدار تھا۔ کل صبح اس مسئلہ میں دو فریق ہو گئے۔ جن سے ایک کا نام اتحادیوں ہے۔ اور دوسرے کا حلفاء اور اتحادیوں نے کل ۴ بجے صبح بین الاقوامی مجلس فیصلہ کو بمقام لاہائی اطلاع دی کہ وہ اس کا فیصلہ ماننے کے لئے طیار نہیں۔ امریکہ نے بین الاقوامی مجلس کا ساتھ دیتے ہوئے اتحادیوں کے خلاف کل ساڑھے چھ بجے صبح اعلانِ جنگ کر دیا اور نتیجہ وہ ہوا جس کا حال میں نے ابھی بیان کیا۔ لوگوں

کے پھیپھڑے زہریلی گیسوں کی وجہ سے پھٹ پھٹ گئے۔ اور جو جہان تھا وہیں دم توڑنے لگا۔

میں خود کارسن ہوا باز کے ساتھ ایک طیارہ پر چڑھ کر تحقیق حالات کے لئے روانہ ہوا۔ ہم دونوں نے محفوظ گیس نقاب اپنے چہروں پر ڈال لی تھی اور فولادی نلکیوں میں اتنی مقدار آکسیجن کی بھری تھی کہ ۹ گھنٹے تک کام دے سکے۔ ہم لوگ صبح سات بج کر ۲۸ منٹ پر نیویارک میں اترے اور تمام سڑکوں پر مکانوں کے اندر کامل سات گھنٹے تک جستجو کی لیکن ایک شخص بھی زندہ نہ ملا۔ ہوا میں اب بھی کچھ کچھ گیس کا اثر باقی ہے اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ۶۰ لاکھ آدمی جو کل تک چل پھر رہے تھے، ہنس بول رہے تھے آج جسم بے جان نظر آ رہے ہیں۔ شہر کے کاروباری حصوں میں اور کارخانوں کے اندر لاشیں کبھی ہوئی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ ہوا۔ بالکل اچانک ہوا۔ اور اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ چند منٹ پیشتر اس حملہ کی اطلاع مل جاتی اس لئے شہر کی تمام آبادی اپنے اپنے کام میں مصروف تھی کہ دفعۃً یہ بلانا ازل ہوئی۔ لاشوں کے دیکھنے سے عجیب و غریب منظر سامنے آگئے۔ ایک شخص کی لاش ایسی حالت میں ملی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب گیس اس کی ناک تک پہنچی تو اپنے دونوں بازو سے اسے منہ چھبانا چاہا۔ اس کے پاس ہی اس کی گھڑی ٹوٹی ہوئی ملی جو ۲ بج کر ۵۹ منٹ پر بند ہوئی تھی۔ اور چونکہ یہ حملہ ۲ بج کر ۵ منٹ پر ہوا تھا۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱ منٹ کے اندر ہی اندر دنیا کے گرد و لاکھ آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ بنکوں میں، کارخانوں میں، دفاتروں کے اندر، گھروں میں، سڑکوں پر الغرض جہاں تک جا رہی ہے، سوائے لاشوں کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ ڈاک خانہ میں دیکھا۔ کہ پوسٹ ماسٹر اپنی میز کے پاس ہی مرا ہے لیکن رومال اس کے منہ پر رکھا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے گیس سے بچنے کی پوری کوشش کی۔ بڑے بڑے محل ویران پڑے ہیں، قیمتی فرنیچر، ریشمی پردے، نفیس نفیس برتن سب اپنی اپنی جگہ بدستور موجود ہیں، لیکن ان کا استعمال کرنے والا کوئی نظر نہیں آیا۔ بنکوں میں نوٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، اشرفیوں کا انبار نظر آتا ہے، مگر نہ کوئی انکا چرانے والا باقی رہا نہ حفاظت کرنے والا۔

مشرقی حصہ شہر میں آگ لگی ہوئی ہے اور اب تک مختلف رنگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ کیونکہ اس حصہ شہر میں کارخانے تھے اور جب گیس نے یہاں کے کام کرنے والوں کو ہلاک کر دیا تو بوائلر اور روشن گیس کے نل پھٹے جنھوں نے چاروں طرف آگ پھیلا دی۔ اور عمارتوں کے سیمنٹ اور فولاد کے جلنے سے رنگین شعلے بلند ہونے لگے، اب بھی گاہے گاہے مختلف عمارتوں سے دھماکوں کی آوازیں آرہی ہیں

اس وقت نیویارک کے مکاناتوں، سڑکوں اور دفاتروں میں ۴۰ لاکھ لاشیں پڑی ہیں اور جب تک ان کو اٹھا کر کہیں پھینکا نہ جائے یہ شہر دوبارہ آبادی کے قابل نہیں ہو سکتا۔ مشرقی حصے کی لاشیں تو خیر جل کر خاک سیاہ ہو گئی ہیں ورنہ ۲۰ لاکھ لاشیں یہاں کی بھی ہٹانا پڑتیں۔

اخبار نیویارک ٹائمز کے دفتر میں جا کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہاں کے لوگ اپنے اپنے کام میں بالکل اخیر وقت تک مصروف رہے، کیونکہ ان کو کچھ دیر قبل اس حملہ کا حال معلوم ہو گیا تھا اور انہوں نے کھڑکیاں بند کر لی تھیں، لیکن جب گیس ان کمروں میں بھی پہنچی تو جو شخص جس جگہ جس حال میں بیٹھا تھا وہیں مر گیا۔ ایک کلرک آلہ تلفون کے سامنے بیٹھا بیٹھا مر گیا اس حال میں کہ دو برقی پیغام اس کے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کی عبارت یہ ہے:۔

” امریکن بیرے کے طیاروں نے جو بحر اٹلانٹک میں متعین ہیں، تین ہزار دیکھے جن پر اتحادیہین کے طیارے موجود تھے۔ امریکہ کے طیاروں نے ان کو گیارہ ہزار گز کے فاصلہ سے دیکھ لیا تھا۔ جب قریب آئے تو وہ پانی میں ڈوب گئے۔ لیکن امریکن امیرالبحر کا خیال ہے کہ یہ صرف دھوکا ہے اور ان کا نیویارک پر حملہ کرنا یقینی ہے۔ دوسرے پیغام میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ

” وزارتہ حربیہ اتحادیہین کے طیاروں کا مقابلہ کرنے کے لئے بالکل آمادہ ہے، امریکہ نے اپنے آپ کو طیاروں کے حملہ سے بالکل محفوظ کر لیا ہے اور ان کی بربادی کے لئے خاص توپیں موجود ہیں۔“

لیکن افسوس ہے کہ امریکہ کی کوئی احتیاط مفید ثابت نہ ہوئی اور اتحادیہین اپنا کام کر گئے۔

جس وقت حملہ ہوا تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگ دعا کے لئے جوق در جوق کلیساؤں کی طرف دوڑے ہوئے گئے۔ کیونکہ ڈیڑھ ہزار لاشیں تو کلیسائے ٹرنٹی میں پڑی ہوئی ہیں، دو ہزار کلیسائے پارک میں، ۴۰۰ کینسہ عمانویل میں اور ۸۰۰ کینسہ ریور سائڈ میں۔ ایک کلیسے کے اسپتال میں پہنچے تو دیکھا کہ ایک ڈاکٹر آلات جراحی کی میز کے سامنے مردہ پڑا ہوا ہے، ایک مریض نے جس پر عمل جراحی ہونے والا تھا، جراحی کی میز پر دم توڑ دیا۔ دوسری جگہ ڈاکٹر کسی مریض کا کان دیکھتے دیکھتے رہ گیا اور ایک ڈاکٹر مطالعہ کرتا ہوا مر گیا، ایک کتاب اس کے سامنے کھلی ہوئی رکھی ہے اور وہ صفحات سامنے ہیں جن میں اڈرنیالین کا بیان درج ہے۔

کولمبیا یونیورسٹی کی عمارت میں پہنچے تو دیکھا کہ وہاں کا پرنسپل لائبریری کے دروازہ پر مردہ پڑا ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ باہر دیکھنے کے لئے جا رہا تھا کہ اسی وقت گیس کا سب گرا اور سب کو ہلاک کر گیا۔ نیویارک کے اکثر لڑکے مدرسوں ہی میں مرے کیونکہ ابھی تک وہ گھروں کو نہ لوٹے تھے۔ ایک مدرسہ میں جہاں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں پڑھتی تھیں دیکھا کہ معلم پڑھاتے ہی پڑھاتے مر گئی اور لڑکیاں جو سامنے اپنی اپنی میزوں پر لکھ رہی تھیں اسی حال میں فنا ہو گئیں، اس وقت اس لڑکیاں لکھنے میں مصروف تھیں اور سب کی سب اپنے سروں کو ہاتھوں پر رکھے ہوئے تھیں۔

زمین دوزریلوے لائن دیکھنے کی ہمت ہم نے نہیں کی کیونکہ تمام سرنگیں لاشوں سے بیٹی پڑی ہیں یہی حال بالائی ریلوے لائن اور اس کے اسٹیشنوں کا ہے۔

خیال ہوا کہ ممکن ہے نیویارک کی سربفلک عمارتوں کے بالائی منزلوں کے لوگ کچھ بچ گئے ہوں کیونکہ گیس وزنی ہوتی ہے اور اوپر کی طرف نہیں چڑھتی چنانچہ ہم ایک عمارت میں گئے اور وہاں کے لفٹ پر سوار ہوئے مگر معلوم ہوا کہ وہ بیکار ہو چکا ہے اور تار کٹ گیا ہے۔ بھر جو نیک ہماری آکسیجن کی مقدار کم ہوتی جا رہی تھی اس لئے زمینوں کے ذریعہ سے اور زیادہ چڑھ کر اوپر پہنچنے کی ہمت نہ ہوئی۔ تاہم ساتویں منزل تک تو کوئی شخص زندہ ملا نہیں۔

سنٹرل پارک کی تمام گھاس خشک ہو گئی ہے، بلودھے مڑھائے گئے ہیں اور درخت جھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہم نے چار ہزار فٹ کی بلندی تک اپنے چہروں سے محافظ گیس نقاب نہیں اتاری کہ مبادا اس کا اثر باقی ہو۔ لیکن جب اس سے زیادہ بلند ہو گئے تو صاف ہوا ملی اور وہاں پہنچ کر میں نے ایک اخبار نکالا جو مجھے وہاں کسی مکان میں ملا تھا اور اُسے دیکھنے لگا۔ اس اخبار میں ایک ایڈیٹوریل نوٹ اس مضمون کا بھی نظر آیا کہ ”امریکہ دشمنوں کے حملہ سے بالکل محفوظ ہے اور امریکہ کی فوج نہایت کامیابی سے طیاروں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔“ میں یہ پڑھ کر اپنے جی میں بہت ہنسنا۔

اب ہم لوگ فلاڈیلفیا کی طرف جا رہے ہیں اور ٹائپ رائٹر میرے سامنے رکھا ہوا ہے جس پر میں یہ پیغام ٹائپ کر رہا ہوں۔

تھا۔ ایک دن شام کو اسے اپنی بیوی اور ممالوں سے کہا کہ میں باغ میں ٹہلنے کیلئے جا رہا ہوں۔ وہاں پہنچ کر اس نے جیب سے پارہ کی ٹکلیاں نکال کر کھائیں، پھر استراحت نکال کر اپنے ہاتھ کی سٹرائین کاٹ ڈالیں۔ ہر چند یہی دونوں طریقے جان لینے کے لئے کافی تھے لیکن اسے اسی پر کفایت نہیں کی بلکہ سر کے کے پیپے میں کود پڑا۔ اور انتہائی تکلیف کے ساتھ اپنی جان دی

(۴) بعض لوگ آسان ذرائع سے خودکشی کرنا چاہتے ہیں اور بعض انتہائی تکلیف کی صورت اختیار کرتے ہیں چنانچہ روس کی ایک امیرہ (پرنس آنا و بلفسکی) پیرس کے مشہور بلند برج ایفل سے کودی لیکن بجائے اسکے کہ وہ باہر کی طرف کودتی اندر کی طرف کودی اور لوہے کی سلاخوں سے ٹکرا کر اپنی جان دی

(۵) ونیس کا ایک شخص (ماتیلو لوفات) سخت مذہبی خیال کا آدمی تھا۔ اسے مسیح کے متبع میں اپنے آپ کو مصلوب کر کے جان دی یعنی پہلے تو اپنے ہاتھ پاؤں میں کیلیں ٹھونک کر تختہ کے ساتھ جڑیں اور پھر اس صلیب کو اپنے گمے کی کھڑکی سے چھت میں لہتی باندھ کر اس طرح لٹکایا کہ وہ آہستہ آہستہ زمین کی طرف آئے لیکن زمین تک نہ پہنچ سکے۔

(۶) روس کی ایک مشہور رقاصہ تھی اسے اپنے ایک محبوب کے ساتھ ملکر اس طرح خودکشی کی کہ دونوں ایک ساتھ اوپر اباؤس کی بلند ترین چھت سے کود پڑے۔

دو سال ہوئے ارکاڈیا (امریکہ) کے ایک آدمی نے صوبہ فلوریڈا میں دو بڑے سانپ لہے اور جب **سانپ کا گوشت** انکی کھال کھینچی تو ان کا گوشت بالکل سالمون جھلی کا سا نظر آیا اسے انکا سر کا ٹکڑا گوشت پکا کر کھایا تو اسے بہت لذیذ معلوم ہوا۔ اسے مزید تجربہ کرنے کے لئے اپنے بعض احباب کی دعوت کی اور منجملہ اور کھانوں کے سانپ کا گوشت بھی ان کے سامنے پیش کیا۔ سبھوں نے اسکی بہت تعریف کی اور نہایت شوق کیساتھ اسے کھایا۔

اس کے بعد اس شخص نے سوچا کہ سانپ کا گوشت جھلی کی طرح ڈبوں میں بند کر کے بازار میں پیش کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس تجربہ میں بھی وہ کامیاب ہوا اور بازار میں اس گوشت کی مانگ بہت بڑھ گئی

سانپ پکڑ کر کارخانہ کے اندر تار کے صندوقوں میں ڈال دیے جاتے ہیں اور بند وقت سے ان کے سر اڑا کر دم کی طرف سے لٹکا دیے جاتے ہیں یہاں تک کہ ان کا خون صاف ہو جائے۔ اس کے بعد ان کی کھال کھینچ کر ان کا تیل نکال لیا جاتا ہے اور پھر نرم آنچ میں ان کو دو گھنٹہ تک پکا کر گلا لیتے ہیں۔ جب ہڈیاں علیحدہ ہو جاتی ہیں تو نمک اور سیاہ مرچ کا سفوف چھڑاک کر پھر آگ پر رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد گوشت کے ٹکڑے ڈبوں میں بند کر کے ہوٹلوں اور بازاروں میں بھیج دیے جاتے ہیں۔ جہاں یہ بحساب ایک گنی فی پونڈ فروخت ہوتے ہیں۔

ادب اردو کا مکمل ذخیرہ

ادب اردو کا مکمل جامع تاریخ ہر قسم کی زبان اردو اور اس کی نظم و نثر کی مفصل اور مکمل تاریخ اور عمدہ لہجہ کی قیوں کا مکمل تذکرہ جو زمانہ ابتدائے زبان اردو سے لیکر بارہویں صدی ہجری کے نصف اول تک کا ذکر اور اسی

تاریخ اردو کی قدیم

کے ضمن میں تمام شعراء اور مصنفین کے نہایت صحیح اور جدید و نچسب حالات بھی تحریر ہیں جسکو حکیم سید شمس اللہ قادری ماہر علوم آثار قدیمہ نے عربی فارسی اردو انگریزی فرانسیسی جرمنی وغیرہ کی مشہور و مستند کتابوں سے اخذ کر کے مرتب و مدون کیا۔ جو ۱۹۲۶ء سے عثمانیہ یونیورسٹی کے امتحان ایم۔ اے میں بھی داخل ہے قیمت پندرہ

یعنی ہر شہری آٹ اردو لٹریچر کا اردو ترجمہ جس میں نظم و نثر کی تاریخ کی قیوں کو اس میں خوب کیساتھ دکھایا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو لٹریچر میں اس کی تاریخ نہیں تھی۔ خوں یہ ہے کہ دور اول سے لیکر زمانہ

تاریخ ادب اردو

مک کے تمام شعراء اور نثر نگاروں کے واقعات زندگی اور ان کے سوانح کو بھی انتہائی شریح و بسط کے ساتھ دکھایا گیا ہے ساتھ ہی ساتھ تنقیدی نظر بھی ڈالی گئی ہے۔ دو جلدوں میں ایک میں نظم دوسری میں نثر کا تذکرہ ہے۔ قریب قریب سو مصنفین کی تصاویر بھی اس میں دی گئی ہیں۔ اور ان کا کس بھی شامل کیا گیا ہے اس میں دوسرے تذکروں کی غلطیاں بھی دکھائی گئی ہیں چھپانی اس قدر خوب ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ قیمت آٹھ

اردو اور فارسی کی نہایت مشہور و معروف شاعرہ عورتوں کا جامع تذکرہ ہے۔ بہترین کلام کا تذکرہ ہے اور عورتوں کا کوئی تذکرہ اس سے بہتر نہیں دیکھا گیا قیمت پندرہ

تذکرۃ النخواتین

خواجہ میر درد کے کلام کو نہایت صحت کے ساتھ نہایت قدیم نسخوں سے ملا کر چھپا گیا ہے۔ شروع میں خواجہ صاحب کا تذکرہ اور ان کے شاگردوں کے جامع حالات مقدمہ میں درج ہیں قیمت ۱۲

دیوان خواجہ میر درد

ایک خاص قسم کا تذکرہ جس میں سلاطین کے تمام فرقوں کے حالات و تقاریر کا نہایت تفصیل اور شریح کو ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے اور دعویٰ کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے بہتر نسخوں میں کوئی کتاب نہیں ہو نہایت نچسب کتاب ہے قیمت لاکھ

مذہب الاسلام

مولوی عبدالغفور صاحب نسخ کا لکھا ہے اردو شعراء کا نہایت جامع تذکرہ ہے اور مشکل سے اس میں اس زمانہ کے شعرا جوئے ہیں۔ جا بجا کلام کے متعلق اپنی رسلے کا انذار کیا ہے نہایت عمدہ اور نایاب تذکرہ ہے قیمت پندرہ

سخن شعرا

تذکرہ حسینی فارسی اس قدر بہترین اور نچسب تذکرہ ہے کہ شاید اس کی نظیر فارسی کے کسی دوسرے تذکرہ میں آپ کو نہ ملے گی۔ شعراء کے حالات اور کلام کے علاوہ جس قدر لطائف اسے متعلق ہیں وہ بھی لکھے گئے ہیں یہ تذکرہ زمانہ عالمگیر بادشاہ میں لکھا گیا تھا قیمت ۱۰

تذکرہ حسینی فارسی

تذکرہ گلشن بنجارا نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کا مشہور اور مقبول اردو شعراء کا زبان فارسی میں تذکرہ ہے قیمت ۱۰ اور انتخاب زاوہر تمام شعراء کے باریج اور لطیف لطائف کو تاریخ کی کتابوں سے لکھا گیا ہے قیمت ۱۰

تذکرہ گلشن بنجارا

انتخاب زاوہر تمام شعراء کے باریج اور لطیف لطائف کو تاریخ کی کتابوں سے لکھا گیا ہے قیمت ۱۰

انتخاب زاوہر تمام شعراء کے باریج اور لطیف لطائف کو تاریخ کی کتابوں سے لکھا گیا ہے قیمت ۱۰

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

ناول، ڈرامے اور افسانے

تاریخ و سوانح خواتین لغات و ادب

گوڈر کا لال	فرانس مادری	۱۲	نظرات افک	۱۲	تاریخ مغرب	۱۲	بازاری زبان	۸
شوکت آرا بیگم صد اور	افشار در جہاں	۱۲	بندرانامہ	۱۲	تاریخ اسلامی	۱۲	لغات سعیدی	۱۲
حصہ سوم	اقبال دو وطن	۱۲	بس کار و کلمہ	۱۲	حصہ ۲	۱۲	لغات کشوری	۱۲
سعید کے خطوط	حسن معاشرت	۱۲	فائدہ سعید	۱۲	حصہ ۳	۱۲	تعمیر تحقیق جلد ۱	۱۲
بیاری ہیلی	ایامی	۱۲	خونناک کھیتی	۱۲	حصہ ۴	۱۲	غیر اللغات فارسی	۱۲
نئی ٹوٹی بیاری ہیلی	سولہ کہانیاں	۱۲	سیلاب اشک تصویب	۱۲	حصہ ۵	۱۲	مجاہدات نسوان	۱۲
عورتوں کی انشا	ستہ کہانیاں	۱۲	بے زبان دوست	۱۲	حصہ ۶	۱۲	جو اہر اللغات	۱۲
انشا نسوان	سولہ قصے	۱۲	جال ہم نشین	۱۲	حصہ ۷	۱۲	گوہر اللغات	۱۲
سیرۃ الکبریٰ	مراقا العروس	۱۲	تفسیر عصمت	۱۲	حصہ ۸	۱۲	چراغ نسوی	۱۲
طرز زندگی	بناؤ اندش	۱۲	جوہر قداس	۱۲	حصہ ۹	۱۲	دلکھی لغت	۱۲
مخدرات تیموریہ	توبہ انصوح	۱۲	تائید غیبی	۱۲	حصہ ۱۰	۱۲	جوہر کلمات نظیر	۱۲
ازواج البنی	کنیز خانمہ	۱۲	پر سراد قتل	۱۲	حصہ ۱۱	۱۲	عزیز اللغات	۱۲
ازواج الانبیا	پیکھڑیاں	۱۲	اعلان آزادی	۱۲	حصہ ۱۲	۱۲	مذکورہ ریختی	۱۲
سیرۃ عائشہ صدیقہ	نصیحت کار کھیل	۱۲	سرگزشت ہاجرہ	۱۲	حصہ ۱۳	۱۲	تاریخ ادب کے قدیم	۱۲
عفت المہلات	برکات سلطان	۱۲	نوحہ زندگی	۱۲	حصہ ۱۴	۱۲	دکن میں اردو	۱۲
سبیل الجنان	ابن الوگت	۱۲	قلب عزیز	۱۲	حصہ ۱۵	۱۲	مختار کلام ہندی	۱۲
بچوں کی پرورش	چند بند	۱۲	عروس کربلا	۱۲	حصہ ۱۶	۱۲	رباعیات عمر خیام	۱۲
حرز طفلان	مختار حکایات	۱۲	شہید مغرب	۱۲	حصہ ۱۷	۱۲	مختار کلام ہندی	۱۲
تہذیب نسوان	تندرستی	۱۲	ماہ عجم	۱۲	حصہ ۱۸	۱۲	اردو کے اساتذہ کرام	۱۲
بیوی کی تعلیم	حفظ عصمت	۱۲	تغی کمال	۱۲	حصہ ۱۹	۱۲	تصنیف الفاظ	۱۲
بیوی کی تربیت	طیب نسوان	۱۲	سراب مغرب	۱۲	حصہ ۲۰	۱۲	فیض اردو	۱۲
تربیت اطفال	بہر صحت	۱۲	منازل ساڑھ کالی	۱۲	حصہ ۲۱	۱۲	نور اللغات جلد ۱	۱۲

دواوین فارسی

دواوین اردو

دیوان شمس تبریزی	کلیات غالب	۱۲	دیوان غمگین شیری	۱۲	کلیات نظیر اکبر الہ آبادی	۱۲	صنعتیہ عشق	۱۲
کلیات عراقی	کلیات صاحب	۱۲	دیوان ہلالی	۱۲	گلزار داغ	۱۲	فرط و داغ	۱۲
دیوان حافظ	دیوان ناصر علی	۱۲	اسرار غیبی	۱۲	دیوان رند	۱۲	عالم خیال بقصیر	۱۲
دیوان بیدل	کلیات سعدی	۱۲	ذوق غم	۱۲	دیوان ذوق	۱۲	دیوان شہیدی	۱۲
دیوان عرفی	کلیات عزیز	۱۲	پیام شرقی	۱۲	گلندہ عزیز	۱۲	کلیات اکبر الہ آبادی	۱۲
کلیات جامی	دیوان عنصری	۱۲	قصائد عزیز جلد ۱	۱۲	مرآۃ الغیب	۱۲	نزدیک شاہ جہانپوری	۱۲

تذکرہ و تاریخ	جاسوسی کتابوں	مراتی	ناول سجاد حسین	تفصیر عمرنی لے	ناول مشہور
پیغمبر عظیم	عمر ۱۰	مراتی دبیر	عمر ۱۸	چوروں کا کلب	عمر ۹
شب معراج	عمر ۸	مراتی انیس کلاں	عمر ۱۸	بٹی چھتری	عمر ۱۰
سراج منیر	عمر ۱۳	مراتی ضمیر	عمر ۱۸	برہم کی گرفتاری	عمر ۱۰
پیغمبر عالم	عمر ۱۰	مراتی مونس	عمر ۱۸	ادب کی کتابیں	عمر ۱۰
سوانح حضرت رسول	عمر ۱۰	مراتی دلگیر	عمر ۱۸	مکمل شرح دیوان غالب	عمر ۱۰
سید المرسلین	عمر ۱۰	عجائب و غرائب	عمر ۱۰	بزم خیال	عمر ۱۰
سید رکاز	عمر ۱۰	عجائب مخلوقات	عمر ۱۰	مشاطہ سخن	عمر ۱۰
سیرۃ الصدیق	عمر ۱۰	تصویر نگین	عمر ۱۰	مکاتیب عن الملک	عمر ۱۰
نہج البلاغ	عمر ۱۰	تصویر سادہ	عمر ۱۰	تذکرہ الشعراء	عمر ۱۰
ابو بکر صدیق	عمر ۱۲	جمع القلوب	عمر ۱۰	تذکرہ حسینی	عمر ۱۰
اندلس اسلام	عمر ۱۲	ظلمتِ زمانہ	عمر ۱۰	گمشدہ بیٹا	عمر ۱۰
الحبیب	عمر ۱۰	کارخانہ عام	عمر ۱۰	سراپا کے سخن	عمر ۱۰
عمر بن عبدالعزیز	عمر ۱۰	ریالڈ کے ناولوں کے ترجمے	عمر ۱۰	سوانح نظیر اکبر لادای	عمر ۱۰
دولت فادیتہ	عمر ۱۰	ناول سرشار	عمر ۱۰	مولانا شبلی نعمانی	عمر ۱۰
مکمل سوانح نبی اکرم	عمر ۱۰	الہ دین ویلی	عمر ۱۰	سیرۃ ابنی جلد اول	عمر ۱۰
تذکرہ اولیائے ہند	عمر ۱۰	فریب حسن	عمر ۱۰	دوم	عمر ۱۰
مرآۃ الکونین	عمر ۱۰	سوزن عشق	عمر ۱۰	دوم	عمر ۱۰
قصص الانبیاء مکمل	عمر ۱۰	روز الیہیٹ	عمر ۱۰	دوم	عمر ۱۰
سفر نامہ چین	عمر ۱۰	ناول ہزار	عمر ۱۰	دوم	عمر ۱۰
تلخیص التواریخ	عمر ۱۰	شام جوانی	عمر ۱۰	دوم	عمر ۱۰
خاتون جنت	عمر ۱۰	حرم سرا	عمر ۱۰	دوم	عمر ۱۰
تجارت الصوفیہ	عمر ۱۰	عمر ۱۰	عمر ۱۰	دوم	عمر ۱۰
خواتین آگورہ	عمر ۱۰	عمر ۱۰	عمر ۱۰	دوم	عمر ۱۰
مشاہیر نسوان	عمر ۱۰	عمر ۱۰	عمر ۱۰	دوم	عمر ۱۰
مشاہیر جند	عمر ۱۰	عمر ۱۰	عمر ۱۰	دوم	عمر ۱۰
مخدرات تیموریہ	عمر ۱۰	عمر ۱۰	عمر ۱۰	دوم	عمر ۱۰
بیگمات بنگال	عمر ۱۰	عمر ۱۰	عمر ۱۰	دوم	عمر ۱۰

نگار یک مجلسی کے لئے



قیمت

تصانیف حضرت نیاز پختوری

<p>نگارستان حضرت نیاز کے بہترین منتخب مقالات اور نساخوں کا مجموعہ۔ نگارستان کے نیک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے حوالہ معنائیں غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے قیمت ۱۰</p>	<p>گوارہ تمدن مولانا نیاز کی وہ حرکت نفاذ کتاب جس میں تاریخ اور باطل سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت کے کتب از بدست صہ بیاہ اور دنیاؤ تہذیب نشانی اس کی کس قدر مسنونہ پروردیں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت ۱۰</p>	<p>شہما کی سرگزشت حضرت نیاز کا وہ علم نظیر انسانہ جو ان دوروں میں پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے ہوں دکھایا گیا ہے اس کی تالیف اس کی تخیل اس کی ذکاوت بیان کی زندگی مضمون اس کی انفرادی فکر اس کے وہ بے گنتی ہے قیمت علاوہ محصول ۱۰</p>	<p>فرست الیوم مولانا نیاز پختوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص کو انسانیت کی شناخت اور اس کی ترقی کو دیکھ کر اپنے اندر سرخوشی کے سیرت عروج و زوال پر شاہ جہاں صحت پر بازی فرم دیکھائی فرم کے متعلق صحیح فہم کوئی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ۱۰</p>	<p>شاعر کا انجام جناب نیاز کے مضمون جناب کا کھا ہوا انسانہ حسن عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک مجلس میں موجود ہیں یہ نیا نئے چٹا اور انشاؤں کا مجموعہ ہے اس قدر بلند ہے کہ پہلی کتاب میں موضوع پر بھی دوسری جگہ ل نہیں سکتی۔ قیمت علاوہ محصول ۱۰</p>	<p>خبرات بھاشا جناب نیاز نے ایک عجیب مقالات اور نساخوں کا مجموعہ نگارستان کے نیک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے حوالہ معنائیں غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے قیمت ۱۰</p>
<p>صحیبات جس میں سہ سادات کی حوالہ معنائیں کے سنی حالات کی کہ وہ سید گئے ہیں اس کا توڑ مولانا نے خاص اپنی انشا میں لکھا ہے اس کتاب میں سہ صحابیات سے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہیں طباعت و کتابت نہایت نفیس ہے قیمت علاوہ محصول ۱۰</p>	<p>نوعان کھجور کے بعد تین انسانوں کا مجموعہ جن میں بتایا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو چلتی ہے سونائیں۔ زبان و طوالت انشا و تخیل کے لحاظ سے تعریف مضمون ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی ضامن ہے قیمت ۱۰</p>	<p>ذاکرات نیاز یعنی حضرت نیاز کی آرزو جو ادبیات و تنقید علمی کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شرف دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں ملتی رہی ہیں۔ قیمت ۱۰</p>	<p>فلسفہ قدیم جو میں حضرت نیاز سے تین علمی معنائیں ملی ہیں۔ چند گنتے فلسفہ قدیم کی مدحوں کے ساتھ ۱۔ ماد میں کا مذہب ۲۔ حرکت کے کرشمے نہایت مفید و عجیب کتاب ہے قیمت ۱۰</p>	<p>تاریخ الدولتین جو میں زیادہ کے تاریخ تمدن الاسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں محمد بنی امیہ دینی عباس کی سیاسیات پر ہے مثل تبصرہ کیا گیا ہے جو دیکھنے کی یہ کتاب بڑی قیمتی شہرت حاصل کی ہے قیمت ۱۰</p>	<p>المسئلة الشرعیة مصطفیٰ کامل ہاشا کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ یہ وہ کتاب ہے جس نے یورپ و ایشیا کے سیاسیات میں پھیل ڈالی تھی اور جس نے جسک پہلے دیدان کی یہ کتاب بڑی قیمتی شہرت حاصل کی ہے قیمت ۱۰</p>

<p>تذکرہ خندہ گل مولانا نیاز کی اسی میں ۳۰ صفحات سے زیادہ اردو فارسی کے لطیف شاعروں کے حالات معائن کے لطائف و نظائر و انطباعات کلام کے درج ہیں قیمت ۱۰</p>	<p>دیگر مکتوبات کی قابل مطالعہ کتابیں مثنوی لالہ سچ طاس سور کی حرکت الارام مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ قیمت ۱۰</p>	<p>مثنوی زینر عشق مرتبه جنوں گورگہ پوری جس میں کتب کچھ بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویریں دی گئی ہیں ایک تصویر گورگہ پوری</p>	<p>فرست التخریج مکمل یعنی اردو اور انگریزی رسم خط اور نظائر تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت حال چہن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت ۱۰</p>
---	---	--	---

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے۔
رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفعہ کو اطلاع ہونی چاہئے اور نہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپہہ ششماہی تین روپہہ (۵)۔
بیرون ہند سے آٹھ روپہہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

شمارہ	فہرست مضامین اپریل ۱۹۳۳ء	جلد ۲۳
۲	ملاحظات	
۹	منزوی زبانوں کے ادب لطیف پر ایک سرسری تبصرہ (مسلل)	
۲۵	شہلی ابراہیمی ایم۔ اے۔	راکھی
۳۲		جوش کی شاعرانہ کیفیتیں
۴۰	محشر عابدی بی۔ اے۔	سیزرو کلیو پیٹرا
۵۶		حضرت نیاز کے چند خطوط
۶۶		باب المراسلۃ والمناظرۃ
۷۱		باب الاستفسار
۷۶	ذوقی بی۔ اے۔	ہولی (نظم)
۷۷	عدم	ابراہیم سے خطاب (نظم)
۷۸	اثر	کلام جعفر عینیاں اثر کھنوسی
۷۹	دل	کلام دل شاہجہا پوری
۸۰	حیرت۔ فراق	کلام حیرت بی۔ اے۔ و فراق گورکھپوری

نگار

ایڈیٹر۔ نیاز فنجوری

جلد ۳۳	اپریل ۱۹۳۳ء	شمار ۴
--------	-------------	--------

ملاحظات

دارالعلوم ندوہ کے متعلق کچھ اور اکتشافات
عبدالعلی ناظم ندوہ کے متبادر پر ایک رچھر تو شوق

گزشتہ ماہ کے ملاحظات لکھنے کے بعد ہمارا ارادہ نہیں تھا کہ ”دارالعلوم ندوہ“ کی داستان کو جس میں نہ ہمارے لئے کوئی لذتِ ندرت ہے، نہ کیفیتِ افادیت، بار بار ملک کے سامنے پیش کریں۔ لیکن اس خیال کو پیش نظر رکھ کر کہ ممکن ہے ملک کے لئے اس میں کچھ نہ کچھ سامانِ بصیرت و عبرت موجود ہو، مناسب ہی معلوم ہوا کہ اس درسگاہ کی موجودہ حالت اور اس کے ناظم (عبدالعلی) کی ذہنیت کو ایک بار پوری طرح بے نقاب کر دیا جائے، تاکہ ہماری قوم جان لے، کہ اس درسگاہ کی امداد کرنا بنجر زمین میں آبپاشی کرنے سے زیادہ نہیں اور یہاں بچوں کو تعلیم کے لئے بھیجنا ان کے دلی و دماغ پر ہمیشہ کے لئے غلامی کی مہر لگا دینا ہے۔

”دارالعلوم ندوۃ العلماء“ کے شاندار اور پرہیزگار و جلال نام کو سرکردہ نیا غالباً یہ یاد رکھنی ہوگی کہ علوم عربیہ کی یہ کوئی نہایت ہی مہتمم بالشان درسگاہ ہوگی۔ اس کے ذرہ ذرہ سے علوم و فنون کے دریا ابل رہے ہونگے، اس کے مختلف ججروں میں علامہ یتیمیہ اور ابوالعلماء المعری بیٹھے ہوئے درس حکمت دے رہے ہوں گے۔ اور اسکے ایوانوں میں ہزار ہا شاہدین طلبہ ہر وقت مصروف مطالعہ نظر آتے ہوں گے، لیکن غالباً دنیا یہ معلوم کر کے حیران رہ جائے گی کہ دارالعلوم ندوہ میں طلبہ کی تعداد سیکڑوں تک بھی نہیں پہنچتی اور ان میں تقریباً سب وہی ہیں جو دارالافتاء میں رہتے ہیں اور جنہوں نے والدین نے ”دارالعلوم“ کے لفظ سے مرعوب ہو کر یہاں سب ”علوم و فنون“ کے لئے بھیج دیا ہے۔ رہا یہ امر کہ یہاں کن کن علوم کی تعلیم ہوتی ہے، نصاب کس درجہ بلند ہے، کیسے کیسے مشاہیر علم و فضل یہاں کے اساتذہ ہیں، کن قابل ہاتھوں میں یہاں کی عنان حکومت پائی جاتی ہے۔ اور آئیں نظم و نسق میں پہلک کی نمائندگی کس حد تک پائی جاتی ہے۔ ان تمام باتوں پر میں اس وقت روشنی ڈالوں گا جب تمام اطلاعات مجھے فراہم ہو جائیں۔ میں نے ڈاکٹر عبدالعلی ناظم ندوہ کو ایک تحریر بطور استفسار بھیجی ہے۔ اگر انہوں نے جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائی جسکا مجھے یقین نہیں تو خیر، ورنہ پھر میں دوسرے ذرائع سے تمام ضروری اطلاعات و معلومات اس درسگاہ کے متعلق حاصل کر کے پہلک کو آگاہ کروں گا۔

گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں ایک طالب علم عنایت علی (صحیح نام عنایت اللہ ہے) کے اخراج کا حال بیان کیا گیا تھا، لیکن شوق موسیقی کی وجہ سے کسی طالب علم کو محروم تعلیم کر دینے کی ایک مثال ناظم ندوہ اور بھی قائم کر چکا ہے جسکا حال مجھے بعد کو معلوم ہوا۔

ایک طالب علم علاء الدین احمد حیدر آباد سے بغرض تعلیم یہاں بھیجا گیا تھا جو وہاں کا وظیفہ یاب بھی تھا۔ جب کہ مل ۸ سال کا زمانہ یہاں تعلیم پاتے ہوئے اسے گزر گیا تو ذوق موسیقی کی بنا پر اسے بھی نکالا گیا۔ اور مستند مالیات حیدر آباد (نواب خزیار جنگ بہادر) کو ناظم ندوہ نے انتہائی زہد و ورع کی نمائش کرتے ہوئے ایک تحریر بھیجی کہ علاء الدین احمد کا وظیفہ (غالباً تیس روپیہ ماہوار) بند کر دیا جائے، کیونکہ وہ خارج اوقات مدرس میں، میوزک کالج بھی جاتا ہے۔ نواب خزیار جنگ نے جو ہندوستان کی کسی معمولی درسگاہ کے ناظم نہیں بلکہ حیدر آباد ایسی بڑی ریاست کے معتمد مالیات ہیں، جواب دیا کہ محض موسیقی سے ذوق رکھنا کوئی الزام کی بات نہیں۔ اگر وہ دارالعلوم کی تعلیم کے لحاظ سے ناکارہ ثابت ہو رہا ہے تو اطلاع دی جائے۔ لیکن چونکہ طالب علم تیز تھا اور اس نے علاوہ امتحانات دارالعلوم کے یونیورسٹی کے امتحان عالم میں بھی کامیابی حاصل کر لی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ ناظم اس کی بدشعوری کی شکایت نہ کر سکتا تھا۔ الغرض نتیجہ یہ ہوا کہ مستند ناظم نے اس طالب علم کو دارالعلوم میں پڑھنے کی اجازت نہ دی اور خزیار جنگ بہادر نے اس کے وظیفہ میں بیس روپیہ

بہر حال یہ ہیں وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جن پر ناظم کی توجہ صرف ہوتی ہے اور یہ ہیں اُن کی وہ رواداریاں جنہوں نے اس درسگاہ کی حالت کو سقیم بنا رکھا ہے۔ اب اسی کے ساتھ چند کلمے شیخ صاحب (حمید حسن لٹوکی) کے متعلق بھی سن لیجئے مگر اس درسگاہ کے مہتمم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ یہ بزرگ کتابی قابلیت کے لحاظ سے جو کچھ بھی ہوں۔ مجھے اس کا علم نہیں لیکن اپنی ذہنیت کے اعتبار سے ان کو ناظم ندوہ کے حریف کامل ہونیکا دعویٰ ہے۔ صرف ایک واقعہ اس کے ثبوت میں پیش کر دینا غالباً کافی ہوگا۔

کلکتہ کے چند فاضل مرد اور وہیں کی چند گریجویٹ عورتیں لکھنؤ آتی ہیں اور یونیورسٹی ہال میں ان کے لکچروں کا انتظام ہوتا ہے۔ دارالعلوم ندوہ کے طلبہ بھی عمارات یونیورسٹی کے قریب رہنے کی وجہ سے واقف ہو جاتے ہیں اور ان کا شوق علم کشاں کشاں لکچر روم تک پہنچا دیتا ہے۔ جب یہ واپس آتے ہیں۔ تو جناب مہتمم ان کو طلب کرتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ ”تم لوگوں کو شرم نہیں آتی کہ عورتوں کا لکچر جا کر سنتے ہو اور ندوہ کو بدنام کرتے ہو“۔ اگر ان الفاظ میں طلبہ کو غیرت دلانا اس لئے نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی ان عورتوں کا حریف علم بننے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا، تو پھر اس برہمی کا اندازہ مشکل ہے جو مہتمم صاحب کے غیرت دلائل اور الفاظ سے ظاہر ہو رہی ہے، کیونکہ طلبہ کا نامحرم عورتوں کو جا کر دیکھنا یا ان کی آواز کو سنانا کوئی ایسی معمولی بات نہ تھی جس کو مہتمم صاحب کی شب زندہ دارانہ خصوصیات آسانی سے برداشت کر سکتیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ طلبہ ندوہ کی ذہنی آزادی کو روکنے کی اور تدابیر بھی اختیار کی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ مہتمم صاحب ان کو ملک کے تمام اخبارات و رسائل دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے، بہت سی ایسی کتابیں ڈائریکٹری سے اُن کو نہیں دی جاتی جن کے مطالعہ سے ان کے نقشبند دور ہونے کا اندیشہ ہے اور اس قسم کا سلوک ان سے کیا جاتا ہے جسے خود دار طبیعتیں برداشت نہیں کر سکتیں، چنانچہ سنا گیا ہے کہ ایک بار کسی طالب علم (غلام بنی الدین) نے مہتمم صاحب کو امتحان کے کمرہ میں زدو کوب بھی کی اور جس کے متعلق میں نے ناظم ندوہ سے مفصل کیفیت دریافت کی ہے۔

متعدد طلبہ میرے پاس ایسے آئے اور آتے رہتے ہیں جو ندوہ اور وہاں کے اربابِ نظم کے طرف سے لبریز شکایت ہیں اور معلوم ہوا کہ بعض طلبہ کا وہاں سے چلا جانا اور جدید طلبہ کا داخل نہ ہونا۔ اس تنگ ذہنیت اور اس بد نظمی کی وجہ سے ہے۔ انگریزی تعلیم کے لئے بھی وہاں ایک درجہ کھولا گیا ہے لیکن غالباً اس لئے کہ پبلک پر اپنی آزاد روی اور روشن خیالی کا اثر ڈال کر مالی امداد حاصل کی جائے، ورنہ عملاً اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اخبارات میں ناظم ندوہ کی طرف سے پبلک کے سامنے چندہ و عطیات کے لئے اپیل تو ضرور کبھی کبھی

پیش کر دی جاتی ہے، لیکن ارباب ندوہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر کبھی غور نہیں کرتے کہ کیا قوم اپنے بچوں کو وہاں صرف اس لئے بھیجنے کے لئے تیار ہو سکتی ہے کہ جب دس سال کا طویل زمانہ ختم کرنے کے بعد وہ وہاں سے نکلیں تو یکسر داڑھی ہی داڑھی نظر آئیں اور روشن خیالی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا "نقطہ سویدا" ان کے دلوں میں نہ پایا جائے!

حقیقت یہ ہے کہ ذہنی آزادی کے لحاظ سے اس وقت مسلمانوں کی صرف ایک ہی درسگاہ جامعہ ملیہ (دہلی) ایسی ہے جس پر ہماری قوم ناز کر سکتی ہے لیکن افسوس ہے کہ قوم اس کی طرف سے بے پرواہ ہے اور داڑھیوں کے رعب نے اب تک ہم میں "سیاہ و سفید" کی تمیز کی اہلیت پیدا نہیں کی۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ گول میز کانفرنس کی داستان کیا ہے، یہ بار بار اراکا برہند کا **وہاٹ پیپر** لندن جا جا کر لوٹ آنا کس مقصود کی تک و دو ہے فیڈریشن کس نعمت ربانی کا دوسرا نام ہے، صوبوں کی خود مختاری کی حقیقت کیا ہے، لامرکزی طریق حکومت سے ہندوستان کو کیا برکات ملنے والی ہیں، اور یہ کہ ملک کی آزادی کا کب تک انتظار کیا جائے تو میں سورہ طہ کی وہ آیتیں سنا دوں گا جن میں موسیٰ اور فرعون کا مقابلہ دکھایا گیا ہے اور پھر وہاٹ پیپر کی طرف اشارہ کر کے کہہ دوں گا کہ

اذ جاء موسى والقی العصا فقد ابدل السحرا والساحر

کیونکہ وہاٹ پیپر واقعی ایک عصائے موسوی ہے جس نے گول میز کانفرنس کے سحر و طلسم کو باطل کر کے رکھ دیا اور "وعدہ پرچینے والوں" کی آنکھ سے پردہ ہٹا کر یہ حقیقت پوری طرح واضح کر دی کہ ازس فزوں نتوانی بمن جفاور نہ تو آن نی کہ جفاے لوانی و شکنی

وہاٹ پیپر کیا چیز ہے۔؟ یہ بیان ہے حکومت برطانیہ کا جو مطالبات ہند کے جواب میں شائع کیا گیا ہے، یہ تفسیر ہے ان المامات و تشابہات سیاست کی جو گول میز کانفرنس میں خدا کے چند برگزیدہ بندوں پر نازل ہوئی اور یہ تفسیر ہے اس خواب آزادی کی جس نے سالہا سال سے وطن و اہل وطن کو بیقرار و مضطرب بنا رکھا تھا پھر کیا آپ نے اس صحیفہ قسمت کا مطالعہ کر لیا۔ اس نوشتہ مقسوم کا مدعا جان لیا اور اپنی بڑھی ہوئی تناؤں کے خون کئے جانے کی داستان سن لی؟۔۔۔ ممکن ہے بعض جماعتوں کو لے نواز ان برطانیہ کا یہ نغمہ کوئی جدید چیز معلوم ہو، ہو سکتا ہے کہ بعض ان حضرات کے نزدیک جو "کشود نقاب" کی تاخیر اور "ازدحام تننا" کے تناشہ میں مشروف تھے یہ کوئی جدید جلوہ طرازی ثابت ہو، لیکن ارباب نظر جانتے تھے کہ برق کی عبادت کرڈ والو کو ہمیشہ اسی طرح "افسوس حاصل" کرنا پڑتا ہے اور اپنی ذات پر اعتماد نہ کرنے والوں کیلئے دنیا ہمیشہ اسی طرح بے

اعتماد ثابت ہوتی ہے

کہا جاتا تھا کہ گول میز کانفرنس، سامن کمیشن رپورٹ سے کچھ ترٹی کر کے، آئینہ کی اصطلاحات پر غور کر رہی ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ ٹیک کی مکمل آزادی تو کجا، اسے ڈومین ہوم رول کی رعایتیں بھی نہیں دی جائیں۔ بیان کیا جاتا تھا کہ ہوم گورنمنٹ کے اختیارات اور ویسٹسٹ کے کی ملوکانہ حیثیت میں بہت کمی پیدا ہو جائے گی، لیکن جب پردہ اٹھا تو معلوم ہوا کہ ان کے بہروں سے جلال؛ استعداد اور زیادہ ہو گیا ہے۔ بھر کیا بندہ رست ان میں کوئی ایک جماعت بھی ایسی نظر آتی ہے جس نے اس کو نگاہ پسندیدگی سے دیکھا ہو، کوئی ایک شخص ایسا ہے جس نے حکومت کے اس فیصلہ کو انصاف پر معمول کیا ہو، اس لئے اس سوال نے آئینہ کے اعتماد کا ہے نہ ماغنی کی حسرت کا بلکہ اتفاق کامل اور اتحاد تام کے ساتھ اس امر پر غور کرنے کا کہ

کایہ بستی تست عم، بچونس ایدلی
تو گر جنیں نہ گردانی، گرہ کشائے لا کیتا؟

اردو زبان میں تعلقاتِ جنسی کی تاریخ و نفسیات پر بالکل نئی کتابچہ

(حضرت نیاز کے قلم سے)

شہوانیات

غوامت تقریباً ۲۰۰ صفحات قیمت غیر حوالہ کے جلد سے علاوہ حصول

اپریل میں شائع ہو جائے گی۔ لیکن خریداران نگار سے ایک روپیہ کم لیا جائے گا۔ جن حضرات نے کچھ روپیہ پیش کی ہے اسکو منہا کر کے باقی رقم کا وہی پون اپریل کے اندر اندر انکو مل جائیگا۔

نمبر نگار لکھنو

راہی

(۱)

چنار گڑھ کا قلعہ گھرا ہوا تھا۔ توپوں کی گھن گرج سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر سمت دھول کی مسموم فضا میں حملہ آور سپاہیوں کے دستے پے درپے ڈھالوں کو سپرکے ہوئے سمندر کی موجوں کی آگے بڑھتے جاتے تھے۔ قلعہ کی فصیل پر شیر خاں مستعدی کے ساتھ کمان کر رہا تھا اسکے ایک اشارہ پر ہزاروں تیر، بڑا پتھر روغن نفا اور گولے بے یک وقت برسے گئے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ حملہ آوروں کا بڑھتا ہوا نہ تھکنے والا سیلاب قلعہ آہنی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر لاشوں اور زخمیوں کو چھوڑ کر اٹے پاؤں لوٹ جاتا تھا۔ یہ سلسلہ مسلسل ایک گھنٹہ سے جا چکا تھا اور اب رفتہ رفتہ حملہ آوروں کے جوش میں کمی ہوتی جا رہی تھی کہ یکایک قلب فوج میں جنبش ہوئی اور ایک خوشرو نوجوان جس کے چہرے سے عجب قسم کا تقدس برستا تھا، نمودار ہوا۔ یہ دوسرے افسروں کی طرح لباس پہنے ہوئے تھا۔ مگر اس کے عمامہ میں ایک بیش قیمت بڑی سی مرصع کلنی لگی ہوئی تھی۔ یہ ہندو ستار نوجوان شہنشاہ ہمایوں تھا۔ اس نے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور ساری فوج کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ ہر دستے کے سامنے گھوڑے کو چند لمحوں کے لئے روک لیتا اور سپاہیوں کی ہمت بڑھاتا۔ اس نے دو گھنٹے کے اندر ساری فوج کا جائزہ لے لیا۔ اور ایک لمبا چکر کاٹ کر پھر قلب فوج میں واپس چلا آیا۔ شہنشاہ کی ہمت افزائی اور اس کی موجودگی نے سپاہیوں میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کر دیا تھا۔ گولوں کی زور و شور۔ بارش ہونے لگی اور ہر دستہ جان پر بھل کر کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح قلعہ کی دیوار پر چڑھ جائے۔ اور شہنشاہ کی نظروں میں سرخروئی حاصل کرے، بارہا ایسا ہوا کہ چند جانناز سیرھیاں نکا کر سیرکھٹھیلی پر بے کردیوانہ وار چڑھیں۔ مگر سیرھیاں نیچے گرا دی گئیں اور چڑھنے والوں کو یا تو جان سے ہاتھ دھونا پڑا یا زخموں سے چور ہو کر چبھے گئے۔

شام ہو رہی تھی۔ اور ہمایوں بیتاب تھا کہ جس طرح ہو آج ہی قلعہ فتح ہو جانا چاہئے۔

”بیرم خاں قلعہ آج ضرور فتح ہو جانا چاہئے“ شہنشاہ نے کہا۔

”جہاں پناہ! اب تو شام ہو چکی مگر کل قلعہ ضرور فتح ہو جائے گا۔ کیونکہ رسد بند ہو جانے کی سبب سے قلعہ والے فائدہ مند رہے ہیں۔ اور ان کے لئے سوائے قلعہ حوالہ کر دینے کے کوئی چارہ نہیں۔ کل انشاء اللہ کو کب ہمایوں چنار کے قلعہ پر لہراتا ہوا نظر آئیگا۔“ بیرم خاں نے کہا۔

اتنے میں شہنشاہ کی نظر چند جانباز سپاہیوں پر پڑی جو قلعہ کی دیوار پر سیر ہی لگا کر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر قلعہ والوں نے سیر ہی نیچے گرا دی تھی اور وہ زمین پر تڑپ رہے تھے۔ شہنشاہ اس جانبازی کے نظارہ کی تاب نہ لاسکا اور اُس نے منہم ارادہ کر لیا کہ خود سیر ہی لگا کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ جائے گا۔ اس نے بیرم خاں کو اپنے اس ارادہ سے مطلع کیا۔

”بالکل بیکار ہے۔ جہاں پناہ! کل قلعہ ضرور فتح ہو جائے گا۔ شام ہو چکی ہے اور رات بھر کی تاخیر کے لئے ایسی عزیز جان کو جس کی قیمت کونین کی سعادت سے بلند تر ہے۔ ہلاکت میں ڈالنا۔ دشمنوں کے خلاف ہے۔“ بیرم خاں نے کہا۔

”اچھا جیسی تمہاری رائے۔ رات کی تاریکی پھیل رہی ہے۔ اب طبل باز گشت بجنے کا حکم دو۔ کل میں خود اپنے جانباز سپاہیوں کے ساتھ قلعہ کی دیوار پر چڑھوں گا“ شہنشاہ نے کہا۔
جواب میں بیرم خاں نے مودبانہ سر کو جھکا لیا۔

(۲)

رات تاریک تھی اور ایک تنہائی حصہ اس کا گذر چکا تھا۔ ہمایوں کے فوجی کیمپ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دن کے تھکے ماندے سپاہی پڑے بے خبر سو رہے تھے۔ البتہ کہیں کہیں سے زخمیوں کے گراہنے کی۔۔۔۔۔ آوازیں آرہی تھیں۔ اور پھرہ کے سپاہی چاروں طرف گشت لگا رہے تھے۔ اس سلسلے میں شاہی حیرہ کے اندر کسی خاص معاملہ پر گفتگو ہو رہی ہے۔

”اراکین سریر سلطنت! آپ کو معلوم ہے کہ فردوس مکانی دشمنوں کے ساتھ ہمیشہ انتہائی فیاضی، رحم، اور محبت کے ساتھ پیش آئے۔ پس مابعد دولت کے لئے بھی مناسب ہے کہ فردوس مکانی کے پاک نقش قدم کی اتباع کرنے ہوئے۔ اسی مقدس فیاضی، رحم، اور محبت کے سرسبز اور شاداب درخت کی ہمیشہ آبیاری کرتے رہیں۔ شیر خاں اب اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے اور معافی کا خواستگار ہے۔ غور کرو، سوچو، سمجھو، اور بتلاؤ کہ اُسکو کیا جواب دیا جائے“ شہنشاہ نے کہا۔

”جہاں پناہ! لیکن شریر، کینہ، اور احسان فراموش افغانوں کے ساتھ رحم، انصاف کا خون، اور احسان فراموشی کی حمایت ہے۔ شیر خاں کی یہ صرف مکاری ہے۔ فردوس مکانی کے سامنے بھی اس نے اسی طرح سراطاعت خم کر دیا تھا۔ اور فردوس مکانی نے اس کو ہمیشہ کے لئے معاف کر دیا تھا مگر اس احسان فراموش نے اس کا جو صلہ دیا وہ جہاں پناہ سے پوشیدہ نہیں“ ایک سردار نے کہا۔

”احسان فراموش! بالکل احسان فراموش!! ان طوطا چشم افغانوں سے وفا کی امید حاصل

ہے ” دوسرے سردار نے جوش سے کہا۔

” بڑے نمک حرام ہیں بکجنت “ تیسرے سردار نے چہرہ پر شکن ڈال کر کہا۔

اتنے میں چوہدری داخل ہوا۔ اور جھک کر مہراجا لایا اور کہا۔

” عالیجاہا! چتور سے دور اچوت سوار آئے ہیں۔ اور ان کی التجاہے کہ ابھی باریابی کا شرف بخشا جائے

کیونکہ وہ شہنشاہ کے نام ایک اہم پیام لائے ہیں “

” چتور راجپوت — اہم پیام۔ نہ معلوم کیا بات ہے “ شہنشاہ نے آہستہ آہستہ

کہا۔ پھر بہ آواز بلند کہا کہ ” اچھا فوراً حاضر کرو “

(۳)

” تم لوگ کون ہو؟ کہاں سے آتے ہو؟ — اور وہ کونسا اہم پیام ہے جس کے لئے بغیر صبح کا انتظار

کئے ہوئے تم نے باریابی کی اجازت مانگی “ شہنشاہ نے ہمہ تن متوجہ ہو کر پوچھا۔

” مہابلی “ ایک راجپوت نے ادب سے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کہا۔ ” ہم کوگ راجپوت ہیں اور چتور کے

پچھے سیوک ہم اس وقت چتور سے آ رہے ہیں اور مہابلی کے نام اپنی مہارانی سریشتی گزادتی کا ایک خط

لائے ہیں “

شہنشاہ کی آنکھیں اس دوران گفتگو میں برابر ان کے چہرے پر گڑھی ہوئی تھیں اور اس کی آنکھوں سے

نیاضی، رحم، اور بہادری کا سچا نور برس رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور ہاتھ کو میتابی کے ساتھ بڑھا کر

بولتا۔ ” وہ خط کہاں ہے؟ “

اس کے جواب میں اُس راجپوت نے ایک دوسرے راجپوت کے ہاتھ سے جو اُس کے پاس کھڑا تھا ریشمی

خریطہ جلدی سے لے کر شہنشاہ کے سامنے پیش کیا۔

شہنشاہ نے وہ خریطہ میرمنشی کو دیا اور کہا ” مضمون سے مابعد دولت کو آگاہ کرو “

میرمنشی نے خط کو خریطہ سے نکالا۔ خط کے اوپر ایک جہانگیری کے قسم کی کوئی موصع چیز لپیٹی ہوئی تھی۔ یہ قیمتی

جواہرات سے موصع تھی اور اس میں سونے کی زنجیر خوبصورتی کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ میرمنشی نے اس کو باصیاط

تمام کھول کر علیحدہ رکھا اور خط کھول کر مضمون کی طرف متوجہ ہوا۔ خط کا مضمون یہ تھا:-

گنیش جی

اکلنگ جی

رام جی

بلکہ رام جی، اکلنگ جی، گنیش جی، یہ تین محافظ دیوتا تھے جن سے ہر کام میں مدد مانگی جاتی تھی۔

” مہابی کے کنول جیسے قدموں پر بے شمار سلام عریضہ نیاز حضور کو ایسے وقت میں لکھ رہی ہوں جبکہ میرے بدن کا ایک ایک قطرہ خون آنیوالی ہولناک مصیبت کے تصور سے خشک ہو چکا ہے۔ وقت بڑا نازک ہے اور زیادہ تاخیر نہ کی جائے۔ لے لے تباہی و بربادی، اور ذلت کے عمیق سمندر میں غرق کر دے گی۔ میں حضور کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ اور میرا پیارا چہتور بہادر شاہ والی گجرات کی فوجوں سے گھرا ہوا ہے۔ چہتور کے سچے سیوک اپنے سردوں کو ہتھیلی پر لئے ہوئے ہیں مگر ”بلٹھ توپوں“ کے سامنے ان کی بہادری کا رگہ نہیں ہوتی اور وہ چہتور کے ناموس کی قربانگاہ پر بھیر بکریوں کی طرح ”بلٹھ توپوں“ کے پھروں سے بیرحمی کے ساتھ ہر روز ذبح ہو رہے ہیں۔ ایسے وقت میں یہ ”راکھی“ آپ کی خدمت میں بھیج رہی ہوں اور امید کیسی کامل یقین ہے کہ آپ اس کو قبول کریں گے۔ کیونکہ بہادری کے قانون کے مطابق میری بھیجی ہوئی ”راکھی“ کو قبول کرنا اور اس کو باندھ کر میرا راکھی بند بھائی ہو جانا آپ پر فرض ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ میری بھیجی ہوئی ”راکھی“ میرے بھائی شہنشاہ ہمایوں کی کلانی پر بند ہی ہوئی ہے۔ اب اس کی لاج آپ کے ہاتھ ہے۔ میرے مقدس بھائی — اب بلا کسی تاخیر کے جلد آئے اور اپنی بہن کی عزت و حشیشوں کے ہاتھ سے بچائے اور اپنے شیر خوار بھانجے اودے سنگھ کی حفاظت کیجئے۔“

آپ کی بہن
کرناوتی

۲۵۔ آمادس سہمبت ۱۵۸۹

ہمایوں خط کا مضمون بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ خط کا مضمون ختم ہو چکا تھا اور اب اس کو کسی غور و فکر کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اس وقت اپنے فطری جذبہ سے سرشار تھا اور فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کو کیا کرنا چاہئے۔

” راکھی کہاں ہے؟“ میری کلانی پر باندھ دو۔ ” شہنشاہ نے نوجوان راجپوتوں سے مخاطب ہو کر کہا — پہلا نوجوان راجپوت جو اپنے ساتھی سے آگے کھڑا ہوا تھا آگے بڑھا، شہنشاہ کے قدموں کو بوسہ دیا، اور اس نے شہنشاہ کے داہنے ہاتھ کی کلانی پر راکھی باندھ دی۔ اور تب اس نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر پرنام کیا اور چند قدم ہٹ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

اس وقت دونوں نوجوان راجپوتوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

” شیر خاں کو جو اب دے دو کہ ماب دولت نے اس کا جرم معاف کیا اور وہ کل حضور میں آکر ماب دولت کی

اظہار خوشنودی کی سند حاصل کرے، شہنشاہ نے میرنشی سے کہا۔

میرنشی نے جواب میں سر کو جھکا دیا۔

”میرے بہادر دوستو! میں پرسوں صبح کو یہاں سے اپنی پوری فوج کے ساتھ چتور کی جانب کوچ کرونگا اور اپنی بہن کرناوتی کی حفاظت کا فرض ادا کروں گا۔ اس کے لئے میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اپنے بہادر سپاہیوں کی عزیز جانیں، خود اپنی جان، رنجھبور کا قلعہ۔ غرضکہ اپنی بہن کرناوتی کی حفاظت کی ہر ممکن قیمت میں ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ تم لوگ بھی سستا لو اور مابعد دولت کے ہمراہ رکاب روانہ ہو،“ شہنشاہ نے نوجوان راجپوتوں کو کہا۔

”مہابلی! حضور کا حکم سر آنکھوں پر ہے۔۔۔۔۔ مگر مناسب ہے کہ ہم لوگ صبح ہی روانہ ہو جائیں اور جلد از جلد چتور پہنچ کر اپنی مہارانی کو حضور کی آمد آمد کی نوید جانفزا سائیں۔ تاکہ سر میتی مہارانی کو اطمینان ہو، سپاہیوں کے دل بڑھ جائیں، اور دشمن سنکر کانپ اٹھیں“ پہلے نوجوان راجپوت نے جواب دیا۔

”تمھاری رائے نسب ہے۔۔۔ جاؤ۔۔۔ میری اجازت ہے۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔ میری بہن کو جلد میرا پیام پہنچاؤ۔ میں بھی قریب قریب تمھارے ساتھ ہی پہنچوں گا“ شہنشاہ نے جواب دیا۔

(۴)

ابتداءً آفرینش سے چتور کے نام میں ایک تقدیس ہے۔ یہ راجستھان کا کعبہ ہے، بیت المقدس ہے، کاشی ہے اور سب کچھ ہے۔ اس سے سچی بہادری کا نام زندہ ہے۔ اس سے بہادران راجستھان کے سروں میں اولوالعزمی کا سودا، آنکھوں میں بیداری، اور جگر میں حڑپ پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چتور کی پاک سترنین پر جب کبھی ”وہشیوں“ کا حملہ ہوا تو بہادران راجستھان نے اس کی دفاع کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہا دیا۔ اس کی گود میں حیرت انگیز بہادری کے ہزاروں کارنامے کھیل رہے ہیں۔۔۔۔۔ ایسے کارنامے جنکی مثال تاریخ کے صفحات پر مشعل سے مل سکتی ہے۔ آج بھی جبکہ والی گجرات سلطان بہادر شاہ اپنے قہار لشکر کے ساتھ منڈو کے راجہ کی معیت میں اپنے باپ مظفر شاہ کی ذلت کا انتقام لینے کے لئے چتور کی پاک سرزمین کو گھیرے ہوئے پڑا ہے تو فدائیوں کی کمی نہیں ہے۔ بوندی کا بہادر فرزند پانچ سو بہادر راجپوتوں کے ساتھ، جھالور کا راجہ سونیکر راؤ، ابوکار راجہ دیوراؤ، اور راجستھان کے بہت سے سورا مقدس چتور کی دفاع کے لئے پینچ گئے ہیں۔

۱۔ راجستھان کے لوگ اپنے حملہ آوروں کو اسی نام سے یاد کرتے تھے۔

مگر اس مرتبہ چتور کا حملہ آور عظیم الشان لشکر لے کر آیا تھا۔۔۔۔۔ ایسا عظیم الشان لشکر کہ راجستھان کی ابتدائے تاریخ سے لے کر آج تک کبھی دیکھا یا سنا نہ گیا تھا۔ لشکر عظیم کے علاوہ عجیب غریب آلات کا مقابلہ تھا جنکے آگے بہادران راجستھان کی بہادری کا رگڑ نہ ہوتی تھی۔ رومی خاں "پلٹھ توپوں" کے ذریعہ سے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ وزنی گولے برساتا تھا۔

(۵)

۱۲ جیٹھ ۱۵۸۹ سمبت (مطابق ۳۲-۳۳ ۱۵۳۲ء) کی بھی عجیب ہولناک صبح تھی۔ گولے سین ویسار سے پھٹ پھٹ کر گر رہے تھے اور چتور کا قلعہ دہوئیں کی مسموم فضا سے چھپا ہوا تھا۔ چند ماہ کی ستوا تر گولہ باری کی وجہ سے قلعہ کی دیواریں اور فصیلیں چور ہو چکی تھیں اور اب قلعہ میں کوئی دم باقی نہ تھا۔ لیکن یابوس کی اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی بہادران راجستھان کے ہاتھوں سے ایک لمحہ کے لئے بھی سرفروشانہ جرات، آہنی استقلال، اور امید کا سر رشتہ نہ چھوٹتا تھا۔ آج جنگ اور گولہ باری کا سارا زور شور درہ بیکا پر تھا۔ یہاں بوندی کا بہادر راجگمار یا پنج سو ہزار راجپوتوں کے دستہ کے ساتھ کمان کر رہا تھا اس دستہ کے اوپر رومی خاں اپنی پوری طاقت کے ساتھ گولے برسار رہا تھا اور بہادر شاہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ جس صورت سے ہو سکے اس درہ پر قبضہ کر لیا جائے کیونکہ قلعہ کی فتح اسی درہ کی فتح پر منحصر تھی۔۔۔۔۔ مگر درہ کی حفاظت بوندی کا راجگمار کر رہا تھا اور پلٹھ توپوں کی آتشباری، بیشمار شکر، اور بہادر شاہ کی ساری دانشمندیوں بیکار ثابت ہو رہی تھیں۔ رومی خاں رات ہی سے سرنگ بچھانے میں مصروف تھا۔ اس نے درہ کے جانناز تھانظروں کو توپوں، گولوں اور جرات کے بیشمار لشکر کے دماغ کی طرف متوجہ رکھا اور اس طرح سے سرنگ کو نہایت ہی ہوشیاری کے ساتھ مکمل کر لیا۔ کال ایک گھنٹہ گزر چکا ہے کہ فلیتہ میں آگ لگائی جا چکی ہے۔۔۔۔۔ مگر درہ بیکا کے جانناز محافظ آئے والی ہولناک مصیبت سے بے خبر دفاع کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ گولے سین ویسار سے پھٹ پھٹ کر گر رہے ہیں۔ تلوار اور نیزے چاروں طرف سے برس رہے ہیں۔ مگر چند سو جانناز راجپوتوں کا وجود ایک مضبوط چٹان ہے۔۔۔۔۔ درہ بیکا کے چٹانوں سے بھی مضبوط۔۔۔۔۔ بہت زیادہ مضبوط۔۔۔۔۔ جس سے بے شمار فوجوں، گولوں، تلواروں اور نیزوں کا سیلاب ٹکرا ٹکرا کر اٹنے پاؤں واپس چلا آتا ہے۔ ایک دھماکا ہوا اور درہ بیکا اڑ گیا۔۔۔۔۔ اور اس کے ساتھ بوندی کا راجگمار مع اپنے چند سو بہادر راجپوتوں کے راہی جنت ہوا۔ دشمنوں کی فوج میں خوشی کا لغزہ بلند ہوا کیونکہ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ بس اب قلعہ فتح ہو گیا لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ یہ چتور کا قلعہ ہے دشمنوں

۱۲ راجپوتوں کو ٹوپ سے بڑی نفرت تھی چنانچہ اسی بنا پر وہ اس کو "پلٹھ" کہا کرتے تھے

کو بہت دیر تک خوشی نصیب نہیں ہوئی کیونکہ جب دہوئیں کا ابر پھٹا تو انھوں نے دیکھا کہ بہادران چطور کا دوسرا دستہ مقابلہ کے لئے کھڑا ہوا ہے۔ یہ راؤدر گا تھا جو چندوت کے بہادر سردار ستو اور دو دو اور دوسرے بہادران راجستھان کے ساتھ، یونڈی کے راجگمار کی جگہ لینے کے لئے پہنچ گیا تھا۔ مگر چند راجپوت ایک بیشمار لشکر اور ”پلھ“ آلات حرب کا کلب تک مقابلہ کرتے۔ ہوا وہی جو ہونا تھا سب کے سب چطور کی عزت و حرمت پر فدا ہو گئے۔ مگر اب بھی دشمنوں کی مراد پوری نہ ہوئی کیونکہ رانی جو اہر بانی راٹھور نے ان کی جگہ لے لی تھی۔ رانی فوجی لباس پہنے ہوئے تھی اور بہادر راجپوتوں کو لاکار لاکار کر دشمنوں کی صفوں کو درہم برہم کر رہی تھی مگر اس بہادر راجپوتی کا بھی وہی حشر ہوا جو ہونا تھا۔

اب دفاع فضول تھا۔ محض جنون تھا اس لئے بہادر راجپوتوں نے آخری فیصلہ کر لیا کہ ہم سب لوگ کٹ مریں گے۔ مگر اودے سنگہ کو بچانا ضروری تھا۔ کیونکہ چطور کے دفاعی دستہ کی سرداری ہی کر سکتا ہے جس کی رگوں میں شاہی خون دوڑنا ہو۔ اس لئے دیولا کے راجگمار باگھ جی نے فوراً بڑھ کر میواڑ کا علم اٹھالیا۔ اور اودے سنگہ کو یونڈی کے راجگمار سورتاں کے سپرد کر دیا گیا۔ ان ضروری انتظامات کے بعد فائدہ کا پھانٹک کھول دیا گیا۔ راجپوتانہ کے موسم گرما کا آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ تازت آفتاب، لوؤں کی لپٹ، اور ناقابل برداشت گرمی کی حدت کی وجہ سے کسی انسان کا کھڑا ہونا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ لیکن گجرات کا لشکر کثیر تھا، سامان رسد، اور ہر قسم کے سامان وافر تھے اس لئے گجراتی لشکر برابر بڑھ رہا تھا۔ مگر چطور کے جانباز سپاہیوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ سامان رسد اور دوسرے ضروری سامان بھی ختم ہو چکے تھے۔ لیکن اس وقت وہ فتح کے لئے نہیں۔ مرنے کے لئے آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گجرات کے عظیم الشان لشکر کو دسیان میں نہیں لارہے تھے کہتے ہیں کہ گھسان کا معرکہ ہوا۔ شام تک جنگ جاری رہی اور جانبازان چطور ایک ایک کر کے کٹ مریں۔

یہاں تو یہ ہذا تھا اور قلعہ کے اندر تیرہ ہزار عورتیں زعفرانی ساریاں پہنے، ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ لگا کر گویا کہ وہ دوسری دنیا میں اپنے شوہروں سے ملنے کے لئے جا رہی ہیں، رانی کرناوتی کے ساتھ جلتی ہوئی آگ میں کود پڑیں اور اس طرح سے انھوں نے اپنی مقدس آبرو۔۔۔۔۔ جو گنگا کے مقدس پانی کی طرح پاک تھی۔۔۔۔۔ جو رات کے چمکیلے ستاروں سے زیادہ چمکیلی تھی۔۔۔۔۔ جو پہاڑ پرانی شہنشی صبح سے زیادہ دلفریب تھی، گجرات کے ”جوشی“ سپاہیوں کے ہاتھوں سے بچالی۔

چنار گروہ سے چطور تقریباً ۵۲۵ میل ہے۔ ہمایوں نے شیرشاہ کا اظہار اطاعت قبول کرنے کے بعد

لبی بن کرناوتی اور اپنے بھانجے اودے سنگھ کو بہادر شاہ والی گجرات کے حملہ سے بچانے کے لئے چتور کی طرف کوچ کر دیا۔ لیکن ایک عظیم الشان لشکر، سامان رسد، سامان حرب، یہ سب اسباب تھے جن کی وجہ سے تیزی کے ساتھ منزل طے نہیں کی جاسکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہمایوں سارنگ پور پہنچا تو اس کو چتور کی ہولناک تباہی کی اطلاع ملی۔ اس کے کلیجہ پر ایک چوٹ لگی۔ اس کا دل بے حد حساس، واقع ہوا تھا۔ بہت دیر تک غم و غصہ کے گہرے سمندر میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور فوراً بہادر شاہ کو جواب تک چتور ہی میں تھا ایک خط لکھا۔ خط میں بہادر شاہ کو بہت ملامت کی گئی تھی اور اس کو خبردار کیا گیا تھا کہ جو حشر چتور کا اس کے ہاتھوں ہوا ہے۔ وہی حشر گجرات کا ہونے والا ہے۔

(۷)

بہادر شاہ کا لشکر بہت بڑا تھا، سامان حرب کی بھی کمی نہیں تھی، پھر چتور کی فتح نے گجراتی سپاہیوں کے حوصلے بھی بڑھادیے تھے۔ گجراتی سرداران فوج کے حوصلے بھی بڑھے ہوئے تھے اور ان کی رائے تھی کہ فوراً حملہ کر دیا جائے لیکن رومی خاں کی رائے ہوئی کہ اردو کے چاروں طرف حصار باندھ کر جنگ کی جائے۔ بہادر شاہ رومی خاں کی گولہ اندازی کا لوہا مانے ہوئے تھا اور اس کو صائب الرائے بھی سمجھتا تھا اس کے علاوہ اس پر کچھ ایسا رعب چھا گیا تھا کہ اس نے رومی خاں کی رائے پر ہی عمل کرنا مناسب سمجھا۔

مالوہ کے علاقہ میں منڈو کے قریب میدان جنگ قرار پایا۔ گجراتیوں نے اپنے فوجی کیمپ کے چاروں طرف خندقیں کھود دی تھیں اور بڑی بڑی توپیں لگا دی تھیں۔ اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ ہمایوں کا ایک لشکر ہی بھی گجراتی کیمپ کے اندر گھسنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ دقت یہ تھی کہ گجراتی لشکر کا ایک سپاہی بھی اپنے حصار سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ گجرات، مالوہ، اور دوسرے مقامات کے راستوں پر جہاں سے رسد پہنچ سکتی تھی، مغلوں کا قبضہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کو مشکل سے دوہینے گذرے تھے کہ سامان رسد کی کمی سے سپاہی اور گھوڑے بھوک سے مرنے لگے۔ مجبور ہو کر بہادر شاہ ایک رات چپ چاپ اپنے پانچ امرا کیساتھ شاہی خیمے نکل کر منڈو بھاگ گیا۔ گجراتی سپاہیوں کو جب اپنے بادشاہ کی غدارئی کی خبر ملی تو وہ ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور سارا فوجی کیمپ مع مال و اسباب اور آلات حرب کے ہمایوں کے لئے چھوڑ گئے۔ لیکن ہمایوں کو تو بہادر شاہ کی گرفتاری کی تو مٹی ہوئی تھی۔ وہ فوراً اپنی پوری فوج کے ساتھ بہادر شاہ کے تعاقب میں منڈو کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب ہمایوں منڈو پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ اور اتفاق سے رات بھی اندھیری تھی اور پھر سفر کی تکان سے چور بھی تھا لیکن بہادر شاہ کو گرفتار کرنے کے لئے بے چین تھا۔ اسبابے چین تھا کہ رات کی تاریکی، سفر کی تکان، غرض کہ کسی قسم کی مشکل اس کی بے چینی کی آگ کو بجھا نہیں سکتی تھی۔ اسی وقت

میجر ڈومو:- سمندری خاریشت۔ سیاہ اور سفید مچھلیاں
کچھوے۔ گھونٹے، سیب۔

سیزر:- پچھلی بھی ہے؟

میجر ڈومو:- جی ہاں۔

سیزر:- برطانوی کستور اچھلی؟

میجر ڈومو:- برطانوی کستور اچھلی سیزر۔

سیزر:- تو پھر وہی منگاؤ (میجر ڈومو غلام کو حکم دیتا ہے اور

غلام اس کی تمہیں کو بھلا جاتا ہے) میں برطانیہ میں غلام رہ چکا

ہوں۔۔۔۔۔ خشکی کا وہ آخری ٹکڑا جو تمام دنیا

کو گھیرنے والے سمندر میں واقع ہے۔ میں وہاں قیمتی

موتیوں کی تلاش میں گیا تھا۔ ہم برطانوی موتی

کی حکایت سنا کرتے تھے۔ لیکن اس کی تلاش میں

ہم نے برطانوی کرم صدف پایا۔

اپالو ڈورس:- تمام نسلیں تمکو اس کیلئے دعا دینگی۔

(میجر ڈومو سے) سمندری خاریشت میرے لئے۔

روفیو:- کوئی خشک چیز نہیں جس سے شروع کریں۔

کلیو پیٹرا:- میجر ڈومو۔ بٹھنے ہوئے مرغ لاؤ۔

بٹھنے ہوئے مرغ۔

روفیو:- ہاں یہ کافی ہوگا۔

کلیو پیٹرا:- (دلاج سے) جھکی بطخ میرے لئے۔

میجر ڈومو:- سیزر اپنی مرضی کے مطابق شراب کا

انتخاب خود کریں تو بہتر ہے۔

سیزر:- میرے لئے سادہ پانی لاؤ۔

روفیو:- (بجد آزرده خاطر ہو کر) میرے لئے سسلی کی

شراب لاؤ۔

کلیو پیٹرا:- (منہ بنا کر) سیزر تم کو دعوت دینے میں تضحیح
اوقات کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ ہمارے کھانے ٹمکو
پسند نہیں آتے۔

سیزر:- اچھا۔ اچھا۔ تجھے لیبیا کی شراب دو۔ میجر ڈومو

سیزر کا جام بھر دیتا ہے پھر کلیو پیٹرا اور اپالو ڈورس کا) لیکن

جب میں روم واپس جاؤں گا۔ تو ان فضول چیزوں

کے متعلق تو انہیں نافذ کروں گا اور ان قوانین کی سختی

سے پابندی کراؤں گا۔

کلیو پیٹرا:- اس کی اس وقت کوئی فکر نہ کرو۔ آج تو

تم کو اور لوگوں کی طرح عیش پسند بننا ہی پڑے گا۔

(دہانہ ہاتھ میز پر آگے کی طرف بڑھا دیتی ہے)

سیزر:- اچھا صرف ایک مرتبہ میں اپنے آرام کی قربانی

کروں گا۔۔۔۔۔ (اس کا ہاتھ جوم کر) اب تم کو

اطمینان ہوا یا نہیں؟

کلیو پیٹرا:- اور اب تم اس بات کا یقین تو نہیں کہتے

کہ میں تمہارے روم چلے جانے کی منتہنی ہوں۔

سیزر:- میں کسی بات پر یقین نہیں کرتا۔ میرا دماغ سو گیا

ہے۔ اس کے علاوہ کون جانتا ہے کہ میں روم

واپس جاؤں گا یا نہیں؟

روفیو:- (خوفزدہ ہو کر) کیا؟

سیزر:- روم میں اب میرے لئے اور کیا نئی چیز رہ

گئی ہے، وہاں کے تمام سال یکساں ہوتے ہیں

اور وہ کوئی نئی بات بجز اس کے پیش نہیں کرتے کہ

میں زیادہ بڑھا ہوتا جا رہا ہوں۔

اپالو ڈورس:- سحر کی حالت بھی ویسی ہی ہے۔ بیٹھو

کلیو پیٹرا :- نہیں نیل میرا جد ہے۔ اور وہ ایک دیوتا ہی
اوہ۔ میں نے کچھ اور سوچا ہے خود نیل ہی اس کا
نام تجویز کر لے گا۔ ہم کو اسی سے کہنا چاہئے۔

(مجرڈ موسے) اس کو بلو او۔ (ذہنوں آدمی ایک
دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ مگر مجرڈ موسے
چلا جاتا ہے) (ایک پادری ایک چھوٹا سا مجسمہ ابوالہول
کاٹے ہوئے آتا ہے۔ پادری میز کے پاس آ کر مجسمے کو بیچ
میں رکھ دیتا ہے تب توں آدمی اس سے متاثر نہیں ہوتے۔
تاہم وہ کسی قدر تعجب و درہو جا رہے ہیں۔)

سیرز :- یہ کیا خرافات ہے ؟

کلیو پیٹرا :- تم کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ یہ
خرافات نہیں ہے۔ اس کو جائز طریقہ سے انجام دینے
اور اس کو خوش کرنے کے لئے ہمیں کسی چیز کی
قربانی کرنا چاہئے۔ لیکن میرا خیال ہے اگر اسے
صرف تھوڑی سی شراب دے دی جائے تو کافی
ہوگی۔

اپالوڈورس :- (اپنا سر ہٹا کر ڈاک کی طرف دیکھتا ہے۔)

ہم اپنے بازو سروس والے دوست سے کیوں پوچھیں
کلیو پیٹرا :- (بے چین سے) اُف۔ وہ تمہاری باتیں
سن کر غصہ ہو جائے گا۔

روفیو :- میرا خیال ہے کہ نیل کا منبع اس کے وطن
سے باہر ہے۔

کلیو پیٹرا :- نہیں میں اپنے چھوٹے ابوالہول کے سوا
اور کسی کو اس کا نام نہ رکھنے دوں گی۔ کیونکہ جب
سیرز آ کر مجھ سے ملا تو میں اسی جگہ پر تھی۔ (دہریز کو)

آدمی جب زندگی سے عاجز آجائے ہیں تو کہتے ہیں
ہم نے دریائے نیل کے منبع کے سوا اور سب کچھ دیکھ
لیا ہے۔

سیرز :- (ایک خاص تاثیر کے ساتھ) اور وہ دریائے نیل کا
منبع کیوں نہیں دیکھتے ؟ کلیو پیٹرا۔ کیا تم میرے ساتھ
دیکھنے چلو گی ؟ کیا ہم روم کو چھوڑ دیں ؟
روم جس نے عظمت حاصل کی ہے محض یہ جاننے
کے لئے کہ عظمت چھوٹے آدمیوں کی قومیت کو کس
طرح فنا کر دیتی ہے ؟ کیا میں تمہارے لئے
ایک نئی سلطنت کی بنا ڈالوں۔ اور اس غیر معلوم
عظمت میں تمہارے لئے ایک مقدس شہر تعمیر کروں ؟

کلیو پیٹرا :- (سرت سے) سرور۔ سرور۔

روفیو :- اب وہ افریقہ کو بھی فتح کرے گا۔

اپالوڈورس :- واقعی یہ بہت اچھی تحریک ہے۔ اس
میں سیرز صرف ایک فاتح بنا ہی نہیں ہے۔ بلکہ
ایک جدت آفریں شاعر اور ایک آرٹسٹ بھی ہے۔

اور ہم کو اس مقدس شہر کا نام تجویز کرنا چاہئے۔ اور
اس کے نام سے تیبیا کی شراب کا جام پینا چاہئے
سیرز :- اس کا نام خود کلیو پیٹرا رکھے گی !

کلیو پیٹرا :- اس کا نام "سیرز کا نذرانہ اپنی
عجیبیہ کو" ہوگا۔

اپالوڈورس :- نہیں نہیں۔ اس سے زیادہ وسیع
کوئی ایسا نام بناؤ جو ستاروں والے آسمان کی
غیر محدود فضا پیدا کرنے والا ہو۔

سیرز :- (غیر دلچسپ انداز سے) صرف "وادی نیل" ہی کیوں نہ ہو؟

تخص چاقولے ہوئے موجود ہے۔

سیر:۔ (اٹھتے ہوئے) خون!

اپالو ڈورس:۔ (بیکھے اپنا ہاتھ خاموش رہنے کو بلاتا ہے۔)

اوہ۔ خاموش۔ کیا تم لوگوں نے سنا؟

سیر:۔ دوسری آواز؟

اپالو ڈورس:۔ (میز کے پاس اپنا کر نہیں میں خیال

کرتا ہوں کہ ساحل پر کوئی چیز گری ہے۔)

سیر:۔ (بہت خوفزدہ ہو کر) میز سے ہسٹ کر سٹولوں

کے قریب آتا ہے رو فیو اس کی بائیں جانب ہتا

ہے اور اپالو دوسری جانب۔)

کلیو پیٹرا:۔ (اب بھی اپنی پہلی جگہ میز پر بیٹھے ہوئے) سیر

کیا تم مجھے چھوڑ دو گے؟ اپالو ڈورس کیا تم جاہتے

ہو؟

سیر:۔ اپالو ڈورس صحن میں جا کر دیکھو کیا ہوا؟

(اپالو ڈورس سر کو جنبش دے کر جلا جاتا ہے جس سیر سے

رو فیو ادھر جڑھا تھا)

کلیو پیٹرا:۔ تمہارے سپاہیوں نے کسی کو مار ڈالا۔ خیر

نواں میں کیا حرج ہے؟

(ساحل کی طرف سے ایک شور سنائی دیتا ہے۔)

(سیر اپالو ڈورس کے ساتھ جانا چاہتا ہے کہ رو فیو ایک ہاتھ سے

اس کا کندھا پکڑ کر روک لیتا ہے۔ اس آواز میں فٹا تا بھت کے

آخری کنارے سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی آتی ہے۔ اسکی

آنکھوں میں ایک مضمحل، آسودگی جھلکتی ہے سیر سمجھتا ہے کہ شاید

وہ شراب زیادہ پی گئی ہے)

رو فیو:۔ (آہستہ سے) ان دونوں نے کوئی سازش کی ہے۔

دیکھ کر پادری کی طرف پلٹتی ہے) جاؤ میں خود پادری

ہوں۔ اور تمہاری خدمت میں خود انجام دوں گی۔

(پادری تنظیم غم کر کے چلا جاتا ہے۔)

اب ہم سب کو مل کر نیل سے درخواست کرنی چاہئے

شاید وہ میز پر کھٹکھٹانے گا۔

سیر:۔ کیا۔ میز کی کھٹ کھٹ؟ کیا اس جمہوریت

کی آنکھوں میں بھی واہمہ پرستی جاری ہے؟

کلیو پیٹرا:۔ واہمہ پرستی نہیں ہے۔ ہمارے پادری میزوں

تسے سیکڑوں باتیں دریافت کرتے ہیں۔ اپالو ڈورس

کیا یہ سچ نہیں ہے؟

اپالو ڈورس:۔ ہاں۔ ہاں۔ میں خود اس کا معتقد

ہوں جب کلیو پیٹرا پادری ہے تو اپالو ڈورس اسکا

شاگرد ہے حلف اٹھانے کی تحریک کرو۔

کلیو پیٹرا:۔ تم کو میرے ساتھ کتنا چاہئے۔ نیاپ

نیل۔ اپنی آواز ہم کو سناؤ۔“

چارول مل کر:۔ (مجسمہ کے سامنے اپنے اپنے گلاس اٹھا کر

باپ نیل اپنی آواز ہم کو سناؤ۔) (ایک انسان کی انتائی

درد و کرب میں نکل ہوئی آواز بواب دیتی ہے۔ سب خوفزدہ

ہو کر اپنے اپنے جام رکھ دیتے ہیں۔ اور سننے لگتے ہیں۔ سیر

کلیو پیٹرا:۔ برنظر ڈالتا ہے۔ اور اُسے دیتا کے سامنے اپنی شراب

انتہائی تشکر آمیز نگاہوں سے اندھینا ہوا پاتا ہے اپالو ڈورس

اچھلتا ہوا جھت کے کنارے آواز سننے کو جاتا ہے)

سیر:۔ (کلیو پیٹرا کو گور کر) یہ کیا تھا؟

کلیو پیٹرا:۔ کچھ نہیں۔ شاید کسی غلام کو مار رہے ہیں

رو فیو:۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کے اندر ایک

فتاتا:- ملکہ پھر اپنے غلام کے چہرہ کو دیکھ رہی ہے۔
 (کلیو پیٹرا ایک لمحہ کے لئے تعریف کن انداز اس کے قتل کے
 ارادے کے اظہار کو محسوس کرتی ہے بھر وہ اپنے دونوں ہاتھ
 اس کی گردن میں جائل کر لیتی ہے اسے دیوانہ وار پیار کرتی ہو
 اور تمام زبور توڑ کر اس کے سر پر لاد دیتی ہے۔۔۔ دونوں
 آدمی اس منظر کی طرف سے ہلٹ کر ایک دوسرے کو دیکھنے
 لگتے ہیں۔ فتاتا آہستہ آہستہ قریبانگاہ کے پاس پہنچتی ہے۔ آ
 سے سامنے جھک جاتی ہے اور اسی حالت میں عبادت کرنی ہو
 سیر روفیو کو ستون کے پاس جھوڑ کر کلیو پیٹرا کے پاس
 جاتا ہے)

سیر روفیو:- (جس جتنا انداز سے) کلیو پیٹرا کیا ہوا؟
 کلیو پیٹرا:- (بہت ہلکے) عزیز سیر روفیو کچھ نہیں (وہ اس کے
 پاس محبت آمیز انداز سے جاتی ہے) پیارے، سیر کیا تم
 مجھ سے ناراض ہو؟ تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ
 رہے ہو؟ میں نے تمام وقت تمہارے ساتھ گزارا
 ہے۔ مجھے کیا معلوم کیا ہوا۔؟

سیر روفیو:- (موز انداز سے) یہ سچ ہے۔
 کلیو پیٹرا:- (بچہ اطمینان سے اس سے محبت کا اظہار کرتی ہو)
 درحقیقت یہ سچ ہے۔ (وہ اس کے اظہار محبت کا جواب
 نہیں دیتا) روفیو تم بھی جانتے ہو کہ یہ سچ ہے۔
 (شور یکایک بلند ہو کر غائب ہو جاتا ہے)

روفیو:- مجھے اب معلوم ہو جائیگا۔ (وہ بے لگ بڑھاکر
 قریبانگاہ کی طرف جاتا ہے اور فتاتا کے شانے پر ہاتھ رکھ دیتا
 ہے) خاتون محترم مجھے آپ کی ضرورت ہے۔
 فتاتا:- (اٹھتے ہوئے) میری جگہ ملکہ کے پاس ہے۔

کلیو پیٹرا:- اس نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا روفیو۔
 سیر روفیو:- (روہوت سے) اس کو ٹھہرنے دو۔
 روفیو:- (قریبانگاہ پر ہلکے) بہت خوب تو میری جگہ بھی
 یہیں ہے۔ اور اب تم لوگ خود دیکھ سکتے ہو
 کہ کیا واقعہ ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں ایک
 طوفان بے تمیزی برپا ہے۔
 سیر روفیو:- (متین اضطراب سے) روفیو۔ اطاعت
 کے لئے ایک وقت ہوتا ہے۔
 روفیو:- اور استقلال کا بھی ایک موقع ہوتا ہو
 (وہ اپنے دونوں ہاتھ باندھ لیتا ہے۔)

سیر روفیو:- (کلیو پیٹرا سے) اس کو باہر جانے کا حکم دو۔
 کلیو پیٹرا:- ہاں میں حکم دوں گی۔ سیر میں ہمیشہ
 تمہارے حکم کی تعمیل کروں گی۔ کیونکہ مجھے تم سے
 محبت ہے فتاتا باہر چلی جاؤ۔
 فتاتا:- ملکہ کا حکم میری مرضی ہے۔ میں ملکہ کے بلانی
 کے لئے قریب ہی ٹھہرتی ہوں (وہ آ کے پاس
 سے گزر کر جاتی ہے)

روفیو:- (ساتھ ساتھ) سیر یہ یاد رکھو کہ تمہاری
 جان کا محافظ بھی قریب ٹھہرا ہوا ہے۔
 (وہ اس کے ساتھ چلا جاتا ہے)

کلیو پیٹرا:- (سیر کی اس اطاعت کا احساس کرتے ہوئے
 جو وہ روفیو کی کرتا ہے اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور ستونوں
 کے درمیان بیچ پر بیٹھ جاتی ہے)

کلیو پیٹرا:- تم روفیو کو کیوں اجازت دیتے ہو کہ
 وہ تمہارے ساتھ اس طرح پیش آئے۔ تم کو

اُسے بتانا چاہئے کہ اسکا کیا مرتبہ ہے ؟
سیرر :- اس کو میرا دشمن بننا سکھاؤ۔ تاکہ وہ اپنے خیالات
مجھ سے چھپکے جیسا کہ تم اس وقت چھپا رہی ہو۔
کلیو پٹیرا :- (اس کا خوف پھر عود کر آتا ہے) سیرر تم یہ کیوں
کہتے ہو۔ درحقیقت میں تم سے کچھ نہیں چھپا رہی ہوں۔
تم تیرے ساتھ اس طرح پیش آنے میں غلطی پر ہو۔
(وہ رونے لگتی ہے) میں صرف ایک بچہ ہوں۔ اور پتھارا
دل پتھر کا ہوا جاتا ہے محض اس خیال سے کہ کوئی انھیں
مار ڈال لیا ہے۔ میں اس کو برداشت نہیں کر سکتی۔
(وہ ارادتا رونے لگتی ہے۔ وہ اس کو انتہائی نمکین اور بے پردہ
انداز سے دیکھتا ہے وہ پھر ادھر دیکھتی ہے اور یہ معلوم کر کے کہ اسے
ترس نہیں آیا۔ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ اپنے جذبات سے کشمکش
کرتے ان پر قابو پانا چاہتی ہے اٹھ بیٹھتی ہے)
ہاں مجھے معلوم ہے کہ تم آنسوؤں سے نفرت کرتے ہو۔
اب تم کو ان سے صدمہ نہ پہنچے گا۔ میں جانتی ہوں
کہ تم غصہ میں ہو۔ صرف رنجیدہ ہو، میں اس قدر بے
وقوف ہوں کہ جب تم مجھ سے سرد مہری سے گفتگو
کرتے ہو تو میں اس سے پریشان ہوئے بغیر نہیں رہ
سکتی۔ دراصل تم سچائی پر ہو۔ یہ خیال کرنا کہ کوئی
مار لگایا کسی کو صدمہ پہنچا۔ بہت خوفناک اور
تکلیف دہ ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ حقیقت میں کوئی
خطرناک ————— (اس کی آواز نفرت کا لہجہ اختیار کر کے
حلق میں رک جاتی ہے)

سیرر :- تم کو کس نے خوفزدہ کر دیا۔ ؟ تم نے کیا کیا
ہے ؟ (سائل پر ایک بگل کی آواز آتی ہے) اہا ہا یہ آواز

جواب کی طرح معلوم ہوتی ہے۔
کلیو پٹیرا :- (تھر تھراتی ہوئی بیچ پر گر پڑتی ہے اور ہاتھ سے منہ
چھپالیتی ہے) میں نے تم کو دہوکہ نہیں دیا۔ سیرر میں
قسم کھا کر کہتی ہوں۔

سیرر :- مجھے معلوم ہے۔ میں نے تم پر اعتماد نہیں کیا
(وہ اس کی طرف سے پلٹ کر جانے کا ارادہ کرتا ہے کہ پٹیرا
اور بری ٹینس سیٹیں کو گھسیٹتے ہوئے لاتے ہیں رو فیو سا
آتا ہے سیرر کا نپ اٹھتا ہے) پھر پھپھی کا قاتل !

رو فیو :- میرا خیال ہے کہ سارا شہر پاگل ہو گیا ہے وہ
محل کو مسمار کرنے اور ہم کو بھگا دیتے پر تلا ہوا ہے میں
نے مجمع کو صحن سے باہر کرنے وقت اس کو پکڑا ہے۔
سیرر :- اس کو چھوڑ دو (وہ اس کے باوجود چھوڑ دیتے ہیں)

سیٹیں شہریوں کو کس بات پر غصہ ہے ؟
لو سیس :- تم نے کیا سوچا ہے سیرر ؟ پو تھینس انکا
بے حد عزیز رہتا تھا۔

سیرر :- پو تھینس کو کیا ہوا ؟ میں نے اسے ابھی
رہا کر دیا۔ ادھا لٹھنہ بھی نہ گزرا ہوگا۔ کیا انھوں نے
اسے باہر نہیں جانے دیا ؟

لو سیس :- ہاں زمین سے ساٹھ فٹ بلند گیلری کی
کمان میں وہ مردہ ٹھہرا ہے اور اس کی پسلیوں میں
ایک چاقو تین فٹ لمبا پیوست ہے۔ وہ پتھپی
کی طرح مردہ ہے۔

سیرر :- (بے حد خوفزدہ ہو کر) قتل کر ڈال گیا۔ ہمارا
قیدی۔ ہمارا اہمان (وہ برہم انداز سے رو فیو کی طرف
دیکھتا ہے) رو فیو —————

رونیو:- (سوال پر غور کرتے ہوئے موثر انداز سے) جس نے ایسا کیا وہ ایک عقلمند اور تمہارا دوست تھا۔ (کلیو پیٹیرا بے حد نڈر ہو جاتی ہے) لیکن ہم میں سے کسی نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ اس لئے مجھ پر غصہ ہونا بیکار ہے (سیر پلٹ کر کلیو پیٹیرا کو دیکھتا ہے)

کلیو پیٹیرا:- (اٹھ کر ٹھکانہ انداز سے) وہ لگنے مصر کے حکم سے مارا گیا۔ میں سیر کی طرح خواب دیکھنے والی نہیں ہوں۔ جو ہر غلام کو اپنی توہین کرنے کی اجازت دوں۔ رونیو نے ابھی بیان کیا کہ میں نے اچھا کام کیا۔ اب دوسرے حاضرین بھی اس کا فیصلہ کریں گے۔ (وہ دوسروں کی طرف پلٹی ہے) اس پوٹینس نے مجھ سے اس امر کی خواہش کی کہ میں اس کے ساتھ سازش کر کے سیر کو ٹالمی اور اچیلس کے حوالے کر دوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے کوسا اور پھر سیر کے پاس آیا کہ تنہائی میں اس کو سمجھا کر اپنی اس مکاری کو میرے سر تھوپے میں نے اس کو اس دغا بازی کو عملی جامہ پہناتے وقت بکرا لیا۔ اس نے میری توہین کی یعنی ملکہ مصر کی۔ میرے منہ پر۔ سیر مجھ سے انتقام نہ لے گا۔ اس نے اس سے گفتگو کی اور پھر اس کو رہا کر دیا۔ کیا میں خود اپنا انتقام لینے میں حق بجانب نہ تھی؟ بولو۔ لوسیسی!

لوسیسی:- میں اس کو غلط نہیں کہہ سکتا۔ لیکن سیر اس کے معاوضہ میں تمہارا شکر یہ ادا نہ کرے گا۔ کلیو پیٹیرا:- بولو۔ اپالو ڈورس۔ کیا میں غلطی پر تھی؟ اپالو ڈورس:- میں صرف ایک ہی لفظ الزام کا

باتا ہوں اور بے حد خوبصورت۔ تم نے مجھے پناہ ایک سردار کہہ کر مخاطب کیا ہوتا۔ اور میں کشتی میں اس غیبت کرنے والے کو قتل کر ڈالتا۔

کلیو پیٹیرا:- (عظمیٰ انداز سے) اب میں تمہارے غلام سے بھی پوچھنا چاہتی ہوں۔ سیر! بری ٹینس لول کیا میں غلطی پر تھی؟

بری ٹینس:- اگر مکاری، جھوٹ اور بیوفانی کی کوئی سزا نہ دی جاتی تو سوسائٹی کی شکل درندوں کی ایک تماشہ گاہ بن جاتی۔ جہاں وہ ایک دوسرے کو بھانڈا کھاتے۔ سیر غلطی پر ہے۔

سیر:- (اضطراب آفریں غاموشی سے) تو معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ میرے خلاف ہے۔

کلیو پیٹیرا:- (ہمت زور دیکر) سنو سیر! اگر اسکندریہ میں ایک بھی ایسا آدمی مل جائے جو یہ کہے کہ میں غلطی پر ہوں تو میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ محل کے پھاٹک پر اپنے غلاموں کے ہاتھوں سے سولی پر لٹاک جاؤ گی سیر:- اگر ساری دنیا میں ایک آدمی، ابھی یا کبھی یہ جاننے کے لئے مل سکے کہ تم نے غلطی کی تو اس آدمی کو یا تو میری طرح ساری دنیا کو فتح کرنا پڑے گا یا اس کے ذریعہ سولی پر چڑھ جائے گا۔ (سرداروں کا شور پھر سنائی دیتا ہے) تم سنتی ہو۔ یہ دروازے پر کھٹکھٹانے والے بھی انتقام اور قتل پر یقین کرتے ہیں۔ تم نے ان کے رہنما کو قتل کر ڈالا تو یہ بھی جائز معلوم ہوتا ہے کہ وہ تم کو قتل کریں۔ اگر تم کو اس میں شک ہو تو اپنے چاروں شیروں کے دریافت کر لو

لی ہیں۔ میں صرف ایک خواب دیکھنے والا ہوں۔
کلیو پیٹرا:۔ لیکن وہ مجھے مار ڈالیں گے۔
سیزر:۔ اور کیوں نہ ماریں؟
کلیو پیٹرا:۔ رحم۔

سیزر:۔ رحم۔ کیا یہ اس قدر جلد اس حالت
 پر پہنچ گیا ہے کہ تم کو سوائے رحم کے اور کچھ نہیں
 بچا سکتا۔ کیا اس نے پو تھینس کو بچایا؟
 (وہ اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے اٹھتی ہے اور پھر نہایت
 مایوسانہ انداز سے بیچ پر جا بیٹھتی ہے۔ ابا لودوس اپنی
 ہمدردی کا اظہار کرنے کے لئے اس کی بیچ کے پیچھے جا کر کھڑا
 ہو جاتا ہے۔ اب آسمان کا رنگ بدلتا ہے اور وہ بہت جلد
 تاریخی ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ستون اور مجسمے دھندلے
 نظر آنے لگتے ہیں)

اور اس سچائی کے نام پر۔ دانتائی نفرت سے زور دیتا
 ہے) کیا میں ان سب کو اپنی ملکہ کے قتل کرنے پر
 قتل نہ کروں گا۔ اور اس کے عوفن یہاں کے
 باشندے مجھے اس لئے قتل کر ڈالیں گے کہ میں نے
 ان کے وطن کو لوٹا اس پر حملہ کیا۔ اور تیار روم
 ان قاتلوں کو قتل کے بغیر چین سے بیٹھے گا؟ محض
 دنیا پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ روم کس طرح اپنی
 عزت اور فرزندوں کا انتقام لیتا ہے۔ اور اس
 لئے تاریخ کی انتہا پر۔ قتل کی نسل، عزت اسیجائی
 اور امن کے نام سے بڑھتی رہے گی۔ یہاں تک کہ
 دیوتا ان خون آشامیوں سے بیزار ہو جائیں اور
 ایک ایسی قوم پیدا کریں۔ جو سمجھ سکتی ہے۔

(غونٹاک شور۔ کلیو پیٹرا خوف سے زرد پڑ جاتی ہے) وہ
 لوگ نہیں جن کی توہین نہ ہونی چاہئے۔ ان کے
 پاس جاؤ۔ تاکہ الفاظ سمجھ میں آسکیں۔ تم ان کو
 پو تھینس کے الفاظ سے زیادہ دلخراش اور روح
 فرسا پاؤ گے۔ (آہستہ آہستہ ایک وقار کے ساتھ
 اٹھتے ہوئے) اب ملکہ متھر کو انتقام کا حکم سنانے
 دو۔ اور اپنی محافظت کی طیاری شروع کرنے دو۔
 کیونکہ اس نے سیزر کو قبول نہیں کیا۔

(وہ جانے کو ہلٹتا ہے)

کلیو پیٹرا:۔ (خوفزدہ ہو کر اس کے پاس دوڑ کر گھٹنوں
 پر گرے ہوئے) سیزر مجھے برباد نہ کرو۔ اور اس
 محل کو بچاؤ۔

سیزر:۔ تم نے حیات و موت کی طاقتیں خود لے

رو فیوڈ:۔ وعظ کافی ہو چکا۔ دشمن پھانگ پر آ گیا ہو۔
سیزر:۔ (اس کی طرف پلٹ کر غصہ سے) ہاں۔ اور
 اتنے مہینوں تک اس کو کس بات نے دروازہ
 پر روک رکھا تھا یہ میری بیوقوفی تھی، جیسا تم
 کہتے ہو۔ یا تمھاری دانائی؟ اس مصری خون
 کے سمندر میں کس کے ہاتھوں نے تم لوگوں کے
 سروں کو موجوں سے اوپر رکھا؟ (کلیو پیٹرا سے)
 اور پھر بھی یہ حالت ہے کہ سیزر ایک شخص کو
 حکم دیتا ہے۔ ”دوست تم آزاد ہو اور آزادانہ
 جا سکتے ہو“ اور تم، جو اب میری تلوار پکڑ کر اپنی
 ننھی سی جان کی حفاظت کے لئے کہہ رہی ہو یہ
 جرأت کرو۔ کہ چھپ کر نکل جاؤ۔ اور اس کی پیٹھ پر

سیر:۔ (رنجیدگی سے) اوہ کم ظرف۔ کم ظرف۔
 لوسٹیس:۔ (کلیو پیٹرا اور سیر کے بیچ میں آکر) سنو سیر۔
 تم حیر اور ذلیل کہہ سکتے ہو لیکن اس سے میرا معنوم یہ
 بھی ہے کہ جس قدر زیادہ ممکن ہو میں زندہ رہوں۔

سیر:۔ اچھا۔ میرے دوست تو معلوم ہوتا ہے تم سیر سے
 زیادہ زندہ رہو گے۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ میں نے کوئی
 جادو کیا ہے جس نے تمہاری فوج اور سارے شہر کو
 اتنے دنوں تک خلیج ہی پر روک رکھا۔ کل ان کو مجھ سے
 کیا عداوت تھی کہ وہ میرے خلافت کھڑے ہو کر اپنی جان
 خطرہ میں ڈال دیتے۔ لیکن آج ہم نے ان کے رہنا کو
 مار کر ان کے سامنے ڈال دیا۔ اور اب ہر شخص اس
 خون کے نشمن کو صاف کرنے پر آمادہ ہے۔ کیونکہ ہم
 ایسے ہی ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ تو اب ہمت
 سے کام لو۔ اور اپنی تلواروں پر بار بھرا کھو پیٹی
 کا سر جدا ہو چکا ہے، اور سیر کا سر بھی عمر طبعی کو پہنچ
 گیا ہے۔

سیر:۔ (عظمت کے انداز سے) وہ جس نے کبھی کوئی موقع
 نہیں کی، کبھی نا امید نہیں ہو سکتا۔ سیر، عیش اور
 غم کے وقت صرف اپنی قسمت کی تحریر ہی پر نظر رکھنا ہی
 لوسٹیس:۔ قسمت پر نظر رکھنا ہے۔ اور وہ سیر پر آتی
 طرح مسکرائیگی جیسی ہمیشہ مسکراتی رہی ہے۔

سیر:۔ (غبار ادا یعنی سے) کیا تم میری ہمت افزائی کا ارادہ کرتے
 لوسٹیس:۔ میں آپ کے سامنے اپنی خدمات پیش کرنا ہوں۔
 میری ضرورت ہو تو میں اپنی جگہ بدل سکتا ہوں۔
 (سیر ایک ایک زمین پر آکر، اس کو غور سے دیکھتا ہے اور یہ نتیجہ نکالتے

جاتے ہیں۔) "دو تاروں کی خواہش ہے کہ میں اپنا
 ہاتھ کھول دوں اور تم سب کو طوفان میں ڈوب
 جانے دوں۔"

کلیو پیٹرا:۔ (ایک ٹکارا نہ توخ کیساتھ) لیکن سیر اگر تم ایسا کرو گے
 تو اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارو گے۔
 (سیر کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں)

روفیو:۔ (دھمکتے ہو کر) جو پیٹرا کی قسم ہی وہ لفظ ہے جو سیر
 کو مجبور کرے گا کہ وہ یہاں سے نکلے شہر میں چلا جائے اور ہم
 لوگوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دئے جانے کے لئے یہاں چھوڑے
 (سیر سے) کیا تم کو محض اس لئے چھوڑ دوں گے کہ ہم بوقوت
 ہیں میں قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ میں فطرتاً
 اس کو اسی خوبی سے انجام دیتا ہوں جیسے ایک کٹا
 بلی کو مارتا ہے۔ ہم سب تمہاری پاپوش کے پاس
 پڑے رہنے والے کہتے ہیں۔ لیکن ہم ہمیشہ سے آپ
 کے وفادار رہے ہیں۔

سیر:۔ افسوس۔ روفیو۔ میرے لڑکے میرے لڑکے ہم
 سب کتوں کی طرح سڑک پر مرنے والے ہیں۔

اپا لوٹورس:۔ (بے جلد سے) سیر تم جو کچھ کہتے ہو اس کو صحیح
 ہونا چاہئے۔ تاہم میں کلیو پیٹرا ہی کا طرفدار ہوں۔ اگر
 ہنگو مرنا ہی ہے تو اسے کسی آدمی کی محبت یا کسی آدمی
 کے بازوؤں کی طاقت کی ضرورت نہ ہوگی۔

کلیو پیٹرا:۔ روک لیکن میں مرنا نہیں چاہتی۔

(وہ سیر کی طرف دوڑ کر میز پوش اٹھا لیتا ہے اور انگلی شراب میں ڈبو کر اسیر ایک نقشہ بنا تا ہوا لوہیسیس اور رو فیو اس کے پاس آ کر دیکھنے لگتے ہیں۔ تقریباً روشنی غائب ہو جاتی ہے) یہاں محل ہے (نقشہ برانگلی سے دکھا کر) یہاں میدان ہے۔ تم (رو فیو) بیس آدمی لو اور اس سڑک (نقشہ پر دکھا کر) سے جائیں گا ہاٹہ کرو۔ اور جب وہ تمہیں سنگباری کریں۔ تو اس طرف سے فوج کے پارے جاؤ۔ میرے راستے ٹھیک ہیں۔ کیا ٹھیک ہیں لوہیسیس؟

لوہیسیس :- ہاں یہ انجیر کا بازار ہے۔

سیرز :- (اسکو سننے کے لئے بہت گہرا ہٹ سے) ہاں ہم نے ان کو یہاں پہنچ کر دیکھا تھا۔ اچھا (وہ کپڑا میرے پھینک دیتا ہے اور پھر ستونوں میں آتا ہے) جاؤ بری ٹینس ٹرینس سے کہو کہ نصف ساعت میں مغربی جھیلوں کے لئے ہمارا فوجیں جہاز پر قبضہ کر لیں۔ میرے گھوڑے اور زردہ بکتے لاؤ (بری ٹینس جانا ہے) باقی کے ساتھ میں جھیل کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ اور متھری ڈیٹس سے ملنے کیلئے ریل تک پہنچ جاؤں گا۔ جاؤ لوہیسیس یہ پیغام پہنچا دو۔

(لوہیسیس بری ٹینس کے بعد خود بھی تیزی سے چلا جاتا ہے)

اپالو ڈورس لاؤ اپنی تلوار بچھے دو اور اس مہم میں میرا دایاں بازو بن کر بچھے مر دو۔

اپالو ڈورس :- بسرو چشم۔

سیرز :- (اس کا ہاتھ بکڑ کر) کیا تم کام کر سکتے تیار ہو؟

اپالو ڈورس :- ہاں فن کے لئے تیار ہوں۔ فن سپر گری کے لئے (وہ لوہیسیس کے پیچھے خود بھی تیزی سے جاتا ہے اور کلبو پٹرا کو یک نخت بھیجتا ہے)

ہوتے کہ اس پیشکش کے پردہ میں کوئی راز ہے) کیا اس جگہ؟

لوہیسیس :- ہاں اسی جگہ!

رو فیو :- کیا تمہارا خیال ہے کہ سیرز اس قدر پاگل ہے کہ وہ تم پر اعتماد کرے گا۔

لوہیسیس :- میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے اس وقت تک بھروسہ نہ کرے جب تک فتح نہ ہو جائے۔ میں صرف اپنی زندگی کے لئے درخواست کرتا ہوں اور سیرز کی فوج کی کمان کرنے کی۔ اور چونکہ سیرز بہت صاف سوداگر ہے اس لئے میں بیعانہ بھی ادا کر دوں گا۔

سیرز :- بیعانہ ادا کر دے گا۔ کیسے؟

لوہیسیس :- ایک خوشخبری سے۔

رو فیو :- کیا خوشخبری؟

سیرز :- کیا خبر۔ کیا خبر۔ کیا میرے لڑکے رو فیو تم نے کہا! کمانگ آگئی ہے۔ اور کیا خبریں ہم سے متعلق ہیں۔ کیا لوہیسیس ایسا نہیں ہے۔ متھری ڈیٹس آ رہا ہے۔

لوہیسیس :- اس نے پلوسیم پر قبضہ کر لیا ہے

سیرز :- (سرت سے) لوہیسیس سٹپیں اس وقت سے تم میرے ایک سردار ہو۔ رو فیو۔ مصریوں نے اپنے ہر ایک سپاہی کو متھری ڈیٹس کو روکنے کے لئے ریل پر بھیجا ہوگا۔

اب سڑکوں پر آدمیوں کے ہجوم کے سوا اور کچھ نہیں ہے

لوہیسیس :- بالکل درست ہے متھری ڈیٹس بڑی سڑک سے ممفیس کی طرف جا رہا ہے تاکہ وہاں کے ادھر سے دریا پار کرے۔ چلیس ہاں اس سے مقابلہ کرے گا۔

سیرز :- اچلیس سیرز سے وہاں لڑے گا۔ دیکھو رو فیو۔

رو فیو:۔ کھیل کھیلا جاتا ہے اور بار بار جاتا ہے کلیو پیٹرا

اور عورت کو ہمیشہ بدترین حصہ ملتا ہے۔

کلیو پیٹرا:۔ (غصہ سے) جاؤ۔ اپنے آقا کے ساتھ جاؤ۔

رو فیو:۔ (اسکے کان میں دستانہ) پہلے ایک بات سنو۔ اپنے

قاتل سے کہو کہ اگر پوچھنیس مناسب طریقہ سے مارا

جاتا۔ یعنی گردن کے ذریعہ سے۔ تو وہ اس قدر

ہنگامہ نہ مچاتا۔ تمہارے آدمی نے اس کے کام

کو تقویت دی۔

کلیو پیٹرا:۔ تمکو کیسے معلوم ہوا کہ وہ ایک آدمی تھا؟

رو فیو:۔ (خیر پریشان ہو کر) تم نہیں تھیں۔ جب یہ واقعہ

ظہور میں آیا تو تم ہمارے پاس تھیں (دو انداز نفرت اسکا ہون

سے اپنی پیٹھ پٹا لیتی ہے۔ وہ ایسا سر پلاتا ہے اور باہر جانے کیلئے پردہ

کھینچ لیتا ہے اب یہ خوشگوار چاندنی کا وقت ہے، میرا ہٹا دیگی ہے۔

قاتلانوں اور چاند کی روشنی میں بھرتی کی قربانگاہ پر مصروف عبادت

نظر آ رہی ہے رو فیو چونک بڑھا ہی۔ بھر پردہ دوبارہ آہستہ سے بند کر دیتا

ہے۔ اور آہستہ سے کلیو پیٹرا کو مخاطب کرتا ہے، کیا وہ یہ بھی؟

اپنے ہاتھ سے؟

کلیو پیٹرا:۔ (دھمکا کر) جو بھی ہو۔ میرے دشمنوں کو چاہئے

کہ اس کی طرف سے خبردار رہیں۔

رو فیو:۔ (دانت پیکر اس کو دیکھتے ہوئے) کلیو پیٹرا میں اسکو

دیکھوں گا۔ (دو وعدہ کے استحکام کی خاطر اپنا سر پلاتا ہے اور

ادراہنی تلوار میان میں رکھتا ہوا پردہ سے باہر نکل جاتا ہے)

رومی سپاہی:۔ (نیچے صحن میں) سیر ز زندہ باد۔ سیر

زندہ باد۔ (کلیو پیٹرا سنٹی ہے بھر بڑا بگل بچتا ہے اور اس کے

ساتھ اور بگلوں کی آوازیں آتی ہیں)

رو فیو:۔ آؤ۔ یہ ایک قسم کا نفل ہے۔

سیر:۔ (سرت سے) کیا یہ نہیں ہے میرے لڑکے؟

(وہ تالی بجاتا ہے۔ غلام میر کی طرف آتے ہیں، اب ان فضولیاں

کی ضرورت نہیں۔ جاؤ یہ تمام چیزیں لیکر یہاں سے

پہلے جاؤ۔ میری نظروں سے ان کو جلد دور کرو۔

(غلام سیر کو ہٹانے لگتے ہیں، اور بڑے سوتیلوں کو ڈھانکتے ہوئے

کھینچ لے جاتے ہیں) رو فیو۔ تم سڑکوں کو متعلق اچھی طرح

سب جانتے ہو؟

رو فیو:۔ جی ہاں۔ مجھے یقین ہے کہ میں بخوبی واقف

ہوں میں ان سڑکوں پر ہر وقت جا سکتا ہوں۔

(بگل کی آواز نیچے صحن سے آتی ہے)

سیر:۔ تو آؤ۔ اب ہم کو فوج سے گفتگو کر کے انکا دل

بڑھانا چاہئے۔ تم ساحل پر جاؤ میں صحن کی طرف

جاتا ہوں۔ (وہ سیر ہی کی طرف جاتا ہے)

کلیو پیٹرا:۔ (اپنی جگہ سے اٹھ کر جہاں وہ اب تک بالکل خاموش پڑی

تھی اور کسی نے اس کی پروا نہ کی تھی سیر کی طرف ڈرتے ڈرتے اپنے

ہاتھ دھاڑتے ہوئے) سیر

سیر:۔ (پلٹ کر) ایہہ۔

کلیو پیٹرا:۔ کیا تم مجھے بھول گئے ہو؟

سیر:۔ میں اس وقت مشغول ہوں۔ جب میں آپس

آؤں گا تو تمہارے معاملات کا تصفیہ کیا جائیگا۔

خدا حافظ۔ اب صبر اور استقلال سے کام لو۔

(وہ بالکل بے اعتنائی اور انہماک کے انداز سے جاتا ہے وہ مٹھیاں

بند کر کے اٹھتی ہے۔ اور اس کے چہرہ پر انتہائی غیظ و غضب کے آثار

نمایاں ہو جاتے ہیں۔)

کلیو پیٹرا:۔ (اپنے ہاتھ مل کر بکارتے ہوئے) فتاتا۔ فتاتا۔ اندھیرا ہو گیا، اور میں تنہا ہوں میرے پاس آؤ (سکوت) فتاتا (دور سے) فتاتا (سکوت) بے چین ہو کر وہ پردوں کی رستی کھینچ لیتی ہے اور پرے علیحدہ ہو جاتے ہیں فتاتا، مردہ، سرتن سے جدا، آؤ کی قربان گاہ پر بڑی ہوتی ہے۔ خون سفید پتھر پر بہ رہا ہے۔

ایک نظم

تھوار کا دن۔

ٹھیک دوپہر۔ محل کے سامنے فوج آراستہ کھڑی ہوئی ہے مشرقی ساحل پر سیزر کی فوجیں زرق برق لباس میں نظر آ رہی ہیں اور اس بل کے قریب کھڑی ہیں جہاں سے ابالوڈورس کا بس لیکر اترتا تھا۔ ایک وی محافظ گذر گاؤں پر لگائی کے لئے بیان متین ہو۔ جہاں سے ایک فوج بریک پڑ چھا رہا گیا ہے۔ جو محل کے سامنے مرکزی پھاٹک پر شمال کی جانب گڑھا جاتا ہے۔ پھاٹک کی کتادہ سیزر میاں کلیو پیٹرا کی سہیلوں سے معمور ہیں جو نہایت چمکدار اور ریشمی اور رنگین لباس میں ملبوس ہیں۔ اور پھولوں کا ایک باغ معلوم ہوتی ہیں۔ سامنے کے حصے میں اسکے ماذاف صفت بانٹے کھڑے ہیں۔ شمالی حصے میں رومی سپاہ استاد ہے ان میں بلزنار، عجمی اور رسالدار، نہایت اچھے لباس پہنے ہوئے موجود ہیں۔ (ابالوڈورس شہریوں کے درمیان سے راستہ نکالتا ہوا آتا ہے،

اور رومی سپاہ کچھچھ سے انہروں کو بکارتا ہے)

اپالوڈورس:۔ کیا میں گذر سکتا ہوں؟

رسالدار:۔ جاؤ سستی کے ابالوڈورس۔

(سپاہی اُسے جانے کو راستہ دیتے ہیں)

بلزنار:۔ کیا سیزر قریب ہے؟

اپالوڈورس:۔ ابھی نہیں۔ وہ ابھی بازار ہی میں ہے۔ میں سپاہیوں کا شور و غل زیادہ نہ سن سکتا تھا۔ ایک شخص نصف گھنٹہ تک فوجی جوش و خروش کا اظہار کرتے کے بعد ہندسہ کی ہوا میں سانس لینے کی خواہش کرتا ہے۔

عجمی:۔ کو کیا خبر لائے؟ کیا اس نے پادریوں کو قتل کر ڈالا ہے؟

اپالوڈورس:۔ نہیں۔ وہ اس حالت میں اُس سے بازار میں ملے کہ انکے سروں پر رکھ پڑی ہوئی تھی اور وہ اپنے دیوتاؤں کو ہاتھ میں لئے ہوئے تھے انہوں نے اپنے دیوتا اسکے قدموں پر ڈال دیئے۔ ان دیوتاؤں میں قابل دید ایپس (Aps) تھا۔ جو سونے اور ہاتھی دانت کا ایک عجیب و غریب مجسمہ تھا۔ میری رائے سے اسے اسکے معاوضہ میں بڑے پادری کو دو ٹیلینٹس دیئے بلزنار:۔ (خوفزدہ ہو کر) ایپس۔ صرف دو سیلنٹ میں پھر بڑے پادری لئے کیا کہا؟

اپالوڈورس:۔ ایپس سے رحم و کرم کی درخواست کی۔ بلزنار:۔ اب اسکی وجہ سے ملک میں قحط اور طوفان آئے گا۔ عجمی:۔ اور پھر۔ ایپس نے کیوں ایپس سے سیزر کو مروا نہیں ڈالا۔ اپالوڈورس، جنگ کی کوئی تازہ خبر؟

اپالوڈورس:۔ چھوٹا تالمی غرق کر دیا گیا۔

بلزنار:۔ غرق کر دیا گیا۔ کیسے؟

اپالوڈورس:۔ اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ۔

سیزر نے تین طرف سے ان پر ایک وقت حملہ کیا۔

اور سب کینیل میں بھگا دیا۔ تالمی کا بیڑا ڈوب گیا۔

پلڑتار :- یہ سیزر ایک عجیب الخلق آدمی ہے! کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ جلد آئے گا؟
اپالوڈورس :- جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو وہ
ہودیوں کا قصبہ طے کر رہا تھا۔

شمال کی جانب سے جنگوں کی آواز آتی ہے اور لوگوں میں ایک
ہل چل مچ پاتی ہے۔ سیزر آنے کی اطلاع ہوتی ہے،

عجمی :- اسنے ان کا کام ختم کر دیا۔ وہ دیکھو آ رہا ہے۔
(وہ مصری سپاہ کے سامنے اپنی جگہ پر دوڑتا ہے۔)

پلڑتار :- (ہسکے ساتھ) وہ دیکھو سیزر آ رہا ہے۔

(سپاہی بالکل سیدھے کھڑے ہو کر اپنا لباس درست کرتے ہیں۔)

اپالوڈورس مصری سپاہ کی طرف جاتا ہے)

رسالدار :- (گنہ گاہ کے محافظ کے پاس دوڑ کر) سیدھے
کھڑے رہو۔ سیزر آ رہا ہے۔

(سیزر رید کے علاوہ اور اپنے تمام مساجوں کے ہمراہ آتا ہے۔
بری ٹینس ساتھ ساتھ ہے۔ سپاہی لغزہ مسرت کے ساتھ اس کا استقبال

کرتے ہیں۔)

سیزر :- مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرا جہاز میرا منتظر ہے۔ سیزر
کا ہتھ کو خدا حافظ کہنے کا وقت آ گیا ہے۔ اور روینیو
اب میرے جانے سے قبل اور کس کام کی تکمیل باقی
رہ گئی ہے؟

روینیو :- (اسکی بائیں جانب سے) آپ نے ابھی اس صوبہ
کے لئے کوئی رومی گورنر نہیں مقرر کیا۔

سیزر :- (اس کی طرف تیر انداز سے دیکھ کر انتہائی متانت سے) تم
میری مدد کرنے والے اور مجھے اس مصیبت سے نجات
دلاؤ تو اے، اپنی تیر کے وزیر اعظم پر کا اس کے مستحق نہیں

کے متعلق کیا کہتے ہو؟

روینیو :- کیوں، اس کی تلو پھر ضرورت پڑیگی۔ کیا آپ نے
یہ فراموش کر دیا کہ وطن واپس جاتے وقت آپ کو راستے
میں تین یا چار لشکروں سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔؟

سیزر :- بالکل درست۔ خیر مگر اب یہ بتاؤ کہ تم نے متعلق کیا کہتے ہو؟
روینیو :- میں! میں ایک گورنر۔ تم کیا جواب دیتے ہو؟ کیا تم نہیں
جاننے کہ میں ایک آزاد منش آدمی کا بیٹا ہوں؟

سیزر :- (شفقت سے) کیا سیزر نے تلو اپنا فرزند لکھ کر نہیں مخاطب
کیا؟ (تمام حاضرین کو مخاطب کر کے) ایک منٹ کیلئے خاموش رہو
اور جو کچھ میں کہتا ہوں غور سے سنو۔

رومی سپاہ :- سیزر کا حکم سنو۔

سیزر :- ایک رومی گورنر کی خدمات، صفات، مرتبہ اور
نام سنو۔ خدمات کے لحاظ سے سیزر کی ڈھال، اوصاف

کے لحاظ سے سیزر کا دوست۔ مرتبہ کے لحاظ سے ایک
رومی سپاہی۔ (رومی سپاہ لغزہ مسرت بلند کرتی ہے) اور نام

نامی روینیو۔ (فوج دوبارہ لغزہ مسرت بلند کرتی ہے۔)

روینیو :- (سیزر کے ہاتھ کو بوسہ دیکر) ہاں میں سیزر کی ڈھال
ہوں۔ لیکن جب میں سیزر کے شاؤنوں کے ساتھ نہ
رہوں تو یہ ڈھال بیکار چیز ہوگی۔ خیر۔ مگر کوئی حرج
نہیں (وہ اپنے آپ کو سمجھاتا ہے اور جلا جاتا ہے)

سیزر :- میرا برطانوی غلام کہاں ہے؟

بری ٹینس :- (سیزر کے دائیں ہاتھ کی طرف بڑھ کر)

سیزر :- وہ یہاں موجود ہے۔

سیزر :- مجھ سے یہ بتاؤ کہ تم نے کس نے کہا تھا کہ تم اپنے
کی جنگ میں اپنے وطن کے جنگی لغزہ لگاتے ہوئے

کو دپڑو تھے کسکو ناشائستہ ناموں سے مخاطب کیا؟
برمی ٹینیس :- سیزر۔ میں آپ سے یہ التجا کرتا ہوں کہ جو الفاظ
جوش و خروش کے عالم میں میری زبان سے نکل گئے
ان کو معاف کیجئے۔

سیزر :- اور تھے کس طرح نہز کو پار کیا جب تم تیر نہیں سکتے۔
برمی ٹینیس :- میں نے آپ کے ٹھوڑے کی دم پکڑ لی تھی۔
سیزر :- برمی ٹینیس، یہ ایک غلام کے کام نہیں ہیں
بلکہ ایک آزاد آدمی کے کارنامے ہیں۔

برمی ٹینیس :- سیزر میں آزاد ہی پیدا ہوا تھا۔
سیزر :- لیکن ان لوگوں نے تمکو سیزر کا غلام کہہ کر مخاطب کیا۔
برمی ٹینیس :- صرف سیزر کا غلام ہی بندگی میں سے
حقیقی آزادی حاصل کی ہے۔

سیزر :- (متاثر ہو کر) بہت خوب کہا۔ جیسا کہ میں ناشکر گزار
ہوں۔ اسی لحاظ سے میں تمکو آزاد کر دینا چاہتا تھا۔
لیکن اب ایک لاکو ٹیلنٹ کے معاوضہ میں بھی
تمکو ہداہتہ کروں گا (دو دو سنانہ طور پر اسکے شانے پر تھپتھپاتا
گلتا ہے۔ برمی ٹینیس اس کا ہاتھ پکڑ کر چومتا ہے)

بلز نار :- (عج سے) یہ رومی جانتا ہے کہ آدمیوں کو کس
طرح اسکی اطاعت کے قابض بنایا جاسکتا ہے۔
گٹھی :- ہاں۔ ایسے انکار پسند آدمی جو کبھی اسکے
خوفناک دشمن نہیں بن سکتے۔

بلز نار :- ادچالاک۔ اوتر شر۔

سیزر :- (بالوڈرس کو ہماری صفت میں بکھ کر بکارتے ہوئے)
اپالوڈورس۔ میں تمہارے آرٹ تمہاری نگرانی میں
دیتا ہوں۔ یاد رکھو۔ روم کو آرٹ سے محبت ہے اور

وہ اسکی ترقی کی خاطر بلا چون و چرا مدد دینے کو تیار ہے
اپالوڈورس :- سیزر میں سمجھتا ہوں۔ روم خود آرٹ
پیدا نہ کریگا۔ لیکن جو دوسری قومیں پیدا کریں گی وہ
ان کو خرید کر اپنے ساتھ لے جائیگا۔

سیزر :- کیا۔ روم آرٹ پیدا نہ کریگا۔ کیا صلح و امن کوئی
آرٹ نہیں ہے؟ کیا جنگ ایک آرٹ نہیں ہے؟ کیا
گورنمنٹ ایک آرٹ نہیں ہے؟ کیا تہذیب ایک آرٹ
نہیں ہے؟ ہم تمکو یہ سب چیزیں صرف چند زبور اور جوہرا
کے عوض لے رہے ہیں۔ اور تم اس سودے سے بہت فائدہ
میں رہو گے۔ (بلت سر دیتے ہیں) اور اب سوار ہونے سے پہلے
کس کام کی تکمیل باقی رہ گئی ہے؟ (کوشش کر کے یاد کرتے ہوئے)
ہاں مجھے خیال پڑتا ہے کہ کوئی بات مجھے یاد نہیں آ رہی
ہے۔ وہ کیا ہو سکتی ہے؟ ہاں۔ ہاں، اسکو نامکمل
ہی رہنا چاہئے۔ رو فیو خدا حافظ۔

رو فیو :- سیزر میں تم کو بنیر ڈھال کے روم جانے کی اجازت
دینے پر مجبور ہوں۔ وہاں بہت سے دشمن ہیں۔

سیزر :- کوئی حرج نہیں ہے، میں واپس جاتے وقت اپنی
زندگی کے فریض ختم کر دوں گا۔ اور پھر میں بہت
دنوں تک زندہ رہوں گا۔ اسکے علاوہ میں نے موت
کے خیال کو ہمیشہ ناپسند کیا ہی۔ بہتر ہوتا کہ میں بارڈالا
جاؤں۔ خدا حافظ۔

رو فیو :- (ایک آہ بھر کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے) خدا حافظ۔

(دو دنوں مصافحہ کرتے ہیں)

سیزر :- (اپالوڈورس کی طرف ہاتھ ہلاتے)

خدا حافظ اپالوڈورس اور تمام میرے دوست

اپنی منشا کے مطابق کرے گا۔
کلیو پیٹرا:- تمہاری منشا کے مطابق نہیں۔
سیزر:- (بریشان ہو کر) میری منشا سے کیا مطلب ہے؟
کلیو پیٹرا:- بغیر سزا کے۔ بغیر انتقام کے اور بغیر انصاف کے۔

سیزر:- (اعتراف کرتے ہوئے) ہاں۔ یہی ٹھیک راستہ ہے۔ سب سے زیادہ ممکن اور مناسب راستہ۔ (روفیو سے) روفیو اگر تم سے ہو سکتا ہے تو اس پر یقین کرو۔

روفیو:- کیوں۔ سیزر میں اس پر یقین کرتا ہوں۔ تم نے بہت پہلے مجھے اس پر یقین دلایا ہے۔ لیکن دیکھو۔ تم آج نیومیڈیا کے سفر پر روانہ ہو رہے ہو۔ اب یہ بتاؤ کہ اگر وہاں ایک بھوکے شیر سے سامنا ہو تو تم اس کو اپنے نکل جانے پر سزا نہ دو گے؟

سیزر:- (تعب سے سوچتے ہوئے) اس سے اس کا کیا مطلب ہے؟
روفیو:- نہ اس سے ان لوگوں کے خون کا انتقام لو گے جن کو اس نے شکار کیا۔

سیزر:- نہیں۔
روفیو:- نہ اس کو اسکے جرم پر تنبیہ کر دو گے۔
سیزر:- نہیں۔

روفیو:- تو پھر تم اس سے اپنی جان بچانے کے لئے کون سا طریقہ استعمال کرو گے؟
سیزر:- (بیزی ہے) بندہ خدا مار ڈالوں گا۔ جیسا کہ

(سیزر بھاد کی طرف بڑھتا ہے۔ کلیو پیٹرا۔ رنجیدہ اور سیاہ لباس میں ٹونٹ، بلیک کرسی زور یا جواہرات کے، محل سے اتر کر سیڑھیوں پر آتی ہے۔ سیزر اس کو اس وقت دیکھتا ہے جب وہ بولتی ہے) کیا کلیو پیٹرا کیلئے اس وانگی میں کوئی حصہ نہیں ہے۔
سیزر:- (مسرت سے) آہ۔ میں سوچ رہا تھا کہ کچھ کرنا باقی ہے (روفیو سے) روفیو تم نے مجھے کس طرح اس بات کو بھول جانے دیا؟ (جلدی سے اس کی طرف دوڑ کر) اگر میں تم کو دیکھے بغیر چلا جاتا تو کبھی اپنی اس غلطی کو معاف نہ کرتا (وہ اس کے ہاتھ بڑھ لیتا ہے۔ اور سب کے بیچ میں لگتا ہے۔ اور اس کے کہنے کے مطابق کرتی ہے) کیا یہ سوگ میرے لئے ہے؟

کلیو پیٹرا:- نہیں۔

سیزر:- (افسوس سے) اوہ۔ یہ میری کس قدر کم فہمی تھی! یہ تمہارے بھائی کے لئے ہے!

کلیو پیٹرا:- نہیں!
سیزر:- پھر کس کے لئے؟

کلیو پیٹرا:- اپنے رومی گورنر سے دریافت کرو جبکو تم نے ہمارے لئے چھوڑ دیا ہے۔

سیزر:- روفیو؟

کلیو پیٹرا:- ہاں۔ روفیو (وہ نفرت سے اس کی طرف اشارہ کرتی ہے) وہ جو اب سیزر کے نام سے یہاں کا حاکم ہے۔ سیزر کی تقلید کرتا ہے۔ اور سیزر کے قوانین پر چلتا ہے۔

سیزر:- کلیو پیٹرا وہ اس طرح حکومت کریگا۔ جیسی اس سے ممکن ہے اسے اب یہ کام اپنے سر لیا ہے۔ اور

تو میں دوبارہ کبھی تمھارے ہاتھوں کو نہ چھوتا۔
لیکن یہ فطری قتل ہے۔ میں اس پر خوف زدہ
نہیں ہوتا۔

(روفیو مطمئن ہو کر کلیو پیٹرا کی طرف دیکھ کر سر ہلاتا ہے کہ وہ
اس بات کو ذہن نشین کرے)

کلیو پیٹرا:۔ (طفلانہ انداز سے) اب تمام دنیا کو معلوم
ہو جائے گا کہ سیر زکس قدر غیر انصاف پسند
اور دھوکہ باز ہے۔

سیر ز:۔ (اس کا ہاتھ تیرپٹا کر) آؤ مجھ سے ناراض
نہ ہو۔ مجھے اس طوطا تیا کے لئے افسوس ہے۔
(وہ ہنسی ہے) اوہو۔ تم ہنس رہی ہو۔ کیا اس
سے مطلب مکر اتحاد ہے؟

کلیو پیٹرا:۔ (دہنسی پر خود سے غصہ ہو کر) نہیں۔ نہیں۔
نہیں۔ البتہ صرف تم کو طوطا تیا کہتے سن کر ہنسی
آتی ہے۔

سیر ز:۔ کیا! اب بھی بچہ ہی ہو کلیو پیٹرا؟ کیا
میں نے تمکو ایک عورت نہیں بنا دیا۔

کلیو پیٹرا:۔ یہ تم ہو جو ایک بڑے بچے ہو۔ تم مجھے یہ قوت
بنانا چاہتے ہو۔ کیونکہ تم سنجیدگی سے پیش نہیں آتے
لیکن تم میرے ساتھ ناروا سلوک کیا ہے۔ اور
میں تم کو معاف نہیں کرتی۔

سیر ز:۔ مجھے خدا حافظ کہو۔

کلیو پیٹرا:۔ میں نہ کہوں گی۔

سیر ز:۔ (خوشامداً) میں روم سے ایک بہت اچھا
تحفہ تم کو بھیجوں گا۔

وہ خود کرے گا۔ اس شیر کے استعارہ سے کیا مقصد
ہے تمھارا؟

روفیو:۔ کیوں؟ کلیو پیٹرا کے پاس ایک شیرنی تھی
جو اس کے حکم سے لوگوں کو قتل کر ڈالتی تھی۔

میں نے
سوچا کہ کہیں وہ کسی روز تمکو قتل کر لیا حکم نہ

دیکھے۔ اگر میں سیر ز کا شاگرد نہ ہوتا تو میں نے اس
شیرنی کے ساتھ معلوم نہیں کیا کیا مخلصانہ باتیں
کی ہوتیں۔! میں نے اس کو سزا دی ہوتی۔
میں نے اس سے پوچھنیس کا انتقام لیا ہوتا۔

سیر ز:۔ (اعادہ کرے) پوچھنیس!

روفیو:۔ (جاری رکھتے ہوئے) میں نے اس کا امتحان
کیا ہوتا۔ لیکن ان تمام یہ قوتیوں کو میں نے پس
پشت ڈال دیا۔ اور ابیر کسی افسوس کے اس کی
گردن جدا کر دی۔ اور اسی وجہ سے کلیو پیٹرا تمھارے
پاس ماتمی لباس میں آئی ہے

کلیو پیٹرا:۔ (غصہ سے) اس نے میری کنیز فنانا کا خون
کیا ہے۔ سیر ز اس کا خون تمھاری گردن پر بھی
ہے۔ اگر تم اس کو آزاد چھوڑ دو۔

سیر ز:۔ (تیزی سے) بہتر ہے میری گردن پر ہو۔

کیونکہ یہ بہت اچھا ہوا۔ روٹیو۔ اگر تم نے اپنے
آپ کو منصف کی جگہ بیٹھا پایا ہوتا۔ اور اس

عورت کو مستعد در سوم کے بعد کسی جلاو کو قتل
کرنے کے لئے دیا ہوتا۔ کہ انصاف کے نام
سے لوگوں کے سامنے اس کی گردن ماری جائے

مجھے توقع نہیں کہ اب ہم دونوں کی پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔

(وہ اس کی پیشانی کا بوسہ لیتا ہے۔ وہ بہت متاثر ہوتی ہے سبز بہانہ پر سوار ہو جاتا ہے)

رومی سپاہی :- (جب وہ اپنا پاؤں جھاز پر رکھتا ہے۔) زندہ باد سب سب۔
خدا حافظ۔

(وہ جھاز پر پہنچ کر روٹیوں کو ہاتھ کے اشارہ سے جواب دیتا ہے۔)

اپالوڈورس :- (کلیو پیٹرا سے) عزیز منگہ آنسو بہاؤ۔ انہوں نے تمہارے غلام کا دل توڑ دیا۔ وہ چند روز کے بعد واپس جائے گا۔

کلیو پیٹرا :- مجھے اُمید نہیں ہے۔ لیکن میں رونا ضبط بھی نہیں کر سکتی۔

(وہ اپنا رومال سبز کی طرف ہلاتی ہے۔ اور جھاز حرکت کرتا ہے)

رومی سپاہی :- (اپنی تلواریں ہوا میں بلند کر کے) سب سب زندہ باد

محشر عابدی

کلیو پیٹرا :- (تمک سے) روم مجھ کی ادے سکتا ہے جو مصر میں موجود نہیں۔

اپالوڈورس :- سب سب یہ سچ ہے۔ اگر تحفہ یقینی خوب صورت ہوگا۔ تو وہ مجھے تمہارے لئے اسکندریہ میں خریدنا پڑے گا۔

سب سب :- میرے دوست تم ان خزانوں کو شاید بھول رہے ہو جنگی وجہ سے روم مشہور ہے تم انکو اسکندریہ میں نہیں دیکھ سکتے۔

اپالوڈورس :- سب سب وہ کیا ہیں۔
سب سب :- اسکے فرزند۔ او کلیو پیٹرا مجھ معاف کرو اور خدا

حافظ کو۔ اور میں تمکو ایک آدمی بھیجوں گا جو سہرے

پاؤں تک دم کا شریف ترین انسان ہوگا۔ تم نہیں کہتے اور بلا اور سنگدل نہیں۔ اسکا سر نجانہ ہوگا۔ نہ اسکے کندھے جھکے ہونگے۔ بلکہ تیز اور چالاک۔ مضبوط اور جوان۔ دن بھر لڑنیوالا۔ اور رات بھر عیش اڑانے

والا۔ کیا تم سب سب کے بدلے ایسا آدمی لوگی؟

کلیو پیٹرا :- اس کا نام۔ اس کا نام۔

سب سب :- مارک انطونی؟

روٹیو :- خاتون تم اس سودے میں گھائے میں رہو گی۔ اگر انطونی کو سب سب کے بدلے لوگی۔

سب سب :- تو اب تم مطمئن ہو!

کلیو پیٹرا :- تم پہ لوگے تو نہیں!

سب سب :- میں نہ بھولوں گا۔ خدا حافظ۔

جانے گا ورنہ باوجود کوشش اور محنت کے بھٹک جائے گا۔ یہی طور میرے خیال میں قرب الہی کا بھی ہونا چاہئے۔ معاف کیجئے گا میری اس جسارت کو کہ آپ جیسے جید عالم مجھ کے مضامین پر ایک قسم کی رائے زنی کرتا ہوں۔ لیکن یہ الفاظ محض ایک رو میں قلم سے نکل گئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میرے دل کو آپ کی طرف سے نادیدہ کیوں انسیت سی پیدا ہو گئی ہے

(ننگار) مجھے یہ معلوم کر کے از بس مسرت حاصل ہوئی کہ آپ نے میرے عقاید اور مقاصد ننگار کے متعلق جو رائے قلم کی ہے وہ ننگار کا مطالعہ کرنے کے بعد قائم کی ہے اور آپ نے عوام کی طرح محض مولویوں کے غلط بردہاگندہ ابراہیماد کر کے مجھے کافرو لحد سمجھنے کا ثواب حاصل نہیں کیا۔

آپ اپنی تحریر میں ایک جگہ ظاہر فرماتے ہیں کہ ”میرے بعض اصول و عقاید سے آپ کو اتفاق نہیں۔“ بہتر ہونا اگر آپ ان کی صراحت فرمادیتے، کیونکہ تحریر گرامی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کا جو اعتقاد میں نے معلوم کیا ہے بعینہ وہی اعتقاد میرا بھی ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اصولاً آپ کو میرے کس خیال سے اختلاف ہے۔ ممکن ہے کہ آپ نے بعض فروعی مسائل کو اصول میں شامل کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہو یا یہ کہ میری بعض تعبیرات کو آپ ناپسند فرماتے ہوں۔ بہر حال آپ ہی کے دو مقررہ اصول کو سامنے رکھ کر اظہار خیال کی اجازت چاہتا ہوں، ممکن ہے یہ پردہ اٹھ جائے اور پھر آپ مجھے بھی اسی جگہ پر پائیں جہاں آپ کا پائے ثبات قائم ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ اعمال حسنہ اچھی چیز ہیں لیکن بلا صحیح وسیلہ کے کسی بارگاہ میں رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کے خیال میں قرب الہی بھی ضروری چیز ہے۔ معاف فرمائے اگر میں سب سے پہلے آپ سے یہ سوال کروں کہ ”کسی بارگاہ میں رسائی ہونے“ کا کیا مفہوم ہے اور ”قرب الہی“ سے آپ کا کیا مقصود ہے۔ اگر قرب الہی اور بارگاہ کی رسائی سے آپ کا مراد ایک ہی (اور غالباً ایسا ہی ہوگا) تو آئے سب سے پہلے اسی مسئلہ پر غور کر لیں کہ مذہبی زبان میں یہ الفاظ بول کر کیا مفہوم مراد لیا جاتا ہے اور حقیقت کے لحاظ سے یہ کیا ہیں؟ اتنا تو غالباً آپ بھی تسلیم کرتے ہوں گے کہ ”قرب الہی“ سے وہ نزدیکی یا مواصلت مراد نہیں ہو سکتی جیسی اس دنیا میں دو انسانوں یا دو مادی اشیاء کے درمیان پائی جاتی ہے اور نہ ”بارگاہ کی رسائی“ سے اس نوع کا قرب مقصود ہو سکتا ہے جیسا ایک غریب کسان کو کبھی کبھی آپ کے حضور میں حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر جب حقیقت یہ نہیں ہو تو غور کرنا چاہئے کہ اہل مذہب کی اس سے کیا مراد ہے اور وہ اس بند و موعظت سے کس نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں۔

میں اس وقت ذات باری کی حقیقت سے بحث نہیں کروں گا اور نہ اس اکھن میں پڑوں گا۔ کہ اس کی ذات و صفات میں تفریق ممکن ہے یا نہیں، بلکہ نہایت سادگی کے ساتھ صرف اس تعلق پر غور کروں گا جو خدا یا قدرت کے

ساتھ نوع انسانی کو حاصل ہے۔۔۔۔۔۔ یہ امر یقیناً محتاج صراحت نہیں کہ وہ خدا جسکو بے نیاز مطلق کہا جاتا ہے، وہ آفرینگار اعظم جو اپنی ذات سے ایک مستقل کمال ہے اور وہ قدرت جو بلا کسی رعایت کے ہر وقت مصروف کار ہے، کسی فانی مخلوق کی کبھی محتاج نہیں ہو سکتی اور نہ ہمارا کوئی فعل اس کو کسی طرح متاثر کر سکتا ہے۔۔۔۔۔۔ پھر جب حالت یہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ہمارے اعمال کا اثر ہماری ہی ذات پر ہونا چاہئے، ہماری ہی زندگی کو ان سے متاثر ہونا چاہئے اور ہماری اچھائیوں یا برائیوں کا دائرہ اثر ہماری معاشری و تمدنی زندگی سے آگے نہ بڑھنا چاہئے۔۔۔۔۔۔ یعنی اگر ہم اچھے کام کریں گے تو اس کا نتیجہ ہمارے ہی لئے بہتر ہوگا۔ اور اگر معاصی و بد اخلاقی میں مبتلا ہوں گے تو ہم خود تباہ و برباد ہوں گے۔۔۔۔۔۔ یہی ہے وہ نکتہ جس کو کلام مجید میں کہیں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ

ان الله لا یغیر بقوم حتی ینوبوہ وہ سبانا نفسہم

کسی جگہ۔۔۔۔۔۔ ان الله ینزل من یشاء۔۔۔۔۔۔ کہہ کر اس کی توثیق کی گئی ہے اور کہیں طرز زبان بدل کر اسی حقیقت کو اس طرح ظاہر فرمایا ہے کہ۔۔۔۔۔۔ فصل یھاک الالاقوم الغاسقون۔۔۔۔۔۔ اور کسی جگہ۔۔۔۔۔۔ ان الارض میں مشاہدہ عبادی الصالحون۔۔۔۔۔۔ سے اس راز کو کھول دیا گیا ہے۔

بہر حال آپ تمام کلام مجید کا مطالعہ کر جائے کوئی ایک آیت بھی ایسی نہ ملے گی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ہمارے اعمال خدا کو بھی کسی طرح متاثر کر سکتے ہیں اور اس کی برہمی یا خوشنودی کا مفہیم ہماری تباہی یا فلاح کے علاوہ کچھ اور ہے۔ اس لئے قرب الہی یا رسانی بارگاہ کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ٹھہر تاکہ اگر ہم اچھے اعمال کے پابند ہوں گے تو فلاح و ترقی کی صورت میں جو نتیجہ پیدا ہوگا۔ اسے مذہبی زبان میں قرب الہی سے تعبیر کریں گے اور اس کے برعکس اگر ہمارے اخلاق ذلیل و رومی ہوں گے تو تباہی و بربادی میں مبتلا ہو جائیں گے اور یہی ہے خدا سے دوری یا اس کی برہمی و ناخوشی۔۔۔۔۔۔ پھر اگر آپ خیال کو اور زیادہ وسیع کریں اور خدا و انسان کے تعلق پر زیادہ غائر نگاہ ڈالیں تو یہ آسانی یہ بھی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ دوزخ و جنت بھی اپنی اسی اہلیت و نا اہلیت سے مشعلق ہے۔ اور قومی خوشحالی و بربادی کے اظہار کے لئے ”جنات نعیم“ اور ”اسفل السافلین“ سے بہتر الفاظ کوئی اور ہو ہی نہ سکتے تھے۔

بہر حال اس سے تو آپ کو بھی انکار نہیں کہ انسان کو عقل و ہوش عطا کئے جانے کا اقتضار یہی ہونا چاہئے کہ اس کے

لہ عام طور پر اس کے یہ معنی لئے جاتے ہیں کہ اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، حالانکہ یہ لفظی کا معمولی بول چال فقرہ من یشاء واقع ہوا ہے اور یشاء کا ماحول حق ہے۔ اس لئے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ ہدایت دیتا ہے اس کو جو خود اپنی ہدایت چاہتا ہے۔

ایسے کاموں کی توقع کی جائے جو مقصود آفرینش ہے۔۔۔ پھر جب اصل چیز صرف اعمال حسنہ قرار پائے تو یہ کتنا کہ بلا صحیح وسیلہ کے کسی بارگاہ میں رسائی کیسے ہو سکتی ہے صرف یہی معنی رکھ سکتا ہے کہ ہم کو درستی اخلاق کے لئے کوئی صحیح و موثر طریقہ ضرور اختیار کرنا چاہئے۔۔۔ لیکن اس طریقہ یا وسیلہ کو اصل مقصود نہ قرار دینا چاہئے۔۔۔

النیات کا مشہور مسئلہ ہے کہ آلہ یا ذریعہ صرف ایک آلہ یا ذریعہ ہونے کی حد تک قابل اختیار ہوتا ہے نہ کہ اصل مقصود کی حیثیت سے۔۔۔ اور یوں بھی روز کی زندگی میں ہم اس حقیقت کا مطالعہ کر سکتے ہیں کہ وسیلہ مقصود، جادہ و منزل میں کتنا فرق ہے۔

اگر آپ نے اس حد تک میرے صحیح مدعا کو سمجھ لیا ہے تو بہ آسانی آپ کو معلوم ہو سکے گا کہ میرے اعتقادات اور ایک مولوی کے اعتقادات میں کیا فرق ہے۔۔۔ میں کیا کہتا ہوں اور وہ کیا سمجھنا چاہتا ہے۔۔۔ اصول مذکورہ بالا کی بنا پر میرا کہنا یہ ہے کہ تمام مذاہب عالم کا مقصود انسان کے اخلاق کو درست کرنا تھا۔ اور ان میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے ہر نیا دین اپنے پہلے دین کے لحاظ سے زیادہ مربوط و مستحکم آئین لے کر آتا تھا، جتنے کہ اسلام کا فلور ہوا اور اس نے ایک حرف آخر کی صورت سے ہمیشہ کے لئے انسان کو کسی اور مذہب کی استمداد سے بے نیا کر دیا۔۔۔ لیکن اسلام کا مذہب کیا تھا، اسلام کی تعلیم کیا تھی؟۔۔۔ (زیرا ایک بہت باریک نکتہ ہے جسے گوشگزار کرنا چاہتا ہوں)۔۔۔ صرف یہی کہ محض اخلاق حسنہ پیدا کرنا ہی اصل مذہب ہے، اور کسی مذہب کی پابندی صرف اس خیال سے کہ محض اس کی پابندی نجات و فلاح کے لئے کافی ہے یا نکل بے اصل چیز ہے۔۔۔ یہی وہ راز تھا جس کو غالب نے یوں بیان کیا ہے کہ

ملتیں جب منگیس اجزا ایمان ہو گئیں

یعنی اصل ایمان نام ہے مذہب ”ترک مذہب“ کا، محض درستی اخلاق کا اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اب اسلام کے تصور کے بعد کسی مذہب کی ضرورت دنیا میں باقی نہیں رہتی، کیونکہ اس کا مفہوم ہی یہ ہے کہ بغیر کسی پابندی رسم و رواج یا شاعرانہ ظاہری کے صحت اخلاق کو مطمح نظر قرار دیا جائے۔۔۔

پھر اگر حقیقت یہ نہیں ہے تو بتائیے کہ اسلام کا فطری مذہب ہونا کیا معنی رکھتا ہے، رسول اللہ کا جرمہ اللعاب ہونا کیا مفہوم رکھ سکتا ہے اور مسلمان کیونکر اخوت عامہ کے عالمگیر رشتہ سے شرق و غرب کے تمام انسانوں کو باہم دگر وابستہ کر سکتے ہیں۔

میں نے کبھی نہیں کہا کہ نماز و روزہ بری چیز ہے بلکہ ہمیشہ یہی ظاہر کیا کہ اگر ان سے درستی اخلاق مقصود ہو تو ان کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ لیکن میں اس کا قائل کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہوں کہ محض نماز پر طوطی لینا یا ایک مہینے کے روزے رکھ لینا ہی اصل ایمان ہے۔۔۔ یہ سب ذرائع و وسائل ہیں مقصود حقیقی

تک پہنچنے کے اسلئے اگر یہ منزل تک پہنچانے والے ثابت نہ ہوں تو ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور ہماری تمام عبادات جسدِ بے روح کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس جگہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر عبادات اسلام بجائے خود ضروری نہیں اور محض اخلاقِ حسنہ ہی پر انحصار ہو نجات کا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ غیر مسلم افراد بھی جو پاکیزہ اخلاق رکھتے ہیں ناجی نہ ہوں اور اس طرح اسلام کی خصوصیت پھر کوئی باقی نہیں رہتی۔۔۔۔۔ میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ بیشک یہی ہونا چاہئے کیونکہ میں نجات کا مفہوم لیتا ہوں وہ جو اسی دنیا کے فلاح و ترقی سے متعلق ہے اور وہ یومِ آخرۃ۔۔۔ یومِ یثاق۔ وغیرہ سے متعلق کرتے ہیں جن کا میں قائل نہیں اور نہ کوئی عقلی دلیل ان کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہے علیٰ خصوص اس وقت جبکہ خود کلامِ مجید سے میرے قول کی تائید ہوتی ہے۔

آپ اگر تعلیمات اسلام کی روح پر غور کریں گے (اور یقیناً آپ نے غور کیا ہوگا) تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس سے زیادہ سادہ چیز کسی مذہب نے پیش نہیں کی۔۔۔ رہا اُس روح کو پیدا کرنا سو اس کے لئے بیشک عوام کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر ایک خاص لٹریچر پیدا کرنا پڑا اور اس طرح، آخرۃ۔۔۔ معاد۔۔۔ عذاب۔۔۔ ثواب۔۔۔ دوزخ۔۔۔ جنت۔۔۔ قرب الہی وغیرہ کی سیکڑوں اصطلاحات جاری ہو گئیں

ورنہ
حُسنک واحدٌ وعبارة ناشی

اس میں کلام نہیں کہ میں بھی وسعت خیال کے لحاظ سے انتہائی نقطہ پر ہوں اور مولوی بھی اپنی تنگی خیال میں جواب نہیں رکھتا، لیکن یہ ”بین بین“ کیا چیز ہے۔ اگر مذہب نام اسی چیز کا ہے جو مولوی بتاتا ہے تو اس کو آج نہیں توکل مٹ جاتا ہے اور پھر اس کے بعد اس کی بقا کی صورت صرف وہی ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔ پھر اب یہ آپ کی خوشی ہے کہ جو تاریکی گل شے والی ہے اُسے آج ہی ترک کر دیں یا کل پر اٹھا رکھیں

جاں بجاناں وہ وگرنہ از توستانہ اجل
خود تو منصف باش ایدل این گن یا آن گن

فراست تحریریں

یعنی اردو اور انگریزی رسم خط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت، چال چلن، مستقبل اور تمام حالات معلوم کر نیکافن اردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت علاوہ محسول۔ ۸ ر

نیچر نگار

باب الاستفسار

(متعلق بہ مذہبیات)

(جناب محمد عمر صاحب صدیقی تلمری)

جریدہ ”انصاف امرتسر“ میں ”الہامات اور کرامتوں“ کے عنوان کی ماتحت چند نوٹ ”کلمہ معقولہ“ کے حوالہ سے شائع ہوئے ہیں جو بڑی حد تک میرے خیالات کا آئینہ ہیں یا یوں کہئے کہ ایک عرصہ سے یہی اور اسی قسم کے خیالات میرے دل و دماغ پرستوی ہیں اور جو باوجود کوشش کے بھی میرے دل سے دور نہ ہوئے۔ اور معاف کیجئے اگر یہ کہوں کہ ”نگار“ کو بھی اس باب میں میں نے اپنا ہمنوا نہ پایا۔ بہر حال میں انکو استفسارات کی شکل میں یہاں پر درج کرتا ہوں اور آپ کی رائے معلوم کر نیکامتمنی ہوں۔ اگر آپ کچھ حرج نہ سمجھیں تو ”نگار“ کی کسی قریبی اشاعت میں اپر (اپنے نقطہ نظر) روشنی ڈالنے کا شاید آپ ہی کے ذریعہ سے کچھ تسکین قلب حاصل کر سکوں :-

(۱) اگر قرآن۔ انجیل۔ وید۔ تورات۔ زبور وغیرہ کتب مقدسہ الہامی ہیں تو ان میں اخلاص کیوں ہے ؟

(۲) کیا کسی الہامی کتاب نے کوئی ایسی بات دنیا کو بتلائی جو کہ اُس وقت دنیا کو معلوم نہ تھی ؟

(۳) مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق اگر قرآن کے نازل ہونے سے باقی الہامی کتب مقدسہ منسوخ ہو گئی

ہیں تو بھرتوریت۔ زبور۔ انجیل کے ماننے والوں کو ان سے ہٹا کر قرآن کی طرف لگانے کا خدا نے

کوئی موثر طریقہ اختیار کیوں نہیں کیا ؟ جس سے کہ وہ بغیر ہچکچاہٹ یا شک و شبہ کے قرآن پر

ایمان لے آتے۔

(۴) اگر محض رسول اللہ پر کلام اللہ نازل ہو کر یہ کہنے سے کہ پہلی کتاب میں منسوخ ہو گئیں وہ منسوخ بھی جائز ہو چکا ہے اور

کے بعد براہ اللہ بر الہامی کتاب نازل ہونے اور اس میں یہ لکھا ہونے سے کہ قرآن مسخ ہو گیا کیوں اُسے مسخ نہ سمجھا جائے ؟ جب کہ ایسا دعویٰ ہر نبی کر سکتا ہے۔ اور کرتا رہے گا۔

(۵) دنیا میں جتنی الہامی کتابیں ہیں سب کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے اور ان کی تعلیم پر غور کیا جائے تو ان میں کوئی ایسی بات نہ ملے گی جیسے کہ دنیا پہلے سے نہ جانتی ہو ان کتابوں میں تقریباً ایسی باتیں درج ہیں جو ضروریات زندگی کے نقطہ نظر سے بہت ہی معمولی سمجھی جانی چاہئیں اور کوئی اہم بات ان میں نہ ملے گی۔ مثلاً انسان طرح طرح کی بیماریوں سے تکالیف اٹھاتا ہے اور قدرت کے پاس امراض کو دور کرنے والی اچھی اچھی ادویات بھی موجود ہیں مگر خدا نے بزرگوار الہام آج تک کبھی کسی مرض کا شافی علاج نہ بتلایا۔ انسانی دماغ نے اپنے لئے خود تورات، دن کی سنت اور مشقت سے کئی ایجادیں کی ہیں اور قدرت کے پوشیدہ و منفرد راز معلوم کئے ہیں اور آئندہ کر رہے گا۔ مگر الہام نے قدرت کے کسی معنی راز پر اب تک روشنی نہیں ڈالی جس سے کہ انسان کو اتنا حیران و پریشان نہ ہونا پڑتا۔

کیا کسی الہامی کتاب نے دنیا کی اذیت کے احساس کو بند کرنے کے لئے اکلورافارم طیار کرنے کا طریقہ بتلایا ؟ کیا کسی کتاب نے تیرتھرا تیرا یا زیارت مقامات مقدسہ کے لئے ریل گاڑی یا سوڑ کار بنانے کی ترکیب بتائی ؟ کیا کسی مذہبی کتاب نے معیبت کے وقت ایک دوسرے کو تبریک کے لئے تار یا ٹیلیفون بنانا سکھلایا ؟ کیا کسی مذہبی رہنمائے اپنی کرامات سے چیک باؤ او کو دنیا سے دور کر دیا ؟ یا خدا سے ہم کلام ہو کر ریڈیو کے خواص معلوم کئے ؟ آخر وہ کون سی باتیں ہیں جو محض قیاسی اور خیالی باتوں پر لڑنے اور مرنے کے علاوہ الہامی کتابوں نے سکھلائی ہیں۔ اور جن سے کہ دنیا کی ترقی اور راحت میں کسی نئے باب کا اضافہ ہوا ہے ؟

زنگار) جو شکوک آپ نے ظاہر کئے ہیں، وہ آج کل ہر ذمی فہم شخص کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں اور اگر مذہب و متعلقات مذہب کو بالکل اسی روشنی (تاریکی) میں دیکھا جائے، جو قدیم خیال کے اہل مذہب اور باب دین کی طرف سے پیش کی جاتی ہے اور اگر ان تمام بیانات کو جو خدا، نبی، الہام، وحی، اور کتاب اللہ کے متعلق وہ ظاہر کرتے ہیں یقین کر لینا ضروری ہو، تو اس میں کلام نہیں کہ جو اعتراضات آپ نے کئے ہیں یا اہل علم کی طرف سے کئے جاتے ہیں، ان کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دن ساری دنیا کو اہل مذہب کے نقطہ نظر سے) متحد و کافر ہو جانا ہے۔ یہاں ہندوستان میں تو خیر ابھی دو ہی چار جماعتیں ایسی

قائم ہوئی ہیں جو مذہب کے خلاف پروپاگنڈا کر رہی ہیں لیکن مغرب میں تو ایک طوفان برپا ہے اور مذہب نے اپنی شکست کو نمایاں طور پر تسلیم کر لیا ہے۔۔۔۔۔ منکرین خدا نے اپنے کلب قائم کر رکھے ہیں، اپنی سوسائٹیاں بنالی ہیں، اپنے اخبار و رسائل اشاعہ کرتے ہیں، اپنی کتابیں چھاپ چھاپ کر مفت تقسیم کر رہے ہیں اور علی الاعلان خدا کا انکار کر کے تمام انبیاء کرام کو گالیاں دے رہے ہیں۔۔۔۔۔ آپ کو شاید یہ سنکر حیرت ہوگی کہ امریکہ کی ملحد جماعت نے جس میں بڑے بڑے اہل علم شامل ہیں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ کس استدلال پر اور کس اخلاقی قانون کے زیر اثر خدا کے وجود کو کلیساؤں کی صورت میں قائم کئے ہوئے ہے۔ اور وہ کیوں نہیں تمام عبادتگاہوں میں سمار کر کے نوع انسانی کو اس مکر و فریب کے جال سے آزاد کراتی۔۔۔۔۔ ایک بڑی لطف قسم سنئے :-

امریکہ میں دستور ہے کہ سال میں ایک دن مقرر ہے جس کا نام " ادائے شکر یہ کا دن "

Thanksgiving Day رکھا گیا ہے۔ اس دن عام تعطیل ہوتی ہے اور کلیساؤں

میں خدا کا شکر یہ ادا کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ جب ملحدوں اور منکرین خدا کی یہ سوسائٹی وہاں قائم ہوئی

تو اس نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ یا تو اس دن کی تعطیل بند کر کے شکر یہ کی رسم کو بند کیا جائے ورنہ ایک دن

اور بھی تعطیل کا مقرر کیا جائے جس کا نام Blames giving Day

ہو اور اس دن بجائے شکر یہ کے خدا پر الزام رکھنے کے لئے عام جلسے کئے جائیں !

کیونکہ اُن کے نزدیک اول تو خدا کو ماننا ہی سرے سے حماقت ہے اور اگر مانا جاتا ہے تو پھر کیوں نہ

دنیا کے تمام تکالیف و مصائب کا الزام اس پر رکھا جائے

امریکہ میں الحاد (Atheism) نے اب ایک مستقل علم و فن کی حیثیت اختیار کر لی

ہے اور کثیر تعداد میں وہاں سے کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں اور مقبول ہوتی رہتی ہیں۔۔۔۔۔ بہر حال

اس میں کلام نہیں کہ موجودہ دور " لامذہبیت " کا دور ہے، دنیا رفتہ رفتہ " مذہب " کی طرف سے

بیزار ہوتی جا رہی ہے۔ اور اگر واقعی نوع انسانی کو اب بھی مذہب کی ضرورت ہے تو دنیا میں صرف ایک

ہی مذہب (اسلام) ایسا ہے جو اس سیلاب کا مقابلہ کر کے لوگوں میں پھر ایک ایقانی و اذعانی کیفیت پیدا

کر سکتا ہے، بشرط آنکہ اس کی صحیح روح کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔۔۔۔۔ آپ باور کیجئے میں یہ دعویٰ

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک شخص ثالث کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ میں جانتا ہوں لوگوں

کو مذہب کے خیال سے کیوں نفرت پیدا ہوتی جا رہی ہے اور اسلام کیوں ان تمام الزامات سے بلند ہے

جو دوسرے مذاہب پر اہل علم کی طرف سے عاید کئے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ خیر، یہ تو میرے خیالات

پریشاں تھے جو آپ کے استفسار کو دیکھ کر بے اختیار انہ زبان پر آ گئے اور جن کو غالباً آئندہ کسی صحبت میں

ابر کریم سے خطاب

کس مقدس میکدے سے جھوم کر نکلا ہے تو
 کونسی گنگا کی چوکھٹ چوم کر نکلا ہے تو
 آرماتے کس ادا سے کیفیت برساتا ہوا
 ایک یرجم کی طرح بیتاب لہراتا ہوا !
 عزق ہے کس کیفیت روحانی میں ابر کریم
 تجو ہے کس فکر نورانی میں ابر کریم

ڈھونڈو کوئی پاک دنیا اپنی الفت کے لئے
 جس جگہ بھٹکی ہوئی انسانیت آباد ہو
 منتخب کروہ زمیں باران رحمت کے لئے
 جس جگہ انسان کا لوطا ہوا دل شاد ہو

یہ جہنم زار اس الطاف کے قابل نہیں
 جس جگہ مذہب فزوشی کا لقب ہے رہبری
 پنڈلیوں تک خرقہ زبرد و رع آیا ہوا
 دارٹھیوں میں معصیت کی تیرگی گوندھی ہوئی
 معصیت کوشی کے پیکر، نفس سرکش کے مرید
 رحمتوں کی جس پہ بارش ہو یہ وہ محفل نہیں
 جس جگہ ہے کار فرما زہد کی جادو گری
 لیکن آنکھوں میں رعونت کا نشہ چھایا ہوا
 راہبانہ شکل و صورت حرص میں ڈوبی ہوئی
 خلد کے تاجر، خدا کو نیچنے والے پلید !

آہ یہ دنیا جہاں خوف خدا کوئی نہیں
 جس جگہ سرمایہ دار ہی کا لقب تمذیب ہے
 رات بیخوابی سے کٹی ہے جہاں انسان کی
 بے محایا دیو باطل ہے جہاں خنجر بدست
 فاقہ کش مزدور کے خون کی بہا کوئی نہیں
 جس جگہ کتوں کی عفن خطبہ تادیب ہے
 گل رہی ہیں ہڈیاں انصاف کی، ایمان کی
 جس جگہ تعزیر کے قابل ہے مرد حق پرست

اس زمیں پر سانپ اور اژدر برسے چاہیں
 برق کرنی چاہئے، پتھر برسے چاہئیں

عدم

کلام مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

دل کی عدو ہوئی ہو بانداز آشنا
تجھ سے حذر ہے ای نگہ ناز آشنا
ہمتت کہ دور منزل مقصود اپنیں
آئے لگی ہو کافوں میں آواز آشنا
بیدل کی طرح مجھ سے بھی نہیں با اثر
”انجام کار دشمن و آغاز آشنا“

داع عشق کی مے سے چھمک رہا ہے
اک بھول ہو جو نہک رہا ہے
آنکھیں کب کی برس جگی ہیں
کوند ابتک لپک رہا ہے
اب آئے ہمارے یا نہ آئے
آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے
ہے دور بہت زمان و عدہ
اور دل ابھی سے دہڑک رہا ہے
کس نے وحشی اثر کوہِ حمیرا
دیوار سے سر پٹک رہا ہے

ہشیار کو اک آن میں دیوانہ بنا دے
دیوانہ جسے زگس ستانہ بنا دے
بدمست کو ہشیار کہ ہشیار کو بدمست
جو چاہے جسے گردش پیمانہ بنا دے
سن ای دل ناشاد وہ کیا پوچھ رہے ہیں
حسرت کی نگاہوں کو ابانسانہ بنا دے
دامن نہ ہو آلودہ اثر گرد و نیلے سے
مقصود کو مطلوب سے بیگانہ بنا دے

کوئی روٹھا ہوا پھر مہرباں ہو
مرے حسرت بھرے دل تو کہاں ہے
خدارا ہمت ای پائے شکستہ
نظر کے سامنے وہ آستان ہے
نیشن سے جو اٹھا تھا اسیر و
مری آنکھوں میں اب تک وہ ہواں ہے
قفس میں ہو گیا اکثر یہ دہوکا
ستار اصبح کا یا آسٹیاں ہے
نگاہ میں لگے جھکنا، دل کا جانا
مری آنکھوں میں اب تک وہ سماں ہے
مذہم دیدہ، چہرہ زرد و لب خشک
اثر پندار خود داری کہاں ہے

کلام دل شاہجہا پوری

رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہو دل پڑھ مصیبت ہوتی ہے
 میں تارے گنتا رہتا ہوں جب نیا غافل سوتی ہے

اوجس ستم پر در تیری ہر چہرہ قیامت ہوتی ہے
 جس راہ میں سر دھنتا ہو کوئی اس راہ میں کانٹے بونتی ہے

قدرت کی چمن آرائی کا گو ایک اثر ہے دونوں پر
 چنچے ہیں کہ ہنستے رہتے ہیں شبنم ہے کہ پیہم روتی ہے

ہے جنکے مقدر میں ساحل کیا خوت انھیں طغیانی کا
 جو ڈوبے باہو اس کو تو ہر موج قیامت ہوتی ہے

گو پیش نظر کوئی بھی نہ تھا گہرا کے جد ہر دکھا یہ سنا
 کیا میرے تغافل کا شکوہ تقدیر ہی تیری سوتی ہے

ناوک ہو کہ پیکاں ناوک کا اور عشق اسے میں سمجھوں
 اک ٹیس سی دل میں اٹھتی ہو رہ رہ کے کھٹک سوتی ہے

ہیں اشکے واں اور اشکوں میں شامل ہو عرق پیشانی کا
 محشر منہ دامت قاتل کی دامن کا لہو ابے ہوتی ہے

کشتی ہو مری محفوظ فنا اس کی ہے بقا گرائی میں
 جس نے بھی کیا رُخ سائل کا وہ نذر تلام ہوتی ہے

ہنکا ہم غم حسنین اے دل ہر اشک کا یہ حاصل سمجھو

رہ جائے تو نوک نشتر ہے بہ جائے تو سچا موتی ہے

کلام عبدالمجید حیرت بی۔ لے

زباں سے اگر کچھ کہا چاہتا ہوں
تو شاید اعدنا چاہتا ہوں
تصویر میں جس کے مزے لے لے ہوں
اُسے آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہوں
جسے دیکھتا ہوں، مجھے دیکھتا ہو
خدا جانے میں کہا کہا چاہتا ہوں
دلِ نغوں شدہ کی حکایت نہ پوچھو
عزیزو، سنبھالو، اگر چاہتا ہوں
خدائی کو معلوم ہے یہ تو حیرت
کہ اسکے سوا اور کیا چاہتا ہوں
نہ دو اور نہ کچھ دعا میری
اب تو سن لے مرا خدا میری
کون کرتا ہو مجھ غریب پہ رحم
کون سنتا ہو التجا میری
ڈھونڈتا ہوں کون دلِ حیرت
یہ خطا ہو تو ہو خطا میری

اس طرح جس کی مراد ہی جائے
وہ خطا بھی تو بنا دی جائے
کام آئے گا کسی کے کوئی؟
یہ توقع ہی اٹھا دی جائے
غمِ الفت ہی وہ نئے سے حیرت
زندگی جس میں گمراہی جائے
مایوس نہ ہوا تساں گزے جو مصیبت سے
کٹ جاتی ہے ہر مشکل تھوڑی سی عزیمت سے
نا کام و فارہ کر، پامال جفا ہو کر
وہ وقت بھی امر حیرت ہر وقت نہیں رہتا
کون کہتا ہو کہ پورا امرالماں ہو جائے
آرزو کوئی تو برائے دلِ مضطر کی
کام آئینہ حیرت کا فقط اتنا ہے

کلام فراق گورکھپوری

شکست رنگ کے آئینہ دار بھی کچھ تھے
چمن میں دیکھ لیا تھا ہنھوں نے صحر کو
نثار پریش غم کے ترے کرم کے نثار
ہیں غیر تیں بھی کچھ ابد و ست عشقِ روا کو
گدازِ شیشہ نازک ہے یاد دلِ لرزاں
بھرا ہے عشق نے صہبا کتابِ فرساؤ
بتا کہ دولت کو زمین کیا کرے وہ دل
کہ تجھ سے بھی نہ جو بدے تری تمنا کو
کر ترک بھی دنیا کو دنیا کی طلب بھی کر
ہم سے کیا ہو سکا محبت سے
مٹتے ہوئے دنیا سے بچتے ہوئے دنیا سے
تو نے تو خیر بے وفائی کی

نوائین کے مطالعہ کی کتابیں

ناول، ڈرامے اور افسانے

تاریخ و سوانح حرمیوں لغات و ادب

۱۲	نظرات اشک	۱۲	تاریخ مغرب	۱۲	بازاری زباں
۱۲	جنت درانامہ	۱۲	تفسیر تاریخ اسلامی	۱۲	لغات سعیدی
۱۲	بس کارو کہ	۱۲	حصہ ۱	۱۲	لغات کشوری
۱۲	فانہ سعید	۱۲	حصہ ۲	۱۲	تجزیہ تحقیق جلد ۱
۱۲	خفاک مبینی	۱۲	حصہ ۳	۱۲	غیر اللغات فارسی
۱۲	سیلاب اشکات تصویر	۱۲	العصاحات	۱۲	محاورات نسوان
۱۲	بے زبان عدوت	۱۲	امت کی باتیں	۱۲	جوہر اللغات
۱۲	جال ہم نشین	۱۲	الزہراء	۱۲	گوہر اللغات
۱۲	تفسیر عصمت	۱۲	اسوہ حسنہ	۱۲	چراغ سخن
۱۲	جوہر قدامت	۱۲	بہند و شہداء	۱۲	دکھنی لغت
۱۲	تائید نبوی	۱۲	شونہار	۱۲	جوہر کلیات نظیر
۱۲	پر اسرار قتل	۱۲	سوانح اکبر الہ آبادی	۱۲	عزیز اللغات
۱۲	اعلان آزادی	۱۲	سفر نامہ عراق	۱۲	تذکرہ ریختی
۱۲	سرگزشت ہاجوہ	۱۲	تاریخ افغانہ	۱۲	تاریخ اہل سعید
۱۲	فہم زندگی	۱۲	اسلام اور غیر مسلم	۱۲	دکن میں اردو
۱۲	قلب حرمیں	۱۲	سیر المصنفین حصہ ۱	۱۲	مغرب کلام ہندی
۱۲	عروس کر بلا	۱۲	حصہ ۲	۱۲	رباعیات عمر خیام
۱۲	شہید مغرب	۱۲	تاریخ اسلام ۵ جلد	۱۲	مغرب کلام ہندی
۱۲	ماہِ عم	۱۲	اخبار الاندلس ۳ جلد	۱۲	اردو کے اساتذہ کرام
۱۲	تجہ نکمل	۱۲	خلافت موحدین	۱۲	تصریح الاغلاط
۱۲	سراب مغرب	۱۲	خلافت موحدین	۱۲	فیض اردو
۱۲	نملک سارو کمال	۱۲	عرب اور اسکا مستقبل	۱۲	نور اللغات ۳ جلد

دواوین فارسی

دواوین اردو

۱۲	کلیات غالب	۱۲	کلیات نظیر اکبر الہ آبادی
۱۲	کلیات صاحب	۱۲	گلزار داغ
۱۲	دیوان ناصر علی	۱۲	دیوان رند
۱۲	کلیات سعیدی	۱۲	دیوان ذوق
۱۲	کلیات حرمیں	۱۲	گلشن حرم
۱۲	دیہاں منبری	۱۲	مرآة الغیب
۱۲	دیوان مکی شیرازی	۱۲	کلیات لظفر
۱۲	دیوان ہلالی	۱۲	کلیات مومن
۱۲	اسرار خدیوہ	۱۲	دیوان ناسخ
۱۲	زبور مجسم	۱۲	کلیات سیر
۱۲	پیام شرق	۱۲	کلیات سودا
۱۲	قصد عزیر جلد ۱	۱۲	کلیات انشا

ذیل کی کتابیں نگار یک کلبی سے طلب فرمائے

تذکرہ و تاریخ	جاسوسی کتاویں	مراتی	ناول سجاد حسین	ظفر عمرانی کے	ناول مشہور
بینبر غنیمت	عراقی ہومز	مراتی دیر	امتن الذی	چودوں کا کلب	عقیدہ خدادی
شب مہراج	مخاصرہ پیرس	مراتی انیس کمال	عاجی بندوق	نیلی چھتری	مخدرات
سراج منیر	شیخ جلی	مراتی ضمیر	پیاری دنیا	ہیرام کی گرفتاری	جوئے حق
بینبر علم	ہیرام کی دلہنی	مراتی مونس	کاپاپٹ	ادبی کتابیں	عجبت بین
سواغ حضرت رسول	انقلاب فرانس	مراتی دیگر	یٹلی چھری	فناغ و مفتوح	باک خرمی
سید المرسلین	بحری تفریق	عجائب و غرائب	طرح دار نوٹڈی	مکمل شرح دیوان غالب	ایام عرب
حیدر کار	نظری جاسوس	عجائب مخلوقات	طوسی خانوں	بزم خیال	قیس دینی
سیرۃ الصدیق	ٹوکی حرم سرا	تصویر نگین	ناول جوالا پشاو	مشاطہ سخن	یوسف و زلیخا
عمر ابن خطاب	جنگہ ایلین	بالتصویر سادہ	مرنائی	مکاتیب عمر الملک	ذوال الخداد
ابوبکر صدیق	ہیرام چور	جمع الغنون	مآستین	تذکرۃ الشعراء	حسن کا ڈاکو
امام اسلام	زبردست	طلسم فرنگ	بنگالی دہلیوں	تذکرہ حسینی	در بار حرام پور
انجیب	کچی کاراز	کارخانہ عالم	عشق و فرنگ	گلشن سجاد	ہینا بازار
عمر بن عبدالعزیز	عبدالرحمن ناصر	ریالڈن کے ناولوں کے ترجمے	پر تاب	سر پاشے کن	قدس نامہ
دولت فاروقیہ	عروس مصر	ناول سرشار	سیر کسار	سیرۃ ابنی عبدہ اول	ریتہ اکیبری
مکمل سواغ زین العابدین	سیلاب خون	الہ دین و لیلی	خدا کی نوبدار	افلیدہ بظرنامل	پاپا
تذکرہ اولیائے ہند	سیاحت زمین	فریب حسن	جہم سرشار	کاسنی	نورانی ملک
مرآۃ الکونین	سیاحت ہوا	سوزن عشق	الفیلدہ بظرنامل	سواغ عمر و عیار	
قصص ملا نبی اکمل	نازمین مراکش	روز الیمرٹ	کاسنی	سواغ عمر و عیار	
سفر نامہ حسین	تندلی سیر	ناول ہیرا	سیرۃ ابنی عبدہ اول	سواغ عمر و عیار	
تلخیص التواریخ	سرار بالغویم	شام جوانی	سیرۃ ابنی عبدہ اول	سواغ عمر و عیار	
خاقون جنت	روح یلی	حوم سرا	سیرۃ ابنی عبدہ اول	سواغ عمر و عیار	
مخارات الصوفیہ	امین بک	حاج بن یوسف	سیرۃ ابنی عبدہ اول	سواغ عمر و عیار	
خواتین گورہ	سیرۃ یوسف	یوسف پاشا	سیرۃ ابنی عبدہ اول	سواغ عمر و عیار	
مشاہیر نسوان	الغلاب عثمانی	ہیرام کی دلہنی	سیرۃ ابنی عبدہ اول	سواغ عمر و عیار	
مشاہیر جد	ہیرام کی آزادی	ہیرام کی سرگذشت	سیرۃ ابنی عبدہ اول	سواغ عمر و عیار	
مخدرات تیموریہ	ہیرام کی سرگذشت		سیرۃ ابنی عبدہ اول	سواغ عمر و عیار	
بجلیات بکال			سیرۃ ابنی عبدہ اول	سواغ عمر و عیار	

نگار یک کلبی کے



قیمت

تصانیف حضرت نیاز پختوری

<p>نگارستان حضرت نیاز کے بہترین کالمی مقالات اور فسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے حدود مضامین غیر زبانوں میں نقل کئے گئے۔ قیمت عسکری</p>	<p>گہوارہ تمدن مولانا نیاز کی وہ حرکت اللہ کی کتاب جس میں تاریخ اور سہ ماہی سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے قسمت زبردست حصہ لیا اور دنیاؤں کو تہذیب شائستگی کی کس قدر سنوں پر اردیں باکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول عسکری</p>	<p>شہنا کی سرگزشت حضرت نیاز کا وہ علم نظیر افسانہ جو انور زلمن میں پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا جس کی پہلی اسکی تخلیق اسکی نوکرت جہان اسکی ہندی مضمون کی راہی اظہار علیہ جو مظلوم کے دہشت گردی ہے قیمت علاوہ محصول عسکری</p>	<p>فراسٹ الیڈ موضع نیاز پختوری جس کے مطالعے سے ایک شخص کو اسکی شاخت اور اسکی کیریڈ کو دیکھ کر ہی پتہ چلتا ہے کہ اسکی سیرت عروج و زوال پر مشتمل ہے۔ قیمت علاوہ محصول عسکری</p>	<p>شاعر کا انجام جناب نیاز کے عقوان شباب کا نگار ہر افسانہ حسن خلق کی تمام اشد کوشش کینیات اس کے ایک جملہ میں درج ہیں اپنی اپنے پلاٹ اور افسانہ کو لکھنے سے اس قدر بلند چہیت کہ پہلی کتاب اس موضوع پر تھی۔ دوسری جگہ اس میں نہیں سکتی۔ اس پر نظر آؤں قیمت علاوہ محصول عسکری</p>	<p>خبرات بھاشا جناب نیاز نے ایک کلمہ کی تہذیب کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ایک نئی شریک کی ہے کہ اسکی پہلی کتاب اس موضوع پر تھی۔ دوسری جگہ اس میں نہیں سکتی۔ اس پر نظر آؤں قیمت علاوہ محصول عسکری</p>
---	---	--	--	--	--

<p>صحابیات جس میں ہمد ساری کی ہمد علیہ کے مستند حالات کیجی کر دیے گئے ہیں اس کا مقصد مولانا نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے اس کتاب میں سہ ماہی سے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہیں طباعت و کتابت نہایت نفیس۔ قیمت علاوہ محصول عسکری</p>	<p>نقار کھجائے بعد تین افسانوں کا مجموعہ جن میں بتایا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو چلتی ہے سونائیں۔ زبان و طوالت انشاء و تخیل کے کاٹا سے تعریف فضول ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی ضمانت ہے قیمت عسکری</p>	<p>نذر اکرات نیاز یعنی حضرت نیاز کی آرزوی جو ادبیات و تنقید علیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شرح کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم چندیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت ۱۲ علاوہ محصول عسکری</p>	<p>فلاسفہ قدیم جس میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین درج ہیں۔ قیمت علاوہ محصول عسکری</p>	<p>سیارح الدولتین جو سی زیادوں کے تاریخ مشہور عالم کتاب کا ترجمہ ہے۔ وہ کتاب سب سے پہلے کی اور ب و ایشیا کے سیاسیات پر پہلے مثل تبصرہ کیا گیا ہے جو سی ایران کی یہ کتاب بہت اچھی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عسکری</p>	<p>المسئلہ الشریعیہ مصطفیٰ کامل پاشا کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ ہے۔ وہ کتاب سب سے پہلے کی اور ب و ایشیا کے سیاسیات پر پہلے مثل تبصرہ کیا گیا ہے جو سی ایران کی یہ کتاب بہت اچھی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عسکری</p>
---	---	--	---	--	--

<p>فراسٹ التحریر مکمل یعنی اردو اور انگریزی کا ہم نوا اور مفید تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت حال چمن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت ۸ علاوہ محصول عسکری</p>	<p>دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں فقہوی زہر مستحق مرتبہ فقہوں کو کہ پوری زمین ملک کے جملہ بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور اسکی فقہوی اور علمی مہم کی ایک تصویب ہے۔ قیمت ۸ علاوہ محصول عسکری</p>	<p>فقہوی لالہ سنج طاس سور کی حرکت اللہ کی کتاب کا مکمل ترجمہ ادبی شایستگی کے لئے نقل ہے۔ قیمت ۸ علاوہ محصول عسکری</p>	<p>مذکرہ خندہ گل موضع عبد الباقی اسکی اس میں صفحات سے زائد اور اسکی کے لطیف شاعری کے حالات اور اس کے لطیف و ظرافت و نقلی بات کا نام کے درج ہیں قیمت ۸ علاوہ محصول عسکری</p>
--	--	--	--

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شکار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے۔
رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے اور نہ رسالہ مفت روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ دھرا سششما ہی تین روپیہ (۱۰)
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمارہ	فہرست مضامین مئی ۱۹۳۷ء	جلد ۲۳
۲	اطلاعات	
۹	مغربی زبانوں کے ادب لطیف پر ترجمہ	
۲۴	سائب کا فیصلہ	
۳۲	جنم آستھی کی تقریب میں	
۳۶	کتوبات نیاز	
۴۴	ہمش کی شاعرانہ لغزشیں	
۵۰	کفائش حیات پر ایک تحقیقی نظر	
۵۹	باب المناظرۃ والمآسل	
۶۳	باب الاستفسار	
۶۸	سک کے اکتشافات	
۷۵ تا ۷۰	منظومات	
۷۶	ذوقی۔ عدم۔ آخر۔ باقی۔ اثر۔ کوکب	
۱۹۳ تا ۲۰۸	سلومات	
	ذکرہ معرکہ سخن	
	آسی	

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۵	مئی سنہ ۱۹۳۳ء	جلد ۳۳
---------	---------------	--------

ملاحظات

دارالعلوم ندوہ کے کچھ اور اندرونی حالات

میں نے ۲۲ مارچ کو ایک تحریر ناظم ندوہ کے پاس روانہ کی تھی اور چند باتیں درسگاہ کے آئین نظم و نسق کے متعلق ان سے دریافت کی تھیں۔ لیکن آج تک انھوں نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی وہ سوالات یہ تھے:

- (۱) موجودہ تعداد طلبہ دارالافتاء میں رہتے ہیں
- (۲) نصاب تعلیم درجہ وار کیا ہے۔
- (۳) انگریزی کی تعلیم نصاب میں کہاں تک کھی گئی ہے اور اس پر کس حد تک عملدرآمد ہوتا ہے۔
- (۴) کتنے طلبہ کو وظیفہ ملتا ہے۔ اور اس کی مقدار ماہانہ کیا ہے۔

- (۵) کشمیر سے کتنے طلبہ بلائے گئے تھے اور ان کی تعلیم اور ان کے وظائف کا کیا انتظام ہوا اور کب ؟
- (۶) دارالعلوم کے سالانہ مصارف کیا ہیں
- (۷) کہاں کہاں سے کتنی امداد سالانہ مقرر ہے۔
- (۸) کیا طلبہ کو عام اجازت ہے کہ وہ جس اخبار و کتاب کو چاہیں مطالعہ کر سکتے ہیں اگر عام اجازت نہیں ہے تو کیوں اور کون کون سے اخبار و رسائل یا کتابیں ممنوع المطالعہ ہیں
- (۹) گزشتہ ۵ سال میں کتنے طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ (۱۰) طلبہ ذیل کے اخراج کا کیا سبب تھا۔
- عبدالسلام - عبدالحئی - عنایت اللہ - علاء الدین احمد - غلام حسن الدین - رئیس احمد جعفری -
- (۱۱) دفتر نظامت کے سالانہ مصارف کیا ہیں
- (۱۲) انتظامیہ کمیٹی کے ممبر کون کون ہیں
- (۱۳) انتظامیہ کمیٹی کے ممبر مقرر کرنے کا کیا قاعدہ ہے اور پبلک کا نمائندہ اس کمیٹی میں کون ہے۔
- (۱۴) کیا یہ صحیح ہے کہ کسی طالب علم (غلام محی الدین) نے مہتمم دارالعلوم کو مارا اور کیوں
- (۱۵) کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے انگریزی وضع کے بال رکھنے اور دائرہ صحنہ منڈانے کی ممانعت کی ہے لیکن زلفیں رکھنے کی اجازت دیدی ہے
- (۱۶) آپ کب سے نظامت کے عہدہ پر مامور ہیں اور اس دوران میں آپ نے کوئی قدم کسی خاص اصلاح کی طرف اٹھایا اور کیا ؟
- (۱۷) کیا یہ صحیح ہے کہ بنگال کا کوئی طالب علم حال ہی میں بعارضہ چیچک مبتلا ہو کر فوت ہوا اور آپ نے علاج کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور جب یاد دہانی کی گئی تو آپ ہمیشہ بھول جائے گا عذر پیش کیا
- (۱۸) کتنے معتمدی الحال کام کرتے ہیں۔ ان کے نام کیا ہیں اور کیا فریض ہیں
- (۱۹) آپ کتنے سال کے لئے ناظم مقرر کئے گئے ہیں۔ یا یہ خدمت ہمیشہ کے لئے آپ کو تفویض ہوئی ہے
- (۲۰) آئندہ ناظم اور معتمدین کا انتخاب ہو گا یا نہیں اور ہو گا تو کب اور اس کے متعلق کیا قواعد ہیں۔
- میں جانتا تھا کہ وہ کبھی ان سوالات کا جواب نہ دیں گے، کیونکہ جب کسی کی دکھتی ہوئی رگ پکڑ لی جائے تو دھوکا دینے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ تکلیف کا اظہار کئے بغیر خاموشی سے اس کو گوارا کر لیا جائے، لیکن میں نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ناظم کو مخاطب کیا۔ کیونکہ اصول کا اقتضا یہی تھا۔ اور انھوں نے جواب نہیں دیا۔ کیونکہ معاملہ ”کشف ساق“ کا تھاپا بی کر رہ گئے۔
- اس دوران میں چند اور اطلاعات بھی مجھے موصول ہوئیں جن کے متعلق ناظم نہ وہ سے استفسار ضروری

ہے لیکن خط کے ذریعہ سے جواب حاصل کرنے کی توقع چونکہ بیکار ہے اس لئے میں نگار ہی کے ذریعہ سے ان کو بھی بارگاہ نظامت کبریٰ تک پہنچانا چاہتا ہوں :-

(۱) حال ہی میں ہزار کسٹنسی نواب صاحب چھتاری کے ہاتھوں ایک مسجد کا سنگ بنیاد سر زمین ندوہ "میں قائم کرایا گیا ہے۔ لیکن اس سے قبل غالباً نواب سر مرزا اسد خاں سے بھی ایک مسجد کا سنگ بنیاد نصب کرایا گیا تھا۔ اور جب اعلیٰ حضرت حضور نظام تشریف لائے ہیں تو اس وقت بھی کسی مسجد کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس لئے دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا واقعی متعدد مسجدیں علیحدہ علیحدہ طیارہ برداری ہیں جن کا سنگ بنیاد متعدد بار رکھا گیا، یا ایک ہی مسجد کے مختلف حصوں کا سنگ بنیاد مختلف لوگوں سے رکھوایا گیا۔ اگر کسی مسجد کی تعمیر کا یوں تجزیہ کر کے مختلف لوگوں کو سنگ بنیاد نصب کرنیکی سعادت کا موقعہ دینا کوئی دینی یا شرعی تدبیر ہے تو خیر، ورنہ اگر محض حصول زر کیلئے یہ سب کچھ کیا گیا ہے تو کیا یہ طریق عمل "وکل تشتردا بایاتی ثمنافلیدا" میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) کیا یہ صحیح ہے کہ حال ہی میں مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی نے دارالعلوم کے مدرس ادب عربی (ہلالی عرب) کو دیکھ کر ان کی کٹی ہوئی داڑھی پر اعتراض کیا اور جب ہلالی صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے برہم ہو کر اپنا استعفا ناظم کے پاس روانہ کیا،

(۳) کیا یہ درست ہے کہ مولوی حبیب الرحمن شروانی کی طرف سے پندرہ وظائف صرف ان لڑکوں کے لئے مخصوص ہیں جو داڑھی چھوڑنے میں دیگر طلبہ سے سبقت لے جائیں اور کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ "شروانی" وظیفہ کسی طالب علم کا داڑھی منڈوانے یا کٹوانے کی وجہ سے بند کر دیا گیا ہو۔ کیا ناظم صاحب تکلیف فرما کر ان "مستوفی الخیئۃ طلبہ" کے نام بتا سکتے ہیں، جن کو یہ وظائف ملتے ہیں

(۴) کیا یہ صحیح ہے کہ ایک طالب علم "حسن ثمنی" سہ ماہی امتحان دیکر اپنے مکان چلا گیا اور جب سالانہ امتحان ختم ہونے کے بعد واپس آیا تو مولوی حمید حسن صاحب مہتمم نے اس کو اونچے درجہ میں ترقی دیدی۔ لیکن جب دیگر طلبہ نے احتجاج کیا تو پھر اس کو نیچے درجہ میں اتار دیا گیا۔ اگر یہ درست ہے تو کیا ناظم صاحب ندوہ مہتمم کے اس طرز عمل کا کوئی سبب بتا سکتے ہیں اور نیز یہ کہ ان کے کانوں تک یہ معاملہ پہنچایا نہیں اور پہنچا تو انھوں نے کیا کارروائی کی۔

(۵) کیا یہ درست ہے کہ وظیفہ یاب طالب علموں کے ساتھ مہتمم کا سلوک اچھا نہیں ہے اور ایسے طلبہ کو معمولی سی معمولی غلطی پر "مدرسہ سے روٹی پانے" کا طعنہ دیا جاتا ہے، درنحالیکہ اسی قسم کی غلطی اگر غیر وظیفہ یاب طلبہ سے ہو تو پیر واہ نہیں کی جاتی۔ اگر یہ صحیح ہے تو کیا ناظم ندوہ بتا سکتے ہیں کہ یہ کس قسم

کا اخلاقی مظاہرہ ہے اور ناظم نے اس جانب کوئی توجہ کی ہے یا نہیں
(۶) کیا یہ صحیح ہے کہ مہتمم مدرسہ جس وقت درس حدیث دیتے ہیں تو ان کے درس کا اکثر حصہ مشتمل ہوتا
ہے صرف راویوں کی تکذیب و جرح پر اور ان کے نزدیک ایک راوی کی صحت و ثقاہت کا معیار
صرف یہ ہے کہ وہ ”مسلم ابو حنیفہ“ کی تائید کرنے والا ہو۔ کیا ناظم نے خود کبھی ان کے درس میں
جا کر اس امر کی تحقیق کی ہے؟

(۷) کیا یہ درست ہے کہ غیر مقلد طلبہ کے ساتھ مہتمم خصوصیت کے ساتھ بہت بڑا سلوک کرتے ہیں اور عصیت
سے کام لے کر امتحان میں ان کو قصداً فیل کیا جاتا ہے۔

(۸) کیا یہ صحیح ہے کہ مہتمم مدرسہ سوائے علماء حنفی کے دیگر مسالک کے علماء کو درس و تدریس کے وقت بڑا کہا کرتے ہیں
اور ان پر جاوید بجا کھلے کرتے رہتے ہیں۔

(۹) کیا یہ صحیح ہے کہ طلبہ کے لئے وظیفہ تو درس روپیہ ماہوار کے حساب سے وصول کیا جاتا ہے اور ان پر ہر
پانچ سات روپیہ صرف کئے جاتے ہیں۔

میں ناظم صاحب کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ تمام اطلاعات مجھے دارالعلوم ندوہ ہی کے طلبہ و اسٹاف
کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہیں اور اگر ان میں غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے تو ان کو تفصیل کے ساتھ جواب دینا
چاہئے۔ لیکن اگر انھوں نے سکوت اختیار کیا تو میں سمجھوں گا کہ یہ اطلاعات واقعی درست و صحیح ہیں اور پھر میں
ان تمام واقعات پر پوری طرح تنقید کر کے پبلک کو اخبارات و رسائل، جرائد و پمفلٹ کے ذریعہ
سے متنبہ کر دوں گا کہ ”دارالعلوم ندوہ“ کی انتظامی حالت کس قدر خراب و ردی ہے اور ملک کو اس کی
اعانت کی طرف سے دستکش ہو جانا چاہئے۔

ہندوستان کی ایک فلاکت زدہ قوم یاد رکھو کہ صرف زمین ہی گردش نہیں کرتی بلکہ کائنات کی ہر چیز گردش میں ہے،
سے چند اصولی اور سادہ باتیں یہاں تک کہ خود نظام شمسی بلکہ وہ عالم کائنات بھی جس کا ایک حقیر حصہ نظام شمسی
ہو، ہر وقت گردش کی حالت میں ہے اور ہر ہر ذرہ میں ہر لمحہ کچھ نہ کچھ انقلاب ہوتا رہتا ہے۔ پھر غور کرو کہ جب زندگی کے اصول بدل جائیں
لوگوں کی ذہنیت بدل جائے، آسمان و زمین بدل جائے تو ترقی کے اصول کیوں نہ بدلیں گے، قانون و شریعت میں کیوں نہ تغیر کی ضرورت
ہوگی۔ پھر اگر کوئی قوم ایسی ہو جو صرف اپنے اسلاف کی ترقی کو سامنے رکھ کر اور انھیں کے اصول پر کار بند ہو کر آگے بڑھنا چاہتی ہو تو
اسکو سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے اپنا سفر اس حال میں شروع کیا ہے کہ اسکی پشت منزل کی طرف ہے اور منہ ایک عمیق غار کی جانب۔
پھر یوں بھی میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کونسی گری ہوئی قوم ایسی ہو جسکا ماضی کسی وقت زرخشاں نہیں رہا اور

جس کے اسلاف نے ترقی نہیں کی۔ اس میں خصوصیت نہ مسلمانوں کی ہو نہ ہندوؤں کی، اس لئے اسلاف کے حالات پر غور کر کے یہ نہ دیکھو کہ انھوں نے کس طرح ترقی کی بلکہ یہ دیکھو کہ ان کو زوال کیوں ہوا۔ اور یہیں سے یہ نکتہ واضح ہو گا کہ ترقی کا اولین اصول زمانہ و اقتضا، زمانہ کا ساتھ دینا ہے۔ اور جب تک اس کا ساتھ کسی قوم نے دیا ترقی کرتی رہی اور جب اس کا لحاظ نہ رکھا تو زوال شروع ہو گیا۔ اگر اسلاف نے کسی خاص اصول کے ماتحت ترقی کی تھی تو وہ اسی وقت کیلئے موزوں بھی تھی، آج ان کے نقش قدم پر چل کر کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔ یقیناً اسلاف کے کارنامے ہم کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ ہم ان سے پیچھے نہ ہٹنے پائیں، لیکن ان کے اصول کار کو بالکل بھلا دینا چاہئے کیونکہ اب وہ بیکار ہیں اور ان کی تقلید تضحیح اوقات۔

مسلمانوں کے انحطاط کا بڑا سبب یہی قدامت پرستی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم عہد سعادت و عہد خلفا کی پالیسی یا طریق کار کو اختیار کر کے ترقی کر سکتے ہیں، درنحالیکہ آج ان میں سے ایک بات بھی ہم کو کامیاب نہیں بنا سکتی۔ وہ زمانہ اپنے ماحول کے لحاظ سے ایسا تھا کہ جو قوم عزم راسخ کے ساتھ تلوار لیکر اٹھ کھڑی ہوتی کامیاب ہو جاتی، لیکن آج تو کوئی ایسا کرے۔ پہلے اگر صرف قوت بازو سے حکمرانی ہوتی تھی تو آج علم و دماغ سے ہوتی ہے، پہلے اگر ترقی کا مفہوم صرف نان شعیر کی فرادانی تھا تو آج گنج شایگان کی مہموری پر بھی قناعت نہیں کی جاتی۔

اب اس نکتہ کو ذرا محدود دائرہ میں لاکر سیاسیات ہند پر منطبق کیجئے اور مسلمانوں میں جو عام احساس اپنی گری ہوئی حالت اور ہندوؤں کی ترقی کا پیدا ہو گیا ہے اس پر غور کر کے کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کیجئے۔

جس نے کچھ بھی مطالعہ دور حاضر کا کیا ہے وہ بہ آسانی معلوم کر سکتا ہے کہ موجودہ عہد میں کامیابی کا راز، صرف برویکنڈ میں مضمر ہے۔ اور یہ صرف اس لئے کہ مسائل آمد و رفت اور ذرائع خبر رسائی کی ترقی اور دیگر اعلیٰ طریق تنظیم سے رائے عامہ کے اقتدار کا اثر نہایت وسیع ہوتا جا رہا ہے اور کسی امتیازی حیثیت اختیار کرنے کے لئے یہ بالکل لازم ہو گیا ہے کہ رائے عامہ کو اپنا طرفدار بنایا جائے جس کا واحد طریقہ برویکنڈ ہے۔ ہندو قوم کی عروت، بین الاقوامی دنیا میں، صرف اس وجہ سے ہوئی کہ اُس کے بعض افراد، دنیا کی رائے عامہ کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ رابندر ناتھ ٹاگور نے شاعری میں شہرت پیدا کی، بوس اور رامان نے سائنس میں، رادھا کرشنا نے فلسفہ میں اور گاندھی نے ایک ایسا نیا فلسفہ پیش کیا جو یورپ کے لئے بالکل نیا چیز تھا۔ یورپ عجائب پرست ہے۔ نئی چیز کی جستجو میں ہر وقت سرگرداں رہتا ہے۔ اگر کوئی نیا فلسفہ، نیا مذہب، نئی تحریک، یورپ کے تسکین یورپ کے اشتہار اور برویکنڈ کے طریقوں کو اختیار کر کے پیش کی جائے تو یورپ کی ہمدردی اور طرفداری حاصل کرنا بہت آسان کام ہے۔ مشرقی ممالک کی ایک عرصہ سے یہ غلامانہ ذہنیت ہو گئی ہے کہ جس چیز کی مغرب تعریف کر دیتا ہے وہ انھیں بھی اچھی نظر آنے لگتی ہے۔ ان کو اپنی چیزیں بھی وہی اچھی نظر آتی ہیں جنھیں یورپ ایک دفعہ اچھا کہتا ہے۔ اس لئے افراد اور اقوام کی کامیابی کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ایسی تحریکیں شروع کی جائیں جو دنیا کی رائے عامہ کو اپنی طرف جذب کر سکیں۔ ایسی تحریکیں کیا ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی تحریکیں وہی ہو سکتی ہیں جو یورپ کی سمجھ میں آسکیں۔ اور جن کا لائحہ عمل مغربی طریقے

سے مشابہ ہو۔ آپ فلسفہ تصوف و مذہب کے نہایت باہنیک نکات پر مغز پاشی کیجئے، شعر و ادب کے جواہر پائے ہمیشہ کرتے رہئے، علمی و اخلاقی و سیاسی و معاشرتی تحریکیں شروع کیجئے۔ لیکن جب تک آپ یورپ کی توجہ اپنی طرف جذب کرنے میں کامیاب نہ ہوں گے، ان سب کا انجام یقینی طور پر ناکامی ہوگا۔ اگر آپ کا انداز بیان و طریق کار مغربی اصول کے مماثل ہے۔ اور اہل مغرب کی سمجھ میں آنے والا ہے تو آپ کی کامیابی ممکن نظر آنے لگتی ہے۔ مشرق کی اس وقت جس قدر بھی کامیاب تحریکیں ہیں، وہی ہیں جو ابتدا میں یا تو مغرب کے اتحاد عمل سے یا ان کے طریق کار کی تقلید کے ساتھ شروع کی گئی ہیں۔ مغرب جن تحریکوں کو سمجھ سکتا ہے۔ ان میں ممتاز مرتبہ تحریک مساوات، آزادی اور قومیت کو حاصل ہے۔ مذہب کی بنیاد پر جس قدر تحریکیں شروع ہوتی ہیں انھیں تعلیمیافتہ اقلیت تو شاید سمجھ سکتی ہے لیکن وہ بھی بہت مشکل سے، مگر لے عامہ کو ان سے کبھی کوئی ہمدردی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایک جماعت کا، اپنے مذہبی امتیاز کی وجہ سے، مخصوص مراعات اور حقوق کا مطالبہ کرنا ان کی فہم سے بالاتر ہے۔ مذہب ایک مدت ہوئی، یورپ کی قومی تحریکوں سے خارج ہو چکا ہے۔ وہاں کی تحریکیں سیاسی اور اقتصادی ہوتی ہیں۔ قومی آزادی، ملکی صنعت کی ترقی، تقسیم دولت کی اصلاح کی تحریکیں ان کے نزدیک سمجھ میں آنے والی تحریکیں ہیں۔ لیکن مذہب کو قائم رکھنے والی تحریکیں ان کے نزدیک عہد وسطیٰ اور عہد تاریک کی خوفناک یادگاریں ہیں۔ اسی لئے جو افراد و اقوام یورپ کی ہمدردی حاصل کر کے کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو ابتداءً اس سانچے میں ڈھال لیں۔ شاعر ہیں تو اپنی نظم میں یہی کیفیت پیدا کریں، فلسفی سائنس دان، مدبر غرض جو کچھ بھی ہیں وہ یورپ کی اس مخصوص ذہنیت کو اپنا رہنما بنائیں۔ اور جب وہ ایک دفعہ لے عامہ کی توجہ جذب کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر اپنی مخصوص تہذیب و معاشرت، اپنی زبان، اپنے مذہب اور اپنی تمام خصوصیات کو کامیاب کر سکتے ہیں۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر برطانوی پارلیمنٹ میں انگریزوں کے نمائندے گاندھی ٹوپی اور ٹھہ کر جاتے ہیں۔ اور بڑے بڑے لکھتی کھدر پہننا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔

مشرق میں ایک ہولناک جنگ کے آثار | ترقی پیداوار کے آئینہ بردگراہ میں، سوویٹ روس، اپنی عسکری قوت کو ترقی دینے کا تہیہ کر چکا ہے۔ ہوائی طاقت کو وہ خصوصیت کے ساتھ بڑھانا چاہتا ہے۔ اور اپنے ہوائی بیڑے کو دنیا میں سب سے زیادہ مضبوط بنا رہا ہے۔ مختلف قسم کے ہوائی جہاز مثلاً بم پھینکنے والے، تار پیڈ ولیجانے والے، ڈریڈناٹ، کروزر، وغیرہ بکثرت بنائے جا رہے ہیں۔ مسلح نظریہ ہے کہ جو طاقت برطانیہ کو اپنی بحری بیڑے سے حاصل ہے وہی طاقت، روس کو اپنی ہوائی بیڑے سے حاصل ہو جائے۔ اس مسلح نظر کو پورا کرنے کے لئے وہ ایک بے پناہ عزم کے ساتھ سرگرم کار ہے۔ یہ مسلح نظر کوئی پویشیہ راز نہیں ہے جس کا علم فوج ہی کے صرف چند اعلیٰ افسروں کو حاصل ہے، بلکہ یہ ایک قومی مسلح نظریہ جس کا اعلان ملک کے گوشہ گوشہ میں کیا جا چکا ہے اور جس کی تکمیل جمہور و سس کا ہر ہر فرد اپنا ذاتی فرض خیال کرتا ہے۔

لوجوانوں کو اس اسکیم سے جو دلچسپی ہے اور جس جوش و خروش

سے وہ اس کی تکمیل میں حصہ لیتا چاہتے ہیں اس سے حکومت پوری طرح فائدہ اٹھا رہی ہے۔ روسی سرخ ہوائی بیڑے کا سردار، ایک شخص مسمی براناف ہے۔ جو نہ خود ہوا باز ہے اور نہ کوئی ماہر انجنیر، لیکن اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اُسے تنظیم میں بڑا ملکہ حاصل ہے۔ اور نگرانی کرنے اور ولولہ عمل پیدا کرانے میں اس کا مقابلہ کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔

روس کا خیال ہے کہ بحری قوت کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور ہوائی قوت کا زمانہ شروع ہو رہا ہے۔ روس اس بات کی پوری کوشش کر رہا ہے کہ ہوائی قوت میں وہ کسی حریف سے پیچھے نہ رہے۔ وقتی طور پر اس مسئلہ کو اس وجہ سے بھی اور زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ روس اور جاپان کے تعلقات، پنچوریا کے قضیہ کی وجہ سے کافی کشیدہ ہو گئے ہیں۔ علاوہ اس کے جرمنی اور فرانس کے عسکری معاہدہ سے بھی روس بدظن ہے۔

جرمنی کے کارخانوں کو حال ہی میں، روس نے ایک ہزار ٹن ہوائی جہاز کے سامان کے لئے آرڈر دیا ہے اور آسٹریا کے کارخانوں سے ایک سو ساٹھ دو درہن کے شیشے منگوائے گئے ہیں۔ روس میں اس وقت تینیس بڑے کارخانے ایسے ہیں جو ہوائی جہازوں کے بنانے میں مصروف ہیں۔ یورپ کے ایک بڑے کارخانہ دار کا خیال ہے کہ روس کے ہوائی جہاز کے کارخانوں کی اہلیت پیداوار، امریکہ کے کارخانوں سے بھی زیادہ ہے۔ اور اس کے وہ دو سبب بیان کرتا ہے اولاً یہ کہ روس میں جنگ کے مخالفین کی جماعت مفقود ہے دوسرے وہاں کے ہتھیاروں کو منافع تقسیم کرنے کے لئے بھجور نہیں ہیں۔ روس کے پاس اس وقت تقریباً سترہ سو ہوائی جہاز ہیں اور عنقریب ان کی تعداد تین ہزار ہو جائے گی۔

روس کے ہوائی بیڑے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں پیراشوٹ (وہ چھتری جس کے ذریعہ سے نیچے اترتے ہیں) کے استعمال کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ اور ہوا بازوں کو تاکید ہے کہ وہ کسی حال میں بھی اپنی مشین کو نہ چھوڑیں اور کوشش کر کے اسے زمین پر واپس لائیں۔ اس میں شک نہیں کہ برطانیہ اور امریکہ کے مقابلہ میں روس میں ابھی تک بہت سی خامیاں ہیں۔ لیکن اس کے کام کرنے والوں میں ایسا عجیب و غریب ولولہ عمل پایا جاتا ہے کہ وہ بہت جلد اپنی خامیوں کو رفع کر کے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے مبارز طلبی کر سکیں گے۔

شہوانیات۔ تاریخ الفحشا یا ترغیبات جنسی

بالکل مفت۔ یعنی اس طرح کہ منگا کر پڑھ لیجئے۔ اور واپس کر کے ہم سے قیمت لے لیجئے۔ منبر نکار

وہ سینا کی طرح کام کرنا اور اس کی طرح ہر وقت تھکی ہاری نظر آنا پسند نہ کرتی تھی۔ سینا اس کی سیلی تھی اور سینا کی سخت گیری اور قدامت پسندی نے، صرف اسی سے ملنے کی اجازت، اسے دے رکھی تھی۔ سینا ہی کے ذریعہ سے اُسے باہر کی دنیا کی جھلک نظر آتی تھی۔ سینا کا شوہر، اُسے کبھی اس بات پر مارتا تھا کہ تیرے لڑکا کیوں نہیں ہوتا اور کبھی اس بات پر کہ تو چپائیاں کیوں جلا دیتی ہے۔ سینا اس کے ان تمام اندیشوں کو یہ کہہ کر رفع کرنا چاہتی تھی کہ بیٹی، تیری کا باپ، امیر ہے تیری پڑھا لکھا اور سمجھ دار ہے۔ وہ تو مجھے ملکہ بنا کر رکھے گا۔ لیکن اس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

وہ جواب دیتی ” لیکن مجھے یہ معلوم کیسے ہو کہ وہ حسین اور عقلمند ہے۔ میں نے تو اُسے کبھی نہیں دیکھا۔“ اور پھر نہایت لجاجت سے سینا کے گلے میں باہیں ڈال کر کہتی۔ ” سینا، میری اچھی سینا۔ صرف ایک دفعہ تو مجھے اُسے دکھا دے۔“

سینا، ناراض ہو کر جواب دیتی ” ہائیں۔ بیٹی۔ کیسی باتیں کرتی ہے۔ تو ایک اونچے خاندان کی راجپوت بیٹی ہے۔ تجھے شرم و لحاظ بالکل نہیں آتا۔ تیرے اندر یہ ذلیل جستجو کیسے پیدا ہوئی۔ تیرا باپ سے گا تو کیا کہیگا۔ (اور پھر لہجہ بدل کر پیار سے) اے میری پیاری فاختہ، اگر ان باتوں کی تیرے باپ کو خبر ہو گئی تو میری اور تیری دونوں کی خیر نہیں ہے۔ اے میری جان۔ ایسی باتیں نہ کیا کر۔“

لیکن تارا کی اس سے تسکین نہ ہوتی تھی۔ رواج کی پابندی، اس کی بے چین طبیعت کے لئے ایک بارگراں تھی۔ وہ شادی سے پہلے، اپنے منگیتر کو دیکھنا چاہتی تھی۔ آخر کار سینا کچھ تو اپنی عادت سے مجبور ہو کر اور کچھ اس خیال سے کہ معلوم نہیں جب یہ بیاہ کر اپنے شوہر کے یہاں چلی جائے گی تو بے تکلفی اور محبت کی وہ خصوصیت جو مجھے اب حاصل ہے، باقی رہے یا نہ رہے، اس کی ضد پورا کرنے پر راضی ہو ہی گئی۔

شادی کی رسم ادا ہونے میں ابھی چند ہفتے باقی تھے۔ مگر تارا نے، اپنی جستجو پسند طبیعت سے مجبور ہو کر، اپنے منگیتر کو، اپنے مکان کے برابر، سڑک سے گزرتے ہوئے، جھانک کر دیکھ ہی لیا۔ اور خوشی سے اس کا دل اچھلنے لگا۔ اس سڑک سے تیری روز گذرتا تھا۔ اور اب تارا کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ اسے روزانہ دیکھا کرتی تھی اور اس کے دیکھنے کے بعد اس کی نبض کی رفتار میں جو تیزی پیدا ہو جاتی تھی اس سے، اُسے یقین ہو گیا کہ وہ اس نوجوان سے جو اپنی سر و قامتی اور اعضا کی مضبوطی کے لحاظ سے بالکل دیوتا معلوم ہوتا تھا، محبت کرنے لگی ہے۔ اب اس کے دل کو ایک دوسرا خیال ستانے لگا۔ کیا وہ بھی مجھ سے ایسے ہی محبت کرے گا، وہ اوپر نگاہ اٹھا کر کیوں نہیں دیکھتا کہ میری ایک جھلک دیکھ سکے۔ شاید وہ مجھے

بد صورت اور نحیف و نزار باور کرتا ہے۔ شاید وہ بھی اُس لڑکی سے شادی کرنا پسند نہیں کرتا جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُسے کیسا تعجب ہوگا جب شادی کی رات کو، وہ میرے ہجرہ سے آپنل اٹھائے گا اور دیکھے گا کہ اس کی دو لہن کیسی حسین ہے۔

تارا، اپنے خیالات میں اسی طرح دیر تک محو رہی اور پھر کر دٹ لے کر، اس طرح لیٹ گئی گویا وہ سوتے والی ہے۔

اُس شام کو، نیری، سو اگر رنجیت کا اکلوتا بیٹا، حسب معمول گھر واپس جا رہا تھا۔ وہ اس لڑکی کے خیال میں منہمک تھا۔ جس سے یونیورسٹی میں اسے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور جسے اب وہ، اپنی شادی کا زمانہ نزدیک آتا دیکھ کر، بھول جانا چاہتا تھا لیکن نہ بھول سکتا تھا۔ وہ انہیں خیالات کی کشمکش میں منہمک تھا کہ ایک سُرخ پھول، اس کی نگاہ کے سامنے سے گزرتا ہوا، اس کے قدموں کے نزدیک گرا۔ نیری نے متعجب ہو کر اُسے اٹھایا اور اس پر آمدہ کی طرف نگاہ ڈالی جہاں سے پھول آسکتا تھا۔ حیرت و استعجاب سے اس کی نگاہ اس تصویر پر جم کر رہ گئی جو اس نے وہاں دیکھی۔

دو سیاہ خوبصورت آنکھیں اس کو دیکھ رہی تھیں۔ بال، سات کی طرح سیاہ۔ گورے پھرہ کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ اور باریک سُرخ لبوں سے، تبسم اُبلاتا تھا۔

ایک گلاب کا پھول اس کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا پیکر انسانی میں اوپر،

آن کی آن میں، یہ تصویر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے حواس درست کر کے وہاں سے روانہ ہوتا۔ چہار دیواری سے ایک دریچہ کھلا۔ ایک ہاتھ باہر نکلا اور اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ نیری بیتا بانہ اندر داخل ہوا اور گواڑ اندر سے بند کر لے۔

اس کا مقابلہ، ایک بار پھر، اسی سے ہوا جسے وہ برآمدہ میں دیکھ چکا تھا۔ یہاں وہ، اُسے اور زیادہ حسین نظر آئی۔ ایک نازک اندام گورے رنگ کی حسین لڑکی جس کا جسم ساری میں لپٹا ہوا تھا اور بال بکر پر لہرا رہے تھے۔ نیری، بیتا بانہ آگے بڑھا۔ لڑکی نے، محبت کی چنگاری، اس کی آنکھوں میں دیکھی اور خوش ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ پھر مسرت سے ہنستے ہوئے اس نے کہا ”نیری، رنجیت کے بیٹے، اگر تجھ میں ہمت ہے تو مجھے پکڑ لے“ اور یہ کہ نیری کی طرح ادھر ادھر بھاگنا شروع کیا۔

نیری کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک پیدا ہوئی اور وہ اپنی یونیورسٹی کی محبوبہ کو، بھی بھول گیا۔ وہ

اسی سفید تیزی کے تعاقب میں، وارفتگی کے ساتھ دوڑنے لگا۔ مسرور بچوں کی طرح دونوں دوڑتے رہے۔ تارا، اسے کاوے دیتی رہی، درختوں، گلاب کی جھاڑیوں، پھولوں کے کنبوں کے درمیان سے ہو کر وہ گزرتے رہے اور جب تیزی اس کے پکڑنے میں کامیاب نہ ہو تو تارا نے ہنسنا شروع کیا۔ اس کی ہنسی سے، تیزی نے اپنی کوششوں کو دوچند کر دیا اور آخر کار ————— تارا، تیزی کی آغوش میں، سختی کے ساتھ گرفتار ہو گئی اور جب تارا نے جس کا چہرہ، دوڑنے کی وجہ سے تہما ہاتھا، تیزی کو، اپنے لبوں پر، مہر محبت ثبت کرنے کی اجازت دی تو دونوں خوب ہنسنے۔ لیکن جب تیزی نے اُسے دوبارہ پیار کرنے کی کوشش کی تو اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔ نہیں۔ اب تمہیں میرے باپ کے آتے سے پہلے بھاگ جانا چاہئے“ تیزی نے جواب دیا۔ لیکن، اے حسینہ، جب تک مجھے تیرا نام نہ معلوم ہو میں تجھے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔“ تارا ابل کھالاس کی گرفت سے آزاد ہو گئی اور دوڑ کھڑی ہو کر اسے چڑھانے لگی۔ ”اے تیزی، میں تیری منگیت تارا ہوں۔ وہی دُہلی، بد صورت دو لہن جس کی تجھے تمنا ہے“

اس احساس سے کہ میری منگیت، یہی حسینہ دو شیرہ ہے۔ تیزی کی رگوں میں خون نہایت تیزی سے دوڑنے لگا۔

تارا نے اسے ستانا شروع کیا اور پوچھا ”کیوں۔ تیزی، سچ بتا، کیا میں واقعی ایسی بد صورت ہوں کہ تیری بیوی بننے کی اہلیت نہیں رکھتی“

تیزی نے پُرسرت آواز سے کہا ”تارا، میرے پاس یہاں آؤ“ لیکن تارا پھر پر لگا کر اڑ گئی۔ اور اس غیر متوقع ہنگامہ سے جس نے اس کی بڑسکون زندگی میں ایک شعریت پیدا کر کے، گزشتہ ایام کی بے کیف یکسانیت کی تلافی کر دی تھی، پوری طرح لطف اندوز ہوتی رہی۔ البتہ دروازہ کے قریب، اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دیا۔ اور ایک مختصر بوسہ کے بعد تیزی وہاں سے باہر نکل آیا۔

تارا خوش خوش اُس جگہ سے مڑی اور دوڑ کر مکان کے اندر جانا ہی چاہتی تھی کہ اس کا باپ، سامنے والے پیل کے پیچھے سے قدم بڑھا کر سامنے آگیا۔ ایک نگاہ ڈالتے ہی تارا کو معلوم ہو گیا کہ اس کا باپ تمام راز سے واقف ہو گیا ہے۔ اب اس کی نگاہیں نیچی تھیں اور ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور اپنے باپ کے بولنے کی منتظر تھی کیونکہ کوئی راجپوت لڑکی بلا اپنے باپ کے ایما کے لبوں کو جنبش نہیں دے سکتی۔

لیکن تارا اتنی خوفزدہ نہ تھی جتنا اسے ہونا چاہئے تھا۔ وہ خوف زدہ کیوں ہوتی جب کہ اس کا دل

نعموں سے معمور تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس کے باپ کو اس سے ذرا بھی الفت ہے تو وہ ضرور تمام معاملہ کو سمجھ جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہمدردی کرے گا۔

ایک مختصر آواز نے اسی خاموشی کو توڑا۔ "تارا۔ میری طرف دیکھو" تارار نے نگاہ اٹھائی اور اسے اُن قرآ لود آنکھوں میں جن سے وہ دوچار تھی ذرا سا شائبہ ہمدردی اور الفت کا نہ پایا۔

"تارا، یہ تو نے کیا کیا؟ کیا مینا، سٹھیا گئی ہے کہ اُس نے تجھے اس طرح ذلیل ہونے کی اجازت دیدی۔" پھر آواز میں غصہ کی سرد مہری پیدا کر کے اس نے جواب طلب انداز میں کہا۔ "لڑکی۔ یہ تیرا عاشق کون تھا۔"

"ابا۔ یہ تو میرا منگیتر تھی۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں اُس سے۔ ابا مجھے معاف کرو ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا"

اُس نے بات کاٹ کر کہا "گناہ نہیں کیا۔ یہ گناہ کم ہے جو تو کر چکی ہے۔ تجھے سزا نہیں آتی۔ کیا تو نہیں جانتی۔"

"لیکن، ابا، وہ تو مجھ سے محبت کرتے ہیں۔"

"بس خاموش! محبت۔ محبت کس چیز کا نام ہے؟ ایک شریف لڑکی کو محبت سے واسطہ ہے شریفوں کے دل میں محبت نہیں ہوتی بلکہ ان کا دل احساسِ فرض اور وفاداری سے معمور ہوتا ہے۔ ماں باپ اور شوہر کی خدمت و اطاعت تیرا شعار ہونا چاہئے تھا۔ تو نے مجھے ذلیل کر دیا۔ تو کہتی ہے تیری کو تجھ سے محبت ہے۔ لیکن کیا تو سمجھتی ہے کہ میں تجھے اس بات کی اجازت دوں گا کہ تو اپنے منگیتر کو بھی میری طرح ذلیل و رسوا کرے۔ یہ ناممکن ہے۔ اپنے کمرے میں جا اور میرے حکم کا انتظار کر جو میں تیری دایہ کی زبانی تجھ تک پہنچاؤں گا"

تارار نے کانپتے ہوئے، لیکن اس بات سے خوش ہو کر کہ اس آفت ناگیاں سے جلد چھٹکارا ملا، نہایت ادب سے سر جھکایا اور اپنے باپ کے سامنے سے چلی گئی۔ اس کے باپ کو اس سے کوئی محبت نہ تھی۔ اس کی نسبت، بچپن میں، تیری کے ساتھ، صرف اس لئے کی گئی تھی کہ تیری کے معزز خاندان سے رشتہ قائم ہو جائے۔ دستور کے مطابق، تیری اپنی منگیتر کو صرف شادی کی رات کو ہی دیکھ سکتا تھا اس سے پہلے ہرگز نہیں۔

تارا کی عجیب کیفیت بھی۔ وہ اپنی خیالی دنیا کی رنگین فضاؤں سے، اصلی دنیا کی تلخ حقیقتوں کی طرف ایک لخت، منتقل ہونا نہیں چاہتی تھی اور مشترک جذبات کے ساتھ، مینا کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ مینا،

بڑے انتظار کے بعد آخر کار آئی۔ لیکن جب اس نے تارا کو اپنی آغوش میں لے کر اس کے باپ کے احکام سنائے تو اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ تھیں۔ حکم یہ تھا کہ تارا، اسی وقت، اپنی جوانی کے انتہائی نکھار کے زمانہ میں، مندر کی خدمت پر مامور ہو جائے اور ایک قدیم رواج کی خلاف ورزی کی پاداش میں، اپنی بقیہ زندگی کے تمام ایام تہنیا میں بسر کر دے۔

تارا کی آنکھیں حیرت و رنج سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ”یہ کبھی سچ نہیں ہو سکتا۔ میرا باپ محض ایک رواج کی پابندی کے لئے مجھ پر ایسا ظلم ہرگز نہیں کر سکتا۔ اپنے منگیتر سے محبت کرنے میں کون سی ذلت ہے۔ میرا باپ اس بات کو کیوں معیوب خیال کرتا ہے۔ میری مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس کی آنکھیں اس کی محبت کا راز برطا کہ چکی ہیں۔ میری ایک بیوہ رسم کے ٹوٹ جانے کی بنا پر مجھ سے کبھی ناراض نہ ہوگا۔ پھر میرے باپ کو اس کا کیوں اس قدر خیال ہے۔ میری شادی میری کے ساتھ ہو رہی ہے۔ ان کے ساتھ نہیں ہو رہی ہے۔ انھیں کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ میری سر تیں مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھین لیں۔ اور مجھے مندر کی سنگیں دیواروں میں پابند رہنے کے لئے مجبور کریں۔ میں کھر سے بھاگ جاؤں گی اور.....“

..... اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھوں میں اضطراب اور بے چینی سے روشنی پیدا ہو گئی اور مینا کو خوب جھنجھوڑ کر، اس نے اس کے آنسو خشک کئے اور پھر بھاگ نکلنے کے متعلق سازشیں ہونے لگیں۔ طے یہ پایا کہ میری کو تارا کی پوری حالت سے مطلع کیا جائے اور اس کے مشورہ سے بھاگ نکلنے کی تدبیر کی جائے۔

شام کسی نہ کسی طرح گذر گئی۔ لیکن تارا برابر مینا کی آمد اور میری کے پیغام کا انتظار کرتی رہی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ مینا غریب پکڑی گئی ہو۔ اس خیال پر، تارا کو ہنسی آئی اور دل میں سوچنے لگی کہ میرا باپ جب اس بغاوت کا حال سنے گا تو بے ہوش ہو جائیگا۔ مینا، آخر کار، دبے پاؤں واپس آئی اور تارا نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن مینا اس قدر بدحواس تھی کہ اس سے بات کا صحیح پتہ ملنے میں بھی کچھ وقت صرف ہوا۔ تدبیر یہ طے پائی تھی کہ کل، دن نکلنے سے تین گھنٹے پہلے، میری، پھلوں کے باغ میں تارا کا انتظار کرے گا اور پھر دونوں میری کے چپا کے یہاں بھاگ جائیں گے۔ جہاں ان کی شادی ہو جائے گی۔

تارا نے مینا کو مسرت کے عالم میں، سینے سے لپٹا لیا۔ اور اُسے پیار کر کے کہنے لگی۔ ”اے مینا، دیکھ تو کیسے اپنے کی بات ہوگی۔ ایک راجپوت لڑکی کو کسی نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کرتے بھی سنا ہے۔“

تین بج چکے ہیں۔ رات خاموش اور سرد ہے۔ چاند کی روشنی زرد اور پھیکی ہو چکی ہے۔ تارا، آہستگی سے

اپنے مکان سے نکلتی ہے۔ اس کی سپید ساری پر ایک سیاہ چادر لپیٹی ہوئی ہے۔ اس کا دل مسرور ہے اور اس کے قدم ہلکے اٹھ رہے ہیں۔ اسے امید ہے کہ وہ بہت جلد آزاد ہو جائے گی۔ اور محبت و احساس فرض میں اس کے لئے کوئی امتیاز باقی نہ رہے گا۔ اور وہ اپنے شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری رسمی مجبوری اور بے چارگی کے ساتھ نہیں بلکہ قلبی لذت و مسرت کے ساتھ کرے گی۔ اسے اس قدر خوشی تھی کہ وہ گانا اور زور سے ہنستا جا رہی تھی۔ لیکن اس کے پاؤں کی چاپ اسے محتاط رہنے کے لئے خبردار کر رہی تھی۔ اب وہ پھلوں کے باغ میں، لائبریری گھاس کے کنارے سے ہو کر گذر رہی تھی۔ آدھا راستہ طے ہو چکا تھا کہ اسے ایک سایہ سا راستہ سے گذرنا ہوا معلوم ہوا۔ اُس کے ذہن نے کہا کچھ نہیں کوئی ٹھنی ہل رہی ہے۔ لیکن خوف و ہراس سے اسے بھوتوں کی موجودگی کا وہم ہونے لگا۔ اور غیر ارادی طریقہ پر اسکی رفتار میں تیزی پیدا ہو گئی۔ ایک ٹھنی کے ٹوٹنے سے وہ اور بھی خوفزدہ ہوئی اور دوڑنے لگی۔ بدحواسی میں، ایک بیل سے اس کا یاؤں الجھا اور وہ گر گئی۔ کوئی چیز اسے اپنے نیچے رنگینی معلوم ہوئی اور پھر ایک پھنکار سی سنائی دی اور سانپ کے پھن جیسی کسی چیز نے اس کی کلائی میں ایک ہلکی سی ضرب لگائی اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

تازہ آنے عین اسی وقت، اپنے منگیتہ کو سامنے کھڑا ہوا دیکھا اور وہ اسی بات کے احساس سے قاصر رہی کہ یہ ہوا کیا۔ اُسے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ وہ اس کی طرف دوڑی اور بہت جلد اس کے بازوؤں کی گرفت میں پونج گئی۔ جب تیزی نے اس کی کلائی کو پکڑا تو وہ ذرا جھجکی۔ لیکن دونوں کو اس بات کا قطعی احساس نہیں ہوا کیونکہ دن کے واقعات کے اعادہ سے دونوں تازگی کے مارے بیتاب تھے۔ اس وقت ہنستا گیا سہل معلوم ہو رہا تھا۔ سخت گیر باپ، احساس فرائض، رسم و رواج کی زنجیریں اور مندروں کی سنگین دیواریں سب انہماک سے اوجھل تھیں۔

گھوڑے عرصہ کے بعد، تیزی نے تازہ کے چہرے پر اضمحلال کے آثار دیکھنا شروع کئے۔ لیکن تازہ نے ہنس کر ان علامات کو مٹانے کی کوشش کی اور گھاس پر گرنے کا واقعہ بیان کیا۔ جب تیزی نے اس کی کلائی کو دبایا تو پھر غیر ارادی طور پر وہ جھجکی۔ اس مرتبہ تیزی نے دیکھ لیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ مجھے زخم دکھلاؤ لیکن وہاں زخم نہ تھا، ہتیلی کے اوپر صرف دو بدنما نشان بنے ہوئے تھے۔

اُس نے گہرا ہٹ سے پوچھا۔ "تازہ۔ مجھے گھرے ہوئے کتنی دیر ہوئی۔ کیا کسی چیز نے تجھے کاٹا تھا۔" "کیوں نہیں تو۔" اس نے جواب دینا شروع کیا۔ لیکن پھر پھنکارا اور اپنے نیچے کسی چیز کا رنگنا اُسے یاد آگیا۔ تیزی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جب اس نے پورا قصہ سنا اور ایک سخت خوف اس پر طاری ہو گیا۔ اس کے بیان سے سانپ کا کاٹنا ثابت ہوتا تھا۔ لیکن زہر شراٹین میں سرایت کر چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ

اُس کے اثرات چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے۔ اس کے پاس اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اس خوفناک حقیقت کو جہاں تک ہو سکے تارا سے پوشیدہ رکھے۔ اسے اپنے رومال سے اس کی کلائی کو باندھ دیا اور دُکھتے ہوئے اور بے قرار دل کے ساتھ اس نے کوشش کی کہ اپنی نگاہوں سے کسی تکلیف کا اظہار نہ ہونے دے۔ لیکن تارا سب سمجھ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں خون دہراں سے پھیل گئیں۔ ”نیری۔ پھن والی چیز سا.....“

.... سانپ تھی! آہ۔ خدا کے لئے انکار نہ کرو۔ لیکن۔ نیری۔ کیا۔ کیا میں مر جاؤں گی۔“

”نہیں۔ نہیں۔ میری جان“ اُس نے چلا کر کہا اور اپنے سینے سے دبا کر لپٹا لیا۔ اس نے سوچا کہ دیوتا ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ اب وہ نہیں مر سکتی۔ میں نے اس کے نازک گلاب جیسے وجود کو اپنے دل پر نقش کر لیا ہے۔ ابھی ایک لمحہ ہوا، سرور و شاداں، زندگی اور صحت سے معمور؛ وہ میرے بازوؤں کی گرفت میں آچکی ہے

ب۔ موت.....

تارا نے بیتابی اور بے صبری سے لپٹے ہوئے کہا ”نیری۔ مجھے اپنے بازوؤں کی گرفت میں مضبوطی سے پکڑ ہو اور میں بہادری سے مقابلہ کی کوشش کروں گی۔ کیونکہ تیری معیت میں یہ تکلیف بھی بے حقیقت ہے۔“

جب ایک چیخ اس کے لبوں سے نکلی اور اس کا چہرہ متغیر ہونے لگا، تو نیری کو اس کی محبت نے بتایا کہ اسے اس وقت کیا کرنا چاہئے۔ اس نے تارا کو اپنے دل سے لگائے رکھا اور تسکین دیتا رہا۔ کیونکہ اس کی زندگی آہستہ آہستہ تم ہو رہی تھی۔

نیری نے اُسے پیار کیا اور آہستہ آہستہ کہا ”اے تارا، تجھے ایک دفعہ پالینے کے بعد، چھوڑ دینا بڑی سخت اذیت ہے.....“

جوں جوں وقت گزرتا گیا، مہلک زہر آہستہ آہستہ دل کی طرف بڑھتا رہا۔ کوشش کے ساتھ تارا نے نگاہ ناکراں کو دیکھا۔ ایک غیر فانی محبت تارا کی آنکھوں میں خوفگن تھی اور نیری کی آنکھیں بھی اس محبت کا جواب ایسی ہی پاک اور ابدی محبت سے دے رہی تھیں۔

وہ بھکا اور اس نے اس کے لبوں کو بوسہ دیا۔ اس کے بازوؤں کی گرفت میں اس حسین دوشیزہ گلاب نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ جس حُسن و نزاکت کے ساتھ نیری کی زندگی میں وہ داخل ہوئی تھی اس حُسن و نزاکت کے ساتھ اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر کے رخصت ہو گئی۔

(ترجمہ از الرٹریٹڈ ویکی)

محمد عاقل ایم۔ اے (علیگ)

جنم شہادت کی تقریب میں

اڈیٹر نگار کی تقریر

جناب صدر و حاضرین جلسہ —————
 گزشتہ سات سال قیام بھنوں کے زمانہ میں میرے لئے یہ بالکل پہلی فرصت ہے کہ مجھے کسی مجمع میں زبانی
 اظہار خیال کا موقعہ ملا ہو اور مجمع بھی کافروں کا ————— معاف فرمائے یہاں میں نے لفظ کافر منکر و لمجد کے معنی میں
 استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ اس مفہوم میں استعمال کیا ہے جو دنیا کے شر و محبت میں نہایت ہی عزیز و محبوب ہستی
 کے لئے مستعمل ہوتا ہے اور باور کیجئے کہ ہندو جماعت بعض اعتبارات سے مجھے حد درجہ عزیز و محبوب ہے۔
 بہر حال میرے لئے بڑی مسرت کی بات ہے کہ آج میں آپ حضرات کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں
 اور ایسے تہوار کی تقریب میں جو ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس ایک مقدس رات
 کی یادگار میں جب ایک برگزیدہ ہستی نے عالم وجود میں آکر حیات انسانی کے بہت سے نئے اور اوق پلٹ کر رکھنے
 افسوس ہے کہ صرف کل شام کو مجھے یہاں حاضری کی دعوت دی گئی اور مجھے بالکل موقعہ نہیں ملا کہ میں اس
 مہتمم بالشان تقریب کے لئے کوئی قابل ذکر خدمت انجام دے سکتا، تاہم تعمیل ارشاد میں حاضر ہو گیا ہوں اور
 اپنی پریشان خیالی پر اظہار معذرت کرتا ہوں۔

حضرات، میں ایک زمانہ سے مذاہب عالم کا مطالعہ کر رہا ہوں اور جنھوں نے نگار کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ
 اچھی طرح واقف ہیں کہ اپنی آزاد خیالی کے بدولت مجھ پر کیسے کیسے سخت حملے ہوئے اور ہو رہے ہیں، لیکن میں یہ کہنے
 سے کبھی باز نہیں رہ سکتا کہ مطالعہ مذاہب کے سلسلہ میں، جس نتیجہ پر میں پہنچا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ یا تو مذاہب
 سب کے سب لغو و مہمل ہیں یا سب کے سب سچے ہیں۔ وہ اس لحاظ سے کہ دنیا میں کوئی خونریزی و خون آشامی
 ایسی نہیں ہوئی جس میں مذہب کا ہاتھ نہ رہا ہو اور یہ اس حیثیت سے کہ جب ہم ان کی تعلیمات کو دیکھتے ہیں

توان کی سچائی سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتے۔

دنیا میں مذہب کے ہمیشہ دو پہلو رہے ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق عقائد سے ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو اعمال سے وابستہ ہوتا ہے۔ یاد دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ایک کا نام ”فلسفہ مذہب“ ہے اور دوسرے کا معاشرت و تمدن۔ پھر یہ تو اکثر ہوا کہ کسی قوم نے ان میں سے کسی ایک پہلو کو لے لیا اور معراج ترقی تک پہنچا دیا، لیکن ایسا کتر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی جماعت کے دونوں پہلو مکمل رہے ہوں اور غالباً یہ کہنا خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ ہندوں کی جماعت میں بہت کچھ اس تکمیل کی صلاحیت پائی جاتی ہے، کیونکہ اگر ایک طرف انکا فلسفہ ویدانت، اپنی جگہ فلسفہ مذہب پر آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے تو دوسری طرف کائنات حیات میں ان کی تقسیم عمل کامیابی کا بڑا راز ہے۔

آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ ہندو کوئی مذہب نہیں ہے۔ بلکہ یہ لفظ ایرانی الاصل ہے۔ قدیم اہل ایران دریائے سندھ کو دریائے ہندھو کہا کرتے تھے اور بعد کو ادھر کے رہنے والوں کو بھی اسی لفظ سے پکارنے لگے یہ تو خیر لغوی تحقیق ہوئی مگر میں تو حقیقت کے لحاظ سے بھی یہی کہتا ہوں کہ ہندو اصطلاحی معنی میں کوئی مذہب نہیں ہے۔ بلکہ سوسائٹی کا ایک نظام ہے، دنیاوی کاروبار میں تقسیم عمل کا ایک طریقہ ہے اور آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کا دستور۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مذہب میں نہ کبھی کسی شخص پر کفر و الحاد کا فتوے لگا کر اسے مذہب سے خارج کیا جاسکتا ہے اور نہ اصولاً آپ انکار کر سکتے ہیں اگر کوئی اور شخص آپ کی جماعت میں شامل ہونا چاہے، لیکن معاف فرمائیے اگر میں کہوں کہ جس طرح دنیا کی اور تمام قوموں نے اپنے اصول حیات و معاشرت کو بھلا دیا، اسی طرح آپ نے بھی اسے بھلا دیا۔ اور آج ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی بارہا بھلایا اور جب بھلایا کوئی نہ کوئی شخص آپ میں ضرور ایسا رو نما ہوا جس نے اس بھولے ہوئے سبق کی یاد دلانی۔ پھر کیا آپ کو یا کسی اور کو اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ جب بدی آٹھ بھدر اکو کرشن جی ہمارا ج عالم وجود میں آئے تو یہ زمانہ وہ نہ تھا جب آپ اپنی زندگی کے اصل مقصد کو بھلا چکے تھے۔ اور کیا ضرورت نہ تھی کہ کوئی رفاہیہ مصلح اس وقت پیدا ہوتا اور آواز عن بلند کرتا؟

پھر اس وقت ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ وہ راج چندر جی کی طرح چھتری جماعت کے ہمیر و بنکر ما بھارت میں پانڈوں کے دست راست تھے، یا بھگوت گیتا کے بیان کے مطابق دشمنوں کے اوتار رہے ہم کو اس تحقیق کی حاجت ہے کہ دشمن بران کی روایات کے مطابق متھرا میں راجہ اور گویہوں کے ساتھ ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ کس ریاضت میں بسر ہوا! اپنی حیات کے آخری لمحے دو اراکھیں کس طرح گزارے، بلکہ صرف یہ ہے کہ جس چیز کا انھوں نے درس دیا، جس بات کی انھوں نے تسلیم دی وہ کیا تھی اور کیسی تھی۔ پھر

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ بھگتی سے بہتر تعلیم، فلسفہ اخلاق و تصوف کی کوئی اور ہو سکتی ہے؟

روحانی صداقت، اخلاقی پاکیزگی، داستان محبت، پیام آزادی، باطل کا مقابلہ، حق کی حمایت، اگر آپ ان تمام باتوں کو دنیا کی کسی شاعری میں یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو بھگوت گیتا پڑھئے اور عالم سے بے نیاز ہو جائے۔

افسوس ہے کہ میں اس زبان سے واقف نہیں جس میں بھگوت گیتا کا مطالعہ کرنا چاہیے لیکن جس حد تک ترجموں سے استفادہ کا تعلق ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھ پر کم کسی کتاب کا اتنا اثر ہوتا ہے جتنا بھگوت گیتا کا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے کا سینہ جذبات کے طوفان سے لبریز ہے اور انسانی زبان اس کو ظاہر کرنے سے عاجز رہتی ہے لیکن وہ لوگ جو صرف الفاظ کے پیرو نہیں ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جو سیلاب ان محدود لفظوں میں نہیں آسکا، ہوسمند اس کوزہ میں نہیں سما سکا ہے اس کی حقیقت کیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟

آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ جب پندرہویں صدی کے اخیر میں ولجھنے والے راجپوتانہ و گجرات میں اور ایک دوسرا مہاتمانے بنگال میں دشمنی رفاہر کی حیثیت سے تعلیمات بھگوت گیتا کو از سر نو زندہ کرنا چاہا اور پھر انیسویں صدی میں سوامی نارائن جی مہاراج نے اس تحریک میں اور زیادہ قوت پیدا کرنا چاہی، تو دفعہ لوگوں کے خیالات میں کیے انقلاب برپا ہوا اور کس طرح لوگ جوق در جوق اسی تحریک کی طرف گھنچ کر آنے لگے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ آج جبکہ شمالی ہند میں بہت بڑی جماعت پرستار ان کرشن کی موجود ہے، بھگوت گیتا کی کس تعلیم پر عمل لیا جا رہا ہے اور آپ نے ہندوستان کے اس پیغمبر اعظم کی بتائی ہوئی راہوں پر چلنے کی کس حد تک کوشش کی ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بھگوت گیتا کی اصل روح تمام دنیا کے انسانوں کو بھائی سمجھنا ہے، لیکن مہاراجا نے ہے کہ شاید اس مجمع میں اس وقت بھی بہت سے ہندو بھائی ایسے ہوں گے جو مسلمان کا تو خیر ذکر ہی کیا، خود اپنی ہی بھائی کے کسی دوسرے فرد کے ہاتھ کا پیکا ہوا کھانا نہ کھائیں گے۔ افسوس ہے آپ لوگ انسان کو صرف اس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس کے سر پر جوٹی ہے یا نہیں، وہ دھوتی پہنتا ہے یا پاجامہ اس کے سر پر تر کی ٹوپی ہے۔ فلسفہ کیپ، حالانکہ انسان نام ظاہری وضع قطع کا نہیں بلکہ اس کے بطون کا ہے، اس کے دل کا ہے جس پر سما جانے کے لئے خدا کوئی تفریق نہیں کرتا۔ اگر آپ لوگ اس حقیقت کو سمجھ جائیں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے مذہب سے زیادہ امن پسند و صلح کل مذہب کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

معاف فرمائے اگر میں کہوں کہ آپ بھی دوسرے مذہب والوں کی طرح اپنے مذہب سے بہت دو۔

گئے ہیں اور جو تعصب ان میں پایا جاتا ہے وہی آپ میں بھی ہے

درمیان کافراں ہم بودہ ام
یک کمر شالیہ ز نار نیست

یورپ میں ویسالیوس کے زمانہ تک جو لوگ علم تشریح الاعضاء سیکھتے تھے وہ بجائے اس کے کہ خود کسی لاش کو چیر بھاڑ کر اعضا کی تشریح سیکھیں، صرف حکیم جالینوس کی کتابیں پڑھ کر علم تشریح سیکھا کرتے تھے۔ عملی طور پر اگر تعلیم ہوتی بھی تھی تو وہ صرف ادنیٰ قسم کے جانوروں کی لاشوں پر اور اس کام کے لئے خنزیر کو خاص طور پر منتخب کیا جاتا تھا۔ علم تشریح کا درس دیتے ہوئے پروفیسر جالینوس اور بوعلی سینا کی کتابیں کھول کر پڑھتا جاتا تھا اور اس کا مددگار ایک لائبریری جریب ہاتھ میں لے کر لاش کے مختلف اعضا کی طرف اشارہ کر کے بتاتا جاتا تھا ویسالیوس اس طریقہ کا ہمیشہ سخت مخالف رہا اور اکثر شکایت کیا کرتا تھا کہ اس کا استاد جنٹریس اپنے چاقو سے قلم تراشی کے سوائے کوئی کام نہیں لیتا۔

الغرض لاشوں کی چیر بھاڑ کر کے تشریح اعضا معلوم کرنے کے لوگ سخت مخالف تھے۔ اور اب ماہرین طب اپنی معلومات کو مکمل کرنے کا کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کرتے۔ اور یہ امر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ پوسٹ مارٹم کے سوا دنیا میں کوئی طریقہ ایسا نہیں جس سے طبی معلومات میں مزید اضافہ ہو سکے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں اب صرف یہ مرحلہ طے کرنا باقی رہ گیا ہے کہ بیماریوں کے اسباب کے رد کرنے کا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ تحقیقات کرنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض صورتوں میں بن اسباب کے ماتحت موت واقع ہوتی وہ ہرگز روٹمانہ ہوتے اگر تقدم بالحفظ پر عمل کیا جاتا اور اسی زمانہ میں علم طب انسدادیہ (pre Science) کو ترقی ہونا شروع ہو گئی۔

ابھی کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ انسان نے نظر یہ جراثیم اختراع کیا۔ جسے اب دنیا نے پوری طرح تسلیم کر لیا ہے۔ موسیو پاسٹیور نے علم طب میں جو شاندار کارنامہ انجام دیا اس سے بلاخود تردید اب یہ نظریہ قائم ہو گیا ہے کہ بہت سے امراض جن کے اسباب و علل اس وقت تک پردہ خفا میں تھے، درحقیقت بعض نہایت باریک خورد بینی جراثیم کے جسم میں داخل ہو جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور انھیں جراثیم کی وجہ سے موت واقع ہوتی ہے۔ اور اب طب انسدادیہ ترقی کرنے کے لئے اس قدر کامیاب ہو گیا ہے کہ جو موذی اور مستعدی امراض کچھ عرصہ پیشتر عالم انسانی میں تھلکہ ڈال دیتے تھے ان کو بڑی حد تک قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔ ان انسدادیہ جراثیم کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بچوں کی تعداد اموات میں کمی ہو گئی۔ اور اس طرح گویا انسان کی زندگی کے اوسد اطول میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

جوں جوں حیوانات کے مدارج حیات بلند ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی وہ قوت تجدید شباب (Rejuvenation) بھی زائل ہوتی جاتی ہے جو بعض ادنیٰ قسم کے جانداروں میں پائی جاتی ہے۔

یعنی جب حیوان منازل ارتقاء طے کرنے کرتے انسان کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو اس کی وہ قوت تجدید قطعی زائل ہو جاتی ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنا کوئی صنایع شدہ حصہ بھریدا کر لیا کرتا تھا۔ چنانچہ کیچوے کی قسم کے جانور (unicellular organism) جو ارتقاء جسمانی کے پہلے ادنیٰ میں ہیں وہ اس لحاظ سے قطعی "لافانی" ہیں کہ ان کو فطری طور پر موت لاحق نہیں ہوتی۔ اگر ماحول اپنی حال ہو تو فارمیسیم (paranecrosis) یعنی بانی اور دیگر سیال چیزوں میں پائی جانے والے نہایت باریک خوردبینی کیڑے) کی ساڑھے آٹھ ہزار پشتیں یوں ہی گزر جاتی ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ کہ ان حیوانات کی جو ٹیلیس کے بعد دیگرے ارتقائی حالت میں پیدا ہوتی ہیں ان میں کسی قسم کی ترقی نہیں ہوتی۔ الغرض جوں جوں حیوانات کی زندگی زیادہ ترقی یافتہ ہوتی جاتی ہے اور ان کے مختلف اعضاء و جوارح کے افعال مخصوص ہوتے جاتے ہیں۔ اس کی قوت تجدید بھی زائل ہوتی جاتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بعض قسم کے رینگنے والے کیڑوں میں ایسی قوت تجدید حیات ہوتی ہے کہ اگر ان کے جسم کا $\frac{1}{10}$ حصہ بھی کاٹ دیا جائے تو وہ نشوونما پانچ پورا کیڑا بن جائے گا۔ اور یہ نئے کیڑے بڑے بڑے کیڑے سے جس کے جسم کا ٹکڑا لیا گیا تھا زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ اس وقت باوجود اس یقین کے کہ کسی نہ کسی دن موت کا آنا ضرور ہے، انسان اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ موت کا وقت جس قدر ملتوی ہو سکے غنیمت ہے۔

زندگی اور موت کا درمیانی وقفہ ایسا نہیں جو پشیم زدن میں طے ہو جائے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سانس بند ہو جانے کے بعد یا ڈوگھنٹہ تک قلب کی حرکت جاری رہتی ہے۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض اعضاء کے خلیا زیادہ عرصے تک موت طاری ہونے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ اگر ان خلیا کو مناسب حالات اور موافق ماحول میں رکھ دیا جائے تو وہ ایک غیر معین مدت تک زندہ رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ شخص یا فرد جس کا ان خلیا سے تعلق تھا کبھی کامر چکا ہے

تحفظ ذات اور خواہش حیات یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں جو نوع انسانی کی فطری خصوصیت سمجھی جاتی ہیں۔ اور زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کی خواہش کیسا تھ یہ تمنا بھی پیدا ہوتی ہے کہ زندگی اچھی طرح بسر ہو۔ کیونکہ اگر انسان کی قوت فکر، اور قوت احساس زائل ہو جائے تو اس کے لئے زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کی خواہش بیکار ہے۔ ایسا شخص ایک ایکڑ ہے۔ جو اپنا پارٹنر تم ہو جانے کے بعد بھی ایسٹج پر فضول کھڑا ہے جب انسان کی ذہنی سرگرمیاں زائل ہو جائیں۔ اس وقت طول حیات کی آرزو قطعی بیج ہے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہئے کہ زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کی جسمانی و دماغی صحت بھی کسی قدر بحال رہے۔

تطویل حیات کی جس قدر فکر انسان کو اس زمانہ میں دامنگیر ہوئی ہے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اور جب قدر اس مسئلہ پر انسان کا دماغ آجکل غور کر رہا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں کیا۔ اب اس پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا جا رہا ہے اور ایسے ایسے لوگ غور کر رہے ہیں جن کے نقطہ ہائے نظر قطعی مختلف ہیں، قومی اور بین الاقوامی جماعتیں بھی اس مدعا کے حصول کے لئے سرگرم ہیں اور حکومتوں کو بھی یہ فکر لاحق ہے کہ اس کی رعایا کیونکر طویل حیات حاصل کر سکے متعدی امراض کے انسداد میں محکمہ صحت عامہ کے کارکن ہر وقت مصروف عمل رہتے ہیں۔ اور انسداد امراض کی غرض سے سختی کے ساتھ قریظینے قائم کئے جا رہے ہیں۔

مختلف جماعتوں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اپنی قوم کے شہریوں کی صحت کا تحفظ کیا جائے۔ اور کوئی سیٹھا جماعت اس وقت تک برسر اقتدار نہیں رہ سکتی۔ جب تک وہ اپنے شہریوں کے لئے عمدہ پانی کی بمرسانی، صفائی کی مناسب تدابیر، قواعد حفظان صحت کے مطابق سامان خور و نوش کی فراہمی اور متعدی امراض کے انسداد کی تدابیر عمل میں لانے کا فرض اپنے ذمہ نہ لے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسان زمانہ قدیم میں زیادہ عرصہ تک زندہ رہتا تھا۔ اور اب اس کی عمر گھٹ گئی ہے۔ اور اس کا ثبوت وہ بائبل سے دیتا ہے۔ حالانکہ اس سلسلہ میں اول تو یہی بات قابل تشریح ہے۔ کہ بائبل میں جو لفظ "سال" استعمال کیا گیا ہے وہ دراصل انہی معنی میں ہے جس سے ہم لوگ آشنا ہیں کسی اور معنی میں۔ اس میں شک نہیں کہ نوٹنگی اور یعقوب کی عمریں اپنے زمانہ کی اوسط عمروں سے زیادہ طویل ہوئیں۔ لیکن قدیم مصریوں کے مقابر سے جو پرانی تحریریں برآمد ہوئی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب سے دو ہزار برس پیشتر انسان کی عمر طبعی تیس برس تصور کی جاتی تھی۔ بچوں اور کس لڑکوں میں شرح اموات اب سے کہیں زیادہ تھی۔ البتہ رومیوں میں انسان کی عمر طبعی کسی قدر زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ مشہور ہے کہ انھیں ڈاکٹروں سے سخت نفرت تھی اور جب یونانی اطباء نے رومہ الکبریٰ میں آباد ہونا شروع کیا تو رومیوں نے ان کی طرف بہت کم توجہ کی۔ مورخ پلائینی (*Pliny*) نے اس بارہ میں لکھا ہے کہ :- " طبابت کا پیشہ اختیار کرنا اہل رومہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور جو معدودے چند طب پڑھتے تھے۔ وہ درحقیقت یونانی ہو گئے تھے "۔

انسان کی عمر طبعی کے متعلق سب سے پہلا نقشہ مشہور ماہر فلکیات ہیلی (*Halley*) نے تیار کیا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس کے نام سے ایک ڈمداستارہ مشہور ہے۔ ہیلی نے اپنے مرتب کردہ نقشہ میں دکھایا تھا کہ شہر برسلا (واقع جرمنی) میں سال ۱۶۷۶ء میں انسان کی عمر طبعی پیدائش کے وقت ۳۳ برس شمار کی

جانی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں انگلستان کے اندر انسان کی عمر طبعی ۳۹ برس سمجھی جاتی تھی، لیکن جب سے تمام مہذب و تمدن دنیا میں حفظانِ صحت کے متعلق عظیم بیداری پیدا ہوئی۔ اس وقت سے انسان کی عمر طبعی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کی خواہش کا نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ انسان نے تطویلِ حیات کی تدابیر معلوم کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ موت کا ایک دن آنا لازمی ہے۔ لیکن انسان کی خواہش یہ ہے کہ موت کا دن جب تک ملتوی رہے اسی قدر اچھا ہے۔ اور اس میں اس کی کوششیں صرف علمی یا سائنٹفک تدابیر تک ہی محدود نہیں رہیں، بلکہ وقتاً فوقتاً اس کام کے لئے انسان نے نہایت عجیب و غریب بلکہ مضحکہ انگیز تدابیر اختیار کی ہیں۔

دنیا کے مختلف ملکوں میں بڑے بڑے حوصلہ مند اور بہادر لوگ "اعرت" کی تلاش میں سرگرداں پھرے آجیات کی تلاش میں سکندر اعظم نے طبقہ انظلمات کی خاک چھانی۔ یورپ میں پولس ڈیلین چشمہ حیات کی تلاش میں مارا مارا پھرا۔ الغرض انسان کی خواہش ہر زمانہ میں یہی رہی کہ بیماری، انحطاط، اور موت سے محفوظ رہے۔

ہمارے ہی زمانہ میں انحطاط سے بچنے کے سیکڑوں عجیب و غریب نسخے ایجاد ہوتے ہیں۔ سیکڑوں ترکیبیں قیامِ صحت اور استقرارِ شباب کی بیان کی جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ غذا پر زور دیا جاتا ہے۔ ایک شخص کتنا ہے کہ تطویلِ حیات کا راز خالص نباتاتی غذا میں مضمر ہے۔ دوسرا کتاب ہے کہ فلاں چیز کھائی جائے تو صحت اور زندگی بحال رہتی ہے۔ کوئی کتاب ہے کہ کئی دو دھکا استعمال آجیات کا کام دیتا ہے۔ کوئی کتاب ہے کہ ایسی چیزیں کھائی جائیں جن میں کسی قدر نشہ بھی ہو۔ اور کوئی کتاب ہے کہ زندگی جاہو تو نشہ آور چیزوں کے پاس نہ جاؤ۔ لیکن لطف یہ ہے کہ جس قدر کسی غیر معمولی چیز کی سفارش کی جاتی ہے اسی قدر لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ غذا کا تعلق تطویلِ حیات اور قیامِ صحت سے بہت زیادہ ہے۔ اور اسی سلسلہ میں بہت سے سائنسدانوں نے بعض خاص غذاؤں کی سفارش بھی کی ہے یہ بھی درست ہے کہ بعض کے فقدان کا نتیجہ بیماری ہوتا ہو اور ہم بھی جانتے ہیں کہ بعض خاص قسم کی چیزوں کا کھانا خاص خاص بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ ایک جدید نظریہ قائم ہوا ہے کہ زیادہ تر وہ غذا یہ استعمال کی جائیں جن میں "وٹامین" *Vitamins* جوہر حیات، زیادہ ہوں۔

حکیم پلوٹارک نے جو قواعد و ضوابط صحت کے متعلق قائم کئے ہیں ان میں زیادہ غذا پر بحث کی گئی ہے اور اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ انسان کو اپنی صحت قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ سادہ غذا استعمال کرنا چاہئے۔

صحت کے سلسلہ میں دوسری چیز جس پر زیادہ زور دیا گیا ہے وہ ”ورزش“ ہے۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ اگر عضلات جسم کی حالت درست رکھنا منظور ہو تو ورزش ضرور کی جائے۔ اگر روزمرہ کھلی ہوا میں اعلیٰ درجے کے ساتھ تھوڑی سی ورزش کر لی جائے تو اس سے انسان کی صحت جسمانی درست رہتی ہے۔

مذکورہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ ورزش جسمانی کی بھی ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔ زمانہ قبل از تاریخ کے انسان کی تویہ حالت تھی کہ وہ خوراک کی تلاش میں سرگرداں پھرتا تھا۔ اور اس طرح اس کی ورزش کافی ہو جاتی تھی۔

علاوہ ازیں اس کے لئے یہ بھی لازمی تھا کہ خود کو جنگل کے درندوں یا دشمن قبائل کی تاخت و تاراج سے محفوظ رکھنے کے لئے مضبوط رکھے۔ اور اس لئے اسے لازمی طور پر ورزش کرنا پڑتی تھی۔ پھر چونکہ قدیم انسان کے پاس اپنی ٹانگوں کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نقل و حمل نہیں تھا۔ اس لئے وہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام رقبہ پیادہ پاٹے کیا کرتا تھا۔ نہ کوئی راستہ تھا نہ سڑک نہ دریاؤں پر کوئی پل تھا۔ گرمی اور سردی۔

بارش اور برف سے اس کی جان عذاب میں رہتی تھی۔ اور ہمسایہ کے دشمن قبائل جو قتل و غارت کرتے تھے وہ علوہ۔ جو لوگ جسمانی لحاظ سے کمزور یا ناکارہ ہوتے تھے وہ ایسی زندگی کی سختیوں کو ہرگز برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ طے مراحل اور قطع منازل کرتے کرتے یا تو راستہ پر خود ہی گر پڑتے تھے یا ان کے ساتھ ان کو چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ الغرض اس وقت صرف وہی لوگ زندہ رہ سکتے تھے جن کے ہاتھ پاؤں طاقتور اور دل مضبوط ہوں۔ اس زمانہ میں نہ کوئی اسپتال تھا۔ نہ کوئی خیراتی شفا خانہ یا محتاج خانہ۔ نہ کمزور لوگوں اور بیماروں کے لئے کوئی جائے پناہ تھی۔ الغرض جس قدر... بقائے زندگی کے لئے سامان خورد و نوش کا ہونا

لازمی ہے اسی طرح سے انسان کے لئے ورزش جسمانی بھی ناگزیر چیز ہے۔ موجودہ تمدن نے زندگی کی راہ میں بہت کچھ سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔ انسان بغیر تکلیف اٹھائے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا جاسکتا ہے۔ محنت سے بچنے کے صد ہا طریقے ایجاد ہو گئے ہیں کہیں بجلی ہے کہیں ٹیلیفون۔ کہیں تلگراف ہے۔ کہیں موٹر کار اور کہیں لاسٹکی۔ جن کے ذریعہ سے معمولی آمدنی کا آدمی بھی اپنی زندگی آرام بسر کر سکتا ہے۔

الغرض فی زمانہ انسان پر کوئی ایسی محنت نہیں پڑتی جس سے اس کی ورزش جسمانی پوری ہو سکے۔ اس لئے سخت ضرورت ہے کہ انسان کو ورزش جسمانی کی ترغیب دی جائے۔ تطویل حیات کے لئے آج کل

بیمہ کمپنیاں اسی اصول پر عمل کر رہی ہیں۔ جو لوگ اعضاء و جوارح کے افعال و فرائض سے واقف ہیں کہ انسان کے جسم میں اگر بعض خاص غدود نشوونما پانچا جائیں تو صحت پر بہت مفید اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل خاص قسم کے غدودوں کے بارہ میں بہت محنت سے تفتیش کی جا رہی ہے۔ اور تجربوں سے دکھلایا جا رہا ہے کہ اگر انسان کے جسم میں بعض

خاص غدود داخل کر دئے جائیں تو ان کے ذریعہ سے انسان کی عمر بڑھ جاتی ہے۔ کچھ عرصہ سے اس امر پر بھی بہت کچھ غور و خوض کیا جا رہا ہے کہ کسی بیماری کا تعلق والدین یا آبا و اجداد سے کیا ہے۔ اور اگرچہ ابھی اس قسم کی تحقیق و تدقیق کی ابتدا ہے۔ لیکن یہ امر روز بروز واضح ہوتا جاتا ہے۔ کہ انسان کے طول عمر پر جس قدر اثر اس کے آبا و اجداد یا والدین کی صحت اور طاقت کا پڑتا ہے اس قدر کسی اور چیز کا نہیں پڑتا۔ اور یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ طویل العمر اسلاف کے اخلاف بھی طویل العمر ہوتے ہیں۔ اور کوتاہ عمر والدین کے بچے بھی عموماً کوتاہ عمر کے ہوتے ہیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ ہر فرد بشر جو دنیا میں پیدا ہوتا ہے اس کو قدرت کی طرف سے خاص نوعیت کے خلائیاں حاصل مقدار میں عطا ہوتے ہیں۔ بعض صورتوں میں یہ نوعیت ادنیٰ اور بعض صورتوں میں اعلیٰ ہوتی ہیں۔ آجکل زیادہ تر اموات غوارض قلب یا شرائین کی وجہ سے واقع ہوتی ہیں اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو والدین مرض صرع میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے بچوں کے جسم کی رگیں بھی ادنیٰ قسم کی ہوتی ہیں۔

جن لوگوں کی نسبت یہ معلوم ہو چکا ہے کہ انھوں نے اوسط سے زیادہ عمر طبعی پائی ہے ان کی زندگیوں پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لوگوں کے سوانح حیات کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے تطویل حیات کا کام جس دیوتا کے سپرد کیا ہے۔ اس کی نظر انتخاب بھی کچھ عجیب و غریب واقع ہوئی ہے۔ جب ہم ان ”جو انان صدسالہ“ کی سوانح عمریوں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی ولادت اور ابتدائی زندگی کے حالات نہایت مبہم نظر آتے ہیں۔

جب ہم ان لوگوں سے ان کی تطویل زندگی کا راز دریافت کرتے ہیں تو ان کے جوابات اکثر مبہم مغالطہ انگیز بلکہ متضاد و متباہن ہوتے ہیں۔ ایک پر صدسالہ بیان کرتا ہے کہ اس کے طول حیات کا راز یہ ہے کہ اس نے کبھی تمباکو نوشی کی نہ کبھی مسکرات کا استعمال کیا۔ دوسرا کہتا ہے کہ اس کی طویل زندگی تمباکو کے استعمال اور اعتدال کے ساتھ شراب خواری کی رہن منت ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ وہ عمر بھر برابر گوشت کھاتا رہا۔ دوسرا کہتا ہے کہ اس نے کبھی گوشت کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ایک شخص کہتا ہے کہ وہ ہمیشہ برابر روزمرہ ورد کرتا رہا اور دوسرا کہتا ہے کہ اس نے کبھی اتنی بھی محنت نہیں کی کہ بازار ہی جا کر کوئی چیز خرید لایا ہو۔

ان پیران صدسالہ کی دماغی حالت بھی مختلف دکھی گئی ہے۔ ایک شخص کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ نہایت سنجیدہ اور متین ہے اس کا حافظہ بھی اچھا ہے اور طبیعت میں بھی سکون ہے۔ دوسرے شخص کو دیکھتے ہیں کہ وہ حد درجہ کاسر بلع الحس ہے ذرا سی بات پر غضبناک ہو جاتا ہے اور ادنیٰ سی بات پر اس کے جذبات

مشتمل ہو جاتے ہیں۔ امریکہ کے پریزیڈنٹ جان ایڈمز (John Adams) نے
اکیا نوے سال کی عمر پائی تھی۔ مگر وہ اس قدر سرخ القضب تھا کہ ذرا ذرا سی بات میں آپے سے باہر ہو جاتا
تھا۔

اکثر حضرات اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ انسان کی دماغی و ذہنی حالت کا اس کی صحت جسمانی پر بچہ
اثر پڑتا ہے۔ ہمیں اس نظریہ پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن ہنوز یہ بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ انسان کی ذہنی قوتیں
اس کو کسی بیماری سے محفوظ رکھ سکتی ہیں یا اس کے قوی کے انحطاط کو روک سکتی ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ ”ہم
نے کوئی فلاسفر ایسا نہیں دیکھا جو دانت کے درد سے رو نہ دیا ہو“
بہر حال تطویر حیات اور اس بات کی کوششوں کا سلسلہ ابھی جاری ہے کہ قوائے انسانی کے
قدرتی انحطاط کو روکا جائے۔ تاکہ عمر انسانی میں اضافہ ہو سکے۔

اس مختصر بحث کے بعد جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا امور ہیں جن کا انسان کی عمر پر اثر پڑتا ہے تو
سب سے پہلی بات یہ نظر آتی ہے کہ والدین کے قوی اور ان کی صحت کو عمدہ ہونا چاہئے تاکہ بچے کے خلا یا بھی اچھے
ہوں طویل العمر اسلاف کے اخلاف عموماً طویل العمر ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب اس طرح بچہ کو
عمدہ قوی حاصل ہو جائیں تو آئندہ زندگی میں اس کو ان قدرتی وسائل سے با احتیاط کام لینا سکھایا جائے۔
آپ کے پاس قلب و جگر اور دیگر اعضائے رئیسہ کی عمدہ قوتوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے۔ کہ
خواہ ان طاقتوں کو یک لخت صرف کر دیں یا کفایت شعاری کے ساتھ کام لیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ حفظان صحت
کے اصول پر عمل کر کے اپنے ان خداداد قوتوں میں اضافہ کیا جائے۔ کام کاج، کھیل کود، سونے بیٹھنے کے متعلق کوئی
ضابطہ مقرر کیا جانا تو محال ہے۔ کیونکہ ہر شخص کو اپنے ماحول اور حالات کردہ پیش کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے۔
اور یہ باتیں ہر شخص کے لئے مختلف ہوتی ہیں۔ جو چیز ایک شخص کو موافق ہوتی ہے وہی چیز دوسرے شخص کو مضر
پڑتی ہے۔ اس لئے تمام آدمیوں کے لئے کوئی خاص ضابطہ مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ چوتھی بات یہ ہے کہ جو شخص
اپنی عمر زیادہ کرنا چاہے وہ ہر بات میں اعتدال مد نظر رکھے۔ اور نشہ کی چیزوں سے حتی الامکان محترز
رہے۔

علم طب اس قدر ترنی کر چکا ہے کہ ہر شخص کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ جو امراض ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتے
ہیں ان سے کس طرح محفوظ رہنا چاہئے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایک سمجھدار شخص اپنے بچوں کو چیچک، تپ محرقہ، یا
سرخ بخار وغیرہ میں مبتلا ہونے سے محفوظ نہ رکھ سکے۔

تاریخی زمانہ میں علم الاغذیہ کو کبھی اس قدر ترقی نصیب نہ ہوئی تھی جس قدر کہ اس زمانہ میں ہو چکی ہے۔ اس لئے ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ واقفیت رکھے۔

اب معاملہ رہ گیا خصوصیات خاندانی کا سوار تقار حیات کے ابتدائی مدارج میں تو انسان اصول انتخاب فطرت کے زیر اثر کام کرتا تھا۔ لیکن مہذب اور تمدن ہونے کے بعد وہ اس منزل سے بہت دور نکل گیا ہے۔ اب ہر ملک کے شعبہ صحت عامہ کے فرائض اس سے بھی متجاوز ہو چکے ہیں کہ امراض متعدی کا انسداد کیا جا کیونکہ انسان کے قومی خواہ کمزور ہوں یا طاقتور مگر وہ ہر طرف حفاظتی قوانین کے ذریعہ سے محفوظ ہے۔ اور اب ہر ملک کا خزانہ عامہ اور اس کی خیراتی انجمنیں کھوکھا روپیہ صرف کر کے ان لوگوں کی جانیں بچاتی ہیں جو قدیم زمانہ میں نذر اجل ہو جاتے تھے۔ یہ تو نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے ضعیف القوی لوگوں کا استیصال کر دیا جائے۔ لیکن یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد دنیا میں زیادہ نہ بڑھے۔

اگرچہ فی زمانہ عرصہ تک زندہ رہنے کی خواہش بہت بڑھ گئی ہے۔ لیکن علم کی ترقی کے ساتھ باخبر لوگوں کے دلوں سے موت کا خوف بھی زائل ہو گیا ہے۔ اور جو لوگوں انسان اپنی فطری موت کے قریب پہنچتا جاتا ہے اتنی ہی موت اس کو کم بھیجا تک معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور انسان دنیا میں اپنا کام ختم کر نیچے بعد مطمئن... دل کے ساتھ پامردانہ قدم رکھتا ہو اس عالم کی طرف روانہ ہو جاتا ہے جہاں کا حال آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا

سورہ روم

سورہ روم روم

۱۔ ہمیں ہندوستان اور یورپ کے مابین ایک پل بنانا چاہیے جو ان دونوں ممالک کو جوڑے۔

۲۔ ہمیں ہندوستان اور یورپ کے مابین ایک پل بنانا چاہیے جو ان دونوں ممالک کو جوڑے۔

۳۔ ہمیں ہندوستان اور یورپ کے مابین ایک پل بنانا چاہیے جو ان دونوں ممالک کو جوڑے۔

۴۔ ہمیں ہندوستان اور یورپ کے مابین ایک پل بنانا چاہیے جو ان دونوں ممالک کو جوڑے۔

۵۔ ہمیں ہندوستان اور یورپ کے مابین ایک پل بنانا چاہیے جو ان دونوں ممالک کو جوڑے۔

۶۔ ہمیں ہندوستان اور یورپ کے مابین ایک پل بنانا چاہیے جو ان دونوں ممالک کو جوڑے۔

۷۔ ہمیں ہندوستان اور یورپ کے مابین ایک پل بنانا چاہیے جو ان دونوں ممالک کو جوڑے۔

۸۔ ہمیں ہندوستان اور یورپ کے مابین ایک پل بنانا چاہیے جو ان دونوں ممالک کو جوڑے۔

۹۔ ہمیں ہندوستان اور یورپ کے مابین ایک پل بنانا چاہیے جو ان دونوں ممالک کو جوڑے۔

۱۰۔ ہمیں ہندوستان اور یورپ کے مابین ایک پل بنانا چاہیے جو ان دونوں ممالک کو جوڑے۔

باب المناظرۃ والمراسلۃ

(جناب مولوی عبدالملک صاحب آروی)

ماہرچ کے رسالہ میں آپ نے میرے خط کے جواب میں جو بحث کی ہے، میں نے بڑھی، آپ حدیث معراج کو موضوع قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ اگر اس کو صحیح تسلیم کیا جائے، تو (معاذ اللہ) ذات رسول اللہ (ص) اور اللہ (ت) ہوتی ہے، کیونکہ ڈاکٹر ٹنڈل کی روایت کے مطابق ارتادراف نامک "اور" اندر اللوک گینم وغیرہ میں بھی معراج اسلامی کے مثل واقعات پائے جاتے ہیں، آپ اس صورت میں بحث کی دو صورتیں قرار دیتے ہیں یا تو معراج نبوی کے واقعہ سے جو احادیث میں مذکور ہے یکسر انکار کر دیا جائے یا پھر ارجن اور زردشت کی معراج پر بھی ایمان لایا جائے۔

میرا علمی عقیدہ ہے، کہ دنیا کی ساری تاریخ میں احادیث سب سے زیادہ صحیح اور معتبر ہیں کیونکہ روایات کی تنقید و تصحیح کے سلسلہ میں احادیث کے لئے جو انتظام کیا گیا۔ اس کی نظر دنیا کی کسی قومی یا ملی تاریخ میں نہیں ملتی، لہذا بہ حیثیت ایک جوئے حق میرا ایمان ہے، کہ معراج کی حدیث صحیح ہے، اور خود آں حضرت سے مروی ہے، اسی لئے ڈاکٹر ٹنڈل کے ہفتوات کا ترجمہ پیش کر کے میں نے تنقید میں یہی ثابت کیا کہ ڈاکٹر صاحب جو محض ظن و قیاس کی بنا پر اس کا اظہار کر رہے ہیں کہ روایت معراج مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کی عظمت و جلال قائم کرنے کیلئے جو نسیت اور برہمنیت کے نمونہ پر گڑھ لی ہے، صحیح نہیں، چونکہ معراج کی حدیث میرے نزدیک مستند ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی قیاس آرائی کی تردید کر دی گئی، اور بتایا گیا کہ معراج کی حدیث خود آں حضرت سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں اس صورت میں خود آں حضرت پر اعتراض وارد ہوتا ہے، کہ انہوں نے "ارتادراف نامک" کی داستان کے مثل اپنی معراج کا واقعہ وضع کر لیا، چونکہ تاریخ اس کی شاہد ہے، کہ آں حضرت پہلوی زبان سے واقعہ نہ تھے، اس لئے آپ ایک غیر مسلم مقررین

کی طرف سے یہ قیاس پیش کرتے ہیں کہ آن حضرت کے زمانہ میں ایک ایسا ”عجمی“ موجود تھا جس کی طرف لوگوں کا گمان تھا، کہ وہ آپ کو سکھاتا ہے، اس سلسلہ میں آپ نے سورہ نخل کی یہ آیت درج کی ہے،

يقولون انما يعلم بشرط لسان الذی یلمذون لوگ کہتے ہیں آپ کو کوئی آدمی سکھا جاتا ہے، اس شخص الیہ اعجمی وھذا لسان عربی صہبین۔ کہ زبان جسکی طرف منسوب کرتے ہیں عجمی ہو، اور یہ صاف عربی زبان ہے۔

اس میں شک نہیں بعض مفسرین نے جن میں زرخشری اور بیضاوی بھی ہیں اس ”عجمی“ سے سلمان فارسی کی ذات مراد لی ہے، لیکن ایک مفسر قرآن کے لئے محقق تاریخ بھی ہونا ضروری نہیں اس لئے ہمارے مفسرین نے اس باب میں تاریخی غلطی کی، تعجب تو یہ ہے کہ آپ نے بھی اس سے استدلال کر لیا اور آپ کا بھی گمان غالب یہ ہے کہ اس ”عجمی“ سے حضرت سلمان فارسی مراد ہیں، حالانکہ اصحاب سیر و تاریخ سے یہ پوشیدہ نہیں، کہ حضرت سلمان فارسی مدینہ میں ایمان لائے، یہیں پہلی مرتبہ آپ کو سرور کائنات کا دیدار مہر ہوا، اور یہیں ہی قریظہ کے ایک یہودی سے مسلمانوں نے آپ کو آزاد کرایا، خود آں حضرت نے اپنے دست مبارک سے تین سو درخت لگائے اور حضرت سلمان کی آزادی کے معاوضہ میں اس یہودی کو دیا، اس ”عجمی“ سے ایک رومی غلام مراد ہے، جو نصرانیت کا پیرو تھا، صاحب موضح القرآن کی یہی رائے ہے، جارج سیل نے جتنے اسماء لگائے ہیں ان میں جبر (عمر بن الحضرمی کے یونانی غلام) عابش، قیس، یاسر وغیرہ ہیں اور یہ تمام حضرات نہ تو ایرانی تھے، اور نہ نجوسی مذہب کے پیرو، حضرت سلمان فارسی کا نام بھی سیل نے حاشیہ میں لکھا ہے، لیکن اس کو زرخشری کی رائے سے غلط فہمی ہو گئی، سورہ نخل کی ہے، اور سلمان فارسی مدینہ میں آئے، اس لئے آپ کا یہ قیاس کہ آن حضرت کو ان کی وساطت سے ارتداد ان نامک کی روایت پہنچ سکتی تھی، رد ہو جاتا ہے، حیرت ہے کہ آپ نے محض ظن و قیاس سے کام لے کر یہ تو لکھ دیا کہ سلمان فارسی کے ذریعہ ارتداد نامک کی روایت آن حضرت تک پہنچ سکتی تھی، لیکن اس پر غور نہ فرمایا کہ اس کے مقابلہ میں نقر بن مرث جب ماہر ادبیات ابران موجود تھا، اور اس نے عربوں کو اس سے آگاہ کیا اور آنحضرت کے سلاطین کا تذکرہ کر کے قرآن مجید کو ”اساطیر الاولین“ کہا کرتا تھا، اور اپنے بندار میں سرور کائنات کو حر لبت قرار دیکر خود کو خرافیات قدیمہ کا زیادہ ماہر بتاتا تھا، اب آپ کا یہ لکھنا کہ اسلامی کورنوں نے اس واقعہ کو حذف کر دیا ہوگا، کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے، کیا مورخین اسلام ”غیب میں“ تھے کہ انھوں نے یہودیوں کے مناظروں کا حال کئی صدیاں قبل معلوم کر لے، اگر اسلامی علماء اور مؤرخین اس پیشینہ اور اساطیر تحریری سے کام لیتے تو تاریخ اسلام میں وہ بے شمار واقعات درج نہ ہوتے جن کا غلط مفہوم پیدا کر کے آج جو پیشینہ منہ کی آئے ہیں، اگر ڈاکٹر ٹسڈل کے ہفوات، اور خرافات پریشان پر ایمان لانا ضروری ہے تو زیادہ

سے زیادہ زردشت اور ارجن کی معراج کے واقعات کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے، اس کے جواب میں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ قرآن مجید نے تمام قوموں کے ہادیوں اور انبیاء کے وجود کو تسلیم کیا ہے، لکل قوم مہاد اس لئے اگر پہلوی اور سنسکرت زبانوں میں معراج کے واقعات ملتے ہیں تو انکار کی کوئی وجہ نہیں قیاس کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ پہلوی اور سنسکرت چونکہ ”اندو جرمانیہ“ (Indo Germania) لغات کی شاخیں ہیں اس لئے بہت ممکن ہے، دونوں ایک ہی ماخذ کی بگڑی ہوئی صورتیں ہوں اور آریہ قوم کے کسی نبی کو واقعہ معراج ہوئی ہو، زردشت، اور ارجن کے حالات و سوانح میں چونکہ خرافیات کا غالب اثر ہے، اس لئے معراج کی روایت کے متعلق کسی ذات کی تعیین نہ ضروری ہے، اور نہ ممکن، ہم یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ جس طرح سامی قوموں کے مسیح، ایلیا، اور محمد کو معراج ہو سکتی ہے، اسی طرح آریہ اقوام کے انبیاء و رسل کو بھی معراج ہو سکتی تھی، یہ اور بات ہے، کہ ہم تحقیق و استقرائی بنا پر کسی ذات کی تعیین سے انکار کریں

(نکار) ہر چند یاربابہ ایک ہی مسئلہ پر رد و قدح کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں، لیکن چونکہ آپ کو میرے بیان کی طرف سے تھوڑی سی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اس لئے اس کو دور کرنا ضرور ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ میں سورہ نخل کے ”اعجمی“ سے حضرت سلمان فارسی کی ذات مراد لبتا ہوں۔ حیران ہوں کہ آپ نے میرے کس فقرہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ میں نے پارچ کے رسالہ میں آپ کے حوالہ کا جواب دیتے ہوئے کسی جگہ اشارتاً بھی ظاہر نہیں کیا کہ میرے نزدیک اعجمی سے مراد سلمان فارسی ہیں۔ بلکہ فٹ نوٹ میں صراحتاً یہ درج کر دیا تھا کہ ”یہ بحدہ غالباً دور از کار ہوگی کہ وہ شخص کون تھا۔ اس باب میں تفسیرین کا اختلاف ہے، بعض جبر۔ یا سر۔ قیس۔ وغیرہ کا نام دیتے ہیں اور بعض نے سلمان فارسی کا نام لیا ہے۔“

۱۔ معترض تو سورہ نخل کی آیت پیش کر کے صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ کوئی اعجمی ضرور تھا جس کے متعلق لوگ کہا کرتے تھے کہ آن حضرت کو سکھاتا رہتا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ وہ کون تھا اور کون نہیں خارج از بحث ہے۔ اور نہ معترض سے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ وہ اعجمی کون تھا۔ یہ آپ کا کام ہے کہ اس کی تعیین کیجئے یا نہ کیجئے۔

۲۔ عیلمت ہے کہ آپ معراج نبوی کی حدیث کو صحیح تسلیم کرنے کی ضد میں اس حد تک لڑے آگے کہ زردشت و ارجن کی معراج کو بھی ممکن سمجھتے تھے۔ محبت کی یہی وہ منزل ہے۔ جس کا ذکر کسی شاعر نے ان

مذہب عقل و ہوش چھین لینے والا ثابت ہو تو خود ہی فیصلہ فرمائے کہ اس کی حمایت کون کر سکتا ہے۔ مذہب ذریعہ ہے تزکیہ اخلاق کا اور اخلاق کی درستی عقلی ضرورت ہے۔ اس لئے اصولاً مذہب کو بھی عقلی ضرورت ماننا پڑے گا۔ یہ کیا تماشہ ہے کہ جس چیز کے وجود کو ہم اندر دئے عقل ضروری سمجھیں اسی پر غور کرنے کے لئے ہم عقل سے کام نہ لیں۔ اسی لئے ہمیں مذہب کے تمام اصول و معتقدات کو پہلے درایت و فراست کی کسوٹی پر کس کر دیکھتا ہوں، اگر وہ اس طرح کامل العیار نکل آئے تو پھر روایتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، ورنہ ان پر نگاہ بھی نہیں ڈالتا۔

پھر بیچ بتائے کیا واقعات معراج پر آپ نے درایتاً کبھی نظر ڈالی ہے اور کیا رسول اللہ کا براق پر سوار ہو کر درجہ بدرجہ آسمانوں پر چڑھنا اور طمانکہ و انبیاء سے وہ تمام باتیں کرنا جو تفصیلی ذکر حدیث میں موجود ہے۔ آپ بالکل صحیح باور کرتے ہیں۔ اگر آپ کے نزدیک اس میں کوئی استحالہ عقلی نہیں ہے۔ اور اس کو حقیقتاً بالکل واقعہ سمجھتے ہیں، تو مجھے آک آہ بھر کر خاموش رہ جانے کے علاوہ کچھ نہیں کہنا، لیکن اگر آپ کا ضمیر واقعات معراج کو تمثیلی بار و حافی حیثیت سے زیادہ کوئی جگہ نہیں دیتا تو پھر آپ اس حدیث کی صحت پر کیوں اصرار کرتے ہیں جو رسول اللہ کے ”معراج جسمانی“ کو بالکل ارجح اور زردشت کی سیر آسمانی کی طرح پیش کر رہی ہے، اور کیوں نہیں آپ لٹڈل کے ہمزبان ہو کر رسول اللہ کی ذات گرامی سے اس الزام کو دفع کر دیتے کہ خود انھوں نے ان واقعات کو بیان کیا۔

مجلس تحریک قرآن کا ماہوار رسالہ

”ترجمان القرآن“

مرتب :- ابو الاعلیٰ مودودی

اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے۔ اور ہر شخص جو اسلام کو سمجھنا چاہے اس سے قرآن کو سمجھنا اور اس کے معانی میں غور کرنا چاہیے۔ غرض کیلئے مجلس تحریک قرآن ایک ماہوار رسالہ شائع کر رہی ہے جس کا مقصد علموں کو قرآن سمجھنے میں مدد دینا، انکی مشکلات اور شکوک اور تامل کو حل کرنا اور زندگی کے مسائل اور معاملات میں اس ہدایت فرہنگی کو پیش کرنا جو قرآن حکیم میں کی گئی ہے۔ مذہبی مناظرہ و مجادلہ اور فرقہ ریزعات اس رسالہ کو چھوڑ کر نہیں۔ اس کا کام محض تعلیم و تفہیم ہے۔

دفتر ”ترجمان القرآن“ - خیریت آباد - قیمت سالانہ پندرہ روپے

حیدرآباد دکن

باب الاستفسار

موجودہ فن تمثیل کی ابتدا مغرب میں

(جناب مولوی عبدالغنی صاحب رائے پور)

کیا آپ براہ کرم مطلع فرما سکتے ہیں کہ مغرب میں موجود فن تمثیل کی ابتدا
کیونکر ہوئی اور اول اول کیا صورت اس کی تھی؟

(نگار) فن تمثیل کی ابتدا یورپ میں قرون وسطیٰ سے ہوتی ہے گیارہویں اور تیرہویں صدی کے درمیان
وہاں ایک جماعت آوارہ گرد شعرا کی پیدا ہوئی جنہیں ٹروباڈور (Troubadour) کے
نام سے موسوم کرتے تھے اور غیر معمولی شہرت و قبولیت ان کو حاصل ہوئی۔ خصوصیت کے ساتھ عورتوں
کا طبقہ تو اس درجہ مالوف تھا کہ امر اور ملوک کو بھی اپنی بیویوں اور بیٹیوں کی طرف سے اطمینان باقی نہ
کیونکہ تاریک راتوں میں سیاہ ریشمی لباس پہن پہن کر یہ خود بھی ان سے ملنے باہر نکل جاتی تھیں اور لہجہ
طور پر انہیں بھی اپنے مجروں میں بکالیتی تھیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ان میں سے بعض شعرا انما
ایچے خاندان کے ہوتے تھے اور دوسرا یہ کہ فن شعری اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ان کا وہی مرتبہ
تھا جو جاہلیت کے شعرا عرب کو حاصل تھا۔ یہ لوگ ہمیشہ حسن و جمال ہی کی داستان کو نہیں دہراتے
تھے بلکہ لوگوں میں جذبات شجاعت و حماست بھی پیدا کرتے تھے، چنانچہ اس لحاظ سے ایلیور کے نام نے پورا

میں نقش و صورت کی حیثیت..... حاصل کر لی ہے کیونکہ جب انگلستان نے ویتنام کے ساتھ جنگ کی پہ تو نارمنڈیا اور
کے لشکر کے آگے آگے ہی تھا اور سب سے پہلے اسی نے وار کر کے دشمن کے دو کپا ہی ہلاک کر ڈالے تھے۔
ایک بڑا سبب ان کی اہمیت کا یہ بھی تھا کہ اس زمانہ میں نہ تفریح کے اسباب کافی تھے۔ اور نہ دوسرے
مقاموں کے حالات معلوم کرنے کا کوئی بہتر ذریعہ حاصل تھا اور چونکہ اس جماعت کے ذریعہ سے یہ دونوں
یاقین حاصل ہو جاتی تھیں اس لئے اہل اولوک کے طبقہ میں بھی ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی اور جب کبھی
کوئی جماعت ایسے شہر آ کر پہنچ جاتی تھی تو یوں سمجھے کہ عید ہو جاتی تھی۔
ایسا شاعر ہمیشہ ایک طائفہ یا جماعت کی صورت میں سیاحت کیا کرتا تھا یعنی اس کے ساتھ پہلووانی کا
فن جانتے والے، فنون سیگری کے ماہر، موسیقی کے استاد اور دیگر نو و لعب کے مشائق بھی طرح کے لوگ
ہوا کرتے تھے۔ وہ خود تو گھوڑے پر سوار ہو کر چلتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی سب اس کے جلو میں بیدل
چلتے تھے۔

جب یہ کسی امیر کے قصر کے پاس پہنچتا تھا تو اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے چاروں طرف اپنی آمد
دھندل اور اپٹا دیتا تھا اور منادی کرتے آئے اس کی فصاحت و بلاغت کی تعریفیں کر کے لوگوں میں ہنجمل
ڈال دیتے تھے۔ اس خبر کے شایع ہوتے ہی امیر اپنے قلعہ کے خندق پر بل گرا دیتا تھا اور اس جماعت کو
کے اندر جانے کی اجازت مل جاتی تھی۔ جب وہ شہر کے اندر داخل ہوتے تھے تو امیر کے نمائندے ان کا
استقبال کرتے تھے اور ان کے قیام و طعام کے لئے بہترین انتظام کیا جاتا تھا۔ اس کی خبر جب
پس پردہ پہنچتی تھی تو غور توں میں بھی خاص بہجان پیدا ہو جاتا تھا اور وہ اپنی آرائش و زیبائش کی
تعمیل میں کوئی دقیقہ کو سفاقت کا نہ اٹھا رکھتی تھیں محض اس امید پر کہ شاعر شاید کسی پر گرویدہ ہو جائے اور
اس کے حسن و جمال پر کوئی نظم لکھ کر شہرت دوام دیدے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ انی امیر اس اندیشہ سے
ان کی ہنر آئی نہیں کرتا تھا اور ان کو قصر کے اندر بزم سیر و سخن یا محفل رقص و سرود قائم کرنے کی اجازت
دیتا تھا، لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر شاعر کو برہم کر دیا تو پھر وہ ملکوں ملکوں
اس کی برائیاں بیان کر کے رسوا بھی کر دے گا، اور اگر اس کو خوش رکھا تو ہر جگہ تعریف بھی کرتا پھر بیگا۔
عورتوں کے میلان کا بھی اہم سبب ہی تھا کیونکہ اس زمانہ میں نقل اخبار کے ذریعہ تو تھے نہیں کہ ایک جگہ
کا حال دوسری جگہ آسانی سے پہنچ جائے اور اڑکیاں قدر تباہ چاہتی تھیں کہ دوسرے شہروں اور ملکوں میں
ان کے حسن کے افسانے پہنچیں اور بہتر سے بہتر شہر انھیں حاصل ہوں۔ پنانچہ اس خدمت کو "شاعر"
بخوبی انجام دیتا تھا اور اپنے شعروں میں ایک نئی کی حسن کا ذکر کر کے دہوم چا دیتا تھا۔ لیکن اس کا معاذ

بھی "شاعر" رات کی تنہائیوں میں کافی سے زیادہ وصول کر لیتا تھا۔

"شاعر" کے ساتھ جو جماعت پہلوانوں وغیرہ کی رہتی تھی وہ اصل میں ان مثلین کی اوزاد تھی۔ جو چھٹی صدی سے قبل اطلالیہ کے تماشہ نگاہوں میں کثرت سے نظر آتے تھے۔ لیکن جب شمالی یورپ اور وحشی قوموں نے اطلالیہ کو فتح کیا تو انہوں نے ان مثلین کو بھی دیکھا اور ان کے کرتب وغیرہ دیکھ کر سخت حیرت انہیں ہوئی، لیکن چونکہ وہ ان فاتحین کی تواریخ امیر نقلیں بن گیا کرتے تھے۔ اس لئے تماشہ نگاہیں برباد کر دی گئیں اور تماشہ کرنے والے تمام کماٹ یورپ میں منتشر ہو گئے۔ چنانچہ انہیں لوگوں کی نسل تھی جو "شاعر آوارہ گرد" کے ساتھ رہتی تھی اور مختلف شہروں میں گھوم پھر کر تماشہ دکھایا کرتی تھی۔

ان لوگوں نے ایک "فالوس سحری" بھی ایجاد کیا تھا جسے موجودہ آسٹریا کی ابتدا سمجھنا چاہئے۔ رو بادور شاعروں کی جماعت اپنا تماشہ ہمیشہ کھانسنے کے بعد دکھایا کرتی تھی۔ سب شراب کے نشہ سے حاضرین پوری طرح مغلوب ہوتے تھے۔ روشنیاں گل کر دی جاتی تھیں اور صرف "جادو کا فالوس" آڑ میں روشن رہتا تھا۔ جماعت کا سردار تماشائیوں سے پوچھتا تھا کہ کیا وہ شیطان کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی دندنہ یاد یوار پر ایک سایہ عجیب الخلقیت انسان کا نظر آتا تھا جس کے بڑے بڑے پیدنگ ہوتے تھے۔ لوگ کچھ کر شائف ہو جاتے تھے۔ اور ان کی غیر معمولی قوتوں کا یقین کر کے ان سے ڈرنے لگتے تھے۔

اس کے بعد ایک زمانہ وہ آیا جب "شاعر" اس جماعت سے علیحدہ ہو گیا اور ان بازی گروں کی اخلاقی حالت بہت خراب ہو گئی۔ یعنی سر بازار تماشہ کرنے کی حالت میں یہ لوگوں کی جیبوں سے چیزیں چرانے لگے۔ اور سخت بدنام ہو گئے۔ اسی کے ساتھ یہ لوگ امر کی بڑی بڑی نقلیں بھی کیا کرتے تھے، آخر کار ۱۵۵۰ء میں ایک قانون وضع کیا گیا کہ جب تک کوئی باضابطہ اجازت نہ حاصل کرے اس قسم کے تماشہ نہیں دکھا سکتا۔

یہ لوگ علاوہ ان شہیدوں کے دواؤں کی تجارت بھی کیا کرتے تھے اور بالکل اسی طرح جیسی آج کل ہندوستان میں سڑک پر سائڈے کا تیل بیچنے والے کیا کرتے ہیں۔ ان کی ترکیب یہ ہوتی تھی کہ مثلاً ایک شخص دفعہ تماشہ دکھاتے دکھاتے تھک کر گڑھی پر بیٹھ جاتا تھا اور زور زور سے کھانسنے لگتا تھا۔ اس کے بعد وہ تیل کی پیشی نکال کر اپنے گلے پر لٹاتا تھا اور کھانسی فوراً دور ہو جاتی تھی۔ معاً اسی وقت انہیں میں سے ایک شخص جو ہجوم میں شامل ہوتا تھا، باہر نکل کر کہتا کہ مجھے بھی کھانسی ہے اور اگر مجھ کو فائدہ ہو جائے تو جانوں کہ تمہاری دوا مفید ہے۔ یہ کہہ کر زور زور سے کھانسنے لگتا، لیکن دوا ملتے ہی کھانسی دور ہو جاتی اور اس طرح لوگوں کو یقین دلا دلا کر دوائیں بیچتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مجمع میں سے کوئی زخمی

شخص نکلتا اس حال میں کہ زخموں سے خون بہتا ہوتا، لیکن دوا کا استعمال ہوتے ہی خون بند ہو جاتا۔
حقیقتاً یہ تمام باتیں مصنوعی ہوا کرتی تھیں۔ اور کسی خاص تدریس سے جسم میں زخم کی کیفیت پیدا کر لی
جاتی تھی۔

جب لندن میں (Theatres) کا زور ہوا تو ان باڈیگرن کو یوں سڑک پر
جمع عام میں تماشہ کرنے کی ممانعت کرائی گئی اور لندن سے باہر ایک عمارت بنادی گئی۔ جس کا نام
(Theatre) رکھا گیا۔ یہ عمارت اسلین (دو لاکھ ایک ہزار فٹ) جس پر تخت قائم نہیں
کی گئی تھی۔ اس کے بعد دوسری عمارت طیار کی گئی جس کا نام (Curtain) رکھا
گیا اور یہ بھی اہم بنا۔ وہاں اسٹیج کی اور ایٹروں کی جھلیں عربی اور مشرقی کئے ہیں۔

کاجل - سمرمہ - چورن - مستمن

ڈاکٹر صاحب نگار نے خود ان دو اؤں کا اظہار کیا کہ اپنی رائے کے مفید ہونے پر ان کو برکے ملاحظات میں ظاہر کی ہیں۔
دوسری تازہ سند لا حواہ ہو۔ سمرمہ ضعف بصارت وغیرہ کے لئے بہت مفید ہوا، ایک شیشی اور بھیج دیجئے۔

(بیدار خان، زبر سوئمٹہ - پوت محل)

کاجل - آشوب - سرخی، ضعف بصارت کے لئے ازلیس مفید ہے۔ ایک ڈبہ کی قیمت ۷
ایکروپیہ (علاوہ محصول)

سمرمہ - یہ بیش بہا سمرمہ ۴۰ دن میں بڑی بوٹیوں کے عرق میں پس کر تیار کیا جاتا ہے۔ جالا۔ دھن
موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بار بار آزما یا ہوا
ہے۔ قیمت فی پڑیا ایک روپیہ ۷ (علاوہ محصول)

چورن - یہ وہ اکسیری پیر ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ بیٹ کا درد۔ قبض۔ نفخ و ریاح کا پید ہونا
سورہ سفیم و سول کا آنا۔ یک تخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبہ ۷۔ تولہ ایکروپیہ
مستمن - اس کی اوستہ خوبی یہ ہے کہ چتے ہوئے دانست جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ ۷۔ تولہ ۷۔ علاوہ محصول
نوٹ:- سب چیزیں سنگھنے والوں کو محصور لداک معاف۔

مہیکم - ڈریجہ دست نگار لکھنؤ

اس کے کتبائات

(صحت انسانی کے متعلق)

انسان کی موجودہ ترقی مختلف علوم و فنون سے وابستہ ہے اور ان میں سے ایک وہ ہے جس کا تعلق انسان کی صحت سے ہے۔ یورپ میں ایک جماعت مستقلاً اس تحقیق و جستجو میں ترقی رہتی ہے کہ امراض کو دنیا سے محو کر دیا جائے اور انسان کی عمر طبعی کا اوسط اگر کم تر تک نہیں پہنچ سکتا تو کم از کم سو تک تو ضرور پہنچ جائے۔ اس سلسلہ میں جو کتبائات ۱۹۶۰ء میں ہوئی ہیں ان کا بیان فائدے سے خالی نہیں۔

(۱) انگلستان کے مشہور فاضل سر لیونارڈ ہیل نے عرصہ تک اس امر پر غور کیا کہ برودت و حرارت کا احساس مختلف لوگوں میں کیوں کم و بیش ہوتا ہے۔ کسی کمرہ میں دو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں ان میں ایک کھڑکی بند کرنے پر اصرار کرتا ہے، دوسرا اس کے کھول دینے پر۔ ایسا کیوں ہے؟

فاضل موصوف کی تحقیق اس باب میں یہ ہے کہ ناک کے اندر جو اعصاب پائے جاتے ہیں۔ وہ جلد کی سطح اور اندرونی پردوں کے درمیان پھیلے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ بعض لوگوں کی جلد حرارت کو زیادہ جذب کرنے کی اہل ہوتی ہے اور بعض کی کم اس لئے گرمی سردی کے احساس میں یہ تفاوت پایا جاتا ہے۔

(۲) زکام و نزلہ کے متعلق اب سے قبل یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جراثیم سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ لیکن اب ثابت ہوا کہ اس کے بھی جراثیم ہوتے ہیں لیکن اتنے دقیق و باریک کہ خوردبین کے ذریعہ سے بھی ان کو نہیں دیکھ سکتے۔ امریکہ کے ڈاکٹر کنڈال کی تحقیق ہے کہ اس کے جراثیم تو وہی معمولی خوردبینی جراثیم ہوتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ وہ اتنے چھوٹے ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح نظر نہیں آتے۔

(۳) ڈاکٹر گرولڈ شائنگ نے متعدد تجربوں کے بعد یہ بات معلوم کی ہے کہ وہ لوگ جن کی طبیعت یاس و اضمحلال کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے وہ جراثیمی بیماریوں میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ ان میں اثر قبول کرنے کی بہت صلاحیت ہوتی ہے اور وہ جراثیم کی مقاومت اچھی طرح نہیں کر سکتے کیونکہ وہ

سانسین جلدی جلدی لیتے ہیں اور آکسیجن کی کافی مقدار ان کے پھیپھڑوں میں نہیں پہنچتی جو جراثیم کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے۔

(۴) امریکہ کے ایک ڈاکٹر جان واگرنے ثابت کیا ہے کہ صابون کے جھاگ جراثیم کو ہلاک کرتے ہیں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں جیتے کہ پھیپھڑوں کے التهاب، خون کی سمیت، اور انفلوئنزا کے جراثیم بھی اس سے فنا ہو جاتے ہیں۔

(۵) ایک فلم کے ذریعہ سے آنسوؤں کے اثرات ہلاکت جراثیم سے متعلقہ انگلستان میں دکھائے گئے اور ثابت کیا گیا کہ آنسو جراثیم کو نہ صرف ہلاک کر دیتے ہیں بلکہ بالکل جو کر ڈالتے ہیں۔ آنسو میں ایک خاص مادہ انزیم پایا جاتا ہے۔ جو جراثیم کا سخت دشمن ہے۔ جو کچھ آنکھ نہایت نازک عضو ہے اور جراثیم سے متاثر ہونے کی اس میں بہت زیادہ اہلیت پائی جاتی ہے اسی لئے قدرت نے اس میں آنسو پیدا کر دیے تاکہ آنکھوں کی حفاظت ہو سکے۔

(۶) کچھ عرصہ سے خیال تھا کہ انسان کی جلد میں بھی کوئی مادہ ایسا موجود ہے جو امراض سے بچاتا ہے۔ چنانچہ امریکہ کے مشہور ڈاکٹر ہولمز نے اس مادہ کے وجود کو ثابت کر دیا اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ جلدیوں کی جلد میں نسبتاً دفع امراض کی بہت زیادہ اہلیت پائی جاتی ہے۔

(۷) ہچکی کا ایسا عجیب و غریب علاج ڈاکٹر گولڈن نے دریافت کیا اور وہ یہ کہ معمولی کاغذ کا بڑا لفافہ جس میں بازار والے کپڑا وغیرہ لپیٹ کر دیتے ہیں تاکہ اور سنہ پر رکھ کر سانس بچائے۔ اس طرح کاغذ کا کابینہ دماغ کے مرکز عصبی کو متاثر کرتا ہے اور ہچکی دور ہو جاتی ہے۔

(۸) دانتوں کی خرابی کا ذمہ دار عدم صفائی اور منہ کے جراثیم کو بتایا جاتا تھا لیکن اب معلوم ہوا کہ اس کا بڑا سبب غذا ہے۔ کیونکہ اگر ایسی غذا استعمال کی جائے جس میں ویتامین اور چونہ کے مرکبات کی کمی ہو تو دانت خراب ہو جاتے ہیں۔

(۹) جھروں، کھیوں اور لپوؤں کے دور کرنے کے متعلق بہترین طریقہ ڈاکٹر منرو نے یہ بتایا کہ اگر کھڑکیوں کے پیشے سرخ، زرد یا نیلگوں ہوں تو ان کیڑوں سے نجات مل سکتی ہے۔ کیونکہ حشرات کو ان رنگوں سے سخت نفرت ہے۔

”دُنیا“

ہمنشیں! مجروحِ غم ہوں، جان کہتے دے مجھے
گرچہ مجھ پر بھی ستم بھائے ہیں، دُنیا نے بہت
دردِ محرومی، غمِ ناستِ ادا مانی کے لئے
زندگی میں روح کے اجزا پریشاں کر دئے
نرم رو میں صبح کی جب جھلملاتے ہیں چراغ
شب کی خاموشی میں، جب سوتی ہے نبضِ جستجو
کیف کی اس فصل میں جب سُکرائی ہے بہار
چاندنی کے رقص میں جب گنگنائی ہے صبا
اس فضا کے نور میں جب حُسنِ الٹا ہے آفتاب
عیش کے اُس عہد میں، جب بھول بنجاتی ہو خاک
اُس جواں سالی میں جب ہر چیز ہوتی ہے عیس
آہ اس سہمی و عمل کا دیکھنا، ہمد م! آل

خلق کی بیگانگی پر، آہ، رونے دے سننے
حشر اٹھائے ہیں جہاںِ فتنہ آرائے بہت
میں بنا ہوں تلخیِ نا قدر دانی کے لئے
میں نے اپنے دل کے ٹکڑے نذرِ دریاں کر دئے
مدتوں، کھوٹا ہے جوشِ شکر سے میرا مارا
مدتوں برس ہے میری چشمِ گریاں سے لہو
مدتوں میں تشنہ کامی سے رہا ہوں بیقرار
مدتوں کا بنی ہے میرے نالہِ غم سے فضا
مدتوں بیگانہ عشرت رہا میرا شباب
مدتوں میں کاوشِ غم سے رہا ہوں سینہ چاک
مدتوں دھندھلی رہی ہے، میری دنیا کی جبین
میں ہوں اور اک مستقل کیفیتِ حزن و ملال

خاکسٹا ٹوتا بندگی بخشی ضیائے مہر نے
 لیکن اسے ہم ازا! میں اس پر نہیں اندوہ لگیں
 سمیرتے پیتا میں اپنی زندگی کا تلخ جام
 وہ دنیا، سر پر سر معمورہ وہم و قیاس
 اس میں ظلمت آفریں ہے مہر تاباں کا جلال
 طبع ہماں گردش میں اک ٹوٹا ہوا سا جامِ عقل
 میں جہاں نا آشنا اسرارِ فطرت سے دماغ
 لہ جہاں سلینوں میں ہیں نامحرم احساس درد
 ہر دولت ہے جہاں انساں کی نبضوں میں رواں
 سمیرتے ایک سطح پر، مجروح، آزاد و اسیر
 اس میں نفرت سے سنا جاتا ہے فطرت کا پیام
 میری جانب، آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا دہر نے
 خلق کی بیگانگی سے یہ مرا مطلب نہیں
 خوں رلاتا، ہر مجھے دنیا کے فانی کا نظام
 زندگی فانی ہے جہاں دابستہ اندوہ و یاس
 یا وجود نامتامی ہے جسے ناز کمال
 عقل ہے، جس بزم میں آئینہ اوہام عقل
 جاوہ تکمیل ہے، اور پیر مکتب کا چسپاں سرخ
 قبر کے مانند تیرہ، برف کے مانند سرد
 روح کی دادی ہے اور ابر غلامی کا دھواں
 ہے جہاں انسان، تنگ روح و محروم ضمیر
 ہے گراں جس کی طبیعت پر محبت کا نظام

چھیڑتی ہے سازِ نواب گردشِ ایام کیا
 دیکھے ہوتا ہے اس آغاز کا انجسام کیا

رعنائی غم

تو سطح میں ہونا داں ادا ہو کے میں آگیا ہے
 غمناک عاشقی کی فرضی کہانیاں ہیں
 ڈوبی ہوئی ہیں بنبضیں، ڈھلنے لگا ہے منکا
 ”اکھڑی ہوئی ہیں سانسیں پہنگامِ نزعِ طاری“
 مذاہب اب بیٹھے ہیں بالیں پہ آکے سینہ
 ”میسے پڑی ہوئی ہو۔ اک حشر کا ہونا عالم
 لے دے تیرے غم کی ہے کائنات اتنی
 کم عقل! عمر بھر میں یہ کی ہے جانچ تو نے
 کتنی حسین۔ شے بے تو بیا نتا نہیں ہے
 تو ”غم“ سمجھ رہا ہے ”غم کی غذا منوں“ کو
 ناداں! گدا ز غم تو خود مستقل زباں ہے

لفظوں کو تو نے اصلی مقصد بنا لیا ہے
 بے کیف آنسوؤں کی جھوٹی رو انیاں ہیں
 سامان ہو رہا ہے عشاق کے کفن کا
 اٹکی ہوئی ہے ہچکی پتی ہر دم شماری
 ماتھے پر آگیا ہے اب موت کا پسینہ
 روشن ہے شمع بالیں۔ برپا ہے شورِ ماتم
 اس پر تراہ مہلک دعوئے غم پر کستی
 غم کو سمجھ لیا ہے دوزخ کی آبیج تو نے
 لیلائے غم کی رات پہچانتا نہیں ہے
 مسائل پہ ڈھونڈتا ہے تہ کی حقیقتوں کو
 رنگیں تجلیوں کی رنگین داستاں ہے

فریاد کی تو کوئی مخصوص لے نہیں ہے

نالہ کہ سچ کہا ہے پابند لے نہیں ہے (غالب)

ذوق

التجا

ای خدا ای جفاکشوں کے خدا
خوں آسٹام امتحانوں میں
عوم کو عزم آہنیں کرے
تشنہ عیش کامرانی ہوں
دل میں جوش کمال پیدا کر
عرش پیمانگاہ دے تجھ کو
زندگی دی تو سرخوشی بھی دے
واقفِ عرض و التجا ہے تو
لینے الطاف سے مئے مالک
جانگزا ہے عذابِ ناکامی

سخت جانوں، بلاکشوں کھنڈا
دے جگہ جھکو کامرانوں میں
دل میں غیرت کی بجلیاں بھر دے
طالب سوز جادو دانی ہوں
طلب لازوال پیدا کر
قوت بے پناہ دے مجھ کو
کیف صہبائے زندگی بھی دے
حال دل خوب جانتا ہے تو
دکھ کا درمان دے مرے مالک
تاجا اضطرابِ ناکامی

بے نیازِ عجم جہاں کر دے
سرخرو کر دے، کامراں کر دے

عدم

قطعات

عشرت جاوید
فرصت ہی، کوئی فکر نہیں، گنج باغ ہے
ای دنیوی شکوہ و زرو جاہ کے خیال!
بھیک کی ہوا ہے، ابر ہے، دیوانِ باغ ہے
مجھ سے نہ بول، عرش پہ میرا داغ ہے

شبہ شاعر
سوزِ درون و برقی نہاں کی جھلک ہے
تصویر بھی بدلتی ہے کاغذ پہ کروٹیں
آئینہ دار ہے دلِ خانہ خراب کا
دھندلا سا عکس ہے یہ مے اضطراب کا

زبانِ محبت

ہر چند نامِ ادم محبت ہے بیجاں!
بجتا ہے جب ستار تو یہ جانتا نہیں
موسیقی تریس ہو مگر اسکی تر جہاں
دہرا رہا ہے کوئی مری عم کی استاں

اختر انصاری ہلوی

نعرہ عشق

دارِ رحیمہ کے مسکراتا ہوں ✓ موت سے زور آزماتا ہوں
زندگی کو ابھارتا ہوں میں زلفِ بہتی سنوارتا ہوں میں
بے تکلف ہو رسم و راہ مری توڑ دیتی ہے دل نگاہ مری
روح کا سردی خرام ہوں میں عرشِ دالوں سے ہم کلام ہوں نہیں
موت مجھ سے نظر چرائی ہے دیکھ کر مجھ کو کانپ جاتی ہے

دستِ قدرت کا شاہکار ہوں میں
دوشِ اقبال پر سوار ہوں میں

باقی صدیقی

(راولپنڈی)

غزل اثرِ رحمانی

خیال آتے ہی دل بچود ہوا ہے وہ چشمِ مست کتنی کیفِ زاہت ہے
وفا کیسی کہ محرومِ جفا ہے یہ دل اس پر بھی مجبور و فنا ہے
اسی نے تجھ کو پایا ہے۔ ہمیشہ جو تیری جستجو میں گھو گیا ہے
کسی کے ٹوٹے دل کو جوڑ دینا یقیناً حاصلِ مہر و وفا ہے
سمجھتے ہیں لے کچھ اہلِ دل ہی محبت میں فنا ہونا بے تاب ہے
تھارے جبرستہ سنتے دوزخات ہمیں بھی صبرِ آخر آچلا ہے
برتنے ہو اسی سے عنایت تم جو دل ہی چیزِ تلو دے چکا ہے
خرابِ عاشقی۔ ناکامِ حسرت مراد دل اب تو کس کام کا ہے

اثرِ ثابت ہو ایہ تجربہ سے

جوانی ہے تو جینے کا مزا ہے

کیفیات

جو ہر مطلب نہیں شرمندہ عرض کلام
 ذرہ ذرہ بن گیا آئینہ دارِ جوشِ حسن
 ہے بہت میرے لئے اک عشوہ نیم التفات
 کیوں نہ ہو شانِ کرم میں شوخی رنگِ ستم
 اس نگاہِ ناز کا طالب ہوں جو مخصوص ہو
 عشق میں منت کش ہوں، حکایت کو ہوں
 ہر نگاہِ یاس ہی ٹوٹے ہوئے دل کا پیام
 کس قدر حیرت اثر تھی شوخی موجِ خرام
 کون ہوتا ہے خریدارِ متاعِ ننگ و نام
 حسن کی فطرت میں ہی ذوق و فا کا احترام
 ننگِ ذوقِ عشق ہے کیفِ نگاہِ لطفِ عام
 جب خموشی میں بھی ہو رعنائیِ حسنِ کلام

قطعہ

بادہ نشانِ طرب ہیں اور تکلیفِ خار
 الخدر خمیازہ کیفیتِ عیش و نشاط
 اب نہ وہ میخانہ باقی ہو نہ وہ صہبا و جام
 سرگراں ہیں سستہ جاں ہیں شہ نہ لب ہیں تلخکام

انتہائے خود فراموشی نے آنکھیں کھولیں

فطرتِ سفاک کا اللہ سے جوشِ انتقام

کوکتب شاہِ بہا پوری

معلومات

دنیا کا دورِ جمیل | چند سال قبل کی بات ہے کہ حسن و جمال کی جستجو صرف تماشہ گاہوں اور ٹیلیٹروں میں ہو کر رہ گئی تھی، یعنی جو عورتیں نغمہ و رقص کا پیشہ اختیار کرتی تھیں انھیں کو اس امر کی ضرورت ہوتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو خوبصورت بنا کر پیش کریں، لیکن اب حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ اور حسن و جمال کی طلب دنیا میں اس قدر بڑھ گئی ہے کہ عملی زندگی کے کسی شعبہ میں اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک ظاہری حسن و جمال بھی حاصل نہ ہو۔ — خانگی خدمت کے لئے ایک حسین لڑکے یا لڑکی کی جستجو ہوتی ہے تاکہ اس کو دیکھ کر وجدان کو صدمہ نہ پہنچے، دفاتر میں کلر کی کے لئے جمیل عورتوں کی تلاش ہوتی ہے تاکہ اہل دفتر کی قوت عمل میں ہیجان پیدا ہوتا رہے، دوکانوں میں خوش گل عورتوں کی ضرورت ہے تاکہ خریدار متوجہ ہوں، اسکولوں میں خوبصورت عملات درکار ہوتی ہیں تاکہ بچوں کے نفسیات پر اچھا اثر پڑے، ہسپتالوں میں خدمت کے لئے صاحب جمال لڑکیاں ڈھونڈی جاتی تھیں تاکہ لوگ کھینچ کھینچ کر وہیں پہنچیں۔ ہسپتالوں میں تیمارداری اور علاج کے لئے بھی حسین عورتوں ہی کی جستجو ہے تاکہ بیمار جلد اچھا ہو جائے۔

(در انحالیکہ اس باب میں مشرقی نقطہ نظر یہ ہے کہ — خوش طیبہ ست بیاتا ہمہ بیمار شولیم)
اس میں کلام نہیں کہ جنگ عظیم نے غیر معمولی تباہیاں عالم میں پھیلانیں لیکن انھیں کے ساتھ ”فنِ جمیل“ کی بنیاد ڈال کر بڑی حد تک تمام نقصانات کی تلافی بھی کر دی۔ جو لوگ جنگ میں بیکار ہوئے تھے شخص ان کے اعضاء درست کرنے کے لئے ڈاکٹری کا ایک نیا شعبہ ظہور میں آیا تھا۔ لیکن اب اسی شعبہ نے ”فنِ جمیل“ کو ہاتھ میں لے کر دنیا کی بد صورتی و بد وضعی محو کر دینے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے، اور یورپ کے جمالیاتی ذوق پر اتنا زبردست اثر اس کا پڑا ہے کہ برے اخلاق کو تو وہ نظر انداز بھی کر سکتے ہیں لیکن بری صورت کے لئے ان کے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ چنانچہ حال ہی کا واقعہ ہے کہ امریکہ میں ایک شخص نہایت بد صورت تھا اور کوئی شخص اس سے کسی کام کے لئے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ آخر کار اس نے مجبور ہو کر خودکشی کا ارادہ کیا، لیکن زندگی باقی تھی اس لئے قبل وقوع موت کے لوگوں کو پتہ چل گیا اور وہ شفا خانے بھیج دیا گیا۔ یہاں فنِ جمیل کی جراحی سے اس کی بد صورتی دور کر دی گئی اور اسے ملازمت مل گئی۔ اس سے قبل تو یہ تھا کہ صرف ناک کان وغیرہ کی معمولی بد نمائی کو جراحی سے دور کر دیا کرتے تھے، لیکن اب تو چہرہ و جسم کے ہر

حصہ کے قبیح ترین عیب کو دور کر دیتے ہیں اور وہاں اخباروں میں ڈاکٹروں کے اشتہارات نکلتے رہتے ہیں کہ جسکو حسین بننا ہو ہم سے رجوع کرے۔

دو سال ہوئے کہ نیویارک میں ایک خیراتی شفا خانہ فن جمیل کا قائم کیا گیا ہے اور وہاں بنیر کسی فیس کے بد صورتی کا علاج کیا جاتا ہے۔ ایک عورت کا واقعہ ہے جو اپنی بد صورتی کی وجہ سے نہایت رباب و شکستہ حالت میں زندگی بسر کرتی تھی، لیکن عمل جراحی کے بعد اس کی مالی حالت نہایت اچھی ہو گئی اور لوگوں کو پہچاننا دشوار ہو گیا کہ آیا واقعی یہ وہی عورت ہے یا کوئی اور۔

پھر یہ ذوق وہاں صرف کس عورتوں ہی میں نہیں پایا جاتا بلکہ ساٹھ ساٹھ سال کی بڑھیا عورتیں بھی عمل جراحی کی اذیتوں کو برداشت کرتی ہیں اور صرف اس لئے کہ جب وہ آئینہ دیکھیں تو خود ان کو اپنی صورت بڑھی نہ معلوم ہو۔

اس میں شک نہیں کہ بہ نسبت مردوں کے عورتوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ بعض کو یہ تمنا ہوتی ہے کہ ان کا شوہر ان سے محبت کرتا رہے۔ بعض کو یہ ڈر رہتا ہے کہ کہیں ان کی ملازمت نہ جاتی ہے؛ بعض کو جو تھیں وغیرہ میں نوکری کرتی ہیں بول بھی بقا حسن کی ضرورت ہوتی ہے اور جو مطلقہ یا دوشیزہ ہیں۔ وہ شوہر کی تلاش و جستجو میں اپنے آپ کو جمیل ظاہر کرنے پر مجبور ہیں۔ بعض ایسی عورتیں بھی ہیں جو بلا ضرورت محض غرور حسن کی رعایت سے اپنے کان چھوٹے، دہانہ تنگ، اور آنکھیں بڑھی کر لیتی ہیں تاکہ ان کا فتنہ حسن اور سحر کشش اور زیادہ بے پناہ ثابت ہو۔

پھر یہ شوق صرف عورتوں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ مردوں میں بھی عام ہوتا جاتا ہے چنانچہ ڈاکٹر ہوارڈ کرام جو اس فن کا بڑا ماہر ہے۔ لکھتا ہے کہ ایک بار میرے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ میرے چہرہ پر عمل جراحی کے خط و خال اور شبابہت بدل دو۔ مجھے شبہ ہوا کہ کہیں یہ کوئی مجرم تو نہیں ہے جو اپنی شکل میں تبدیلی پیدا کر کے سزا سے محفوظ رہنا چاہتا ہے، چنانچہ میں نے پولیس کو اطلاع دی۔ (کیونکہ وہاں کا قانون ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے چہرہ کی شبابہت تبدیل کرے تو پولیس کو اطلاع دینی چاہئے تاکہ وہ تحقیق کرے کہ گرفتاری کے ڈر سے تو وہ اپنی صورت تبدیل نہیں کرتا) اور جب وہاں سے تصدیق ہو گئی کہ یہ کسی جرم میں مطلوب نہیں ہے تو میں نے عمل جراحی کیا۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے اپنی بیوی سے بہانہ کیا کہ وہ باہر سفر پر جا رہا ہے اور خفیہ طور پر عمل جراحی کرایا۔ جب گھر واپس آیا تو چہرہ پر پٹیاں وغیرہ بندھی ہوئی تھیں۔ بیوی نے پوچھا تو کہہ دیا کہ کسی حادثہ کی وجہ سے چہرہ مجروح ہو گیا ہے۔ جب زخم اچھے ہو گئے اور پٹیاں کھولی گئیں تو بیوی نے وہاں

عالم ہی دوسرا دیکھا، نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار خود سیکم کو بھی اپنے چہرہ پر جراحی کرا کے شوہر کے مقابل حسین بننے پڑا۔

پھر اگر لوگوں کا میلان اسی طرح بڑھتا رہا اور عمل تجمل کے ذریعہ سے چہرہ و جسم کے معائب و نقائص دور ہونے رہے، تو یقیناً ایک زمانہ وہ آئے گا۔ جب نسل پر اس کا اثر پڑے گا۔ اور اولاد خود اتنی حسین جمیل پیدا ہونے لگے گی کہ عمل جراحی کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ — بہر حال موجودہ انسان نے فطرت کے ساتھ جو جنگ اختیار کی ہے اسی کا ایک پہلو یہ بھی ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں کامیاب قدرت کو حاصل ہوگی یا انسان کو۔

بنک کس نے ایجاد کیا | **بنک** کا کاروبار ایسی چیز ہے کہ اگر آپ کسی سے پوچھیں گے کہ اس کا روار کیا ہے تو وہ فوراً کہہ دے گا کہ یہ زمانہ حال کی چیز ہے اور موجودہ تمدن کی تہذیب نے اسے قائم کیا ہے۔ لیکن عراق میں علماء طبقات الارض کی تحقیق یہ ہے کہ اب سے ۲۷۰۰ سال قبل اہل بابل بنک اور اس کے فواید سے واقف تھے۔

ایک تختی زمین سے برآمد ہوئی ہے اور اس کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح سے ۷۰۰ سال قبل بابل میں ایک بنک قائم تھا جس کا نام ایچیسی تھا اور اس میں موجودہ بنکوں کی طرح شرکا بھی تھے۔ اس بنک میں لوگوں کی بسات جاریہ (Current account) بھی تھی۔ امانتیں بھی رکھ جاتی تھیں، منسکات بھی جاری کئے جاتے تھے اور اس کے حصے بھی مقرر تھے۔ لیکن چونکہ کاغذ اس وقت تک ایجاد نہ ہوا تھا اس لئے اینٹوں پر کندہ کر کے اسے پکالیتے تھے تاکہ تحریر محفوظ رہے۔

فرانس کا قومی خزانہ | شہر پیرس کے وسط میں فرانس کا وہ بنک واقع ہے جس کے اندر حکومت فرانس کی دولت سونا اور سونے کی اینٹوں کی صورت میں ایک جگہ ڈھیر ہے۔ مشہور ہے سونے کے لحاظ سے اس وقت کوئی ملک فرانس سے زیادہ دولت مند نہیں کیونکہ دنیا میں جتنا سونا پایا جاتا ہے اس کے تہائی حصہ کا مالک فرانس ہے۔ ہزاروں لوگ روزانہ اس عمارت کے پاس سے گزرتے ہیں اور انھیں مطلق خبر نہیں کہ اس کے اندر کتنے قارونوں کی دولت محفوظ ہے۔ اس بنک کی عمارت

بظاہر نہایت معمولی ہے، لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عمارت کا اصل حصہ جہاں یہ خزانے محفوظ ہیں، زمین کے اوپر پایا ہی نہیں جاتا بلکہ وہ دربر زمین در منزل چلا گیا ہے۔ خزانہ سب سے نیچے کے عمیق غاروں میں رکھا ہوا ہے اور وہاں تک پہنچنے کے لئے بجلی کا ایک (تاکوننگ) بنایا گیا ہے جو بغیر کسی آواز کے اوپر سے آتا جاتا ہے۔ چاروں طرف بجلی کی روشنی ہے اور ہوا صاف رکھنے کے لئے خاص خاص

لات نصب کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلی منزل میں پہنچنے کے بعد ایک نہایت مستحکم دروازہ فولاد کا نظر آتا ہے جس کے کھولنے اور بند کرنے کے لئے بجلی کا انجن کام کرتا ہے۔ اس دروازہ کا طول قد آدم کے برابر ہے۔ لیکن اس کی دبازت یا موٹائی چھ آدمیوں کی دبازت کے برابر ہے اگر وہ برابر برابر ایک صف میں کھڑے نہ جائیں یہ دروازہ اس قدر محفوظ ہے کہ نہ کوئی گولہ اس پر اثر کر سکتا ہے نہ بجلی کا شعلہ اسے بھونک سکتا ہے۔ دروازہ کے کھلتے ہی ایک آہنی سرنگ ملتی ہے جو اندر ہی اندر ایک وسیع فولادی مکان تک پہنچا دیتی ہے۔ یہاں خزانہ محفوظ ہے۔ یہاں کے کام کرنے والوں کے لئے ۸۰ دن کے لئے تمام ضروری اشیاء فراہم کر دی جاتی ہیں۔ اور وہ اس مدت کے بعد دوسری جماعت آجاتی ہے جو اتنے ہی دن تک یہاں کام کرتی ہے یہاں کی روشنی اور آبرسانی کا انتظام بالکل علیحدہ ہے اور شہر سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہاں صرف سونا اور قیمتی تمسکات محفوظ ہیں، بلکہ فنی و ادبی نوادریں بھی اسی جگہ مقفل کر دئے گئے ہیں۔

نیواکی وسیع ترین عمارت | اس وقت تک امریکہ اپنی سرفیٹک عمارتوں کے لئے بہت مشہور تھا، لیکن اب اس نے وسعت تعمیر کی طرف بھی قدم اٹھا کر ساری دنیا کو شکست دیدی۔

ہے، چنانچہ حال ہی میں شکاگو کی "عمارت تجارتی" کا افتتاح ہوا ہے جس کو دنیا کی وسیع ترین عمارت کہنا چاہئے۔ اس کی بلندی تو اتنی زیادہ نہیں ہے کیونکہ صرف ۲۲ میٹر لیں اس میں پالی اجاتی ہیں لیکن اسکی وسعت اور گہرائی بہت غیر معمولی ہے۔ یہ عمارت حقیقتاً بجائے خود ایک مختصر سا شہر ہے جس کے اندر ہر قسم کے کارخانے پائے جاتے ہیں۔ اس کے اندر بازار ہیں، کارخانے ہیں، دفاتر ہیں، بینک اور ہوٹل ہیں، سینما اور تھیٹر ہیں، ڈاکخانے اور تار گھر ہیں، باغات اور کھیل گھر ہیں۔ غرض تمدن جدید سے متعلق کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو وہاں نہ پائی جائے۔

اس عمارت میں پانچ ہزار کمرے، دس ہزار کھڑکیاں اور سات ہزار دروازے پائے جاتے ہیں۔ ہاں دس بڑے بڑے انجن بجلی پیدا کرنے کے لئے نصب ہیں اور ۲۰۰ موٹر (۱۰۰۰ ہپروپوٹ) بہر وقت کام کرتے رہتے ہیں۔

یلم زدہ بیوی | مصنفہ فضل حق قریشی دہلوی عصر جدید سے متعلق ایک نہایت لطیف مزاحیہ ڈراما ہے بلحاظ نوعیت مختصلاً اور انداز بیان بہت کامیاب ہے۔ تمثیلی کوشش کے پورے عناصر اس میں موجود ہیں۔ تعلیم یافتہ عورتوں کی جو وہ روش پر ایک ہلکی طنز ہے۔ ہر جگہ ایک مستقل قہقہہ ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ڈرامہ روشن تھیٹر دہلی میں نہایت کامیابی کیساتھ مسلسل کئی سال تک چلے گیا۔ اور خود مصنفہ اختر کا پارٹ کیا۔ قیمت صرف ۸ روپے کا پتہ ہے۔ ساتی بک ڈپو۔ دہلی

تارکا پبلیشرز
مدھی سندھ دہلی

ایلیفون
۵۵۶۶

مصفی

طب یونانی کا تازہ کرشمہ

انسان کی زندگی کا مدار خون پر ہے خون اگر خراب ہو گیا ہے تو آدمی کی تندرستی قائم نہیں رہ سکتی۔ ہندوستانی دواخانہ دہلی۔ 'مصفی' ایجاد کر کے تمام ملک کو مقابلہ کی دعوت دیتا ہے۔ اور بلاخون تردید دعویٰ کرتا ہے کہ صفائی خون کے لئے مصفی سے بہتر دوا آج تک نہ ایشیا پیدیش کر سکا ہے نہ یورپ۔ مصفی ہندوستان کی جرئی بوٹیوں کا خلاصہ ہے۔ اور مسیح الملک ثانی حکیم حاجی محمد احمد خاں صاحب کے مشورہ سے جدید سائنٹفک طریق پر طیارا کیا گیا ہے۔ خون کی خرابی سے پیدا ہونے والے ہر مرض کی تیر بہتر دوا ہے۔ کھجلی۔ داد۔ پھنسیاں وغیرہ حتیٰ کہ سوزاک۔ آتشک۔ اور جذام کا نہ ہر ایلہ مادہ بھی اس کے استعمال سے ہمیشہ کے لئے نابود ہو جاتا ہے۔ اس کی خوراک چاء کا ایک چمچہ ہے۔ اور بلحاظ نفع مصفی درحقیقت اکسیری چیز ہے۔

قیمت ۱۲ خوراک کی شیشی صرف ۱۲۰ محصول ذمہ خریدار

ترکیب استعمال

ایک خوراک صبح ایک شام تھوڑے پانی میں ملا کر اور اگر مرض کا جوش زیادہ نہ ہو تو دن میں ۳ مرتبہ استعمال کیا جائے۔

ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس ۲۲ دہلی سے طلب کیجئے

نوکر کہ در عرف عام شہرت دار و غلط محض است بے مراد و نانو کر یا یہ گفت لیکن اگر بے نوکر یا بمعنی کہ آن شخص نوکر ندارد استعمال کنند جائز باشد مولوی گوید یہ

عاشقاں از بے مراد یہائے خویش
با خبر گشتند از مولائے خویش

اعتراض مرزا غالب - وہ میاں صاحب ہانسی کے رہنے والے بہت چوڑے چکلے جناب عبدالواسع فرماتے ہیں کہ بے مراد صحیح اور نامراد غلط - ارے تیرا ستیا ناس جاے - بے مراد اور نامراد میں وہ فرق ہے جو آسمان اور زمین میں ہے - نامراد وہ ہے کہ جس کی کوئی مراد کوئی خواہش کوئی آرزو نہ برآوے - بے مراد وہ ہے جس کا صغیر ضمیر نقوش مدعا سے سادہ ہو اور قسم بے مدعا دیے غرض و مطلب - حسبہ لشد ان دونوں امروں میں کتنا فرق ہے - ناپردہ اور ناکام - اور نامراد است اور ناپچار کہ یہ مخفف ناپچار اور ناپار کہ یہ مخفف "ناآہار" ہے اور نامراد اور نانا انصاف یہ سب درست - ہائے کہاں گئے ہانسی والے معلم -

(مؤلف) ملائے ہانسی کا مقصد کلام یہ ہے کہ تا اکثر مشتقات اور صفات پر داخل ہوتا ہے جیسا کہ نابالغ اور ناسموع اور لفظ ہے اسمائے غیر صفت پر جیسا کہ بے دانش و بے علم و بے شور و بے زر لیکن حسب قول صاحب فرہنگ اندراج بعض جگہ اس کے برعکس بھی پایا جاتا ہے - جیسا کہ توآن - اور امید کہ یہ دونوں لفظ غیر مشتق ہیں - ان پر حرف نفی خلاف قیاس بجائے بے کے نا داخل ہوتا ہے - اور نا توآن و نا امید کہا جاتا ہے - بے توآن اور بے امید مستعمل نہیں ہے - جیسا کہ سعدی نے کہا ہے

امید ہست پرستندگان مخلص را کہ نا امید نگردد ز آستان اللہ - یا خواجہ حافظ

ہاں مشو نا امید چوں واقف نہ ز اسرار زینب

باشند اندر پردہ باز یہائے پتہاں غم مخور

بعض جگہ ایسے مرکبات بھی نظر آئے کہ ایک ہی لفظ پر دونوں لفظ داخل ہوئے ہیں - جیسے کہ بے پاس اور

نا پاس وغیرہ وغیرہ

میرے خیال میں ملا عبدالواسع نے جو قاعدہ لکھا ہے وہ صحیح ضرور ہے اس واسطے کہ قواعد کی اکثر کتابیں اسی کی تائید کرتی ہیں - مگر انھوں نے چونکہ مستثنیات کا ذکر نہیں کیا اسی لئے مرزا غالب کو اعتراض کا موقع مل گیا - ورنہ اصل میں خلاف قیاس - اور شاذ کے طریق پر وہ الفاظ واقع ہوئے جنھیں مرزا نے اپنے واسطے دلیل قاطع سمجھا ہے - اور اس قسم کے شاذ الفاظ کی عربی کے علم صرف میں کوئی انتہا نہیں ہے - اسی لحاظ سے ملا عبدالواسع پر یہ اعتراض واقع نہیں ہوتا اور چونکہ نام مستندین کا اسی قاعدہ پر اجماع ہے اس لئے مرزا کی رائے اتنے لوگوں کے مقابلے میں نہیں مانی جاسکتی - یہ اور بات ہے کہ بے مراد اور نامراد کے دو خاص معنی آپ کے یہاں ہو گئے مگر ان پر قاعدہ کی بنا نہیں رکھی جاسکتی -

علی شہر ہندی و اعجاز اکبر آبادی

شاہ آفریں لاہوری نے حاکم لاہوری سے اور حاکم نے مولانا آزاد بلگرامی سے یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک زمانے میں وزیر خاں کی مسجد میں موزوں طبعوں کے مجمعے رہتے تھے۔ صحن مسجد میں چند لوگ جمع ہوتے اور شعر خوانیاں ہوا کرتی تھیں اتفاق سے ایک روز مجمع میں ملا محمد سعید اعجاز اکبر آبادی بھی شریک تھے۔ شعور و شاعری کا چرچا تھا۔ عمرہ عمدہ شعر پڑھے جا رہے تھے۔ کسی نے ناصر علی کا یہ شعر پڑھا ہے

صریر خامہ میداخم کہ باطبعت نبی سازد
دریدی نامہ۔ دل صد پارہ شد۔ قاصد لہنجا

اس ناصر علی علی شہر ہندی کا سلسلہ نسب حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ اول میں سیف خاں بدخشی کے ملازم ہوئے۔ جب سیف خاں اکبر آبادی کی صوبہ داری پر متعین ہوئے تو ناصر علی بھی اکبر آبادی میں عرصہ تک مقیم رہے۔ جب سیف خاں کا انتقال ہو گیا تو یہ شہر ہندی چلے گئے۔ نہایت بے باکی اور ہندی سے اوقات گزارا کرتے رہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ چار سہ ماہہ صفر کو میر باغ کے لئے گئے تھے اور وہیں بیٹھے ہوئے شراب پی رہے تھے کہ اسے میں شیخ محمد اعظم خلیفہ حضرت مجدد قدس سرہما اُدھر سے گزرے ناصر علی سے خفا ہو کر بوجھا کہ یہ کیا ہے۔ ناصر علی نے جواب دیا۔ "اے اللہ مالکِ یوم الدین" اس فقرہ سے علماء میں اتنی برہمی ہوئی کہ فتوؤں کے بعد ناصر علی کے قتل کا حکم تیار کیا گیا۔ اور یہ سخت آفت میں مبتلا ہوئے۔ میر محمد زماں راسخ کو یہ واقعہ معلوم ہوا۔ اپنے بال بچوں کو ساتھ لیا اور ناصر علی سے کہا کہ جان بچانا ہے تو میرے ساتھ چلو۔ عرض کہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکال کر دہلی پہنچایا۔ یہاں پہنچ کر بھی مدتوں تک وہی رنگ و لہجہ سنا سکتے رہے۔ آخر کار توفیق الہی نے دستگیری کی اور تمام مکر وہات سے توبہ کر کے شیخ محمد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مرتبہ ہو گئے۔ آفریں ذوالفقار خاں ابن اسد خاں کے مصاحب ہو گئے۔ چنانچہ جس روز پہلی مرتبہ قصیدہ نذر گزارا تو قاصد یہ کلام مطلع پڑھا ہے

اموشان حیدری زمین آتشکار

تیغ تو در نہر دکند کار ذوالفقار

یہ سنکر نواب موصوف نے ناصر علی کو باقی قصیدہ پڑھے۔ سے تیغ کر دیا۔ اور کہہ دیا کہ بس کافی ہے۔ اس مطلع ہی کا صلہ میں نہیں دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد ایک ہاتھی اور تیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ مگر ناصر علی نے سب روپیہ مستحقین کو تقسیم کر دیا

آخر عمر میں دہلی میں تھے اور یہیں ۲۰ رمضان المبارک سن ۱۱۰۰ ہجری میں مرحوم ہو کر جو ار حزار حضرت نظام الدین اولیاء میں مدفون ہوئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے
 رسالہ نہ پونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک فریقہ کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مضرت روانہ ہوگا
 سالانہ قیمت پانچ روپیہ (۵۰) ششماہی تین روپیہ (۳۰)
 بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمارہ	فہرست مضامین جون ۱۹۳۳ء	جلد ۳۲
۲		اشعار
۹		سفری زبانوں کے ادب لطیف پر تبصرہ
۲۵	انجم کریمی	ایا
۴۰		جوش کی شاعرانہ لغزشیں
۴۴		مکتوبات نیاز
۵۰		اب الاستفسار
۵۹		اب المراسلۃ والمناظرۃ
۶۱	انقر۔ عدم۔ فطرت۔ کوکب۔ راز۔ فرخ۔ اختر۔ ۱۹۶۱ء	نظومات
۶۲		طبوعات موصولہ
۷۷		طبوعات
۲۰۹	آسی	ذکرہ معرکہ سخن
۲۲۲		

نگار

ادبیر۔ نیاز فتحپوری

شمار ۶	جون ۱۹۳۳ء	جلد ۳۳
--------	-----------	--------

ملاحظات

ایک قوم کی تباہی کا راز اس کی قدامت پرستی ہے

”کسی زمانہ میں ایک بزرگ تھے جو دریا کی سطح پر مصلابچھا لیتے تھے اور اس پر نماز پڑھتے ہوئے پانی کو عبور کر جاتے تھے “
 ”کوئی ولی اللہ کسی طرف سے گزر رہے تھے کہ ایک کنویں پر انھوں نے آدمیوں کا ہجوم دیکھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ ایک بھینس
 اندر گر گئی ہے اور لوگ اس کے نکلنے کی فکر میں ہیں۔ انھوں نے کنویں میں ہاتھ لٹکا کر جو باہر نکالا تو لوگ کیا دیکھے ہیں کہ بھینس
 باہر کھڑی ہوئی ہے “

”کسی زمانہ میں ایک صاحب کرامت درویش کثرت ریاضت سے اسقدر لطیف ہو گئے تھے کہ چکا اُن کے جسم کے آر پار ہو جاتا تھا
 اور ان کا بدن حائل نہ ہوتا تھا “

”تذکرۃ الاولیاء“ قسم کی کتاب میں اٹھا کر دیکھے تو ہزاروں واقعات آپ کو اس سے زیادہ حیرت انگیز نظر آئیں گے۔ لیکن آپ

س پر بھی غور کیا ہے کیا واقعی کسی وقت ہمارے یہاں کے اکابر مذہب و تصوف سے اس قسم کی مجر العقول باتیں ظاہر ہوتی ہیں اور اگر یہ صحیح ہے تو اس کا کیا سبب تھا اور کس فائدہ و نتیجہ کے لئے تھا اور اب اس ”کشف و کرامات“ کے لوگ کیوں نظر نہیں آتے؟

آپ کسی شخص سے جو ان باتوں کی صحت کا قائل ہے یہ سوال کریں گے تو وہ نہایت ہی غم آلود و حسرتناک چہرہ بنا کر کہے گا کہ ”یہ اگلے لوگوں کی باتیں ہیں جو انھیں کے ساتھ گئیں، نہ اب وہ ریاضتیں ہیں نہ عبادتیں، نہ وہ روحانیت ہے نہ مداقت، نہ وہ ایمان ہے نہ وہ یقین“ پھر آپ اس سے پوچھئے کہ اب ایسا کیوں نہیں ہے، کیا مسلمان دنیا میں رہے، کیا عبادت کا اصول بدل گیا، کیا اصول اخلاق و روحانیت میں کوئی تغیر پیدا ہو گیا، تو وہ اس کے جواب میں ہوائے اس کے کہ اپنی بگھتی کار و تار وئے، خدا کی مرضی پر محمول کرے یا کلجنگ کی خرابی بنا کر خاموش ہو رہے اور کچھ نہ کہے گا۔ اکثر و بیشتر میرے پاس ایسے حضرات کرم فرماتے رہتے ہیں جو میرے کفر و الحاد میں میرے ساتھ ہمدردی دیکھتے ہوئے مجھے راہ راست پر لانے کی سعی فرماتے ہیں چنانچہ چند دن ہوئے ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے اور اس عزم کے ساتھ کہ وہ مجھ بیدین کو بغیر مسلمان بنانے ہوئے نہ اٹھیں گے، میں ان کی مقطع صورت ان کی شرعی وضع، اور ان کے ہنگامہ بیز ”السلام علیکم“ سے چونک کر پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ آج پھر کوئی ”خداوند“ اپنے ”ناچیز بندہ“ کو سعادت جلوہ بخشنے کے لئے آیا ہے، اس لئے تعظیماً و احتراماً اٹھ بیٹھا، صدر میں جگہ دی اور موڈب ہو کر خاموش بیٹھ گیا۔ پہلے تو وہ بڑی دیر تک نایت غور سے میری صورت و وضع کو دیکھتے رہے اور پھر ایک نہ چھپ سکنے والی خشونت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ ”میں نے سنا ہے کہ تم معجزہ و کرامت کے قائل نہیں“ میں نے عرض کیا کہ ”یہ تو آپ نے غلط سنا ہے۔ کیونکہ کل ہی میں رزوال میں دان نارمن کا معجزہ دیکھ چکا ہوں جو ۱۰۰ فٹ کی بلندی سے ۳۰ فٹ کی جست لگاتا ہوا آگ کے شعلوں کے درغائب ہو جاتا ہے، علاوہ اس کے یہاں کے پروفیسر معشوق علی کی کرامتیں بارہا دیکھ چکا ہوں جو ایک رومال سے

جزوں رومال اور ایک روپیہ سے سیکڑوں روپے آن کی آن میں بنا دیتے ہیں“
یہ سنتے ہی اُن کا چہرہ سرخ ہو گیا اور برہم ہو کر بولے۔ ”لوگیا رسولوں کے معجزے اور اولیاء کی کرامات بھی کوئی عہدہ بازی تھی“

میں نے کہا ”مجھے اس کا علم نہیں، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ میرے لئے تو ان لوگوں کے یہ تماشے بھی معجزے ہی حکم رکھتے ہیں، کیونکہ میں ویسا کرنے سے عاجز ہوں“ فرمایا۔ ”مشق سے ہر شخص ایسا کر سکتا ہے“ میں نے کہا کہ۔ ”ایک منکر مذہب معجزوں کے متعلق بھی یہی کہہ سکتا ہے“ بولے۔ ”مگر اس کا یہ کہنا تو غلط ہوگا کیونکہ وہاں مشق و کتساب کا کوئی سوال نہ تھا۔ اور معجزہ اصطلاح میں کہتے ہی اس کو ہیں جو ایک نبی سے بغیر کسی مشق و کتساب کے سرزد ہو“ میں نے کہا۔ ”بجا ارشاد ہوا، لیکن اگر آجکل کے شعبدے دکھانے والے بھی

یہی دعوے کر بیٹھیں کہ جو کچھ وہ دکھاتے ہیں اس کا تعلق مشق و اکتساب سے نہیں ہے تو آپ کیا فرمائیں گے۔“
 کہنے لگے۔ ”ہم اسے جھوٹا کہیں گے اور سیکڑوں مثالیں ایسی بتا دیں گے کہ مشق سے لوگ ویسا کرنے میں کامیاب ہو گئے“
 میں نے کہا۔ ”یہ درست ہے، لیکن نتیجہ کے لحاظ سے شعبہ و معجزہ وہ میں کوئی فرق مجھے نظر نہیں آتا، سوائے
 اس کے کہ ایک شخص کسی وہی قوت کی وجہ سے اس کے ظہور کا مدعی ہے اور دوسرا مشق و اکتساب سے۔ اس سے
 اخلاق انسانی کو کیا فائدہ پہنچتا ہے“۔ بولے۔ ”معجزہ تو صرف اس لئے ہے کہ نبی کو نبی مانیں اور اس کے کہنے
 پر عمل کریں“۔ میں نے کہا۔ ”تو خلاصہ یہ ہوا کہ نبی وہ ہے جس سے معجزہ سرزد ہوا اور معجزہ وہ ہے جو نبی سے ظاہر
 ہو“۔ کہنے لگے۔ ”بیشک“

ظاہر ہے کہ جس جماعت کے رہنما و قاید اس عقیدہ و خیال کے ہوں گے، وہ کیوں نہ عجوبہ پرست ہوگی اور
 اس کا یہ عقیدہ کہ ”اسلاف“ کے سے صاحبان علم و عربیت، حاطان فضل و کرامت اب نہیں پیدا ہو سکتے، اس کو
 کس درجہ مایوس اور ناکارہ نہ بنا دے گا۔ اس میں شک نہیں کہ ”عہد ماضی“ میں انسان کے لئے بہت کچھ دلچسپ
 ہوا کرتی ہیں اور گزرے ہوئے واقعات بعض دماغوں کے لئے ایک ”طاسم زار“ کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں، لیکن
 اس کا تعلق صرف ہمارے جذبات محبت و عقیدت سے ہے۔ جو انسان کے عہد و حشت سے وراثتاً منتقل ہوتے
 چلے آئے ہیں اور اب ہم ان کو ایک ”حقیقت و واقعہ“ سمجھنے لگے ہیں

ادارہ مذہب کے قیام کی تاریخ کا اگر آپ مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اس کی بنیاد ہمیشہ کسی ایک مخصوص
 ہستی کے ساتھ جذبہ خوف و احترام یا محبت و عقیدت پر قائم ہوئی اور اس ہستی کے اٹھ جانے کے بعد انسان نے
 اپنی عقیدت و ارادت کو وسیع و مستحکم بنانے کے لئے بہت سی ایسی باتیں اپنی طرف سے اضافہ کر کے بیان کرنا شروع کیں
 جو لوگوں کو مرعوب یا راغب کرنے والی تھیں۔ چنانچہ انبیاء کے معجزے، اولیاء کے کرامات، درویشوں کے خوارق
 عادات سب اسی قبیل کی چیزیں ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ صرف ہمارے ہی ارادتمندانہ جذبات
 یا مصالح تبلیغ کی پیداوار ہیں۔ پھر جس طرح سو سال پیشتر کے کسی بزرگ کے حالات میں اس وقت ایک معتد بہ افاض
 اُس کے کرامات کا نظر آتا ہے، اسی طرح آج کسی بزرگ کے متعلق بھی سو سال بعد ایسی ہی روایتیں منسوب کر دی
 جائیں گی، اور جس طرح چار قرن پہلے کی پختہ قبرا آج کسی نہ کسی بزرگ کا مزار بن گئی ہے، اسی طرح نصف صدی
 بعد آج کی بنی ہوئی قبر بھی پھولوں کی چادر کا چڑھایا جانا مستبعد نہیں، اگر جمل و داہمہ پرستی کا یہی عالم رہا

ہمارے اسلاف نے اپنے عہد میں جو کچھ کیا وہ اس میں شک نہیں کہ لایق صد ہزار آفون و ستایش ہے
 لیکن یہ کہنا کہ جو کچھ وہ کر گئے ہیں، اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں اور جو کچھ وہ کہ گئے ہیں۔ اس کو بلا چون و چرا آنکھ
 بند کر کے تسلیم کر لینا چاہئے، حد درجہ مضر تعلیم ہے اور ایک قوم کی دماغی و ذہنی ترقی کو خاک میں ملا دینے والی ہے

آئے اپنے بعض اسلاف کی علمی تحقیق اور ذہنی ترقی کا ایک لطیفہ سن لیجئے:-

علامہ قزوینی اور علامہ دمیری سے غالباً ہر وہ شخص واقف ہو گا جس نے تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے علامہ قزوینی وہی ہیں جنہوں نے ”تاریخ گزیدہ مرتب کی، ظفر نامہ لکھا اور نزہۃ القلوب تصنیف فرمائی یہ حُر بن یزید کی اولاد میں سے تھے جنکو میدان کربلا میں سید الشہداء کے ہمراہ جہاد کی سعادت حاصل ہوئی تھی اور مذہباً شیعہ تھے۔ علامہ دمیری آٹھویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ، محدث و مفسر تھے، جامع ازہر قاہرہ میں فلسفہ و ادب کے لکچرار تھے، خاص سرزمین مکہ میں سلسلہ درس و تدریس جاری رکھتے تھے، صاحب کرامات بھی مانے جاتے تھے اور منجملہ خطبات و دیگر کتب کے ایک مشہور کتاب حیات الحیوان کے بھی مصنف تھے الغرض یہ دونوں ایسے صاحب فضل و کمال تھے کہ آج کوئی مولوی و عالم ان کے مرتبہ تک پہنچنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ لیکن ان کی تحقیق انیق اور ان کی پختگی ذہن کا کیا عالم تھا۔ حیاۃ الحیوان لے کر اسکول کے کسی طالب العلم کو دیدتے اور فیصلہ اسی پر چھوڑ دیتے۔ — مثلاً ان حضرات کی کاوش علمی کا ایک ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ عقاب کی تحقیق کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:-

”جب عقاب (جیل) سال خوردہ ہو جاتی ہے اور بینائی کھو بیٹھتی ہے تو وہ فضا میں بلند ہوتی ہے اور اس حد تک اوپر اُڑ کر چلی جاتی ہے کہ اس کے پر تازات آفتاب سے جل جاتے ہیں، اس کے بعد وہ بیٹھے گرتی ہے اور ایک شور و تبلیغ پانی کے کنوئیں میں غوط لگا کر از سر نو جوان ہو جاتی ہے

(قزوینی)

جب چیل ضعیف و کمزور ہو کر اندھی ہو جاتی ہے تو اس کے بچے اس کو چاروں طرف لادے بھرتے ہیں، یہاں تک کہ ہنڈستان کے ایک چشمہ تک پہنچتے ہیں اور اس میں غوط لگاتے ہیں۔ اس کے اثر سے چیل کی بینائی عود کر آتی ہے اور وہ از سر نو جوان ہو کر اپنی شکاری زندگی شروع کر دیتی ہے

گرگس، چیل کے انڈے سے پیدا ہوتا ہے اور چیل کرگس کے انڈے سے۔ تمام چیلیں مادہ ہیں اور دوسری چیلوں سے جفتی کھاتی ہیں۔ یہ صرف تین انڈے دیتی ہیں۔ لیکن تیسرے انڈے کو پھینک دیتی ہیں اور صرف دو سیتی ہیں، تیسرے انڈے کو ایک اور طاہر جس کا نام کاسر العظام (ہڈی ٹوڑ) ہے اٹھاتا ہے اور اس سے بچہ نکالتا ہے چیل، ہندوستان سے ایک پتھر لے آتی ہے اور گھونسلے میں رکھ دیتی ہے۔ تاکہ انڈے میں آسانی ہو۔ یہ پتھر کھوکھلا ہوتا ہے جس کے اندر ایک اور پتھر ہوتا ہے یہ پتھر عورتوں کے وضع حل میں بھی آسانی پیدا کر دیتا ہے

(دمیری)

غالباً یہ کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ عقاب کے متعلق جو کچھ ان محققین نے لکھا ہے وہ صرف نقل ہے قدیم یونانی روایات کے

مد قدم سے اُن کے یہاں رائج چلی آ رہی تھیں۔ پھر جب آٹھویں صدی ہجری تک ہمارے یہاں کے مورخین مصنفین کی تحقیق کا یہ عالم تھا کہ وہ روایات قدیہ سے ایک انچ بہت کر خود اپنے ذہن و عقل سے کام لینا گناہ سمجھتے تھے ظاہر ہے کہ اس سے قبل اور کیا عالم رہا ہوگا اور ان کے علمی کارناموں کی زمانہ موجودہ میں کیا وقعت ہو سکتی ہے یقیناً ان لوگوں پر کوئی الزام نہیں، کیونکہ جو کچھ انھوں نے کیا وہ ان کی بساط عقل کے لحاظ سے بالکل درست ما، لیکن سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ تفتیش و تحقیق نے غیر معمولی وسعت اختیار کر لی ہے، کیوں کسی کو اس امر نے ماننے پر مجبور کیا جائے کہ اسلاف جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے اور ہم انھیں کا اتباع کر کے ترقی حاصل کر سکتے ہیں

یہی وہ قدامت پرستی ہے جو اس سے قبل خدا جانے کتنی قوموں کو تباہ و برباد کر چکی اور اب مسلمانوں کی جماعتوں کا شکار بنی ہوئی ہے۔ عجوبہ پرستی کا دور گزر گیا، یہ دور ہے صرف تجزیہ و مشاہدہ کا، اس لئے اب نہ زہ و کرامات پر محض اس لئے یقین کیا جاسکتا ہے کہ قدیم کتابوں میں ایسا لکھا ہوا ہے اور نہ صرف خوارق عادات بنا پر کسی کی عظمت و بزرگی ثابت کی جاسکتی ہے، کیونکہ جب تک ”طبیعیات“ کی دنیا تک انسان کا دسترس تھا کسی کا دس فٹ بلند جست کر لینا بھی مجزہ کہلایا جاسکتا تھا، لیکن اب کہ طیاروں اور ہوائیوں کے ذریعہ ہمہ دشمن ثریا ہو جانا بھی مستبعد نہیں، اولیاء کرام کے خوارق عادات کو اُن کی بزرگی کے ثبوت میں پیش کرنا فن ہی معنی رکھتا ہے کہ آج ہم یورپ کے ایک ایک موجد و مخترع کو صاحب کرامات یقین کرنے پر

دور ہیں
تسقدر افسوسناک امر ہے کہ اس وقت بھی جب تمام دنیا میں علم کا انجالا پھیل گیا ہے اور انسان حقیقی معنی اذافت الہی کے دور سے قریب تر ہوا جا رہا ہے، ہم بدستور اسی زمانہ میں ہیں جب بقول قرآنی و دمییری چیل ہوئے میں پارس پھر پایا جاتا تھا اور مستقبل کی امیدیں صرف نزول مسیح اور ظہور مہدی موعود سے وابستہ کئے

سے ہیں
کاشش ہم سمجھ سکتے کہ اس وقت دنیا کو حاجت نہ مہدی کی ہے نہ مسیح کی بلکہ ضرورت ہے اڈلسین و مارکونی زمان اور بوس کی کیونکہ انسان اب مجزہ و کرامات کی حد و گزر کر عالم جد و ہمد کی اس منزل تک پہنچ گیا ہے جہاں خود میں ”جذبہ الوہیت“ پیدا ہوتا نظر آ رہا ہے اور ”انسانیت گبری“ کا مشاہدہ ایک ایسی حقیقت ذاتی “
خدا اس کے اندر پیدا کر رہا ہے جس کو اگر ہم چاہیں تو معرفت ربانی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں اور قرب الہی

بھی

اس لئے اگر تم قدامت پرستی کی لعنت سے آزاد ہونا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو احمق و جاہل نہ سمجھو بلکہ

ہوش گوش والا انسان باور کر کے ہر بات کے سمجھنے کی کوشش کرو، اپنے ذہن و دماغ کو نوامیس قدرت کی گتھیاریں سلجھانے کا اہل بناؤ اور پرستش اسلاف کو ترک کر دو کہ اس سے زیادہ سنگ گراں ترنی کی راہ میں اور کوئی نہیں ہو سکتا اسی کے ساتھ اپنی اولاد کی تربیت و تعلیم میں بھی اس کا لحاظ رکھو کہ ان کی عقلی آزادی محو نہ ہونے پائے اور دوسروں کی روشنی میں مطالعہ اشیا کی عادت ان کی "حریت فکر" کو تباہ نہ کر دے۔ پھر اگر تمہاری ایک نسل بھی اسی اصول کے ماتحت تربیت پائی تو سمجھ لو کہ تمہاری تمام مصیبتیں دور ہو گئیں۔ ورنہ نفل جو تم کو اور تمہاری اولاد کو دیکھنا ہے اسے آج میری زبان سے سن لو اور یاد رکھو کہ جس طرح اور ہزاروں اندھی قومیں اب سے قبل تباہ ہو چکی ہیں، اسی طرح تم کو بھی تباہ و برباد ہو جانا ہے اور خدا اس سے بالکل بے نیاز ہے کہ مسلمان کا وجود دنیا میں باقی رہے یا نہ رہے

ایک مولوی کی عجیب و غریب حرکت

۲۶ مئی کے لیڈر میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ سسر ام ضلع آرہ کے ایک مولوی نے جن کا نام عبدالعزیز ہے یہ عہد کیا ہے کہ وہ پیادہ سفر کر کے حج کریں گے اور دوران سفر میں ہر پانچ قدم کے بعد دو رکعت نماز نفل بھی پڑھیں گے چنانچہ ۹ مئی ان کے سفر کو ہو گئے ہیں اور ابھی تک وہ الہ آباد نہیں پہنچے۔ نامہ نگار کا بیان ہے کہ پندرہ دن کے بعد وہ الہ آباد پہنچیں گے اور ایک ہفتہ یہاں قیام کریں گے گویا سسر ام سے الہ آباد تک کی مسافت ۱۵۶ میل کی دس مہینے میں طے ہوگی۔ اگر سسر ام سے مکہ معظمہ تک خشکی کا راستہ کم از کم ۳۰۰۰ میل کا ہو اور مولوی صاحب موصوف اسی رفتار سے بغیر کسی اضمحلال و عدالت کے اپنا سفر جاری رکھیں تو منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کم و بیش بیس سال درکار ہوں گے

یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ممکن ہے مولوی ذہنیت کا شاہکار سمجھا جائے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ خدا کی یہ عجیب و غریب مخلوق اس سے زیادہ عجیب و غریب حرکتیں کر سکتی ہے اور دنیا کی بڑی سی بڑی گمراہی خیال بھی ان واقعات کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو اس جماعت کی طرف سے ظہور میں آسکتے ہیں

کیا سسر ام میں کوئی ایسا شخص نہیں جو اس دیوانہ مذہب کو اس حرکت سے باہر رکھتا اور کیا ہندوستان میں بھی کوئی ایسا مسلمان نہیں جو اس غریب کو سمجھا سکے کہ مذہب اسلام ان لغویات سے بہت بلند واقع ہوا ہے اور یہ تعسف و جنون خدا و رسول کے نزدیک کسی طرح پسندیدہ نہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس "تن آزاری" کا مقصد کیا ہے۔ اور ہمارے سامنے بہت سے ان سادھوؤں کی مثالیں موجود ہیں جو اپنے ہاتھ پاؤں تک خشک کر ڈالتے ہیں صرف اسلئے کہ جلا پہنچ کھنچ کر ان کے پاس آئیں اور خدا کو چھوڑ کر انکی پرستش کرنے لگیں

جنگ چین و جاپان سے ایک سبق

چین و جاپان کی جنگ اصولاً و عملاً دونوں طرح ختم ہو چکی، یعنی جاپان نے اپنی عسکری تنظیم، اپنی آرہنگی علوم اور اپنے جوش و وطنی سے باوجود ایک نہایت ہی محدود سلطنت ہونے کے دشمن کو شکست دیدی اور چین باوجود اتنی کثیر آبادی، اتنی وسیع سلطنت ہونے کے، اعتراف شکست پر مجبور ہو گیا۔ پھر اگر اس واقعہ میں ایک طرف ہمارے لئے یہ درس عبرت پنہاں ہے کہ ”کم و کیف“ کی جنگ میں ہمیشہ کامیابی ”کیف“ ہی کو ہوتی ہے، تو دوسری طرف جمعیتہ الامم کی بیچارگی بھی ایک دفتر بصیرت ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جس نے ایک سال قبل یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ اس جنگ میں بڑے دشمن کوئی صلح نامہ نہیں ہو سکتا اور آج وہ جاپان کے اس زور و شمشیر کو دیکھ رہی ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتی وہ لوگ جو قلم کی قوت کو تلوار کی قوت سے زیادہ کارگر یقین کرتے ہیں۔ انہیں اور جاپان کی اس فتح مندی کا مطالعہ کر کے عبرت حاصل کریں کہ آج مغرب کی بڑی بڑی قوتوں کی بزم آرائیاں، جاپان کی صرف ایک ”داستان رزم“ کی بھی حریف نہیں ہو سکتیں۔ سچ کہا تھا۔ ڈی ولیر نے کہ جمعیتہ الامم جس چیر کا نام ہے وہ صرف ایک ٹھوکے کی ٹٹی ہے جس کو ہر نیزہ باز اپنی ادنیٰ قوت سے کام لے کے پامال کرتا ہوا گزر جاسکتا ہے۔

حضرت نیاز فتحپوری کی دو اور معرکہ الآرا کتابیں

زیر ترتیب طباعت ہیں

نگارستان حصہ دوم۔۔۔۔۔ جس میں جناب نیاز اپنی پوری شان ادبیت کے ساتھ نظر آئیں گے۔۔۔۔۔ اور

مجموعہ استفسار و جواب (۲۲ سے ۳۳ تک)۔۔۔۔۔ جو نگار کے

فاضل اڈیٹر کا زبردست علمی کارنامہ ہے

ظاہر ہے کہ ان دونوں کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا
 پیغمبر نگار لکھنو

مایا

رانی پور کے زمیندار بسنت کمار کے باپ سرگباش ہو چکے تھے۔ اور اب بوڑھی ماں رادھا اور نوجوان بیوی پاروتی کے سوا ان کا اس دنیا میں اپنا کوئی نہ تھا۔ وہ بی۔ اے پاس کر چکے تھے اور قانون کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے ہی میں گذرتا تھا۔ رادھا جو بُرائے خیال کی ماں تھی اپنی بہو پاروتی کو بسنت سے ملنے کا بہت کم موقع دیتی تھی، جب کوئی پڑوس کی عورت رادھا سے اس کی وجہ پوچھتی تو وہ کہتی: "دولوں ابھی نا سمجھ اور نا تجربہ کار ہیں بیوی کے پھندے میں پھنس کر بسنت بڑھ لکھ نہیں سکتا ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے عیش و آرام کے لئے ساری زندگی پڑی ہے۔" چنانچہ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ رادھا اپنی بہو کو بڑی کوشش سے خانہ داری کا کام کھارتی تھی۔ اور پاروتی کا سارا دن رسوئی، تھنڈا ارغانہ اور ٹھا کر جی ہی کے گھر میں گذرتا تھا۔ ات کو بھی رادھا سو کو اپنے پاس سلاتی تھی۔ جیسے کوئی لاپرواہ مان گئے کارس خراب ہوس پوس کر بیٹا اور بچہ دور سے دیکھ کر لپٹائے وہی حال بسنت کا بھی تھا اس کی آنکھوں کے سامنے ہی نوجوان بیوی کارس گھسی کی جگہ میں پس پس کر مٹی میں لاجار ہا تھا لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ماں کے خلاف کوئی کام کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی مگر ضبط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے یہ سعادت مندی زیادہ دن تک نہ قائم رہ سکی آری ایک دن وہ ماں سے باغی ہو گیا۔ پھاگن کا مہینہ اور دوپہر کا وقت تھا بسنت اپنی بیٹھک میں کچھ پڑھ رہا تھا یکبارگی اس کے کانوں میں آواز آئی :-

گیاں بر جائے ایسی ہوری اُن بن دیے جزت موری۔

گاؤں میں اس نے اکثر لوگوں کو بھگاؤنگاٹے سنا تھا مگر اس وقت دیہاتی لڑکیوں کے گیت "گیاں بر جائے ایسی ہوری" نے بسنت کے دل کو تڑپا دیا اسے ایسا معلوم ہونے لگا گویا لڑکیاں گیت میں اس کا مذاق اڑا رہی ہیں پھر دوسری 'ہولی' شروع ہوئی :-

ہوری آئی سجن ناپیں آئے دیکھو شام بہاے بدلیو امیں چھائے

رنگ کھیلیں سکھیاں اپنے پیاسنگ ہنس ہنس گردانگائے

رہ رہ آوے یاد بلم کی عمیر گلال نہ بھائے ہوری آئی سجن.....

بہو وہ اپنے دل کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ پیاسے کے سامنے پانی کا گلاس رکھا تھا لیکن اسے پینے کی اجازت

نہ تھی۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ وہ پھاگن کے مہینہ میں بھی اپنی بیوی سے بات چیت نہیں کر سکتا تھا۔ ماں تو رات کے خیال کی ہے لیکن وہ تو تعلیم یافتہ اور نئی روشنی کا تھا وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اور پھر اپنے گھر میں داخل ہوا اس کی ماں سو رہی تھی۔ بسنت کی نگاہیں پاروتی کو تلاش کرنے لگیں وہ رسوئی گھر میں بیٹھی جاؤں میں رہی تھی شوہر کو دیکھ کر اس نے گھونگھٹ کرنا چاہا لیکن بسنت نے اشارہ سے اس کو اپنی طرف بلایا۔ اس نے کہا ”پاروتی کتنی گنوار ہے شوہر سے پردہ کرتی ہے“ مگر یہ کوئی نئی بات نہ تھی وہ ہمیشہ سے پردہ کرتی چلی آئی تھی لیکن آج سے پہلے بسنت نے اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہ کی تھی۔ پاروتی نے گھبرا کر ساس کی طرف دیکھا وہ سو رہی تھی۔ ”آج ان کو کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ مجھے کیوں بلاتے ہیں۔۔۔۔۔ ماں جی کا بھی کچھ خیال نہیں۔۔۔۔۔ اگر میں ان کا حکم نہیں مانوں گی تو یہ ناراض ہو جائیں گے۔۔۔۔۔ اور اگر ان کے پاس جاؤں اور ماں جی جاگ اٹھیں تو۔۔۔۔۔“ پاروتی کو سوچتے دیکھ کر بسنت سے خاموش نہ رہا گیا اس نے کہا۔۔۔۔۔ اجی سنتی ہو یا نہیں میں کہتا ہوں ادھر آؤ۔۔۔۔۔“ یہ کہتا ہوا بسنت۔۔۔۔۔ چھت پر چلا گیا۔ پاروتی سہمی ہوئی اٹھی اور اس کی طرف خوف بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی دبے پاؤں بسنت کے پاس پہنچ گئی

”گھر میں کیوں ہو پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔“

”جی۔۔۔۔۔“

”میں تو کہتا ہوں کہ پلنگ پر بیٹھ جاؤ اور تم“ جی اجی! کی رٹ لگا رہی ہو“

”اگر ماں جی جاگ اٹھیں اور انہوں نے منگوہیاں دیکھ لیا تو بڑی بڑی بات ہوگی“

”یعنی مجھ سے ملنا بڑی بات ہے کیا خوب؟ کیسی بیوقوفی کی باتیں کرتی ہو۔ ہونہ آخر دیہاتن؟“

”لیکن اب ہنگ نہیں لے یہ کس کی بیوقوفی تھی۔ میں تو دیہاتن ہوں لیکن آپ کو شہر میں رہ کر بھی آج۔۔۔۔۔ پہلے کبھی اس کا خیال نہیں آیا“

بات معقول تھی لیکن بسنت اپنی ہار ماننے کیلئے تیار نہ تھی انہوں نے کہا۔ ”خیر فضول بحث کرنے سے فائدہ نہیں۔ سنو اور غور سے سنو میں نے اب تک بہت ضبط کیا لیکن اب مجھ سے ضبط نہیں ہوتا اب میں جا ہوں اور دل سے چاہتا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھو مجھ سے باتیں کرو۔ اور میرا دل بہلاؤ۔“ اتنا کہہ کر بسنت نے پاروتی کا ہاتھ تھام کر پلنگ پر بٹھالیا۔

گوں ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ دن کے وقت پاروتی اپنے شوہر کے پاس بیٹھی ہو شرم و لحاظ کے ڈر سے وہ کانپنے لگی یہ حالت دیکھ کر بسنت نے پاروتی کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔۔۔۔۔ ٹھیک

ادھا جو جاگ اٹھی تھی پاروتی کو تلاش کرتی ہوئی اوپر پہنچی۔ کمرہ کا ایک دروازہ کچھ کھلا ہوا تھا اس کے سامنے بونچے ہی رادھا اس طرح چونک اٹھی جیسے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہو۔ دوپہر کی روشنی میں یہ نظارہ کبھی نہ دیکھا گیا۔ وہ دل میں سوچ رہی تھی۔ ”رام! رام! میری بھی ایک دن شادی ہوئی تھی مگر میں نے ایسی بے شرمی سے کبھی کام نہیں لیا۔ کلجک کا زمانہ ہے جو کچھ نہ ہو جائے تھوڑا ہے“

(۲)

ہوا اور آگ کا میل ہو گیا۔ ادب و لحاظ سب کچھ محبت کی آگ میں جل کر خاک سیاہ ہو گئے۔ بیوی کی تربیت بسنت کی زندگی کا اصلی مقصد ہو گیا۔ لوک لاج سے اس نے چشم پوشی اختیار کر لی اب پاروتی دن رات بسنت کمرہ میں رہنے لگی پاروتی یتیم تھی اس کے ماں باپ مر چکے تھے خیال تھا کہ سسرال میں اُسے آرام ملے گا مگر یہاں آتے رادھا نے اُسے گھرستی میں ایسا جکڑا کہ اُسے آرام ہی نہ ملا اس کا حسن و شباب مٹی میں ملنے والا تھا مگر بسنت ٹھیک وقت پر سوکھے ہوئے کھیت کو حمیت کی آبیاری سے شاداب کر دیا اس کی ناز برداریوں سے پاروتی دل کا باغ لہلہانے لگا۔

پاروتی تحسن کی دیوی تھی مگر وہ تعلیم یافتہ نہ تھی بسنت نے اس کو پڑھانا شروع کر دیا۔ پہلے پہل تو دیہاتی پڑھنے سے گھبرائی مگر پھر مجبوراً اس کو شوہر کا حکم ماننا پڑا۔ جب دیکھے کمرہ میں بیٹھی ہوئی سر ہلا کر پڑھتی رہتی اور ماسٹر صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے قانونی کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے تھے بیچ بیچ میں ترچھی نظروں سے اُس کی طرف بھی دیکھتے جاتے تھے کہ وہ جی لگا کر پڑھتی ہے یا نہیں۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ بسنت اپنی بند کر کے یکبارگی بیمار گئی پکاراٹھنے۔ ”پاروتی!“ پاروتی چونک اٹھتی اور گھبرا کر بسنت کی طرف دیکھنے۔ اس وقت اس کی ہر نیسی نشیلی آنکھیں ایسی پیاری معلوم ہوئیں کہ بسنت بیتاب ہو جاتا اور کہتا۔ اچھا اب اپنی کتاب میرے پاس... تو لاؤ دیکھوں تو سہی تم کیا پڑھتی ہو؟“ پاروتی گھبرا جاتی کہ ماسٹر صاحب امتحان نہ لینے لگیں۔ کیونکہ امتحان میں پاس ہونے کی اسے بہت کم امید ہو کر تھی بہت کوشش کرنے پر بھی اس کا جی پڑھنے میں نہ لگتا تھا وہ سبق پڑھ کر جتنا یاد کرنے کی کوشش کرتی کالے کالے حروف چوٹیوں کی قطار کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے سے نکلنے جاتے تھے۔

ماسٹر صاحب کے بتلانے پر پاروتی ملزم کی طرح ڈرتے ڈرتے کتاب لے کر جاتی۔ بسنت اپنا ایک ہاتھ لاکر میں اس طرح سے ڈال دیتا کہ وہ بھاگ نہ سکے اور دوسرے ہاتھ میں کتاب لے کر کہتا۔ اچھا

بتاؤ آج کتنا بڑھا ہے“ پاروتی جتنی سطروں پر اس کی نظر پڑتی انگلی سے بتا دیتی۔ بسنت حیرت کا اظہار کرے ہوئے کہتا۔ ”اوہو! بہت بڑھ ڈالا مجھ کو دیکھو میں تو کچھ بھی نہیں بڑھ سکا۔“
 بھولی بھالی پاروتی حیرت زدہ ہو کر کہتی۔ ”تو اتنی دیر تک آپ کیا کرتے رہے؟“
 بسنت اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہتا۔ ”میں ایک بیدرد۔ سنگدل دیوی کا درشن کر رہا تھا اور وہ

میری طرف دیکھتی بھی نہ تھی۔“

پاروتی اس کا جواب دے سکتی تھی مگر لاج کے مارے اور پریم کے دباؤ سے وہ اپنی ہار مان لیتی تھی کسی کسی دن بسنت کہیں باہر جاتا تو موقع پا کر پاروتی پڑھنے میں لگ جاتی اتنے میں بسنت نہ معلوم کہاں سے دبے پاؤں آ کر پیچھے سے اس کی آنکھیں بند کر لیتا اور کہتا۔ ”اچھا بتاؤ! میں کون ہوں؟“ اس پر پاروتی اپنی آنکھوں سے بسنت کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتی ہوئی کہتی۔ ”واہ جی واہ! میں جان گئی بس اب آنکھیں کھول دو۔ آپ میرے ہر دیشور ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نہ؟“ اس پر بھی بسنت ہاتھ نہ ہٹاتا تو پاروتی اس کے ہاتھوں میں چنگیاں لینے لگتی اور کوشش کر کے یکبارگی کھڑی ہو جاتی اس طرح سے اس کی آنکھیں تو کھل جاتیں لیکن اس کے دونوں ہاتھ بسنت تھام لیتا۔ اس ”جنگ عظیم“ میں پاروتی کے زخماں بیز ہوئی کی طرح سرخ ہو جائے کتاب دور گر جاتی اور ساڑھی کا پلہ سر سے کھسک کر کندھے پر اور پھر وہاں سے سینہ پر سے گذر کر پاؤں پر گر پڑتا۔ اپنی اس بے بسی پر پاروتی کو غصہ آ جاتا اور وہ رو پڑتی۔ بس جنگ عظیم فوراً ختم ہو کر صلح کی کارروائی شروع ہو جاتی۔

پاروتی کے بڑھنے کے وقت جب بسنت اس کو بہت پریشان کرتا تو وہ کتاب بند کر کے کہتی۔ ”تو کیا آپ مجھے جاہل رکھنا چاہتے ہیں؟“

”تو تمھاری کربا سے میں ہی کون پنڈت ہو جاتا ہوں“
 یہ سن کر پاروتی اٹھ کر چلنے کے لئے تیار ہو جاتی اور کہتی۔ ”اچھا اب میں سمجھ گئی میری وجہ سے آپ کے پڑھنے میں حرج ہوتا ہے۔ اب میں یہاں نہ بیٹھوں گی لو جاتی ہوں۔“
 بسنت اس کا ہاتھ تھام کر پھر بھالیتا اور کہتا۔ ”اس کا حال تم کیا جانو مجھ کو چھپر کر تم باسانی پڑھنے

لگتی ہو مگر تم کو چھپر کر پڑھنا میرے لئے آسان نہیں ہے“
 ”اچھا جب آپ یہاں نہ رہا کریں گے تو میں پڑھا کروں گی“
 ”یہ تو میں ہرگز پسند نہ کروں گا“
 ”کیوں“

”اس لئے کہ تمہارا جی بڑھنے میں لگ جائے گا تو پھر تم مجھے بھول جایا کرو گی“
 ”واہ! واہ! کیا بات بنائی ہے“

اسی قسم کی لڑک جھونک دونوں میں ہوتی رہتی تھی اس کے بعد کنوار کی الٹی بارش کی طرح رونادھونا شروع ہو جاتا جیسے دھوپ میں کبھی کبھی ترشح ہو کر یکایک بند ہو جاتا ہے اسی طرح پاروتی کا بھی حال تھا پاروتی بھی تھی اور سنستی بھی تھی۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہونا چاہئے وہی ہوا نہ تو بسنت ہی وکالت پاس کر سکا اور نہ پاروتی ہی اپنی پہلی کتاب ختم کر سکی۔

(۳)

پاروتی اور بسنت تو پریم لیلایا میں پھنسے تھے اور رادھا گریہ سستی کے کاموں میں لپی جا رہی تھی اس کو کسی آرام نہ ملتا تھا اگر پاروتی کوئی کام کرنے کے لئے تیار بھی ہوتی تو رادھا کہتی — ”رہنے دو ہورانی! تم کیوں تکلیف اٹھاتی ہو بسنت دیکھ لیکھا تو خفا ہوگا جاؤ جاؤ آرام کرو پڑھ لکھ کر پنڈتائن بن جاؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں بڑھی ہوں تو کیا میں اب بھی گزرتی کا کام تم ایسی نازک بدن لڑکیوں سے زیادہ اچھی طرح سے کر سکتی ہوں۔ جیسے جی بھگوان جگو تمہارا محتاج نہ بنائے“ یہ الفاظ پاروتی کے دل پر تیر کی طرح سے لگتے ان الفاظ میں کتنا زہر پھرا تھا یہ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی لیکن سمجھ کر بھی کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ رادھا کی خواہش تھی کہ ہمیشہ کی طرح پاروتی اس کے اشارہ پر چلے مگر اب یہ مجال تھا پاروتی اپنے شوہر کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی تھی اور اب جبکہ وہ بڑی آزادی سے اپنے شوہر کی محبت کا لطف اٹھا رہی تھی وہ ساس کی خوشامد کیوں کرتی۔ عرصہ تک اسی طرح کام چلتا رہا لیکن بڑیوں کا ڈھانچہ کہاں تک کام دیتا بوڑھی اور کمزور رادھا محنت۔ رنج و غم اور جلن سے بیمار پڑ گئی شروع میں معمولی زکام ہوا اور پھر اسی نے رفتہ رفتہ مملک بیماری کی صورت اختیار کر لی اور رادھا اڑیاں رگڑ رگڑ کر بر لوٹ سدھاری۔ پاروتی اور بسنت کو بہت صدمہ ہوا لیکن رفتہ رفتہ سب رنج و غم دور ہو گیا اور پھر دونوں محبت کے گہوارے میں جھولنے لگے۔ مگر اب یہ وقت پیش آئی کہ گزرتی کا کام کیسے چلے۔ پاروتی آرام طلب ہو چکی تھی جو کارتن تو کمارن کر دیتی تھی لیکن پاروتی کو کھانا پکانا پڑتا تھا کچھ دن تک تو اس نے کسی نہ کسی طرح کام چلایا لیکن پھر بیمار پڑ گئی اب بسنت گھبرا گئے ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کام کیسے چلے۔ پاروتی کے میکے ”بیسڑھی“ میں اسکی ایک چھری بال و دھوا بہن آیا جو اس سے دو چار سال بڑی تھی رہتی تھی۔ بیسڑھی ایک ویران مقام پر چھوٹا سا گاؤں تھا اسی گاؤں میں آیا نامیدی کے تاریک سمندر میں غوطے کھاتی ہوئی باغ کی اس سہیل کی طرح جس کی جڑ پہلے ہی سے کٹی ہوئی ہو اپنے باپ کے ساتھ دن کاٹ رہی تھی مان لڑکپن ہی میں مر چکی تھی۔ ایک دن پاروتی نے آیا کو یاد کیا اور بسنت

سے کہا۔ ”اگر کو تو مایا کو میں یہاں بلا لوں بڑی نیک لڑکی ہے اس سے مجکو بڑی مدد مل جائے گی۔“ بسنت۔ ”بھلا تمہارے چچا اس کو یہاں آنے کی کیوں اجازت دیں گے“ پاروتی۔ ”میری بیماری کا حال سترہ ماہ کو ضرور بھیج دیں گے۔ مایا میری سہیلی ہے اس کے آنے سے میری طبیعت بھی بہل جائے گی“

بسنت نے دوسرے ہی دن مایا کو بلوا بھیجا اور وہ رانی پور آگئی۔ شام کا وقت تھا جب مایا بہلی سے اتر کر پاروتی کے گھر میں داخل ہوئی اس وقت بسنت کسی کام سے باہر نئے ہوئے تھی۔ پاروتی پلنگ پر بڑی تھی مایا کو دیکھتے ہی وہ خوش ہو کر اٹھ بیٹھی۔ ”آؤ جیجی! اچھی تو رہیں تم نے تو کبھی بھول کر بھی میری خبر نہ لی، مایا۔“ بس رہنے دے باتیں نہ بنایہ تو کہتی نہیں کہ سسرال میں اگر ہم غریبوں کو بھول گئی الٹا مجھے الزام دیتی ہے خیر یہ باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی یہ تو بتا کہ تیرا یہ کیا حال ہو گیا۔ جیجی سے اچھی طرح بنتی تو ہے نہ؟ پاروتی نے مسکرا کر کہا۔ ”ہاں خوب۔ پر ماما کا ہزار ہزار شکر ہے“ وہ۔ ”مجھ پر بہت مہربان ہیں مجھے یہاں کسی بات کی تکلیف نہیں۔ رہ گئی میری بیماری کو سچی بات یہ ہے کہ ساس جی ہی گھر کا سب کام کرتی تھیں۔ ان کے مرنے کے بعد سے گریہی کا کام مجکو سنبھالنا پڑا کام کرنے کی عادت نہ تھی اس وجہ سے بیمار پڑ گئی جیجی! میں نے اسی وجہ سے تم کو تکلیف دی ہے کہ تم میرا گھر سنبھال لو مجھ اکیلی جان سے گریہی کا کام نہیں سنبھال سکتا اب تم کو یہاں سے کبھی نہ جانے دوں گی۔“ مگر جیجی! ایک بات کہتی ہوں دیکھو بڑا نہ ماننا تم میری بہن ہو اور میں نے تم کو اسی رشتہ سے بلا یا ہے کہیں کچھ اور خیال نہ کرنا۔“ مایا نے منہ بنا کر کہا۔ ”واہ ری پگلی! بھلا اس میں کون بڑا ماننے کی بات ہے۔ کسی غیر کا تو کام ہے نہیں تو اپنا کام ہے دونوں میں اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ بسنت آگئے۔ مایا نے اس سے پہلے بسنت کو نہ دیکھا تھا وہ خاموش ہو گئی،“

پاروتی نے بسنت سے کہا۔ ”یہ لو میری مایا جیجی آگئیں۔ اب میری طبیعت اچھی ہو جائے گی۔“ بسنت نے مسکرا کر کہا۔ ”ضرور۔ کہو جیجی اچھی تو رہیں“ مایا نے کچھ شرمناک جواب دیا۔ ”ہاں بھیتا“

تعارف ہو جانے کے بعد سب نے کھانا کھایا۔ پاروتی اور بسنت تو اپنے کمرہ میں چلے گئے اور مایا کو ایک دوسرا کمرہ جو ان کے کمرہ سے کچھ دور پر تھا رہنے کو مل گیا۔ دن بھر کی تھکی مایا بہت جلد نندیا دیوی کی گود میں سو گئی۔

(۴)

رات میں تو مایا کو گھر دیکھنے کا اچھی طرح سے موقع نہ ملا تھا صبح کو اس نے دیکھا کہ گھر بہت ردی حالت

میں ہے۔ صحن میں کوڑا کرکٹ کا انبار لگا ہے رسوئی گھر میں کوئی چیر، سلیقہ سے نہیں رکھی ہوئی ہے۔ مایا نے سب سے پہلے گھر کی صفائی کی بسنت کے کمرہ کو صاف کیا اور پھر کھانا پکایا۔ اس دن بسنت نے کھانا کھایا تو بہت تعریف کی پاروتی بھی بہن کی تعریف شکر بہت خوش ہوئی۔ اب وہ پھر آزاد ہو گئی اسے کوئی کام نہ کرنا پڑتا تھا اس نے بھنڈار خانہ کی کچی مایا کو دیتے ہوئے کہا۔ ” بسن جچی اب میں بے فکر ہو گئی اب تم میرا گھر سنبھال لو گی۔“

مایا نے لہجی داپس کر نیکی کو شش کر لے ہوئے کہا۔ ” نہیں پاروتی! اس کو تم اپنے پاس ہی رکھو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

پاروتی۔ ” بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کچی تم اپنے ہی پاس رکھو۔ کیا تم مج کو اپنی بہن نہیں سمجھتی ہو؟“

مجبوراً مایا نے کچی لے لی۔ اب مایا ہی تمام گھر کا انتظام کرتی تھی اس نے تھوڑے ہی دنوں میں پاروتی کا گھر بنا دیا وہی گھر جو پہلے گندگی کا مخزن تھا اب رشک چمن بن گیا۔ پاروتی اور بسنت سوتے ہی رہتے لیکن مایا علی الصبح اٹھ کر ان کے کمرہ کو صاف کر آتی بسنت کی کتابیں جو ادھر ادھر بے ترتیبی سے بڑی رہتیں ان کو بٹھکانے سے رکھ آتی۔ مایا کی سلیقہ مندی نے آہستہ آہستہ بسنت کے دل میں جگہ پیدا کر لی تھوڑے دن تک مایا بسنت سے بے تکلف نہ ہوئی ایک دن پاروتی نے مایا سے کہا۔ ” جچی! تم ”اُن“ سے شرمانی کیوں ہو ان سے خوب کھل کر باتیں کیا کرو۔“

مایا اس کے جواب میں مسکرا کر چپ ہو گئی اتفاق سے بسنت بھی اس موقع پر آگے اور انہوں نے بھی شکوہ کیا کہ مایا اُن سے کیوں بات نہیں کرتی۔ اس دن سے مایا بسنت سے کچھ کچھ باتیں کرنے لگی اور رفتہ رفتہ وہ اس کے بے تکلف ہو گئی۔ پہلے وہ اس جگہ سے ہٹ جاتی تھی جہاں مایا اور بسنت ہنستے بولتے تھے روکنے سے بھی نہ ٹھیرتی تھی مگر اب وہ ان کی ہنسی مذاق میں بھی حصہ لینے لگی۔ جب پاروتی کبھی بسنت کا مذاق اڑاتی تو مایا بھی پاروتی کا ساتھ دیتی۔ میل جول اور بات چیت ہی سے کسی کی خوبی یا بُرائی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بسنت کی ٹنگا ہوں میں مایا کی قدر و وقعت بڑھنے لگی اب اُسے مایا کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی خوبی نظر آنے لگی۔

مایا نے بائیسویں سال میں قدم رکھا تھا اس لحاظ سے وہ ایک شگفتہ بھول تھی لیکن ایسا بھول جو عموماً دوپہر کے وقت کالمتا ہے اور دھوپ سے مر جھانے لگتا ہے۔ مایا کے خوشنما چہرہ پر ایک خاص قسم کی رونق ضرور تھی لیکن ایسی رونق جو عموماً دوپہر کے وقت پھولوں پر ہوتی ہے جن پر صبح کی شبنم سے بنائے ہوئے پھولوں کی صباحت اور نسیم سحری کے پنکھا جھلے ہوئے تازگی کے آثار کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ مایا کی آنکھوں میں نشہ شباب سے سُرخ دُورے دوڑ رہے تھے۔ مگر ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ اور مانگ میں سُہاگ کی لکیر نہ تھی کیونکہ وہ بیوہ تھی اور ایسی بد نصیب بیوہ جس کا سہاگ لڑکپن ہی میں اُجڑ گیا تھا۔ اور اب وہ بیوگی کی آگ میں جل رہی تھی۔

اس کے حسن و شباب پر خزاں نے اپنا قبضہ جما رکھا تھا۔

عرصہ تک پانی نہ ملنے سے جس طرح پودا مرجھانے لگتا ہے لیکن پانی پاتے ہی وہ لہلہا اٹھتا ہے۔ وہی حال مایا کا بھی ہوا جب اس پر پاروتی کی محبت اور بسنت کی عنایت کی بارش ہوئی تو اس کا غنچہ اول کھل اٹھا اس کے چہرہ پر شگفتگی آگئی۔ گلاب کے پھول پر گرد جم گئی تھی ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے نے وہ گرد اڑا دی اور پھول نکھر کر خوبصورت معلوم ہونے لگا۔

برنگھارت کی اندھیری رات تھی زینداری کے کام سے بسنت کسی دوسرے گاؤں میں گیا ہوا تھا واپس ہونے میں اُسے بہت دیر ہو گئی۔ مایا کھانا پکا کر پاروتی کے کمرہ میں بیٹھی ہوئی ادبزد ہر کی باتیں کر رہی تھی پاروتی نے کہا۔ ”رات زیادہ ہو گئی ہے آسمان گھرا ہے پانی برسے والا ہے مگر وہ، اب تک واپس نہیں آئے“ مایا۔ ”آئے ہی ہوں گے“

پاروتی۔ ”میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے میں تو اب سوتی ہوں وہ آئیں تو بھوجن پر وس دینا۔ تکلیف تو ہوگی“

”نہیں نہیں تکلیف کس بات کی اچھا تم آرام کرو“ یہ کہہ کر مایا رسوئی گھر میں چلی گئی اور آرام طلب مایا نفوڑی دیر میں خواتین بیٹھ گئی۔ بجلی کی جھک اور بادل کی گرج میں بسنت گھر میں داخل ہوا اب مایا بھی برسے لگا تھا مایا نے رسوئی گھر سے نکل کر کہا۔ ”پارو (پاروتی) کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ آپ کا انتظار کر کے سو گئی کئے بھوجن پر وس دوں“

”اور تو کیا تم اب تک میرے ہی انتظار میں بیٹھی ہو“

مایا کے رنگینے ریسے ہونٹ اس کا جواب دینے کے لئے پھٹک اٹھے لیکن وہ صرف ”جی ہاں“ کہہ سکی۔ اس وقت بجلی پھر پھکی سفید دھوئی میں مایا کا چہرہ جگمگا اٹھا بسنت کی آنکھیں چوندھیا گئیں بسنت نے سنبھل کر کہا۔ ”اچھا میں رسوئی گھر ہی میں آتا ہوں وہیں بھوجن کروں گا کمرہ میں کھانا لانے کی ضرورت نہیں“ بسنت کپڑے بدلنے کے لئے اپنے کمرہ میں چلا گیا اس عرصہ میں مایا نے جلدی جلدی آگ جلا کر گرم گرم پوریا تل ڈالیں۔ بسنت آیا تو اس نے آسن بچھا کر بھوجن پر وس اور بسنت کے سامنے رکھ دیا۔ آج خلاف معمول بسنت کو ہمیشہ سے زیادہ کھانے میں مزہ ملا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ”مایا! اُف مایا! کتنی ہنرمند۔ سلیقہ شعار اور دلکش لڑکی ہے۔ اس کی آنکھوں میں توجہ و بھرا ہے“ بسنت نے نظر اٹھا کر مایا کی طرف دیکھا وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی بسنت کی زبان سے بے خودی میں نکل گیا۔ ”مایا!“ مایا نے سر اٹھا کر بسنت اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا دونوں کی نظریں لڑکیوں مایا کا نپ اٹھی بسنت کا دل مچل اٹھا۔ اس کی زبان سے نکل گیا۔ ”آہ تم کتنا اچھا کھانا پکاتی ہو اور کھانے ہی کا کیا ذکر تمھاری تو ہر بات بہت اچھی معلوم ہوتی ہے

اور کیوں نہ ہو جب تم خود اچھی ہو۔۔۔۔۔“ مایا نے شرما کر سر جھکا لیا وہ پھر بسنت سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ کر سکی
 ” اور کیوں نہ ہو جب تم خود اچھی ہو۔۔۔۔۔“ یہ صدا اس کے کانوں میں بار بار گونجنے لگی۔ آج تک کسی مرد نے
 اس سے ایسی باتیں نہ کی تھیں۔ ایسی باتیں اس کے لئے معیوب تھیں۔۔۔۔۔ مگر اس وقت مایا کا جی چاہتا
 تھا کہ بسنت برابر ایسی ہی باتیں کرتا رہے۔

کھانا کھانے کے بعد جب بسنت منہ ہاتھ دھو چکا تو مایا نے پان دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ بسنت نے اس
 کی انگلی کو دبا دیا مایا کو ایسا معلوم ہوا گویا پھونے ڈنک مار دیا اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور سوئے پھر نکل
 کر اپنے کمرہ کی طرف بھاگی تمام صحن میں پانی بھرا تھا اس کا پاؤں پھسلا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑی بسنت
 نے جلدی سے دوڑ کر اسے اٹھالیا۔ مایا کی ناگن کی طرح لہرائی ہوئی لٹیں بسنت کے رخساروں کا بوسہ لینے
 لگیں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مایا تڑپ کر بسنت کی آغوش سے جدا ہو گئی۔ شرم و غیرت سے وہ
 تھر تھر کانپ رہی تھی۔

بسنت نے کہا۔۔۔۔۔ ” کہیں چوٹ تو نہیں لگی“

” نہیں“ کہتی ہوئی مایا دوڑ کر اپنے کمرہ میں کھس گئی اور اندر سے زنجیر لگا دی۔ وہ تمام رات روتی رہی۔
 غیرت شرم و لحاظ۔ ڈر رسوائی یا اپنی سبکدوشی پر، یہ معلوم نہیں۔ ادھر بسنت کی بھی ساری رات بڑی بے چینی
 سے گذری۔۔۔ ” کیا میں نے کوئی پاپ کیا ہے؟“ وہ گر بڑی تھی اس کو اٹھانا کیا میرا فرض نہیں تھا۔
 مگر۔۔۔ کیا میں پاروتی کو دھوکا نہیں دے رہا ہوں۔۔۔ کہیں بابا میری شکایت پاروتی سے نہ کر دے۔۔۔
 اُف پھر تو میں منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاؤں گا۔ مگر اُدھ! شکایت بھی کر دے گی تو میرا کیا ہوگا۔۔۔“
 بسنت کی ساری رات اسی ادھیڑ بٹن میں گذری۔

(۵)

اس کے بعد کئی دن تک پھر بسنت کو مایا سے ملنے کا موقع نہ ملا یا خود مایا ہی تنہائی میں بسنت کے پاس نہ
 گئی۔ بسنت کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ مایا نے پاروتی سے اس کی شکایت نہیں کی تو وہ دل میں بہت خوش
 ہوا۔ اور اب اس کی ہمت بڑھ گئی لیکن جتنا مایا کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا مایا اتنا ہی اس سے دُور
 بھاگتی مگر یہ حالت بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ برسات میں ندی جب جوش بر آتی ہے تو اس کی تھانہا نہیں
 ملتی پھر بھی ملاح تھانے لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح مایا بھی بسنت کے دل کی تھانہا لے رہی تھی وہ عورت
 تھی اور ایسی عورت جس کا سہاگ اجر چکا تھا جو سماج کی ستانی ہوئی تھی جس نے محبت کا کبھی مزہ ہی نہ چکھا
 تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے دل میں محبت کے جذبات نہ تھے یا اس کا دل محبت سے خالی تھا وہ

پریم کی پیاسی تھی اس کی دلی خواہش تھی کہ کوئی اس سے محبت کرے اور وہ بھی اس کے بدلے میں اپنی محبت پیش کرے لیکن سماج کے ڈر سے اُسے اس کا موقع ہی نہ ملتا تھا وہ اپنی خواہش کو دبائے ہوئے تھی مگر جب سماج ہی نے اس کا موقع دیا تو اس کے دل سے محبت کا دریا پھوٹ نکلا۔ اتفاق سے وہ ایسے گھر میں پہنچی۔ جہاں اس کو سماج کے ایک خوش مزاج مرد نے شراب محبت کا پیالہ پیش کیا وہ انکار نہ کر سکی۔ جس طرح راکھ میں دبی ہوئی چنگاری ذرا سا کر دینے سے چمک اٹھتی ہے اسی طرح مایا کی محبت کی آگ بھی بھڑک اٹھی جس نے شرم و کاٹا اور خوف رسوائی کو جلا کر خاک کر دیا۔

بسنت کا عجیب حال تھا اب اس کو مایا کا لب و لہجہ اتنا دلکش اور سرور انگیز معلوم ہوتا کہ اس پر ایک بخودی سی طاری ہو جاتی مایا کے ایک ایک سنتھ میں بسنت نے وہ اثر محسوس کیا کہ بھولی بھائی پاروتی کی پریم رس میں بھری باتیں اسے پھینکی معلوم ہونے لگیں پتے ہوتی کی آب و تاب کو جھوٹے موتی کی عارضی چمک نے ماند کر دیا۔ شرابی نشہ کے بعد درمیان ہی میں خمار آنے پر پھر شراب پینے کی خواہش کرتا ہے تاکہ رنگ جمار ہے مگر یہ نشہ پاروتی کہاں سے لائے وہ مایا کے جال سے بے خبر تھی بسنت کی طرف سے اس کو اطمینان تھا اپنی بہن پر پورا بھروسہ تھا عین اس خمار کی حالت میں جب مایا نے پُرانی شراب نئے رنگین پیالہ میں بھر کر ایک عجیب ادا سے بسنت کو پیش کی تو وہ مدہوش ہو گیا اس کا سر ساقی کے قدموں پر تکیا گیا بسنت کی مدہوشی نے مایا کے قدموں کو بھی ڈمگادیا بہت کوشش کرنے پر بھی وہ سنبھل نہ سکی اور خود بھی نشہ میں چور ہو گئی

سرد رات تھی صاف شفاف دن تھا آسمان نیلگوں تھا دو پہر کے سنائے میں پاروتی سو رہی تھی۔ مگر جوانی سے دیوانی مایا اپنی آرام گاہ میں فرشی تکیہ کے سہارے لیٹی ہوئی اپنے مستقبل کے متعلق کچھ سوچ رہی تھی اس وقت اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس کے سر پر کوئی کپڑا بھی ہے یا نہیں۔ وہ ایک نیمہ آستین اور سفید دھوتی پہنے ہوئے تھی وہ ہوتی سر سے سرک کر کمر کے گرد لپیٹ گئی تھی اور نیمہ آستین بھی اپنا فرض اچھی طرح سے نہیں ادا کر رہی تھی۔ اتفاق سے بسنت کسی کام سے مایا کے کمرہ کی طرف نکل گیا سو اتنی کو دیکھ کر متوالا پھینچا آپے میں رہے یہ جہاں ہے مایا کے پانگ سے دو قدم کے فاصلہ پر پہنچ کر بسنت ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ سب بناؤ اسی کو تڑپانے کے لئے کئے گئے ہیں اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ ”اؤں مایا! اس وقت تم کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی ہو“ یہ کہتے ہی اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مایا کو گلے لگانا چاہتا ہے۔ مایا گھبرا کر اٹھی اور بسنت سے دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ خوف اور شرم سے اس کے چہرہ کا رنگ غروب ہونے والے آفتاب کی طرح سُرخ ہو گیا اس نے کمرہ سے باہر نکل جانے کے لئے قدم بڑھایا مگر بسنت نے روکتے ہوئے کہا۔ ”مایا! ہاتھ جوڑتا ہوں ٹھیر جاؤ۔ صرف تھوڑی دیر کے لئے ٹھیر جاؤ۔“ مایا کے قدموں

میں جیسے کسی نے زنجیر ڈال دی بسنت کی محبت آمیز آواز سنکر ماؤں ہی نہیں بلکہ سارے بسم نے ایک مٹی کے بنے ہوئے بت کی سی شکل اختیار کر لی۔ بسنت نے جرات کر کے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مایا کے کندھوں پر کھینچے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ بسنت کے چھونے سے ماما کے دونوں گال سُرخ اور پیشانی پسینہ سے تر ہو گئی اس کی تمام شوخی اور تیزی نہ جانے کہاں چلی گئی اور وہ منتر کے بس میں آئی ہوئی ناگن کی طرح سر جھکا کر خاموش کھڑی رہ گئی۔ بسنت نے مایا کے گلانی گالوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا — ”کیا مجھ سے خفا ہو؟“

”نہیں —“

”تو پھرتے کیوں دور بھاگتی ہو۔ مجھ سے ہنس کر باتیں کیوں نہیں کرتی ہو۔“

”مجھ سے باتیں کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ مجکو میرے حال پر بڑا رہنے دیجئے۔ اگر آپ کی یہ منشاء ہے کہ میں اس گھر کو چھوڑ دوں تو اچھی بات ہے میں کل بسیرٹی چلی جاؤں گی۔ اچھا بس اب آپ یہاں سے چلے جائے۔“

”میں کیا کروں اپنے دل کے ہاتھوں سے مجھ کو ہوں مایا!“

”ایسے دل کو نکال کر پھینک دیجئے جو پاپ ساگر کی طرف لئے جا رہا ہو۔“ یہ کہ کر مایا نے بسنت کے دونوں ہاتھوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیا اور کسی قدر ہٹ کر بولی۔ ”آپ کا کیا بگڑے گا آپ مرد ہیں مگر میں دکھایا تو نہیں کی نہ رہوں گی، سماج میں کہیں مجھے تنگ نہ لے گی۔“

”اوندھ! سماج کا کیا ذکر۔ سماج کو میں ٹھیک کر لوں گا اس کو ہمارے تعلقات کا پتہ ہی نہ چلنے پائے گا۔“

”جی ہاں پتہ نہ چلنے پائے گا۔ یہ خوب کہی! آپ کو باتیں بنانی خوب آتی ہیں مگر میرے حال پر کر پائیجئے اور فوراً یہاں سے چلے جائے کہیں پاروتی آگئی تو میں منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاؤں گی۔“

بسنت نے تو یا کچھ سنا ہی نہیں اس نے مایا کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”تو اچھا صرف دو منٹ جی بھر کر اس چاند سے مکھڑے کو تو دیکھ لینے دو۔“

زور سے جھٹکا دے کر مایا نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پاروتی کے کمرہ میں چلی گئی۔

(۶)

اب پاروتی کو بسنت گویا بھول گیا تھا وہی پاروتی جسکو وہ کسی وقت اپنی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل نہ ہونے دیتا تھا وہی پاروتی جس کے لئے اس نے اپنی ماں کی بھی کچھ پرواہ نہ کی تھی اب دن رات اپنے کمرہ میں پڑھی رہتی تھی۔ بسنت کے دل کا حال اس سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ بسنت اب پاروتی سے بہت کم بولتا تھا کچھ عرضہ تک تو اس نے پاروتی کا لحاظ کیا لیکن پھر اس نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اب اس کا زیادہ وقت مایا سے ہنسی مذاق میں گذرتا تھا۔ ہر وقت اس کی زبان پر مایا ہی کی تعریف رہتی تھی۔ وہی پاروتی جو کبھی مایا کی تعریف سن کر

خوش ہو ا کرتی تھی وہی اب مایا کی تعریف سن کر جلنے لگی۔ اب تو اُسے مایا کی صورت سے بھی نفرت ہو گئی۔ مرد کے دل کو کس طرح سے اپنے قابو میں کیا جاسکتا ہے۔ مرد کس بات سے خوش ہوتا ہے یہ اس کو معلوم نہ تھا بسنت اس کو بغیر کسی کوشش اور محنت کے بڑی آسانی سے مل گیا تھا اب اس کو مایا کے جال میں پھنسا دیکھ کر پاروتی تلملا اٹھی لیکن پھر بھی اس نے وہ طریقہ اختیار نہ کیا جس سے مایا کا جال ٹوٹ جاتا بلکہ اس کی نا تجربہ کاری نے اسے غلط راستہ پر ڈال دیا بسنت کو سنبھالنے کے بجائے وہ مایا سے لڑنے کو تیار ہو گئی اب وہ اٹھتے بیٹھتے مایا کو طعنہ دینے لگی لیکن مایا نے کچھ بڑا نہ مانا اس نے پاروتی کے طعنوں کو بڑی خندہ پیشانی سے سنا اور خاموش رہی۔ پاروتی کی یہ حرکت بسنت کو بہت بڑی معلوم ہوئی اور اُس نے پاروتی کو بہت لعنت طامت کی اور ضد میں آکر پاروتی سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا اب ہر کام مایا ہی کے اشارہ پر کرتا مایا ہی کی خاطر داری اور ناز برداری اس کی زندگی کا خاص مقصد ہو گیا اب مایا ہی گھر کی ملکہ تھی لیکن مایا ہمیشہ پاروتی کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی مگر اس کا نتیجہ اُلٹا ہی ہوتا تھا ایک دن پاروتی نے مایا کو خوب گالیاں سنائیں مایا جو اب تک خود کو سنبھالے ہوئے تھی گالیاں سن کر اپنے غصہ کو نہ ضبط کر سکی اس نے کہا ” زبان سنبھال کر بات کر“

”مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی“ پاروتی نے منہ بنا کر کہا۔

”کیسی؟“

”خود اپنے دل سے پوچھ لو“

”میں کچھ نہیں سمجھی“

”سمجھ کر بھی نہ سمجھو تو بھلا کوئی کیسے سمجھا سکتا ہے“

”توصاف صاف کیوں نہیں کہتی ہو دل میں رکھنے سے کیا فائدہ۔ میں تو تمہاری خدمت کرنے یہاں آئی تھی اگر اب تم کو میری خدمت کی ضرورت نہیں ہے تو مجھے بسیرا بھی بھیج دو۔ یہ روز روڈ کے طعنے شکوے مجھ سے اب نہیں سنے جاتے“

”میں نہ کہوں مگر دنیا کی کون زبان بند کر سکتا ہے۔ مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ خدمت کے صلہ میں تم میرے بیٹی کو مجھ سے چھین لو گی اگر مجھے یہ پہلے معلوم ہوتا تو میں تم کو ہرگز نہ بتلاتی۔“

مایا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ”پاروتی تمہارا خیال غلط ہے۔ پر مانتا جانتا ہے کہ میرا دل اب تک پاک ہے۔ تمہارا سوامی تم کو مبارک رہے“

”جی! باتیں نہ بناؤ۔ میں تمہاری جہاں کو خوب سمجھتی ہوں پہلے تو مایا کے جال میں پھنسا دیا اور اب کہتی ہو کہ تمہارا سوامی تم کو مبارک رہے“

مایا کی بھنویں تن گئیں اس نے تڑپ کر کہا۔ ” پارو! سچ کہتی ہو عورتوں کی ذات ہی مایا دنی ہوتی ہے۔ مجھ میں کیا مایا تھی یہ تو میں نہ جان سکی مگر تم نے جان لیا۔ اسی طرح تم میں کیا مایا ہے تم نہیں جان سکتیں مگر میں واقف ہو گئی۔ مجھ میں مایا ضرور تھی ورنہ ایسی نوبت کبھی نہ آتی میں نے کچھ جان کر اور کچھ نہ جان کر پھیندا ڈالا ہی مگر اس میں میری کوئی خطا نہیں تم نے ہی مجھے اس کا موقع دیا ہماری جاتی کا دہرم ہی ایسا ہے۔ میں نے قسم بھی کھائی لیکن تم نے یقین نہ کیا ابھی بات ہے اب ہوشیار ہو جاؤ میں اب بتا دوں گی کہ مجھ میں کیا مایا ہے۔“

اتنا لکڑ غرور۔ غصہ اور نفرت کی شکست سے مایا رو پڑی وہ پاروتی سے اور کچھ نہ کہہ سکی جلدی سے اٹھی اور اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ رہی۔ شہد کی مکھی جب ضد پر آتی ہے تو جو بھی اس کے سامنے آئے اُسے کاٹ کھاتی ہے اسی طرح غصہ سے بھری ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی مایا بھی پاروتی کے گھر میں آگ لگانے کے لئے تیار ہو گئی اگر اُسے سکھ نہیں ملا تو وہ بھی اس کو جو اس کی راہ میں کانٹا ثابت ہو گا جلا کر خاک سیاہ کر دے گی۔

(۷)

اُس دن مایا دن بھر اپنے کمرہ سے باہر نہ نکلی۔ شام کے وقت بسنت نے جب مایا کو نہ دیکھا تو اس نے گھر کی کنارن سے دریافت کیا اس نے پہلے تو پھپھانا جاہا لیکن جب بسنت نے بہت مجبور کیا تو کہا۔ ” وہ اپنی کوٹھڑی میں ملکن سے کچھ بات ہو گئی ہے مگر کون بات ہوئی ہے یہ مجکو نہیں معلوم، رام جانیں“

بسنت کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس نے پاروتی سے جا کر غصہ میں پوچھا۔ ” مایا کہاں ہے؟“

” واہ ری مایا! مایا ہی سب کچھ ہے میں کچھ نہیں بہت دنوں کے بعد بات بھی کی تو وہی مایا کا ذکر! سچ ہے مرد کی ذات بڑی بے وفا ہوتی ہے۔“ یہ سوچ کر پاروتی کے دل پر چوٹ لگی اور اس نے تڑپ کر جواب دیا۔

” میں کیا مایا کے پیچھے پھر کرتی ہوں۔ تمہارے دل میں تو ہر وقت مایا بسی رہتی ہے اُسی دل سے پوچھ لو کہ مایا کہاں ہے؟“

غصہ کے مارے بسنت کا بڑا حال ہو گیا۔ سچی باتیں ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہیں مرد ہو کر وہ اپنی عورت سے شکست ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اُس نے بھی جل کر کہا۔ ” مایا میرے دل میں ہے یا نہیں یہ تو پر مانتا جانے لیکن اتنا میں ضرور جاننا ہوں کہ تم مایا کے جلن میں جلی جا رہی ہو اس کی خوبیاں تمہاری آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہی ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ تم مایا کا کسی بات میں مقابلہ نہیں کر سکتی ہو۔ اب اس ضد میں تو میں تم کو اور جلاؤں گا دیکھوں تم میرا کیا بگاڑ سکتی ہو۔ راتی روٹھیں گی اپنا سماگ لیں گی اس کے سوا اور کیا ہوگا؟ تم بے فائدہ مایا سے لڑا کرتی ہو اور آج بھی لڑی ہو یہ مجھے معلوم ہو گیا یا درکھنا اس کا نتیجہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔“ اتنا لکڑ بسنت مایا کے کمرہ میں پہنچا۔ پاروتی کی آنکھیں کھل گئیں نتیجہ کا خیال کر کے وہ کانپ اٹھی۔

بات اتنی بڑھ جائے گی یہ اس نے نہ سوچا تھا اس وقت بسنت کی دھکی سن کر وہ پریشان ہو گئی اس کی آنکھوں میں سارا جہان تاریک معلوم ہونے لگا اس نے اپنے دہڑکتے ہوئے دل کو سنبھالا اور کچھ سوچ کر مایا کے کمرہ کی طرف چلی۔ فتح ہو گئی یا شکست۔ یہ سوچنے کا موقع نہ تھا مگر مایا کی یہ بات کہ ”ہم عورتوں کی ذات ہی مایا دنی ہوتی ہے“ اُسے یاد آگئی۔ پاروتی بھی عورت تھی اس میں بھی کوئی نہ کوئی مایا ہوگی پاروتی بھی اپنی مایا کا امتحان دینے کے لئے تیار ہو گئی۔ مایا کے کمرہ کا دروازہ کھلا تھا اور وہ پلنگ پر منہ لیٹے پڑی تھی۔ پاروتی دروازہ ہی پر پھپکے کھڑی ہو گئی کہ بسنت اُسے نہ دیکھ سکے۔ مایا نے کڑی لبنت لے کہا۔ ”مایا!“

محبت بھری آواز سن کر پیار کا دریا لہریں مارنے لگا وہ لہریں لطیف تھیں ان سے رگوں میں محبت کا رس دور لگیا مایا نے سر اٹھا کر بسنت کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر منہ چھپا لیا بسنت نے عاجزانہ لہجہ میں کہا۔ ”مایا! سچ بتاؤ آخر کیا بات ہے۔ کیا تم کو پاروتی نے کچھ کہا ہے“

مایا نے کچھ جواب نہ دیا مگر وہ رو پڑی۔ بسنت نے بیتاب ہو کر کہا۔ ”مایا! مایا! مت روؤ۔ ہاتھ جوڑتا ہوں مت روؤ۔ میں تمھاری یہ حالت نہیں دیکھ سکتا میری ہی وجہ سے تم کو بے فائدہ باتیں سننی پڑتی ہیں لیکن اب آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا پاروتی بے وقوف ہے۔ نالائق ہے۔ میں اب اسکو ایسا سبق دوں گا کہ وہ بھی عمر بھر یاد رکھے گی۔ تم کو رنج کر نیکی کوئی ضرورت نہیں ہے لو بس اب اٹھو میں پاروتی کو اسی وقت گھر سے۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ بسنت کو کہنے کا موقع نہ ملا پاروتی یکایک کمرہ میں داخل ہوئی اور مایا کے قدموں پر گر کر رونے لگی وہ بڑی مشکل سے اتنا رک رک کہ سکی۔ ”جی! مجھے معاف کر دو اب میں تمھارے دل کو کبھی نہ دکھاؤں گی۔۔۔۔۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔۔۔۔۔ تم میری بڑی بہن ہو میری کھٹا کرؤ مایا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ بتی ورتا پاروتی کے چہرہ پر دکھ کی جھلک تھی ہوئی آگ دیکھ کر مایا کے دل میں ایک بھگتی پیدا ہوئی۔ رنج و غم کے پے ہوئے پانی میں نیانی ہوئی بھولی بھالی پاروتی نے پراچین زمانے کی دلیلیوں کی طرح اپنے من کو لار دیا اب وہ سمجھتی عورت نہیں تھی بلکہ سنی سادھی عورتوں کی طرح ہڈی تھی۔۔۔۔۔ وہ ہار کر جیت گئی اور مایا جیت کر بھی ہار گئی۔ جب آگ بہت تیز ہوتی ہے تو پانی کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ پاروتی بچوں کی طرح سے ہلک ہلک کر رو رہی تھی مایا نے اُسے زور سے اپنے کلبہ سے لگا لیا۔ مایا کا جال آنا فنا ٹوٹ گیا۔ یہ موثر سین دیکھ کر پھر بسنت سے کمرہ میں نہ ٹھیرا گیا وہ دبے پاؤں باہر نکل گیا۔

(۸)

بھادوں کی اندھیری رات تھی گھر کے سب لوگ سو رہے تھے مایا چپکے سے اٹھی اور دبے پاؤں پاروتی کے کمرہ میں پہنچی وہاں پہونچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے بڑی مشکل سے اس نے اپنے دل کو سنبھالا اور بھنڈا خانہ کا کئی پاروتی کے آپنل میں باندھ دی ایک مرتبہ حسرت بھری نظروں سے بسنت کی طرف دیکھا اور پھر وہاں سے نکل کر

اور پھر ہمیشہ زندہ رہیں گے کیا تمہارے پاس ان مذہبی عقائد کا جو انسانوں کو مصائب زندگی برداشت کرنے کی طاقت بخشتے ہیں کوئی نعم البدل موجود ہے؟ عقلیت پسند کے پاس اس الزام کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ آئے اس پر غور کریں۔

(۱)

منکر خدا واقعی کسی ایسی ہستی کا قائل نہیں ہے جو قادر مطلق ہو یا رحم و محبت کا مجسمہ ہو۔ وہ اس خیال کو اپنے دماغ میں جگہ نہیں دے سکتا کہ ایسی کائنات کا جیسی کہ ہمارے سامنے ہے کوئی خالق ہو سکتا ہے کیونکہ ایک کامل خالق کی پیدائی ہوئی کائنات بھی کامل ہونی چاہئے تھی اور تمام مخلوق کو مکمل اور عیوب و نقائص سے مبرا ہونا چاہئے۔ درانحالیکہ جدید طبیعی تحقیقات ہم کو یقین دلاتی ہیں کہ یہ کائنات یعنی نظام ثوابت مع کرہ زمین کے قطعی مکمل نہیں اور مکمل ہونا کیسا جبکہ ابھی تک ان کا دور تعمیر ہی ختم نہیں ہوا اور روز کے طبیعی مشاہدات اس کے ثبوت میں پیش کئے جاسکتے ہیں لزلوں کا آنا، آتش فشاں پہاڑوں کا پھوٹ ٹکنا، سواحل سمندر کا ابھرا بھر کر ڈوبنا، آہستہ آہستہ پہاڑوں کا سمندر میں پھونچ جانا، پہاڑوں کی جگہ وادیاں اور وادیوں کی جگہ پہاڑ بن جانا، جو بے شمار قرون سے جاری ہے اور آئندہ بیشتر قرون تک جاری رہے گا۔ کیا اس عدم تکمیل کا کافی ثبوت نہیں۔ اور آگے چلے۔ کرہ ارض میں قطبین مقناطیسی کا انتقام مقام، نیز اس کے قطبین ہندسی کا تغیر، زمین کے محور کا اپنے دائرۃ البروج کے مقابل بائیں ہو کر کرہ ارض میں تبدیلیاں پیدا کرتے رہنا اور نسل انسانی کے واسطے بے شمار مصائب و آلام کا باعث ہونا یہ ثابت نہیں کرنا کہ کرہ ارض کی تخلیق ہونے کس درجہ نامکمل و ناقص ہے۔ پھر لوں دیکھئے کہ دنیا میں ہر مخلوق اعلیٰ سے اگلے تک زندہ رہنے کے لئے اس بات پر مجبور ہے کہ دوسری مخلوق کو تباہ کرے اور کھا جائے۔ اور اس طرح دنیا میں ایک بیرحمانہ قتل ایک بے پناہ خونریزی اور ایک وحشیانہ سعی فتنہ دی جا رہی ہے۔ اور ہر چیز محض زندہ رہنے کے لئے اس جدوجہد میں مصروف ہے کہ اپنی ہستی قائم رکھنے کے حق کو دوسروں سے بہ جبر تسلیم کرے۔ ہر ظاہر ہے کہ ان حالات کے ماتحت کسی ایسے خدا کا تصور جو بیکسر محبت و درافت بتایا جاتا ہے کیونکر ممکن ہے۔ عقلیت پسند، خدا پر اعتقاد رکھنے والے کو یقین دلاتا ہے کہ ایسے خدا کی کوئی ہستی موجود نہیں ہے جو مکمل دانائی انصاف اور محبت کی صفات سے متصف ہو اور نہ کوئی ایسی شخصیت موجود ہو جو اس ذرہ بے مقدار انسان کی کوششوں کے نتائج اور انجام پر حکمراں ہو۔ ان باتوں کو منکر معتقد کانپ اٹھتا ہے۔ اور خوف و ہراس کی حالت میں آسمان کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے کیونکہ اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا تمام نظام اجتماعی کی بنیادیں منہدم ہو گئی ہیں۔ لیکن عقلیت پسند اپنا نہایت مدلل اور ہمت افزا جواب پیش کرتا ہے کہ یا لوسی کی کوئی وجہ نہیں بلکہ برخلاف اس کے نسل انسانی کی نجات اسی خیال میں مضمر ہے کیونکہ وہ کامل دانائی جس کے متعلق فریب خوردہ انسان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ عرش متعال سے حکومت کر رہی ہے خود اسی کے اندر موجود ہے

وہ کامل انصاف جس کے واسطے آپ فلک الافلاک کی طرف نگاہیں اٹھا رہے ہیں حقیقتاً خود آپ ہی کے اندر موجود ہے اور وہ کامل محبت جس کے متعلق آپ کا یہ خیال ہے کہ اس کائنات پر حکمران ہے، خود آپ ہی کے دل میں پوشیدہ ہے۔ جو کچھ انسان نے ہزار ہا سال کے افکار کے بعد کیا وہ صرف یہ ہے کہ اس نے اُس چیز کو جو خود اسی کے پہلو میں پائی جاتی ہے خلافت عقل طریقوں سے استدلال کر کے عالم موجودات سے باہر لامکان میں پہونچا دیا، وہ ہزار ہا سال تک ایک غلط فہم غلطی میں مبتلا رہا لیکن آج جبکہ وہ اپنی اُس غلطی کو دور کرنا چاہتا ہے، اس کو بجز اس کے اور کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ کہ اس نور دانائی کو ہستی سے اٹھا کر بلند ترین سطح پر پہونچا دے یعنی اب اس کا کام یہ ہے کہ اس اپنی اور آئیو الی نسل کے قوائے دماغی کو معقول تعلیم کے ذریعہ سے کامل بنائے۔ اور انصاف کی شیخ مردہ کو اور اس کی چراغ سحری کو آفتاب کی طرح روشن اور منور کرے، نا انصافی اور ناراستی کی تاریکی کو جو کر دے یہاں تک کہ تمام نسلی امتیازات، تمام اقتصادی ناہمواریاں ایک ہموار سطح پر آجائیں، اور تمام تعصبات صغہ ہستی سے مٹ کر ایک انصاف کامل کی حکومت کا آغاز ہو جائے

(۲)

عقلیت پسند گروہ بقائے روح اور حیات بعد الموت کے خیال کو اپنے دماغ سے نکال دیتا ہے کیونکہ اس اعتقادی تائید میں خفیف ترین شہادت بھی میسر نہیں آتی برعکس اس کے حیات عضوی (*Organic life*) اس امر کی تائید کرتی ہے کہ موت خواہ طبعی ہو خواہ غیر طبعی زندگی کے خاتمہ کا نام ہے جس میں انسانی زندگی بھی شامل ہے عقلیت پسند جانتا ہے کہ عہد قدیم میں انسان نے خود کو بانی موجودات سے اس قدر افضل خیال کیا کہ اُس نے یہ سمجھ لیا کہ صرف اسی کو روح سے سرفراز کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب انسان نے حیات حیوانی پر زیادہ توجہ کی اور فہم حیوانی کو اپنے مسئلہ کا موضوع بنا یا تو اس کو اس بات کا اقرار کرنا پڑا کہ حیوان مطلق کو بھی روح عطا ہوئی ہے بلکہ بعض تو یہاں تک اقرار کرتے ہیں کہ درختوں میں بھی روح یا روح کے مشابہ کوئی چیز پائی جاتی ہے۔

اسی کے ساتھ ایک ماہر علم الاعصاب میدان میں آتا ہے۔ اور مذہب پرست کو یقین دلاتا ہے کہ یہ نام نہاد روح سوائے نظام عصبی کے اور کچھ نہیں ہے اور یہ کہ جس حد تک کسی حیات عضوی میں نظام عصبی موجود ہے اسی حد تک اس میں روح بھی موجود ہے اور اس لئے وہ یہ نتیجہ اندر کرتا ہے کہ جب نظام عصبی فنا ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس نام نہاد روح کی کیا اصلیت ہے یہ ایسا سوال ہے جس پر متفکرین کے دماغ اسی روز سے غور کر رہے ہیں جس روز سے انسان نے زندگی کے آغاز و انجام پر غور کرنا شروع کیا اور جس کے متعلق عجیب و غریب قیاسی توہمات قائم کئے، مگر عقلیت پرست اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ روح کا آغاز عین اسی وقت شروع ہوتا ہے جب کہ نظام عصبی کا آغاز ہوتا ہے اور نظام عصبی کا آغاز عین اسی وقت یا اس کے کچھ بعد

ہوتا ہے جبکہ فعل جنسی کے ذریعہ سے حل قائم ہوتا ہے۔ الغرض عقلیت پرست اپنی رائے کو قدیم روحانیات کی تعلیم کے موافق نہیں بنا سکتا اور اسی بنا پر وہ ہمیں اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ متقدمین کی تمام روحانیات کی کتابیں از سر نو تحریر کی جانی چاہئیں تاکہ وہ طبیعیات اور علم الاعصاب کی موجودہ تحقیقات کے نتائج کے ساتھ مواخت پیدا کر سکیں۔

مگر اب سوال یہ ہے کہ عقلیت پرست اس مقلد کی تسکین کے واسطے کیا چیز پیش کرتا ہے اس بیماری ماں اور مفہوم باپ کی تسلی کے لئے کیا چیز پیش کر سکتا ہے جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کھلی ہوئی قبر کی طرف دیکھ رہے ہیں جو ان سے اس چیز کو ہمیشہ کے واسطے چھین لینے کے لئے تیار ہے جو ان کی زندگی کا سہارا محبت کا واسطہ اور جوئی کا ذریعہ ہے۔ کیا اس کے پاس کوئی تسلی بخش الفاظ منانے کے واسطے اور کوئی ہمت افزا باتیں پیش کرنے کی واسطہ نہیں ہیں جنکے ذریعہ سے ان کے آسودہ ہو جائیں۔

اس کا صرف ایک جواب ہے جس کی پوری اہمیت سمجھنے کے لئے ہمیں موت کا وہ رسمی موروثی نظریہ قطعی طور پر بدل دینا پڑے گا جو نسل انسانی میں اس وقت پایا جا رہا ہے اور اس کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اعلیٰ درجہ کے روشن خیال اپنی متفقہ کوششوں کے ذریعہ سے عوام الناس کے داغوں میں اور خاکر آنے والی نسلوں کے ذہن میں یہ خیال بچنگی کے ساتھ جمادیں کہ جہاں تک ضعیف العمری کی موت کا تعلق ہے وہ فطری چیز ہے اور فطری زندگی کا فطری نتیجہ موت ہے، جہاں تک بیماری کے ذریعہ سے موت کا تعلق ہے وہ دانشمندانہ حفظاً تقدم کے ذریعہ سے روکی جاسکتی ہے اور علاج کے ذریعہ سے اس کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ بھی کیا جاسکتا ہے اور جو اموات بطور حادثہ واقع ہوتی ہیں وہ بھی سخت ترین قوانین تحفظ کے ماتحت بند کی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح موجودہ اور آنے والی انسانی نسلوں میں یہ خیال ذہن نشین ہو جائے گا کہ ملکی جنگوں کے باعث جو موتیں واقع ہوتی ہیں ان کو بین الاقوامی مجلس صلح کے ذریعہ سے قطعی ناممکن الوقوع بنایا جاسکتا ہے۔

اس نقطہ پر پہونچ کر نظریہ ارتقا ہمارے پیش نظر ہوتا ہے نہ بطور لعنت کے جیسا کہ مقلدین کا عقیدہ ہے بلکہ بطور برکت کے جو غیر متعصب لوگوں پر یہ واضح کرتا ہے کہ تمام فاسد نفسانی خواہشات میں ایک خواہش بھی ایسی نہیں ہے جو کسی شیطانی ہستی نے اس کے اندر پیدا کر دی ہوں اور جو اس کے اختیار سے باہر ہوں بلکہ یہ تمام آثار ہیں اس بات کے کہ انسان نے ان ادنیٰ درجہ کی خواہشوں کو جانوروں سے وراثتاً حاصل کیا تھا۔

پھر ممکن ہے کہ خود ہمارے اندر اس قدر ہمت پیدا نہ ہو سکے کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں اس پر عمل کر کے دکھلا دیں لیکن ہماری اولادیں اور ہماری اولادوں کی اولادیں متحدہ عمل اور مشق کے ذریعہ سے اس قدر کافی ہمت پیدا کر لیں گی کہ موت، تابوت اور قبر کا بھندہ پیشانی خیر مقدم کریں اور بغیر کسی یاس و حزن کے موت کا مقابلہ کریں

بلکہ یہاں تک کہ موت کی عظمت سے اُن کے چہرے جگمگا اٹھیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک عقلیت پرست، آسمانی قوانین کے مقابلہ میں کیا چیز پیش کر سکتا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ مفکر کو یقین دلانا ہے کہ اول تو دنیا میں کبھی کوئی ایسی چیز تھی نہیں جس کا نام آسمانی قوانین ہو بلکہ برعکس اس کے جو قوانین آسمانی قوانین کے نام سے لوگوں کے سامنے پیش کئے گئے وہ حقیقت میں مذہبی لوگوں ہی کا اختراع تھے جنہوں نے ان کو موثر اور مقبول بنانے کے لئے لوگوں پر یہ ظاہر کیا کہ یہ خدا نے ان کو المام و وحی کے ذریعہ سے بتلائے ہیں اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک ایسا جہنم بھی ایجاد کیا جس میں آگ روشن ہے اور جس میں قدیم یونانیوں کے خیال کے مطابق اتمراری عذاب موجود ہے۔ لیکن جوں جوں تہذیب ترقی کرتی گئی، انسانی قوانین رفتہ رفتہ نام نہاد آسمانی قوانین کی جگہ لینے لگے اور بالآخر خود اُن کی جگہ قائم ہو گئے اس لئے اب انسانی فرض یہ ہے کہ جب اور جہاں خدائی قوانین انسانی آزادی اور انسانی حقوق کے متعارض واقع ہوں، ان پر نظر ثانی کر کے ترمیم و تسیخ کرے یا نئے حالات کے ساتھ موافقت پیدا کرنے کے لئے اُن کو قطعی مسترد کر دے۔

بقائے روح کے متعلق جو جواب ابھی دیا گیا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے عقلیت پرست اس بات کو بھی محسوس کرتا ہے کہ اُس کا یہ نظریہ کہ مادرائے لحد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے اس موجودہ زندگی کو اس قدر پیش بہا بنا دیتا ہے کہ ہم اس کے ایک ایک لمحہ کو مستحق حیات بنا نا اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں اس لئے ہمارے واسطے یہ لازم ہے کہ ہم اس زندگی کو خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو شرافت اور رحمتی سے اُس جہنمک مالا مال رکھنے کی کوشش کریں جس جہنمک کہ ہم میں اس کی صلاحیت موجود ہے۔ ہماری اولادوں کو یہ بات سکھائی جائے گی کہ کوئی سخت کلمہ یا ناروا سلوک نہ کبھی واپس لیا جا سکتا ہے نہ اس کا کبھی تدارک کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی قربانی اس کا کفارہ ہو سکتی ہے اس لئے اُس سے ہمیشہ احتراز کرنا چاہئے۔

اس طرح عقلیت پرست یقین رکھتا ہے کہ اس کے پاس فی الحقیقت ایک ایسا انم البدان پیش کرنے کے واسطے موجود ہے جو اُس مذہبی عقیدہ کی جگہ لے سکتا ہے جس کو مذہب عالم نے نشوونما دیا ہے۔

(نگار) آپ، بینڈرٹ کے اس مقالہ پر مجھ سے اظہار خیال چاہتے ہیں، درنحالیکہ انداز بیان اور انتخاب الفاظ کے ادنیٰ تغیر کے ساتھ ہی سب کچھ میں بھی لکھ چکا ہوں اور ایک مغربی ملحد کو میرے مقابلے میں اگر کوئی امتیاز حاصل ہے تو صرف یہ کہ وہ سرے سے خدا کے وجود یا خدا کے مفہوم ہی کو قابل تسلیم نہیں سمجھتا اور میں ایک ایسی قوت کا قائل ہوں جو حقیقی معنی میں ”فعال لما یرید“ ہے۔ وہ مصائب عالم اور حوادث

طبعی کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کائنات ہنوز نامکمل ہے اور ایک مکمل خالق سے نامکمل مخلوق کا ظہور میں آنا قابل یقین نہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی قوت اعلیٰ، عالم خلق و کون میں تدریج کے ساتھ عمل تکمیل کو جاری رکھنا چاہتی ہے تو اس میں کونسا استحالہ عقلی ہے، اور کیا ”ذکر فعال“ لما یزید“ کے مفہوم میں وہ قوت و اقتدار دراصل نہیں ہے جو ”مسئولیت“ و ”پرسش“ سے بہت بلند ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ میں یہ باور کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتا کہ وہ قوت انفرادی کی سطح حیثیت سے عالم کی ایک ایک چیز اور اس کے ایک ایک ذرہ کی ہر وقت نگرانی کرتی ہے اور اسی لئے میں دعا و استجابت دعا کو بالکل فعل عبث قرار دیتا ہوں۔

مقدرات الہیہ سے حقیقتاً وہ نوا میں فطرت مراد ہیں جو ایک خاص اندازہ سے تمام عالم طبیعیات میں اپنا اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور مادی اسباب کے تغیر و انقلاب یا کمی و بیشی سے کبھی کبھی ان نتائج میں بھی تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں جو عادتاً ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کو عدم تکمیل یا عدم یکسانیت قرار دے کر کیوں کسی ”مکمل خدا“ کے وجود سے انکار کیا جائے جبکہ اسی کیفیت کو خدا کے ”ارادہ آراد“ سے متعلق کر کے بہ آسانی اس گتھی کو سلجھایا جا سکتا ہے۔ بہر حال کسی ایسی قوت کے وجود سے جو عالم تکوین میں کار فرما ہے۔ سخت سے سخت لمحہ بھی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس کا نام خدا نہ رکھے اور اسے ”علت اولین“ یا ”علت العلل“ وغیرہ کے نام سے موسوم کرے۔

ایک مذہب ہی انسان اور غیر مذہب ہی انسان کے اس اعتقاد میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ وہ عوام کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر (یا حقیقتاً خود اپنی ذہنیت کے لحاظ سے جو ممکن ہے ترقی یافتہ نہ ہو لیکن اصلاح پسند ضرور ہے۔) ایک ایسا خیال خدا کے متعلق پیش کرتا ہے جو فلسفہ کی گتھی میں الجھائے بغیر نوع انسانی کی اصلاح چاہتا ہے اور یہ خود اپنی تسکین قلب کے سامنے ان مصالح کی پرواہ نہیں کرتا جو عوام سے متعلق ہے۔ البتہ اگر وہ زمانہ کبھی آیا (اور یقیناً آئے گا) کہ تمام افراد انسانی ایسے ہی ترقی یافتہ ہو جائیں جسے کہ مسٹر بینڈرٹ ہیں اور تکمیل اخلاق کا وجوب ایک کھلی ہوئی روشن حقیقت کی صورت اختیار کر لے تو یقیناً انسان مذہب سے بے نیاز ہو جائے گا۔ اور ہو جانا چاہئے کیونکہ ایک مذہب کا انتہائی ارتقا صرف یہی ہے۔ اور اس کی تکمیل کے بعد اس کو از خود تحلیل ہو جانا چاہئے۔

النامی کتابوں کے متعلق جو خیالات فاضل مقالہ نکار نے ظاہر کئے ہیں، ان سے مجھے اس حد تک تو ضرور اتفاق ہے کہ ان کو خدا کا کلام کہنا حقیقتاً کوئی وزن نہیں رکھتا اور اس کو اب کوئی صاحب عقل انسان صحیح باور نہیں کر سکتا، لیکن میں یہ کبھی نہ مانوں گا کہ انبیاء و رسل نے مقصداً لوگوں کو دہوکا دیکر ایسا باؤ کرایا، کیونکہ ان کی سیرت کا مطالعہ ہم کو بتاتا ہے کہ وہ لوگ جنسوٹے یا مکار نہیں تھے اور نہ وہ اپنے مقصد میں

کامیاب ہو سکتے تھے اگر ان کی کارگاہ عمل صرف مکر و فریب پر قائم ہوتی۔ اس لئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کہ الہامی کتب خدا کا کلام بھی نہیں ہیں اور انبیاء نے بھی غلط بیانی سے کام نہیں لیا ہے تو پھر تیسری صورت کیا ہو سکتی ہے؟

میں اس سے قبل کئی بار ”وحی و الہام“ کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کر چکا ہوں جن کا حاصل یہ ہے کہ انبیاء کی زبان سے ایک خاص تاثر کے ماتحت بے اختیارانہ طور پر کلمات رشد و ہدایت کا نکل جانا اصل وحی ہے اور چونکہ اس حال میں انسان پر ایک قسم کی ”مقناطیسیت ذاتی“ (Self Magnetism) طاری ہو جاتی ہے۔ اور یہ کیفیت رفتہ رفتہ ”اشارہ ذاتی“ (Auto Suggestion) میں تبدیل ہو جاتی ہے جسے ”لطیفہ غیبی یا روح القدس“ بھی کہہ سکتے ہیں، اس لئے وہ باور کرنے لگتا ہے کہ جو کچھ اس کے منہ سے نکل رہا ہے وہ خود اس کی ذاتی فکر و کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ کوئی قوت برتر و اعلیٰ اس کے دماغ سے بول رہی ہے اور اسی بات کا یقین وہ دوسروں کو دلانا چاہتا ہے۔ خود کلام مجید کے طرز عبارت کو دیکھنے تو معلوم ہوگا کہ حاجا اس میں خود رسول اللہ سے بھی خطاب کیا گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اور کا کلام سول بنا رہے ہیں۔ لیکن آپ سمجھے کہ یہ کیا بات ہے۔

یہ ”مقناطیسیت ذاتی“ کی وہ انتہائی کیفیت ہے۔ جب انسان اپنے پیکر مادی سے علیحدہ ایک اور لطیف ہستی (Etherial Being) کے وجود کو اپنے اندر محسوس کر کے اس کے ”داعیات“ کو علیحدہ ایک مستقل صورت میں دیکھنے لگتا ہے اور اس حال کے ماتحت جو کچھ اس کے منہ سے نکلتا ہے وہ واقعی انسانی دماغ کی پیداوار سے بلند تر مرتبہ کی چیز ہوتا ہے۔ پھر جس طرح یہ صحیح ہے کہ ہم اس کو (لفوی معنی کے اعتبار سے) کلام خداوندی یا ”منطوقات الہی“ نہیں کہہ سکتے، اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ انبیاء و رسل کا اپنی شدید کیفیات نبوت کے لحاظ سے اس کو ”ماوراء عالم مادہ“ کی چیز کہہ کر پیش کرنا غلط بیانی یا مکر و فریب نہیں کہلایا جاسکتا۔

حیات بعد الموت یا معاد کے متعلق جو خیالات فاضل مقالہ نگار نے ظاہر کئے ہیں۔ ان سے مجھے بالکل اتفاق ہے اور اس میں کلام نہیں کہ انبیاء کا ”دوزخ و جنت“ کے خیال کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا بالکل تمثیلی و تشبیہی چیز ہے، لیکن اس کو ”حقیقت“ کے رنگ میں اس لئے پیش کیا کہ عوام کے متاثر کرنے کا بہترین ذریعہ یہی تھا۔

جن حضرات نے شروع سے نگار کا مطالعہ کیا ہے وہ واقف ہوں گے کہ مسئلہ معاد میں میرے خیالات میں تدریجی طور پر برابر انقلاب پیدا ہوتا رہا ہے۔ خیر، اس کا قائل تو میں کبھی نہیں ہوا کہ قیامت کے دن مردے

قبروں سے اٹھیں گے، جو ق درجہ جحش میں جمع ہوں گے اور باقاعدہ حساب کتاب ہو کر دوزخ و جنت کی سزا و جزا انھیں ملے گی، لیکن یہ ضرور یقین کرنا تھا کہ مرنے کے بعد رُوح قائم و باقی رہتی ہے اور روحانی مسرت و لذت کا دوسرا نام فردوس و جہنم رکھا گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال بھی محو ہوتا گیا یہاں تک کہ آج میں رُوح کی بقا کا بھی قائل نہیں اور پورے اعتقاد و یقین کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ زندگی نام ہے امتزاج عناصر کے اعتقاد کا اور جب یہ اعتدال باقی نہیں رہ جاتا تو انسان پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ اور موت نام ہے بالکل ”نیٹا نیٹا“ ہو جانے کا۔

اس میں شک نہیں کہ مذہب کی بنیاد تا مگر منحصر ہے اعتقاد معاد پر اور کوئی شخص اس کو تسلیم نہ کرے تو پھر مذہب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ جس طرح ایک مذہب کو مابعد الطبیعیات سے متعلق کر کے غیر ترقی یافتہ عقول انسانی کے لئے مفید و کارگر بنا یا جاسکتا ہے، اسی طرح اس کو اسی دنیا سے متعلق کر کے موجودہ ترقی علوم و فنون کے دور میں قابل عمل نہیں ٹھیرایا جاسکتا۔ — میرا خیال یہی ہے کہ اس خدمت کو صرف مذہب اسلام ہی انجام دے سکتا ہے اور یہی میرا موجودہ مشن ہے جس کی تبلیغ میں ایک زمانہ سے کر رہا ہوں۔

اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ نوع انسانی کی فلاح کا تعلق صرف دو چیزوں سے ہے، ایک سعی و عمل اور دوسرے اتحاد و مساوات۔ اور عملی طور پر ان دونوں چیزوں کو جس طرح اسلام نے پیش کیا ہے۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ جا بجا ”تفکر و تدبر“ کی ہدایت کرنا، صرف جد و جہد ہی کو ذریعہ فلاح و نجات قرار دینا اور تمام نوع انسانی کو ایک رشتہ سے وابستہ سمجھنا، یہ ہے قرآن مجید کی تمام تعلیم کا خلاصہ لیکن ایک قدیم خیال کے مذہبی انسان میں اور مجھ میں اتنا فرق ہے کہ وہ ان سب کے نتائج عالم مابعد الموت سے متعلق کرتا ہے۔ اور میں اسی دنیا سے وابستہ سمجھتا ہوں۔ پھر کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے اس سے زیادہ لچک کسی اور مذہب میں پائی جاسکتی ہے اور کیا اسلام کو فطری و آخری مذہب کہنا اس کا مقتضی نہیں کہ وہ ترقی کے ہر دور میں یکساں طور پر مفید یقین اور رہبر رہنا ثابت ہو۔

یہاں پر ایک اعتراض ضرور پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر قدیم خیال کے لوگ بقا رُوح اور عقیدہ معاد کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے اور اس کی مخالفت کیوں کی جائے جبکہ وہ دنیاوی ترقی کے مانع نہیں۔ — لیکن یہ اعتراض موجودہ عقلی دور میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ اس وقت انسان کا مطالبہ ایسی تعلیم کا ہے جو ذہنی و عقلی آدادی کو برقرار رکھنے والی ہو اور بغیر سمجھے ہوئے محض روایات اعتقاد کا کی بناء پر کسی امر کا باور کر لینا یا دوسرے کو باور کرانا عقلی آدادی کو تباہ کرنے والا ہے جس پر اب کوئی راضی نہیں

ہو سکتا — محض اس لئے کسی بات کو یقین کر لینا کہ اس کے یقین کر لینے میں کوئی حرج نہیں، نہایت غلط منطق ہے اور اب اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا۔ جب تک ایک انسان بالکل بچہ ہے۔ ہم اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر اس کو ڈرا سکتے ہیں کہ ”اس کو نہ لو یہ کاٹ لیتا ہے“ لیکن سن شعور تک پہنچنے کے بعد تو ہم اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ”تم تو یہی یقین کئے جاؤ کیونکہ ایسا یقین کرنے میں کوئی حرج نہیں“ ظاہر ہے کہ وہ یہ دلیل سن کر سوائے ہنس دینے کے اور کیا کر سکتا ہے۔

بہر حال اس میں کلام نہیں کہ یہ زمانہ مذاہب عالم کے لئے نہایت ہی خطرناک زمانہ ہے۔ اور اس وقت صرف وہی مذہب و مسلک زندہ رہ سکتا ہے جو ذہنی ترقیوں کا ساتھ دینے والا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ ایسا مذہب صرف اسلام ہے بشرط آنکہ اس کی صحیح روح سمجھ کر لوگوں کو اس کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے، ورنہ مولویوں کا بتایا ہوا مذہب تو اب چلنے کا نہیں

اس خستہ اگر دیر زید شام بہیرد

کتاب شہوانیات کے بعض عنوانات یہ ہیں

فحاشی کی تعریف فحاشی کے اسباب مذہبی فحاشیاں مذہبی فحاشیوں کی علامتیں
 فحاشی پر عمومی تبصرہ مقدس مباشرت فحاشی کے اسباب فحاشی کی ابتدا فحاشی قدیم روم میں
 استلذاذ بالمثل استلذاذ بالنفس استلذاذ بالوحوش استلذاذ بالنفس استلذاذ بالخیال
 استلذاذ بالادویہ فحاشی عہد قدیم میں فحاشی قرون وسطیٰ میں عہد جدید اور فحاشی
 اخلاق جنسی کا ماضی حال اور مستقبل وغیرہ وغیرہ
 اگر آپ ابھی تک یہ کتاب ملاحظہ نہیں فرمائی تو اب طلب کیجئے۔ ضخامت ۳، ۵ صفحات قیمت
 علاوہ محصول مجلد ہے غیر مجلد ہے۔
 خریداران انگار سے ایک روپیہ کی رعایت۔

منیجر نگار دکنو

باب المراسلة والمناظرة

(جناب شوق قندھاری)

مدت سے آرزو تھی کہ جناب سے طرح گفتگو ڈالوں لیکن موقعہ و محل کے خیال نے اب تک ایک مناسب عنوان کا منتظر رکھا اور اب جبکہ ملاقات کے لئے ایک موزوں تقریب ہاتھ آگئی ہے میں اپنی اسی دیرینہ خواہش کو پوری کر رہا ہوں یہ تقریب کیا ہے؟ اس کو اسی وقت بیان کر دینے سے پہلے میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ ننگار سے اپنی شناسائی اور توسط ننگار آپ سے ہے۔ اپنی غائبانہ واقفیت کی داستان ختمہ الفاظ میں بیان کر دوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ آپ کی کوششیں کسی نہ کسی عنوان اور کسی نہ کسی طریقہ سے کامیاب اور بار آور ہو رہی ہیں اور جوتی بنائیں گی۔

آج سے آٹھ نو سال پیشتر میں نے پہلے پہل آپ کا نام سنا اور وہ بھی مساند اسلام اور دشمن مذہب کی حیثیت سے۔ اور سچ پوچھے تو اس وقت نہ مجھ کو اتنی فرصت تھی کہ ننگار کا بالاستیعاب مطالعہ کرتا اور نہ اتنی اہلیت کہ مطالعہ کے بعد تنقید کرتا آپ کے خیالات پر اور اپنی کوئی ذاتی رائے قائم کرتا، اس لئے خاموش رہا۔ اور منتظر ہا وقت و موقعہ کا۔ اس طرح چار پانچ سال گزر گئے۔ اور اس عرصہ کے بعد میں نے اپنے میں اتنی اہلیت سوس کی کہ اب میں ننگار کا بامعان نظر مطالعہ کر کے بطور خود کوئی شخصی رائے قائم کر سکتا ہوں چنانچہ اتفاق وقت سے اتنی مہلت بھی زمانہ نے دی کہ ایک گوشہ عافیت میں بیٹھ کر ایک مدت کی تمنا کو پوری کر سکوں۔

اب فرصت کے زمانہ میں جتنے بھی پرچے مجھے دستیاب ہو سکے میں نے بڑھ ڈالے اس میں شک نہیں کہ شروع شروع میں اپنے عقاید و ایمانیات کے بارے میں ایسی تلخ بلکہ مخالفانہ آرا کا مطالعہ کرتے مجھے نہایت تکلیف ہوئی اور اس احساس تکلیف کا ذمہ دار وہ تعصب مذہبی اور وہ اسلوب تربیت تھا جو کسی تنقید و تبصرہ کو مطلق برداشت اور گوارا نہیں کر سکتا۔ اس احساس تکلیف کے دوران میں کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ میں نے پرچے پڑھتے پڑھتے پھینک دئے۔ لیکن وہی جسوئے حقیقت جس نے مجھے شروع میں ننگار کے مطالعہ پر آمادہ کیا تھا پھر مجھے کساتی اور میں پڑھنا شروع کر دیتا

تھوڑے دنوں کے مطالعہ کے بعد میں نے خود غور کرنا شروع کیا کہ نگار کا مشن کیا ہے اور وہ کہاں تک حاصل حقیقت ہے۔ چنانچہ میرے تعمق و وجدان نے مجھ پر امر واضح کیا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ حق و صداقت کے اعتبار سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ چنانچہ اس وقت سے میں نگار کا مستقل خریدار ہوں اور ہر ماہ نامے کو مطالعہ کو۔۔۔۔۔ اور خصوصاً شعبہ مذہب کے مطالعہ کو اپنے اوپر قرض سمجھتا ہوں۔

نگار کی اس خاموش تبلیغ نے مذہب کے متعلق اور سنجیدہ و عمیق مطالعہ کا شوق مجھ میں بیدار کر دیا میں چاہتا تھا کہ اس بارہ میں فائر تصانیف کا مطالعہ کروں تاکہ تسکین ہو اس سلسلہ میں میں نے علاوہ دیگر بے شمار کتب کے مقبول احمد صاحب کی کتاب فلسفہ مذہب کو۔۔۔۔۔ جو بالالتزام نگار میں شائع ہوا کی۔۔۔۔۔ بھی لگے ہاتھوں پڑھ ڈالا لیکن معاف فرمائیے کہ اسے بالکل سطحی تصنیف پایا بعد ازاں میں نے فلسفہ کی باقاعدہ اور منضبط تحصیل شروع کی۔ اور مسلسل دو تین سال کے درس فلسفہ نے مجھے تشکیک کے دامن میں پناہ دی اور میں نے جان لیا کہ علم کی رسائی نارسائی سے آگے نہیں یعنی

معلوم شد کہ پتہ معلوم نیست

ہماری ساری علمی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

اب میں تشکیک و ارتیابیت کا قائل ہوں اور مذہب اور مذہب کی پیداوار کے متعلق میرے خیالات وہی ہیں جو ایک مشکک کے ہوتے ہیں۔ اور آپ ہی فرمائیے۔ کہ اگر آپ کسی چیز کا انکار نہیں کر سکتے تو کیا اس کا اثبات کر سکتے ہیں؟

خدا کے نعرہ کو آپ بدیہی الوجود کہتے ہیں۔۔۔۔۔ اور اس کے شاہد نگار کے ملاحظیات ہیں۔۔۔۔۔ لیکن آپ ہی فرمائیے کہ کیا آپ اسکا اثبات کر سکتے ہیں۔ اگر مصنوع کو دیکھ کر صانع کا خیال پیدا ہونا ناگزیر امر ہے تو یہی فرمائیے کہ کیا آپ کا صانع اسی نوع کا ہے جس نوع کے صناع انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اگر ایسا ہی تو پھر ایک اور چیز اس کی شریک ازلیت ہو جاتی ہے جسے مادہ کہتے ہیں اور شاید اس ثنویت کو آپ جائز نہ رکھیں اور اگر آپ کا ”صانع حقیقی“ صناعان مجازی کے مانند نہیں تو کیا وہ خود ہی صانع اور خود ہی مصنوع ہے۔

خود کو زہ و خود کو زہ گر و خود گل کو زہ؟

اور کیا اس میں اسی قسم کا استحالہ عقلی نہیں جس قسم کا کہ مصنوع کو خود بخود دین جانے کے اعتقاد میں ہے؟ اگر آپ اثبات کی جرأت کریں تو شاید آپ برکھ کے ہمنوا ہو کر آخری دلیل جو پیش کریں گے وہ یہی ہوگی کہ مادہ کو عامل و قائل ماننے سے منفی لازم آتا ہے۔ اور خدا نے اعلانے کے بارے میں ایسا کوئی منفی لازم نہیں آتا لیکن

میرا سوال اس وقت ہی ہوگا کہ اس تنفر کا ذمہ دار کون ہے سو آپ کے متعصب اسلوب تربیت کے بہ او یہ بھی کہ خدائے تعالیٰ کے بارے میں ایسا کوئی تنفر کیوں لازم نہیں آتا؟

اس پر سے مجھے آپ کہیں مادیت کا وکیل نہ سمجھئے میرا مسلک تو ”لا علمی“ ہے اور بس اور اس سے اتنا تو ثابت ہے کہ ہمارے علم میں و توفیق و اذعان کوئی چیز نہیں اور یہ بھی کہ اگر ہم کسی چیز کا انکار ایقان و توفیق کے ساتھ نہیں کر سکتے تو اس کے اثبات میں بھی وہ ادعاے شان باقی نہیں رہتی۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا — جو کائنات مذہب کی سب سے زیادہ جلیل القدر سستی ہے — ذہن انسانی کی سب سے زبردست تصنیف ہے — اور تعجب ہے کہ ہمیں کو اپنے ذاتی خیالات سے — جن کا امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر ہونا یقینی ہے — اب انحراف دروگردانی نامکن سی ہو گئی ہے!!

اس طرح ارتباہیت نے مجھے وہ سکون و اطمینان بخشا جس کا میں جو با تھا اور اس کے لئے میں نگارہ کا سفدر مسموں ہوں ظاہر ہے۔

اب آپ نے ابھی طرح بہتہ پہلا لیا ہوگا کہ مذہب کے متعلق میرا زاویہ نگاہ کیا ہے مذہب کی فی الوقت دنیا کو ضرورت ہے یا نہیں اس کے متعلق میں کیلچر فیلڈ رائے نہ دوں گا البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ صاحبان علم و عقل کے لئے کسی مذہب کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے اور نہ ہے ان کا اپنا ضمیر ان کا بہترین رہنما ہے۔ ہاں اس طبقہ کو چھوڑ کر بقیہ افراد بنی نوع انسان کے لئے مذہب کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر نہ وہ معاشرہ انسانی کے لئے کارآمد ہو سکتے ہیں اور نہ وہ خود کو کوئی پسندیدہ زندگی کر سکتے ہیں۔

یہاں پر میں اپنے معتقدات سے الگ ہو کر آپ سے چند استفسارات کرنا چاہتا ہوں — اور دور اصل ہی تقریب ملاقات ہے — یہ کہ عبادات کا مفہوم و منشاء جو آپ نے سمجھا ہے اور سمجھانا چاہا ہے وہ تو ہر لحاظ سے بالکل درست و احسن ہے اور واقعہ بھی یہی ہے — یہ میں بحیثیت ایک ارتباہی کے نہیں بلکہ بحیثیت ایک ایسے مسلم کے جو نیاز کی تبلیغ پر ایمان لایا ہے کہہ رہا ہوں — کہ اوامر اس سے زیادہ کوئی بحیثیت نہیں رکھتے کہ انسان کو معاشرہ کے لئے اور زیادہ کارآمد بنائیں مدینت و معاشرت میں مدد و معاون ہوں اور خیالات کی درستی، اخلاق کا تصفیہ اور نفس کا تزکیہ کریں بنا بریں آپ کا یہی کہنا بالکل درست ہے کہ ”محض نماز پڑھ لینا یا ایک ماہ کے روزے رکھ لینا اصل ایمان نہیں“ لیکن یہ تو بتلائے کہ جب عبادات کا مقصد اتنا ارفع و اعلى ہے تو پنج وقتہ یا سہ وقتہ اور ایک ماہ یا بلا قید مدت کی پابندی اور اس پر اصرار کیوں اور پھر مناقشہ و رد و قدح کیا مہنی؟ اگر کوئی شخص تمام رات نماز پڑھنے کے بعد اپنے میں وہ بات پیدا کرے جو مقصود ہے تو اس کو کیوں مطلق کریں آپ؟ اور اگر کوئی شخص بغیر رکوع و سجود کے

وہ اپنے پر کبھی طاری ہوتا پائے جو اصل نماز ہے تو وہ کیوں جہنمی ہو؟ جیسا کہ مولوی کہتے ہیں!

دوسرا استفسار میرا الہامی کتب سے متعلق ہے آپ نے اپریل کے نگار میں الہام کی حیثیت اور الہامی کتب کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس کی افادیت سے مجھے انکار نہیں آپ کا یہ فرمانا کہ ”یہ وہ الفاظ و خیالات ہیں جو انتہائی تاثر کے عالم میں اصلاح ملک و قوم کے لئے بے اختیار انبیاء کے منہ سے نکل گئے“ دعویٰ مستغنی عن الدلیل لیکن آپ نے اس امر کی نسبت بھی غور کیا ہے کہ الہامی کتب کا پیرایہ بیان کیا ہے دور کیوں جائے قرآن ہی کو لیجئے اس میں کہیں تو رسول اللہ کو مخاطب کیا گیا ہے اور کہیں مسلمانوں کی جماعت کو اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خود خدا خطاب کر رہا ہے اگر آپ کا کہنا مان لیا جائے تو یہ امر ترشح ہوتا ہے کہ انبیاء نے یہ دیکھ کر کہ ان کے اپنے مخاطب کا جماعت پر کوئی اثر نہ ہوگا یہ جھوٹ تراشا کہ خدا کی زبان میں بولنے لگے۔ مولانا جاد اور ان کی قوم کے دیگر انبیاء بنی اسرائیل کے ان ہفتوں کو تو میں درخور اعتنا نہیں سمجھتا کہ یہ خود خدا کا کلام ہے جو بہ اہتمام خاص ”لوح محفوظ“ سے ذریعہ ”جبریل امین“ نازل ہوا اس پر جتنے اور جس قسم کے اعتراضات ہو سکتے اور ہوتے ہیں ان کے نہ اعادہ کی ضرورت ہے اور نہ مجھے خط کی طہالت اس کی اجازت دیتی ہے۔ مذکورہ اعتراض اسلام کی اس صنف پر کیا گیا ہے جو بیکسر عقلی ہے۔ نقل کا تو ذکر ہی کیا

کیا ان امور کی نسبت قریبی اشاعت میں آپ کچھ روشنی ڈالنی پسند کریں گے اور ایسی امید کریں

کوئی باندھوں تو وہ ناسزا تو نہیں؟ فقط

مخلص
شوق قدحاری

۶ مئی ۱۹۳۳ء

(نگار) گرامی نامہ پڑھنے کے بعد میرا ارادہ یہ ہوا کہ آپ سے بیچ کے طور پر سلسلہ مراسلت قائم کروں لیکن افسوس ہے کہ نہ آپ نے اپنا پورا نام اور پتہ تحریر فرمایا اور نہ ڈاکخانہ کی نمبر سے کچھ سراغ چل سکا کہ خط کہاں پوسٹ کیا گیا ہے۔ ہر چند لفافہ کی پشت پر ایک چھوڑا اردو کی دو دو نمبریں ”عمری“ اور ”عدوں“ نظر آتی ہیں، اور اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ ریاست نظام میں کسی جگہ آپ کا قیام ہے لیکن مراسلت کے لئے اس کو نا کافی سمجھ کر مجبوراً نگار ہی کے ذریعہ سے رسید پیش کرتا ہوں۔

مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ نے نگار کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے وہ کامل غور و مطالعہ کے بعد کیا ہے اور قدامت پرستی کی زنجیروں سے علیحدہ ہو کر ————— ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ نگار کی زندگی

کے تقریباً بارہ سال گزر چکے ہیں اور اس دوران میں ایک عشر لمحہ بھی مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے اپنے مشن کی صداقت کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا ہو۔ پھر یہ تو ہوا کہ کسی مسئلہ پر میری رائے میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں، لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ اس تغیر کو ظاہر کرنے میں نے پس و پیش سے کام لیا ہو۔ یہاں تک کہ آج نصف قرن کی تحقیق و مطالعہ اور غور و تفکر کے بعد میں اپنے آپ کو اس منزل میں پاتا ہوں جسے صحیح معنی میں ”ایقان و عرفان“ کی منزل کہنا چاہئے۔ نہ اب مجھ پر کوئی کیفیت ”ارتیاب و شک“ کی کبھی طاری ہوتی ہے، نہ ”اضحلال و تزکزل“ کی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ ایک زمانہ کے اضطراب روحانی اور تذبذب ذہنی کے بعد جو یہ سکون ضمیر نصیب ہوا ہے تو کتنی راحت و لذت اپنے اندر محسوس کرتا ہوں۔ جب تک میں مذہب کو اپنے آبا و اجداد کی نگاہ سے دیکھتا رہا، درس نظامی کی کتابوں کے اوراق میں ڈھونڈتا رہا، مولویوں کے مواعظ اور صوفیوں کے اقوال میں تلاش کرتا رہا، ایک لمحہ کے لئے بھی قلب کو اطمینان نصیب نہ ہوا، لیکن جب ان تمام واسطوں سے علیحدہ ہو کر، ان تمام علائق کو توڑ کر اور ان جملہ ذرائع سے بے نیاز ہو کر، خود اپنی آداد آنکھوں، اپنی آزاد عقل، اور اپنے آزاد ضمیر کو رہنمایا تو جاببات اٹھنے لگے، تاریکیاں مٹنے لگیں اور آخر کار شاہد مقصود کو بے نقاب دیکھ کر جس کیفیت سے لطف اٹھتا رہا ہوں اس کا حال نہ پوچھئے

ہم کعبہ وہم بتکدہ سنگ رہ ما لود

رفیتم و صنم بر سر محراب شکستیم

میری پیدائش، میری تربیت ایسے شدید مذہبی ماحول میں ہوئی تھی کہ اگر فطرت خود میری رہنمائی نہ کرتی تو میری ہلاکت میں کوئی شک و شبہ نہ تھا، لیکن باور کیجئے کہ ابتدا ہی سے میں مولویوں کے بتائے ہوئے مذہب کو اپنے لئے غیر نشئی بخش پاتا تھا اور ایسا محسوس کرتا تھا کہ میری روح کی شیرینی میں کوئی تلخ شے ملائی جا رہی ہو پھر جب بعد کو مجھے آزادی نصیب ہوئی اور میں اس غلامی سے نکل کر خود تحقیق کی لذت سے آشنا ہوا تو مختلف دور سے مجھے گزرا پڑا اور سب سے آخری دور جس کے بعد سمیع یقین کا روشن ہونا مقصود ہو چکا تھا، وہی ارتیاب و تشکیل کا دور تھا جس سے آپ اس وقت گزر رہے ہیں،

گر غبار آلودہ گشتی باک نیست

اے ہزاراں دیدہ در راہ تو خاک

انتظار کی گھڑیاں ختم ہو رہی ہیں، جلوہ حقیقی کی ساعت قریب تر آتی جا رہی ہے اور وہ لمحہ درخشاں آسٹے ہی والا ہے جب خدا، ”انسانیت کبریٰ“ کے صورت میں آپ کے سامنے جلوہ گر ہو گا اور آپ بھی بے اختیار کہہ اٹھیں گے کہ

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پر تو آں ہر کجائی نگری اجننے ساخته اند

جس وقت تک میں نے نگار جاری نہ کیا تھا، یہ سمجھتا تھا کہ جو حالت ”تذبذب“ و ”عدم یقین“ کی چھ پرطاری ہے۔ وہ شاید ہی کسی اور جگہ نظر آئے، لیکن جب نگار کے ذریعہ سے میں نے اپنے ”اضطرابِ روحانی“ کو ظاہر کیا اور اپنے شکوک و ادھام لوگوں کے سامنے پیش کئے تو مجھے یہ معلوم کرنے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ ایک میں ہی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کا بڑا حصہ یہ غلطی اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور ایک عام بے اطمینانی لوگوں کے دلوں میں پائی جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد میری آواز کا حلقہ جتنا وسیع ہوتا گیا، اتنے ہی زیادہ ہم خیال نظر آنے لگے، یہاں تک کہ اس وقت نگار ہزاروں آدمیوں کے ”تذبذبِ اضطراب“ کو دور کر چکا ہے اور آج ہندوستان کا شاید ہی کوئی مقام ایسا ہو جہاں نگار کی تبلیغ پر ایمان لانے والے دوچار موجود نہ ہوں۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ جتنی کامیابی ہوئی چاہئے تھی نہیں ہوئی، اور جس وسعت کے ساتھ اس خیال کو پھیلنا چاہئے تھا نہیں پھیلا، لیکن اس کا سبب اصل تحریک کا نقص نہیں بلکہ اس کا سبب فقدانِ علم ہے جو علم و تحقیق کے اس دور میں بھی ہندوستان کی خصوصیت خاصہ بنا ہوا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نگار کا مخاطبہ صرف اہل علم ہی سے ہے اور انھیں کے ذہن و دماغ میں تبدیلی پیدا کرنا نگار کا مقصد ہے۔

آپ نے دو باتیں بھی مجھ سے دریافت کی ہیں۔ ایک عبادات کے مفہوم کے متعلق ہے اور دوسرا وحی و الہام کے متعلق۔ میں ان دونوں مسئلوں پر کئی بار مباحث کے ساتھ نگار کے صفحات میں گفتگو کر چکا ہوں لیکن غالباً نگار کے دو پرچے جناب کی نگاہ سے نہیں گزرے۔ میں نے کبھی روزہ و نماز کی مخالفت نہیں کی بلکہ ہمیشہ صاف صاف الفاظ میں یہی ظاہر کیا ہے کہ اگر کوئی ان ذرائع سے مقصدِ حقیقی کو حاصل کر سکتا ہے تو یقیناً ان کی پابندی واجب ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ ضرور کہا ہے کہ ان کو اصل چیز نہ قرار دو بلکہ صرف ذریعہ سمجھو تزکیہ اخلاق کا اور اس لئے اُس شخص کو بھی جہنمی نہ کہو جو بغیر اس ذریعہ کے کسی اور وساطت سے اصل مقصد تک پہنچنا چاہتا ہے۔

جنوری ۱۹۳۲ء کے نگار کا غالب حصہ اسی بحث کے لئے وقف تھا۔ اگر آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا تو اب دیکھئے۔ اسی کے ساتھ مئی ۱۹۳۲ء، جولائی ۱۹۳۲ء، اگست ۱۹۳۲ء اور اگست ۱۹۳۲ء کے پرچے بھی ملاحظہ فرمائے کہ صحیح فیصلہ آپ ان کے مطالعہ کے بعد ہی کر سکتے ہیں۔

وحی و الہام کے متعلق آپ نے اپریل ۱۹۳۳ء کے نگار کا حوالہ دیکر استفسار کیا ہے، حالانکہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف ضمنی دوسری طور پر ہے، اس مسئلہ پر بسط گفتگو میں نے اپریل ۱۹۳۳ء کے پرچہ میں کی ہے

اس کو ملاحظہ فرمائے اور اس ماہ کی اشاعت میں بھی باب الاستفسار پڑھنے کی تکلیف گوارا کیجئے۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی کیفیت منتظرہ باقی رہے تو مطلع فرمائے تاکہ اس کے دور کرنے کی کوشش کروں
اخیر میں ایک بار مجھے اور اجازت دیجئے کہ ”حریت فکر“ کے حصول پر آپ کو مبارکباد دوں اور اس تحریک کو اس استعداد پر ختم کروں کہ:-

بیادِ روت بہ محراب گاہ نور نہیم ۛ بنائے کعبہ دیگر سنگ طور نہیم
حظیم کعبہ شکست و اساس قبلہ بخت ۛ بتازہ طرح کے قصر بے قصور نہیم

صرف اخیر جون ۱۹۳۳ء تک

سات روپیہ کی تین کتابیں تین روپیہ میں موصول
تذکرہ خندہ گل۔ جس میں ۳۰۰ سے زائد اُردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات معہ انتخاب کلام کے درج ہیں۔ ضخامت ۷۸۰ صفحات اصلی قیمت ۷۷۔
فلسفہ مذہب۔ اُردو میں بالکل پہلی کتاب جس میں مذہب کی حقیقت، اس کے ارتقاء اور مسائل اعتقادی پر فلسفیانہ نظر ڈال کر حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اور یہ و نقد میں تمیز کر کے مذہب کے صحیح خطا و خالی بخش کے لگے ہیں۔ اصلی قیمت ۷۷۔
فراست التحریر مکمل۔ اُردو میں بالکل پہلی کتاب جس کو دیکھ کر آپ ایک شخص کے سوا خط سے اس کے حالات و اخلاق پر بہ آسانی حکم لگا سکتے ہیں۔ اصلی قیمت ۷۷۔
حضرت نیاز کے تین معرکہ الارامضامین

فلاسفہ قدیم کی روجوں کا اجتماع — مادین کا مذہب — حرکت کے کرشمے
اصلی قیمت ۷۷

نیچر نگار

گدا

تو نے پھیلایا ہے میرے سامنے دست سوال
یہ تری سہمی ہوئی نظریں سرِ اُپا التماس
چھیر ڈی یا اے گدائے بنو، نبض خیال
اس قدر افسردہ حالی، خال و خداتنے اُداس!
سر سے پاتک بید کے مانند تھماتا ہے تو
ہر قدم پر ناتوانی سے گرا جاتا ہے تو
چبھ رہی ہے روح میں صبر آزما افسردگی
تلخ ہے کس درجہ آنکھوں کی بھیانکے دشمنی!
زندگی کو ناز ہے جس پر وہ حسن مستعار
آج تک تیری نگاہوں پر نہیں ہے آشکار

کس قدر دُھند ہلا ہے اس پیکر میں نور جان پاک

کو چہ بیچارگی ہے اور تیری مشت خاک

تو ہے ایسا شادا! پامال جنائے روزگار
عظمت نوع بشر ہے دور گردوں کا فراخ
ٹھو کریں کھاتا ہے تو با آدمیت کا وقار
ہوش میں آ۔ اے رہیں نخوت اور رنگ تلخ
سر جھکا اے دعویٰ یک لگی بزم حیات
سر جھکا اے دانش تزیب و زعم ارتقا
دریں آزادی اسی کا نام ہے کیا ای خدا!
جس نے پایا ہے کمال آدمیت کا سراغ
ہے اسی پستی ہے یہ آوازہ طبع غیور
اب کہاں ہے، سامنے آئے وہ عقل بدماغ
بول اے انسانِ فانی کے فلک پیمانہ نور

ہے یہی تنظیم اجزائے معارف کا آل کچھ بتائے محو بال افشالی نبض جس سال
چاہتے لبریز تجھ کو عشرت فانی کا جام اے پرستار خودی، اے مال و دولت کے غلام

ان سے تیری غفلتیں کیا حاصل عصیان نہیں

ہیں جو کہنے کے لئے انساں، مگر انساں نہیں

جنگی روہیں مرچکی ہیں بھیک ہے جنگا شعار بیچتے پھرتے ہیں جو بے دام انسانی وقار

جنگے سینوں میں نہیں سعی و عمل کی دار و گیر جنگے دل خوابیدہ ہیں خاموش ہیں، جنگے ضمیر

جنگی ہر جنبش ہے استعمار ذلت کے لئے جو بنے ہیں، ظلم و تحقیر و اہانت کے لئے

جادو منزل سے واقف ہیں نہ گرم جستجو سست جنگی نبض دل ہے، سرد ہے جنگالو

بھللا کر بھگ چکا ہے جن کی روہوں کا کنول زندگی میں چھارہ ہا ہے جن پر اک خواب اہل

ان کو تیرے سامنے لایا ہے فطرت کا عتاب یہ ترسے باطن کی تصویریں ہیں کچھ بیرنگ آب

تاکہ تو آنکھوں سے دیکھے اپنی بربادی کا حال رقص کرتے ہیں ان آئینوں میں تیرے خدو خال

ان کے نالے ہیں زمانے کو جگانے کے لئے قوم کی غفلت کا افسانہ سنانے کے لئے

لیکن اس ہنگامہ ادبار میں غیرت کہاں

قوم جب مجروح پستی ہو تو پھر غفلت کہاں

احساس آتشیں

گاہے گاہے کس لئے منموم ہو جاتا ہے تو ! اے مرے غمخوار شاید میرا غم کھاتا ہے تو
 بھوڑے، یہ روز کی دلدوز باتیں چھوڑے رنج پہونچانی ہیں یہ جانسوز باتیں چھوڑ دے
 میری ہستی، خود مرے آزار کی بنیاد ہے میرے ہر ذرے میں سوزِ جاوداں آباد ہے
 خاکتار ہتا ہوں میں راتوں کو جلنے کے لئے شمع کی مانند جل جل کر پگھلنے کے لئے
 ختم ہو سکتا نہیں شاعر کا روحانی عذاب، پھونک زے گا جھ کو اک دن غم کا طویلانی عذاب
 دوسروں کی آگ میں جلنا میری تقدیر ہے میرے پیارے شاعری اک دردِ عالم گیر ہے

دے کے قدرت نے مجھے اک دور رس، گہری نظر غیر مہربانی عادتوں کو دیکھنے والی نظر
 کر دیا ہے اک عذابِ دائمی کا اہتمام ہو گئی ہیں زندگی کی راحتیں مجھ پر حرام
 کاش تو میری نظر سے دیکھ سکتا، ایکبار سینہ لگیتی کے لامحور و دواغوں کی بہار
 کیا کہوں اس غمکدے میں کیسا نازک دور ہو اور ہی کچھ ہم نشیں! قدرت کے زیرِ غور ہو
 وقت آتا ہے کہ بے چون و چرا اڑ جائیں گے
 اک دھماکا ہو گا اور ارض و سما اڑ جائیں گے

عدم

نمودِ شبنم

جلوہ آرا تھی عروسِ شبِ عجب انداز سے
 کیف آگیں تھیں چمن میں حُسنِ گل کی گرمیاں
 حُسن کی انگڑائیاں تھیں عشق کی آغوش میں
 عشق توں کی مستیوں میں، شب بسر ہوتی رہی
 ایک بیکِ شب کی فضاؤں میں تفسیر ہو گیا
 اب عروسِ شب سحر سے منہ چھپانے کے لئے
 تیزی رفتار یوں شرما کے دکھلانے لگی
 اُف دمِ رخصتِ عروسِ شب کی وہ جلوہ گری
 یاد ہے وہ شب کا جانا منہ گلوں کا جو م کر
 کانٹوں سے پازیب کا پیہم اُلجھنا۔ بھوٹنا
 پھر رو پہلے موتیوں کا وہ جھما جھم لوٹنا

غنجیہ و گل اس ادا پر بے سحا شاہنس دیے

ہنس کے اپنے جیبِ دامن موتیوں سے بھر لیے

فطرت واسطی

داعیات

آہ نارسا اپنی، نالہ ناتواں اپنا
 کیا کہیں، محبت میں دل پہ کیا گزرتی ہو
 آپ اور دلداری! خواب ہو کہ بیداری
 لطفِ زندگی کیسا سیرِ گلستاں کس کی
 آنہ جلے حرفِ اکٹن! انکی بے نیازی پر
 تاکجا رہیں گھٹ کر دل کی حسرتیں دلیں
 فکر کی لطافت میں ذکر کی صداوت میں
 اشک داستانِ دل کی، خامشی بیاں اپنا
 حُسن بے نیازاُن کا، عشق بنگاں اپنا
 ہو ہنوز کچھ باقی شاید امتحاں اپنا
 ہے وہ اب قفس اپنا کھاجو آشیاں اپنا
 تاکجا محبت میں آپ امتحاں اپنا
 لوٹ لے کوئی رہزن کاش کارواں اپنا
 کون ہے شریک اپنا کون ہم زباں اپنا
 دوست کے سوکستے حال لکھوں کو کتب

اور ہر دو عالم میں کون راز داں اپنا

کو کب (شاہما پوری)

افسردگی!

روئے گیتی سے نمایاں ہو رہا ہے اضطراب!
 خشک ہو کر رہ گئی ہے ہر رنگِ ابر بہار!
 بند تھا غنچے کے سینے میں کبھی طوفانِ رنگ!
 اب وہ اگلی سی نہیں رُخسار گل کی آب و تاب!
 چہرہ گیتی نظر آتا ہے اک تصویرِ عنسم!
 پھار ہی ہے نئے دلی ہر شے ہے گویا سو گوار!
 تیز رو سیل ہوا میں کا پتے ہیں برگ و بار!
 یا یہ عالم ہے کہ اس کی دید بھی ہے ناگوار!
 اب وہ پہلی سی نہیں کیفیتِ موج بہار!
 دہر کی ہر چیز سے افسردگی ہے آشکار!
 آج ہر اک شے مری نظروں میں ہے تصویرِ یاس!

دل ہی افسردہ ہو جب تو کیوں نہو دنیا داس!

راز بنگش سرحدی

غزل — فرخ بناری

غم نہیں گر غم بہتی کو فراوانی دے
شوق دیدار کی منزل ابھی طر کرنا ہے
کون ہوتا ہے حریف سے حسن و نغمہ
جذب آنکھوں سے کروں میں جنوں کی دنیا
ہاں مگر دل کو مے ذوق پریشانی دے
اور جلوں کو زرا خصیتِ عربانی دے
دل دیا ہے تو اسے قوتِ روحانی دے
اور تھوڑی سی جو گنجائش ویرانی دے
چشمِ سفاک کو تادیبِ کم رانی دے
جگہ صیاد اگر اذن پر افشانی دے
عقل کو راہ بتاتی ہدیٰ نادانی دے
ای خوشاد دل جسے وہ مزہ حیرانی دے
کون ہے اب جو مجھے داغِ سخن الی دے

غزل — اختر انصاری

مری جبین سے، یہ سچ ہے، سکوں ٹپکتا تھا
مگر نظر میں تو کرب نہاں جھلکتا تھا
نظر تو پھر بھی نظر ہے، غم محبت میں
ہنسائیں جب، تو ہنسی سے لہو ٹپکتا تھا
پھپھا ہے حسنِ برادرانِ خزاں کی ردی میں
بیخِ برادر میں رنگِ خزاں جھلکتا تھا
ربا پُست سے پیدا تھی جب لائے شباب
شیمیمِ حسن سے باغِ جہاں جھلکتا تھا
وہ وقت، آہ! افق سے نکل رہا تھا چائے
کلیجہ، کناروں بھری رات کا دہڑکتا تھا
مے شباب کی قسمت بڑی سہی، لیکن
جو ان ہونے سے پہلے میں مر تو سکتا تھا

مری نگاہ بھی کس درجہ مست تھی اختر!
جب اُس میں عکسِ خراباتِ دل جھلکتا تھا

مطبوعات موصولہ

ماہوار رسالہ ہے جو ۶ ماہ قبل مولوی ابو محمد صاحب مصلح کی ادارت میں حیدرآباد سے جاری ہوا تھا اور اب مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی اڈیٹری میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔

ترجمان القرآن

اس رسالہ کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے، یعنی مطالب قرآنی اور تعلیقات فرقانی کو ان کی صحیح و حقیقی روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا۔ یقیناً اس مقصد کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن جیسا کہ خود فاضل اڈیٹر نے ظاہر کیا ہے۔ عمد حاضر میں اس مدعا کی تکمیل آسان نہیں — عمد ماضی میں جب مذہب نام صرف اسلاف پرستی و قدامت پرستی کا تھا کسی شخص کا مبلغ یا مصلح بن جانا دشوار نہ تھا، لیکن اب جبکہ علوم جدیدہ اور اکتشافات حاضرہ نے ”عمل و خیال“ کی بالکل نئی طرح ڈال کر ”حریت فکر و ضمیر“ کی دولت سے دماغوں کو مالا مال کر دیا ہے۔ کوئی مذہب صرف اس دلیل کی بنیاد پر زندہ نہیں رہ سکتا کہ اس کے اسلاف کا بھی طرز عمل یہی تھا اور وہ بھی وہی سوچتا دیکھتا تھے جو اب بتایا جاتا ہے۔

پہلے اگر خدا کی وحدانیت سے بحث کی جاتی تھی تو اب سرے سے خدا کا وجود ہی محل نظر بنایا جاتا ہے۔ اگر پہلے ایک رسول کی ہدایت اس کے معجزوں سے ثابت کی جاسکتی تھی تو اب ”علوم معنائیہ“ انھیں معجزوں کی دلیل پر ہزاروں رسول و نبی پیدا کرنے کے لئے آمادہ ہیں — پہلے ایک دعاظ آسمان کی طرف دیکھ کر ”عرش و کرسی“ والے خدا کو پکار سکتا تھا لیکن آج جبکہ آسمان ہی کوئی چیز نہیں رہا، انکا ایسا کرنا کسی طرح مفید یقین نہیں ہو سکتا۔ الغرض اب زمانہ ”یومنون بالغیب“ کا نہیں رہا بلکہ ”یومنون بالبرہین والاشہاد“ کا ہو رہا ہے۔ ان کے قہمیں ہی شخص کا مذہب کی حمایت کے لئے نظر ہوجانا آسان کام نہیں، جبکہ خود نفس ”ذہبیت“ کا خیال بھی اپنی جگہ چند ان قابل قبول نہیں۔

اس وقت تک جتنے مذہبی رسائل مسلمانوں کے نکلے ہیں ان سب کی شان ہی رہی ہے کہ مخاطب کو مسلمان سمجھ کر خطاب کیا گیا ہے اور میرے نزدیک یہ پہلی کمزوری ہے جو کسی مذہب والے کی طرف سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ ضرورت ایسے رسائل کی ہے جن میں مسلم و غیر مسلم دونوں سے خطاب کیا جائے۔ اور جتنے خدشات و شبہات ایک شخص کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں ان کو سامنے رکھ کر دلائل کو استوار بنایا جائے۔ محض یہ کہدینا کہ قرآن کی تعلیم یہ ہے، یا احادیث

میں یوں بتایا گیا ہے، یا ہمارے فقہاء و علماء یہ کہہ گئے ہیں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ آپ ایک مسلمان کی زبان بند کر کے طوعاً یا کرہاً اس کا سر انقیاد جھکا کے سکتے ہیں، لیکن جس چیز کو شمع یقین کہتے ہیں وہ خود ایک مذہب ایمان والے مسلمان کے دل میں بھی روشن نہیں ہو سکتی، یہ جائیکہ ایک غیر مسلم یا کافر و نیک جو آپ کی کسی کتاب سے مرعوب ہونے کے لئے طیار نہیں

اس لئے اگر یہ رسالہ بھی صرف مسلمانوں کے لئے جاری کیا گیا ہے اور غیر مسلم اس سے نور ہدایت حاصل نہیں کر سکتا تو بیکار ہے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے جیسا کہ خود اڈین کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے تو پھر ان کے لئے مناظرہ کا باب کھولنا ضروری ہوگا۔ (در انحالیکہ وہ اپنے اشتہار میں اس سے عنقہ رہنے کا اظہار کر رہے ہیں) —

چاہئے تو یہ تھا کہ مولوی ابوالاعلیٰ صاحب ذاتی و انفرادی احساس و یقین کی بناء پر خواہ کچھ ہوتے، لیکن رسالہ نکالتے ایک غیر مسلم کی حیثیت سے اور پھر اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر وہ اسلام کی صداقت کو ثابت کرتے، لیکن وہ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کی ترتیب ہی میں وہ کچھ ایسی بات پیدا کر دیں۔ جو ایک غیر مسلم کو اس کے مطالعہ کی طرف مائل کرے۔ میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ خواہ مخواہ کلام مجید کی آیتیں یاد دوسری عربی کتابوں کی عبارتیں نقل کر کے پہلے ہی سے ایک غیر مسلم کے دل میں وحشت پیدا کر دی جائے اور وہ نگاہ ڈالتے ہی رسالہ کو بند کر کے رکھ دے۔ اس لئے میں مشورہ دوں گا کہ ظاہری حیثیت اور انشاء و تحریر کے لحاظ سے بھی اس کو "اغیار" کے مطالعہ کے قابل بنایا جائے۔ اگر واقعی اسلام کی صحیح خدمت انجام دینا ہے

قرآن پاک اپنے معنی کے لحاظ سے تین حصوں پر منقسم ہے ایک وہ جس میں اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ دوسرا وہ جس میں اعتقادات پیش کئے گئے ہیں۔ اور تیسرا وہ جو قصص و تمثیلات پر مشتمل ہے۔ حصہ اول کے متعلق زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی دلیل و برہان کے لانے کی، کیونکہ تعلیم اخلاق تمام مذاہب کی تہو بہا یکساں ہے اور ہر شخص یہ ماننے پر مجبور ہے کہ مذہب اسلام کی تعلیم دوسرے مذاہب کی تعلیم سے مختلف یا فرد تر نہیں، البتہ حصہ دوم اور حصہ سوم پر زیادہ توجہ کرنا چاہئے، کیونکہ علوم جدیدہ اور اکتشافات حالیہ نے انہیں دو حصوں کی طرف سے ریب و تذبذب کی کیفیت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان شبہات کے دور کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ اس صدی کا مجدد کہلائے جانے کا مستحق ہوگا

اس لئے میں مشورہ دوں گا کہ ایک مستقل باب اس موضوع پر قائم کر کے تمام ان آیات قرآنی کا استقصاء کرنا چاہئے جو عقاید و قصص سے متعلق ہیں اور ان کا صحیح مفہوم و مدعا متعین کر کے ان اعتراضات کو رفع کرنا چاہئے جو اس وقت اہل علم و تحقیق کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا بلکہ صرف ہند و موعظت کو شعار بنایا تو پھر یہ رسالہ صرف بچوں، عورتوں اور جاہلوں ہی کے بڑھنے کی چیز رہ جائے گا۔ اور علمی و تحقیقی دنیا میں اسے کوئی

نہ پوچھے گا

مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو اس وقت سے جانتا ہوں جب ان کا جاننے والا صرف میں ہی تھا۔ اور اس لئے میں ابھی طرح واقف ہوں کہ باوجود قدامت پسند ہونے کے وہ بہت سنجھی ہوئی طبیعت رکھتے ہیں، خدا نے ”فکرِ سلیم“ کی توفیق بھی انھیں دی ہے، اور اگر ضرورت و ماحول کے اقتضائے انھیں مجبور نہ کر دیا تو ہمیں امید رکھنا چاہئے کہ وہ ترجمان القرآن کو صرف پُرانے خیالات کے مولویوں کا پرچہ نہ ہونے دیں گے۔ بلکہ جدید روشن خیال والوں کے لئے بھی اسے مفید بنانے کی کوشش کریں گے۔ محرم کا جو رسالہ ہمیں موصول ہوا ہے اس کو دیکھ کر آئندہ کے متعلق ہم کوئی رائے قائم کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ یہ نئے ادیٹر کی پہلی فکر کا نتیجہ ہے۔ آئندہ کے لئے میں ان کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ سب سے پہلے وحی و الامام کی حقیقت پر گفتگو کریں کہ اسی کے سمجھنے پر کلامِ اہم کی حقیقت کا سمجھنا منحصر ہے اور پھر مسئلہ معاد کو لیں کہ اسی کے حل ہونے پر انحصار مذہبیت و لامذہبیت کا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کلامِ الہی اور معاد کا کیا مفہوم منبہن کرتے ہیں، اس کے بعد میں اپنے شبہات و اعتراضات پیش کروں گا۔ اور اگر ان کی کوشش سے وہ دور ہو گئے تو مجھے بڑی مسرت ہوگی کیونکہ ”ناچار مسلمان شو“ کی جس لعنت میں بہت سے لوگ گرفتار ہیں، اس کا ایک بڑا سبب ”عقیدہ معاد“ بھی ہے۔

ایک ماہوار ادبی رسالہ ہے جو کم و بیش ایک سال ہوئے سرزمینِ راولپنڈی سے نکلا۔ اور **خمتان** اب تک جاری ہے۔ اس رسالہ کی نظم و ترتیب وہاں کی ایک ادبی انجمن کے ہاتھوں میں ہے جس کے روحِ رواں ہمارے عزیز دوست حضرت عدم ہیں۔ جناب عدم کی ادبیت کا اثبات ضروری نہیں کیونکہ ناظرین ننگار ابھی طرح واقف ہیں، کیونکہ ان کی نظمیں اکثر ننگار میں شائع ہوتی رہتی ہیں اور بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

امید ہے کہ یہ رسالہ جناب عدم کی کوشش سے ”معیاری“ اصول کو نہ چھوڑے گا۔ اور زبان کی مفید خدمت انجام دینے والا ثابت ہوگا۔

مجموعہ ہے جناب محشر عابدی بی۔ اے کے چند مختصر افسانوں کا جسے مطبع عہد آفرین حیدرآباد **محشرستان** نے پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ جناب محشر کے جو افسانے اس مجموعہ میں شامل ہیں وہ ہندوستان کے مختلف رسائل میں اس سے قبل شائع ہو کر پسند کئے جا چکے ہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ ان کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جاتا۔

جناب محشر کے افسانے عموماً جذباتِ محبت سے لبریز ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے کافی تازگی کے ساتھ انھیں لکھا ہے۔ زبان و طرزِ ادا بھی کافی دلکش ہے اور پلاٹ بھی اکثر افسانوں کے فن کے لحاظ سے

اچھے ہیں۔

یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۲۳۶ صفحات پر محیط ہے اور مجلد عاری میں، غیر مجلد پھر میں دفتر نگارہ سے بھی مل سکتا ہے

ترجمہ ہے جرمنی کے مشہور فیلسوف شاعر گوٹے کے ایک رومان محبت کا،
نوجوان درتھر کی داستان غم | جناب ریاض الحسن صاحب ام۔ اے کے قلم سے۔

گوٹے کو دنیا کے ادب میں جو مرتبہ حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور جو بین الاقوامی شہرت اس کو حاصل ہوئی وہ مشکل ہی سے کسی اور کو نصیب ہوئی ہوگی۔ گوٹے دنیا کے اُن چند مخصوص لوگوں میں سے تھا جن کے دماغ کو قدرت نے ادب و فلسفہ کے لئے نہایت ہی معتدل امتزاج کا حاصل بنایا اور عمر بھر اُن سے وہی خدمت لی جس کے لئے وہ وضع کئے گئے تھے

گوٹے نے اس داستان محبت کو صرف ہیرو (درتھر) کے خطوں سے مرتب کیا اور جذبات کی ایک دنیا ان میں منتقل کر دی۔ افسانہ صرف اتنا ہے کہ درتھر ایک لڑکی سے محبت کرنے لگا اور وہ اس سے۔ لیکن اس کی شادی کسی اور شخص سے ہو گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درتھر نے ہجر و فرقت کی کڑیاں بھیلے بھیلے آخر کار ایک دن خود کشی کر لی۔ درتھر کا وہ خط جو اس نے خود کشی سے پہلے اپنی محبوبہ کو لکھا ہے۔ ایک ایسا شاہکار ادب ہے جس کی مثالیں بہت کم کسی زبان کے لٹریچر میں ملتی ہیں

فاضل مترجم کا ملک کو ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے زبان کی گرانقدر خدمت انجام دی۔ ترجمہ بڑی حد تک صاف و سلیس ہے، گو ترقی کی گنجائش اس میں ابھی بہت کچھ پائی جاتی ہے۔

فاضل مترجم نے مقدمہ میں گوٹے کے مفصل سیرت بھی قلم بند کر دی ہے اور اس کی تصانیف پر بھی دلچسپ تبصرہ کر دیا ہے جسکی سخت ضرورت تھی۔ یہ کتاب پھر میں لٹریچر سٹڈی کمیٹی نمبر ۱۔ بیلی روڈ الہ آباد سے مل سکتی ہے

لاہور میں ایک مذہب شکن انجمن قائم ہوئی ہے اور یہ رسالہ اس انجمن کی پہلی تبلیغی کوشش ہے
تجدید عمل | یہ رسالہ مکھنوں کے مرزا عسکری علی خاں مجاز می نے لکھا ہے اور صحیح آئینہ ہے ان خیالات کا جو آج کل

ہر سوچنے والے دماغ میں پیدا ہو رہے ہیں اور آہستہ آہستہ مذہب کی عمارت کو متزلزل کرتے چلے جاتے ہیں اس رسالہ میں مختلف ابواب کے ماتحت مختلف عنوانات سے بحث کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مذہب کا

وجود عہد تاریک کی یادگار ہے اور اب زمانہ حال میں مذہبیت کو قائم رکھنا ذہنی ارتقاء کی راہ میں ایک سنگ گراں حائل کرنا ہے جسے انسانیت کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ رسالہ فی الجملہ دلچسپ اور مطالعہ کے لائق ہے

معلوم نہیں ہمارے علماء کرام کی نگاہ سے یہ رسالہ گزرا ہے یا نہیں، اور عبد الماجد صاحب دریا بادی

”قبلہ دیں مددے، کعبہ ایماں مددے“ نے بھی کوئی کارروائی اس انجن اور اس رسالہ کے مصنف کے خلاف مقدمہ چلانے کی کی ہے یا نہیں اور اپنے مذہب کی حمایت کے لئے حکومت برطانیہ کو سلنے دستِ سوال پھیلا یا یا نہیں۔ اگر ان کے علم میں یہ بات اب تک نہیں آئی تو اب میں ان کو آگاہ کرتا ہوں اور ان کے جوشِ ایمانی کے مظاہرہ کا منتظر ہوں، لیکن اگر یہ جاننے کے بعد بھی وہ خاموش رہیں تو سوئے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہن بازی اگر چہ پانہ سکا سر تو کھوسکا

کس منہ سے اپنے آپ کو کتاہو عشق باز اے روسیہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا

یہ رسالہ ۸ میں اردو بک اسٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتا ہے

اس کا تجربہ نہ کیجئے



اگر آپ کو پندرہ کتابیں مختلف سائز کی ایک الماری میں رکھی ہوئی دیدی جائیں اور کہا جائے کہ ان کو الٹ پلٹ کر جتنی صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں الماری میں ترتیب دیجئے تو بظاہر آپ کو یہ کام بہت آسان نظر آئیگا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک کتاب کے نکلنے اور رکھنے میں صرف ایک منٹ صرف ہو تو بھی آپ کو ۹۹۹۹۹۹۹۹ سال کا زمانہ درکار ہوگا

معلومات

فن خطابت کے دس اہم اصول کے بتائے ہیں:-
فرانس کے مشہور ماہر خطابیات نے ذیل کے دس اصول فن خطابت

- ۱۔ ہمیشہ نرم و آہستہ آواز سے بولنا شروع کرو اور رفتہ رفتہ آواز کو بلند کرو
- ۲۔ ہر لفظ کو زبان اور لب کی پوری حرکت سے صاف صاف ادا کرو
- ۳۔ ہر لفظ دوسرے سے علیحدہ ادا کرو، تاکہ باہم گریں نہ جائیں
- ۴۔ ٹھہر ٹھہر کر، گہری سانس لیکر تقریر کرو اور ایسا کبھی نہ ہو کہ تم کچھ بول رہے ہو اور تمہارے دانت بند ہوں
- ۵۔ اپنے سامنے سامعین کی طرف دیکھتے رہو اور اگر کوئی تحریر پڑھ رہے ہو تو گوشش کرو کہ آواز کی موجوں کا رخ سامعین کی طرف سے نہ ہٹے
- ۶۔ جب خطبہ دو تو پوری طرح تنکڑے ہوئے کی گوشش کرو
- ۷۔ تقریر کے وقت کبھی تنگ و چست کپڑے استعمال نہ کرو
- ۸۔ کھانا کھانے کے بعد تقریر کرنے سے احتراز کرو
- ۹۔ میٹھی چیزیں زیادہ استعمال کرو
- ۱۰۔ اور اگر ان تمام احتیاطوں کے باوجود تمہاری آواز کام نہیں دیتی تو کسی طبیب سے رجوع کرو

موت کے بعد تاجپوشی | ایک عورت انیر سے ہو چکی تھی، لیکن چونکہ یہ شادی شاہ پرتگال کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی اور وہ اپنے بیٹے کی شادی کسی اور جگہ کرنا چاہتا تھا، اس لئے اس نے اپنی بہو کو قتل کر دیا اس کے تین سال بعد جب وہ مر اور بدرو تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی مقتول بیوی کی لاش کو نکلوایا اور لباس فاخرہ لپیٹ کر اس کو تخت پر بٹھایا اور سر پر تاج رکھا جس وقت یہ رسم ادا ہو رہی تھی بدرو اپنی مقتول ملکہ کے سامنے کھڑا ہوا اور ہاتھ اور تمام اہرا سر جھکائے ہوئے رسم احترام کو ادا کر رہے تھے

ایک عظیم الشان درخت | کلیفورنیا کے جنگلوں میں جو جماعتیں مفتشین کی بھرتی رہتی ہیں ان کو وہاں ایک عجیب و غریب درخت نظر آیا ہے جس کی عظمت کا مقابلہ دنیا کا کوئی درخت نہیں کر سکتا یہ درخت ۳۰۸ گز لمبا ہے اور بیس گز اس کا دور ہے۔ ہر چند اس کی لمبائی زیادہ حیرت انگیز نہیں کیونکہ اس لمبائی کے

درخت وہاں اور بھی پائے جاتے ہیں لیکن اس کی موٹائی البتہ حیرتناک ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس درخت کی لکڑی سے پورے بس میں گھر طیار ہو سکتے ہیں

کلیفورنیا میں لکڑی کے مکانات کثرت سے طیار ہوتے ہیں، چنانچہ وہاں ایک کلیسہ ایسا ہے جو صرف ایک ہی درخت کی لکڑی سے طیار ہوا ہے، لیکن اس درخت سے تو درجنوں کیسا طیار ہو سکتے ہیں

اس وقت یورپ میں ہر جگہ مقابلہ حسن کا سودا سایا ہوا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ کوئی نئی چیز ہے، درانحالیکہ اب سے چار ہزار سال قبل بابل و آشوریہ میں بھی یہی رواج پایا جاتا تھا اور وہاں کے بادشاہ بھی بالکل اسی طرح اس کا انتظام کرتے تھے جیسا آج کل یورپ و امریکہ میں نظر آتا ہے

فیصلہ کرنے والوں کی ایک جماعت بٹھادی جاتی تھی اور مقابلہ جمال میں شریک ہونے والی لڑکیاں نکلے سامنے سے گذرتی تھیں یہ ایک ایک کو دیکھ کر باتفاق رائے اس کی حسن کی قیمت کا اندازہ کرتی تھیں اور جو شخص ان سے نکاح کرنا چاہتا تھا، اس کو مقررہ قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس طرح جو روپیہ جمع ہوتا تھا وہ انھیں لڑکیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا تاکہ ان کے مصارف نکاح اور ہمیز کے کام آئے

جرمنی کے کسی شخص باول براؤن نے ایک کاغذ ایجاد کیا ہے جس پر آگ کا اثر نہیں ہوتا نہ جلنے والا کاغذ اور سخت سے سخت آگ اس کو جلانے سے عاجز ہے، درانحالیکہ بظاہر دیکھنے میں وہ بالکل معمولی

کاغذ معلوم ہوتا ہے

یہ کاغذ نوٹ، دستاویز وغیرہ کے لئے بہت موزوں ہے اور اب جرمنی میں غالباً اسی کاغذ کے "اوراق مالی" طیار کئے جائیں گے۔ یہ شخص اس سے قبل پچاس ایجادیں کر چکا ہے جو سب کی سب جرمنی میں رجسٹرڈ ہو چکی ہیں

جرمنی، فرانس، امریکہ میں تجربے کئے جا رہے ہیں کہ ڈاک ہوائیوں کے ذریعہ سے پہونچائی جائے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایک بڑی ٹنکی لی جائے گی جس کے

نصف حصہ میں ڈاک ہوگی اور بالائی نصف حصہ ہوائی ہوگا۔ اس ہوائی میں اتنی طاقت ہوگی جو ایک متعین مقام تک پہونچ سکے۔ اس مقام تک پہونچنے کے بعد وہ پھٹے گی اور ڈاک کے تھیلے چھتریلوں کے ذریعہ سے آہستہ آہستہ زمین پر اتر آئیں گے

اگر اس میں کامیابی ہوگی تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ گویا ڈاک تار کے ذریعہ سے بھیجی جاسکتی ہے۔ اور اس کے بعد دوسرا قدم غالباً یہ ہوگا کہ بجائے ڈاک کے تھیلوں کے انسانوں کو ہوائی میں بٹھا کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہونچایا جائے۔ جرمنی میں اس کے تجربے ہو رہے ہیں اور پوری کامیابی کے ساتھ

امریکہ میں اشتہار کا بالکل نیا طریقہ | امریکہ کی ایک کتب فروش کمپنی نے ایک عجیب و غریب طریقہ کتابیں فروخت کرنے کا اختیار کیا ہے۔ اس نے دس ہزار اشتہار مع ایک لفظ کے ملک میں تقسیم کئے ہیں اور اشتہار میں صرف یہ لکھا ہے کہ لفاظہ چاک کر کے مطالعہ کیجئے۔ لفاظہ کے اندر ایک ٹکڑا ڈور سے کاٹتا ہے اور ایک گوند لگا ہوا فیٹہ جس پر کارخانہ کا پتہ چھپا ہوا ہے، اسی کے ساتھ ایک تحریر ملتی ہے جس میں درج ہے کہ آپ ہماری دوکان سے ہر نئی شائع شدہ کتاب مفت لے کر پڑھ سکتے ہیں اگر پسند ہو تو قیمت بھیج دیجئے ورنہ یہ ڈور الپیٹ کر اور فیٹہ چپکا کر ڈاک خانہ میں دیدیجئے، کتاب ہم کو واپس مل جائے گی

غار کے اندر رہنے والی قوم | چین کے صوبہ شانسی میں تمام لوگ ان غاروں کے اندر زندگی بسر کرتے ہیں جو کسی وقت ان کے آباؤ اجداد نے پہاڑوں میں کھودتے تھے۔ یہ لوگ مغل نسل کے ہیں اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے کافی ترقی یافتہ ہیں کیونکہ یہ لوگ کاشتکاری، پارہ ہانی، اور سنگتراشی وغیرہ سے بخوبی واقف ہیں

حال ہی میں جرمنی کے ایک سیاح نے ان کا حال لکھا ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ اس سیاح کو حیرت ہو گئی جب اس نے دیکھا کہ ان کے مکانات جو غاروں کے اندر پتھر کاٹ کر بنائے گئے ہیں نہایت پاکیزہ ساخت کے ہیں اور فن تعمیر و سنگتراشی کا بہترین نمونہ کہلائے جاسکتے ہیں۔ یہ لوگ نہایت نفیس کپڑے طیار کرتے ہیں، عمدہ چٹائیاں بنتے ہیں اور گھروں کی آرائش و زیبائش کے لئے بھی مختلف قسم کی چیزیں بناتے ہیں ان کی صحت بہت اچھی ہے اور باوجودیکہ غاروں میں رہنے سے سورج کی روشنی ان تک بہت کم پہنچتی ہے ان کی تندرستی قابل رشک ہے۔ ان کے یہاں جب کوئی مر جاتا ہے تو اس کے دفن کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور قبر کی طیاری میں حد درجہ فنی نزاکت صرف کی جاتی ہے

صرف اخیر جون ۱۹۳۳ء تک

بالکل مفت

سائنس کے عجائب ۶ — فراسٹ التحریر مکمل عمر — فراسٹ الیڈ عمر

یعنی

صرف ۸ کے ٹکٹ بھیج دیجئے، تینوں کتابیں آپ کو مل جائیں گی

میں ہر نگار لکھنؤ

میلینون
۵۵۶۶

مصفی

ہندوستان
میدی

طب یونانی کا تازہ کرشمہ

انسان کی زندگی کا مدار خون پر ہے خون اگر خراب ہو گیا ہے تو آدمی کی تندرستی قائم نہیں رہ سکتی ہندوستانی دواخانہ دہلی 'مصفی' ایجاد کر کے تمام ملک کو مقابلہ کی دعوت دیتا ہے اور بلا خوف تردید دعویٰ کرتا ہے کہ صفائی خون کے لئے 'مصفی' سے بہتر دوا آج تک نہ ایشیا پیش کر سکا ہو نہ یورپ 'مصفی' ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کا خلاصہ ہے۔ اور مسیح الملک ثانی حکیم حاجی محمد احمد خاں صاحب کے مشورہ سے جدید سائنٹفک طریق پر طیار کیا گیا ہے۔ خون کی خرابی سے پیدا ہونے والے ہر مرض کی تیر ہدف دوا ہے۔ کھجلی۔ داد۔ پھنسیاں وغیرہ حتیٰ کہ سوزاک۔ آتشک۔ اور جذام کا زہریلہ مادہ بھی اس کے استعمال سے ہمیشہ کے لئے نابود ہو جاتا ہے۔ اس کی خوراک چاؤ کا ایک چمچ ہے۔ اور بلحاظ نفع مصفی درحقیقت اکسیری چیز ہے

قیمت ۱۲ خوراک کی شیشی صرف ۱۲ محصول نمہ خریدار

ترکیب استعمال

ایک خوراک صبح ایک شام تھوڑے پانی میں ملا کر اور اگر مرض کا جوش زیادہ نہ ہو تو دن میں

۳ مرتبہ استعمال کیا جائے

ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس ۲۲ دہلی سے طلب کیجئے



تصانیف حضرت نیاز پختوری

<p>گورکھ پور حضرت نیاز کے بہترین مثنوی مثنوی اور غزلوں کا مجموعہ دو جلدوں کے ایک تیس جلدوں میں مندرجہ تالیف کا شمار اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے مثنویوں میں ہر ایک مثنوی کی کیفیت و حصول</p>	<p>گورکھ پور گورکھ پور کی وہ معرکت آواز تالیف میں تین جلدوں میں میں تالیف کیا گیا ہے کہ ارتقا تدوین پر اوردت نے کتب پر دست چھڑایا اور دنیا تدوین کی تالیف کی کہ مثنویوں اور ان میں ہر ایک کی تالیف و حصول</p>	<p>شہادتی سرگزشت حضرت نیاز کا وہ علم افسانہ جو اردو زبان میں پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے حصول پر لکھا گیا ہے اس کی تالیف کی تازہ کن کی تالیف مثنویوں کی علاقہ کے وہ تالیف ہے تالیف و حصول</p>	<p>فراسنت الیوم مولانا نیاز پختوری کا افسانہ ہے ایک شخص ہاتھی کی شہادت اور کو لکھا گیا ہے جو سیرت عروج و زوال صحت بیماری غرض کے تالیف و حصول ہے تالیف و حصول</p>	<p>شاعر کا انجام نیاز نیاز کے عنوان کا افسانہ جو اردو تمام تالیف کی کیفیت ایک فلم میں موجود ایسے چٹا اور ہے اس قدر بلند پہلی کتاب میں دوسری جگہ قیمت علاوہ</p>	<p>خبرات بھاشا جناب نیاز نے ایک تالیف کے ساتھ بہترین شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں تالیف کی ایسے چٹا اور پہلی کتاب میں دوسری جگہ قیمت علاوہ</p>
<p>عربی پر بات ہیں پر عربی تالیف کے ساتھ کہ وہ تالیف عربی پر بات سیرت عروج تالیف و حصول</p>	<p>نیاز کی تالیف تین جلدوں کا میں تالیف کیا گیا پہلی مرتبہ جو سوزائیں زبان ارتقا و تالیف تالیف و حصول</p>	<p>نیاز کی تالیف نیاز کی تالیف جو ادبیات و کا عجیب و غریب ہے ایک بار اس شروع کر دینا پڑھ لیا ہے اس کی تالیف و حصول</p>	<p>نیاز کی تالیف نیاز کی تالیف تالیف و حصول تالیف و حصول تالیف و حصول</p>	<p>نیاز کی تالیف نیاز کی تالیف تالیف و حصول تالیف و حصول تالیف و حصول</p>	<p>المسئلۃ الشرعیۃ مصطفیٰ کامل پاشا مشہور عالم کتاب یہ وہ کتاب ہے یورپ و ایشیا سیاسیات پر تالیف اور تالیف و حصول</p>

<p>تذکرہ شہسوار مولانا نیاز کی تالیف تالیف و حصول</p>	<p>مثنوی اللہ تالیف و حصول</p>	<p>فراسنت التحریر تالیف و حصول</p>	<p>فراسنت التحریر تالیف و حصول</p>
--	---	---	---

تنگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے
 رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک فرس میں طلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا۔
 سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صبر) ششماہی تین روپیہ (صبر)
 بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمارا	فہرست مضامین جولائی ۱۹۳۳ء	جلد ۲۴
۲		ملاحظات
۹		مغربی زبانوں کے ادب لطیف پر سرسری تبصرہ
۲۱		جوگیش کی شاعرانہ لفظ ہمیشیں
۲۹	محمد نصیر الدین	دنیا کو اب مذہب کی ضرورت نہیں ہے
۳۰	نسیم رضوانی	مقدس روس
۴۷		مکتوبات نیاز
۵۴		باب الاستفسار
۵۹		باب المراسلہ والمناظرہ
۶۶		مطبوعات موصولہ
۶۹		انعامی مضمون
۷۰	علی اختر۔ عدم۔ اختر انصاری۔ راز۔ گوکب	منظومات
۷۸		معلومات
۲۲۵	اسی	تذکرہ معرکہ سخن

جو وہ تو وہ معلوم کر سکتا ہے نہ ہوگا۔

نگار

ادیسرا۔ نیاز فختوری

شمار ۱	جولائی ۱۹۳۳ء	جلد ۲۲
--------	--------------	--------

ملاحظات

نوع انسانی کی تفریق دنیا میں جن جن صورتوں سے پیدا ہوئی، ان کی تفصیل تو خیر مشکل ہے لیکن پند کھلی کھلی صورتیں ایسی ہیں جن کو آسانی سے بتایا جاسکتا ہے اور آسانی سے ہر شخص سمجھ بھی سکتا ہے۔

عہد ظلمت و بہل کو چھوڑئے جب انسان کی حالت ایک جانور سے زیادہ نہ تھی اور وہ انسان کے "مفہوم اجتماعی" سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ دوسرے انسان پر حملہ کرتا تھا اور اُسے کھا جاتا تھا۔ وہ اپنے ہی خاندان کے افراد پر غصہ کرتا تھا، اور انھیں ہلاک کر ڈالتا تھا۔ بلکہ اس زمانہ کو سمجھئے جب انسان نے اجتماعی زندگی شروع کی اور "من و تو" کی تفریق مٹانے کے لئے "مذہب" کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مذہب کو اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی؟

کیا وہ دنیا سے خود غرضی و حب ذات کے جذبہ کو مٹا سکا؟۔ اس کے جواب میں تاریخ کی ورق گردانی کر دو اور دیکھو کہ اس کے جتنے صفات خون سے رنگین نظر آتے ہیں۔ ان میں کیا سوائے مذہبی جنگوں کے کوئی اور چیز پائی جاتی ہے۔ پھر تماشہ یہ کہ جس مذہب نے اپنے آپ کو جتنا زبردست علمبردار امن و سکون کا بتایا، اتنا ہی زیادہ وہ "غار تگر امن و سکون" زری کو جتنا زیادہ برا ظاہر کیا اتنی ہی زیادہ خونریزی اسے کی۔ لیکن خیر اس کو بھی

پھوڑے کہ یہ افسانہ بھی بہت بُرا نا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ دور مذاہب چونکہ انسان کے عہد وحشت سے قریب تر تھا اس لئے یہ سب کچھ ظاہر ہونا مستبعد نہ تھا۔ آئے، اس دور کو دیکھئے جسے دور عقل و حکمت کہتے ہیں، عہد اخلاق و انسانیت سے تعبیر کرتے ہیں اور جو علوم و فنون، اور گوش و ہوش کا زمانہ کہلاتا ہے۔ ہاں، تو سوچئے کیا اس عہد میں انسان زیادہ صلح جو و امن پسند ہو گیا ہے، کیا اس کی خوریزیاں و خوں آشامیاں کم ہو گئی ہیں، کیا اب وہ آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا اس کی خود غرضی و نفس پرستی مٹ گئی ہے؟ یقیناً نہیں۔ اگر پہلے ایک وحشی انسان صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لئے دوسرے انسان کو ہلاک کر ڈالتا تھا تو اس عہد کا متمدن انسان اپنی اجتماعی گرسلی دور کرنے کے لئے قوم کی قوم کو کھا جانے کے لئے آمادہ ہے اور اگر پہلے صرف اس بات پر لڑائی ہوتی تھی کہ فلاں اہرمن پرست ہے اور فلاں یزداں پرست، تو اب اس بات پر ہوتی ہے کہ فلاں کارنگ سیاہ ہے اور فلاں کا سپید، پہلے انسان کی خواہشیں محدود تھیں اور تمناؤں مختصر اس لئے لڑائی بھی جلد ختم ہو جاتی تھی، لیکن اب حرص انسانی کی کوئی حد و پایاں نہیں اس لئے جنگ کے ختم ہونے کی بھی کوئی توقع نہیں۔ پہلے انسان لڑتا تھا صرف زندہ رہنے کے لئے اور اب لڑتا ہے عیش کرنے کے لئے، پہلے جنگ ہوتی تھی بقا و حیات کے لئے اور اب ہوتی ہے ”توفیق معصیت“ کے لئے، یعنی اگر پہلے سوال ضرورت کا تھا تو اب لذت کا ہے

یہ استعماری مظالم، جو صنعت و تجارت کی ترقی کے بہانہ سے کئے جاتے ہیں، یہ مستبدانہ ستم رانیاں جو تہذیب و شائستگی کے نام سے روارکھی جاتی ہیں، یقیناً بقا و حیات کے لئے ہیں نہ ”سدر مق“ کے لئے بلکہ اُس جذبہ حرص و خود غرضی کی تسکین کے لئے ہیں، جو آتشکدہ بہنم کی طرح ہر وقت صدائے ہل من مزید بلند کر رہا ہے پھر چونکہ اجتماعی مواعی و جرائم کے لئے اجتماعی تدابیر کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے ظالم جماعتوں نے مظلوم جماعتوں کے خلاف اپنے اندر اتحاد عمل پیدا کرنے کے لئے مختلف تدابیر و غور کیا اور آخر کار انھوں نے ایک ایسا بہانہ تلاش کر ہی لیا جو کافی نمایاں اور یہ اندازہ حرص و طمع کا کافی وسیع تھا۔ یعنی انھوں نے بنی نوع انسان میں تفریق پیدا کرنے کے لئے اب مذہب و مذہبیت کو سامنے نہیں رکھا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ وسیع ذریعہ نسل و رنگ کے امتیاز کا پیدا کیا۔ یہاں تک کہ آج یورپ و ایشیا کا افراق نہ جغرافی اصول پر قائم ہے نہ تاریخی حقیقت پر، بلکہ صرف اس نظریہ پر کہ یورپ کا انسان گورا ہے اور ایشیا کا کالا۔ ایک کارنگ سفید ہے اور دوسرے کا سیاہ۔ پھر جنھوں نے استعمار مغربی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ یہ امتیاز کب سے مشرق کو پامال کر رہا ہے اور کس کس طرح اس تفریق سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا

لیکن چونکہ ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے اور ہر انسانی تدبیر کی ایک عمر، اس لئے یہ ضرور تھا کہ مشرق کسی نہ کسی وقت اس ذلت کو محسوس کرتا، اس لعنت سے بیزار ہو جاتا اور اگر کسی کے پاس چشم بینا موجود ہے تو وہ معلوم کر سکتا ہے کہ اس

احساس کی لہر اب مشرق کے ہر گوشہ میں پائی جاتی ہے

اس احساس و بیداری کے کیا اسباب ہیں؟ — اس میں شک نہیں کہ انخطاط اور زوال خود اپنے اندر عروج و ترقی کے اسباب پنہاں رکھتے ہیں، لیکن ان اسباب کو بروئے کار لانے کے لئے کوئی نہ کوئی تحریک ضروری ہے۔ پھر جنھوں نے بیسویں صدی کی ابتدا سے سیاسیات عالم کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس تحریک کا باعث صرف وہی امتیاز نسل و رنگ کی دیوار تھی جو مغرب نے اپنے اور مشرق کے درمیان حائل کر رکھی ہے اور جسے جنگ عظیم نے نمایاں طور پر ظاہر کر کے اہل مشرق کو خواب گراں سے جگا دیا

تیس سال اس طرف کی بات ہے کہ جاپان سوائے اپنے جزیرہ کے ایشیا میں کسی ایک جزیرہ کا بھی مالک نہ تھا، لیکن اب کیا و نشا اس کے قبضہ میں ہے، پنجو ریامیں اس کی حکومت ہے، خط استوا تک تمام جزائر جنوبی اس کی ملکیت میں ہیں، اور اعلیٰ میں اس کا شمار ہوتا ہے اور بحری قوت میں تیسرا درجہ اس کا سمجھا جاتا ہے

سینہ ۱۹۴۷ء میں چین کی حالت ایک ایسی لاش کی تھی جسے مختلف کتے نوچنے کے لئے گھیرے ہوئے تھے لیکن جب ہاں ملکیت ختم ہو کر جمہوریت پیدا ہوئی، اور ملک میں بیداری کے آثار ظاہر ہوئے تو اس کی تمام املاک جو دول یورپ کے اجارہ میں تھی واکزاشت ہوئیں اور اس کا حق استقلال تسلیم کر کے وہ امتیازات اٹھانے پر تے جو اہل مغرب کو وہاں حاصل تھے

افغانستان کی جو حالت تیس سال قبل تھی وہ بھی کسی سے مخفی نہیں کہ اس کا وجود صرف اغراض برطانیہ کی تکمیل کے لئے تھا اور حکومت ہند کا تابع اس کو سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح ایران کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف روس اس کو دباتا چلا جاتا تھا اور دوسری طرف برطانیہ — — —۔ بلا عرب دولت عثمانیہ نہیں بلکہ حقیقتاً دول یورپ کی سیادت میں تھے، لیکن اب یہ تمام ممالک خود مختار ہیں، آزاد ہیں اور استقلال تام کے مالک کہلائے جاتے ہیں۔ ہر چند ہندوستان اس وقت تک حصول آزادی میں کامیاب نہیں ہوا، لیکن جو تحریک ناکستریں پیدا ہو گئی ہے اور جسے ”نظم نیابت“ کے حقوق حاصل کر کے ایک خوشگوار مستقبل کی بنیاد ڈال دی ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں — — — اس لئے اب سوال یہ ہے کہ مشرق کی اس عام بیداری کا سبب کیا تھا یعنی کیا کوئی اندرونی تحریک از خود بروئے کار آئی یا کسی خارجی محرک نے یہ احساس پیدا کیا — — — اس کا جواب وہی ہے جو اس سے قبل ہم دے چکے ہیں اور پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ نتیجہ ہے اہل مغرب کی نخوت و کبر بانی کا، عجب و غرور کا جس نے مشرق کے انسان کو انسان نہ سمجھ کر جانور یا کاسا سلوک اس کے ساتھ کیا اور اس کو سٹک جامد جان کر ہمیشہ ٹھکرایا — — — پھر چونکہ انسان ہمیشہ ٹھوکریں کھانے کے بعد ہی سنبھلتا ہے اس لئے اہل مشرق کو بہر حال احساس ذلت ہونا چاہئے تھا۔ اور جب ایک بار یہ

احساس پیدا ہو گیا ہے تو کسی نتیجہ تک پہنچنا ضروری ہے، خواہ اس کے لئے کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ کرنا پڑیں یہ تو ایک عمومی تبصرہ ہوا ایشیاء کے تمام ممالک پر لیکن انھیں میں ایک مخصوص ملک ایسا بھی ہے جو اپنی نوعیت آبادی کے لحاظ سے جداگانہ تنقید کا محتاج ہے اور وہ ہندوستان ہے

تمام ایشیاء میں یہی ایک ملک ایسا ہے جہاں دو متضاد خیال و اعتقاد کے انسان بستے ہیں اور اس لئے اگر حصول آزادی میں یہ دوسرے ملکوں سے پیچھے رہ جائے تو حیرت کی بات نہیں، کیونکہ جب تک کوئی ایک عرض مشترک کسی ملک کی آبادی میں نہ پیدا ہو۔ حصول مدعا آسان نہیں، اور یہاں ہی امر ازل بس دشوار نظر آتا ہے

یقیناً اس باب میں ہندو مسلمان دونوں قابل الزام ہیں، لیکن میں مسلمانوں کو زیادہ قصور وار ٹھہراتا ہوں کیونکہ باوجود اس امر کے کہ وہ یہیں کے قدیم باشندے ہیں، یہیں کی آب و ہوا میں پیدا ہوئے، پلے اور بڑھے، لیکن وہ محض اختلاف مذہب کی وجہ سے اپنے آپ کو ہندوؤں سے بالکل الگ تھلاگ رکھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اختلاف مذہب انسان کی قومیت کو نہیں بدل سکتا۔ اور وطنیت کا رشتہ ایسا مضبوط رشتہ ہے جو کسی طرح ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔ — یہ ہو سکتا ہے کہ آج ایک ہندو مسلمان ہو کر ہندوؤں کی برادری سے خارج ہو جائے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک مسلمان آریہ یا عیسائی ہو کر، مسلمانوں کی جماعت سے نکل جائے، لیکن یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ بجا ہندوستان کے فرانس یا امریکہ کا باشندہ کہلائے اور اس کی وطنیت بدل جائے۔ پھر مسلمانوں نے حجاز و عرب، ترکی و ایران سے تو ہمیشہ دلچسپی لی کیونکہ سوال ہم مذہب ہونے کا تھا، لیکن خود ہندوستان کے حالات سے کبھی اعتناء نہ کیا جہاں خود انھیں اپنی زندگی بسر کرنا ہے۔ اگر اسلام کسی انسان کے قومیت کو بدل دینے کا مدعی ہو کر رونا ہوا ہے، تو نتیجہ معلوم اور اگر اس کا مقصد و ادعا یہ نہیں ہے تو پھر یہ ذہنیت کدسی؟

میں اس کا خطا دار اپنے یہاں کی مولوی جماعت کو قرار دیتا ہوں، جن کو آج تک مذہبیت و وطنیت کے امتیاز کا سلیقہ پیدا نہیں ہوا اور جو ملک و قوم کے مسائل میں بھی مذہبی تقشف کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتے آج کل بعض اہل نظر مسلمان بھی یہ شکایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ہندوؤں کی جماعت ہندوستان میں ہندو حکومت قائم کرنا چاہتی ہے اور مسلمانوں کے جذبات کے ساتھ کسی رواداری کے لئے آمادہ نہیں۔ درانجا ایک شخص غور کرنا چاہئے کہ کیا وہ خود باشندہ ہندوستان ہونے کی حیثیت سے ہندو نہیں ہیں اور کیا ان کا یہ کنناد پر دہ اس آہش کا اظہار نہیں کہ وہ مسلم حکومت چاہتے ہیں۔ پھر جب وہ خود ہندوستان سے کوئی رشتہ وطنیت قائم رکھنا نہیں چاہتے تو ہندوؤں سے شکایت کیوں؟ وہ تو بہر حال ہندو ہیں، ہندو رہیں گے۔ اور ان کا قومی فرض ہے کہ وہ اپنی حکومت قائم کریں خواہ مسلمانوں کو گوارا ہو یا ناگوار

یہ بات اب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے کہ ایک بار جنگ اور ہوگی، اور ایسی شدید کہ شاید دنیا پھر کبھی ستر اٹھاسکے۔ اسلحہ سازی کے خلاف جلسے پر جلسے ہو رہے ہیں، صلح و امن کی ہر طرف سے پکار ہو رہی ہے، لیکن حقیقت کے لحاظ سے امن و سکون، غالب کے اس مصرعہ کی تفسیر سے زائد نہیں کہ

آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

ٹھیک اسی وقت جبکہ فرانس، جرمنی کی اسلحہ سازی کو ناقابل معافی جرم قرار دیکر اس کا انسداد کلی چاہتا ہے، وہ خود اپنے ملک کے محاصل کا بڑا حصہ فراہمی اسلحہ میں صرف کر رہا ہے، اور عین اسی لمحہ میں جب جرمنی صدائے امن و سکون پر لبیک کہتا ہوتا ہے، روہر کے کارخانے اس کے لئے لاکھوں کوہ شکن توپیں ڈھالنے میں سرگرم کار نظر آتے ہیں۔ بالکل یہی حال اٹلی و برطانیہ کا ہے اور روس و امریکہ کا

اس لئے اس سلسلہ میں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ درپردہ جنگ کی طیاریاں کرتے ہوئے، جنگ سے احتراز کرنے کی تبلیغ کرنا کیا معنی رکھتا ہے اور دوسرے یہ کہ اگر واقعی جنگ ہونی تو کیوں ہوگی اور کہاں سے یہ شعلہ بلند ہوگا۔ امراؤں کا جواب زیادہ مشکل نہیں، کیونکہ وسائل سیاسی کی یہ پہلی مثال نہیں ہے جس پر تعجب کیا جائے اور تجارتی حرص و طمع کا عفریت جب تک سر پر سوار ہے، باہمی مسابقت یقیناً قائم رہے گی اور اس طرح جو بے اعتمادی و خود غرضی قدر ناپیدا ہونا چاہئے، وہ ہمیشہ ایک کو دوسرے سے اسی طرح برسرِ پرخاش رکھے گی، یہیں سے ”کیوں“ کا جواب بھی مل سکتا ہے۔ رہ گیا سوال جگہ و مقام کا سو اس کے متعلق لوگوں کی مختلف رائیں ہیں بعض کہتے ہیں کہ جنگ مستقبل کی آگ مشرق اقصیٰ سے بلند ہوگی، بعض اس کا وسط ایشیا سے بھڑکنا ظاہر کرتے ہیں اور بعض کو یقین ہے کہ وہ پھر جرمنی ہی سے رونما ہوگی۔ لیکن ایک بالغ نظر جماعت ایسی بھی ہے جس کی نگاہ جنوب

یورپ پر جاتی ہے اور جسے یقین ہے کہ جہاں سے یہ شعلہ اڑلے بار بھڑکا تھا وہیں سے دوبارہ بھی بھڑکے گا۔ گزشتہ جنگ سے بڑی بڑی قوتوں کو فائدہ پہونچا ہوا نقصان، لیکن یہ واقعہ ہے کہ یورپ کی بعض چھوٹی چھوٹی قوتیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئیں۔ جزیرہ نمائے بلقان میں ہنگاری، سلوون، کروٹ، مقدونی، البانی اور مائٹی ٹرن بہت سی قومیں آباد تھیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو ترقی و آزادی کا مستحق جانتی تھی لیکن جنگ عظیم نے حکومت سرویا کو محو کر کے ان تمام قوموں کو ان کے فطری حقوق سے محروم کر دیا اور جگو سلویویا کی حکومت قائم کر کے ایک ایسے کوہِ آتش فشاں کی بنیاد ڈالی جس کا بھڑک اٹھنا کسی نہ کسی دن بالکل یقینی ہے

اس وقت جگو سلویویا مالی حالت کے لحاظ سے تقریباً دیوالیہ ہو چکا ہے اور اشتراکی انقلاب کی لہرواں نہایت تیزی کے ساتھ دوڑ چکی ہے، کروٹ جماعت جو حکومت ہنگری سے جدا کر دی گئی ہے کھلی ہوئی بغاوت پر آمادہ ہے اور مقدونی لوگ جنھیں حکومت جگو سلویویا حد درجہ بیدردی سے قتل کر رہی ہے، لاکھوں کی تعداد میں بلغاریا بھاگ

گئے ہیں اور ایک عام برہمی ان میں پیدا ہے۔ اسی طرح ۵ لاکھ البانیوں کی جماعت ہر وقت آمادہ ہے کہ ذرا سا موقع آئے اور جگوسلیویا کی غلامی سے آزاد ہو۔ الغرض سیاسیات یورپ کی یہ نوزائیدہ سلطنت جس کو ڈول مغرب نے ایک (Buffer State) قرار دے کر ہنگری، سربیا اور مانیٹو نگر وغیرہ کی قوت کو توڑنا چاہا ہے، صدر یہ خطرناک چیز ہے اور کسی نہ کسی دن اس کو تمام دنیا میں تباہی پھیلانا ہے۔

مانیٹو نگر کی داستان بہت زیادہ دردناک ہے، کیونکہ گزشتہ جنگ میں اتحاد میں اس کا ساتھ دینے کے باوجود اس کی مٹی پلید ہو گئی اور اس کے قومی اجتماع کو بالکل دہم برہم کر دیا گیا۔ — ہر چند عہد نامہ لندن کی زور سے خدا جانے کیا کیا اس کو دے جانے کا وعدہ کیا گیا تھا، لیکن عملاً سوائے اس کے کچھ نہ ہوا کہ اس کی سہی سہی قوت کو بھی ختم کر دیا گیا اور اس وقت تقریباً ایک لاکھ اہل مانیٹو نگر جو بالکل مسلح ہیں۔ سربیا سے باہر جلا وطنی کی حالت میں لطیفہ اغیبی کے منتظر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ وقت سالہ ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوئی تو مانیٹو نگر و کسی کا مقروض نہ تھا اور جنگ کے بعد ۱۹۱۹ء کو ۳۰ لاکھ طلائی مارک بطور معاوضہ اس کو دیا جانے لگا تھا، لیکن غریب کو معاوضہ تو کیا ملتا، جو کچھ اس کے پاس تھا وہ بھی چھین لیا گیا اور جگوسلیویا کی لعنت اس پر اور اضافہ کر دی گئی۔

الغرض اس وقت یورپ میں سب سے زیادہ بے چینی جس جگہ پائی جاتی ہے وہ جزیرہ نمائے بلقان ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے، یقیناً کسی نہ کسی دن یہاں فساد شروع ہوگا اور اس آگ میں ایک ایک کر کے تمام ڈول یورپ کو بھر کودنا پڑے گا۔ خواہ اس کا نتیجہ دنیا کے لئے قیامت کبریٰ ہی کی صورت میں کیوں نہ ظاہر ہو۔

یہ سال ارباب ادب و انشاء کے لئے بہت خوں آشام ثابت ہوا۔ مرزا رسوا کی موت، طباطبائی کا انتقال، ناصر زید فراق کی رحلت اور پھر اخیر میں میرزا نصر علی کا اٹھ جانا، ایسے معلوم واقعات نہیں جنہیں دنیا کے علم و ادب فراموش کر سکے۔

یہ سب، بزم اردو کے اُس دور کی یادگار تھے جس کو دنیا بھلا بھلی ہے اور جو مستقیم و متاخرین کے درمیان "سندۃ الوسطی" کی حیثیت رکھتے تھے،

مرزا رسوا پر لکھنؤ کی زبان دانی ختم ہو گئی، اور فراق بردہلی کی، طباطبائی کے ساتھ لکھنؤ کے عہد آخیز کا فضل و کمال ختم ہو گیا اور ناصر علی ادب و انشاء کو اس رنگ کے اپنے ساتھ لے گئے جو ان کی زندگی میں بھی کسی دوسرے کا حصہ نہ ہو سکا، اب مرنے کے بعد کیا ہوگا۔

میرزا نصر علی کی ساری زندگی اردو زبان کی خدمت میں گزری اور ہر چند وہ خدمتِ صلائے عام کے اجراء سے آگے نہ بڑھ سکے، لیکن جنہوں نے صلائے عام کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کی جلدوں میں کیسے کیسے

جو اہر ادب پوشیدہ ہیں اور وہ کونسی خدمت زبان تھی جو اسی رسالہ کے ذریعہ سے میرزا ناصر علی نے تقریباً ایک تہائی صدی تک انجام نہیں دی

وہ ان کا سہل ممتنع انداز تحریر، وہ ہلکے ہلکے مزاحیہ فقروں کے ساتھ مابعد الطبیعیات کے خشک و بے آہ رنگ نظریوں کو ہمارے لئے گوارا بنادینا۔ میرزا ناصر علی کی وہ خصوصیت تھی جس سے ان کی تحریر کا کوئی فقرہ خالی نہ ہوتا تھا۔ پنشن لینے سے قبل بھی ان کا محبوب مشغلہ کتابوں کے مطالعہ کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن پنشن کے بعد تو ان کی زندگی کا کوئی لمحہ لکھنے پڑھنے کے علاوہ کسی اور شغل میں بسر ہی نہیں ہوا۔ جب دیکھئے وہ ہیں اور خاک آلودہ کتابوں کا ڈھیر، کتابوں کا ڈھیر ہے اور ان کی جھکی ہوئی گردن۔ پڑھ نہیں رہے ہیں تو لکھ رہے ہیں، اور لکھتے لکھتے تھک گئے تو پھر پڑھتے ہیں مصروف ہیں۔ الغرض ان کی زندگی ایسی قابل رشک زندگی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے اور جس پر حقیقتاً ایک انسان کو فخر کرنا چاہیے

مجھے معلوم ہے کہ جناب انصار ناصر علی (دبی۔ ۱۷) مرحوم کے صاحبزادہ ان کے مضامین کا مجموعہ شائع کرنا چاہتے ہیں، خدا کرے یہ خبر صحیح ہو کیونکہ اس طرح مرحوم کے ادبی خدمات سے ملک کو مستفید ہونے کا موقع حاصل ہو جائے گا۔ لیکن میں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ انتخاب مضامین کا کام کسی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ اور تنہا ایک شخص اس اہم ذمہ داری کو اپنے سر نہ لے

نگارستان کے دوسرے حصہ کی کتابت شروع ہو گئی ہے اور غالباً ۳، ۴ ماہ میں شائع ہو جائے گا اس کے صفحات کا اندازہ کم از کم ۵۰۰ صفحات کیا گیا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ہو جانا ممکن ہے نگارستان حصہ اول میں سیکڑے تک کے ادبی مضامین و افسانے درج کئے گئے تھے۔ اور اس حصہ میں سیکڑے کے بعد سے لے کر اس وقت تک کے ادبی مقالات اور افسانوں کا انتخاب درج ہوگا۔ جو حضرات اشاعت سے قبل مدد فرمائیں گے ان کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہوگا

ترکی ہوویہ

انقلاب ترکی کی بے مثل تاریخ، ایک نازک قوم کی جدوجہد کی بلیغ آموز داستان، مسند مہر ضمیر احمد ہاشمی ام۔ ۱۔ ۱ قیمت علاوہ موصول ایک روپیہ آٹھ آنے (۱۹۳۳ء)

منیجر نگار

اون۔ کیا تمام لوگ بیدار ہو جائیں گے؟
 زرشن۔ ہاں۔ یقیناً
 ایلیکسے۔ نہیں کچھ ایسے بھی ہوں گے۔ جو ہماری آواز
 نہیں سنیں گے۔ ایسے بے حس لوگ جو رقص و
 سرود کے وقت بھی سوتے رہتے ہیں۔ ان کے
 خلاف ہم قتل کی تعلیم دیں گے۔ یہ سب کچھ
 روس کے لئے کیا جائے گا۔ اور جب یہ سب
 کچھ ہو جائے گا۔ روس آزاد ہو جائے گا۔

زرشن۔ (متحیر ہو کر) روس آزاد ہو جائے گا!
 ایلیکسے۔ ہاں۔ کیونکہ اس وقت صرف وہی لوگ زندہ
 رہیں گے۔ جنہیں آزادی مرغوب ہے۔ وہ کسی
 پر جبر نہیں کریں گے۔ تمام بڑے منظم نیست و
 نابود ہو جائیں گے۔ انہیں آزادی کی دیوی
 پر بھینٹ چڑھا دیا جائے گا۔

زرشن۔ اور ہم آزاد ہوں گے؟
 ایلیکسے۔ بالکل پرندوں کی طرح آزاد ہوں گے۔ پھر

ہم اس حکومت کے ماتحت ہوں گے جس کی
 ہیئت ترکیبی کے عناصر معقول ہوں گے۔ اور جس
 میں زمانہ جاہلیت کی یہود گیاں اور نامعقول
 باتیں نہ ہوں گی۔ ہم..... اولاً
 اب تمھاری چال ہے

(وہ بسا پر جھک جاتے ہیں۔ موضع کا سپاہی

داخل ہوتا ہے)

سپاہی۔ شاہ۔ شطرنج کھیلی جا رہی ہے؟

(لیکن اون کھیل میں مجھ ہو جاتا ہے۔ اور خواب نہیں دیتا)

بنائے گا۔ اس طرح سے اگر ایک پیر کو ایک استاد
 ہوگا۔ تو دوسرے پیر کو دو استاد ہوں گے۔ اور ہر
 ایک استاد دس مزید آدمیوں کو سبق دے رہا ہوگا
 اون۔ نہیں۔ نہیں۔ اس طرح بہت دیر لگے گی۔ ہر روز
 ایک نیا استاد بننا چاہئے

زرشن۔ ہاں اس طرح ہم جلدی آزاد ہو جائیں گے
 ایلیکسے۔ نہیں اگر اب ہمارے پاس پچاس استاد ہو جائیں
 اور ہر ہفتہ میں وہ دگنے ہوئے رہیں تو چالیس ہفتوں
 میں ساٹھ ستر لاکھ استاد ہو جائیں گے

زرشن۔ ساٹھ ستر لاکھ!

ایلیکسے۔ ہاں کوئی ایک کروڑ کے قریب

زرشن۔ نوب

ایلیکسے۔ ہم یقیناً کامیاب ہو جائیں گے

زرشن۔ اور پھر۔ چار ماہ کے بعد کیا ہوگا؟

ایلیکسے۔ پھر ہم کچھ دیر اور انتظار کریں گے

زرشن۔ اور پھر؟

ایلیکسے۔ پھر ہم تمام لوگوں کو تعلیم دے چکے ہوں گے۔ کہ

عصائے حاکم کی حیثیت سونے کی چھڑی سے زیادہ

نہیں۔ اور اس میں کوئی چیز بھی سکہ سے بہتر نہیں

اور یہ کہ زار اور اس کے عصا کا تقدس ایک

نواب تھا۔ جس سے دوسرے نوابوں کی طرح

عوام الناس بیدار ہو سکتے ہیں۔ ہم انہیں نہیں

مستقبل میں بیدار کر دیں گے۔ اس وقت خواب

ختم ہو جائے گا۔ اور روس بالکل اسی طرح آزاد

ہو جائے گا۔ جس طرح صبح کے چہمانے والے پرندے

یلکے۔ ہاں

سپاہی۔ اس کھیل میں ہتھیاری کی ضرورت ہے۔ بڑا مشکل کھیل ہے

(چلا جاتا ہے)

یلکے۔ ہمیں ایسے آدمیوں کی ضرورت نہیں ہوگی
ون۔ شاید کچھ آدمیوں کی ضرورت ہو۔ یہ ہمارے
قوانین کے نفاذ میں مدد دیں گے

یلکے۔ نہیں۔ تمہیں معلوم ہے۔ روسی قوانین کے مطابق
ورزی کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ ان کے
اپنے قوانین نہیں۔ یہ آواز آدمیوں کے قوانین
نہیں۔ بلکہ باہر حکومت کے قوانین ہیں۔ جنہیں
روسی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جب یہ مجبوراً
نہ ہوں گی۔ اور قوانین لوگوں کے ساختہ ہوں
گے۔ اس وقت ایسا کونسا روسی ہوگا۔ جو اچھی
خلافت ورزی کرے گا

ون۔ دیکھو زرشن تمہیں تعلیم دی جا رہی ہے۔ ابھی تمہیں
نئے روس کا طرز حکومت بتایا جائے گا

زرشن۔ یہ بہت عجیب باتیں ہیں

یلکے۔ اور پھر کسی آدمی کے دل میں قوانین کے خلاف
ورزی کرنے کی خواہش نہیں پیدا ہوگی۔ کیونکہ
ہر ایک آدمی امیر ہونے کی دہشت سے اپنے حال
پر قانع ہوگا

زرشن۔ تو کیا ہم سب امیر ہو جائیں گے؟

ون۔ ہاں۔ سنو۔ تمہیں ابھی پتہ چل جائے گا

یلکے۔ ہاں۔ کیونکہ اس وقت روس کے شاہی محلات

میں اتنا سونا اور جواہرات ہیں۔ کہ ان سے ایک سال تک
روس کی تمام لوگوں کے اخراجات ہتیا کے جا سکتے
ہیں۔ خواہ اس عرصہ کے لئے تمام لوگ بیکار ہی
بیٹھے رہیں۔ مگر وہ کام کریں گے اور اپنے لئے کسی
زمیندار کو پیداوار میں سے حصہ نہ دیا جائے گا
کسی قرضہ پر سود نہ ہوگا۔ کیونکہ ہم ساہوکاروں
کو ستادیں گے۔ روس کی دولت روس کے لوگوں
کے لئے ہوگی۔ اس کی کوئی انتہا نہیں۔ ہم نے اسکا
اندازہ کیا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ ہر ایک
کسان تمام عمر اتنا ہی امیر رہیگا۔ جتنا کہ ایک کس۔ پادری
یا ڈاکٹر ہو سکتا ہے۔ علاوہ بریں رعایا پر یا تو بالکل کوئی
ٹیکس نہ ہوگا اور یا بالکل معمولی

اون۔ اسلئے کہ اس وقت فوج کا کوئی خرچ نہ ہوگا کیوں یلکے ہی باسونا؟
ایلکے۔ نہیں اس وقت تک فوج رکھنی لازمی ہے۔ جب
تک کہ دوسری اقوام ہم سے یہ سبق نہ لے لیں۔ کہ
جنگ کی خواہش کرنا طاقت کے مترادف ہے
زرشن۔ اور اگر کوئی آدمی آزاد روس کے قوانین کی
خلافت ورزی کرے تو پھر کیا ہوگا؟

ایلکے۔ اگر کوئی کرے؟ ہاں اگر کوئی کرے۔ تو ہم اسے
اصلاحی مکتب میں بھیج دیں گے۔ ان شاہی اہتمام
پر ستوں کی طرح ہم مجرموں کو سائبریا کے زندان
میں نہیں ڈال دیں گے۔ بلکہ اصلاحی مکتب میں
ہم انہیں اس وقت تک تعلیم دیں گے جب
تک کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس نہ ہو جائے۔
پھر ہم انہیں آزاد کر دیں گے۔ اور وہ

ہو رہا ہے۔ کہ مجھے اب شراب کی ضرورت نہ

رہی

ایکے۔ یہ کیا بیہودگی ہے؟ ہمیں اس دن کی یاد

شراب پینی چاہئے۔ اسطرح وہ دن نزدیک کے معلوم

زرشن۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں

اون۔ لو وہ شراب لے آئی۔ ہم سب پیئیں گے

اس طرح بہتر کام کر سکیں گے

زرشن۔ نہیں

اون۔ صرف ایک جام

زرشن۔ اچھا صرف ایک جام۔ اور اس سے زیادہ

ایکے۔ ہاں میں صرف ایک ہی جام کی ضرورت

ہمیں اپنے ذہن کو بالکل صاف رکھنا چاہئے

اس کی مدد سے روس آزاد ہوگا

میریا۔ (ایسا) یہ عجیب باتیں کرتے ہیں

اینا۔ ہاں خدا کرے کوئی آفت نہ آجائے

میریا۔ آفت؟ میرے خیال میں ایسی تو کوئی بار

(میریا اور اینا دونوں جلی جاتی ہیں)

زرشن۔ بڑی اچھی شراب ہے

اون۔ ایک اور جام لے لو۔

زرشن ایک اور دے دو۔ مگر صرف ایک اور

چلا جاؤں گا۔ ورنہ بہت پی جاؤں گا۔ میں

روس اور اس کے متعلق سوچنا چاہتا ہوں

(اون شراب اُڈینا ہے)

بس بس بس بس۔ تم نے تو بہت زیا

ڈال دی ہے

دوسرے شہریوں کی نسبت بہتر شہری ہوں گے

کیونکہ ہم انہیں معاشرت کے تمام آداب میں

ماہر کر کے بھیجیں گے

زرشن۔ تو وہ بہت اچھے دن ہوں گے!

ایکے۔ یہ تم اس لئے کہ رہتے ہو۔ کہ ہم امیر ہو جائیں گے؟

زرشن۔ (حیرت سے) نہیں تو۔ میں یہ اس لئے کہ رہا تھا۔ کہ

روس آزاد ہو جائے گا

اون۔ آؤ۔ ہم اس دن کی یاد میں شراب پیئیں چچی میریا

میریا۔ اون میں آئی

اون۔ چچی کیا تم ہمیں کچھ شراب دو گی؟

میریا۔ شراب! اس وقت؟

اون۔ ہم ایک عظیم الشان دن کے تصور میں شراب

پینا چاہتے ہیں

میریا۔ اوہ تو بہ۔ تمہاری سیاسیات دم نہیں بیلتے

دیتیں

اون۔ ہماری سیاسیات روس کو آزاد کرادیں گی

میریا۔ میرا دل تو انہیں نکتہ تیزی سے حرکت کرنے لگتا ہو

(دونوں میں جلی جاتی ہیں)

زرشن۔ روس آزاد ہو جائے گا

اون۔ ہاں آج ہم اس دن کی یاد میں خوب پیئیں گے

زرشن۔ میں نہیں پیوں گا

اون۔ کیوں؟

زرشن۔ میں ان عظیم الشان ایام کے متعلق سوچنا چاہتا

ہوں۔ اس حکومت کی مقبولیت اور آزادی کی

شان کے خیال سے میرے دل میں اتنا خوش پیدا

مکان کی دیواروں کی مٹی جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی ہے)

زرشن۔ آہ! قحط اور فاقہ!

خمر۔ (سرت سے) ہاں

زرشن۔ کیا! روس میں؟

خمر۔ ہاں یہاں روس میں

زرشن۔ اوہ!

(خمر زرشن کے پہلو والے درخت سے ٹیک لگا کر دوپٹے کے

آپٹل سے کھینچ لگتی ہے۔ اور فاقہ زدہ لوگوں کی طرف دیکھتی

ہے)

نہیں۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا۔ روس کے لوگ فاقہ

سے نہیں مر سکتے۔ میں انھیں خوراک خریدنے کے

لئے دولت دوں گا۔ میرے پاس سو روپل کا نوٹ

ہے۔ اور میں اور بھی لاسکتا ہوں۔ روس کے لوگ

فاقے نہیں کریں گے۔ یہ لو۔ اچھے لوگو

(وہ ہاتھ میں سو روپل کا نوٹ پھیلا کر ان کی طرف بڑھتا ہے)

یہ لو۔ (مگر پردہ کے سامنے آکر ڈک جاتا ہے۔ اس کے دل کو

ہاتھ ٹوتتے ہیں مگر وہ پردہ کو جھونتی نہیں۔ اور آگے نہیں

بڑھ سکتی۔ دوسرے آدمی اُسے نہیں دیکھ رہے ہیں)

خمر۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ وقت بہت دور ہے

زرشن۔ بہت دور؟

خمر۔ ہاں۔ یہ ۱۹۲۰ء کے روس میں ہوگا

زرشن۔ آہ مستقبل میں! مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟

خمر۔ تم جو کچھ کر سکتے تھے۔ وہ کر چکے ہو

زرشن۔ میں؟

خمر۔ دیکھو!

اون۔ تم سب نہ پینا

زرشن۔ میں وہاں بیٹھ کر سوچتا ہوں۔ اگر میں تمہارے

پاس بیٹھا رہا۔ تو اس قابل ہی نہیں رہوں گا

وہ جام اٹھا کر ایک گڑے ہوئے درخت کی جڑوں پر جا

بیٹھتا ہے) آہ عمدہ زریں!

(شراب کا ایک گھونٹ لیتا ہے۔ روشنی مدہم ہو جاتی ہے)

وہ ایک گھونٹ لیتا ہے۔ ایک لطیف اور سفید جالی کا پردہ

اس کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ پھر ایک گھونٹ لیتا ہے۔ اور

ایک اور پردہ گرتا ہے۔ ایک دفعہ پھر اسی عمل کا اعادہ ہوتا

ہے۔ حتیٰ کہ اس کے اور دوسرے آدمیوں کے درمیان ایک

دھندلکی سی سفیدی آجاتی ہے۔ پھر ایک شوخ سی عورت

نہایت بھڑکیلے اور چست لباس میں جھلانگ مار کر اس کے

سامنے آجاتی ہے)

زرشن۔ تم کون ہو؟

نو وارد۔ خمر

زرشن۔ خمر

کیا؟

خمر۔ خمر۔ ایک نہایت ہی قدیم تخلیق۔ دیکھو!

(وہ اپنا ہاتھ ہلاتی ہے۔ تو ایک پردہ کے سوا باقی تمام پردے

اٹھ جاتے ہیں۔ اور روشنی بہت تیز ہو جاتی ہے۔ ایکسے اس وقت

تک جا چکا ہوتا ہے۔ ادن اسی نیز پر بیٹھا ہوا ہے۔ لیکن اُسکا

سر اور ہاتھ نیز پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک چھوٹی سی چبائی ہوئی

شاخ اس کے ایک ہاتھ میں ہے۔ میرا اور اینازمین پر لینی

ہوئی شاخوں کی چھال اور گٹاس جبار ہی ہیں۔ سیاہی یا لوسی

کے انداز میں ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ہے۔

منظر کی وحشت سے نمایاں ہے۔ کہ تمام افراد بھوک سے مبتلا ہیں

زرشن - (بچوں کی طرح نوٹ کو آگے پھیلانے ہوئے حسرت بھرے لہجے میں بولتا ہے) میں یہ روپیہ انھیں دینا چاہتا ہوں

ہوں

خمر - دیکھو!

میریا - (ادن کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے) ادن - ادن - اٹھو اون - (سہ کو اٹھانے کے بغیر پھراتے ہوئے) کیوں؟

میریا - ہیں خوراک تلاش کرنی چاہئے

اون - (حقارت آمیز لہجے میں) خوراک؟ کہاں سے؟

میریا - سنو اور میں تمہیں بتاتی ہوں - اون سنو

اون - مجھے سونے دو

میریا - اون سنو - صرف سن لو - بٹولسکا میں خوراک ہے

اون - بٹولسکا میں خوراک؟

میریا - آہستہ بولو - اون سنو

اون - اچھا

میریا - (راز داری کے انداز میں) کل سکولف نے پھلی کا

ڈبہ کھولا تھا - مجھے معلوم ہے - وہ انگلستان سے

آیا تھا - اس نے دو تین کھائی تھیں - مگر ان میں

سے بو آتی تھی - اس لئے انھیں اس نے رکھ

چھوڑا تھا - اب بھی نو پھلیاں پڑی ہوئی ہونگی

جاؤ انھیں خرید لاؤ

اون - میرے پاس دام نہیں صرف یہ ہیں (چار نوٹ

دکھاتا ہے)

میریا - کتنے ہیں

اون - چار ہزار روپے - مگر ان سے تمام پھلیاں

نہیں مل سکتیں

میریا - ان میں سے بو آ رہی تھی - شاید دیدے

زرشن نوٹ کو گرا دیتا ہے - اور باؤس ہو کر منہ ہاتھوں سے

دھانپ لیتا ہے - منظر برتاہی بڑھتی جاتی ہے - اور سوائے

زرشن کے خاکہ کے اور کچھ نظر نہیں آتا - زرنسن رو رہا ہے

خمر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئی ہے - کچھ عرصہ کے بعد زرنسن کے

گرہ سے زیادہ بلند اور مہیب آواز جمائی لینے کی آتی ہے - خمر

بیدار ہو رہی ہے - اب اس کا نام لباس زرد ہو گیا ہے - وہ

انگٹائیاں اور جائیاں لیتے آہستہ آہستہ اٹھتی ہے - وہ اپنے

آپ کو بمشکل سنبھال رہی ہے - جیسے بہت تھکی ہوئی ہو - اور

درختوں سے ٹیک لگاتی ہوئی باہر نکل جاتی ہے - پہلا منظر پھر

سامنے آجاتا ہے - ۱۹۱۲ء کے روس میں ایلکے اور اون نیز

کے گرد بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں - میریا اور انا کے درمیان

خوشگیاں ہو رہی ہیں)

زرشن - (زرشن کے تیز ہونے پر آنسو خشک کر رہا ہے) آہ!

میں انھیں بچاؤں گا (اٹھ کر ایلکے اور اون کے

پاس چلا جاتا ہے) دوستو - دوستو - فیصلہ کرنے

سے بدیشتر میری ایک عرض سن لو

ایلکے - کہو

زرشن - اگر اس انقلاب نے ہماری تجارت اور

مالیات کو خراب کر دیا - تو پھر؟ ہو سکتا ہے

کہ فوری انقلاب سے انھیں نقصان پہنچ جائے

ایلکے - میں نے تمہیں بتایا ہے - کہ میں لوگوں کو امیر

بنادوں گا

زرشن - ہاں ایلکے یہ تو صحیح ہے - لیکن اس سے اگر

ہمارے اعتبار میں فرق آگیا - تو پھر کیا ہوگا - اگر

رویل اس قابل ہی نہ رہے۔ کہ ان سے خوراک
خریدی جاسکے۔ تو پھر؟

میریا۔ تو بڑا بھی تک سیاست پر ہی گفتگو ہو رہی ہے
ایسا۔ تمہیں کیا۔ مردوں کا جس مضمون پر جی چاہے وہ
گفتگو کر سکتے ہیں

(میریا ہنس دیتی ہے)

ایلیکے۔ میں ابھی تم پر سب کچھ واضح کر دوں گا
اون۔ ایلیکے نے اس کا خوب مطالعہ کیا ہے

زرنشن۔ ہاں۔ اون۔ مجھے معلوم ہے۔ لیکن ابھی.....
ایلیکے۔ میں ابھی اس کی توضیح کرتا ہوں۔ اگر ناخوشگوار
اثر کی وجہ سے رویل اپنی قدر کھودے۔ جس کا
اندیشہ نہیں۔ تو اس صورت میں مرکزی انقلاب
بنک انتظام کرے گا کہ.....

برادر

(ماخوذ)

نسیم رضوانی

نگارستان حصہ دوم

یعنی حضرت نیاز فتحپوری کے ۳۰ بہترین افسانوں کا مجموعہ جو اس سے قبل کبھی کتابی صورت میں
شائع نہیں ہوا۔ ڈیر کتابت ہے۔ حجم ۵۰۰ صفحات سے زائد ہوگا۔ اور غالباً ستمبر ۱۹۳۳ء تک شائع
ہو سکے گا۔ اس کی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ سے کم نہ ہوگی لیکن جو حضرات دور و پیہہ ذریعہ منی آرڈر
بھیج کر ابھی سے اپنا نام درج رجسٹر کرائیں گے۔ ان کو اسی دور و پیہہ میں یہ نادر مجموعہ مل جائے گا
غالباً یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت صحیح معنی میں انشاء عالیہ کا لکھنے والا اگر کوئی ہے
تو وہ صرف حضرت نیاز ہیں اور اس لئے اس مجموعہ میں ایسے ایسے جو اہر ادب آپ کو ملیں گے، جو
کسی دوسری جگہ دستر آہی نہیں سکتے

منیر نگار لکھنو

باب امر اسلئو المناظره

بقائے روح و معاد کے متعلق مدیر نگار سے اختلاف

(مسٹر عبد المجید حیرت بی۔ اے۔ شملہ)

محترمی - السلام علیکم

حوالہ نگار (جون ۱۹۷۶ء) - باب الاستفسار - حاشیہ از صاحب نگار

(۱) آپ یہ باور نہیں کرتے کہ خدا (فعال لما یرید) "عالم کی ایک ایک چیز اور اس کے ایک ایک ذرے کی نگرانی کرتا ہے"

(۲) آپ بقائے روح، حیات بعد الموت یا معاد کے قائل نہیں

بہر حال آپ اس کے تو قائل ہیں کہ اسلام دنیا کا آخری اور فطری مذہب ہے۔ پھر اگر یہ وہی اسلام ہے جسے قرآن مجید

پیش کرتا ہے تو کیا آپ قرآن مجید سے نمبر (۱) و (۲) پر کوئی دلیل پیش کر سکیں گے

بقائے روح کے باب میں آپ غالباً مغرب کے تازہ اکتشافات سے بے خبر نہ ہوں گے

میں آخرت کا قائل ہوں، اس لئے کہ

(۱) لفظ دنیا آخرت پر دلالت کرتا ہے

(۲) آخرت دنیا کے لئے انتہائے بے نفسی کے ساتھ نیکی کئے جانے کی تعلیم ہے۔ پھر جب یہ نہیں کہا جاسکتا،

اور یقیناً نہیں کہا جاسکتا کہ ہر طاعت کا ثواب اور ہر گناہ کا عذاب — یا آپ کے رنگ میں ہر طاعت

کا واقعی عذاب اور ہر گناہ کا واقعی ثواب — انسان کو اسی دنیا میں مل جاتا ہے، تو پھر کیا وجہ کہ اس شک

کو یقین سے بدلنے کے لئے ایک یوم آخرت تسلیم نہ کر لیا جائے

(۳) بدرجہ آخر آخرت پر جناب علی کرم اللہ وجہہ کے اس منطقی استدلال کو دیکھئے جسے سن کر ایک یہودی حلقہ بگوش

اسلام ہوا۔ یعنی اگر یہ دنیا ہی دنیا ہے اور بس تو نیک و بد کی جزا و سزا میں مسلم اور غیر مسلم دونوں برابر ہیں

لیکن اگر آخرت ایک امر واقعی ہے تو پھر نقصان میں کون رہتا ہے اور نفع میں کون

چنانچہ میں اگر آخرت کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہوں تو اس میں کیا "حرج" ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس عقیدے کے رکھنے والے پر پکے اور چاقو کی دو راز کار مثال کیوں کر چسپاں ہو سکتی ہے

(نکار) ۱ - میرا یہ کہنا کہ "خدا ایک ایک چیز، ایک ایک ذرہ کی نگرانی نہیں کرتا" صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ انفرادی طور پر *Individually* کائنات کی ہر ہر چیز کے لئے اپنی قوت کو منقسم نہیں کرتا۔ بلکہ مجموعی طور پر تمام نظام عالم کے لئے چند اصول و ضوابط مقرر کر دئے ہیں اور انہیں کے ماتحت یہ سب کچھ چل رہا ہے

آپ کپڑا بننے کے کسی بڑے کارخانہ میں ضرور کبھی نہ کبھی تشریف لے گئے ہوں گے اور آپ نے دیکھا ہو گا کہ وہاں ہزاروں "کرکے" خود بخود چل رہے ہیں، کپڑا بنا جا رہا ہے۔ رولر اپنے آپ کپڑے کو پیٹ رہے ہیں، درنا خالی کہ وہاں کوئی انسانی ہاتھ موجود نہیں۔ بھر یہ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ کارخانہ کا انجنینئر بجلی یا بھاپ کی مدد سے مشین کو حرکت دے کر عمومی طور پر ہر کام کی نگرانی کر رہا ہے، لیکن یہ تو نہیں کہ سلتے کہ مشین کے ہر ہر بڑے کی جنبش، کرکے کے ہر ہر تار کا ادب پینچے ہونا، ایک ایک۔ نولے کاروئی سے علیحدہ ہونا، ایک ایک پلونی کا طیار ہونا، ان سب پر انجنینئر کی نگاہ ہے پھر چونکہ انجنیر کے ہاتھ میں بھاپ یا بجلی کی وہ قوت موجود ہے۔ جس سے تمام کام انجام پا رہے ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام کارخانہ کا نگران ہے، لیکن یہ کہنا کہ کارخانہ کے ہزاروں لاکھوں چھوٹے چھوٹے کاموں پر بھی علیحدہ علیحدہ اس کی نگاہ ہے، کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

۲ - بقا اور روح اور معاد کے متعلق آپ کا مجھ سے مطالبہ ہے کہ اگر میں اسلام کو دنیا کا آخری فطری مذہب تسلیم کرتا ہوں تو مجھے قرآن مجید سے ثابت کرنا چاہئے کہ بقا اور معاد دونوں حیران معجز نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ نے منبر اکا بھی ثبوت قرآن پاک سے طلب کیا ہے

میرے عزیز دوست، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں تو ان باتوں کا منکر ہوں یعنی میں آپ کے اس دعویٰ کو نہیں مانتا کہ خدا ہر ہر ذرہ پر انفرادی طور سے نگرانی کرتا ہے اور اسے بھی تسلیم نہیں کرتا کہ روح باقی رہتی ہے اور حیات بعد المات کوئی چیز ہے۔ اس لئے اصولاً پہلے آپ کو اس اسباب پر دلیل پیش کرنا چاہئے نہ کہ مجھے۔ آپ جس سے پوچھیں گے وہ بتا دے گا کہ ثبوت پیش کرنا اس شخص کا کام ہے جو کسی بات کا اقرار کرتا ہو یا کرنا چاہتا ہو، منکر یا تو آپ کی دلیل سے قائل ہو کر آپ کا ہمنوا ہو جائے گا یا آپ کے دلائل کی کمزوری کو ثابت کرے دوسرا ثبوت آپ سے چاہے گا۔ اس لئے براہ کرم پہلے آپ ہی کلام مجید سے یہ ثابت کیجئے کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں وہ درست ہے، پھر میں بتاؤں گا کہ آپ کے دلائل ان وجوہ کی بنا پر ناقابل تسلیم ہیں

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ روح کے باب میں مغرب کے تازہ اکتشافات سے غالباً میں بے خبر نہ ہوں گا۔ یقیناً میں بے خبر نہیں ہوں اور نہایت دثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نکر و فریب کا اتنا بڑا جال شاید ہی دنیا میں کبھی پھیلایا گیا ہو۔ اگر سائنٹفک امریکن کی شائع کی ہوئی وہ رپورٹ آپ کے سامنے ہے جو ایک کمیشن نے تمام بلاد یورپ کی سیاحت کرنے کے بعد مرتب کی تھی تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت تک جتنے روحانیوں یورپ میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ۹۰ فیصدی نکار و شعبہ باز ہیں اور باقی دس فیصدی وہ ہیں جو اس فریب میں مبتلا ہونے کے بعد قصور فہم کی وجہ سے، فریب کو حقیقت باور کرنے لگے ہیں

۳۔ آپ نے آخرت کے وجوب پر تین دلیلیں پیش کی ہیں اور معاف فرمائے اگر میں یہ کہوں کہ ان میں سے ایک دلیل بھی ایسی نہیں جو فریق تانی کو قائل کر سکے

پہلی دلیل یہ ہے کہ لفظ دنیا، آخرت پر دلالت کرتا ہے اس لئے آخرت کا ماننا ضروری ہے۔ لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ لفظ دنیا کا وہ مفہوم جو آخرت پر دلالت کرتا ہے کس کام میں کیا ہوا ہے۔ کیا آپ ہی اس کے واضح اور آپ ہی اس کے مفسر نہیں۔ میرے سامنے اگر لاکھ مرتبہ لفظ دنیا بولا جائے تو کبھی ایک بار بھی اس کو سنکر آخرت کا یقین نہیں ہوتا۔ آپ دنیا کو آخرت کا نفیض بتاتے ہیں۔ میں اسے العدم کا نفیض سمجھتا ہوں، یعنی بس طرح لفظ دنیا بول کر آپ کا خیال اس کے نفیض (آخرت) کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ یوں مردے اٹھیں گے، اسی طرح ان کا حساب کتاب ہوگا، یوں عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے وغیرہ وغیرہ، اسی طرح لفظ دنیا بول کر میرا خیال اس کے نفیض العدم محض کی طرف جاتا ہے کہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو حالت عدم میں چلا جاتا ہے گویا کہ وہ کبھی بیدار ہی نہ ہوا تھا آپ کی دوسری دلیل اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ”آخرت انتہائی بے نفسی کے ساتھ نیکی کرنے کی تعلیم ہے“، دراصل لیکہ آخرت کا جو مفہوم پیش کیا جاتا ہے اس میں سوائے غرض و طمع کے کچھ اور ہی نہیں۔ کیا اچھے کاموں کے عوض میں سونے چاندی کے مہلوں، دودھ خمد کی نہروں، حسین و جمیل دوشیزہ عوروں اور بے ریش و برودت لڑکوں کے دیے جانے کا وعدہ کرنا بے نفسی کے ساتھ نیکی کرنے کی تعلیم ہو سکتی ہے اور کیا بڑے کاموں کی پاداش میں شعلہ نزار جہنم کا منظر پیش کرنا ایک شخص کو بے نفسی کے ساتھ نیکی کی طرف مائل کر سکتا ہے۔ جبکہ بے نفسی کا تعلق نہ لالچ سے ہونا چاہئے نہ خوف سے، ہم اگر کسی کے ساتھ کچھ احسان کرتے ہیں اس ڈر سے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہم کو قید و بند میں ڈال دیا جائے گا، یا اس لالچ سے کہ اس احسان کا معاوضہ زیادہ بہتر صورت میں ملے گا تو کیا دنیا میں کوئی شخص ہمارے اس فعل کو بے نفسی پر محمول کر سکتا ہے؟ اسی نکتہ کو غالب نے اس طرح بیان کیا ہے

طاعت میں تار ہے نہ سے وانگیس کی لاگ

دوزخ میں ڈالے کوئی نے کہ بہشت کو

اگر آپ اس کے جواب میں یہ کہیں کہ جنت و دوزخ کا بیان صرف تشبیہی بیان ہے اور حقیقت کچھ اور ہے، تو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس بیان میں ترغیب و تحویف ضرور پائی جاتی ہے، جو بے نفسی کے بالکل منافی ہے میں کہتا ہوں کہ مطلق جزا و سزا کا خیال ہی بے نفسی کو محو کر دینے والا ہے۔ اور جب تک عذاب و ثواب کی تمام کارگاہ کو باطل ٹھہرا کر یہ اصولی نہ قرار دیا جائے کہ "ہنگی ایک فرض انسانی ہے جو بلا خیالی مزید یا بغیر اندیشہ تعزیر ظاہر ہونی چاہئے"۔ بے نفسی کا خیال کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتا

اسی ضمن میں آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب ہر طاقت کا ثواب اور ہر گناہ کا عذاب اس دنیا میں نہیں ملتا تو کیا وجہ ہے کہ یوم آخرت نہ تسلیم کیا جائے۔

اس میں کبھی آپ نے خود ہی ایک بات فرمائی گئی ہے اور خود ہی اس کو دلیل بنا کر پیش کر دیا۔ میں تو کہتا ہوں کہ کوئی طاقت ایسی نہیں جس کا ثواب یہاں نہ مل جاتا ہو اور کوئی گناہ ایسا نہیں جس کی سزا انسان کو یہاں نہ بھگتنا پڑتی ہو، بشرط آنکہ آپ طاعت کا مفہوم "اچھا کام" قرار دیں اور گناہ کا مفہوم "بُرکام"۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ فرض شناسی و ادائے فرض کے بعد ضمیر انسانی کو جو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے اس سے زیادہ سترت کسی اور چیز میں ہو سکتی ہے اور حق تلفی و ناحق کوئی کبھی جو اضطراب نفس انسانی میں پیدا ہوتا ہے اس سے زیادہ عذاب کوئی اور ممکن ہے۔ لیکن اگر کسی کا ضمیر بالکل بھوچکا ہے اور حق و باطل کی تمیز کسی کو باقی نہیں رہی، تو تاریخ عالم اٹھا کر دیکھئے کہ اسی دنیا میں اس کا کیا انجام ہوا، افراد تو چھوڑئے میں تو قومی و اجتماعی زندگی میں بھی اسی اصول کو کارفرما دیکھتا ہوں اور قرآن پاک کی اس آیت پر پوری طرح ایمان لاتا ہوں کہ

هَلْ يَهْدِيكُمْ إِلَّا الْقَوْمَ الْفَاسِقُونَ

پھر بتائے کہ کیا اس آیت میں جس ہلاکت قومی کا ذکر کیا گیا ہے وہ کسی اور دنیا سے متعلق ہے، اور کیا یہ عذاب آپ کی مفروضہ آخری زندگی سے تعلق رکھتا ہے

ممكن ہے ابھی آپ کی تسکین نہ ہوئی ہو، لیکن اگر میں خود کلام مجید سے یہ ثابت کر دوں کہ عذاب و ثواب کا تعلق اسی دنیا سے ہے تو پھر آپ کیا کہیں گے۔ اچھا تکلیف تو ہوگی کلام مجید اٹھائے اور سورہ ہود کی آیات ۱۰۴ و ۱۰۸ ملاحظہ فرمائے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

فَمَا لِلَّذِينَ اشْتَرَوْا نَفْسَهُمْ بِهِنَّ أَذْفَىٰ ذَفِيرًا وَشَرِيفًا ۝	جن لوگوں نے شقاوت کی وہ آگ میں پرے کراہ رہے
خَلْدِينَ فِيهَا مَا مَدَامَتْ أَسْمَوَاتٌ وَالْأَرْضُ وَمَا بَيْنَهُنَّ	ہوں گے اور اسی حالت میں رہیں گے جب تک آسمان و
سَعْدًا وَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا مَدَامَتْ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ	زمین کا وجود ہو اور جن لوگوں نے اچھے کام کئے وہ جنت میں
وَالْأَرْضُ	رہیں گے جب تک آسمان و زمین کا وجود ہے

کیا عذاب و ثواب کو اس دنیا سے متعلق سمجھنے کے لئے اس سے زیادہ روشن و واضح الفاظ کی ضرورت ہے۔ کیا صلاحت السموات والارض کے الفاظ اس بات کا ثبوت نہیں کہ جنت و دوزخ اس دنیا سے علاوہ کسی اور عالم سے متعلق نہیں۔ کیونکہ اگر آپ عذاب و ثواب کو عالم آخرت سے متعلق کریں گے تو پھر صلاحت السموات والارض کہنا کوئی معنی نہ رکھے گا۔ کیونکہ عالم آخرت تو آپ کے نزدیک قیامت یا ماوراء عالم دنیا سے واسطہ رکھتا ہے جب یہ زمین و آسمان کچھ نہ ہوں گے

۳۔ آپ کی تیسری دلیل جس میں آپ نے جناب امیر اور یہودی کی گفتگو کا حوالہ دیا ہے اس کے متعلق سوال اس کے کیا عرض کروں کہ

ہر تمنا ہائے عمرتی خندہ می آید ہرا

اسی قسم کا ایک واقعہ جناب امام جعفر صادق کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کسی شخص نے آپ سے سوال کیا کہ مرنے کے بعد روح کہاں چلی جاتی ہے، آپ نے جواب دیا کہ چراغ گل ہونے کے بعد اس کی لٹکیاں چلی جاتی ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ جواب سننے کے بعد وہ ایمان بھی لے آیا

در انحالیکہ نہ جناب امیر کے جواب پر یہودی کو آخرت پر ایمان لانے کی ضرورت تھی اور نہ محمد کو جناب امام

جعفر صادق کے استدلال پر مسلمان ہونے کی

میرے نزدیک یہ دونوں روایتیں نادرست ہیں اور میں کبھی باور نہیں کر سکتا کہ جناب امیر یا جناب امام جعفر صادق نے ایسی بچوں کی سی باتیں کی ہوں گی، کیونکہ اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم مان بھی لیں کہ جناب امیر کا جواب واقعی مسکت تھا اور یہودی آخرت پر ایمان بھی لے آیا تو کیا اس کا آخرت کے وجود کو تسلیم کرنا حقیقتاً اطمینان قلب کے ساتھ تھا، یعنی اس دلیل سے کوئی اذھانی و ایقانی کیفیت۔ اس کے دل میں پیدا ہو سکتی تھی۔ ہرگز نہیں، اس نے اگر مانا بھی تو صرف اس لئے کہ ایسا اذہن میں کوئی حرج نہیں اور مصلحت اسی میں ہے۔ پھر مصلحت و یقین میں جتنا فرق ہے وہ کسی سے مخفی نہیں

فرض کیجئے میں آپ کے پاس آؤں اور کہوں کہ مجھ میں اتنی قوت موجود ہے کہ جاہوں تو آپ کے کپڑوں میں آگ لگا دوں اور واقعی میں آگ لگا دوں گا اگر آپ نے میری اس قوت کا اعتراف نہ کیا، آپ کو اس کے ماننے میں تامل ہوتا ہے لیکن آپ کا ایک دوست آتا ہے اور کہتا ہے کہ ”مان بھی لو تمہارا کیا حرج ہے۔ اگر اس میں ایسی قوت نہیں ہے تو مان لینے میں تمہارا کیا نقصان ہے، لیکن اگر واقعی وہ ایسا کر سکتا ہے تو پھر نقصان تمہارا ہی ہے“ آپ اس دلیل کو سن کر میری اس قوت کا اعتراف کر لیتے ہیں، لیکن خدا کے لئے بتائے کہ کیا آپ کا یہ اعتراف تصدیق قلب کے ساتھ ہوگا، ہرگز نہیں۔ پھر اگر جناب امیر کی اس دلیل پر وہ یہودی ایمان لے بھی آیا تو کیا واقعی وہ مسلمان

ہو گیا ہوگا۔ جبکہ اسلام و ایمان کے لئے تصدیق بالقلب ضروری ہے
یہی حال جناب امام جعفر صادق کی دلیل کا ہے۔ ایک ملحد جو روح کے بقا کا منکر ہے۔ آپ سے سوال کرتا ہے
کہ مرنے کے بعد روح کہاں جاتی ہے، آپ چراغ کی ٹوکا حوالہ دیکر خود اسی سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ وہ کہاں بٹلی جاتی ہے
آپ ہی انصاف فرمائے کہ اس میں بقا روح کے لئے کونسی دلیل پیش کی گئی، بلکہ اس سے تو اور اسی ملحد کے خیال کی تائید
ہوئی ہے کہ جس طرح چراغ گل ہونے کے بعد اُس کی ٹوکنا ہو جاتی ہے اسی طرح مرنے کے بعد روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ اکابر
اسلام سے اس قسم کی روایتوں کو نسبت دنیا حقیقتاً ان کی توہین کرنا ہے، اور یہ نتیجہ ہے معرفت اُن ادنیٰ درجہ کی ذہنیاتوں
کا جو اپنی داغی بُنچ کو اہمیت دینے کے لئے خواہ مخواہ بڑے بڑے لوگوں سے اس کو منسوب کر دیتے ہیں۔ جناب امیر اور
جناب امام جعفر صادق کا کیا ذکر ہے، احادیث اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ خود رسول اللہ کی ذات گرامی سے ایسے ایسے افعال
واقوال منسوب کئے جاتے ہیں کہ آج اُن کو دیکھ کر شرم آتی ہے اور عقل حیران رہ جاتی ہے کہ کیا ایک رسول کے اخلاق واقعی
ایسے ہو سکتے ہیں۔ اور کیا ایک ملہم من اللہ ہستی سے ایسی باتوں کا ظاہر ہونا کسی طرح ممکن ہو سکتا ہے؟
اب رہا یہ سوال کہ میں آخرت کو کیوں نہیں مانتا، یعنی قیامت اور جزا و سزا کے نظریہ کو کیوں قابل قبول
نہیں جانتا۔ اس کے متعلق آپ مجھ سے کوئی استفسار نہ کیجئے بلکہ خود اُن تمام روایات کا تفصیلی طور پر مطالعہ کیجئے
جو اس باب میں بیان کی جاتی ہیں کہ مرنے کے بعد سے لے کر دوزخ یا جنت میں پہنچنے تک کیا کیا ماحول و مناظر
سامنے آتے ہیں اور پھر خود ہی اپنی عقل سے کام لے کر فیصلہ کیجئے کہ اور کرنے کے لائق ہیں یا نہیں

ایک خاتون کا گت نام خط

۱۲ جون کی ڈاک سے مجھے ایک نفاذ ملا جس پر (Sahab) کی ٹر تھی اور ایک مضمون کے علاوہ حسب ذیل

تحریر بھی اندر موجود تھی۔

مکرمی۔۔۔۔۔! آداب نیاز

یہ مضمون جو میرے جذبات کا مکمل آئینہ دار ہے، آپ کی خدمت میں ارسال ہے، نگار کے ایک دیرینہ
خریدار ہونے کی حیثیت سے اس کا علم ہے کہ نگار میں عورتوں کے مضامین شائع نہیں ہوتے، لیکن پھر بھی اس
جسارت کی مرتکب ہوتی ہوں، اشاعت و عدم اشاعت کا آپ کو اختیار ہے، اگر یہ اس لائق ہو کہ شرف قبولیت
بخشا جائے تو نگار کے صفحات میں جگہ دے کر مشکور فرمائیں

میں اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتی، اور نہ ہی یہ پسند کرتی ہوں کہ کسی مفروض نام سے دنیا کے سامنے
نمودار ہوں، لہذا اس مضمون کے کاتب کو گناہ ہی رہنے دیجئے،
خیر طلب۔۔۔!

مضمون کا عنوان تو ” اظہار تشکر ” ہے لیکن ہے وہ حقیقتاً صرف ” اظہار محبت ” ایک ایسی ہستی کے حضور میں جس کا حصول مضمون نگار کو محال معلوم ہوتا ہے۔ یہ مضمون بالکل اسی قسم کا ہے جس میں بہت سی لمبی لمبی لکیریں، بات بات میں متعدد سوالیہ نشان اور ہر جگہ کے بعد درجنوں علامات حیرت و استعجاب نظر آتے ہیں لیکن اس میں خشک نہیں کہ لکھا گیا ہے خاص تاثر کے ساتھ

یقیناً میں یہ مضمون شائع کرنے کے لئے تیار نہیں اور میں اس کو واپس کر دیتا اگر خاتون محترم نے اپنا پتہ لکھا ہوتا، لیکن چونکہ انہوں نے میرے لئے عزت و تخطیب کی کوئی صورت پیدا ہونے نہیں دی ہے اور میں جانتا ہوں کہ کسی طرح ان کی تحریر کا جواب بھی ان تک پہنچ جائے اس لئے مجبوراً نگار ہی کی وساطت سے ان کو مطلع کرتا ہوں کہ نگار میں یقیناً عورتوں کے مضامین اس وقت تک شائع نہیں ہوئے، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ خدا نخواستہ مجھے با نگار کو عورتوں سے کوئی منہ ہے بلکہ صرف اس بنا پر کہ نگار کے معیار کے مضامین لکھنے والے مردوں میں بھی بہت کم ہیں چہ جائیکہ عورتیں جنکا ادبی ذوق ہنوز بہت زیادہ پست حالت میں ہے

ہمارے یہاں کی عورتیں کچھ پڑھ کر دنیا کے ادب میں آتی بھی ہیں تو صرف دو طرح سے، یعنی یا تو وہ غزلسرایانہ انداز سے تشریف لاتی ہیں یا ” واللہ انہ محبت ” کی بیباکیوں کے ساتھ۔ اور میں ان دونوں کو مردوں کے لئے بھی مضرت رساں سمجھتا ہوں، چہ جائیکہ عورتیں جو سوسائٹی میں اس اس اخلاق کی حیثیت رکھتی ہیں بہر حال میں عورتوں کے مضامین نہایت مسرت سے شائع کرنے کے لئے طیار ہوں بشرط آنکہ ان میں کچھ کام کی باتیں ہوں۔ ورنہ محض مصنوعی آہ و فریاد کی گرم بازاری اور تھکے ہوئے جذبات محبت کا تھکا ہوا اظہار اب تو دل میں بھی کوئی جنبش پیدا نہیں کرنا عقل و دماغ کا کیا ذکر ہے

افسوس ہے کہ مجھے یہ مضمون تلف کرنا پڑا، درانحالیکہ اس کے اوراق کے ٹکڑے اب بھی اپنی عطریت سے ” دعوتِ نزلہ ” دے رہے ہیں۔

نیاز

صرف اخیر جولائی ۱۹۳۶ء تک

سات روپیہ کی چار کتابیں تین روپیہ میں مع حصول

تذکرہ خندہ گل - فلسفہ مذہب - فراست التحریر مکمل - حضرت نیاز کے تین معرکہ الکلام
مضامین
میجر نگار

مطبوعات موصولہ

مغل اور اردو | یہ کتاب صرف ایک باب ہے، اُس کتاب کا جسے نواب نصیر حسین خاں خیال داستان اردو کے نام سے مرتب کر رہے ہیں۔ اس قابل قدر تصنیف کا مقصد جیسا کہ اس نام سے ظاہر ہے۔ اردو زبان کی بسوٹا و مفصل تاریخ لکھنا ہے اور جو حضرات، جناب خیال کی ادبی قابلیت سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ شاید ہی کوئی شخص ان سے بہتر اس خدمت کو انجام دینے والا ہندوستان میں مل سکتا ہے۔ کتاب زیر تبصرہ میں ابتدا و عمدہ مغلیہ سے لے کر امتزاع سلطنت تک زبان اردو کے رواج و ترقی پر نہایت پر لطف طریقہ سے محققانہ نگاہ ڈال کر مسلسل طور پر مغلیہ دور کی اردو کی داستان سنادی گئی ہے کتاب نہایت مفید و دلچسپ ہے اور وہ حضرات جن کو ادب اردو سے ذوق ہے ان کے لئے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔ تنقید کی جو روش جناب خیال نے اس کتاب میں اختیار کی ہے وہ حد درجہ دلکش ہے۔ یہ کتاب دورِ وید میں عثمانی اینڈ سنس نے چھپائی گئی ہے۔

تعلیم زدہ بیوی | جناب فضل حق قریشی بی۔ اے (دہلوی) کا لکھا ہوا ڈرامہ ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ عورت کی تعلیم بعض صورتوں میں مردوں کیلئے کیسی غذا بناتی ہے۔ زبان صاف و شگفتہ ہے، مزاح کا پہلو بھی کافی سنجیدہ ہے، لیکن پلاٹ میں ترقی کی گنجائش تھی اگر توجہ کی جاتی۔ قیمت ۸/-۔ لٹے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی۔ ترجمہ ہے آسکر وائلڈ کے مشہور ٹریجڈی سائومی (Salome) کا جسے سید انصار ناصری نے بی۔ اے (دہلوی) نے پیش کیا ہے۔ اس سے قبل مجنوں گورکھپوری بھی اسی کتاب کا ترجمہ کر کے شائع کر چکے ہیں اور غالباً خلاف انصاف نہ ہوگا اگر مجنوں کے ترجمہ کو اس ترجمہ پر ترجیح دی جائے۔ کیونکہ مجنوں کا ترجمہ کسی جگہ ترجمہ کی شان سے نہیں ہٹا اور جناب انصار ناصری نے اکثر جگہ صرف اخذ مفہوم کو کافی سمجھ کر حذف و اضافہ سے بھی کام لیا ہے۔ قیمت ۵/- ہے اور لٹے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی۔

نجمہ نوری | جناب انصار ناصری دہلوی کا لکھا ہوا ڈرامہ ہے جس میں مادری محبت کے کرشمے دکھائے گئے۔ چاندرا موہنی | یہ فسانہ بھی جناب انصار ناصری کا لکھا ہوا ہے، جس میں بتایا ہے کہ محبت کا تعلق صورت سے نہیں

بلکہ سیرت سے ہے۔ زبان و طرزِ ادا کی خوبی کے ساتھ جذبات کا بھی مصنف نے کافی لحاظ کیا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے، لٹنے کا پتہ ساتی بکڈپو دہلی ہے

مجموعہ ہے جناب افضل حسین صاحب چشتی نے۔ اسے کے افسانوں کا جو
انخوان الشیاطین اور دیگر افسانے علامہ مضمک کے نام سے رسالہ ساتی میں اکثر لکھے رہتے ہیں۔ آپ ملک کے

اچھے مزاج نگاروں میں سے ہیں اور کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ قیمت ۹، لٹنے کا پتہ ساتی بکڈپو۔ دہلی
رقص و سرود جناب عظیم بیگ چغتائی کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ رقص و سرود اسلام میں ممنوع نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں مولویوں کی طرف سے جناب چغتائی پر کافی لے دے ہوئے ہیں اور ہونا بھی چاہئے تھی کیونکہ مولوی ایک ایسا درندہ ہے جو جو عالبقر کی بیماری میں مبتلا ہے اور جو ہر وقت اسی فکر میں رہتا ہے کہ کوئی شکار اس کے ہاتھ آئے اور وہ اپنی چیر پھاڑ شروع کر دے

اب جناب چغتائی نے اپنے خیالات ایک مستقل رسالہ کی صورت میں پیش کئے ہیں دیکھئے کیا ہوتا ہے ؟ قیمت ۹
 ہے اور ساتی بکڈپو دہلی سے مل سکتا ہے ،

اس وقت یورپ میں فنِ شب کا ایک مخصوص شعبہ صرف اس جیتو کے لئے علیحدہ
اعادہ شبابِ درازمی عمر کر دیا گیا ہے کہ انسان کی عمر بطبعی کو کس حد تک طویل بنایا جا سکتا ہے۔ اور اعادہ شباب

ممکن ہے یا نہیں ؟ لیکن ہندوستان میں لوگوں کو اس فن سے صرف استفادہ چسپی ہے کہ اخباروں میں اس قسم کے تجربات کو پڑھ لیتے ہیں اور یورپ کی ترقی ہو چکے کر تھوڑی دیر کے لئے حیران ہو جاتے ہیں

لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب (جو گولکنڈہ حیدرآباد میں افواج باقاعدہ کے سینئر میڈیکل افسیر ہیں) ایک زمانہ سے اس طرف عملی جیتو میں لگے ہوئے تھے۔ اور مختلف قسم کے جانور جمع کر کے تجربہ میں مصروف تھے چنانچہ انکا یہ شوق انہیں کشاں کشاں یورپ لے گیا اور وہاں تمام ممالک میں گھوم پھر کر اس فن کے ماہرین سے ملے اور کافی روپیہ خرچ کر کے علمی و عملی درس لے کر واپس آئے۔ اس رسالہ میں انہوں نے اپنے نتائج مطالعہ پیش کئے ہیں اور ظاہر کیا ہے کہ کہاں کہاں کس طریقہ سے اعادہ شباب کی کوشش جاری ہے اور ہندوستان کے لئے کونسا طریقہ کار مفید ہے

ڈاکٹر صاحب موصوف نے یورپ سے آکر خود بھی استفادہ آپریشن کئے ہیں اور اس باب میں وہ ہر شخص کو نصیحت مشورہ دینے کے لئے طیارہ ہیں

اس رسالہ کے علاوہ اور بھی متعدد رسالے انہوں نے شائع کئے ہیں جن میں یورپ کے قائم کئے ہوئے مختلف نظریہ ہائے اعادہ شباب سے بحث کرتے ہوئے وہاں کے مختلف طریقہ جراحی پر ماہرانہ رائے دی ہے

ہندوستان کو ڈاکٹر صاحب موصوف کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے اس قدر محنت شاقہ اور زرخیز صرف کرنے کے بعد اس مخصوص شعبہ میں مہارت حاصل کی اور اب وہ اپنی معلومات سے اہل ہند کو بلا خیال کسی مادی منفعت کے فائدہ پہنچانے کے لئے طیار ہیں۔

یہ تمام رسالے ڈاکٹر صاحب موصوف سے مفت مل سکتے ہیں۔ لوگوں کو چاہئے کہ ان کا مطالعہ کریں اور جن کو اعادہ شباب سے کچھ بھی دلچسپی ہے وہ خط و کتابت کر کے ڈاکٹر صاحب کا مشورہ حاصل کریں۔

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

اس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آئندہ اخلاق انسانی کے بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز حالات و واقعات درج ہیں۔ کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول آٹھ آنے کے مجلد کتاب صرف پانچ میں — اور غیر مجلد عار میں ملے گی — اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد پانچ میں — اور غیر مجلد سے — میں علاوہ محصول ۸ روپے کے ملے گی — اگر ارشاد ہو تو کتاب ذریعہ وی۔ پی روانہ کی جائے۔ حجم ۳۷۵ صفحات۔ آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے۔

میجر نگار لکھنؤ

الغامی مضمون

(لمحہ شعور و فکر کی دعوت)

موجودہ آبادی کی رُو سے، بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ہندوؤں کے مقابلہ میں یہ ہے :-

مسلمان = ۵۲ / ۸ فی صدی

ہندو = ۴۳ / ۱۱

لیکن تعلیم کے لحاظ سے ہندو باوجود صدہائی آبادی کے کس قدر بڑھے ہوئے ہیں، اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ یہ مقابلہ مسلمانوں کے عام تعلیمی حالت اُن کی ۶۲ / ۲ فی صدی ہے اور انگریزی تعلیم میں ان کا تناسب ۶۹ / ۶ ہے جو طلبہ اس وقت زیر تعلیم ہیں اُن میں ہندوؤں کی تعداد یہ مقابلہ مسلمانوں کے حسب ذیل ہے :-

ہائی اسکولوں میں - ۷۹ / ۶ فی صدی انجینیری میں = ۶۵ / ۵ فی صدی

انٹر کالجوں میں = ۸۳ / ۶ " " تجارتی مدارس میں = ۸۶

یونیورسٹیوں میں = ۸۲ / ۸ " " بنگ، بمبے کے کالجوں میں = ۸۳

پوسٹ گریجویٹ بیوٹھیں = ۸۵ / ۶ " " قانون پیشہ = ۸۶ / ۶

مڈیکل کالجوں میں = ۸۶ / ۳ " " ڈاکٹری = ۹ / ۶ فی صدی دیگر فنون میں = ۷۱ / ۳

اب اسی کے ساتھ تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ ہو کہ اٹلاس و ذلت بد اخلاقی و بد اقبالی میں مسلمانوں کی ترقی کا کیا عالم ہے :-

آوارہ گرد، فقروں میں ان کی تعداد ۵۲ / ۶ فی صدی ہے

قلبتانی و فحاشی وغیرہ میں " " ۶۲ / ۶

اخلاقی جرائم کے ماتحت جیل خانوں میں " " ۵۳ / ۱

اس کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے ؟

جو صاحب اس کا معقول جواب دیں گے اور اس کا زود اثر علاج بتائیں گے ان کی خدمت میں ایک طلبائی تمغہ پیش کیا جائے گا۔ مضمون کا انتخاب مدیر ننگار کریں گے۔ اور منتخب مضمون ننگار ہی میں شائع کیا جائیگا

ایک دردمند مسلمان

حُسنِ سِرِّاَہ

ہوئی ہے آج یہ کس سے عمری نگاہ دوچار کہ خود بخود ہوئی جاتی ہے، سلبِ طاقتِ ہوش
 یہ کس کا جلوہ ہے یہ کس کے جلوہ کی ہو کرن کیا ہے خاک کے ذروں کو جس نے آئینہ پوش
 مچل رہی ہیں رگ پے میں کیف کی موجیں یہ کس نے پھیرا دیا زندگی کا سازِ خموش
 کس ہجومِ رنگ سے ہے نبضِ کاہ میں حرکت و نورِ حُسن سے ہے موجِ خاکِ نالہ فردش
 اٹھا رہا ہے کوئی بزمِ راز کے پردے سرودِ موجِ صبا ہے کہ ہے نوائے سرودش
 ندیم! کس کو ملی ہے یہ نعمتِ سرمدِ نگاہِ جلوہ شناس و نگارِ جلوہ فردش
 خوشا! لطافتِ پہاں کہ آج دل میں نہیں خیالِ تلخیِ فردا، عسقمِ مصائبِ دوش

گئی وہ تیرگیِ شب، وہ رسمِ بے خبری

جبینِ دہر پہ چمکا ستارہٴ سحری

نگاہِ حسنِ طلب چاہئے کہ بزمِ حیات نہیں کچھ اور بجز اک اداے جلوہ ناز
 کھلا ہوا ہے ازل سے درِ حریمِ جمال کوئی حجاب ہے، صبرِ آزمانہ پردہ راز
 بھلاک رہا ہے پیالوں میں رنگِ بادۂ ناب لرز رہی ہے سر دوش موجِ زلفِ دراز
 سمجھ نہ شانِ تغافل کو در کسِ محرومی کہ ہے نیاز کے اجزا سے حسنِ خلوتِ ناز
 جدا ہے عقل کی سرحد سے بخودی کا مقام نہ پیچ و خم ہیں نہ اس راہ میں نشیبِ فراز
 درونِ ساغر دل چاہئے، رہیں طپش وہ موجِ بادہ کہ ہو آتشِ پیالہ گزار
 یہ مشتِ خاک اور اتنی بصیرتِ افروزی مگر عمیق ہے کتنا فریبِ حسنِ مجاز

نناں ہے بے خبری میں نشاطِ منزل بھی

شکستِ دل میں ہے تعمیرِ ہستی دل بھی

علی اختر

(حیدرآباد دکن)

ارمغانِ غم

نگاہ اندوہناک، چہرہ اداس، دل بیقرار کیوں ہے
خبر نہیں اسقدر فراوانیِ غم روزگار کیوں ہے

وفا شعاروں پر اوجھال کیش! بیدریغ اور بے محابا
عنایتِ جانگداز کیوں ہے، نوازشِ دلفگار کیوں ہے

مری خموشی نہیں ہے تسکینِ دل کی آئینہ دار ہدم
میں دم بخود ہوں کہ زندگی ایک ذلتِ ناگوار کیوں ہے

کبھی کبھی لب پہ آہی جاتا ہے آہ کے ساتھ نام تیرا
خبر نہیں تیرا ذکر ٹوٹے ہوئے دلوں کا قرار کیوں ہے

کچھ ایسا مانوس ہو گیا ہوں مصیبت آمیز زندگی سے
کبھی نہیں یہ خیال آیا، زمانہ ناسازگار کیوں ہے

یہ زندگی خود بہت بڑا غم ہے، اے غم عشق دینے والے
یہ درد مندوں کے حال ہی پر نوازشِ بیشمار کیوں ہے

کہو عدمِ دل کا حال کیا ہے؟ یہ کیسی چُپ تم کو لگ گئی ہے
یہ ہر گھڑی، آہ! آہ! اور بات بات میں اختصار کیوں ہے

عدم

وارداتِ امروز

افسونِ بیخودی کا عمل بیکراں ہے آج دل بے نیازِ ہستی کون و مکاں ہے آج
 ڈوبی ہوئی ہے وجد میں رفتارِ زندگی اک کیف ہے کہ ہوش کی روح و رواں ہے آج
 کیا تذکرہ ہے ارض و سما کے وجود کا ہر چیزِ محویت کے سوا بے نشان ہے آج
 رعنائیِ مجاز میں ہیں وہ تجلیاں ! رعنائیِ مجاز میں گم سب جہاں ہے آج
 اک پُر بہار و روح فرا جوئے بار میں موحِ خرام کشتیِ عمر و رواں ہے آج
 بیتاب ہے عناصرِ دل میں خوشی کی لہر ہر سانس میں گدازِ مسرت نہاں ہے آج
 پھر کار و بارِ شوق کا بازار گرم ہے پھر دل سے موحِ کاوشِ سود و نیاں ہو آج
 پھر افتتاحِ جلسہٴ عیش و نشاط ہے پھر اہتمامِ زندگی کا مراں ہے آج

حسن اپنے کیف و ناز سے سرشار ہو عدم !

عشق اپنے سوز و ساز سے آتشِ بجاں ہو آج

عدم

خالہ

آہ! اے اک عمرزدہ شاعر کی تسکین حیات زندگی کی ایک چھوٹی سی منور کائنات
 امن کی ایک پرسکون دنیا ہے گوارا ہ ترا شورشوں کی دسترس سے دور ہے جھولا ترا
 تیری میٹھی نیند کے پردے میں کوئی حور ہے تیرا سپنا خلد کے انوار سے معمور ہے
 جھوا، ارجی بھر کے بھولے میں، اٹھا زلفِ خواب اور مے نختِ جگر! آنیکو ہے اک انقلاب
 تلخیاں ہی تلخیاں ہیں گردِ مشیں ایتام میں جھولنا ہے گل تجھے گوارا، آلام میں

عہدِ طفلی کا رو پہلا خواب ہے ناپائدار دکھینی پڑتی ہے انساں کو جفا کے روزگار
 پیارے خالہ تجکو لے آئیگی دنیا ہوش میں کھولنا ہے آنکھ تجکو حشر کے آغوش میں
 امتحانِ عزم و استقلال کرنے کے لئے ناتواں انسان کو پامال کرنے کے لئے
 گرم ہے آفات کا بازار ازل سے دہر میں سرخرو ہوتے ہیں ذی ہمت عمل سے دہر میں

اک سپاہی بن کے میدان میں اترنا ہو تجھے
 روح فرساحادثوں سے جنگ کرنا ہو تجھے

پروانہ

اے سراپا گد انہ پر دانی مہرب، عشقبا ز پر دانی
 بامزاد اور کامگار ہے تو مذہب عشق کا وقار ہے تو!
 کیا ابد تاب ہے حیات تری کیا منور ہے کائنات تری
 اُف! ترے آبِ گل میں کیا شہو؟ دل ہے سینے میں، دل میں کیا شہو؟
 شمع، خاموش جلتی رہتی ہے آگ کی تو نکلتی رہتی ہے
 پہلے اُس کا طواف کرتا ہے عشق کا اعتراف کرتا ہے
 اور پھر تہ بخودی میں گم ہو کر نشہ سردی میں گم ہو کر
 خوب دل کی لگی بچھاتا ہے شوق سے آگ میں نہاتا ہے

عشق نغمہ ہے اور ساز ہے تو

وہ حقیقت ہے اور مجاز ہے تو

عدم

لمعات اختر انصاری

مہتاب :-

آسماں کے ہاتھ میں ہے اک ستار
پڑ رہی ہے مست نغموں کی بچھوار
آہ ! ان نظرات سے ہے مرتعش
سازِ دل کا کوئی نامعلوم تار

دھوپ اور آئینہ

ہلکی ہلکی بھوار کے دوران میں ،
ہلکے سورج جو بے پردہ ہوا
میں نے یہ جانا کہ وحشت میں کوئی
روئے روئے کھنکھن کر رہا ہے پڑا

مطر پہ

تیری نازک اور پتلی انگلیاں
ساز کے تاروں کو جب کرتی ہیں مس
کاسپنے لگتی ہے زہرہ عرش پر
دل پکار اٹھتا ہے بس ، لگتا ہے بس

مغنیہ

تیرے شوق انگیز اور جاں سوز نغموں کی قسم
تیرے غمخوار اور دل دوز نغموں کی قسم
تیرے صہبائے زماں ، بعد آموز نغموں کی قسم
تیرے غمخوار اور دل دوز نغموں کی قسم

جب دلوں کو سحر زانغموں سے تر پاتی ہے تو
جب رگوں میں زندگی کا خون دوڑاتی ہے تو
بزم کو جب راگ کی حدت سے گرماتی ہے تو
عزق ہو کر بزم موسیقی میں جب گاتی ہے تو

گیت کے طوفاں میں بہ جاتی ہے ساری کائنات
ایک نغمہ بن کے رہ جاتی ہے ساری کائنات

لذتِ غم

یوں بھی ہوتا ہے کہ فکر و ذوق کی تشنہ لبی! چھین لیتی ہے نشاطِ عمر سے آسودگی!
 یوں بھی ہوتا ہے کہ رہتا ہوں میں کثر سوگوار! روح میں پاتا ہوں اپنی مستقل اک مضطرب!
 صرف غم ہوتی ہے جب میری حیاتِ سوگوار اور جھا جاتا ہو مجھ پر سخت ذہنی انتشار!
 دفعتاً ایسے میں او محبوب، تو آتا ہے یاد! اک خیالِ روح پرورد دل کو کر دیتا ہے شاد!
 ایک نامعلوم سستی میں کھوجاتا ہوں میں! حُسن کی رنگینیوں میں جذب ہو جاتا ہوں نہیں!
 دلیں وہ پہلا سا احساسِ الم ہوتا نہیں! روح میں سیدار اب ہوشِ غم ہوتا نہیں!
 کیا کہوں ہوتا ہوں کیسی شادمانی سے دوچار! سیکڑوں ایامِ خوش اس ایک ساعت پر نثار!

کوئی اس احساس کی لذت بتا سکتا نہیں!!

کوئی اس روادِ عشرت کو بتا سکتا نہیں!!

جمیل راز بنگلش سرحدی

”تازیانہ“

اسیرِ دامِ خیال و شکستہ پر کب تک
 قصورِ حوصلہ، کوتاہیِ نظر تا کے
 دراز دستِ سوال و شکستہ پائے رُعل
 دماغِ سست، دلِ بد شعار، طبعِ رکیک
 اسیرِ اس تن آسانِ مریضِ ہم و خیال
 ذلیںِ خمستہ فریاد بے اثر کب تک
 سیرِ نیاز، تمنا بے سنگ در کب تک
 عینِ فکار، لبِ فسردہ، چشمِ ترکب تک
 مذاقِ پست، خیالاتِ منتشر کب تک
 رہیں غم، بدفِ مشق چارہ گر کب تک

وطنِ فروشی و غداری و ضمیرِ کُشی
 درندگی و برادر کُشی و سفاکی
 غلامِ نفسِ اسیرِ کندِ حرص و ہوس
 عد و نواز و عد و دوست و عد و پرو
 فرشتگیِ طلسماتِ جاہ و زر کب تک
 ستیزہ کاری و اندازِ فتنہ گر کب تک
 سیاہست سے عسکرِ مختصر کب تک
 فریب خوردہ و مدہوش و بخر کب تک

ہوا پرست، غلط رو، فساد خیز، شریر

تباہ کار، زیاں کوش، بے بھر کب تک

کو کتب (شاہجہانپوری)

معلومات

چوٹی چھوٹا انسان ہے اور انسان بڑی چوٹی۔ امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں ڈاکٹر ولیم مارٹن ہولیر نہایت مشہور کے لئے انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کر دیا ہے۔ اس موضوع پر جو لٹریچر انھوں نے پیش کیا ہے وہ نہایت عجیب و غریب حقائق اور نادر معلومات کا ذخیرہ ہے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کرہ ارض پر چوٹی کا وجود تقریباً ۳۰ کروڑ سال سے پایا جاتا ہے اور اپنی معیشت وغیرہ کے لحاظ سے وہ نظام بشری سے بہت زیادہ مشابہ ہے، یہاں تک کہ ان دونوں میں اگر کوئی خاص فرق پایا جاتا ہے تو یہ کہ چوٹیوں کا نظام اجتماعی انسان کے نظام اجتماعی سے زیادہ بسیط ہے، کیونکہ اس نے جو ایک وسیع اختیار کر لیا ہے اس سے کبھی ہٹتی نہیں اور انسان تغیر پسند ہے۔ چوٹی کی مشہور قسموں کی تعداد ۳۵۰۰ تک بتائی جاتی ہے، لیکن ان میں سے اگر ہر نوع کی مختلف قسموں کو سامنے رکھا جائے تو یہ تعداد سات ہزار سے متجاوز ہو جاتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ کثرت انواع کے لحاظ سے شاید ہی کوئی مخلوق اس کے مقابل میں پیش کی جاسکے۔

چوٹیاں روئے زمین کے ہر حصہ پر پائی جاتی ہیں سوائے شمال و جنوب کے اس منطقہ بارہ یا پہاڑ کی اُن اونچی چوٹیوں کے جہاں ہر وقت برف بچھ رہتی ہے۔ ان کی اکثر قسمیں اپنا گھر ہمیشہ زمین کے اندر بناتی ہیں اور جب غیر معمولی رطوبت پیدا ہو جاتی ہے یا درجہ حرارت بدل جاتا ہے تو دوسری جگہ منتقل ہو جاتی ہیں۔ چوٹی کی کوئی غذا متعین نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر ایک طرف وہ کیرے، مکوڑے، کھا کر اپنے گوشت خوار ہونے کا ہوتو دیتی ہے تو دوسری طرف غلہ اور پتیاں وغیرہ کی شایق ہونے کے لحاظ سے نباتاتی بھی کھائی جاسکتی ہے، یعنی اس باب میں جو حالت انسان کی ہے وہی اس کی بھی ہے۔ پھر جس طرح انسان میں یہ دستور ہے کہ وہ دوسروں سے خدمت لیتے ہیں۔ اسی طرح چوٹیاں بھی اپنے خادموں سے کام لیتی ہیں اور بیس طرح انسانوں میں سارق و رہزن پیدا ہو جاتے ہیں اسی طرح چوٹیوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

چوٹی کی ایک قسم ایسی ہے جو اپنی غذا صرف لوٹ مار کے ذریعہ سے حاصل کرتی ہے اور دوسری امن پسند مخنتی چوٹیوں سے غذا بچھین کر خود لے بھاگتی ہے۔ ایک قسم چوٹیوں کی بھی ہے جو زیادہ تر دیواروں کے اندر رہتی

اور اندر ہی اندر نہایت پیچیدہ راستے بنا کر چرائی ہوئی غذا کو ان میں چج کرتی رہتی ہے۔ یہ زرد رنگ کی چھوٹی چوٹی ہوتی ہے اور گھروں میں ہر جگہ نظر آتی ہے

ان میں باہد گر علاقہ محبت بھی پایا جاتا ہے اور ایک قسم کی چوٹیاں دوسری قسم کی چوٹیوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ ایک چھوٹی قسم اس کی ایسی ہے جو بڑی چوٹی کی پیٹھ پر سوار ہو جاتی ہے اور اس کے سر اور منہ کو چاٹتی رہتی ہے۔ یہ بڑی چوٹی اسی حال میں غذا کی بھی تلاش کرتی رہتی ہے اور اُسے یہ بار مطلق ناگوار نہیں ہوتا۔ بعض چوٹیاں دوسری چوٹیوں کو غلام بنانے اور ان سے خدمت لینے کی بہت شائق ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک قسم اس کی جس کا نام اماردون ہے، یہ پوری اجتماعی قوت سے دوسرے گروہ پر حملہ کرتی ہے اور غلام بنا لیتی ہے، یہ محارب قسم کی چوٹی خود اپنے بچوں کو نہیں پالتی بلکہ انھیں غلام چوٹیوں سے یہ خدمت لیتی ہے

بعض چوٹیاں دوسرے کیڑوں کو تپتی بنا کر ان کی پرورش بھی کرتی ہیں۔ یہاں تک جب وہ تپتی کیڑا بڑھ جاتا ہے تو بھی انھیں کے درمیان رہتا ہے اور یہ اس کی راحت و آسائش کا پورا لحاظ رکھتی ہیں

الغرض چوٹی کی دنیا بھی بالکل انسانی دنیا ہے اور سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ چوٹی ایک چھوٹا انسان ہے اور انسان ایک بڑا چوٹا

فرانسیسی قوم پر بھی مغرب کی دوسری قوموں کی طرح زمانہ وحشت گزر چکا ہے

فرانس کا قدیم طریقہ احترام اور اس عہد کے بعض مراسم ان کے یہاں عجیب و غریب تھے، مثلاً آٹھویں صدی تک وہاں یہ رواج عام طور پر پایا جاتا تھا کہ جب کوئی معزز شخص کے گھر آتا تھا اور عزت و احترام کے ساتھ اس کی پزیرائی کی جانی مقصود ہوتی تھی تو صاحب خانہ یا میزبان سب سے پہلے اپنے سر کا ایک بال اکھاڑ کر آگے بڑھتا تھا اور ہاتھ پر رکھ کر اس کے سامنے پیش کرتا تھا۔ چنانچہ جس وقت سان جرمان فرانس آیا ہے تو گلو فیس نے یہی حرکت کی تھی اور دربار کے تمام امراء نے بھی اپنے اپنے بال اکھاڑ کر اس رسم کو ادا کیا تھا۔ تنکا منہ میں داب کر ایک پاؤں سے سامنے کھڑے ہو کر خیر مقدم کرنے کی رسم ہندوستان کی بعض خانہ بدوش قوموں میں اب بھی پائی جاتی ہے اور ایران میں بھی کسی وقت یہ رواج پایا جاتا تھا۔ چنانچہ اظہار عجز کے مفہوم میں "خس بدنداں" کا محاورہ فارسی میں اسی رسم کے بنا پر قائم ہوا تھا

غالب لکھتا ہے :-

ہجوم نالہ، حیرت عاجز عرض یک انخال ہے

خوشی، ریشہ صد نیستاں سے "خس بدنداں" ہے

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہجوم نالہ فرط حیرت سے اس قابل بھی نہیں کہ نالہ و فریاد کر سکے اور میری یہ خاموشی میرے

عجز کو بالکل اسی طرح ظاہر کر رہی ہے جس طرح ”نیستاں“ کی خاموشی جس کا ریشہ دار ہونا گویا ”خس بدنداں“ ہونا ہے،

ایک عجیب بازار | برکن کے ہر ہوٹل و قہوہ خانہ میں ایک بار ہر مہینے خاص قسم کا بازار لگتا ہے جہاں خرید و فروخت یا لین دین سکوں کے ذریعہ سے نہیں ہوتا بلکہ ایک چیز کا تبادلہ دوسری چیز سے کر لیا جاتا ہے۔ انعقاد بازار کے دن مختلف لوگ مختلف چیزیں لیکر آتے ہیں اور باہم تبادلہ کر لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی چھلی لے کر آیا ہے تو وہ کسی دوسرے جانور سے تبادلہ کر لیتا ہے، کوئی خاص قسم کی تیتری لے کر آیا ہے تو کسی پودے کے عوض میں دیدیتا ہے۔ الغرض اپنی بے ضرورت چیز کے عوض دوسرے سے اپنی ضرورت کی چیز یہاں لے لی جاتی ہے حال ہی میں ایک شخص یہاں گھڑیاں کا چھوٹا پتہ لایا۔ اور صرف ایک پھول کے عوض اس کو دے گیا۔ دنیا بھر میں کسی جگہ یہ رواج نہیں پایا جاتا اور عمدہ قیم کے طریق خرید و فروخت کی یہ یادگار اس وقت صرف برکن ہی میں پائی جاتی ہے

اندھوں کا شہر | شرقی ترکی میں ایک مقام ہے جس کا نام اولیامان ہے جہاں سات ہزار کی آبادی ہے لیکن لطف یہ ہے کہ ان میں سوائے ۲۰۹ آدمیوں کے باقی سب اندھے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قدیم ترکی حکومت نے اندھوں کے لئے یہاں کوئی خاص انتظام علاج کا کیا تھا جو اب باقی نہیں ہے اور اس طرح ایک مستقل آبادی اندھوں کی یہاں ہو گئی ہے اور اب نسل میں اثر پیدا ہو کر اولاد بھی اندھی پیدا ہونے لگی ہے

تحفہ قبر | دنیا کا شاید سب سے عجیب تحفہ وہ ہے جو امریکہ کے ایک پادری ویل ہوائن کو قبر کی صورت میں دیا گیا۔ اس کا واقعہ یوں ہے کہ سنہ ۱۹۰۵ء میں ایک ویم ہنگ مراد در دفن کر دیا گیا، لیکن بعد کو اس کے ورثہ کا ارادہ یہ ہوا کہ اسے کسی دوسری جگہ دفن کر دیں چنانچہ اس قبر کو خالی کر کے اس کا کتبہ وغیرہ علیحدہ کر لیا اور ایک دوسرا کتبہ لگوادیا۔ جس میں پادری ویل ہوائن کا نام لکھ دیا۔ تاریخ وفات کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ جب یہ سب کچھ ہو گیا تو یہ خالی شدہ قبر کتبہ کے پادری ویل ہوائن کو تحفہ دیدی گئی تاکہ جب وہ مرے تو اس قبر سے کام لے اور کتبہ میں تاریخ وفات مدج کر دے۔ لطف یہ ہے کہ پادری صاحب موصوف اس ہدیہ سے بہت خوش ہیں کیونکہ ان کے نزدیک محبت کا ہدیہ خواہ وہ موت ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو قابل قدر ہے

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

ناول، ڈرامے اور افسانے

تاریخ و سوانح محرمیوں لغات و لہجے

گورڈر کالال	فرانس مادری	۱۲	نظرات اشک	۱۲	تاریخ مغرب	۱۲	بازاری زبان	۱۲
شوکت آبادیلم حصہ اول	افشار جہاں	۱۲	جنت درانامہ	۱۲	تاریخ اسلامی	۱۲	لغات سعیدی	۱۲
سیدہ کے خطوط	اقبال دوطن	۱۲	بس کار و کھ	۱۲	حصہ ۲	۱۲	لغات کشوری	۱۲
بیاری ہیلی	حسن معاشرت	۱۲	فانہ سعید	۱۲	حصہ ۳	۱۲	تعمیر تحقیق جلد اول	۱۲
نئی فیضی بیاری ہیلی	ایامی	۱۲	خفاک قیمتی	۱۲	حصہ ۴	۱۲	غیر لغات فارسی	۱۲
عورتوں کی انشا	سولہ کہانیاں	۱۲	سیلاب افکار تصویر	۱۲	حصہ ۵	۱۲	محاورات نسوان	۱۲
انشار نسوان	سترہ کہانیاں	۱۲	بے زبان دوست	۱۲	حصہ ۶	۱۲	جوہر اللغات	۱۲
سیرۃ الکبریٰ	سولہ قصے	۱۲	جال ہم نشین	۱۲	حصہ ۷	۱۲	گورہر لغات	۱۲
طرز زندگی	مراقبہ لدوس	۱۲	تفسیر عصمت	۱۲	حصہ ۸	۱۲	چراغ سخن	۱۲
مخدرات تیوریہ	بناۃ النعش	۱۲	جوہر قدامت	۱۲	حصہ ۹	۱۲	دکھنی نعت	۱۲
ازواج البنی	توبۃ النصوح	۱۲	تائید غیبی	۱۲	حصہ ۱۰	۱۲	جوہرات کلیات نظیر	۱۲
ازواج الانبیاء	کنیز فاطمہ	۱۲	پر سر اقل	۱۲	حصہ ۱۱	۱۲	عزیز اللغات	۱۲
سیرۃ عالیہ صدیقہ	پگھر لہجہ	۱۲	اعلان آزادی	۱۲	حصہ ۱۲	۱۲	تذکرہ ریختی	۱۲
عفت المسلمات	نصیحت کار کچھول	۱۲	سرگزشت ہاجرہ	۱۲	حصہ ۱۳	۱۲	تاریخ اردو کے قدیم	۱۲
سبیل الجنان	برکات سلطان	۱۲	فصیحہ زندگی	۱۲	حصہ ۱۴	۱۲	دکن میں اردو	۱۲
بچوں کی پرورش	ابن الوقت	۱۲	قلب حزمی	۱۲	حصہ ۱۵	۱۲	منتخب کلام ہندی	۱۲
حرز طفلان	چند بند	۱۲	عروس کر بلا	۱۲	حصہ ۱۶	۱۲	رباعیات عمر خیام	۱۲
تذیب نسوان	منتخب الحکایات	۱۲	شہید مغرب	۱۲	حصہ ۱۷	۱۲	منتخب کلام ہندی	۱۲
بیوی کی تعلیم	تندرستی	۱۲	ناہ عم	۱۲	حصہ ۱۸	۱۲	اردو کے اسالیب	۱۲
بیوی کی تربیت	حفظ صحت	۱۲	تجہ نکل	۱۲	حصہ ۱۹	۱۲	تصنیف الماعلاط	۱۲
تربیت اطفال	طیب نسوان	۱۲	سراب مغرب	۱۲	حصہ ۲۰	۱۲	فیض اردو	۱۲
	بہر صحت	۱۲	کنڈل ساڑھ کال	۱۲	حصہ ۲۱	۱۲	نور اللغات جلد اول	۱۲

دواوین فارسی

دواوین اردو

دیوان شمس تبریز	کلیات غالب	۱۲	دیوان غنی نیری	۱۲	کلیات نظیر اکبر آبادی	۱۲	صحنہ عشق	۱۲
کلیات عراقی	کلیات صاحب	۱۲	دیوان ہلالی	۱۲	گلزار داغ	۱۲	فریاد داغ	۱۲
دیوان حافظ	دیوان ناصر علی	۱۲	اسرار غنی ہوز	۱۲	دیوان رند	۱۲	عالم خیال تصویر	۱۲
دیوان بیدل	کلیات سعیدی	۱۲	ذوہرجم	۱۲	دیوان ذوق	۱۲	دیوان خمیدی	۱۲
دیوان عربی	کلیات حزمی	۱۲	پیام شرق	۱۲	گلندہ عنزہ	۱۲	کلیات اکبر الہادی	۱۲
کلیات جامی	دیوان عنصری	۱۲	تہا و عزیر جلد	۱۲	مرآۃ الغیب	۱۲	نذر دل شاہ جہانپوری	۱۲

ذیل کی کتابیں نگار بک کلبسی سے طلب فرمائے

تذکرہ و تاریخ	جاسوسی کہ ناول	مراثی	ناول سجاد حسین	ظفر عمر زنی لے	ناول شہر
پینچر غلام	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
شب معراج	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
سراج منیر	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
بیخبر عالم	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
سوانح حضرت رسول	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
سید المرسلین	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
حیدر کرار	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
سیرۃ الصدیق	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
عمر ابن خطاب	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
ابوبکر صدیق	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
انہ اسلام	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
الجیب	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
عمر بن عبدالعزیز	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
دولت نادر تہ	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
مکمل سوانح نیرا لہنا لہنگ	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
تذکرہ اولیا	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
تذکرہ اولیاے ہند	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
مرآة الکونین	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
تخص ملا نیا مکمل	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
سفرنا مسعین	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
تلخیص التواریخ	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
خاقان جنت	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
مخارات الصوفیہ	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
خواتین آگورہ	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
مشاہیر نسواں	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
مشاہیر چند	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
مخدرات تیموریہ	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸
بگمات بنگال	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸	عمر ۱۸

نگار بک کلبسی کھنڈ

مولانا شبلی نعمانی

کلام شبلی اردو	عمر ۱۸
کلام	عمر ۱۸
علم الکلام	عمر ۱۸
شعر العجم جلد اول	عمر ۱۸
دوم	عمر ۱۸
سوم	عمر ۱۸
چہم	عمر ۱۸

ناول سرشار

سیر کسار کے	عمر ۱۸
سیرۃ ابنی جلد اول	عمر ۱۸
دوم	عمر ۱۸
سوم	عمر ۱۸
افرادوق	عمر ۱۸
الغزالی	عمر ۱۸
الماہون	عمر ۱۸
رسال شبلی	عمر ۱۸
موزنہ انیس و دہیر	عمر ۱۸

ناول جو الپرشاد

مرثیہ	عمر ۱۸
مذکرۃ الشعراء	عمر ۱۸
تذکرہ حسینی	عمر ۱۸
گلشن بیجار	عمر ۱۸
سرپا کے سخن	عمر ۱۸
سوانح نظیر اکبر بلادی	عمر ۱۸

ناول کے ناولوں کے ترجمے

الہ دین ویلی	عمر ۱۸
فریب حسن	عمر ۱۸
سوزن عشق	عمر ۱۸
روز ایبیرٹ	عمر ۱۸
ناول ہرار	عمر ۱۸
شام جوانی	عمر ۱۸
حرم سرا	عمر ۱۸

عجائب معذب

عجائب مخلوقات	عمر ۱۸
تصویر رنگین	عمر ۱۸
بات تصویر سادہ	عمر ۱۸
جمع الغنون	عمر ۱۸
طلسم رنگ	عمر ۱۸
کارخانہ عالم	عمر ۱۸



قیمت ۸۰۰

تصانیف حضرت نیاز پوری

<p>نگارستان حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور انشائوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ شہرت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے۔ قیمت علاوہ محصول ۱۰</p>	<p>گہوارہ تمدن مولانا نیاز کی وہ سحرانگہ آرا کتاب جس میں تابع اور ساطر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے اور کتنا اثر بردست حصہ لیا ہے اور کتنا تہذیب نشانی کی ہے اس قدر مضمون پر آرد میں بالکل پہلی کتاب کا قیمت علاوہ محصول ۱۰</p>	<p>شہاب کی سرگزشت حضرت نیاز کا وہ مدیم نظیر افسانہ جو اردو زبان میں پہلی مرتبہ سہرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی ہمدی مضمون اور اسکی انشائیہ طرز عمل کے درجہ تک پہنچنے کی قیمت علاوہ محصول ۱۰</p>	<p>فرست المید مولانا نیاز پوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی نام نہاد پیش کیفیات اسکے ایک نامی ایسی شریح کی پرکھ دینا چاہئے جو ہر انسان کے لئے بلا تامل اور انشائیہ کے لئے اس قدر بلند ہے کہ اسکی دوسری جگہ مل نہیں سکتی۔ قیمت علاوہ محصول ۱۰</p>	<p>شاعرِ انجام جناب نیاز کے عفو ان شہاب تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے جہ میں موجود ہیں یہ افسانہ پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کا ایک نثری نمونہ ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۱۰</p>	<p>جذبات بھاشا جناب نیاز نے ایک دلچسپ اور انشائیہ کے لئے اس قدر بلند ہے کہ اسکی دوسری جگہ مل نہیں سکتی۔ قیمت علاوہ محصول ۱۰</p>
<p>صحابیات جس میں عہد سعادت کی خوبیاں کے مشہور حالات بیان کر دیے گئے ہیں اسکا نام مولانا نیاز نے اپنی انشائیہ میں بیان کیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۱۰</p>	<p>نقابِ بھائی کے بعد تین اذ انوں کا مجموعہ نہیں بتایا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو چھٹی ہو سونا نہیں۔ زبان و بلاط انشاء و تخیل کے لحاظ سے تعریف فطیوں ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی ضمانت ہے قیمت ۱۰</p>	<p>مذاکرات نیاز یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت ۱۰</p>	<p>فلاسفہ قدیم اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین ہی مضامین شامل ہیں۔ جلد کا ترجمہ جس میں عہدِ نبوی آمیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بے مثل مضمون لکھا گیا ہے۔ جرحی زیدان سب سے بہتر ترکی و دو نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت ۱۰</p>	<p>تاریخ الدولتین عصیطنے خامل یا شانی آردو عالم کتاب کا ترجمہ یہ وہ کتاب ہے جس نے یورپ کی دنیا کے سیاسیات پر بے مثل مضمون لکھا گیا ہے۔ جرحی زیدان سب سے بہتر ترکی و دو نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت ۱۰</p>	<p>المسئلۃ الشرعیہ عصیطنے خامل یا شانی آردو عالم کتاب کا ترجمہ یہ وہ کتاب ہے جس نے یورپ کی دنیا کے سیاسیات پر بے مثل مضمون لکھا گیا ہے۔ جرحی زیدان سب سے بہتر ترکی و دو نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت ۱۰</p>

<p>تذکرہ خندہ گل مولانا عبدالباری آسی جس میں ۲۰۰ مسخفات سے زیدان اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات اور انکی مختلف و ظریف انتخابات کلام کے منتخب نمونے جمع کیے گئے۔ قیمت ۱۰</p>	<p>دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں</p> <p>تنومی لالہ رخ طاس مور کی سحرانگہ آرا تنومی کا کمال ترجمہ، دنی شہر کا بے مثل نمونہ۔ قیمت ۱۰</p> <p>تنومی زہر عشق مرتبہ مجنوں گور کچھوری جس میں ملک کے چار بہترین ادیبوں کا مقرر شامل ہے اور کئی تصویروں دی گئی ہیں۔ قیمت ۱۰</p>	<p>فرست التخریر مکمل مجموعی آردو ڈائری کے تمام نمونے اور تخریر دیگر کرائیکس کی بہت سی جہن مستقبل اور تمام حالات کو کرنے کا فن آردو میں پہلی پہلی۔ قیمت ۸</p>	<p>فرست التخریر مکمل مجموعی آردو ڈائری کے تمام نمونے اور تخریر دیگر کرائیکس کی بہت سی جہن مستقبل اور تمام حالات کو کرنے کا فن آردو میں پہلی پہلی۔ قیمت ۸</p>
--	---	---	---

ضرورت ہے ایجنٹوں کی ہر شہر میں کیلاس کیلے

جو ہندوستان کی سب سے زیادہ حیرت انگیز اور کثرت سے فروخت ہونے والی دوا ہے

دماغ کی تقویت کے لئے اکیس اور بالوں کی پرورش میں بے نظیر
گھر بیٹھے پانچ روپیہ (۵) سے پندرہ روپیہ (۱۵) روزانہ تک کمالینا کوئی بات نہیں۔ ہر شخص آسانی سے
کر سکتا ہے

جو تک کیلاس کے علاوہ اور بھی متعدد دوائیں ایسی ہی مفید و زود اثر تیار ہیں، اس لئے کیلاس
مستقل کاروبار کے بعد دوسری دوا ایجنٹوں کو دی جائے گی، پھر تیسری، پھر چوتھی۔ الغرض اسی طرح ہر ایجنٹ
کا مستقل کاروبار ہو جائے گا۔ اور ۵ ہزار سالانہ تک کمالینا دشوار نہ ہوگا

کیلاس کی خصوصیت | کیلاس چودہ نایاب جزئی بوٹیوں سے تیار کی جاتی ہے اور اس کے اجزاء بہت قیمتی
ہیں، لیکن اس کی قیمت پھر رکھی گئی۔ دماغ، آنکھ اور بال کی تقویت کے لئے اس دوا
کا نظیر نہیں۔ حال ہی میں کیلاس کے ایک ایجنٹ نے ۴۸۲ روپیہ دس آنے ایک مینے میں کمائے

اشتہار کی وسعت | جو تک ہم نے ۳۶ ہزار سالانہ اس کے اشتہار کے لئے مقرر کیا ہے۔ اور ہر اشتہار میں ہمارے
تمام ایجنٹوں کے نام درج ہوں گے اس لئے ایجنٹوں کو اور زیادہ سہولت اس کے فروخت
کرنے میں ہوگی

تھوک کا حساب | تین درجن شیشیوں کی قیمت ۳۶ روپیہ، اور ۱۲ درجن کی ماٹھے ۱۲ روپیہ کی جائے گی اور
محصول وغیرہ بھی سعات ہوگا۔ ایجنٹ پھر فی شیشی کے حساب سے فروخت
کریں گے۔ تین درجن سے کم شیشیاں روانہ نہوں گی

واپسی روپیہ کی ذمہ داری | جو تک کیلاس کے متعلق یقین ہے کہ وہ ضرور فائدہ کرے گی۔ اس لئے ہم اس کے
لئے بھی تیار ہیں کہ غیر فروخت شدہ مال اگر محفوظ طور پر وقت کے اندر ہم کو واپس بھیج
دیا جائے گا۔ تو صرف نکال کر روپیہ واپس کر دیا جائے گا اس کے معنی یہ ہیں کہ ایجنٹ کو کوئی خطرہ اس کاروبار میں

(بقیہ اشتہار دوسرے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ہو ہی نہیں سکتا

اس لئے اپنے حلقہ میں کیلاس کے ایجنٹ بن جائے اور تھوڑی سی محنت، تندہی اور کوشش سے کام لے کر گھر بیٹھے روپیہ کمائے۔ ایجنٹوں کی بھرتی کا کام نہایت تیزی سے جاری ہے اس لئے پہلی فرسٹ میں تین درجن پیشیوں کی قیمت ذریعہ منی آرڈر بھیج کر ایجنٹ بن جائے ورنہ ممکن ہے آپ کے شہر سے کوئی اور ایجنٹ مقرر ہو جائے اور پھر آپ کو افسوس کرنا پڑے، اگر آپ کے شہر میں کوئی ایجنٹ پہلے مقرر ہو چکا ہے تو آپ کا منی آرڈر واپس کر دیا جائے گا۔ خط و کتابت صرف انگریزی میں کیجئے

کیلاس کے استعمال کرنے والے کیا کہتے ہیں

بابوسرور خاں تحصیلدار کالنڈری ریاست سروہی لکھتے ہیں:- آپ کی کیلاس دماغ اور بالوں کو تقویت کے لئے بے نظیر ہے، تعریف ہونہیں سکتی۔
پرائیٹ سکریٹری ٹھاکر صاحب رتنج ریاست لکھتے ہیں:- ٹھاکر صاحب کی ہدایت کے مطابق آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ کیلاس تیل غیر معمولی طور پر بالوں کے لئے مفید ثابت ہوا۔ مہربانی فرما کر تین درجن پیشیاں اور بھیج دیجئے ڈاکٹر پرامود رام۔ ڈسٹ، بی۔ اے۔ صاحب باغ، احمد آباد لکھتے ہیں:- میں تصدیق کرتا ہوں کہ کیلاس تیل دماغ اور بال کے لئے بہت تقویت بخش ہے اور اس میں کوئی مضر جزو شامل نہیں ہے۔
بیور کرائس کمپنی ۱۰ چارج اسٹریٹ پنانگ لکھتی ہے:- کہ کیلاس تیل ہمارے بہت سے گاہکوں نے مست پسند کیا

بنکرز:-

بنک آف انڈیا لمیٹڈ بمبئی

سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ بمبئی

Sharamsaq & Co

317 Hornby Road

Bombay.

"Charm" تار کا پتہ:-
Bombay.

ٹیلی فون نمبر کارخانہ ۸۹۲۰۰
دفتر " " ۲۳۱۰۵

ساتھ سات ہزار روپیہ انعام حاصل کیجئے

آٹھ الفاظ نوروزی مقولہ کا مقابلہ

مقابلہ کے متعلق شرائط

پہلا انعام ۵۰۰۰ روپیہ
دوسرا انعام ۱۵۰۰
تیسرا انعام ۵۰۰
دس انعامات پچاس پچاس روپے
میزان ۷۵۰۰

نوروزی توہنہ کا استعمال کرنیوالے

کیا کہتے ہیں !

آپ کا تعویذ پہننے کے بعد نیچے فوراً اطلاع ملی کہ مداس گورنمنٹ کالج ہی میں احکام دیے ہیں جس کے مطابق میں اپنی جگہ قائم سب انسپکٹ پولیس کے عہد پر بحال کر دیا گیا ہوں

یہ تحریر اس نرینڈنی کی ایک سب انسپکٹ پولیس کی پر ملاحظہ فروری ۱۹۳۳ء

پورا نام پتہ میر ڈفرن میں آ کر دیکھا جاسکتا ہے

تعویذ نہ ہو جو آپ نے مجھے جو میں بھیجا تھا میرے بہت فائدہ کا باعث ہے (تختہ)

ٹی۔ راجو پلائی ڈی پریسٹنڈنٹ پولیس ڈفرن آتمارام بہت شکریہ عرض کرنا

جسٹریٹ کا (سندہ) آپ کا تعویذ نہ ہونے منگوا تھا اسے فائدہ دینا شروع کیا ہے میں

آپ کا شکریہ ادا کرنا اگر آپ مجھے اپنا بہترین خیال کریں گے ہزاروں اور دیگر خبریں لکھنے میں دیکھی جاسکتی ہیں

آٹھ الفاظ کا کوئی فقرہ یا محاورہ لکھئے۔ جس کا ہر لفظ مندرجہ ذیل آٹھ حروف میں سے ایک حرف کیساتھ شروع ہوا ہو NAVAROZI اور اس فقرہ یا محاورہ میں نوروزی توہنہ کی مناسب تشبیح ہو۔ سب سے بہترین منتخبہ مقولہ یا محاورہ لکھنے والے کو پانچ ہزار روپے انعام دیا جائیگا۔ دوسرے درجہ پر پہننے والے کو پندرہ سو روپے یعنی تیس درجہ لیکو پانچ سو روپے۔ اسکے علاوہ پچاس پچاس روپے کے دس انعامات اور ہیں۔ جس میں ہر ایک کے بذات خود مقولوں کا انتخاب کریں گے اور انعامات کا فیصلہ کرنیوالے اور اس مقابلہ کے سلسلہ میں ہر بات کے متعلق وہ واحد منصف ہوں گے

ایسا موقع عمر بھر میں ایک ہی آتا ہے

آپ کیلئے پانچ ہزار روپیہ نقد حاصل کرنا یہ حیرت انگیز موقع ہے۔ آپ چند منٹ صرف کر کے اس بڑی نقدی کے انعام کو حاصل کر سکتے ہیں صرف ایک فقرہ یا مقولہ مندرجہ ذیل طریقہ کے مطابق بھیجیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ آپ ہی کی کوشش کا ثواب ہو تب سچی قسمت چمک اٹھیں گی اور پانچ ہزار روپے آپ کا انعام ہوں گے

بہت آسان ہے کوشش کر کے ساٹھ سات ہزار روپے جیت لیں پہلے ایسا کیجئے کہ نوروزی توہنوں کے متعلق آپ جتنی واقفیت حاصل کر سکیں کر لیں کہ انکا کیا اثر ہوتا ہے پھر آپ اس قابل ہونگے کہ ایک ہی فقرہ میں نوروزی طاقت کی تشبیح کر سکیں اور یہ مقولہ مذکورہ بالا طریقہ پر بنایا جائے (۱) مقابلہ ہر ایک کیلئے کھلا ہے جو اشخاص پہلے ہی نوروزی کے معتقد ہیں۔

N	۱	<input type="text"/>
A	۲	<input type="text"/>
V	۳	<input type="text"/>
A	۴	<input type="text"/>
R	۵	<input type="text"/>
O	۶	<input type="text"/>
Z	۷	<input type="text"/>
I	۸	<input type="text"/>

فیس داخلہ صرف دو روپے بھیجیں اور جنہوں نے کبھی نوروزی توہید حاصل نہیں کیا وہ نوروزی نمبر توہید کیلئے آڈر بھیجیں جس کی قیمت تین روپے ہے۔ ہر ہفتے صحت نوروزی کی قیمت چھ روپے طلب کیے گئے تو وہ دو داخلے (ENTRIES) بھیج سکتے ہیں اگر وہ نمبر توہید جس کی قیمت پچیس روپے طلب کیے گئے تو وہ دو داخلے بھیج سکتے ہیں۔ نمبر ۱- اسپنل جیسی توہید منگوانے پر جس کی قیمت پچتر روپے ہے وہ بھیجیں داخلے بھیج سکیں گے۔ ایک شخص جتنے بھیجا چاہے ایک ہی لفافے میں بھیجے۔ (۲) مقابلہ میں یکم ہونیوالے ہر فرقہ کو علیحدہ کاغذ لکھیں اور نیچے اپنا نام اور پورا پتہ تحریر کریں اور اسے لفافے بند کر کے اس پر الفاظ نوروزی مقلہ کا مقابلہ (NAVAR) (۳) OZI SLOGAN CONTEST لکھیں۔ تمام رقوم بذریعہ منی آرڈر بھیجی جائیں اور روپیہ بھیجے کے متعلق ڈانخانہ کی رسید داخلے کیساتھ ارسال کیجا جائے۔ منی آرڈر نہیں لکھتا وہاں ڈانخانہ کو حکمت قبول نہیں کہو جائینگے۔ برٹش پوسٹ آرڈر لکھتے ہیں۔ منی آرڈر کے اندازہ کے حساب سے بھیجا جاتا ہے اور اس پر پچھلے رخ حبیب اللہ صاحب لکھا جائے۔ (۴) ان داخلوں یا دعویٰ کیلئے جو کم ہو جائیں یا کسی اور جگہ چلے جائیں یا دیر سے پہنچیں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کیجا سکتی۔ کوئی خط و کتابت یا ملاقات نہیں ہو سکتی اس مقابلہ کے متعلق تمام امور میں حبیب اللہ صاحب کا فیصلہ بالکل آخری فیصلہ ہوگا جس کی قانوناً پابندی لازمی ہوگی اور یہ داخلہ کی ضروری شرط ہے۔ مقابلہ میں شریک ہونے والا کوئی شخص جو مندرجہ بالا قواعد و شرائط کی پابندی نہیں کیا مقابلہ خارج کیا جاگا۔ حبیب اللہ صاحب کے ناموں کے مقابلہ میں شریک ہونے کی اجازت نہیں۔ (۵) اس مقابلہ میں شرکت کیلئے بھیجی ہوئی فیس داخلہ یا توہیدوں کے لیے بھیجا ہوا روپیہ کسی حالت میں واپس نہیں ہو سکتا۔ خط و کتابت اور داخلے صرف انگریزی زبان میں ہوں۔ (۵) تمام داخلہ مندرجہ ذیل پتے پر بھیجے جائیں (۶) مقابلہ میں شرکت کی آخری تاریخ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء ہے اور نتائج کا اعلان ۱۵ نومبر ۱۹۳۳ء کو کیا جائیگا۔ ہندو مدراس - بمبئی کرشنل - ہندوستان - لاہور دہلی - لبرٹی کلکتہ - رنگون - ماٹرا میں نتائج کرایا جائے گا۔

نوروزی کیا اثر کرتا ہے

(۱) بیروزگاروں کو روزگار دلاتا ہے۔ (۲) امتحانات میں کامیابی (۳) مفرد نہیں کامیابی (۴) محنت اور شادابی کے متعلق اپنی فرائض کی تکمیل (۵) آپ کو دشمنوں پر فتح (۶) بری عادات دور ہوتی ہیں۔ بری عادات کے مقابلہ کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ (۷) کاروبار میں وسیع ترقی۔ (۸) ناکامی نندھی کے صندق میں لکھنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اور اگر ملازمت میں میں توجہ دینی ہی ہوتی ہے۔ (۹) رہنمائی۔ امتیاز۔ دوسرے پر مقدم ہونا۔ شخصیت اور کیرئیر میں ترقی۔ (۱۰) فزیشن بزرگوں اور بارہوں کی طرف سے اطمینان۔ (۱۱) غائبانہ ذرائع کو توہید ہونا (۱۲) بڑی باریوں میں یقینی فائدہ اور بحیثیت مجموعی صحت کی ترقی (۱۳) خانہ داری محنت میں افرات و تفریق سے بیل لاپس کامیابی کی خوشیاں۔ خطرات اذیتوں اور جادو وغیرہ کے خلاف محافظ

یقینی کامیابی کا نوروزی طریقہ اختیار کریں

نوروزی تعویذ وہ طاقت جو مدت دراز سے اس پر اس زمین پر موجود تھی میرے جد کو ششہ میں نوروزی کی شکل میں ملی تھی۔ نوروزی کا سیلابی عوش اور قبائلی زندگی کی پر اسرار گنجی جو جسے ہزاروں سال پہلے کو شیطانی ہیت بنا کر پھیل گیا اور لاکھوں کو محنت سے تھکا کر سیلابی اور خوشحالی دی ہے۔ یہی طاقت تعویذ کی شکل میں آج بھی زندگی میں چھوڑی جاتی ہے اور اپنی اذیتوں ترقی اور کامیابی کی اسے حرکت خاطر سے کرتے ہیں۔ اور ایک کامیابی اور ترقی کی بنیاد ہے۔ نیا نیا گنی حقیقت زندگی کی اعلیٰ ترین نوروزی سے بڑی ترقی ہے جو جس نظر کو نہیں بلکہ جھوسے اور غریبی توہین سے شادابی ہے۔ ہزاروں نے اس طاقت کا استعمال کیا ہے اور ترقی کی انہی میں رطب اللسان ہیں۔ حبیب اللہ صاحب نوروزی مقلہ کا مقابلہ پوسٹ ٹکس ڈریپارمنٹ ۱۴۳ بمبئی

تعویذ اور ان کی قیمتیں

نمبر ۱- مذکورہ بالا (۱) کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے۔ قیمت چاندی کے لاکھ قیمت تین روپے۔ نمبر ۲- مذکورہ بالا (۲) کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے۔ قیمت چاندی کے لاکھ قیمت تین روپے۔ نمبر ۳- مذکورہ بالا (۳) کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے۔ قیمت چاندی کے لاکھ قیمت تین روپے۔ نمبر ۴- مذکورہ بالا (۴) کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے۔ قیمت چاندی کے لاکھ قیمت تین روپے۔ نمبر ۵- مذکورہ بالا (۵) کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے۔ قیمت چاندی کے لاکھ قیمت تین روپے۔ نمبر ۶- مذکورہ بالا (۶) کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے۔ قیمت چاندی کے لاکھ قیمت تین روپے۔ نمبر ۷- مذکورہ بالا (۷) کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے۔ قیمت چاندی کے لاکھ قیمت تین روپے۔ نمبر ۸- مذکورہ بالا (۸) کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے۔ قیمت چاندی کے لاکھ قیمت تین روپے۔ نمبر ۹- مذکورہ بالا (۹) کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے۔ قیمت چاندی کے لاکھ قیمت تین روپے۔ نمبر ۱۰- مذکورہ بالا (۱۰) کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے۔ قیمت چاندی کے لاکھ قیمت تین روپے۔ نمبر ۱۱- مذکورہ بالا (۱۱) کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے۔ قیمت چاندی کے لاکھ قیمت تین روپے۔ نمبر ۱۲- مذکورہ بالا (۱۲) کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے۔ قیمت چاندی کے لاکھ قیمت تین روپے۔ نمبر ۱۳- مذکورہ بالا (۱۳) کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے۔ قیمت چاندی کے لاکھ قیمت تین روپے۔ نمبر ۱۴- مذکورہ بالا (۱۴) کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے۔ قیمت چاندی کے لاکھ قیمت تین روپے۔ نمبر ۱۵- مذکورہ بالا (۱۵) کیلئے فائدہ دیتا ہے۔ چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے۔ قیمت چاندی کے لاکھ قیمت تین روپے۔

سے شام تک سوائے ایک خرگوش مارنے کے چڑیا کا ایک بچہ بھی نظر نہ آیا۔ گرمی کے مارے ناک میں دم آ گیا تھا۔ بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ حتیٰ کہ اس روز سلیم بھی کھسیا نا ہو گیا۔

شام کے چھ بجے تھے اور ہم ابھی جنگل ہی میں تھے کہ یکایک آندھی طینی شروع ہو گئی۔ اور دیکھتے دیکھتے اس نے اس قدر زور پکڑا کہ ہم مجبوراً ایک ویران شدہ قدیم عمارت میں لگس گئے۔ اور گھوڑوں کو بھی قریب کے ایک درخت سے باندھ دیا۔ آندھی ختم ہونے پر بارش شروع ہو گئی۔ اور اس قدر موسلا دھار کہ ہمارا دل دہلنے لگا۔ بجلی کی کڑک سے اوسان خطا ہوئے جاتے تھے۔ دس بجے کے قریب یہ طوفان کچھ کم ہوا۔ تاہم بجلی کی چمک باقی تھی۔ اور ایک فانس وقفہ کے ساتھ آندھیرے میں اجالا کر کے عجیب منظر پیش کر دیتی تھی۔ روشنی ہونے پر ہم نے دیکھا تو سوائے پانی کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ کئی سڑک کے نشانات بھی کسی قدر کم ہو گئے تھے۔ ایسی حالت میں گھر پہنچنا آسان کام نہیں تھا۔ علاوہ تاریکی کے اس بات کا اندیشہ بھی تھا کہ اگر بارش دوبارہ آگئی تو پناہ لینے کے لئے کوئی جگہ بھی نہیں ملے گی۔ لہذا یہ فیصلہ کیا کہ قریب کی سرائے میں رات بسر کی جائے۔ یہ سرائے اس جگہ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ وہاں عموماً گھوڑوں کی تھیرا کرتے تھے۔ جو علی الصبح قریب دھوار کے گاؤں میں اپنے مویشی لے جا کر دودھ فروخت کرتے تھے۔

ہم نے گھوڑوں کی باگ پکڑ لی۔ اور با پیادہ سرائے کی طرف روانہ ہو گئے۔

سرائے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ کیونکہ چوکیدار کو اب کسی اور مسافر کے آنے کی امید نہیں تھی۔ تاہم کتہے کھٹکھٹانے پر دروازہ بہت جلد کھل گیا۔ چوکیدار نے ہمارے گھوڑے ایک سائبان کے نیچے باندھ دیے اور سب سے بڑا کمرہ سونے کے لئے دیدیا۔ جو اس وقت کی حالت کو نظر رکھتے ہوئے بہت شہرت تھا۔

زین کے ساتھ بندھے ہوئے تھیلے میں کچھ سامان خورد و نوش موجود تھا۔ مگر ہم نے کچھ نہیں کھایا۔ کیونکہ دن بھر کی محنت سے ہاتھ پاؤں میں درد ہونے لگا تھا۔ بہت جلد آرام کرنا چاہتے تھے۔ بستر موجود تھا۔ اس لئے عجیباً گھبرائی چار پانی پر سونا پڑا۔ چوکیدار ایک کمبل لے گیا تھا جسے سلیم نے اوڑھ لیا۔ اور میں نے ٹخن چھروں سے پنچنے کے لئے ایک چادر تان لی۔ بارش ہونے کے باعث ہوا میں سمولی خشکی پیدا ہو چکی تھی۔

معلوم نہیں۔ کس قدر رات گذری تھی کہ مجھے ایک خواب دکھائی دیا۔۔۔۔۔ نہایت نہیانا تک اور پریشان

کُن خواب۔۔۔۔۔ اب بھی میں اس کو یاد کرتا ہوں تو ایک ہونٹا کی کیفیت مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔ وہ خواب کیا تھا۔ ایک اسرار سر بستہ تھا۔ جس کی حقیقت آج تک معلوم نہ ہو سکی۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے خواب دیکھے ہیں مگر اس شان کا کوئی بھی نہیں تھا اور نہ شاید آئندہ کبھی دیکھوں گا۔ میں نے دیکھا کہ ایک غلام نے ان کمرے کو سوزی ساز و سامان سے مزین ہے میں ایک خوشنامہ کے قریب ام کرسی پر لیٹا کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہوں۔ اور میرا دوست سلیم ایک رام دہ صوف پر بے خبر سو رہا ہے۔ کافی رات

گند جاتے کے باوجود مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ کیونکہ کتاب نہایت دلچسپ تھی
 یکایک ایک دھماکے کے ساتھ بجلی کا فمقہ پھٹ گیا۔ اور تمام کمرے میں تاریکی پھیل گئی۔ میں ابھی اس کی حقیقت
 کو سمجھنے میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ کہ مقابل کی کھڑکی میں روشنی نمودار ہوئی۔ ایک عورت ہاتھ میں مشعل لئے کھڑی تھی۔ اور
 ایک نوجوان حسین لڑکی اس کے پاس تھی۔ کھڑکی میں سے ایک موٹی رسی لٹکائی گئی۔ اور بڑھی عورت مشعل لہرائے ہوئے
 نیچے اترنے لگی۔ اس کے بعد وہ لڑکی بھی اتر آئی۔

دبے پاؤں دونوں ہماری طرف آرہے تھے۔ میں خوفزدہ حالت میں جوں کا توں لیٹا رہا۔ سلم کے قریب آکر نوجوان
 عورت نے مشعل کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔ اور ایک دم بول اٹھی
 ”بے شک یہی ہے۔ یہی ہے۔ میں نے پہچان لیا۔“

ضعیفہ نے پوچھا۔ ”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

حیدر نے حقارت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ”میرا ارادہ وہی ہے جو بروئے انصاف ہونا چاہئے۔ اس شخص
 نے مجھ سے محبت کرنے کا وعدہ کیا۔ مگر اسے نباہ نہ سکا۔ اس نے میری محبت کو ٹھکرا دیا۔ اور اب ایک دوسری عورت
 کو زینتِ آغوش بنانے کے لئے تیار ہے۔ کیوں نہیں بھی اس کی آرزوؤں کو خاک میں ملا دوں؟ میں اس سے انتقام
 لوں گی۔ ایک زبردست بے پناہ انتقام۔ جو اس کی ہستی کو نیست و نابود کر دے۔ اس نے میرا دل
 دکھایا ہے۔ میں بھی اس کا دل دکھاؤں گی۔ اس طرح کہ مرنے کے بعد اس کی روح بھی پریشان رہے۔ ابھی
 چشمِ زدن میں اس کا سینہ چیر کر دل نکالے لیتی ہوں۔ اور اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ اس یو فادل کو۔“
 میرا تمام جسم کانپ اٹھا۔ مگر اتنی ہیبت نہ تھی کہ زبان سے ایک لفظ نکال سکوں

حیدر نے ایک خنجر نکالا۔ جس کو اپنی قمیض کے نیچے کمر کی پیٹی میں چھپا رکھا تھا۔ خنجر کی تیز چمک نے میری آنکھوں
 میں ایک لمحہ کے لئے چمکا جو نیند پیدا کر دی۔ اور میں ایک بار پھر کانپ اٹھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی جیب میں سے اسفنج
 کا ایک بڑا ٹکڑا نکالا اور اس کے دو حصے کر دیے۔ ایک چھوٹا اور ایک بڑا۔ اس نے کمرے میں دکھی
 ہوئی صراحی کا گلا توڑ کر بھی ایک پیالے کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ سب کام سے فارغ ہو کر وہ اپنے زبردست انتقام
 کے لئے تیار ہو گئی۔ اس نے مشعل قریب لانے کے لئے بڑھیا کو اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں غمغما و غضب
 کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ اور میرا دوست دنیا و مافیہا سے بے خبر چین و آرام کی نیند سو رہا تھا۔ میں نے
 دیکھا کہ اس کے ابووں پر خفیست بسمِ رقص کر رہا ہے

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تاکہ اس کو اس حادثہ کا نیکاح سے بچا سکوں۔ مگر پاؤں جنبش نہ کر سکے۔ ایسا معلوم
 ہوتا تھا کہ وہ کسی غیر مرئی زنجیر سے جکڑے ہوئے ہیں۔ یکایک کمرے کی دھندلی روشنی میں خنجر بلند ہوا اور بائیں

جانب دو پسلیوں کے درمیان سینہ کو چیرتا ہوا سلیم کے جسم میں اتر گیا۔۔۔۔۔ میری آنکھیں خوف سے بند ہونے لگیں۔ اور باوجود انتہائی کوشش کے میرے منہ سے کوئی بیج نہ نکلی۔ میں چاہتا تھا کہ دوسرے لوگوں کو خطرہ کی اطلاع دے کر موقعہ واردات پر بلاوں

خنجر کے باہر نکلتے ہی خون بہنا شروع ہو گیا۔ مگر اس قاتلہ نے ایک قطرہ بھی پلنگ کی چادر پر گرنے نہ دیا۔ بلکہ اسفنج کے ایک ٹکڑے میں جذب کر کے مٹی کے پیالے میں جمع کر لیا۔ وہ یقیناً نہایت ہوشیار اور دور اندیش تھی۔ جب خون کی رفتار کم ہو گئی۔ تو اس نے زخم کے اندر اپنی انگلیاں ڈال کر سلیم کا دل باہر نکال لیا۔ الٹی توبہ! وہ خون میں لٹ پٹ تھا۔ اور باہر نکل آنے کے باوجود اس کی حرکت بند نہ ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ محبت کی شیریں جفاؤں سے متاثر ہو کر اب بھی سینہ ہی کے نیچے دھک دھک کر رہا ہے۔ اس نے دل کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور جسم میں بھی خفیف تھر تھری پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے نہایت بیتابی کے ساتھ اپنے کپکپاتے ہوئے لب خون آلود دل پر رکھ کر ایک طویل بوسہ لیا اور۔۔۔۔۔ میری حیرت کی انتہا نہ یہی جب میں نے دیکھا کہ دو موٹے موٹے آنسو اس کی خونیں آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر آگئے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایسے بے رحم دل میں بھی ہمدردی کا مادہ موجود ہو؟ کیا یہ درست ہے کہ عورت کے دل میں جس قدر آتش انتقام ہوتی ہے۔ اتنے ہی زیادہ محبت کے لطیف جذبات بھی ہوتے ہیں؟ کیا درحقیقت صنف نازک فطری طور پر یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے محبوب کی محبت میں کوئی دوسری عورت شریک ہو؟

ہاں میں یہ بیان کرنا بھول گیا کہ اس دوران میں بڑھیا اسفنج کے اندر خون جذب کر کے پیالے میں پھوڑ رہی تھی۔ اور جب خون کا رسنا بالکل بند ہو گیا۔ تو اس نے اسفنج کا دوسرا ٹکڑا پسلیوں کے درمیان رکھ کر زخم کے منہ کو بند کر دیا۔ اور کوئی ایسی چیز اس پر مل دی کہ نشان بھی غائب ہو گیا

حسینہ نے ایک طویل حسرت بھری نگاہ میرے دوست پر ڈالی اور چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ بڑھیا نے اس کا بازو پکڑ کر میری طرف اشارہ کیا۔ مگر اس نے لاپرواہی سے یہ لہکڑیاں دیا

”اس کی فکر نہ کرو۔ یہ مردے سے زیادہ بدتر اور مٹی کے بت سے زیادہ غیر حساس ہے۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا“ اور واقعی اس کا قول درست تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ اور سوائے قلب کی خفیف حرکت کے

کسی چیز میں جنبش نہیں تھی

اس نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور چہرہ کا اڑا ہوا رنگ اس کے سوز دل کا پتہ دے رہا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت اس کو روحانی انقباض شدید حاصل ہو رہا ہے۔ وہ اپنے لئے پریشیمان نہیں تھی۔ مگر اظہارِ افسوس ضرور کر رہی تھی۔ کچھ دیر سکوت کے بعد اس کے لبوں کو جنبش ہوئی اور اس نے کپکپاتے ہوئے لہجہ

میں کہا

”میں نے اس بے وفا کا دل چڑایا مگر ابھی آتش اتمامِ سر نہ نہیں ہوئی۔ خدایا! میری تمنا ہے کہ اس کا مُردہ جسم بھی دریائے خونخوار جانوروں کا لقمہ بنے، اگر میرے گرم گرم آنسو اور انفاس سوزاں تیری بارگاہِ عظمت و جلال میں پذیرائی حاصل کر سکتے ہیں تو اے میرے مالک! میری آخری آرزو قبول کر لے“

— اس نے آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھولی اور بڑھیا کے ہمراہ مشعل کی مدھم روشنی میں باہر نکل گئی۔ کمرہ تاریک ہو گیا اب میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ صبح ہوتے ہی یہ راز فاش ہو جائے گا۔ اور تمام دنیا کو سوائے میرے کسی پر شبہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ سلیم کے ساتھ میں نے تمام رات بسر کی تھی۔ اگر میں یہ بیان بھی کر دوں کہ ایک پراسرار عورت نے کھڑکی کی راہ آکر اس کو قتل کر دیا ہے تو کوئی باور نہیں کرے گا۔ لہذا اپنی جان کی حفاظت ضروری ہے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے یہاں سے فرار ہو جانا چاہئے۔ ورنہ پھانسی کے تختے پر چڑھنا ہوگا

میں اٹھا۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ سلیم پر غور سے نگاہ ڈالی۔ کمرے کی تاریک فضا میں یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ وہ بے خبر سو رہا ہے یا موت کی آغوش میں پہنچ چکا۔ اس کی موت یقینی تھی کیونکہ سینہ چیر کر دل نکالا جا چکا تھا جس کی حرکت و سکون پر حیات و موت کا انحصار ہوتا ہے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ تمام فضا تاریک اور سنسان تھی۔ میں صدر دروازہ کی طرف بڑھتا چلا گیا، یکایک چوکیدار کی آواز سنائی دی

”کون ہے؟“

میں ایک دم ٹھنک کر رہ گیا۔ اب معلوم ہوا کہ کسی نے قوتِ گویائی سلب کر لی ہے۔ جسم میں بھی رعشہ پیدا ہو گیا تھا۔ مگر دل کرہ کر کے حواس درست کئے اور میں نے جواب دیا

”ایک ضروری کام کے باعث میں بہت سویرے جانا چاہتا ہوں تم اپنا کرایہ لے لو۔ اور گھوڑا صہطل کے باہر کھال دو“

اس نے اندھیرے ہی میں لیٹے لیٹے مخمور لہجہ میں جواب دیا

”جب تک صبح کا اُجالا نمودار نہ ہو، تم نہیں جا سکتے یہ ہمارا دستور ہے کہ مسافروں کو آدھی رات کے وقت روانہ ہونگی اجازت نہیں دیتے۔ بالخصوص کوئی حادثہ وقوع پذیر ہو جائے تو اس کے ذمہ دار ہم لوگ ٹھیرائے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ تم اپنے ساتھ کسی کامال چڑا کر یا اس کو قتل کر کے رات کی سیاہی میں فرار ہو جانا چاہتے ہو اگر یہ خیال درست نکلے تو اس صورت میں چوری یا قتل کا ذمہ دار کون ہوگا ظاہر ہے کہ پولیس ہم کو حراست میں لے لیگی“

غیبت ہے کہ اس جگہ اندھیرا تھا اور چوکیدار میرے دلی اضطراب کو۔ جو تمام جسم کی کپکپاہٹ میں ظاہر ہو رہا تھا۔ محسوس نہ کر سکا۔ ورنہ وہ اسی وقت کھٹک جاتا۔ اور شاید اپنے شبہ کو دور کرنے کے لئے میرے ہمراہ کمرے میں چلا

آہا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کیا درحقیقت کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا
 مایوس ہو کر میں واپس کمرے میں آیا۔ کواڑ بند کئے۔ اور اسی آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ قلب کی حرکت بڑھی ہوئی
 تھی۔ اور تمام معصومیت کے باوجود میں خود اپنے آپ کو گنگا تصور کرنے لگا تھا۔ دنیاے تخیل میں پولیس کے سپاہی خاک
 وردیاں پہنے نظر آرہے تھے۔ پھانسی کا تختہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اور کوئی سرگوشی کرتے ہوئے کسی سے کہہ رہا تھا
 ”بے شک مقتول کا ساتھ ہی اس جرم کا مرتکب ہے“
 میں اسی قسم کی ادھیڑ بن میں محو تھا۔ یہاں تک کہ غنودگی طاری ہونے لگی

”کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ“

دروازے کے کواڑ زور سے بج رہے تھے۔ کہ میری آنکھ کھل گئی۔ طلسم خواب ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے چاروں طرف
 نگاہ ڈالی۔ سرائے کا وہی کمرہ تھا۔ جس میں میں اور سلیم پناہ گزیں ہوئے تھے۔ اب نہ وہ عالی شان کمرہ تھا۔ اور نہ وہ قیمتی
 ساز و سامان۔ بارش تھم گئی تھی۔ ایک چھوٹے سے روشندان میں سے سورج کی شعاعیں اندر آرہی تھیں۔ جن میں خاک وغیرہ
 کے چھوٹے چھوٹے ذرات چمکتے رقص کرتے نظر آرہے تھے۔ آفتاب کافی طلوع ہو چکا تھا۔ میں نے صرف ایک لمحہ میں ان
 تمام گرد و پیش کی چیزوں پر نظر ڈال لی۔ اور اٹھ بیٹھا، کیونکہ باہر کی طرف سے کوئی مسلسل کواڑوں کو پیٹ رہا تھا
 میں نے اٹھ کر کنڈی کھولی۔ چونکہ میری نظر کے سامنے تھا۔ معارات کا سارا خواب میرے تصور میں آگیا۔ اس
 نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا

”یوں تو آپ کو بہت جلدی تھی کہ ادھی رات کو مجھ سے گھوڑا طلب کر رہے تھے۔ مگر اب جبکہ کافی دن چڑھ گیا
 تھا۔ آپ بیدار ہونے کا نام نہیں لیتے۔ آئے آپ کے گھوڑے تیار ہیں“

میں عجیب اضطراب کے عالم میں تھا۔ رات کے واقعات کو خواب سے تعبیر کروں یا حقیقت سے؟ یہ فیصلہ کرنا
 دشوار تھا۔ تاہم میں نے یہ کہہ کر اُسے ٹال دیا کہ ”ہم ابھی آٹھ دس منٹ میں آتے ہیں۔ تم باہر چل کر ٹھیرو“
 میں نہیں جاہتا تھا کہ اس کی موجودگی میں سلیم کو بیدار کرنے کی کوشش کروں۔ چونکہ ارکے الفاظ سن کر میں رات کے
 واقعات کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنے لگا تھا۔ میں تنہائی چاہتا تھا۔ بالکل تنہائی۔ تاکہ اگر سلیم مردہ پایا جائے تو فرار
 کی کوئی ترکیب نکالی جاسکے۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے آہستہ سے کبیل کا کونہ اٹھا کر سلیم کا جسم ٹولا۔ وہ بالکل
 سرد تھا۔ اور مجھے پسینہ کی سی مٹی محسوس ہوئی۔ میرا جسم کانپ اٹھا تھا۔ مگر پھر بھی میں نے دل کڑا کر کے اس کو زور سے چمچھو ڈیا
 سلیم نے کسمسا کر روٹی لی اور جانی لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے بے چینی کے ساتھ دریافت کیا
 ”کیسی طبیعت ہے؟“

اس نے لاپرواہی سے جواب دیا

” اچھی طرح ہوں۔ ابھی بخار باقی ہے“

وہ بھی اٹھ بیٹھا۔ اور میرے کتے پر بہت جلد واپس چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ہم دونوں باہر آئے۔ اور مفرودہ کرایہ ادا کر کے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ ہمارا رخ شہر کی طرف تھا۔ رات کو کچھ نہ کھانے کے باعث بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ پھر بھی میں خاموش تھا۔ مگر سلیم سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ دریا کے پُل کے قریب ایک سبز قطعہ دیکھ کر گھوڑے پر سے اتر گیا۔ تاکہ باقی ماندہ ڈبل روٹی اور مکھن سے تھوڑا ناشتہ کر لیا جائے مجھے بھی کافی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ مگر روٹی کے لقمے حلق سے نہ اتر سکے۔ ابھی تک میرے دل بردہشت طاری تھی کھانا کھاتے ہوئے سلیم نے کہا

” تم نے غلطی کی کہ مجھے جگا دیا، میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ نہایت پر لطف خواب“

” خواب“! میں نے چونک کر پوچھا ” کس قسم کا خواب؟“

” وہ نامتام رہ گیا۔ میں صرف اس قدر دیکھنے پایا تھا کہ ایک شخص میری جان لینے کے درپے ہے۔ اور طرح طرح سے میری گھات میں لگا ہوا ہے۔ اس کے بعد کچھ نہ دیکھ سکا۔ تم نے جگا دیا تھا“

” سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا اسرار ہے۔ ایک ہی موضوع کا خواب میں بھی دیکھتا ہوں اور تم بھی۔ اور اسی کا ایک جزو چوکیدار کو دکھائی دیتا ہے“

پھر میں نے رات کا نام خواب سلیم کے سامنے بیان کر دیا۔ وہ بجائے ڈرنے کے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

” دن کو زیادہ تھک جانے کے بعد عموماً رات کا ابتدائی لٹھ بے خبری کی نیند میں اور باقی حصہ بھیا تک خواب دیکھنے میں گذرتا ہے“

” لیکن یہ تو بتاؤ کہ کیا درحقیقت کوئی عورت تم سے محبت کرتی ہے۔ اور تم اس کی طرف مائل نہیں ہو“

” ہاں“۔۔۔۔۔ اس کا چہرہ۔۔۔۔۔ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔۔۔۔۔ ” تمہارے خواب میں کسی قدر واقعیت

ضرور ہے۔ میں ایک حسینہ کے دام محبت میں مبتلا ہوں۔ اور دوسری طرف میری خالہ زاد بہن جگنو اپنا گردیدہ مٹالینا چاہتی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ میں نے ایک مرتبہ غلطی سے اس کے سامنے اظہار محبت کر دیا تھا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اس عشق کا انجام تلخ نہیں ہوگا“

تاہم مجھے اطمینان نہ ہوا۔ اور اپنے شکوک کو رفع کرنے کے لئے اس کے سینہ کی بائیں پسلیوں کو گھور کر دیکھنے لگا۔ تعجب ہے کہ وہاں کوئی نشان نہیں تھا

(۵) اس لئے روایات مابعد کے تفصیلی واقعات کتاب اردو رواف نامک سے ماخوذ ہیں
مولوی عمید الممالک صاحب کا بیان

(۱) معتبر راویوں نے بیان کیا ہے کہ خود پیمبر صاحب نے تفصیلی واقعات معراج کے بیان فرمائے ہیں

(۲) پیمبر صاحب اور اُس زمانے کے عرب پہلوی زبان سے واقف نہیں تھے

(۳) اس لئے معراج کے تفصیلی واقعات اردو رواف نامک سے اخذ نہیں کئے گئے ہیں

فاضل ایڈیٹر نگار کی بحث

(۱) ڈاکٹر ٹنڈل کے اعتراض کا مدعا یہ ہے کہ واقعہ معراج کوئی حقیقت نہیں رکھتا

(۲) ڈاکٹر ٹنڈل کی اس بحث کا کہ واقعات معراج پُرانی کتابوں میں درج ہیں اور انھیں سے ماخوذ ہیں (معتول

جواب نہیں دیا جاسکتا

(۳) اس لئے واقعہ معراج کو رسول اللہ سے منسوب کرنا ان کو جھوٹا قرار دینا ہے اور

(۴) یہ ماننا لازم آئے گا کہ دوسرے نبیوں کو بھی معراج ہوئی یا

(۵) یہ ثابت کرنا ضروری ہو گا کہ پُرانی کتابوں میں کوئی ایسا بیان درج نہیں ہے جس کا ذکر ڈاکٹر ٹنڈل نے

اپنے مضمون میں کیا ہے

(۶) رسول اللہ کو غلط بیانی کے الزام سے بچانے کے لئے روایات متعلق معراج کو موضوع قرار دینا مناسب ہو گا

نوٹ متعلق اعتراض ڈاکٹر ٹنڈل

(۱) ڈاکٹر ٹنڈل نے واقعہ معراج کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق کسی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اور نہ اُس کے متعلق

کوئی بحث کی ہے۔ اس کے برعکس اوس نے واقعہ معراج کو پیمبر صاحب کے خواب پر اسکان کے طور پر مبنی

ہونا تسلیم کیا ہے

(۲) اگر دو جگہ ایک سے بیان درج ہوں اور وہ مختلف زمانوں کے ہوں تو یہ نتیجہ لازمی طور سے نہیں نکلتا کہ بیان

مابعد بیان ماسبق سے اخذ کیا گیا ہے۔ جب تک کہ معتبر شہادت سے اوس کا اخذ کیا جانا ثابت نہ کیا جائے

چونکہ ڈاکٹر ٹنڈل نے ایسا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا ہے اس لئے اوس نے جو استنباط کیا ہے وہ محض ایک

قیاسی یا ظنی امر ہے جس طرح ممکن ہے کہ قیاس مذکور صحیح ہو اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صحیح نہ ہو

(۳) ڈاکٹر ٹنڈل نے اپنا استدلال اس مفروضہ پر مبنی کیا ہے کہ جو شہادت بعد میں میسر آئے وہ محض اس وجہ سے

قابل اعتبار نہیں کہ اس کا ذکر کبھی پہلے نہیں آیا ہے۔ اس کے بجائے ڈاکٹر ٹنڈل کو یہ ثابت کرنا چاہئے تھا کہ

جن راویوں نے تفصیلی واقعات بیان کئے ہیں ان کی پیش کردہ شہادت معتبر نہیں ہیں

نوٹ متعلق مضمون مولوی عبد الممالک صاحب

(۱) مولوی صاحب کے مضمون سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ واقعہ معراج کے متعلق خود ان کا عقیدہ یا مفہوم یا رائے کیا ہے جس کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے ڈاکٹر سٹڈل کے مضمون کی تردید کی کوشش کی ہے۔ آپ نے معراج کے جسمانی یا روحانی یا روایتی واقع ہونے کے متعلق تنقید سے کام لے کر یکا یک ڈاکٹر سٹڈل کے مضمون کے اُس حصہ سے بحث شروع کر دی ہے جو معراج کے تفصیلی واقعات سے تعلق رکھتا ہے ”تنقید روایات“ کے سلسلہ میں آپ نے جو کچھ بیان فرمایا ہے اس سے اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ آپ کس قسم کی معراج کے قابل ہیں اور کن حالات کے تابع خلاصہ یہ کہ جب تک جواب دینے والے کے پیش نظر خود اس چیز کا مفہوم نہ ہو جس کے متعلق وہ اعتراض کا جواب دے رہا ہے۔ اس وقت تک وہ کیا صحیح جواب دے سکتا ہے؟ مضمون سے تو یہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا عقیدہ روایات اولین تک محدود ہے لیکن آپ بحث کرتے ہیں روایات مابعد سے۔ اگر روایات مابعد پر بھی آپ کا عقیدہ ہے تو اس عقیدہ کی تفصیل مضمون میں درج ہونی چاہئے تھی اور اس تفصیل کے ہر جزو کی نسبت یہ ثابت کرنا چاہئے تھا کہ وہ پیغمبر صاحب تک پہنچتا ہے اور عقلاً یا اعتقاداً قابل تسلیم ہے۔ عقلاً سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں جیسے اور معمولی یا غیر معمولی واقعات ہوتے ہیں اسی طرح واقعات معراج کا ہونا ممکن ہے۔ اعتقاداً سے یہ مراد ہے کہ کسی ایسے اصول کے تحت جس کا تعلق ابقان قلب یا روحانیات سے ہو ایسے واقعات کا وجود قابل تسلیم ہے

(۲) مولوی عبد الممالک صاحب نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی ایک طریقہ استدلال مخالف کے دعویٰ کو غلط قرار دینے کا ہے لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ ڈاکٹر سٹڈل کے دعاوی کی تردید کرتے (۳) مولوی صاحب نے یہ ثابت نہیں کیا ہے کہ جس شہادت کو وہ پیش کرتے ہیں وہ معتبر ہے محض شہادت کا بیان کر دینا اس شہادت کے کافی یا معتبر ہونے کی دلیل نہیں ہے

(۴) مولوی صاحب نے غالباً اس امر پر غور نہیں فرمایا کہ اصول شہادت کے اعتبار سے نفی کا اثبات بہت مشکل ہے۔ دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ اہل عرب یا پیغمبر صاحب کو پرانی داستانوں کا علم نہیں تھا۔ کیا اس قسم کے دعاوی قابل اطمینان طریق پر ثابت کئے جاسکتے ہیں

نوٹ متعلق بحث ایڈیٹر صاحب نگار

(۱) آپ کی تمام بحث اس سفر و صہ پر مبنی ہے کہ واقعہ اسری یا معراج غلط ہے لیکن آپ نے اس کی کہیں تفصیل نہیں کی ہے کہ کیوں غلط ہے

(۲) آپ نے یہ تصور کر لیا ہے کہ ڈاکٹر سٹڈل نے ثابت کر دیا ہے کہ واقعہ معراج کوئی حقیقت نہیں رکھتا ہے

لیکن خود ڈاکٹر ٹڈل نے اپنے مضمون میں کسی جگہ ایسا ظاہر نہیں کیا ہے (۳) آپ نے اپنی بحث میں واقعہ معراج اور معراج کے تفصیلی واقعات (جو مابعد کی روایات میں پائے جاتے ہیں) کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی ہے ورنہ ڈاکٹر ٹڈل کا دعویٰ ثابت قرار پاجانے کی صورت میں آپ واقعہ اسری یا معراج کو غلط نہ فرماتے۔ آپ نے ایسے جملوں کے استعمال سے بھی جن میں لفظ آیت یا روایات شامل ہے صحیح مفہوم اخذ کرنے کا موقع ناظرین رسالہ کو نہیں دیا ہے۔ مثلاً مولوی صاحب نے بہ حوالہ روایات بیان معراج کو پیمبر صاحب تک پہنچایا ہے لیکن ایڈیٹر صاحب ان کی دلیل کو روایتی قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک غور کیا جاسکتا ہے۔ مولوی صاحب نے جن روایات کو پیش کیا ہے وہ ہنوز شہادت ہیں جو سلسلہ بیان کو پیمبر صاحب تک پہنچاتی ہے اور دیگر مذاہب کی روایات تک (جن کو فاضل ایڈیٹر تسلیم کرانا چاہتے ہیں یا جن کی موجودگی سے انکار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں) وہ خود بیان ہیں کہ امر کا یعنی صورت اول میں مولوی صاحب نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک خاص بیان ایک خاص شخص نے کیا ہے صورت ثانی میں سوال کی شکل یہ ہو جاتی ہے کہ کوئی خاص بیان غلط ہے یا صحیح۔ فاضل ایڈیٹر یہ کہتے ہیں کہ اگر صورت اول میں اس شہادت کو قابل اعتبار سمجھا جائے تو بیان واقعہ معراج کو پیمبر صاحب تک پہنچاتی ہے تو صورت ثانی میں یہ تسلیم کر لینا لازمی ہوگا کہ دیگر اشخاص کا بھی دعویٰ معراج صحیح ہے۔ بہ ظاہر معلوم نہیں ہوتا کہ یہ نتیجہ کسی غیر مسلم کے نزدیک کس طور پر مستنبط ہوتا ہے

(۴) ڈاکٹر ٹڈل کے قیاس کو آپ نے یقینی طور پر ثابت تصور کر کے معراج کے متعلق روایتوں کو موضوع قرار دینے کا مشورہ بغیر کوئی وجہ بیان کرنے کے دیا ہو۔ کسی غیر مسلم کے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ پیغمبر عربی کو الرام سے بچانے کے لئے معتبر شہادت کو رد کر دے۔ شہادت کو رد کرنے کے لئے کافی وجوہ علیحدہ ہونا چاہئیں۔ یعنی روایات کو موضوع قرار دینے کے لئے نہ تو ڈاکٹر ٹڈل کا قیاس کافی ہے اور نہ پیغمبر صاحب کے جھوٹا ثابت ہونے کا احتمال

(۵) اگر دو جگہ دو بیان ایک سے کئے گئے ہوں تو فاضل ایڈیٹر کے نزدیک ایک بیان کو صحیح تصور کرنے کی صورت میں دوسرے بیان کو بھی صحیح ماننا لازم ہوگا۔ یہ کیوں؟ ممکن ہے کہ ایک جگہ ایک بیان محض تخیل کی کار فرمائی ہو اور دوسری جگہ دوسرا بیان امر واقعی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک بیان کے باور کرنے کی شہادت موجود ہو اور دوسرے بیان کی کوئی تائید نہ ہوتی ہو۔ اگر آج ہم ہوائی جہاز کو امر واقعہ مانتے ہیں تو ہمارے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم مہابھارت اور رامائن کے ہوائی تخت اور الف لیلہ کے اڑنوا

قالبین کو بھی اُمور واقعی سمجھ لیں۔ فاضل ایڈیٹر کا ڈاکٹر سٹڈل کی اس رائے سے بھی متفق ہونا پایا جاتا ہے کہ اگر دو بیان دو مختلف زمانوں میں ایک سے کئے گئے ہوں تو بیانِ مابعد لازمی طور سے بیانِ ماسبق سے ماخوذ ہوگا۔ علاوہ استدلال کی خامی کے یہ ظاہر ہے کہ عبارتِ معنی اور خیالات کا توارداکثر ہوتا رہتا ہے۔ عبارت کے تواردا کی مثالیں سیکڑوں ہیں۔ خیالات کے تواردا کی ذیل میں اسلامی تصوف کی پیدائش اور اُس کا نشوونما ہندی تصوف سے مختلف طور پر جداگانہ تسلیم کر لیا گیا ہے اور اگرچہ بابی مذہب کے بہت سے اصول زردہشتی مذہب سے ملتے جلتے ہیں لیکن اُن کا زردہشتی مذہب سے ماخوذ ہونا اس وقت تک ثابت نہیں ہوا ہے

ڈاکٹر سٹڈل نے کتابِ اردو راف نامک کا اسلام سے چار سو برس پیشتر تصنیف ہونا بیان کر کے اپنے آپ کو اور اپنے استدلال کو اس طریق پر محفوظ کرنا چاہا ہے کہ اگر زردہشتیوں کی روایت کو مان لیا جائے تو کتاب کی تصنیف کا اس قدر زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر آج ڈاکٹر سٹڈل پر یہ اعتراض کیا جائے کہ کتاب مذکور اس قدر پرانی نہیں ہے تو وہ اپنی شرط کی آڑ جائز طور پر لے سکتا ہے لیکن معلوم نہیں ہوتا کہ مولوی عبدالملک صاحب اور فاضل ایڈیٹر نگار نے اس بارے میں کیا توجہ فرمائی۔ پہلی زبان میں صرف گنتی کی کتابیں مذہبی اور غیر مذہبی راج و شائع ہیں جن میں سے اردو راف نامک بھی ایک مذہبی کتاب ہے۔ تحقیق طلب یہ امر ہے کہ یہ کتاب کب تصنیف ہوئی۔ فاضل ایڈیٹر نگار نے جس طرح ایک دیگر مضمون کے سلسلہ میں مزید کہ زمانہ زردہشت کے تو بنیاد و صدی بعد کا قرار دیا ہے اسی طرح وہ اس کتاب کا بھی کوئی زمانہ اسلام سے پہلے کا قرار دے سکتے تھے لیکن یہ ظاہر صاحب موصوف نے ڈاکٹر سٹڈل کے شرطیہ بیان کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ اس لئے اس بارے میں کسی زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس قدر ذکر کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ اس وقت تک محققین کی جو رائے ہو وہ یہ ہے کہ پہلی زبان کی کوئی کتاب سنہ عیسوی کی آٹھویں صدی سے پہلے کی تصنیف شدہ موجود نہیں ہے اردو راف نامک پارسیوں کا بہشت و دوزخ نامہ ہے۔ اس میں اس جوشِ مذہبی اور تجدید مذہب کا حال ضرور لکھا گیا ہے جس کا دور ساسانیوں کی حکومت شروع ہونے کے بعد ہوا۔ لیکن اس کتاب کی مانند جو اور کتابیں اس وقت موجود ہیں مثلاً ”دینِ کثرت“ یا ”میلوے خرد“ وغیرہ یہ سب نویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کی تصنیف شدہ کتابیں ہیں۔ ساسانیوں کا زمانہ شیعہ کے کچھ بعد سے شروع ہوتا ہے اور سنہ ۶۵۱ء تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس مدت کے آثار میں سے یہ لحاظ زبانِ پہلی صرف سکے اور کتبے پائے جاتے ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی موجودہ کتابوں کی تصنیف آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے کی نہیں پائی جاتی۔ بالفاظِ دیگر یہ تمام کتابیں زمانہ اسلام کی تصنیفات میں سے ہیں۔ ممکن ہے کہ اردو راف نامک پہلے کی تصنیف ہو مگر ڈاکٹر سٹڈل کا اعتراض تسلیم کرنے سے پیشتر تحقیقی طور پر یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ (۱) یہ کتاب کب تصنیف ہوئی (۲) سورہ

بنی اسرائیل کب نازل ہوئی (۳) ابتدائی روایات معراج کا زمانہ کب کا ہے اور (۵) روایات مابعد کب سے نقل کی جاتی ہیں

مزار کش

واقعہ معراج سے کسی مسلمان نے اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر انکار نہیں کیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ ایک صاحب مولوی محمد عنایت اللہ صاحب المشرقی نے اپنی کتاب ”تذکرہ“ میں سورہ نحم کی تاویل پیغمبر صاحب کے معراج علم و کمال کی ہے اور اس طور سے کی ہے کہ عبارت اور معنی میں بہت کچھ مطابقت پیدا ہو جاتی ہے لیکن سلسلہ تاویل میں وہ سورہ بنی اسرائیل کی شروع کی آیت کا مضمون یا حوالہ بالکل حذف کر گئے ہیں۔ یہ آیت اس قدر صاف معلوم ہوتی ہے کہ اس سے گریز ممکن نہیں۔ عبارت صاف ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک رات اپنے بندے کو پاک مسجد سے دور کی مسجد کی طرف لے گیا۔ پاک مسجد کو کعبہ ماننے یا کوئی اور مسجد۔ دور کی مسجد کو بیت المقدس کی مسجد ماننے یا کوئی اور مسجد۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک رات میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو مہینوں کی راہ سے لے گیا اور واپس لایا۔ سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کس طریقہ سے لے گیا۔ یہ طریقے مولوی عبد الممالک صاحب اپنے مضمون میں ظاہر کر چکے ہیں۔ اسی سورہ بنی اسرائیل میں آگے میں کرکئی آیتیں ایسی ہیں جن سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ پیغمبر صاحب کو رویا کے ذریعہ سے مکاشفہ ہوا۔ مثلاً ایک آیت اس مضمون کی ہے کہ کافروں نے پیغمبر صاحب سے یہ سوال کیا کہ تم آسمان پر چڑھ جاؤ تو پیغمبر صاحب کو یہ ہدایت ملی کہ وہ منکرین کو ایسا جواب دیدیں کہ میں بشر ہوں۔ ایک آیت کا مضمون یہ بھی ہے کہ جب پیغمبر صاحب کو رویا میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیاں دکھائیں تو اس امر کا اظہار بھی منکرین کی جانب سے فتنہ و فساد کا باعث ہوا۔ خلاصہ یہ ہے کہ واقعہ اسری ایسا واقعہ ہے جسکی کسی مسلمان یا غیر مسلمان کے نزدیک کوئی تردید یا تاویل نہیں کی جاسکتی۔ البتہ اس طریقہ کے متعلق تاویل کو گنجائش ہے جس طریقہ سے پیغمبر صاحب پر یہ واقعہ گذرا۔ یہ مانکر کہ پیغمبر صاحب کو عالم خواب میں یا عالم بیداری میں مکاشفہ ہوا کون سی وجہ ایسی ہو سکتی ہے کہ اگر ڈاکٹر لسڈل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو تفصیلات معراج روایات مابعد میں پائی جاتی ہیں وہ پیغمبر صاحب نے بیان نہیں کی ہیں تو واقعہ اسری سے انکار کر دیا جائے یا کہ فاضل ایڈیٹر ننگار نے رائے ظاہر کی ہے

آیت اسری کے متعلق جو ابتدائی روایات ہیں اور ان میں واقعہ معراج کا بھی حوالہ ہے اور وقوع معراج کے متعلق بے قدر حدیثیں موجود ہیں جن سے (واقعات معراج کی تفصیل کو جدار کھ کر) نفس واقعہ معراج کے متعلق کوئی شبہ قائم نہیں رہتا کہ خود پیغمبر صاحب کے بیان کے مطابق پیغمبر صاحب کو معراج بھی اسی طرح حاصل ہوئی جس طرح کہ وہ حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے جائے گئے

علم روحانیت میں مکاشفہ ممکن الوقوع قرار دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں منجروں اور پکے خوابوں کے وجود کا

اقرار موجود ہے جب کہ ہم قرآن کو صحیح اللفظ اور صحیح المعنی قرار دیتے ہیں اور جبکہ ماہرین روحانیات مکاشفہ کے امکان کی خبر دیتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اپنے اس دعویٰ کے پیش کرنے میں شریکے کہ پیغمبر صاحب کو معراج ہوئی خصوصاً جب کہ ایسا دعویٰ کسی ایسے شخص کے روبرو پیش کیا جائے جو خدا کی ہستی کے راز کو تثلیث پر مبنی سمجھتا ہو اور اُس کی کوئی عقلاً تاویل نہ بیان کر سکتا ہو۔ نیز جبکہ وہ عیسیٰ کی معراج کا قائل ہو تو کیا وجہ ہے کہ اُس کے ظن اور قیاس کا مقابلہ اسی کے اعتقادی اصولوں اور روحانیات کی دلیل سے نہ کیا جاسکے۔ ایسے شخص سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر خدا میں یہ قدرت تھی کہ اس نے عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا تو اُس کی قدرت میں یہ ضرور داخل ہو سکتا ہے کہ وہ پیغمبر نبی یا اوس کی روح کو اپنی عجائبات کا مشاہدہ کرائے۔ یہ سوال بالکل جداگانہ ہے کہ کیا کیا عجائبات مشاہدہ کرائے گئے۔ ممکن ہے کہ جن روایات میں یہ عجائبات مذکور ہیں اُن میں سے بعض ضعیف ہوں۔ نامعتبر ہوں۔ ناقص ہوں۔ لیکن یہ معترض کا فرض ہے کہ وہ ایسا نقص یا ضعف ظاہر کرے۔ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ فلاں روایت ضعیف ہے یا قابل اعتبار نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی روایات کو قبول کرنے کی کوئی وجہ نہیں رہے گی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ معراج کے بارے میں جو احادیث موجود ہیں اُن میں کچھلی تحقیقات کے مطابق صحیح بھی ہیں حسن بھی اور ضعیف بھی۔ اگر زمانہ حال میں کامل تحقیقات ہو سکتی ہے تو ایسی تحقیقات کے لئے جانے میں کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا

فاضل ایڈیٹر نگار سے امید ہے کہ وہ اس گزارش اور نوٹس مندرجہ بالا پر غور کر کے ظاہر فرمائیں گے کہ کیا وجودہ صورت میں ڈاکٹر ٹڈل کا اعتراض صحیح ہے۔

(نگار) ہمارے فاضل دوست مولوی حکیم احمد صاحب نے واقعہ معراج پر اظہار خیال فرماتے ہوئے ڈاکٹر ٹڈل اور مولوی عبدالملک صاحب آروی کے بیانات پر جو تبصرہ فرمایا ہے، وہ صحیح ہوا غلط، لیکن میری تحریر سے جو نتیجہ انہوں نے اخذ کیا ہے وہ یقیناً درست نہیں

اگر فاضل مقالہ نگار میری تحریروں کو جو فروری و مارچ ۱۳۳۶ء کے نگار میں شائع ہوئی ہیں باعنان نظر ملاحظہ فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ میرا اصل مدعا صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ مولوی عبدالملک صاحب ڈاکٹر ٹڈل کے اعتراض کا کوئی ثانی جواب نہیں دے سکے۔ کیونکہ ایک روایت صرف اس بنا پر کہ راویوں کا سلسلہ رسول کریم تک پہنچتا ہے، ایک مسلمان ہی کے لئے قابل قبول ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر ٹڈل یا کوئی اور غیر مسلم کیوں اسے یقین کرنے لگا، وہ تو بر ملا کہہ دے گا کہ اگر واقعی یہ بات تمہارے ہونے کی ہے تو اور زیادہ ثبوت اُن کے نبی نہ ہونے کا ہے

اس لئے سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ واقعہ معراج کے متعلق جو تفصیلی روایت مسلمانوں میں رائج ہے۔ اسے آج کی

عقل انسانی قبول کر سکتی ہے یا نہیں — آج سے میری مراد علوم و فنون کا دور ترقی ہے جب ریاضیات و فلکیات وغیرہ نئے بہت سے معتقدات ماضیہ کو درہم و برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ اب سے تیرہ سو برس قبل جب زمین ساکن اور آسمان متحرک مانا جاتا تھا، جب آسمان کی ایک مادی چیز کی طرح جامد سمجھا کر اسے ”طبق علی طبق“ باور کیا جاتا تھا، جب کشف زمین اور جذب مرکزی کی حقیقت سے لوگ نادان تھے، اس وقت تو اس کا امکان تھا کہ ایک شخص ان سب کو چیرا پھاڑتا مکمل جائے لیکن آج جبکہ آسمان و فلک نام ہے صرف فضا کے بساط کا اس کو کوئی ٹکڑا تسلیم کیا جاسکتا ہے

جبریل کا براق لے کر آنا اس پر سوار کر کے مسجد اقصیٰ تک لیجانا، وہاں سے سات آسمانوں پر چڑھ کر مختلف انبیاء سے گفتگو کرنا۔ اور اخیر میں سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ کر خود ذات باری سے ہمکلام ہونا اور یہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد اس قدر جلد واپس آجانا کہ آپ کا بستر بھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔ اور دروازہ کی زنجیر بھی بدستور پھیل رہی تھی۔ کیا سمجھ میں آنے والی باتیں ہیں اور آج کون ہے جو اس کو باور کر لے گا

اسرہنی اور معراج کے متعلق جتنی روایات بائی جاتی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معراج کو بالکل دنیاوی سیر و سیاحت کی طرح سمجھا گیا اور آسمانوں کو ٹھوس مادی چیز سمجھ کر وہاں انبیاء کا قیام کرنا بھی تسلیم کیا گیا جن سے رسول اللہ نے باتیں کیں۔ اور نہ صرف یہ بلکہ خدا کے لئے بھی ایک جگہ متعین کر کے وہاں ایک درخت (سدرۃ المنتہیٰ) کا ہونا بتایا گیا جس کے پتے اٹھی کے کان کے برابر تھے اور پھل مشکوں کے برابر۔

ظاہر ہے کہ کوئی صحیح العقل انسان ان باتوں کا یقین نہیں کر سکتا اور اگر بقول ہمارے فاضل مقالہ نگار کے ”کوئی مسلمان اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر ان واقعات سے انکار نہیں کر سکتا“ تو یہ بھی یقینی ہے کہ کوئی صحیح الذہن شخص ”مسلمان“ کو کبھی انسان نہیں کہہ سکتا۔

مجھے سخت حیرت ہے کہ مولوی حکیم احمد صاحب بھی جو ”عقل و نقل“ دونوں سے کام لینے کی اہلیت رکھتے ہیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں اور اگر کوئی شخص اس کی لغویت ثابت کر کے رسول اللہ کی ذات سے اس الزام کو دور کرنا چاہتا ہے تو اسے مخالف اسلام سمجھتے ہیں

اگر فاضل مقالہ نگار مذہب کے باب میں عقل سے کام لینا گناہ سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک مذہب نام ہے صرف سمجھ میں نہ آسکنے والی باتوں کا، تو وہ کم از کم روایتوں ہی کے اختلاف پر غور کرتے، اور انھیں اختلافات کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کرتے، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے یہ بھی نہیں کیا

فاضل مقالہ نگار کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسرہنی اور معراج کے باب میں اتنے اختلافات پائے جاتے ہیں کہ شاید ہی کسی دوسرے مسئلہ میں نظر آتے ہوں اور اسی سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نہ صرف اس زمانہ میں بلکہ اُس وقت بھی لوگ اس کو صحیح باور کرنے کے لئے طیار نہ تھے

نفس معراج و اسراء کے وقوع کے متعلق اختلافات کی مختصر فرست ملاحظہ ہو:-

(۱) معراج و اسراء دو جداگانہ چیزیں ہیں اور دونوں علیحدہ علیحدہ ہوئیں

(۲) معراج و اسراء دونوں ایک ساتھ ہوئیں

(۳) ایک بار اسراء ہوئی اور دوسری بار معراج

(۴) معراج دوبار ہوئی ایک بار بغیر اسراء کے اور دوبارہ مع اسراء کے

(۵) معراج مع اسراء کے دو مرتبہ ہوئی

اور لطف یہ ہے کہ ہر شخص اپنے بیان کے ثبوت میں روایات بھی پیش کرتا ہے

اب ان روایات کو لیجئے جو تفصیل معراج کے متعلق بیان کی جاتی ہیں سوان کا اختلاف اور زیادہ حیرت انگیز ہے

صحابہ سے کی روایتوں کو کجا کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس واقعہ کے ایک ایک جزو کے متعلق روایتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ آج یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ کس وقت اور کس جگہ سے آپ معراج کے لئے لیجائے گئے، ایک فرشتہ آیا تھا یا دو تین، آپ جاگ پرتے یا سو رہے تھے، براق پر سوار ہو کر آیا یا سیرطری کے ذریعہ سے جیسا کہ ابن ہشام، طبری اور ابن سعد کا بیان ہے اور کون کون سے پیغمبر کس کس آسمان پر آپ کوٹے،

پھر جب حالت یہ ہے کہ اس عقل و نقل کی جنیت سے واقعہ معراج کی صحت کا یقین نہیں ہو سکتا تو اس پر اصرار کیوں ہو۔۔۔۔۔۔ اگر معراج آنحضرت کو بہ حالت خواب ہوئی جیسا کہ بعض کا خیال ہے تو اس میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں، جسکا اس اہتمام کے ساتھ ذکر کیا جائے کیوں کہ سونے کی حالت میں اس سے زیادہ حیرت انگیز باتیں لوگوں کو نظر آتی رہتی ہیں، اور اگر بہ حالت بیداری مانی جائے تو خیر عقلاً تو محال ہے، نقل و روایت کی رُو سے بھی اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ اس سے زیادہ اہم بالشان واقعہ آنحضرت کی زندگی کا اور کوئی نہیں ہو سکتا اور اسی کے متعلق اس قدر اختلافات پائے جاتے ہیں

اب رہ گیا یہ امر کہ معراج کا خیال زردشتی کتابوں سے لیا گیا یا ہندوؤں کے روایات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ ایک غلط بات خواہ وہ اختراع کی گئی ہو یا کسی کے متبع میں بیان کی گئی ہو، ہمیشہ غلط رہے گی۔۔۔۔۔۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم اس کو مان بھی لیں کہ زردشت نامک میں زردشت کی معراج کا ذکر نہیں پایا جاتا، اور اگر جن کی سیاحت آسمانی ہندوؤں کے قدیم لٹریچر میں کسی جگہ بیان نہیں کی گئی، تو بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمانوں کی روایت معراج کو صحیح باور کر لیا جائے۔۔۔۔۔۔ اس لئے فاضل مقالہ نگار اگر بجائے اس دوران کا رجحان کے نفس مسئلہ معراج

کی تحقیق و تنقید پر اپنا وقت صرف کرنے تو زیادہ مناسب تھا۔۔۔۔۔۔

فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ”اسریٰ بہ عبیدہ“ کھلی ہوئی خمدات اس امر کی ہے کہ معراج ہوئی، لیکن دبی زبان سے سلسلہ کلام میں وہ یہ بھی ظاہر کر گئے ہیں کہ معراج غالباً حالت خواب میں ہوئی، لیکن اگر کلام مجید کی تمام آیتوں پر بغیر کسی تاویل کے ایمان انا فرض ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ معراج بہ حالت خواب مانی جائے کیونکہ الفاظ اسریٰ بہ عبیدہ سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جسد ظاہری کے بجائے گئے بلکہ یہ بھی کہ خود خدا ان کے ساتھ تھا آیت مذکورہ میں لفظ اسریٰ کے ساتھ (ب) کا صلہ استعمال کیا گیا ہے، درانحالیکہ اسریٰ میں جو تقدیر پایا جاتا ہے وہ حرف (ب) کے صلہ کا محتاج نہیں۔ اسریٰ عبیدہ سے بھی سیر کرانے کے معنی پیدا ہو سکتے تھے، پھر ظاہر ہے کہ (ب) کا صلہ کسی خاص مفہوم کے لئے لایا گیا ہے اور وہ یہی ہو سکتا ہے کہ خدا خود رسول اللہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ لیکن اگر وہ اس کی کوئی تاویل کر کے معراج جسمانی کے عقیدہ سے منحرف ہونا چاہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرا شخص کوئی اور تاویل کر کے اس آیت کا کوئی اور مفہوم نہ قرار دے۔ کیونکہ معراج مناسی کے تسلیم کرنے سے تو بدتر جہاں تر یہی ہے کہ اسے اس کا انکار ہی کر دیا جائے، کیونکہ محض خواب میں رسول اللہ کا یہ دیکھنا کہ وہ ہفت افلاک طے کر کے خدا سے ہمکلام ہوئے کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں جس پر کسی رسول یا اس کے قیومین کو ناز کرنا چاہئے۔ علاوہ اس کے اگر فاضل مقالہ نگار واقعی معراج منہی مانتے ہیں تو پھر بدرجہ اولیٰ انھیں روایات احادیث کو ماننا چاہئے جن میں تمام وہی تفصیلات موجود ہیں جو جسمانی سیر و سیاحت کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ مگر کس قدر حیرت ہے کہ وہ ایک طرف احادیث کی صحت کے بھی قائل ہیں۔ اور دوسری طرف معراج کا بہ حالت خواب ہونا تسلیم کرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ کلام مجید میں بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن میں صرف تشبیہ واستعارہ سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً یاد اللہ فوق ایدیم، یا خلق السموات والارض والبینہانی ستہ ایام یا وہ تمام آیات جن میں دوزخ و جنت کا ذکر ہے اور غالباً ہمارے فاضل مقالہ نگار بھی یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ واقعی نہ خدا کے ہاتھ ہے اور نہ پھر دن میں آسمان و زمین بن گئے۔ پھر جب وہ کلام مجید کے سمجھنے میں تاویل سے کلیتہً احتراز نہیں کر سکتے تو پھر تاویل کی تعیین و تحدید کے کیا معنی یعنی وہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ فلاں جگہ تو تاویل ہو سکتی ہے اور فلاں جگہ نہیں۔ تاویل اسی وقت کی جاتی ہے جب عقلاً کسی قول کے ظاہری معنی قابل قبول نہ ہوں، پھر جس طرح خدا کے لئے ہاتھ منہ کا ہونا یا کائنات کا پھر دن میں بن کر طیار ہو جانا ایک شخص کے لئے عقلاً قابل قبول نہیں اسی طرح دوسرے کے نزدیک یہ بھی لائق تسلیم نہیں کہ رسول اللہ براق پر سوار ہو کر یا سیر ہی کے ذریعہ سے آسمانوں پر چڑھ گئے ہوں اور یہ فضائی ہفتواں طے کر کے خدا سے ہمکلام ہوئے ہوں اور وہ گنگو صرف یہ ہو کہ ان کی امت کے لئے بجائے ۵۰ وقت کے صرف پانچ وقت کی نماز فرض کر دی جائے، درانحالیکہ یہ بات یوں بھی آسانی سے طے ہو سکتی تھی۔۔۔۔۔ بہر حال احادیث معراج یقیناً سب کی سب موضوع ہیں اور رسول اللہ نے کبھی ان واقعات کا اظہار نہیں کیا جو روادۃ بیان کرتے ہیں اور اگر کوئی مسلمان اس کا یقین کرتا ہے کہ واقعی رسول اللہ نے ایسا بیان کیا کہ اپنے جسد ظاہری

کے ساتھ فلک الافلاک تک پہنچ کر مش خد اوندی تک بارباب ہوئے تو وہ رسول اللہ کی توہین کرنے والا ہے اور اگر کوئی شخص صرف معراج بہ حالت خواب کا قائل ہے تو وہ رسول اللہ کی ذات گرامی سے استہزا کرتا ہے کیونکہ نیند میں تو ایک معمولی انسان اپنے آپ کا خدا ہو جاتا بھی دیکھ سکتا ہے۔ یہ جائیکہ خدا کے حضور تک پہنچ جانا، اور خواب کی اس کیفیت کو کبھی رسول اللہ اہمیت دیکر بیان نہیں کر سکتے تھے

اب رہا یہ امر کہ معراج کا خیال لوگوں نے کہاں سے لے کر رسول اللہ سے منسوب کیا، اس کے متعلق میں کسی آئندہ صحبت میں اپنی تحقیق پیش کروں گا، کیونکہ علاوہ زردشتیوں کے اور بھی اقوام قدیمہ میں اس قسم کی روئیں پائی جاتی تھیں اور محض اردو دوراں نامک ہی ایک ایسی کتاب نہیں ہے جس میں اس کا ذکر پایا جاتا ہو، حالانکہ اردو دوراں نامک بھی عہد قبل اسلام کی کتاب ہے اور پہلوی زبان کی جدید تحقیقات کے سلسلہ میں علاوہ اردو دوراں نامک کے اور بھی متعدد مخطوطات عہد زردشت کے دستیاب ہوئے ہیں

شہوانیات یا ترغیباتِ حلنبی

حضرت نیاز کے قلم سے

اس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی سہ کی اور آئندہ اخلاق انسانی کے بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے کائنات سے یہ کتاب بالکل نئی پیر ہے۔ اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز حالات و واقعات درج ہیں۔ کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ ننگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول (۸) آٹھ آنے کے مجلد کتاب صرف پکار میں اور غیر مجلد عار میں ملے گی۔ اور اگر آپ ننگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ہے میں۔ اور غیر مجلد ۷ میں علاوہ محصول ۸ کے ملے گی۔ اگر ارشاد ہو تو کتاب ذریعہ وی پی پی روانہ کی جائے، حجم ۳۷۵ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے۔

نیچر ننگار لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

رہنمائے مقدمات مقدسہ

یہ کتاب خالص صاحب حاجی محمد اشرف خاں مہتمم خزانہ ڈیرہ اسماعیل خاں کا سفرنامہ ہے جو دوران زیارت اماکن مقدسہ انہوں نے مرتب کیا ہے ہر چند اس موضوع پر اس سے قبل متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کوئی اہل قلم ایسا نہیں جس نے سفر حج کے سلسلہ میں اپنے تجربات کو قلمبند نہ کیا ہو، لیکن کم کتابیں ایسی ہیں جو ”مجموعہ تجربات“ سے بڑھ کر نتائج مطالعہ و تنقید“ کہلائی جائیں۔ راستہ کی دشواریاں اور ان کو دور کرنے کی تدابیر، مناسک حج کی تفصیل اور ان سے عمدہ برآ ہونے کے طریقے، توہر شخص بکھ سکتا ہے، لیکن اس محدود سے نکل کر کسی ملک کے تمدن و معاشرت، صنعت و حرفت، اقتصاد و تجارت اور طبعی حالات پر گفتگو کرنا آسان نہیں۔ اس کے لئے ایک خاص دماغ، ایک خاص اہلیت، اور ایک مخصوص ذوق مطالعہ و تنقید درکار ہے۔ حج کو آسانی سے طے کر دینے والی کتابیں تو بہت نظر آتی ہیں، لیکن حج کو ذریعہ معلومات بنادینے والی بہت کم ہیں۔

اس لئے ملک کو فاضل مولف کا ممنون ہونا چاہئے کہ ان کا سفرنامہ صرف معمولی ڈائری نہیں ہے جو صرف مناسک حج سے بحث کرتا ہو بلکہ اس میں وہ سب کچھ ہے جس کی ایک نگاہ نگتہ رس اور فہم رمز شناس کو ضرورت ہو سکتی ہے۔ کتاب میں جا بجا تصاویر بھی دی گئی ہیں اور کتابت و طباعت کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ کتاب غیر فاضل مولف سے ڈیرہ اسماعیل خاں کے ہتہ پر مل سکتی ہے۔

اس سے قبل جناب شوکت تھانوی کے مضامین کے دو مجموعے موج تبسم اور بحر تبسم کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ چونکہ موج اور بحر کے بعد تدریجی ارتقائے ماتحت ایک سیلاب کی بھی ضرورت تھی، اس لئے یہ تیسرا مجموعہ ”سیلاب تبسم“ کے نام سے شائع ہوا ہے، درانحالیکہ اس امر میں اختلاف ہو سکتا ہے کہ موج، بحر اور سیلاب میں اذروئے فرق مراتب مقدم و مؤخر کی نسبت وہی صحیح ہے جو شوکت صاحب نے سمجھی ہے یا اس کے برعکس۔ بہر حال اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ بحر میں سیلاب بھی آتا ہے (درانحالیکہ ایسا نہیں ہوتا) اور موج بھی بحر پر مقدم ہے (جو یقیناً غلط ہے) تو یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ سیلاب کے بعد کی منزل کیا ہوگی۔ خدا کرے وہ نہ ہو جو سیلاب کے گزرنے کے بعد علی العموم ہوا کرتی ہے۔

شوکت صاحب ملک کے مخصوص مزاحیہ نگاروں میں سے ہیں اور میں ایک سے زائد بار اُن کے رنگ انشاء پر اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہوں۔ اس مخصوص طرز تحریر میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ مطالعہ جوئیات، بے ساختگی تحریر اور استدلال شاعرانہ (جو تعبیر نگاہی سے آگے نہ بڑھنے پائے) شوکت صاحب میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی ہیں اور اسی لئے اُن کے مضامین کا مطالعہ سنجیدہ طبائع کو بھی ناگوار نہیں ہوتا۔ چونکہ شوکت صاحب اکتسابی مزاح نگار نہیں ہیں بلکہ قدرتا (معاف فرمائیں) ”ہنسور“ واقع ہوئے ہیں، اس لئے اُن کے یہاں تصنع و آورد کا پتہ نہیں اور اُن کی کامیابی کا یہی اصل راز ہے

اس مجموعہ میں اُن کے جو بیس مضامین ہیں جو پھوٹی تقطیع کے ۲۸۰ صفحات کو محیط ہیں۔ کتاب مجلد شائع کی گئی ہے اور دو روپیہ میں صدیق بک ڈپو امین آباد لکھنؤ سے مل سکتی ہے جس نے اس کی اشاعت کی ہے

مجموعہ ہے (مرجم) حکیم فیروز الدین احمد فیروز ظفرانی امرتسری کے فارسی اُردو کلام کا جسے

کلیات ظفرانی

جناب تبسم ام۔ اے نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ شروع میں شاعر کے سوانح حیات بھی درج ہیں اور اُن کے اُردو کلام پر تنقید بھی کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ اوسط تقطیع کے ۲۲۰ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں قصاید و منظومات، قطعات و غزلیات وغیرہ بھی کچھ پایا جاتا ہے

فیروز ظفرانی امرتسر کے اچھے شعراء میں سے تھے اور پنجاب کی وطن پرستی نے انھیں اور زیادہ مشہور کر دیا تھا افسوس ہے کہ میں بالاستیعاب اُن کے کلام کا مطالعہ نہیں کر سکا لیکن جسے جسے ورق گردانی سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کا فارسی کلام، اُردو سے بدرجہا بہتر ہے اور کشمیری الاصل ہونے کی وجہ سے فارسیت کے ساتھ انکو زیادہ لگاؤ تھا۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائے کس قدر پاکیزہ ہیں:۔

ہم امتحان اوست دم امتحان ما	آں ترک نازک ست دگران ست جان ما
خالی ست از متاع تحمل دکان ما	کے جائے ماندن ست بہ بازار عاشقی

حرفے کہ کسے گفتم مکر نتوان گفتم	منصور انا الحق زدہ دیگر نتوان گفتم
نازک نتوان گفتم، سمن بر نتوان گفتم	زیں سنگ دلیہا کہ بہ بنیم بتال را

چند انکہ خم کشید رہین خار بود	از بادہ نوش میکدہ آرزو میرس
-------------------------------	-----------------------------

بہ حیرتم چه قدر عالم آشنا افتاد	بتے کہ پردہ نشین حریم دل بود
---------------------------------	------------------------------

کشیدم در تمنایش من از ہر آرزو دستے چہ خوش لے ناصح ناداں کہ بردارم از دستے
 طفرانی کے فارسی قصائد بھی خوب ہیں اور زور کلام کی اچھی اچھی مثالیں ان میں ملتی ہیں یہ مجموعہ عمار میں کتب خانہ
 طفرانی امرت سر سے مل سکتا ہے

مجموعہ ہے ملک محمد باقر نسیم ام، اے گجراتی کے چند مقالات کا جو عملی زندگی کی اصلاح کے لئے انھوں
تہذیب عمل نے وقتاً فوقتاً لکھے تھے۔ فاضل مولف کا مقصود اس کتاب کی اشاعت سے یہ ہے کہ ملک
 کے نوجوان اور خصوصیت کے ساتھ طلبہ اپنی قوت مطالعہ کو بڑھائیں کہ اسی کا نام قوت حافظہ ہے اور یہی مستقبل کی شاہراہ
 ترقی کھلاتی ہے

غالباً اردو میں یہ بالکل پہلی کتاب ہے جس میں قوت ارادی سے بحث کر کے عملی زندگی میں اس کی غیر معمولی اہمیت
 کو ظاہر کیا گیا ہے

یہ کتاب اس قابل ہے کہ نوجوان طلبہ کے درس میں داخل کی جائے اور مجھے بڑی مسرت ہے کہ جناب نسیم رضوانی
 نے باوجود جوان ہونے کے اپنے شباب کی رعایت سے سب سے پہلے کوئی فسانہ حسن و عشق شائع نہیں کیا بلکہ کام کی چیز
 پیش کی ہے۔ جس سے خود ان کی قوت عمل پر کافی روشنی پڑتی ہے یہ کتاب ۶۱ میں دفتر ”تذکرہ“ گجرات
 سے مل سکتی ہے

جس کا دوسرا نام ”شکل بدلنے کا طریقہ“ بھی ہے۔ یہ ترجمہ ہے کسی انگریزی کتاب کا جسے
میک اپ ”فلوریو“ کلکتہ نے شائع کیا ہے۔ اس کے مترجم کوئی صاحب عکاس دہلوی ہیں۔
 موجودہ زمانہ میں چونکہ صنعت فلم سازی یہاں بھی مقبول ہوتی جا رہی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اردو میں ایسی
 کتابیں لکھی جائیں۔ اس کی قیمت ۱۲ روپے بیشک کچھ زائد معلوم ہوتی ہے

فلسفہ مذہب

اگر آپ مذہب اسلام کو سمجھ کر اس کی پیروی کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے موضوع کے لحاظ سے
 اردو میں بالکل پہلی چیز ہے قیمت ۷ روپے

تذکرہ خندہ گل

جس میں ۳۰۰ سے زیادہ اردو فارسی کے ظریف خناعروں کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف اور انتخاب
 کلام کے درج ہیں۔ قیمت ۷ روپے محصول عمار

نیچرنگار

سرود روح

چل رہی ہے شام کی ٹھنڈی ہوا گاتی ہوئی
 کچھ سنہرے اور شفق گوں بادلوں کے درمیاں
 دور تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیتوں کی ہسار
 پیچ و خم کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں میں بے نقاب
 خاشکی کے حسن میں نعموں کے ہلکوروں کا رنگ
 اک مئے جان بخش سے لبریز ہے دل کا ایوان
 کیا طرب آموز ہے شاداب جنگل کی فضا
 پھیرتی ہے شام جب ساز نشاط و تازگی
 دور ہو جائے ہیں تلخ اور غم فر اور ہم وقیاس
 شام کا مقصد نہیں ہے صرف تخلیق جمال
 کر رہے کوئی در پردہ بشر کا استحرام
 کاش یوں ہموار ہو جائے زمانے کا نظام
 عقل صرف گمراہی ہے، ہوس و لغت اختلاف
 مذہب انسانیت سے ہے خرد کو احترام
 ہر بشر کی روح اطمینان سے محروم ہے
 ہمنشین دل میں اگر رکھتا ہو احساس عمیق
 کیا یہی دنیا ہے لفظ "کن" کی جو تفسیر ہے
 وسعت تخیل میں جب ڈوب جاتا ہوں کہیں
 آنکھ سے مستور ہو جاتی ہے بزم آب و گل
 زندگی کی عظمتوں کے راز ہوتے ہیں عیاں
 گو ہنوز اس سطح پر دنیا کا آنا ہے مجال

دل کو فرحت، روح کو تسکین پہنچاتی ہوئی
 دیدنی ہے ڈوبتے سورج کا کیف افزا سماں
 کو ہسار اور اُن میں اک ہلکا سا نورانی غبار
 حریت کے روح پرور و لولوں کا الہتاب
 کیف، رعنائی، لطافت، زندگی، شوخی، اُننگ
 دھل گئے ہیں بادہ کو تر سے اجڑے دماغ
 ہو رہی ہے اک مسلسل بارش کیفِ مَنیّا!
 ہر گمراہ میں دوڑا ٹھٹھا ہو خونِ زندگی
 روح کی موسیقیوں میں ڈوب جاتے ہیں تم اس
 دے رہی ہے بزمِ قدرت دعوتِ فکر و خیال
 گوشِ دل سے سن ذرا فطرت کا نورانی پیام
 کر سکیں منم خزینوں کا بھی دل سے احترام
 آؤ کیا ہو گا کہ ہوس زائیدہ دنیا کا مال
 زندگی ہے باہنم کی عقوبت کا گداز
 کیا زمانے کی ترقی کا یہی مفہوم ہے؟
 دیکھ عبرت کی نظر سے دہر کے طرز و طریق
 عشق کے ذوق جہاں سازی کی یہ تعبیر ہے؟
 اور جیسا جاتی ہے دل پر ایک گہری بیخودی
 جگمگا اٹھتے ہیں نورِ فکر سے اعماقِ دل
 اور نظر آتا ہے اک پُر امن نورانی جہاں
 ہے مرے پیغام میں منم حقیقت کا جلال

جب محبت مذہب اہل جہاں ہو جائے گی

کائنات اک داویٰ جنتِ نشاں ہو جائیگی

نغمہ محبت

ازل سے دردِ بد دل ہوں، جنوں بہ سر ہوں میں کہ اک غریب، محبت زدہ بشر ہوں میں
 زے خیال میں گم ہو گیا ہے میرا وجود ! ! مجھے کچھ اپنی خبر کیوں نہیں اگر ہوں میں
 ہر ایک سانس ہے تشریحِ دردِ دل، صد حیف ! خود اپنے عشق کی رسوائیوں کا گھر ہوں میں
 یہ کیا سمجھ کے غمِ عشق دے رہے ہو مجھے یہ کس نے تم سے کہا صاحبِ جگر ہوں میں

ازل سے ضامنِ گردش ہے زندگی میری
 یہم حیات کا چھوٹا سا اک بھنور ہوں میں

محرومی

جفا کا لطف باندازہ و فانی ملا تمہارے عہد میں مرنے کا بھی مزانہ ملا
 نہ دل سے محو ہوئی آمد و نہ بر آئی ستم ظریفی فطرت کا مدعا نہ ملا
 جنوں سوار تھا سر پر کہ پاؤں توڑ آئے کچھ اپنی منزلِ موہوم کا پتہ نہ ملا
 کوئی ٹھکانا ہے دنیا ترے حوادث کا کہ خود کو ڈھونڈنے نکلے مگر پتہ نہ ملا

س جناب شیخ ! یہ کیا ماجرا ہوا آخر !

سنا ہے آپ کو کعبہ میں بھی خدا نہ ملا

عدم

قطعات

شعر گوئی

خوں بھرے جام اُنڈیلتا ہوں میں
تم سمجھتے ہو شعر کتتا ہوں !
ٹیس اور درد جھیلتا ہوں میں
اپنے زخموں سے کھیلتا ہوں میں

یاس میں اُمید

میرے یاسوں میں اے اختر!
جس طرح اک اُداس چہرے پر
اس طرح سے اُمید آتی ہے
مُسکراہٹ سی کھیل جاتی ہے

حُسن و نغمہ

حُسن ہے ایک نغمہ دل گیر
دو دنوں جذبات خیز ہیں۔ یعنی
اور نغمہ ہے روح افزا حُسن
حُسن نغمہ ہے اور نغمہ حُسن!

مغنیہ!

اے کہ تو راگنی میں ہے مدہوش!
تھم، کہ گیت اپنے بازوؤں پہ مجھے
اے کہ تو گم ہے مست تانوں میں!
لے جاتا ہے آسمانوں میں!

کیف برشگال

آتشِ غم بھڑک رہی ہے آج؛
ابر ہے، مینہ ہے، ہوا میں ہیں
میری چھاتی دھڑک رہی ہے آج
میری رگ رگ پھڑک رہی ہے آج

نشاطِ نغمہ

زمزمہ سنجِ مطربہ جس وقت
زندگی کی اندھیری راتوں میں
طرب افزا سُروں میں گاتی ہے
ایک بجلی سی کوند جاتی ہے

شعراء لکھنؤ سے خطاب

تم سے کچھ کہنا ہے مجھ کو شاعران لکھنؤ
 نیند کے ماتوں کو غفلت سے جگانیکے لئے
 مردگان ذوق کو دینا ہے پیغام حیات
 تم نے چکھا ہی نہیں ہے بادہ مینکے شعر
 شعر کیا ہے قلم عرفاں کی اک مچ خوش آب
 شعر کیا ہے جنتِ معنی کی صہبائے ظہور
 شعر کیا ہے اک پیام جانفرائے زندگی
 شعر کیا ہے آتش خاموش جذباتِ نہاں
 شعر کیا ہے آیتِ انجیلِ تخیلِ جمیل
 شعر کیا ہے منتہائے رفعت پر وادِ شوق
 شعرا تو ام جہاں کے حق میں ہر درس حیات
 اور تمہارا شعر دنیا کے لئے تعلیمِ خواب
 زندہ جذبات کو مردہ بنا دیتا ہے وہ
 روح کو پیغامِ کلفتِ قلب کو پیغامِ یاس
 دیدہ روشن کو کر دیتا ہے محرومِ بصیر
 دست بر سینہ جماعت او گروہ نوحہ خواں
 دشمنِ احساسِ ملت ہے تمہارا ہر کلام
 نزع و تربت کی حکایت قصہ آہ و بکا

زندہ ہو کر قوم کو بہرِ خدا زندہ کرو
 اس طرح تم شعر کے جوہر کو تابندہ کرو

غزلیات

اختر انصاری

غمِ حیات کمانی ہی، قفّہ خواں ہوں میں
نظر کے سامنے کونذی تھی ایک بجلی سی :
خرداں یہ کہتی تھی "میں شوخی بہارانِ حق"
مری بلا، غمِ ہستی! اٹھائے تیرے ناز
شباب نام ہے اس جاں نواز لمحے کا
جہاں درد و الم بوجتا ہے جھکو، آہ
وہ دن بھی تھے کہ میں جانِ شباب تھا اختر
سجدہ شکر ہے ہر لغزشِ مستانہ عشق

کوکب دشا بہانوری

المدد المدد اے غیرتِ مردانہ عشق
خستہ بادہ سر جوش ہے پیمانہ عشق
کافر عشق حقیقت میں ہیں بیگانہ عشق
عین تعمیر تھی بربادی کا شانہ عشق
بادہ حُسن سے معمور ہے مینخانہ عشق
نہ چھپی خاک میں رعنائی کا شانہ عشق
کیفِ اندوہ تو ہے حاصل مینخانہ عشق
اور ابھی تشنہ تکمیل ہے افسانہ عشق
کون کتا ہے کہ ویران ہے دیرانہ عشق

جویر الفت نما کو کیا کہنے
جلوہ حُسن عام ہے لیکن
بندگی خود ہے بندگی کا صلہ
دل پہ جب اختیار ہی نہ ہے
میں نہیں درخورِ کرم نہ سہی
بھکنے والی تھی کتبِ جہنم نیاز
ہوئی جاتی ہے گم نظر فرخ

فرخ بناری

اس فریب و فاکو کیا کہنے
نگہ نارسا کو کیا کہنے
طاعتِ بے ریا کو کیا کہنے
نگہِ فتنہ زاکو کیا کہنے
ستم ناردو کو کیا کہنے
کششِ نقشِ بیا کو کیا کہنے
حُسنِ حیرت فزا کو کیا کہنے

معلومات

اشتمالی جدت مغرب کی جدت پسند دنیا بھی کیسی عجیب و غریب دنیا ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو اُن کی ذہانت اشتراع کا ممنون نہ ہو۔ وہ کتابیں لکھتے ہیں تو اس میں ابداع و جدت سے کام لیتے ہیں اور کتابیں نیچتے ہیں تو اس کے لئے بھی وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی جدت تجویز کرتے رہتے ہیں حال ہی میں پیرس کے دو نوجوانوں نے مل کر گزشتہ جنگ عظیم کی تاریخ لکھی اور اخباروں میں یہ اعلان کر دیا کہ

”دونوں مصنفوں میں جنگ کا سبب متعین کرنے میں اختلاف ہو گیا ہے اور یہ اختلاف اس قدر شدید ہو گیا ہے کہ اُن کے درمیان نبرد آزمائی ضروری ہے۔“

اس اعلان کے بعد وہ دونوں ایک وقت مقرر کر کے آپس میں تلواروں سے لڑے بھی اور جب یہ خبر شائع ہوئی تو لوگوں کو شوق پیدا ہوا کہ اصل کتاب کو دیکھنا چاہئے جس پر دو پڑھے لکھے آدمیوں میں یوں وحشیانہ جنگ ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند دن میں تمام نسخے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔

فرانس کا غدار چھتر اب سے ہزاروں سال قبل جب چھتر اور فرود کے درمیان جنگ ہوئی تھی تو کسا جاتا ہے کہ چھتر جیت گیا تھا، اور اب بھی جبکہ انسان نے یہ جنگ دوبارہ اختیار کی ہے چھتر ہی کی فتح یقینی معلوم ہوتی ہے کیونکہ باوجود جدید ترین ذرائع ہلاکت کے اس وقت تک انسان اس حقیر مگر زبردست دشمن انسان کیرٹے کو نیست و نابود نہیں کر سکا۔

جب سے یہ امر متحقق ہوا ہے کہ لیریا کا باعث چھتر ہے اس وقت سے تمام تمدن ممالک نے چھتر کے خلاف ایک عام اعلان جنگ کر دیا ہے اور مختلف وسائل اس کی تباہی کے لئے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ خصوصاً امریکہ میں تو حد درجہ جدوجہد اس باب میں کی جا رہی ہے۔

چونکہ چھتر پانی کی سطح پر رہتا ہے اس لئے سمندروں میں اور سواحل پر ایسی چڑیاں، مچھلیاں و معلوم ہوگا کہ حکومت ہینڈک پاسے گئے ہیں جو چھتر کو بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ لیکن حال ہی میں اہل امریکہ نے سواحل فرانس اور دھرا دھرا بڑی تعداد ایسے چھتروں کی فراہم کی ہے جنکی غذا چھتر ہی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ بہترین طریقہ چھتروں کی ہلاکت ہے۔

پچھ فرانس سے لائے گئے ہیں ہر چند ان سے طیر یا نہیں پھیلتا، لیکن ہیں بہ حال پچھ ہی اور اس لئے اگر ان کو غدار پچھ کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ کیونکہ یہ خود اپنی ہی جنس کو برباد کرتے ہیں

چالیس سال قبل امریکہ کی ایک جماعت جو وہاں کے محکمہ ڈاک سے تعلق رکھتی تھی، اطراف ملک کا دورہ کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک کتابھی تھا جس کا نام ”اونی“ تھا

یہ کتاب ہر جگہ ان کے ساتھ رہتا تھا خواہ موٹر میں ہوں یا بیدل، جہاز پر ہوں یا ریل میں

اس کے بعد اسی جماعت نے یہ تجویز کی کہ تنہا کتے کو سیاحت عالم کے لئے بھیجا جائے، چنانچہ ۱۸ اگست ۱۹۳۳ء کو یہ کتا روانہ کیا گیا اس کے گلے میں ایک تختی ڈال دی گئی جس پر یہ عبارت تحریر تھی :-

”یہ امریکہ کے ایک لاکھ ملازمین محکمہ ڈاک کا نہایت محبوب کتا ہے اور ۱۸ اگست کو سیاحت دنیا کے لئے روانہ کیا گیا ہے۔ جس کو یہ کتا بے براہ کرم اس کی سیاحت میں مدد کرے۔“

الغرض اس طرح اس کتے نے اپنا سفر شروع کیا اور فروری ۱۹۳۳ء میں سیاحت کر کے یہ کتاب اپنی جگہ پر واپس آ گیا۔

مشرق میں تو ہر وہ عورت جو پیمان وفا باندھ لیتی ہے ”گھر کی ملکہ“ بن جاتی ہے، لیکن چونکہ مغربی

ملکہ شراب تہذیب کی رُو سے وہاں کی عورت میں سب کچھ ہے مگر یہی نہیں ہے، اس لئے اس کا وہاں ملکہ بننا بھی نفع سے خالی نہیں

حسن و جمال کی ملکہ، ملبوسات کی ملکہ، پھولوں کی ملکہ، عطر و لوند کی ملکہ، موٹر کی ملکہ — الغرض سبھی قسم کی ”ملکانین“ اس وقت تک وہاں پیدا ہو چکی ہیں، لیکن ”ملکہ شراب“ اس وقت تک کوئی نہ ہوئی تھی، سو فرانس نے اس کمی کو بھی پورا کر دیا۔ اور مس ایوان جوئی کو اس عزت کا مستحق سمجھ کر مجمع عام میں اس کا اعلان بھی کر دیا گیا

رہا یہ امر کہ ”ملکہ خمر“ ہونے کا کیا مفہوم ہے اور کیوں مس ایوان جوئی کا انتخاب کیا گیا، سو اس کے متعلق دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ کہ اس سے زیادہ شراب پینے والی خاتون فرانس میں کوئی اور موجود نہیں یا یہ کہ اس کے سراپا کی مینائیت یا ”میگونی“ ایسی ہے جو شراب کے یونانی دیوتا کی یاد کو تادہ کرتے والی ہے

رہ حال جو سبب بھی ہو، ”ملکہ شراب“ اب اصنامی و خرافاتی چیز نہیں رہی، بلکہ دنیا کے اور حضائق کی تہ کو کر رہ گئی ہے اور ظاہر ہے کہ بادہ خواری کے لئے اس سے زیادہ موثق فتوائے جواز اور کیا پیش کیا

ہے

اکا بادشاہ | بوہیمیا میں جہاں اور سامانہ مشاغل تفریح ہیں، وہیں ایک مشغلہ یہ بھی ہے کہ جسم

میں سوئی جھوٹے کا بیج ہوتا ہے اور جو شخص سب سے زیادہ سوئیاں اپنے جسم میں جھبولیتا ہے اس کو کامیاب سمجھا جاتا ہے

۱۹۳۵ء میں جب یہ سالانہ میلہ قائم ہوا تو ایک شخص نے جس کا نام باگرو ہے اور جو کسی خانہ بدوش قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے تمام اگلے پچھلے رکارڈ توڑ دئے اور دنیا کو حیرت میں ڈال دیا

اس نے تین ہزار دو سو (۳۲۰۰) سوئیاں اپنے داہنے بازو اور کلائی میں جھبولیں اور ۳۱ گھنٹے تک اسی طرح اُن کو رہنے دیا۔ اس سے قبل کوئی شخص یہ جرأت نہ کر سکا تھا اور نہ آئندہ اس کی امید کی جاتی ہے

مشہور ہے کہ عورت کبھی اپنی صحیح عمر نہیں بتاتی اور یہ سوال اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ اگر وہ اس سوال کا جواب بھی دیں گی تو ہمیشہ اپنی عمر کو کم بتائیگی تاکہ ان کے شباب

ایک لطیف حکایت

کی جاذبیت کم نہ ہو

سال ہی میں ایک خاتون کسی موٹر سے ٹکرائی اور ناک پر زخم آگیا۔ اس نے موٹر چلانے والے کے خلاف معاوضہ طلب کرنے کا دعویٰ عدالت میں دائر کر دیا۔ عدالت نے ڈگری دیدی۔ لیکن موٹر والا بہت ہوشیار تھا۔ اس نے عذر پیش کیا کہ معاوضہ کی مقدار سن و سال کے لحاظ سے ہونا چاہئے کیونکہ ایک جوان عورت کی ناک اور عمر عورت کی ناک میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ عدالت نے اس عذر پر مدعیہ کو طلب کیا اور حکم دیا کہ اپنی عمر بتائے، لیکن عورت نے معاوضہ سے ہاتھ دھونا تو گوارا کر لیا، لیکن اپنی عمر ظاہر کرنا کسی طرح گوارا نہ کیا

ایک مغربی صحافی کے کارنامے

پنچسٹری نیوز کے ایڈیٹر "کننگ وولٹرز" نے حال ہی میں اپنی خدمت سے سبکدوشی حاصل کی ہے۔ انھوں نے ۲۵ سال تک اس اخبار کی خدمت کی اور اس دوران میں انھوں نے بیس کتابیں لکھیں، ۲۵۰ لکچر دئے، ۲۰۰۰۰ افتتاحیہ مقالے لکھے، ۲۰۰۰۰ کتابوں پر تقریظ لکھی، ۱۵۰۰۰ مقالے مختلف موضوع پر لکھے اور ۸۰۰۰ ڈراموں پر تنقید کی۔ ہندوستان میں بھی ایسے دماغوں کی کمی نہیں، لیکن قدرت کی طرف سے ایک بڑا مانع دماغی کام کے لئے یہاں کی گرمی ہے جو سال میں ۶ مہینے بالکل ضائع کر دیتی ہے۔ برخلاف یورپ کے کہ وہاں ۲۴ گھنٹے کام کرنے کے بعد دماغ نہیں تھکتا

حکومت کی حکومت جو کسی وقت دولت عثمانیہ کے نام سے موسوم تھی اس کے سلطنت کی بنیاد محبت پر

گزشتہ اقدار سے ہر شخص واقف ہے لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ حکومت عثمانی کی اس وسعت کی بنیاد ایک واقعہ عشق و محبت پر قائم ہوئی جب فتنہ چنگیزی نے ایشیا کوچک کی تمام امارتوں کو درہم برہم کر رکھا تھا اور جیوش و قبائل ادھر ادھر

بھاگتے پھر رہے تھے تو انھیں میں ایک قبیلہ خراسانی ترکوں کا بھی تھا جو چار سو سواروں پر مشتمل تھا۔ اور جس کا قائد ارطغرل تھا۔ اسی دوران میں یہ قبیلہ ایسے حصہ ملک سے گزرا جہاں سلجوقی اور تاتاری لشکر باہد گر لڑ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر ارطغرل نے سلجوقیوں کا ساتھ دیا اور فتح حاصل کی۔ اس امداد کے صلہ میں علاء الدین سلجوقی نے، حکومت باز نطنی کے حدود پر ایک صوبہ ارطغرل کو دیدیا۔ ارطغرل نے یہاں خود مختارانہ حکومت کی طرح ڈال کر اپنی مختصر سلطنت کا نام سلطانوںی رکھا

ارطغرل کے بعد اس کا بیٹا عثمان ۱۲۸۸ء میں تخت نشین ہوا (جس کے نام پر ترکوں کی حکومت کا نام دولت عثمانیہ قرار پایا)۔ اس نے باز نطنی حکومت کے متعدد قلعے کر لئے اور اپنی سلطنت کے حدود کو زیادہ وسیع کر لیا، لیکن "اسکی شہر" بروجو باز نطنی حکومت میں واقع تھا۔ اور عثمان کے صدر مقام سے بالکل ملا ہوا تھا اس کا قبضہ نہ ہوا تھا

اسکی شہر کے ایک گاؤں میں جس کا نام ابرونی تھا۔ ایک فاضل شیخ رہا کرتا تھا جس کا نام "ادب عالی" تھا۔ عثمان بچپن ہی سے اس کے پاس آیا جا کرتا تھا۔ اور اس کی صحبت سے مستفید ہوتا تھا۔ اس شیخ کے ایک لڑکی تھی جس کا نام "مال خاتون" تھا۔ یہ لڑکی نہایت جمیل تھی۔ اور عثمان اس پر فریفتہ ہو چکا تھا۔ کچھ دنوں تک تو اس نے انتظار کیا لیکن جب معاملہ صبر و ضبط کی حدود سے گزر گیا تو مجبوراً اس نے شیخ کو پیغام دیا، لیکن شیخ نے انکار کر دیا۔ اتفاق سے اسی دوران میں امیر اسکی شہر کو بھی اس کے حسن و جمال کا حال معلوم ہوا۔ اور اس نے بھی پیام بھیجا، لیکن شیخ نے اس کو بھی رد کر دیا۔ شیخ اس ڈر سے کہ امیر زیادتی نہ کرے اپنی بیٹی کو لے کر ایک دوسرے سردار کے حدود میں چلا گیا اور اس کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا۔ عثمان بھی اتفاق سے یہیں تھا۔ جب امیر اسکی شہر کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن عثمان نے باہر نکل کر اس کو شکست دی اور بھگا دیا۔ اسکے بعد بھی ایک ماٹہ گزر گیا اور عثمان کی محبت کامیاب ہوئی۔ ایک رات عثمان نے انکے اب دیکھا کہ شیخ کے پاس بیٹھا ہوا ہے کہ ناگماں شیخ کے سینہ سے چاند نے طلوع کیا اور اسکے سینہ میں داخل ہو گیا تھوڑی دیر بعد اسے دیکھا کہ اسکی پیچھے ایک بڑا درخت پیدا ہوا جسکی پھلی ہونی شاخوں کے نیچے جہاں قوقاز پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں اور جڑوں کے دریاے ڈانوب، نیل اور جلد و فرات جاری ہیں۔ اسی درخت کے سایہ میں اسے بہت سی وادیاں، پہاڑیاں اور آبادیاں بھی نظر آئیں جن پر ہلال طلوع کے ہوئے ہر اور چڑیوں کے چھوٹے سے فضا گونج رہی ہے۔ اسے یہ خواب شیخ سے بیان کیا۔ شیخ نے سن کر کچھ دیر تامل کیا اور پھر یہ سوچ کر کہ غالباً یہ تمام ترقیاں عثمان کی اولاد کو حاصل ہونیوالی ہیں اپنی لڑکی کیساتھ اسکی شادی کر دی۔ اس خواب کی یہ تفسیر کس حد تک صحیح ثابت ہوئی اس کا ذکر فضول ہے، کیونکہ آل عثمان کا تمام شرق ادنیٰ پر قابض ہو جانا اور مغرب میں آسٹریا و اطالیہ تک اپنی سلطنت کو وسیع کر لینا تاریخ کا روشن واقعہ ہے جس سے ہر شخص آگاہ ہے۔

کالیڈاس کی شکستہ پراپتیاں و ادب

(۱)

حسن نام غلط نگاہی کا ہویا نہ ہو، عشق عبارت فریب کاری دل سے ہویا نہ ہو لیکن یہ یقینی ہے کہ شاعری نام حسن صحرائی اور مصوری کا جس کے پس منظر کو اگر آپ علیحدہ کر کے دیکھیں تو سوائے موسیقی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ کیونکہ آج بیسویں صدی میں بھی جب کہ علوم و فنون کی کثرت نے ذہن انسانی کی بہت زیادہ صیقل کر دی ہے۔ حسن کی ”کافر ادبیاں“ گو سرحد ادراک کے اندر ہوں مگر الفاظ کے حدود سے بدستور باہر ہیں اور آخر کار مجبوراً ایک شاعر کو اپنے عجز کا اعتراف اس طرح کرنا پڑتا ہے کہ

بیاد شیوہ باست بتاں را کہ نام نیست!

ادبیات مشرقیہ میں تنقید و تاثر و جداگانہ شعبے ہیں۔ جو یقیناً براہِ اصل دور ہیں کیونکہ یہ بہت ممکن ہے کہ ایک نغمہ دیکش کسی کے روح پر رقص پیہم کی کیفیت پیدا کر سکے لیکن یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اوس نغمہ کے تاثر اور اوس کی روح کی تاثر میں جو ربط معنوی ہے اس پر بھی وہ حکیمانہ و فلسفیانہ نظر بھی رکھتا ہو۔

کہ بچیمان دل میں جزد دست ہر چہ بینی بدانکہ منظر اوست

حقیقت یہ ہے کہ کالیڈاس کا کلام جس کا ایک ایک حرف کمال شاعری کا دلکش مرقع ہے اوس کی نسبت ناقداً حیثیت سے کچھ بھی لکنا آسان نہیں ہے واقعہ یہ ہے کہ نغمہ میں اس قدر اہلیت نہیں ہے کہ میں اس قادر الکلام شاعر عظیم پر شانِ شایاں بفرہ پیش کر سکوں اور اس لیے یہ بہت آسان امر ہے کہ اپنی حقیقی بے بضاعتی کا ابتدا میں اعتراف کر لوں۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ اس تہی مانگی کا اعتراف ہی میرے صحت ذوق کا ہر آئینہ ثبوت ہوگا۔

اداے بندگی آوردہ درد بود مرا

وگر نہ ذوق جبین آمدن نہ بود مرا

ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب کائنات کے اکثر حصوں میں غور شدہ علم کی شعاعیں نہ پھیلی تھیں اور ان پر ظلمت و جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکی پھائی ہوئی تھی۔ اوس وقت قدرت نے چند ایسے ممالک بھی منتخب کر لئے تھے۔ جہاں حسن و جمال فلسفہ و تصوف فنون لطیفہ مصوری و موسیقی و نسیات و عمرانیات ادبیات و مذہبیات کی تعلیم رائج تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ

ممالک عرب، یونان، مصر، و ہندوستان تھے۔ یہ دور یونان میں اصنام پرستی کے لئے مشہور ہے۔ ہندوستان میں بھی حسن و جمال کے مظاہرہ سے یہ عمدہ خالی نہیں ہے۔ مصر کے افسانے بھی زبان زدِ خلایق ہیں اور یادش بخیر عرب کے ایامِ جہالت کے بازارِ عکاظ کے میلے آج بھی آپ کو جو حیرت بنائے ہوئے ہیں۔ ”جذبہ حسن و جمال“ واقعہ یہ ہے کہ اس دورِ عشرت کی ہر تاسیس میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ فلسفہ و تصوف بھی حسن و جمال کی تجلیوں سے معرّی نہ تھا۔ خانقاہیں بھی اس کیفیت سے خالی نہ تھیں مصوری و موسیقی تو اودن کا خاص حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ فنون لطیفہ و خطابت کا شعبہ بھی اس حسن و جمال کے مظاہرات کا کچھ کم رہیں منت نہیں تھا۔ اگر یونان میں ہیلتنا کا قیامت سوز حسنِ فتنہ محشر ثابت ہو سکتا تھا۔ تو عرب کی بادِ یثیس لیلائیں اور وادی نیل کی بنات زلیخا غالباً انسانی قلوب..... کو اپنے بے پناہ حسن کا آماجگہ بنا کر صاعقہ فتنہ شکن ثابت ہو کر تھیں۔ بھلا ایسے رنگین عمد میں ہمارا وطن کس طرح پیچھے رہ سکتا تھا۔ لہذا اب آپ کی اس علم پرور جماعت کو اسی دورِ پاستال کے ایک عشرت افزا حیرت انگیز ہوش ربا افسانہ کو اس ہیئت صحبتِ شبی میں سناتا ہوں

ہمارے دوست حکیم عبدالقوی صاحب کا ایمان ہے کہ حسنِ قدرت کی پہلی شان نمود ہے جب حسنِ تخلیق ہو تو اس کی میاںش کے لئے عشق بھی ظاہر ہوا اور ظہورِ عشق کے بعد ہی نظامِ دہر کی جلوہ طرازیوں شروع ہو گئیں۔ حسن نہ ہوتا تو عشق کا پتہ بھی نہ ہوتا اور اگر عشق نہ ہوتا تو کائنات ابی گرا نخواستی سے کبھی بیدار نہ ہوتی۔

پیش از ظہورِ عشق کسی کا نشان نہ تھا
بھا حسنِ جہان کوئی میزبان نہ تھا

عشق کو حسن نے پیدا کیا عشق قدیم نہیں حادث ہے مگر آفرینش کے جملہ عشوہ طرازیوں کے مقابلہ میں قدیم ہے اور بیکراں آب و گل کے سرشت میں داخل ہے یہ جذبہ فطری ہے اور بحر کائنات کے ایک قطرہ ہے اوس کی آغوشِ ناز میں آنکھ کھولی ہے

گندِ حسن کی ہمہ گیر یوں سے کائنات کی کوئی طاقت انکار نہیں کر سکتی حسن میں جاذبیت ہے یا حسن ہی عین جاذبیت ہے بلکہ مفناطیسی کشش ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو یہ مشاہدہ ہے کہ جہاں شمع روشن ہو وہاں پرستار ان حسن خود بخود کھنچ کر چلے آتے ہیں قوموں کے عروج و زوال کی داستان ہوشربا ہو یا نسلوں و ملتوں کے بننے و بگڑنے کی خون آگین تاریخیں ہوں۔ آپ یقین کیجئے حسن و عشق کے تاثرات آپ کو ہر جگہ یکساں کارفرما نظر آئیں گے۔ بلکہ ایسے ہی مواقع افسانہ نگاری کی جان ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس دور میں فرانس سے بہتر افسانہ نگاری کسی دوسرے ملک کی تسلیم نہیں کی جاتی کیونکہ اوس کا پس منظر خونخوری ہے اور اس کی پشت پناہی کے لئے انقلاب فرانس یا فریج ریو و لیوشن بھی موجود ہے

یہ صحیح ہے کہ طرازی حسن کا دائرہ غیر محدود ہے اوس کی جولانگاہ ارض سے سماوات تک نہیں۔ بلکہ عرش تک اوس کی

حکمرانی مسلم ہے آفرینش کا ایک ایک ذرہ اس کے جود مشکلیں میں مقید ہے بس یہ کیوں نہ کہا جائے کہ قصہ مختصر نظام کائنات کا انحصار حُسن ہی پر ہے۔

یہ حُسن کی کرشمہ سازیاں تھیں جس نے روز الست ہی سے آزاد معصوم ارواح کے حلقوم میں طوق عبودیت ڈال دیا۔ جو ابھی قید آب و گل میں بھی نہ آئی تھیں۔ کیا اس حقیقت سے بھی انکار ممکن ہے کہ حُسن ہی کی جلوہ آرائیاں تھیں جس نے ایک نادیدہ مجسمہ حُسن کو خواہ آپ اوس کو مذہبی لغات میں کچھ ہی کیوں نہ کہئے مسجودِ خلاق بنا دیا

قول فیصل یہ ہے کہ حُسن ازل سے ہے اور ابد تک رہیگا۔ نیستت میں بھی حُسن تھا۔ اور ہستت میں بھی حُسن ہے اور فنا میں بھی حُسن جلوہ گر رہے گا

ادبیات مشرقیہ میں: "بدیشی" پر ستار ان حُسن کے دلی تاثرات کی صحیح تصویر کھینچنا مشکل ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ادبیات شرقیہ ہو یا غربیہ اس کو پڑھا جائے تو اوس کا ایک ایک صفحہ حُسن و عشق کی گل کاریوں سے مزین ہو لیکن اس بارگاہ "نادونیا" کی نقابت کا شرف محض ایک شاعر کو حاصل ہو سکتا ہے۔ عرب کے پتے ہوئے میدان میں اگر یہ صدا سنائی دیتی ہے کہ

اَلَا مِنْ الْعَشْقِ وَحَالَاتِهِ

اَحْرَقَ قَلْبِي بِجِوَارِ اَتِهِ

تو "تجلی گاہ یزدان" سے یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ

دلم بسوخت تنم سوخت استخوانم سوخت

تمام سوختم و ذوق سوختن باقی است

تو گنگا جمنائے ساحلوں پر بیٹھ کر چاندنی راتوں میں بانسری بجاتے ہوئے آپ نے اکثر یہ دل و جگر جلا دینے والا نغمہ بھی

سنا ہوگا کہ

مورے ہر دے میں لاگی آگ پریم کی

غرض کہ حُسن و عشق کی عشوہ طرازیوں سے کوئی شے خالی نہیں ہے اور آج کی بھگت میں اسی سے متعلق ایک حیرت انگیز

واقعہ سناتا ہوں

دنیا جس قدر ترقی کرتی جائے گی اسی حد تک عہد اصنام کے قادر الکلام شاعر کالیڈاس کی عظمت میں اضافہ ہوتا جائیگا وہ یقیناً زمانہ قدیم کا ایک بہترین شاعر ہے۔ اُس نے شگفتگی کا ڈرامہ لکھا۔ اور اس صہبائے کُن کوئے ساغر میں ایسی دلکشی کے ساتھ پیش کیا کہ لوگ متحیر ہو کر رہ گئے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ شگفتگی کا ڈرامہ آریہ ورت کے ادبیات میں ایک شاداب گلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جس قدر اوس کی تعریف و توصیف کی جائے وہ کم ہے۔ جس عہدہ پیرائے میں کالیڈاس نے آئین دلنوازی پیش کئے ہیں۔ اون کا مغربی ادبیات میں جگہ جو باوجود تحقیق کے پتہ نہیں ملتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ المآنی فلسفی گئے چیخ اٹھا کہ۔

”سال توکی کلبان اختتام سال کے یوے اور وہ تمام چیزیں جو غذا کے روح ہو سکتی ہیں یا زبان کو لذت دینے والی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ارض و سما میں جو کچھ ہے وہ سب تو نے ایک نام میں جمع کر دیا ہے اور اے شگفتگی! تیرا نام زبان پر آئے ہی وہ نام نعمتیں مل جاتی ہیں“

کیا ادبی دنیا کا یہ افسوس ناگ ساتھ نہیں ہے کہ آج تک بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کالیڈاس کہاں پیدا ہوا۔ اور کب اوس نے اس عالم فانی کو چھوڑا اور کب اوس نے یہ ڈرامہ لکھا۔ آیا کالیڈاس ہی وہ خوش نصیب شاعر ہے جو اس دلفریب نرہمت آفریں۔ جذبات خواہیدہ کو بیدار کرنے والے شاہ کار ڈرامہ کا قادر الکمال مصنف بے ہمتا ہے ؟ خود اس شاعر اعظم کی شخصیت ادبی دنیا کے لئے ایک معرہ ہے، ایک راز ہے۔ کالیڈاس خود اس درجہ سے تیار ہے کہ کسی تصنیف میں بھی اوس نے اپنا نسب نامہ یا شاہانہ سر پرستی کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ یہ بھی مشتبہ ہے کہ آیا کوئی ایسا ادبی مجمع جس کو ”نورتن“ کہتے ہیں راجہ بکرماجیت کے عہد زریں میں پایا جاتا تھا یا نہیں۔ اور یہ مسئلہ بھی محتاج تحقیق ہے کہ کہیں راجہ بکرماجیت راجہ بھوج کا دوسرا نام تو نہیں ہے۔ اس وقت کالیڈاس کی تصانیف کی تعداد جو ایک معتبر ذریعہ سے معلوم ہوئی ہے ۱۴ تک پہنچتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پہلی صدی (ق۔م) سے لے کر ساتویں صدی عیسوی تک کم از کم تین شاعر اسی نام کے گزرے ہیں۔ اور جہاں تک میں نے علمائے مہجر سے اس مسئلہ میں گفت و شنید کی اون کا خیال ہے کہ ان تینوں شاعروں کی تصانیف بھی ان ۱۴ نسخوں میں شامل ہیں۔ بہر حال کالیڈاس کی تصانیف میں تین ڈرامے اور تین مسلسل نظمیں بہت مشہور ہیں۔ جن میں سے ایک شگفتگی بھی ہے۔ کالیڈاس کس زمانہ میں پایا جاتا تھا تحقیق کے اس حصہ کو مضمون سے علیحدہ کر کے مختصراً آنا ظاہر کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ کالیڈاس یقیناً حضرت مسیح سے قبل داد سخن دے رہا تھا

کالیڈاس کے حالات بہت کچھ پردہ خفا میں ہیں لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عہد میں عمرانی اور تاریخی حالت آریہ ورت کی کیا تھی۔ جس کا اثر اوس کی شاعری پر بھی لازماً پڑا ہوگا۔ کالیڈاس کی تصانیف سے تاریخی حالات کا بہت

۱۔ کالیڈاس کی قبر سیلون میں سمندر کے کنارہ ایک پہاڑی پر تھی۔ جس کا اب پتہ نہیں ملتا۔ بردیسر نورٹر۔ ایک ساگر ص ۳۱

۲۔ قاصد سماج۔ بالوگپت سرن داس ایڈیٹر کیرٹ۔ سہیل۔ ج ۱۔ پیش ۳۔ مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ

کم پتہ چلتا ہے۔ شمالی ہند کے مشرقی حصہ میں سورج بنسی خاندان حکمران تھا۔ مغربی حصہ میں چندر بنسی حکومت تھی۔ اور وسط ہند میں ریاست مگدہ شباب پر تھی۔ جس میں مالوہ بھی شامل تھا۔ لیکن باہم جنگ و جدال کا بازار گرم نہ تھا۔ ورنہ کالیداس کو اس قدر سیر و سیاحت کا موقع نہ ملتا۔ راجگان ہند کے دربار میں ایشیائی ممالک کے حسب دستور علاوہ وزراء سلطنت اور مشیران مملکت کے دیگر ارباب علم و ہنر کو بھی شرف باریابی بخشا جاتا تھا۔ حکمران بالعموم عادل، رعیت نواز، رحمدل، فیاض طبع اور علم دوست تھے۔ رعایا فارغ البال۔ بلند عرصہ اور علم و ہنر کی شائق تھی۔ مگر نہ تجارت کی گرم بازاری تھی اور نہ ادس کی ضرورت۔ مذہبی حیثیت سے نزاکار پر ماتما کی قوت اہتمام کو شیو کی شکل میں محسوس کیا جاتا تھا۔ جا بجا شیو پرستی ہوتی تھی۔ اور اسی جذبہ کے تحت اخلاقی و عمرانی ڈرامہ کھیلے جاتے تھے۔ بود و باش کے طریقے بہت دلچسپ تھے۔ رہبانیت کا دور دورہ تھا۔ دور دراز جنگلوں میں نفس کشی اور علاقہ دینوی سے قطع تعلق کی تعلیم بالعموم دی جاتی تھی۔ جنگلوں میں ستار۔ مردنگ۔ جل ترنگ۔ بالنسری اون کی دل بستگی کے سامان تھے۔ شہری نفیس مکانات میں رہتے تھے۔ موسم گرما میں پیش سے محفوظ رہنے کے لیے پٹھائی غاروں اور دریائی ساحلوں اور شاداب مہزاروں میں رنگ رلیاں مناتے تھے۔ اون کے طرز بود و باش میں سادگی کی خصوصیت نمایاں تھیں۔ شوق تریٹن۔ مصنوعی دستکاریوں کا محتاج نہ تھا۔ عورتوں میں شوق آرایش بہت زیادہ تھا۔ گو شادی کی تعداد محدود نہ تھی مگر کثرت بھی نہ تھی۔ شوہر کے خلوص کی بنا پر سوکنوں میں رشک و حسد پیدا نہ ہوتا تھا۔ اور جب ہوتا تھا تو انجام خوفناک ہوتا تھا۔ طلاق راج نہ تھا۔ سستی کے واقعات سے بچتے تھے۔ چنانچہ ہندی شاعری ان بُروگوں سے مالا مال ہے

زرعی حالت کے لحاظ سے خشک سالی کا پتہ خال خال چلتا ہے۔ آبادی کم تھی۔ وسائل درآمد و برآمد عمقا تھے۔ اس لہو دیہاتوں اور شہروں میں سود سے فائدہ اٹھانے والے مہاجن مقصود تھے۔ زراعت پیشہ افراد میں زمیندار و کاشتکار کی تخصیص نہ تھی۔ تعلیم والدین۔ اور ادھیایک کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ گوشہروں میں ابتدائی مدرسوں (پاٹ شالوں) کا رواج تھا۔ وید اور اپنیشد کی تعلیم کم تھی

شاشتر۔ پوران۔ رامائن۔ مہابھارت۔ اور گیتا کی تعلیم کا رواج زیادہ ہو گیا تھا۔ کھٹاکا دستور شایع ہو رہا تھا۔ فلکیات سے زیادہ دلچسپی شروع ہو گئی تھی۔ اور ادویات کی بھی تحقیقات کی جاتی تھی۔ لسانیات کے متعلق خاصا لٹریچر مہیا کیا گیا تھا۔ ادبیات میں نظم کا حصہ بلند تھا۔ اور اس صنف میں شعرا کی زیادہ توجہ تھی۔ تاریخ کا عنصر بہت کم تھا۔ لیکن فنون لطیفہ کا ستارہ عروج پر تھا۔ حسن کی نیایش ہر رنگ میں جلوہ گر تھی

یہاں پر یہ بھی واضح کر دینا غالباً نامناسب تصور نہ کیا جائے گا۔ کہ ہندوستان فن تخیل نگاری (ڈرامہ) میں کسی دوسرے ملک کا رہن منت نہیں ہے۔ چنانچہ انسا یکلویڈ یا بریٹانیکا کا فاضل مقالہ نگار لکھتا ہے کہ "ہندوستان میں یہ فن اُسوقت بھی پایا جاتا تھا۔ جب کسی بیرونی اثر کا خیال بھی ناممکن تھا"

مشہور المان فلسفی شیگل نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ

”ہندوستانوں میں جبکی عمرانی اور ذہنی تہذیب زمانہ لامعلوم سے چلی آتی ہے۔ ڈرامہ کا عنصر اس وقت بھی موجود تھا۔ جب کسی بیرونی

ملک سے متاثر ہونے کا خیال و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا“

کالیداس کی عظمت اس آخری صداقت تمامہ کی روشنی میں بہت ارفع ہو جاتی ہے کیونکہ شینگل کالیداس کے مداحین کی فرست میں گئے کے بعد دوسرا نمبر رکھتا ہے۔ شینگل نے اپنی بنیظیر کتاب میں شکنتلا پر بھی عمدہ تبصرہ کیا ہے مشرق مغرب میں شکنتلا کی ستایش و تنقید میں اس قدر کافی لکھا گیا ہے کہ اس سے بار بار دُھرا نا بے سود ہے لیکن پھر بھی چند مخصوص ناقدین کے تبصرہ کو کسی طریح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سروکیم مونیہ جو مشہور ناقد گراہے اور مسکا صداقت نامہ ملاحظہ کیجئے۔۔۔ وہ شکنتلا کے متعلق کیا خیال رکھتا ہے کہ :-

” کالیداس نے جس قدر سہمی آخری پرواز محفل - گرجوشی - شوخی طبع - قلب انسانی سے شناسائی اور اس کے نہایت

پاکیزہ اور نازک جذبات کی دقیقہ شناسی اور اونچی مستفاد خواہشات کی کشمکش سے واقفیت کا اظہار شکنتلا میں کیا ہے اس قدر

کسی دوسرے کی تصنیف میں نہیں پایا جاتا۔ فقہ مختصر محفل شکنتلا کی تصنیف ہی کالیداس کو ہندوستان کا شیکسپیر بنا سکتی ہے“

سنسکرت کا اشلوک اب بھی اس دسی ہوئے کے لئے مشہور نام ہے :-

” عشقیہ نظموں میں ڈرامہ - اور ڈراموں میں شکنتلا - اور شکنتلا میں جو تھا ایک شیرینی اور لطف کا مخزن ہے اور اس میں

بھی آخری چار اشلوک انتہائی خوبی سے سمور ہیں“

گمار لا شاعر نے بہت لطیف پیرایہ میں کالیداس کے کمال کا اعتراف کیا ہے

کالیداس نے انسان اور پری اور دیوی کے حسن کی توصیف جس طریقہ سے کی ہے گو اپنے دور پر اپنے طبقہ کے

اعتبار سے ہر ایک بے نظیر ہے لیکن اگر کسی ایک کا مقابلہ دوسرے سے کیا جائے تو یقیناً ایک قسم کا خوشگوار اختلاف محسوس

ہوتا ہے اور دراصل یہی اوس کا کمال ہے۔ کیونکہ یہ بہت مشکل امر کہ باوجودیکہ ہر ایک کو بطور خود منہائے حسن پر پہنچا دیا

ہے۔ لیکن پھر بھی عورت عورت ہی معلوم ہوتی ہے اور پری پری ہے اور دیوی دیوی ہے اوس کا بڑا کمال یہ ہے۔ کہ خواہ

اُس نے اجمال سے کام لیا ہے خواہ تفصیل سے خواہ نثر سے خواہ تشبیہ سے لیکن ہر حالت میں جو چھ بھی خواہ فلم کیا ہے اُس

سے بہت زیادہ پڑھنے والوں کی قوت تخیل کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور اس لئے بعینہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی نے حسن

جستہ کی تصویر عالم مثال سے لاکر عالم شہود میں رکھ دی ہے یا لوں کیوں نہ کہا جائے کہ اس میں ہر شخص کو اپنی ہی شبیہ ذہنی

یا مثالیہ حسن کا جلوہ نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ذہن انسانی سے فضول خیالات خوشگن کا جلوہ نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے

کہ اگر ذہن انسانی سے فضول خیالات خوش کن امیدیں غلط نظر یہ ذہنی تصورات اور اون کے مثل دیگر اشیا خارج کرنا

جائیں تو کون شک کر سکتا ہے کہ بہت سے انسانوں کے دماغ محفل کھو کھلے ہو کر غم اور افسردگی سے لبریز اور خود اپنے کو ناگرو

کرنے والی چیز بن کر رہ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کالیداس کے نقوش کس اور ہمیشہ غیر فطری حیثیت سے ہمارے دماغ

پرستولی ہو کر رہا ہے۔ اور یہ قادر الکلام شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ غم اور افسردگی سے اگر لبریز ہے تو دوسری جانب اسپیکورین فلسفہ کا بھی قائل ہے اگر وہ بچوں کی جماعت میں ہے تو وہ معصومانہ خوش فعلیاں کرتا ہے کہ آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے اور سنجیدہ افراد میں اس درجہ متین ہو جا یا کرتا ہے کہ دھوکا ہوتا ہے کہ واقعی یہی کالیداس ہے۔ خیام کا فلسفہ عیش بھی اوس کے کلام میں آپ کو ملیگا۔ لیکن مذہبی احترام اور اخلاقیات کے حدود سے ایک پرچ نہیں ہلتا۔ یہی وہ کلام ہے جو دوسرے کو نصیب نہیں ہے۔ نقاش کو حسن کی تصویر کھینچنے میں کسی مادی نمونے کی ضرورت ہوتی ہے گو کہ اس کو آئینی مثالیہ کے مطابق بنانے کے لئے بہت کچھ رنگ و روغن کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن شاعر کا میدان اس سے بہت زیادہ وسیع ہے اوس کو ضد و خال کی مصوری کے لئے کسی مادی نمونہ کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے محسوسات ذہنی سے یہ کام لینے کا عادی ہوتا ہے بشرطیکہ وہ شاعر ہو اور انسان بھی! اہل یونان نے جو کمال فنون لطیفہ میں پیدا کیا وہ محتاج تصریح نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کو آغاز ہی میں تو صیغہ حسن کی طریقہ داخلی تک آسانی پیدا کرنے میں کامیابی ہوئی ہو مرنے ہی لسن کی تصویر پیش کی ہے جس کے عالم سوز حسن نے تمام دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اور یورپ و ایشیا کو دس سال تک جنگ میں مصروف رکھا تھا۔ لطافت بیان اور نزاکت خیال تو یونانیوں کا حصہ تھا۔ وہ کسی اور قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ البتہ یہ کمال سنسکرت کے شعرا میں ماکوی کالیداس کو حاصل ہے کہ جہاں کہیں اوس کو "حسن و جمال" کے اظہار کا موقع ملا ہے اوس نے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے اور اس نے حسن و جمال کی ایسی زندہ اور دلکش تصاویر پیش کی ہیں کہ بھلانے سے بھی ذہن انسانی سے فراموش نہیں ہو سکتیں کالیداس "گھر کی رولٹی" ایک ہنگامہ پر موقوف نہیں تصور کرتا بلکہ وہ فلسفی ہوم کی طرح اس کا کوشاں تھا کہ وہ مسرت و شادمانی کو تمام خارجی اشیا سے آزاد بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرے۔ وہ بیک وقت واعظ و مجلس بھی ہے اور رند ہے پرست بھی وہ خیام کے الفاظ میں اپنی مے نوشی کو چھپاتا نہیں ہے بلکہ دنیا کے سامنے پیش کر کے لوگوں کو بھی مے نوشی کی دعوت دنانہ دیتا ہے۔ خیام نے کیا خوب کہا ہے کہ

اُفتادہ مرا پائے دستِ کار سے بنا ظلم زہی کند ملامت یارے ؟
اے کاش کہ ہر گناہ مستی دادے تامن ابجاں ندیدے ہشیارے

اور کالیداس بھی یہی کہتا ہے کہ "اگر میں حسن پرست ہوں تو دنیا جگہ کیوں مطعون کرتی ہے اے کاش "ہر طاعت" شمار آلود ہو جائے۔ تاکہ حمام کائنات میں جگہ جگہ جوہر کے شاہدان پاک نظر کے سوا کوئی دوسرا دکھائی نہ دے۔ کالیداس کی نگاہ خیام کے راستہ سے ہٹ کر معرفت تک بھی پہنچی ہے اور اسی لئے زیادہ آزادی سے مذہب کے خلافت کچھ کہنے کی کالیداس کی ہمت نہ ہوئی

بہین (مالوہ) کی مہن برستی دار الحکومت میں یہ عدیم المثال شاعر بے نظیر تمثیل نگار حضرت مسیح سے ایک صدی قبل

مہاراجہ بکراجیت کے عہد ہمایونی میں شکسیر۔ ہومر۔ چائرس۔ بن جانس۔ فردوسی۔ امرار القیس۔ علقمہ۔ ابنس۔ بالفہ و عمر کے کمالات دکھلا کر بقائے دوام کی مہر مقبولیت محض اپنے نام کے لئے وقت و ثبوت کر رہا تھا۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ الیڈ (Homer's Illiad) وسیع معلقات کی طرح کالیڈاس کی شاعرانہ حکمت و موعظت شب و روز ترقی کر رہی ہے۔ اظہار حیات کی نزاکت اور تخیل بلند پر وازی ادس کا حصہ خاص ہے۔ اور تاثرات طبی کو عیاں کرنے میں کالیڈاس نے جو کمال پیش کیا ہے۔ ادس کو اب تک سنسکرت میں اوس سے بہتر کوئی دوسرا شاعر مظاہرات حسن و عشق کی حیثیت سے پیش نہ کر سکا۔ وہ محاکات کا بادشاہ تھا۔ جو تصویر وہ اپنے موقلم سے پیش کرتا تھا۔ وہ آپ اپنی نظر ہوتی تھی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ سنگتلا کو ادبیات (آریہ) ہندی کے شاداب سدا بہار چین میں حسین و جمیل پھول کی حیثیت حاصل ہے ” اگر زندہ جاوید شاعر کو اس فن خاص (تمثیل نگاری) کا قلب تصور کیا جائے تو سنگتلا یقیناً اس قلب کا درد۔ متا۔ آرد و اور خواب ہو گی “ اس ڈرامہ کا ترجمہ انگریزی، فارسی۔ المانی، فرانسیسی۔ بنگالی۔ ہندی اور اردو میں ہو چکا ہے انگریزی میں عدالت عالیہ کلکتہ کے فاضل جسٹس سر ولیم جونز (ہفت زبان) نے (۱۸۰۹ء) پیش کیا اور نظم کا جامہ پروفیسر ولیم منرون نے پہنایا۔ المانی ترجمہ شیکل بردران و گئے ہرڈر کا رہن منت ہے۔ ہندی میں اچھنشی سنگھ (۱۸۲۶-۹۵) سابق ڈپٹی کلکٹر مالک متحدہ نے ۱۸۶۲ء میں غالباً اٹاواہ سے شائع کیا جگتھ میں سر نیگور نے ” اپنا یا “ اردو میں جہانگ میں نے تحقیقات کی ہے محض تین نسخہ شائع ہوئے ہیں۔ جس میں بحیثیت قدامت میر کاظم علی جوآن کا آزاد ترجمہ نثر بہت وقیع ہے جوآن کا اصلی وطن عروس البلاد دہلی تھا۔ لیکن وہ لکھنؤ آیا اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ اور لکھنؤ سے وہ کلکتہ کے مدرسہ (فورٹ ولیم کالج) کے لئے بحیثیت مترجم و مددگار کے ڈاکٹر جان گلگراہٹ صدر مدرس (پرنسپل) کی خواہش پر گیا۔ اور ڈاکٹر کی حسب خواہش اس نے ۱۸۲۶ء میں سنگتلا کا ڈرامہ ترجمہ شروع کیا جو ۱۸۲۸ء میں چار سال کی محنت مشاقہ کے بعد مکمل ہوا۔ یہ ترجمہ للوجی لال کب بولتے تھے اور جوآن اردو میں لکھتے جاتے تھے۔ یہ ڈرامہ فرخ سیر بادشاہ کے عہد میں سنسکرت سے برج بھاشا میں بھی منتقل ہو چکا تھا۔ فرخ سیر نے نواز کیشور کو حکم دیا کہ سنسکرت سے شکوتلا کو برج بھاشا میں منتقل کرو۔ چنانچہ کب و دہرے یہ ترجمہ للوجی کی شرکت سے ریختہ میں ہوا۔ یہ اڈیشن ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا۔ اور رومن حروف میں چھاپا گیا۔ اور نصاب میں شامل ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اشاعت خاطر خواہ نہ ہو سکی۔ ۱۸۲۸ء میں علم دوست پارسی کریم بہمن ڈوسا بھائی منشی نے اسے لیتھو میں مرزا حسن کاشانی کے مطبع سے شائع کیا۔ لیکن اس کو بھی عام مقبولیت حاصل نہ ہوئی حتیٰ کہ برنی صاحب کا خیال یہ ہے کہ سیر المصنفین سے لائق مرتب کو بھی اس کی زیارت نصیب نہ ہوئی ادس کا ایک نسخہ برنی صاحب کے پاس ہے اور وہ مقدمہ کے ساتھ شائع کر نوالے ہیں لیکن اس خیال است — دیکھئے برنی صاحب کیا کیا

لے سید حسن صاحب برنی بی۔ ای۔ ال۔ ال۔ بی (علیگ) وکیل ہائیکورٹ۔ یہ اشاعت کے خلاف ہوگا اگر میں برنی صاحب کا شکر یہ نہ ادا کروں مجھ کو آپ کے مضمون سے بہت فہمی

وعدے پورے کرتے ہیں۔ ایک منظوم ترجمہ رشک گلزار کے نام۔ مولوی سید محمد تقی صاحب نے نو لکھنؤ مطبع سے شائع کیا۔ غالباً اس امر کے اظہار میں کوئی ہرج نہیں ہے کہ ان صاحب نے قصہ کو بڑی خوبصورتی سے نظم کیا لیکن انھوں نے قدیم سنت قائم رکھتے ہوئے ہر ایک فصل میں بہار ساغر و مینا کا تذکرہ پھیرا ہے اور وہ اس کے لئے مجبور بھی تھے کیوں کہ وہ زمانہ ہی ایسا تھا اور اس جہاں میں سب عربیاں ہی نظر آ رہے تھے۔ دقت یہ ہو گئی ہے کہ آج ہمارے لئے یہ مسئلہ بہت مشکل ہے کہ آیا آئندہ ایرانی ہے یا خالص ہندی۔ اس ترجمہ میں نجفی عنصر (رنگ) اس درجہ گہرا ہے کہ میر حسن و گلزار نسیم سے اس کا امتیاز مشکل ہے "مثنویات" کے تحت خواہ اس کا درجہ کسی قدر ارفع کیوں نہ ہو لیکن مقامی معاشرت (آریائی تہذیب) (Aryan Civilization) کی عدم واقفیت نے مصنف کی کامیابیوں پر یاتی پھیر دیا ہے اور ہم اس کو کوئی درجہ ادبی حیثیت سے نہیں دے سکتے۔ عرصہ ہوا زمانہ کے مقبول مقالہ نگار مسٹر اقبال دریا شہر ہنگامی نے اس تمثیل کو منظوم حیثیت سے دنیا کے ادب میں پیش کیا۔ اور یہ نہایت درجہ مسرت سے کہا جاسکتا ہے کہ جو نقائص رشک گلزار میں تھے اونکی اصلاح اس میں ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سحر اپنے ابائی وطنی مراسم سے واقفیت تار رکھتے تھے انھوں نے قصہ (اصلی) کی "وطنیت" کو بدرجہ اتم قائم رکھا۔ اون کے کردار، اون کے مسائل، اون کے ادب، اون کے اخلاق، اون کے ادب صحبت و مراسم و مدنیت خالص ہندی نژاد ہیں اور مسٹر نگم کا یہ خیال ایک بڑی حد تک بالکل صحیح ہے کہ بلاغت اور روانی بیان میں سحر کی مثنوی نیرنگ سحر، گلزار نسیم سے بہت کچھ مشابہت رکھتی ہے۔ سحر ہنگامی محض رسماً سما کوئی کے رہیں منت ہیں۔ ورنہ نظر زبان کلیاً اون کا ہے گو میں اس سے اتفاق نہیں کرتا کہ انھوں نے شعر کی مجبوری سے قصہ میں بھی انحراف کیا ہے اگر یہ نہ کرتے اور بجائے اس کے جدید شاہ راہ پر اس کو پیش کرتے تو میرے خیال میں اس کا حسن اور چمک اٹھتا میرا مطلب تو آئی و محو کی قدیم پابندی سے آزادی تھا! لیکن پھر بھی قصہ کی نوعیت اور دلچسپی میں کوئی فرق نہیں ہے

کالیڈاس کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ حسب ذیل امور پر غور کر لیا جائے :-

- (۱) سنسکرت کے قدیم شعرا زیادہ تر عزت نشین ہوتے تھے
 - (۲) لطف سخن اصول مذہب تاریخ اور ادبیات کو اس طریقہ پر ملایا گیا گویا وہ کسی سماوی ہستی کے چار روشن موتی ہیں تاریخ کو اصول مذہب کی تائید سے استوار کیا گیا۔ وقت و تفصیل سے کوئی علامہ نہ تھا
 - (۳) آریہ ورتہ کی قناعت پسندی اور رُجھان روحانی نے۔ اون کی ضروریات کو ہندوستان کی قدرتی پیداوار تک محدود رکھا۔ اسی لئے استعارات تشبیہات رموز معرفت اور کرشمائے قدرت سے مالا مال ہیں
- عام خیال ہے کہ کالیڈاس آزاد منش اور شوخ طبع تھے۔ اس بحث پر واقعہ یہ ہے کہ بہت کچھ دونوں جانب کہا جاسکتا ہے۔ کالیڈاس کا کلام حسن و جمال کا ایسا نقش مرقع ہے لیکن اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو جس تصویر میں کالیڈاس کے قلم نے حسن و عشق کی کوئی رنگین داستان صفحات جمیل پر پیش کی ہے۔ اس مرقع کے اصلی جذبہ خال پاکیزگی۔ طہارت۔ توحید پرستی

اور معرفت کے وہ لافانی نقوش ہیں جن کی تعریف دانا بان فرنگ کو بھی مجبوراً کرنا پڑی !

کسی کا خیال ہے کہ حُسن میں کشش لازمی اور عشق میں شورش لابدی۔ اگر ایک عطیہ الہی ہے تو دوسرا خاصہ طبع انسانی اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ دونوں ناگزیر ہیں ! — اس کو واپس کر سکتے ہیں اور نہ اس کو ترک۔ مغربی عینک سے اگر نہ دیکھا جائے تو اس "حُسن" کا سلف معلوم ہوتا ہے بائرن برسرِ دُھننے والے۔ خدا کی شانِ مشرقی شوخیوں کو اہتدال کہہ کر سامنے سے ہٹا دیا کرتے ہیں۔ بہر حال یہ مسئلہ بہت بحث طلب ہے اس وقت ہم کو کالیداس کی خصوصیات کلام پیش کرنا ہے اور اس کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ ہندوستان میں اس کی کن تصانیف کو مقبولیت عامہ کا خلعت عطا ہوا ہے۔ کالیداس کی شاعری مرکب ہے ان اجزائے ترکیبی سے :-

- (۱) صفائی۔ سادگی۔ نزاکت اور پاکیزگی کالیداس کی شاعری کی روح رواں ہے
- (۲) تصنع اور طویل مرکبات پامال محاورات ذومنین الفاظ سے کالیداس کا کلام پاک ہے
- (۳) روانی۔ سلاست۔ موزونیت پر معنی اور دلغریب تشبیہات سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہیں
- (۴) معنی خیز اساطیر۔ اخلاق رموز افسانوں اور حسب حال قابل تقلید کرداروں کی کوئی کمی کالیداس کے یہاں نہ ملیگی
- (۵) تزکیہ نفس و تزکیہ باطن کی فضا میں سوزش عشق اور شوخی حُسن کو روحانیت کی معراج پر پہنچانا۔ کالیداس کی

عدیم المثال خصوصیت ہے

- (۶) لوکل کلر (مقامی رنگ) کالیداس کے کلام کا نمایاں عنصر ہے۔ ہمالہ کی برفاتی چوٹیاں معدنیات سے پر اور جڑی بوٹی سے لدے ہوئے شاداب مرغزار اور پُر سکون پہاڑ۔ راج ہنس آہوئے رم خوردہ۔ طاؤس زرنگار۔ مہر و مہ۔ سیارگان فلکی۔ مان سرور جھیل کے عرفانی نظاروں کو پیش کرنا ہندوستان کے فردوسی (کالیداس) ہی کا کام تھا

آدم برسرِ مطلب۔ اوس کے شاہکار ڈرامہ شکنتلا کو ملاحظہ کیجئے، ایک ایک لفظ میں ندرت کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ ملاحظہ ہو شکنتلا ایک چمپا کے درخت کے پاس کھڑی ہے اوس کی سبلی کہتی ہے۔ شکنتلا ! تو ایسی نظر آتی ہے کہ گویا اس درخت پر ایک بیل بیٹی ہے۔ سہیلیوں کی چھیر چھاڑ کو سنکر منجلا دشیت اس تشبیہ کی اپنے دل میں وضاحت کرتا ہے۔ اور اس وضاحت کو کالیداس اس طرح پیش کرتا ہے

برگ ملام لعلیں لب ہیں نازک شافیں بازو ہیں جو بن سے مہور عجب اثمار بوانی دلجو ہیں

لہ بہ ترجمہ جگو بابو گچت سرن ماس صاحب قاصد صاحب سے دستیاب ہوا ہے جو ایندہ اوراق میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مرتب

آبیاری کرتے کرتے شکنتلا تھک گئی ہے اور خانقاہ کو واپس جانا چاہتی ہے اوس کی سہیلی روکتی ہے۔ اور سے عشق سے
دہوش و شیت شکنتلا کی دکاوت کرتا ہے سے

جھکے کندھے کلسوں کی آفت کے مارے ہتھیلی ہوئیں لال زحمت کے مارے
بلا وجہ یہ سینہ ابھرا نہیں ہے ہے "پھولی ہوئی" سانس محبت کے مارے
کو پھول بھی رنج پر ہلتا نہیں ہے یہ چپکا ہے عرق مشقت کے مارے
پریشان ہوئی کھل کے جب جھدگیں تولی کلفت کے مارے

شکنتلا کو سوز عشق پریشان کر رہا ہے۔ تمام سہیلیاں اوس کی حالت زار دیکھ کر متفکر ہیں راجہ و شیت بھی دل گرفتہ
دڑختوں کی آڑ سے شکنتلا کے مرض کی تشخیص کرتا ہے سے

لیپ سینہ پہ کیا خس کمانے کو جلن ہاتھ میں ڈائے کل نال کے ڈھیٹے کلن
رخیہ ہی سوز دروں گرہ نما پاں کچھ کچھ دلفریبی تو وہی ہو مری تر چھی جتون
فصل گرما کی تپش عشق کی سوزش کیا ہو وہ بکٹائے یہ بنائے گل تر کا جو بن
دیکھو ادسکی پھین دل کو یقین آتا ہے اسکے جی کو بھی لگی ہو کسی دلبر کی لگن

سہیلیوں میں مشورہ ہوتا ہے اور برگ نیلو فر پر شکنتلا پریم پترا لکھتی ہے سے
کیا جانوں ترے دلگو میں سے یار خوشحال مجکو تو کرہا ہو پریشان ترا خیال
سوز دروں جلاتا ہے فرقت میں آمدن دل میں ہو شوق وصل نظر میں ترا جمال

راجہ و شیت کی رانی ہنس یاد کا بازار حسن سرد پڑنے لگا تو ہمارا راجہ کا التفات بسومتی کی جانب بڑھ گیا تو ہنس یاد
سرد خانہ سے ایک شکایتی نغمہ بلند کرتی ہے سے

ایم پر لیں محل نو۔ زنبور ناداں خود غرض ام پر جب مول تھا رہتی تھی حاضر داما
جب نظر آنکول صورت دکھائی چھوڑ دی تھی ہی شرط وفا! ادبے مردت بے وفا

دربار سارشی کی بددعا رنگ لائی۔ و شیت نے شکنتلا کو فراموش کر دیا۔ منکا اوس کو لے کر اڑ گئی۔ انگشتری
ملتے ہی طلسم شکست ہوا۔ راجہ کو شکنتلا یاد آئی جوش محبت عود کر آیا تصاویر دیکھتا اور دل بہلاتا۔ اس کیفیت کو کالیداس

یوں پیش کرتا ہے

یا تو وہ دن تھا کہ بہر وصل تھی وہ بیقرار
 آج وہ دن ہو کہ اس کا کچھ تپا چلتا نہیں
 اور میں نے دیدیا تھا اک جواب لنگار
 تاک رہا ہوں کب سے اس تصور کو دیوانہ وار
 اس فضا سے چشمہ آب بقا کو چھوڑ کر
 ہورہا ہوں اس سراب بڑھتی پرستار

ایک تصویر اور بھی نہایت دل فریب عنوان سے فردوسی ہند نے پیش کی ہے۔ راجہ اپنے آتم جیوس مانٹھو کے ساتھ تصاویر سے دل بہلا رہا ہے آخر میں یہ خیال آیا کہ ایک تصویر اس موقع میں اور ہونا چاہئے۔ لیکن اس کو غلام نے پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کالیداس کی عقل نے ایک لطیف جدت سے کام لیا۔ اور دونوں کو ہرن اور ہرنی کی صورت میں دکھلا دیا ہے۔ اور ان کے راز و نیاز کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ ہرنی اپنے بائیں آنکھ کی غارش کی شدت کو دور کرنے کیلئے ہرن کے سینگے لگاتی ہے۔ اس حصہ میں جس منظر کو وحشیت دکھانا چاہتا ہے وہ دراصل دسیت و شکنتلا کی ملاقات ہے اسے سینے سے

ایک نظر اور بھی ہمیں دکھاؤں ہم نشیں
 شوخی و ناز و ادا سے موجزن ہو مالتنی
 کچھ نہ کچھ آفریندے تو ان دن انگلیں کو آس
 ہندسوں کے جوڑے کنار و نیل کھڑے ہو بہر اس
 دونوں جانب امن کو ہمالہ کی فضا
 جڑے ہوئے بھڑکے تیلوں پہ گھاس
 ایک رخسار کی شاخ ہوں سایہ فلک
 سوکھتا ہو جن پہ ان صحرائیوں کا لباس
 اسکے سایہ میں ہرن کا خوشنما جوڑا بنے
 ہوں محبت کے کھڑے اک دوسرے کے آس پاس

چشم چپ کو سینگ پر زکے لگاتی ہو غریب
 شدت غارش سے مادہ ہو کے مضطر ہو اس

علم انجیوانات کے ماہر اس مسئلہ سے واقف ہیں کہ ہرنی کی بائیں آنکھ میں جب غارش ہوتی ہے تو وہ کیوں ہرن کے سینگے پر لگتی ہے۔ کیا اس "افشار راز کو۔۔۔ پہلے اس سے زیادہ لطیف کنایہ میں پیش کیا جاسکتا تھا۔ یہی وہ اوصاف ہیں جنہوں نے ہمارے شاعر اعظم کو ہومر فردوسی چائرس اور شکسپیر کا ہم پایہ بنا دیا ہے

لے اس امر کا اظہار کر دینا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی عنصر کے لئے میں بہت بڑی حد تک سہیل کے فاضل مقالہ نگار یا بوجھت کے نڈا کی۔ اسے ال ال بی ڈیکل ہائی کورٹ دیرہ دون کار میں منت ہوں

شکنتلا کو لوگ غلطی سے محض ایک عورت ہی تصور کرتے ہیں حالانکہ وہ تو ایک مستقل تاسیس ہے جس کے عناصر تاریخی - شعریت - حسن - موسیقی و قافیا - درد و سوز و ہجر ہیں " جو نیکہ یہ جملہ عناصر کسی ایک ہستی میں بہ یک وقت جمع ہونا بظاہر مشکل ہیں اس لئے اوس کو محض ایک عورت کہنا یقیناً غلط ہے۔ میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس میں سیدنا جی کی سی روحانیت کا اعلیٰ جذبہ اوس میں ساوثری کا سا استقلال کا زبردست عنصر اوس میں دینتی کا سا صبر کا معرکہ الارا شرفیادہ کردار یقیناً نہیں ہے یہ بھی تسلیم ہے کہ وہ کوہ تھل نہیں وہ مضبوط درخت نہیں وہ سنگ گراں نہیں بلکہ وہ کمزور ہے۔ تا تو اس ہے اور عاجز ہے۔ مصیبت کی باکدھر صر جلتی ہے اور اوس کے متاع صبر کو تاراج کر دیتی ہے اوس کے پائے ثبات میں غرض ہوتی ہے اور اوس کا خرمین حیات، حس و خاشاک کی طرح جل کر ہوا میں منتشر ہو جاتا ہے۔ وہ عزیز الدیار مصیبت زدہ ہے باسی ہے محبت کرنا چاہتی ہے لیکن محبت کی راہوں سے نا آشنا ہے محض ہے اور میرے نظر میں یہی وہ اعلیٰ جوہر ہے جو شکنتلا اور اوس کے ہمنسوں پر فوقیت عطا کرتا ہے۔ اوس کی انسانی کمزوری سے ایک لطیف سبق کائنات کو ملتا ہے اور اسی خامی نے اوس کے کردار کو ماہ تا ماہ پہنچا دیا ہے۔

درخرمین کائنات کرم چونگاہ

یکدانہ محبت است باقی ہمہ گاہ!

اُجین کے افراد آج بھی اپنے قادر الکلام شاعر پر بجا طور سے ناز کرتے ہیں۔ اور فراطعقیدت سے یہ بالکل درست کہتے ہیں کہ سلاست زبان اور صداقت جذبات میں شکنتلا سے بہتر کوئی دوسرا ڈرامہ نہیں ہے۔ شکنتلا کی طرح کالیداس نے بھی اس ڈرامہ کا پلاٹ خود اختراع نہیں کیا بلکہ اساطیر اولین اس ڈرامہ کی بنیاد ہی پتھر میں لیکن ان اساطیر میں قادر الکلام شاعر نے وہ رنگین بیانی اور لطافت جذبات سے کام لیا ہے کہ ڈرامہ بالکل نادر اور نیا ہو گیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ آئین دلنوازی جس دلفریب عنوان سے کالیداس نے پیش کیا ہے اور رموز الفت کے نکات کو جس طرح اوس نے بے نقاب کیا ہے وہ اس کے سوا ماقبل کے شعرا میں یقیناً نہیں ہے۔ کالیداس معلوم ہوتا ہے کہ ادل سے فطرت پرست یا یوں کیوں نہ کہا جائے شاہد حقیقی کا پرستار دل لایا تھا۔ اور اس کی بے باک نظریں حسن پنہاں کو آشکارا کرنے پر تلی رہتی تھیں۔ جو جذبات انسانی ہی تک محدود نہ تھی بلکہ وحوش و طیور اشجار و انما غرضیکہ ساری کائنات اوس کے خاص نقطہ نگاہ کے جلوہ حسن سے معمور تھی اور وہ اوس شاہد حسن کا واحد پرستار تھا! اوس کا موضوع محض حسن و جمال کی نیایش تھا۔ اس نے اپنے موقلم سے جو ہلکے سے نقوش بھی قرطاس عالم پر قائم کئے ہیں وہ انتہائی دلکش ہیں اور اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان نقوش کا۔ بنانے والا محض ایک شاعر ہی ہو سکتا ہے جس کا جذبہ حسن مکمل ہو اور یہ تخیل دلکش محض ایک خلاق معنی ہی کے دلفریب احساس حسن سے پیدا ہو سکتا ہے۔ یہی وہ وصف ہے جس نے دانا یا ان فرنگ کو کالیداس کا مداح بنا دیا ہے

ہمارا چہ بکرماجیت کالیداس کو اپنے تاج شاہی کا ہمیش قیمت ہیرہ تصور کرتے تھے۔ اس لئے جب اون کو اطلاع ہوئی کہ درباری شان نے شکنتلا کا ڈرامہ تصنیف کیا ہے تو حکم دیا کہ اس کی پہلی نمائش موسم بہار میں شاہی محل میں ہوگی اور ایوان شاہی کے ایسیج کو یہ شرف حاصل ہوگا کہ شکنتلا کا ڈرامہ وہیں شاہی سرپرستی میں پہلی بار شایع ہوا اور اس نے بقائے دوام کا غلت حاصل کیا۔ آئے آپ کو بھی اس ڈرامہ کا پر لطف حال سنائیں اور ڈاکٹر ہو روز نے تقریباً ۱۴۰۰ سال قبل کے ساز و سامان کا جو تذکرہ کیا ہے اسی میں رنگ آمیزی کر کے آپ کو آج اس صحبت میں داستاں ہوش رُبا کا ابتدائی باب دکھلائیں۔ دیکھے سامنے ایوان شاہی ہے اور وہ سرکاری ایسیج ہے جس پر شکنتلا کا ڈرامہ پیش کیا جانے والا ہے۔ منتخب روزگار ایکٹر "جگت استاد شاعر" علم پرورد دربار اور اس پر موسم بہار کے لطیف اجتماع سے جو کیفیت اس وقت طبع میں رونما ہوئی ہوگی۔ اوس کا اندازہ ٹھوڑا بہت تو آپ حضرات بھی کر سکتے ہیں دیکھے وہ ایوان شاہی کا سنگت سال رقص و سرود کے لئے وقف ہے بڑے بڑے دروازوں پر زردوزی پردے آویزاں ہیں سامنے کشادہ صحن میں نشست کا انتظام ہے جس کے چاروں طرف خوبصورت سنگی مجسمے ہر تن انتظار بنے ہوئے ستونوں کا حق ادا کر رہے ہیں ان اصنام مجازی پر پھولوں کی چھادر ہوتی ہے۔ صحن کے مہن وسط میں سرخ رنگ کا شاہی شامیانہ نصب ہے جس کی سنہری جھالیں دنیاوی نظروں کو خیرہ کے دیتی ہیں شامیانہ چھ تقری جو بوں پر قائم ہے۔ اور یہ حیرت نزاکت طبع اور رعنائی خیال کا خاتمہ ہے کہ بجائے زمین کے یہ جو ہیں پھولوں کے ڈھیر پر رکھی ہوئی ہیں۔ ایسیج کے سامنے بھی کثرت سے پھول سیلے سے سجائے گئے ہیں جس کے پہلو میں شہنشاہی پرچم ہوا میں لہرا رہا ہے اور لعل و الماس کا پرتکلف پردہ طلائی زنجیروں سے ایسیج پر آویزاں ہے۔ یہ سکر غالباً آپ جو حیرت ہوں گے اور سرور بھی کہ یہ گراں انعام اس قادر الکلام شاعر کو عطا کیا جائے گا۔ سینے آج کی طرح ناقدری کا دور نہیں ہے۔ راجہ سے پرچہ تک علم دوست ہیں ہمارا بھی اپنے بسھا کے ہمیش قیمت لعل کو اوس کے شان شایاں معاوضہ دینا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے اور حیرت کیجئے کہ اس

(۱) سنگت سال ایوان رقص کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایوان کشادہ اور خوشنما ہونا چاہئے اور اس کی سقف لاجوردی نہایت اعلیٰ اور ٹھوس ہونا چاہئے جو جا بجا ستونوں پر قائم ہو۔ جن پر پھولوں کے ہار چڑھے ہوں۔ وسط ایوان میں سنگھاسن پر میزبان بیٹھے داسنی جانب موہن جہاں اور بائیں جانب ایل حرم کو جگہ دینا چاہئے عقبی حصہ میں عمال سلطنت یا فاطمی ملازم ہونا چاہئے۔ شاعروں۔ جوتشیوں۔ علماء و کرام حکمائے حاذق کو حلقہ کے درمیان میں جگہ دی جائے۔ خوب صورت کینزیں اپنے حسن و جمال کے حلقہ میں شفیق آقا کو لئے ہوں کسی کے ہاتھ میں اگر چنود ہو تو کسی کے ہاتھ میں ہو روز کا پانچ عصا بردار بابا جانشانی کے لئے کھڑے ہوں۔ خاموشی کے بعد سلا جھڑے۔ اور لائق رقاصہ پردہ سے نکل کر سلام کے بعد رقص شروع کرے۔

دورِ پاستاں میں عالم ادبیات کی قدما فرمائی کس طرح کی جاتی تھی۔ غالباً یہ منظر ہوش رُبا دیکھ کر چند لمحات کے لئے آپ بھی یہی دعا کریں گے۔ کہ اے کاش ایسے علم پرور اور عزت افزا شاہنشاہ کے عہد سعید میں ہوتے!

لاحظہ ہو۔ سپیدہ سحر کے نمودار ہوتے ہی ایسیج کے عقبی حصہ سے ساز عشرت چھڑتا ہے اور ماہاجہ بکریا حجت اکلیل جہانباتی فرق مبارک پر رکھے قبائے شاہی زیب تن کے ٹھکانے شاہی دست مبارک میں لئے اپنے خدمِ چشم کے ساتھ ”جاہ و جلال“ کا مجسمہ بنے ہوئے ”حُسن و جمال“ کے گنگا جہنی حلقہ میں اپنی بے تاب پرستار اور اولاد سے زیادہ شفیق رعایا کو دعوتِ مظاہرہ بخشے ہیں۔ اور ہر شخص شرعی عقیدہ کے مطابق ظل اللہ تصور کرتا ہوا فرطِ ہیبت سے ستر سجود ہو جاتا ہے۔ آکاش سے نور کی بارش ہوتی ہے اور دنیا والے اس تار بارش میں یہ غیبی آواز بھی سنتے ہیں کہ جس ملک پر ہم مہربان ہوتے ہیں وہاں ایسے ہی عادل اکبر جہانگیر شاہجہاں اور نگنوب سریرا کے سلطنت ہوتے ہیں۔ باجگزار سلاطین اور رنگ شاہی کے ”پوترو رشپوں“ کو داہسی جانب نشست عطا ہوتی ہے۔ کیزان شاہی سرپردہ کے قریب موز چیل لئے ادب سے استاد ہیں۔ حرم سلطنت کی ماشیہ نشین جمال و نمکنت کا مجسمہ بنی ہوئی ظل اللہ کے قرین دنیا کو محو حیرت بتائے ہوئے ہیں، عظمت اللہ۔ دنیا والوں نے حیرت سے بے تاب ہو کر کہا۔ کیا آج ہی قران السعدین ہے؟ کہیں حُسن کے دیوتائے تو او تار نہیں لیا ہے؟

اس جاہ و جلال سے اگر ایک طرف کسی کی فرطِ ہیبت سے نظریں نیچی ہیں تو دوسری جانب کسی کا وقار و جمال سینوں کو پامال کرتے ہوئے قلوب میں لطیف گدگی پیدا کر کے نظروں کو اوپر رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اختیار کی دُردیدہ نظریں اوپر اٹھتی ہیں اور حُسن شاہی کا جائزہ لیتی ہوئی جلدی سے سرپردہ تک کی خبر لیتی ہوئی واپس اگر فرطِ عظمت سے جھک جاتی ہیں۔ دیکھے ہی نہیں بلکہ وہ خواص اپنے پنجوٹھائی میں طلائی نئے اور سدابہار پھولوں کا گلستہ بھی لئے ہے۔ یہ ملکہ زمانی کی جانب سے وہ غیر معمولی تحفہ ہے۔ جو آج کالیڈاس کی خدمت میں پیش کیا جائیگا۔ اور یہی شاداب پھولوں کا گلستہ آج بھری مجلس میں اربابِ علم و ادب کے حضور میں سیاحوں اور شعرائے ادبی کو محو حیرت بنا کر کالیڈاس کو ملک الشعراء کا معزز خطاب دلوانے گا۔ آپ سمجھے بھی آخر حرمِ سلطانی سے آج پھول کیوں منتخب کئے گئے ہیں اور یہ طلائی سکے سے کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟ لیکن حضرات میرے خیال میں یہ ایک لطیف کنایہ ہے۔ حُسن و جمال کے مظاہرہ کا۔ کہ جس طرح آج اس مجمع میں ملکہ زمانی کے لاقانی حُسن کا افسانہ ”رد و شش صبا“ اقطاع بہند میں راج ہے اسی طرح مستقل قریب و بعید کی آنے والی نسلیں اس سدابہار پھولوں کی مست کن خوشبو کو سونگھیں گی اور یہ خود ہو کر اس قادر الکلام شاعر کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہو کر اس بانسری کے دلکش بے تاب کن اور ولولہ انگیز نغمات

سے مسخورد ہو کر اپنا سر دھنیں گے

ہاں ہاں دیکھئے۔ میں تو بہکا ہی تھا اشہب خامہ بھی یہ ساز و سامان دیکھ کر بہک گیا۔ ہاں وہ ملاحظہ کیجئے ایسیا کے جتنی نژاد نہیں ہیکہ کول و ڈراوڑ قوم کے سیاہ فام غلام سُرخ بانات کی دلفریب وردیاں پہنے اور ارغوانی پٹکے لٹکائے محترم و مفتخر مہانوں کو عطر و پان و فواکھات تقسیم کر رہے ہیں دیکھئے وہ سیاہ سیاہ کالی گھٹاؤں میں سفید گونوں والی ماہ جبیں درمبین لعبت چہین خواتین بدیش قیمت مردار لیدی ہار پہنے الماسی - اج (تبسم) خوبصورت بالوں پر لکھے جلی سی کو نذر فضاے حسن میں تملکہ ڈال کر طبائع میں انقلاب پیدا کر رہی ہیں۔ مہانوں کے حواس گم ہیں عقلیں بیچار ہیں اور نکاہیں خیرہ ہو گئی ہیں۔ مشیران سلطنت اور علمائے کرام قرینہ سے اپنی اپنی جگہوں پر رولن افزودہ ہیں۔ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اس وقت اُجین کے مہذب سماج کا روح عطر اور عمرانی حیثیت سے بھی بہترین عنصر الیوان شاہی میں موجود ہے۔ وہ شمالی جانب دیکھئے بہتر ان سلطنت نیپال کی تازہ شویش کے استیصال پر گفت و شنید کر رہے ہیں دیکھئے وہ جنوبی جانب ایک شاہی رصد گاہ کا بنم سفید ریش ایرانی سے گفتگو کر رہا ہے اور وہ شاہی مدیر سنسکرت لغات کے آخری اجزا جمیتی سیاح کے حوالہ کر رہا ہے جو محض اسی عرض سے پسکن سے آیا ہے اور مخصوص حیثیت سے اوس کو اس سبھا میں مدعو کیا گیا ہے۔ وہ دیکھئے نازنینان حرم کے حسن کا جائزہ لیا جا رہا ہے کہ دفعتاً سارنگی جل رنگ۔ ستار۔ بالنسری ہم آہنگ ہو کر انسانی قلوب میں مد جزر کی لطیف کیفیات پیدا کرتے ہیں اور خوش گو ماہران فن اپنے بیچ و ملیح رنگ اپنے تناسب اعضا اور اپنے شباب کی رعنائوں اور عشوہ آفرینیوں میں ستار ہاتھوں میں لئے زلف چٹکائے ساز کے..... ساتھ ہم لوانی کرتے ہوئے ہر تان کو شراب کی حوضوں میں غوطہ دیتے سرشار و مدہوشی کے چشموں سے غسل دیتے شہنشاہ وقت اور علمائے کرام کا خیر مقدمی ترانہ بھرتے ہیں سامعین یہ جسوس کر رہے ہیں کہ تار مضراب پر کسی کی انگلیاں مصروف رقص نہیں ہیں بلکہ کائنات کے رشتہ حیات پر ہیں اور بلوری حلق و دہن سے آواز نہیں نکلتی بلکہ تخلیق کے ساز سے غیر فانی رقص ہو رہا ہے!

سو تر دھارا (مہجر سلج) ادب سے اشیر یاد پیش کرتا ہے۔ اور ایک فی البدیہ مزاجیہ نظم میں حضار مجلس کی توجہ تائیل کی جانب منحطف کرتا ہے! حاجب۔ شاہی ایما و پا کر آگے بڑھے ہیں اور جو اہرات کی مرصع زنجیر ملک الشعرا کے قدموں پر نثار کرتے ہیں دوسری جانب سے ملکہ زمانی کی خواص رعنائی و شباب کا بحس مجسمہ اور حسن و جذبات کا بجز بحرینی ہوئی آگے بڑھی جو۔ اور سدہا بچوں کا گلہ قادر الکلام دیباری کے حضور میں عقیدتاً پیش کرتی ہے اور اطلالی نژاد و کرمج کا خندنگ نظر عطا انداز سے ایک طرزہ بیسی ہوئی اور حضار کے حرم من عقل کو جلاتی عدلیقہ فہم کو تاراج کرتی اپنی جگہ پر واپس جاتی ہے دیکھئے وہ انگشت شاہی کو حرکت ہوئی کہ دہشتا سلج کا خوبصورت پردہ دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے تحسین و آفرین کی صداؤں سے ماہ تا ماہی غل جتتا ہے اور تالیوں کی پر زور موسیقی میں ڈرامہ کا افتتاح ہوتا ہے

حُسن کی شہر آشوبیاں

شام کا وقت ہے، ہلکی ہلکی تاریکی افق سے بڑھ رہی ہے، اور ان چیزوں کی طرح جن کو بسیرا لینے کے لئے دیر ہو گئی ہو، ماہی گیر اپنی اپنی کشتیوں کے بادبان جلدی جلدی لپیٹ رہے ہیں ساحل اسکندریہ پر آخری کشتی آہستہ آہستہ پہنچتی ہے، ایک آدمی سیاہ لبادہ میں لپٹا ہوا خاموشی سے اترتا ہے، اور ایک عورت کو ہاتھ کا سہارا دیتے ہوئے پیچھے اُتارتا ہے — ہم نے اس کو عورت کہا، حالانکہ اپنے چہرے پر نازک جسم کو لئے ہوئے جس طرح وہ ہلکے قدموں کے ساتھ اتری تھی۔ اس کے لحاظ سے کس لڑکی کتنا زیادہ موزوں ہوگا

سترہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے اور وہ کونسی عورت ہے جسے اس عمر میں "لڑکی" سے زیادہ کسی اور لفظ سے منسوب کیا جاسکے، لیکن کلیو پیٹرا جو اس وقت کی نہایت ہی شایستہ و ترقی یافتہ قوم کی فرد تھی اور جو ادب و انشا و فنون لطیفہ میں ہمارے نامہ حاصل کر چکی تھی، اپنے دل و دماغ کے لحاظ سے اسی عمر میں "پوری عورت" ہو چکی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ لڑکی کی لڑکی کو ایسا ہی ہو جانا چاہئے تھا — وہ لڑکی جس نے اندرونی بغاوتوں اور بیرونی حملوں کے وقت بھی بالترقی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑی اور جس نے ملک کی ہر تباہی کا خیر مقدم تازہ جام شراب سے کیا — ظاہر ہے کہ وہ لڑکی جس کی پرورش ایسے پیش کوش دربار میں ہوئی ہو، جس کا ماحول صرف "شباب شراب" کی بدستیاں رہا ہو، وہ سترہ سال کی عمر میں کیا کچھ نہ ہو گئی ہوگی

یہ وہ زمانہ ہے جب کلیو پیٹرا کو اس کے بھائی نے جلا وطن کر کے تھیباڈ میں نظر بند کر دیا تھا اور سیزر اسکندریہ میں موجود تھا — یونو کلیو پیٹرا ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں لگی رہتی تھی۔ کہہ کر اپنے بھائی سے انتقام لے کر مصر کے تخت و تاج پر قابض ہو، لیکن سیزر کی آمد سے اس کو اپنی کامیابی کی امیدیں زیادہ قوی ہو گئی تھیں اور اس لئے وہ اپنے ایک خاص شخص اپالوڈورس کی مدد سے خفیہ طور پر ساحل اسکندریہ تک پہنچ ہی گئی تاکہ سیزر کی امداد سے اپنی کھوئی ہوئی حکومت مصر پھر حاصل کر سکے

کلیو پیٹرا، ساحل اسکندریہ تک تو تمام مصائب برداشت کرنے کے بعد پہنچ گئی تھی، لیکن اب بڑا اہم سوال یہ تھا کہ سیزر تک کیونکر پہنچ سکے۔ کیونکہ مصری سپاہیوں اور جاسوسوں سے اس وقت اسکندریہ کی ایک ایک گلی مہمور تھی

اور کلیو پیٹر اجاتی تھی کہ اگر ذرا بھی پتہ کسی کو چل گیا تو اس کی گرفتاری یقینی ہے۔
اپالو ڈورس نے جو بہت ذہین تھا۔ آخر کار ایک تدبیر نکالی اور کلیو پیٹر کے نازک و پھیلے جسم کو قالینوں میں لپیٹ کر اپنے قوی شانوں پر رکھا اور قہر سیزر کی طرف روانہ ہو گیا۔
جب اپالو ڈورس، قہر کے دروازہ پر پہنچا تو حاجیوں اور دربانوں نے اس کو روکا لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ شخص قالینوں کا تاجر ہے اور سیزر کے سامنے اپنا مال پیش کرنا چاہتا ہے تو کوئی تعرض نہ کیا گیا اور وہ آزادی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

ہر چند سیزر اب جوان نہ تھا اور زندگی میں ایک انسان کو جتنی مسرتیں اور لذتیں میسر آسکتی ہیں۔ ان سب سے وہ لطف اندوز ہو چکا تھا، لیکن احساس نشاط ہنوز اس میں باقی تھا۔ اور یہی وہ خصوصیت تھی جس پر اعتماد کر کے کلیو پیٹر اس کے پاس آئی تھی۔
جس وقت اپالو ڈورس نے کلیو پیٹر کو قالینوں کے اندر سے نکالا تو اس کی حالت ایسی تھی جیسے کسی وحشی ہرن کو آذا کر دیا جائے اور وہ تھوڑی دیر تک گھبرا ہوا ادھر ادھر دیکھتا رہے۔ اس نے اپنے چھوٹے سے لقمے میں آئینہ میں جو کمر کی طلائی زنجیر میں لٹکا ہوا تھا اپنی صورت دیکھی تو معلوم ہوا کہ نہ آنکھوں میں سرمہ کی تحریر کا کبھی تہہ نہ گالوں میں غاذہ کی سرتی کا، لباس بھی حد درجہ بے ترتیب ہے۔ اور بال بھی الجھے ہوئے شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں، لیکن تھوڑی دیر بعد اس کا احساس حُسن پھر قوی ہو گیا۔ اور وہ اس سادگی حسن و شباب کو لئے ہوئے سیزر سے ملنے کے لئے اور اس کو مغلوب کرنے کے لئے آگے بڑھی۔

وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی اور سیزر اس کے پھیلے جسم کی جنبش کو ناگن کی طرح اس کے چہرے نازک جسم کے پوچ کو، اور اس کے دلکش لبک رفتار کی نزاکت کو نہایت حریصانہ نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ قریب آئی تو سیزر نے اس کی ابروؤں کے خوبصورت خم کو دیکھا، اس کی مست و مخمور آنکھوں سے نکلنے والے جادو کو دیکھا، اس کے باریک پنکھری کی طرح باریک نکتھوں کو دیکھا، ایک دوسرے سے جدا رہنے والے گوازیلبوں کو دیکھا، اس کے جسم کے نرم کندن کو دیکھا۔ اور ایک ایسے جذبہ کے ساتھ جو اس وقت تک کبھی اس کے دل میں پیدا نہ ہوا تھا بے اختیار کہہ اٹھا کہ "اے کلیو پیٹر بول، میں تیرے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

کلیو پیٹر نے جو یونانی، شامی، مصری اور لاطینی زبانوں کی ماہر تھی، سیزر کو اس کی ملکی زبان میں جواب دیتے ہوئے بھائی کے مظالم بیان کئے اور یہ التجا پیش کی کہ مصر کا تاج و تخت حاصل کرنے میں اس کی مدد کی جائے ظاہر ہے کہ سیزر جو ہمیشہ سے عورت کے حسن و شباب کا غلام رہا ہے۔ کلیو پیٹر کی کسی خواہش کو رد نہ کر سکتا تھا اور

وہ فوراً اس کے فرمان کی تعمیل کے لئے آمادہ ہو جاتا، لیکن حالات اسقدر تعجیل کے مقتضی نہ تھے کیونکہ وہ اسکندر یہ صرف سیاحانہ طور پر آیا تھا۔ اور اس کے پاس اتنی فوج نہ تھی کہ وہ مصری سپاہ کا مقابلہ کر سکتا۔ کلیوپٹرا نے اس کو سمجھا اور کہا کہ ” اگر یہ پس و پیش کمی افواج کی وجہ سے ہے تو فی الحال میری حکومت کا صرف اعلان کر دیا جائے۔ اور جب بے دم سو فوج آجائے تو میرے بھائی کو تخت سے اتار کر میرے سپرد کر دیا جائے۔“

اُس طرف جب لٹلی دوازوہم کو معلوم ہوا کہ اس کی بہن قید سے نکل کر سیزر کے پاس پہنچ گئی ہے، تو اس نے اچلیس کی قیادت میں ایک زبردست فوج اسکندریہ کی طرف روانہ کی اور رومی سپاہ کے ایک دستہ کو جو وہاں موجود تھا تہ تیغ کر دیا۔ یہ تھی ابتدا اس جنگ کی جو کامل دو سال تک مصری و رومی سپاہ کے درمیان جاری رہی اور جس میں ہزاروں انسانوں کا خون بہانے کے بعد اسکندریہ کے مشہور کتب خانہ کو بھی جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔

سیزر تازہ رومی افواج کے انتظار میں قصر بروٹیم کے اندر ٹھہرا ہے اور کلیوپٹرا بھی سر زمین مصر پر لڑائی کی آگ روشن کر کے سیزر کے ساتھ ہی قصر کے اندر مقیم ہے۔

بروٹیم، اسکندریہ کا وہ مشہور محل تھا جس کی بنیاد اسکندر اعظم نے ڈالی تھی اور جس میں اس کے جانشینوں نے برابر اضافہ کر کے اس کو ایک نہایت ہی مستحکم قلعہ، اور نہایت ہی جمیل قصر کی صورت دیدی تھی، اس کے بڑے بڑے مہری ایوان جو یونانی و مصری فن تعمیر کی نازکترین صنایعوں کا نمونہ تھے۔

..... اس کے زریں درو دیوار، مٹلا بام و سقف، صیقل شدہ آئینہ کے حوض، بلور کے ترشے ہوئے فرارے، وسیع قطعات چمن، یوں تو سیزر کے لئے ہمیشہ جاذب نظر تھے، لیکن یہ حقیقت کلیوپٹرا کے آنے کے بعد ہی اُس پر کھلی کہ ان تمام چیزوں میں کبھی کبھی جان بھی پڑ جائی کرتی ہے اور جس وقت ان مناظر میں یوں جان پڑ جاتی ہے تو پھر ایک انسان کے لئے تمام کائنات کو بھلا دینا کس قدر آسان ہو کر رہتا ہے۔

واقعی سیزر اس وقت تمام دنیا کو حریف غلط سمجھ رہا تھا اور کلیوپٹرا کے معیت میں جو اسے مجسم ”عظرت“ نظر آتی تھی، ایک ایسی زندگی بسر کر رہا تھا۔ جو اس سے قبل اس نے کبھی بسر نہیں کی تھی اور جسے وہ قدرت کا انتہائی انعام سمجھتا تھا۔

کامل چھ مہینے سیزر کو اس ”خلوتکدہ فردوس“ میں زندگی بسر کرنے گزر گئے ہیں اور اسے مطلق ہوش نہیں کہ قصر بروٹیم کے باہر کیا ہنگامہ برپا ہے اور مصری افواج نے اس کے سپاہیوں کو کس قدر پریشان کر دیا ہے۔

ایک دن صبح کو تختہ نگلاب میں بیٹھا ہوا وہ کلیوپٹرا کے بالوں کی عظرت کا لطف اٹھا رہا تھا۔ کہ اس کو افواج روم کی آمد کی اطلاع ملی اور اس کا عسکری احساس دفعہً بیدار ہو گیا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور بولا کہ ” اے کلیوپٹرا، اب وقت آ گیا ہے کہ میں تیرے احسانات کے اعتراف میں مصر کا نواج و تخت تیرے قدموں پر لا کر ڈال دوں، اس لئے

مجھے اجازت دے کہ چند دن کے لئے، تم سے جدا ہو کر پھر انھیں تلواروں کے سایہ میں پناہ لوں۔ جو سیزر کو ملکہ مصر کے التفات کا زیادہ اہل بنا سکتی ہیں۔“

جس وقت روم کے سوار، گال کی پیادہ فوج، سلیشیا اور رموڈس کے جہاز سامان رسد سے لڑے ہوئے، ساحل اسکندریہ پر پہنچے، تو سیزر بھی جو ۶ ماہ سے قلعہ بند تھا، باہر نکل آیا اور جنگ میں مصروف ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ مصری فوج جو اچیلس کی سیادت میں برسہا برس کا رہی تھی، بہت قوی تھی، لیکن روم کی منظم سپاہ اور سیزر کی کوہ شکن جرات کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی، آخر کار اسے شکست ہوئی، کلیوپٹرا کا بھائی مارا گیا اور سیزر نے اسکندریہ کی کنجیاں کلیوپٹرا کے قدموں پر ڈال کر اس کو ایک بار ملکہ مصر تسلیم کرا ہی دیا۔

یقیناً یہ وقت کلیوپٹرا کی انتہائی مسرت کا وقت تھا اور اس کو وہ چیز حاصل ہو گئی تھی جس کے لئے وہ تڑپ رہی تھی، مگر وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھی کہ جس قوت سے یہ سلطنت حاصل کی گئی ہے اسی قوت سے قائم بھی کی جاسکتی ہے اور اس لئے وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح سیزر کو ہمیشہ کے لئے اپنا بنالے۔

ادھر چونکہ سیزر کی واپسی کے لئے روم نہ صرف یہ کہ بیتاب تھا، بلکہ اس کی طویل غیر حاضری سے برہم بھی ہو چلا تھا، اس لئے اس کو جلد سے جلد لوٹ جانا چاہیے تھا۔ کلیوپٹرا نے بہت کوشش کی اور اپنے حسن و جمال کا ہر ناز آمودہ سحر اس نے آزما دیکھا لیکن چونکہ اس وقت سیزر میں جذبہ وطنیت پھر ایک بار عود کر آیا تھا۔ اس لئے وہ کامیاب نہ ہوئی اور سیزر واپسی کی طئاریاں کرنے لگا۔

جب سیزر روانہ ہوا تو کلیوپٹرا بھی اس کو جزیرہ آسیس تک پہنچانے کے لئے ساتھ ہو گئی اور کافی عرصہ وقت کا لطف و نشاط میں بسر کرنے کے بعد جب جدائی کا وقت قریب آیا تو اس نے باجٹم پر روم سیزر سے کہا کہ ”کم از کم اتنا انتظار تو اور کرو کہ تمہاری امانت جو میں اپنے شکم کے اندر لئے ہوئے ہوں، وہ تمہاری آغوش میں سوئپ سکوں۔“

یہ ایک ایسی خبر تھی جس نے سیزر کو پھر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کیونکہ اس کی تین بیویوں میں سے کسی کے اولاد نہ تھی۔ اور وہ اس کا متمنی تھا کہ دنیا میں اپنے بعد کوئی وارث دولت و حکومت کا چھوڑ جائے۔ چنانچہ وہ پھر ٹھہر گیا۔ اس کے تیرہ دن بعد جب سرداران روم، سیزر سے اس کی واپسی کے لئے الحاح و زاری کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ اور یائوس ہو کر واپس جانے لگے۔ تو دفعہ یہ خبر معلوم ہوئی کہ ولادت ہو گئی ہے اور ولادت بھی لڑکے کی۔ سیزر خوشی سے اچھل پڑا۔ اور کلیوپٹرا کو ایک موقع اور مل گیا کہ وہ اس سے نکاح کر لینے پر اصرار کرے۔

سیزر خود بھی یہی چاہتا تھا کہ ہمیشہ کے لئے کلیوپٹرا کو اپنے لئے مخصوص کر لے، لیکن وہ مجبور تھا۔ کیونکہ اس کی بیوی موجود تھی اور علاوہ اس کے قانون روم کی رُو سے وہ کسی اجنبی عورت کو اپنے نکاح میں نہ لاسکتا تھا۔ کلیوپٹرا

اس سے کہا کرتی کہ دو قانون سیزر کے لئے نہیں ہے جو خود قانون بنائے اور توڑنے کے لئے پیدا ہوا ہے لیکن سیزر اس کو ٹال جاتا۔ اس بار بھی اس نے اس مسئلہ کو نظر انداز کرنا چاہا، لیکن اس میں کامیاب نہ ہوا۔ اور دبی زبان سے وعدہ کر کے اپنے ملک کی طرف روانہ ہو گیا

چونکہ سیزر کی غیر حاضری سے دشمنوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ اسلئے سلطنت رومہ اس وقت سخت خطرہ میں مبتلا تھی۔ اور پمپائی کی فوجیں برابر بڑھتی آرہی تھیں۔ کلیو پیٹر کی آغوش سے جدا ہوتے ہی سیزر کے فاتحانہ عزائم پھر عود کر آئے اور بجائے اپنے وطن واپس جانے کے وہ سیدھا ایشیا کو چمک کی طرف روانہ ہوا اور وہاں دشمن کے بیڑہ کو تباہ کر کے اس نے کیسیس پر حملہ کیا، فرانسس کو شکست دی اور افریقہ پہنچ کر قیاس کی مہم سر کی اور اس طرح بے شمار دولت، بے اندازہ مال غنیمت لے کر وہ روم واپس آیا، جہاں اس کی پزیرائی ایسے تزک و احتشام سے کی گئی کہ سرزمین رومہ نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سیزر نے جشن عام کے لئے خزانہ کو ملک عام کر دیا اور کامل ۴۰ دن تک جوش مسرت کی یہ کیفیت برپا رہی کہ لوگوں کو تن بدن کا ہوش باقی نہ رہا۔ جب جشن سے فراغت ہوئی تو دربار منعقد کیا گیا۔ جہاں پانٹ اعظم کا خطاب دے کر اس کی کرسی سب سے بلند مقام پر رکھی گئی اور معبد جیو پیٹر میں اس کا مجسمہ قائم کر کے اس پر دیوتا کا لفظ کندہ کیا گیا

اسکندر یہ کی حالت البتہ قابل اطمینان نہ تھی اور باوجودیکہ سیزر وہاں فوج چھوڑ آیا تھا، کبھی کبھی بغاوت کے آثار پیدا ہو جاتے تھے۔ اور لوگوں کی بے چینیاں بڑھ رہی تھیں۔ کلیو پیٹر پر پبلک کی طرف سے یہ الزام قائم کیا جاتا تھا کہ وہ ایک اجنبی شخص کو مصر پر مسلط کرنا چاہتی ہے، جو ان کے ملکی، مذہبی اور قومی روایات کے بالکل خلاف تھا، اور چونکہ کلیو پیٹر کا تسلط اچھی طرح قائم نہ ہوا تھا اس لئے وہ سازش کرنے والوں کو پکڑ کر قید و بند میں بھی نہ ڈال سکتی تھی، اتفاق سے اسی زمانہ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ سیزر نے مہم افریقہ کے دوران میں ملکہ یونینا سے تعلق پیدا کر لیا۔ اس خبر نے ایک طرف تو اہل مصر کو اور زیادہ جری بنا دیا کیونکہ اس سے ان کو یقین ہو چلا کہ اب سیزر، کلیو پیٹر کی حمایت نہ کرے گا۔ اور دوسری طرف خود کلیو پیٹر کو بہت اضطراب پیدا ہو گیا کہ کہیں سیزر ہاتھ سے نہ نکل جائے

اس دوران میں سیزر اور کلیو پیٹر کے درمیان باہم مراسلت قائم رہی اور ہمیشہ سیزر اس کو اپنی محبت و وفاداری کا یقین دلاتا رہا، لیکن کلیو پیٹر اس کو محسوس کرتی تھی کہ اگر یہ مفارقت چند دن اور اسی طرح قائم رہی تو اس کا اثر سیزر پر بالکل مٹ جائے گا۔ اور پھر مصر کی حکومت کرنا محال ہو جائے گا۔ اس نے کئی بار سیزر کو لکھا کہ وہ روم آنا چاہتی ہے لیکن سیزر اس خیال سے کہ اہل رومہ اس کو کبھی پسند نہ کریں گے، ہمیشہ ناتار رہا۔ آخر کار جب کلیو پیٹر بالکل مجبور ہو گئی تو اس کے ذہن دماغ نے ایک تدبیر نکال لی اور اس نے سیزر کو لکھا کہ جو دوستانہ معاہدہ اتحاد

رومہ اور مصر کے درمیان ہوا ہے اور جس کے بعض شرائط موضوع بحث میں ہیں ان کو طے کرنے کے لئے وہ خود آنے والی ہے، حقیقتاً یہ ایک ایسا بہانہ تھا جس کے خلاف نہ سیزر کچھ کہہ سکتا تھا نہ اہل رومہ کو اعتراض کی گنجائش تھی، اس لئے سیزر نے اجازت دیدی اور کلیو پیٹراروانہ ہو گئی

جون کا مہینہ ہے اور رومہ کا موسم بہار پورے شباب پر — دربار کی عظیم الشان عمارت کھچا کھچ آدمیوں سے بھری ہوئی ہے اور سرلوگوں پر ہر جگہ لوگوں کا ہجوم تبادلہ خیال میں مصروف نظر آتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ کلیو پیٹرار، دربار کی رقاہ ہے، جو ہر وقت طلائی زیور اور موتیوں سے آراستہ رہتی ہے، بعض نہایت سنجیدگی سے یہ خیال قائم کئے ہوئے ہیں کہ وہ کوئی ساحرہ ہے، کاہنہ ہے، جو ہر شخص کو مسحور و مرعوب کر لیتی ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس کی آغوش میں ہر وقت ایک ناگن کھیلتی رہتی ہے اور جس کو چاہتی ہے ڈسوالیتی ہے، بعض کا خیال ہے کہ اس کا حسن بہت غیر معمولی ہے۔ اور بعض اس کو قبیح ترین شکل و صورت والی عورت سمجھتے ہیں۔ الغرض اہل رومہ کلیو پیٹرار کے دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں۔ اور چاروں طرف ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں

جلوس میں سب سے پہلے حبشی غلاموں کا ایک دستہ نظر آتا ہے جن کے کانوں میں سونے کی بڑی بڑی بالیاں جھول رہی ہیں، اس کے بعد خواجہ سراؤں کی ایک جماعت سامنے سے گزرتی ہے جو لمبی عبائیں پہنے ہوئے ہیں، پھر امراء و وزراء کی قطار نظر آتی ہے ان کے پیچھے کاہنوں اور نوجویوں کی جماعت گزرتی ہے، جنکی لمبی لمبی مخروطی شکل کی ٹوپوں کو دیکھ کر اہل رومہ حیرت کر رہے ہیں۔ اور پھر بجا ریوں کا گروہ سامنے آتا ہے جو شیر کی کھال اپنے جسم پر پہینے ہوئے ہیں

جب یہ سب کے بعد دیگرے گزر جاتے ہیں تو چمکیلے نيزوں اور سیاہ ڈھالوں کی جھرمٹ میں ملکہ مصر کی ذریں بالکی نظر آتی ہے، چاروں طرف سناٹا بجا جاتا ہے اور ہر شخص کلیو پیٹرار کو دیکھنے لگتا ہے جو اپنی آغوش میں چھوٹے سیزر کو لئے ہوئے مسکرا رہی ہے — اس کے سر پر ایک طلائی تاج تھا جس کے پشت سے ایک طلائی ناگن جھانک رہی تھی، آنکھوں میں سرمہ کی تحریریں کی آنکھوں کے سحر آگینی کو اور زیادہ نمایاں کر رہی تھی، غاذہ کی سرخی سے اس کے چہرہ کی ملاحظہ پر ایک خاص صندلی رنگ پیدا ہو رہا تھا اور لباس اتنا ہاریک تھا کہ اس کے سینہ و شانہ کا شباب نگاہوں میں کھپا جا رہا تھا

الغرض اس شان و اہتمام کے ساتھ کلیو پیٹرار، رومہ کی سڑکوں سے گزرتی ہوئی اس قصر تک پہنچی جو سیزر نے دریائے نیل کے ساحل پر حال ہی میں تعمیر کرایا تھا

کلیو پیٹرا کو روم آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ زمانہ گزر گیا ہے اور جشن و مسرت کی جتنی صورتیں ممکن ہیں سب اختیار کی جا رہی ہیں، پُر تکلف دعوتیں ہیں اور رقص و سرود کے جلسے مردانہ کھیلوں کی نمائشیں ہیں اور علمی مجالس کے مظاہرے۔ لیکن باوجود اس کے کہ کلیو پیٹرا یہاں کے ذہین و علمی طبقہ کو اپنی ہمت و قابلیت سے مسح کر چکی ہے، باوجود اس کے کہ سیزر کے شاہانہ اقتدار و جبروت کی حمایت حاصل ہے، وہ اس کو اچھی طرح محسوس کرتی ہے کہ ایک جماعت ایسی بھی موجود ہے جو نہ صرف اُسے بلکہ سیزر کو بھی قمر و غضب کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اور معلوم نہیں کس وقت یہ آگ بھڑک کر چاروں طرف مشتعل ہو جائے

جشن لیو پر کیلیا پورے انماک کے ساتھ منایا جا رہا ہے سیزر، صدر کی حیثیت سے بیٹھا ہوا ہے اور کلیو پیٹرا اس کے پہلو میں طلائی کرسی پر متمکن ہے جس وقت قربانیاں ختم ہو جاتی ہیں اور میدان خون سے کافی رنگین نظر آنے لگتا ہے تو مارک انطانی جو سیزر کا سب سے زیادہ معتمد علیہ افسر ہے۔ زردیں تاج لئے ہوئے اٹھتا ہے اور سیزر کے سر پر رکھ دینا چاہتا ہے۔ سیزر انکار کرتا ہے لیکن کلیو پیٹرا — جو اصل محرک اسی تجویز کی تھی، پھر اصرار کرتی ہے اور جب انطانی دوبارہ تاج لیکر بڑھتا ہے تو سیزر پھر انکار کرنا ہے۔ کیونکہ سیزر جانتا تھا ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے اور مخالفین اس سے فائدہ اٹھا کر عام برہمی پیدا کر دیں گے۔ بعض لوگوں نے سیزر کے اس طرز عمل کو دیکھ کر اظہار مسرت کیا اور بعض جو اس کے مخالف تھے انھوں نے سرگوشیاں شروع کر دیں کہ یہ سب مکر و فریب ہے۔ اور آج نہیں تو کل ضرور یہ اپنی ملوکیت کا اعلان کر دے گا

صبح کا وقت ہے اور سیزر دارالامراء جانے کی طیاریاں کر رہا ہے، کلیو پیٹرا کہتی ہے کہ آج اس قدر جلد جانکی کیا ضرورت ہے۔ لیکن وہ نہیں مانتا اور کام کی اہمیت کا ذکر کر کے کیسیس کے ساتھ ہولیتا ہے جسے بروٹس نے بلانے کے لئے بھیجا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بروٹس اس کے دشمنوں میں سے ہے، وہ واقف تھا کہ مخالف جماعت کی سازشیں بڑھتی جا رہی ہیں لیکن اس نے اپنے اقبال و خوش بختی پر اعتماد کر کے کسی بات کی پرواہ نہیں کی اور دارالامراء کی طرف روانہ ہو گیا، لیکن اس کا اندر داخل ہونا تھا کہ دفعتاً ایک شور پیدا ہوا۔ اور پھر آنا فانا شہر کے ایک ایک گوشہ میں یہ وحشت ناک خبر پھیل گئی کہ سیزر مار ڈالا گیا

دنیا انسانی دسترس سے دور

یقیناً دورِ حاضر کی یہ نمایاں خصوصیت کبھی فراموش نہیں ہو سکتی کہ وہ دنیا کے غیر معروف و مجهول مقامات کے دریافت کرنے میں پوری جدوجہد سے کام لے رہا ہے

پھر یہ کشف و اکتشاف کا شوق کسی خاص ملک اور خاص قوم کے مخصوص افراد پر منحصر نہیں بلکہ تمام ممالک اور جمیع اقوام و ملل اس سے متاثر ہیں۔ اور یہ اشتیاق بڑھوں نوجوانوں مردوں اور عورتوں سب میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے

جب ہم کرہ ارض کے نقشہ پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اب تک بکثرت ایسے مقامات موجود ہیں۔ جہاں انسانی قدم نہیں پہنچ سکا اور وہ اپنے مکتشفین کے منتظر ہیں۔ ہر چند انسان قطب شمالی و قطب جنوبی تک پہنچ گیا اور اس نے دنیا کے چھ براعظموں میں سے بہت سے محال کا اکتشاف کر لیا۔ چین، ہندوستان، تبت، ساہرا جنوبی امریکہ، آسٹریلیا، نیوگنی، وغیرہ کے بہت سے غیر معروف مقامات کو اس نے دریافت کر لیا لیکن ہنور بہت سے مقامات روئے زمین پر ایسے پائے جاتے ہیں جن کا علم انسان کو اب تک نہیں ہو سکا

چین میں کوہ این شان کے چوڑے اور تبت کے شمالی حدود میں بہت سے محمول اور غیر معروف مقامات پائے جاتے ہیں۔ اور دنیا نہ تو وہاں کے حیوانات کے متعلق کچھ جانتی ہے نہ اس کو وہاں کے نباتات کا کچھ علم ہے۔ اگرچہ بہت سے سیاحوں نے وہاں تک پہنچنے کا ارادہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے

بحرِ اوقیانوس سے ملا ہوا حصہ زمین اور ہمالیہ پہاڑ کی ایورسٹ چوٹی کا حال ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ہوا، اسی طرح نیوگنی کے پہاڑی سلسلے جن کی بلندی ۸ ہزار فٹ تک ہے اور جن کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں، ان کا حال بھی دنیا سے پوشیدہ ہے۔ اور یہی حال بحرِ جان ایک غیر معروف آبی حصہ کا ہے جس کو ابھی تک کسی متمدن ملک کی کشتی نے عبور نہیں کیا

جزیرہ بورنیو کے اندرونی حصے اور جزائر سلیبز و ملکو لا بھی ابھی تک مجهول ہیں۔ لیبیا اور کے مجاہل، گرین لینڈ کے بعض اطراف، دریائے امیرون داوراٹوک کے چشمے، الاسکا کے شمالی حصے اور قطب جنوبی کے مناطق یہ سب کے

سب پردہ خفا میں ہیں
تاریخ کا ایک صفحہ

کشف مجاہل کا خیال انسانی دماغ میں قدیم زمانے سے پایا جاتا ہے اس لئے جغرافی

اكتشافات کا بڑا حصہ تیرہویں اور اٹنیسویں صدی کے درمیان ہی طے ہو گیا۔ اور امریکہ، افریقہ، ہندوستان، اور چین کے بہت سے مجاہل کا حال معلوم ہو گیا۔ امریکہ اور اس کے مجاہل دریافت کرنے میں اٹنیسویں صدی سے قبل آرکسن، کولمبس، امریکو، کارٹیز، بیزپرود، وغیرہم نے شہرت پائی۔ ۱۷۷۱ء میں جیمس کک نامی سیاح اور اس کے بعد دنیا کے مشہور سیاحین کا ایک گروہ جس میں خاص سیاح میگلن، واسکو ڈیگاما، مارکو پولو، منگو پارک ہیں، مشہور ہوئے۔ یہ تمام سیاحین باوجود اتنی شہرت کے سیاحین روم و یونان اور عرب سے (جو ان سے کئی سو سال قبل مشہور ہوئے) زیادہ نہ تھے جنہوں نے اُس تیرہ و تار زمانہ میں بہت سے شہروں اور ملکوں کو معلوم کر لیا تھا

یورپ اور امریکہ میں جغرافیائی سوسائٹیاں قائم ہونے سے پیشتر بڑے بڑے اکتشافات جغرافیائی انجمنیں | ظہور پذیر ہو چکے تھے۔ مگر یہ اکتشافات متحدہ اور اجتماعی مساعی کے نتیجہ نہ تھے۔ بلکہ انفرادی کوششوں کا ثمرہ تھے۔ لیکن انجمنوں کے قیام کے وقت سے لوگ اکتشافات مجاہل میں متحدہ طور پر بھی مشغول ہوئے۔ اس قسم کی سب سے پہلی انجمن پیرس کی جغرافیائی انجمن (Société de Géographie de Paris) ہے جو ۱۸۲۱ء میں قائم ہوئی، اس کے بعد ۱۸۲۸ء میں برلین کی جغرافیائی انجمن قائم ہوئی۔ پھر ۱۸۳۲ء میں لندن میں ایک انجمن رائل جغرافیائی سوسائٹی کے نام سے قائم ہوئی جو تمام یورپ میں اس قسم کی مشہور انجمن ہے۔ ۱۸۴۵ء میں روس نے بھی ایسی طرح کی ایک انجمن بنائی۔ امریکہ نے بھی ان ممالک کی اتباع کرتے ہوئے ۱۸۵۲ء میں امریکن جغرافیائی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۵۸ء میں ایک دوسری انجمن ملکی جغرافیائی سوسائٹی کے نام سے قائم کر لی۔ یہ انجمن تمام دنیا میں دیگر جغرافیائی انجمنوں سے زیادہ مشہور ہے

اٹلی میں بھی ایک جغرافیائی سوسائٹی ہے جو فلورنس میں امریکن ملکی جغرافیائی سوسائٹی کے قیام سے چار سال قبل یعنی ۱۸۸۲ء میں قائم ہوئی

ان انجمنوں نے جو گراں بہا علمی خدمات انجام دیں ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے سیاحین کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی اور ان کو جتنے روپیہ اور سامان کی ضرورت پیش آئی اس کو فراہم کرنے میں ان انجمنوں نے طرح طرح سے امداد کی۔ اور بہت سے کمیشنوں کی تنظیم کر کے انکو بڑی بڑی سیاحتوں پر آمادہ کیا

سیاحین دو طرح کے ہیں ایک تو وہ جنہوں نے اپنے ذاتی اعراض و مفاد کے لئے اجتماعاً یا انفراداً سفر کئے، دوسرے وہ جن کو علمی انجمنوں نے اطراف عالم میں بھیجا۔ اکثر سیاحین روم و یونان و عرب کی غرض تجارت اور تجارتی منڈیوں کی افتتاح اور اپنے معاملات کی توسیع تھی۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جو تجارتی مال ایک ملک سے دوسرے ملک کو لے جاتے تھے۔ اور اس کو فروخت کرتے تھے۔ بہت سے معادن اور کانوں کی تلاش میں گھومتے تھے۔ اور ایسے بھی تھے۔ جو غلاموں لوٹڈیوں اور جواہرات وغیرہ کی تجارت کرتے تھے

لیکن وہ سیاح جو انجنیوں کی طرف سے بھیجے گئے ان کی غرض صرف علم و فضل کی ترقی تھی۔ ان انجنیوں کے متعلق کتب خانے بھی ہیں جن میں بکثرت علمی کتابیں، تصاویر اور نقشے موجود رہتے ہیں۔ بعض سوسائٹیاں اپنے ذاتی اخبار و رسائل بھی رکھتی ہیں۔ تاکہ پبلک کو ان کے کارناموں کی اطلاع دی جاسکے

دنیا میں جس وقت سے یہ انجنین قائم ہوئی ہیں اس وقت سے سیاحین کا مقصد صرف کسی غیر معروف مقام کا ہی دریافت کر لینا نہیں ہے بلکہ بہت سے علمی نظریات و قضایا کا اثبات ہے جو طبقات الارض، مسئلہ ارتقاء، ناپید حیوانات اور ظہور انسان کی تاریخ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور جنکے متعلق علماء، بحث و تھیس کرتے رہتے ہیں

یہاں ان چند اکتشافات کا ذکر کیا جاتا ہے جن کو سیاحین بلاذ ۱۸۵۰ء سے لے کر بیسویں صدی

عصر جدید کے ابتدائی حصہ تک پورا کر چکے ہیں

بہت سے سیاحوں نے وسط ایشیا میں پامیر پلینو اور پنچوریا (شرق ایشیا) کی سیاحت کر کے بکثرت غیر معروف مقامات کا پتہ لگایا جو اس سے پیشتر موزخ فضا میں تھے۔ سر ولیم کوٹوائے نے ۱۹۰۹ء میں کراہورن کے مجاہل کو دریافت کیا جو اب انس لینڈ کے نام سے مشہور ہیں

۱۸۲۴ء میں جرمنی کے دو شخصوں نے افریقہ کے کلیمنگرو پہاڑ کا سلسلہ اور ملک کینیا دریافت کیا۔ اسی سنہ میں جیٹونسن نامی سیاح نے نیگیمی جھیل کا اکتشاف کیا اور دوران سیاحت میں وکٹوریہ اور دریائے زیمبیزی کے آبشاروں اور روڈریزا کے شمال تک پہنچ گیا۔ ۱۸۵۵ء میں بنٹن و سبیک نے ٹینینیکا جھیل کا پتہ لگایا۔ اس کے دوسرے سال سبیک نے نیانیزا جھیل کو معلوم کیا۔ ۱۸۶۸ء میں سروا بنٹو سیاح نے جنوبی افریقہ کو طے کیا۔ اسی سنہ میں اوسکار کزن نے صحاری میں طنجہ سے ممبکوٹ تک سفر کیا۔ اور سوئی نامی سیاح نے مصر سے خلیج گنی تک سفر کیا۔ اسی سلسلہ میں پاگرو (Palgrave) کا سفر بلاذ عرب و یبرگ (Vassago) کا سفر ترکستان اور ولینر (Wallerstein) کی سیاحت اوسٹریلیا میں، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں

اہل جرمنی کی ایک جماعت (Kunstmann) نے مجاہل ہندوستان اور تبت کا سفر کیا نیز کوہستان ہمالہ، قراقرم و کونین میں گھومی۔ ۱۸۹۵ء میں انگریز سیاحین کا ایک گروہ قطب جنوبی تک پہنچا۔ اور اس نے قطب جنوبی کے مقناطیسی مقام کا تعین کیا۔ (۱۸۴۲ء میں روس ایک انگریز سیاح منطقت قطب جنوبی کے ۸۰، درجہ دقیقہ تک پہنچ چکا تھا) ۱۹۰۸ء میں شکلٹن نامی سیاح ایک ایسے مقام پر پہنچا جو قطب جنوبی سے ۹ میل کے فاصلہ پر تھا

منطقہ قطب شمالی کے اکتشاف میں بھی بہت سے لوگوں نے حصہ لیا چنانچہ ۱۸۸۸ء میں نیسنن نامی سیاح نے بلاڈگرین لینڈ کو طے کیا۔ اور ڈیوک ڈیروزی ۱۹۰۸ء میں ۸۶ درجہ ۳۳ دقیقہ تک شمال میں پہنچا

گرمشتہ صدی کے ریلج ایئر میں فریکلن، کین، بینکس، گریلے، اور مکسن نے قطب تک پہنچنے کے لئے بے انتہا کوششیں کیں تاکہ کوئی قریب ترین اور سہل راستہ دستیاب ہو۔
 قرن سابق کے ایئر میں زور بریکن نامی ایک سوئٹزر لینڈ کے سیاح اور اس کے ساتھی وین نے کوہستان انڈیز پر جانے کا ارادہ کیا اور وہ دونوں اگونگوا چوٹی تک (جس کا ارتفاع ۲۳۰۸۰ فٹ ہے) پہنچ گئے یہ چوٹی کوہستان انڈیز کی بلند ترین چوٹیوں میں ہے اور کوہستان قرقر کی بلند ترین چوٹی سے بھی کچھ زیادہ بلند ہے۔
 ۱۹۵۶ء میں برے امریکن سیاح قطب شمالی تک پہنچا اور اٹار سفر میں اس کو بہت زیادہ مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے دو سال بعد سوئڈن کا ایک سیاح جس کا نام امتدسن تھا قطب جنوبی پہنچ گیا۔ اسی زمانہ میں موریواکن، ڈوسن، رسل وغیرہ نے بھی چند سفر کئے اور بلاڈ لبر اڈور۔ و۔ الاسکا میں سیاحت کر کے بہت سے ایسے غیر معروف مقامات کا پتہ چلایا جن کو دنیا اس سے قبل مطلقاً نہ جانتی تھی۔

مندرجہ بالا بیان کو پڑھنے کے بعد یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ اب کوئی مقام سطح ارضی پر غیر
اب کیا باقی رہ گیا؟ معروف باقی نہیں رہا جس کے انکشاف کی ضرورت ہو، کیونکہ ابھی تک زمین کا بڑا حصہ ایسا بڑا ہوا ہے جہاں انسانی قدم اس وقت تک نہیں پہنچ سکا اور سیاحوں کی جماعتیں ان کے انکشاف کی فکر میں لگی ہوئی ہیں۔

ہم اس وقت برقی قوت، ایٹم اور ریڈیو کے زمانہ میں ہیں انہوں نے بعید مقامات کو قریب اور بہت سی اشیاء کے چہرہ کو بے نقاب کر دیا ہے۔ اب انسان آسانی کے ساتھ بحر و بر اور ہوا میں ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کر سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں کوئی سیاح کسی جگہ کی سیاحت کے لئے اس وقت تک آمادہ نہیں ہوتا۔ تا وقتیکہ اس کے ہمراہ بکثرت نقشیات، تصاویر، کتابیں اور آلات تصویر موجود ہوں اس کے علاوہ اور دیگر اشیاء (جن کے بغیر کامیابی دشوار ہے) کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

قدیم سیاحین کے سفر نامے اگرچہ رسوم و تصاویر سے خالی ہیں۔ مگر پھر بھی موجودہ زمانے میں ایک حد تک مفید ثابت ہوتے ہیں۔ آج کل کے سفر نامے قدیم سفر ناموں سے بالکل مختلف ہیں۔ کیونکہ ان میں سرسری طور پر کسی غیر معروف مقام کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ وہ بڑے بڑے علمی مباحث پر مشتمل ہیں۔ ان میں نباتات و حیوانات کے فوٹو اور ان کے خصائص، جیولوجی، علم ارضاد جو یہ وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔ یاد دہانی کی طرح یوں کہنا چاہئے کہ جدید سفر نامے فی الحقیقت علمی مولفات ہیں جسے انسان بے شمار معلومات کا استفادہ کرتا ہے۔

اس وقت دنیا کے کتنے حصے ایسے ہیں جن کا حال اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔ اسی کا جواب محال ہے اور ان تمام غیر معروف مقامات کا حصر ممکن نہیں، تاہم سیاحین بلاؤ کو قرن حاضر کے اختتام سے قبل ہی ان کے انکشاف کی امید ہے۔ اس

اکتشاف سے دنیا کا نقشہ مکمل ہو جائے گا اور کوئی مقام کرہ ارضی کی سطح پر مجہول نہ رہے گا۔ سائنس و اختراعات کی ترقی، فن پرواز کا کمال، برق و بخار سے حرکت پانے والی مشینیں اور لاسکلی کے آلات یہ تمام چیزیں عنقریب سیاحین کے لئے اُن کی کامیابی کا باعث ہوں گی۔ ذیل میں خاص خاص مجاہل بیان کئے جاتے ہیں

(۱) بلاد ساہیریا کا شمالی مشرقی حصہ جو ایک وسیع میدان ہے جہاں تمام سال برف گرتی ہے اور زمین برف سے ڈھکی

رہتی ہے اس ملک میں ہوا کے بہت تیز بگوئے اٹھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسان وہاں کا کچھ حال نہیں جانتا

(۲) افریقہ میں جبال قمر کے گرد و پیش کے گھنے جنگل جہاں گوریلا بندر پایا جاتا ہے، یہ بندر اور بندروں کے بہ نسبت

انسان سے زیادہ مشاہدہ ہے۔ علماء ان مقامات کا کچھ اور حال نہیں جانتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر علماء

ایسے مقامات تک پہنچ سکے تو ان کو نظریہ نشو و ارتقاء، اسرار و رافت اور مخلوقات حیویہ کی ترقی کے راز

کے اثبات کے لئے بہت کچھ مواد فراہم ہو جائے گا

(۳) قطب جنوبی کے وسیع مجاہل جن میں کہ اب تک کسی سیاح نے بہ تمام و کمال سیاحت نہیں کی

(۴) دریائے اورونیکو اور امیزن کا منبع

(۵) نئی دنیا (امریکہ) کے قدیم متوحش باشندگان کے رہنے اور بسنے کے مقامات اور افریقہ میں زندگی وحشیوں

کے مسکن

(۶) جزیرہ گرینلینڈ (جو شمالی امریکہ کے مشرق و شمال میں واقع ہے) کا بہت بڑا حصہ

(۷) جنوبی امریکہ میں شمالی قطعہ کے بہت سے مقامات

(۸) شمالی اسٹریلیا کے چھوٹے چھوٹے حصے

(۹) جزیرہ بورنیو جزائر نیوگنی اور جزائر فلپائن کے وسطی حصے

(۱۰) بحر الکاہل میں شمالی اسٹریلیا کے بعض جزائر

(۱۱) جنوبی امریکہ میں جنوبی مغربی ساحل کے بعض ٹکڑے

(۱۲) جزیرہ آکسلینڈ کے شمالی اطراف

(۱۳) جزائر فرانسو جوزٹ کے بعض جہات

(۱۴) جزیرہ سواترا کے بعض حصے

اس کے علاوہ بہت سے غیر معروف مقامات کرہ ارضی پر موجود ہیں۔ اور وہ اپنے کتشفین و سیاحین کے

منتظر ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ موجودہ صدی کے اختتام سے قبل روئے زمین پر کوئی مجہول مقام باقی نہیں رہے گا

اپنی ہم خیالی بنانے میں کامیاب ہو ہی گئے

ان کی تبلیغ یہ تھی کہ نماز جمعہ و نماز عیدین ہندوستان میں نہ پڑھنا چاہئے کیونکہ یہ دارالحرب ہے اور بجائے لفظ پیر و مرید کے آئندہ اُستاد و شاگرد کے الفاظ استعمال کرنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے بیعت کے وقت ہاتھ میں ہاتھ لینے کے طریقہ کو بند کر کے صرف توبہ کو جاری کیا۔ ان مسائل میں تو خیر ان کی مخالفت زیادہ نہیں ہوئی، لیکن جس وقت انھوں نے یہ اعلان کیا کہ نوزائیدہ بچہ کی نال دائی سے کٹوانا ہندوؤں کی رسم ہے اس لئے اس کو ترک کرنا چاہئے اور خود باپ کو نال کاٹنا چاہئے، تو سخت برہمی لوگوں میں پیدا ہوئی اور ان کے بہت سے مرید پھر گئے۔ چونکہ کاشتکاروں کی بڑی جماعت پر ان کا اثر قائم ہو چکا تھا۔ اور وہ اس جماعت میں اتحاد پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے زمیندار بہت خائف تھے اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ بھی درپے آزار ہو گئے، یہاں تک کہ ان کو نواباری (ضلع ڈھاکہ) چھوڑ کر جہاں وہ مقیم تھے اپنے وطن چلا جانا پڑا

وطن پہنچ کر پھر انھوں نے اپنا سلسلہ، رشد و ہدایت قائم کیا اور جہلا کی کثیر جماعت ان کی مرید ہو گئی۔ رفتہ رفتہ ان کا اثر اس قدر وسیع ہو گیا کہ کسی کو مخالفت کی ہمت نہ ہوئی۔ اور وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنا حلقہ بڑھاتے رہے ان کے بعد ان کے بیٹے محمد محسن جانشین ہوئے، جو ”دو دھومیاں“ کے نام سے مشہور تھے اور اب بھی اضلاع فرید پور، پٹنا، باقر گنج، ڈھاکہ اور نواکھالی میں کوئی شخص ایسا نہیں جو ”دو دھومیاں“ سے ناواقف ہو۔

دو دھومیاں ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے اور بہت کمسنی میں مکہ چلے گئے۔ جب واپس آئے تو انھوں نے بیان کیا کہ انکو خواب میں بشارت ہوئی ہے اور وہ خدا کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے مامور کئے گئے ہیں۔ چونکہ باپ کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے انھوں نے ان کی جگہ لے لی۔ اور بعض نئی تعلیمات بھی لوگوں کے سامنے پیش کیں۔ مثلاً یہ کہ پھنگا (ایک کیرا جسے بوٹ بھی کہتے ہیں اور جو اچک کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتا ہے) کو انھوں نے حلال قرار دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ٹڈی عرب میں عام طور پر کھائی جاتی ہے اور ہندوستان کا پھنگا بھی بالکل وہی چیز ہے۔ پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی چیز وہاں حلال ہو اور یہاں حرام

دو دھومیاں کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے باقاعدہ اجتماعی زندگی کی روح لوگوں میں پیدا کی اور دیشنوی ہندوؤں کی طرح انھوں نے بھی مشرقی بنگال کے کسی حصہ کر کے ہر جگہ اپنا ایک خلیفہ مقرر کیا۔ خلیفہ کا فرض ہوتا تھا کہ وہ مرکزی تعلیمات کی اشاعت کر کے لوگوں کو منظم طور پر ایک رشتہ سے وابستہ رکھے اور ہر شخص سے چندہ فراہم کر کے صدر مقام پر دو دھومیاں کے پاس بھیجتا رہے جو اس جماعت کی تنظیم کے تہا ذمہ دار تھے

اس جماعت کے اتحاد عمل کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر کوئی زمیندار اس جماعت کے کسی کاشتکار کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرنا مرکزی فنڈ سے مقدمہ لڑنے کے لئے روپیہ دیا جاتا اور بعض دفعہ اگر ضرورت ہوتی تو آدمی ٹھیکر نہ میندار

کی زدوکوب کی جاتی اور اس کا گھر لوٹ لیا جاتا۔

جامی شریعت اللہ کی زندگی میں یہ جماعت نہ زمینداروں کے طبقہ سے برسرِ پیکار ہوتی تھی نہ قانون کی مخالفت کرتی تھی، لیکن جو باپ سے نہ ہو سکا وہ بیٹے نے کر دکھایا اور دودھومیاں نے گویا علانیہ زمینداروں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔

چونکہ زمینداروں کو اس جماعت کی تنظیم سے سخت نقصان پہنچ رہا تھا اس لئے وہ اپنے کاشتکاروں کو جسمانی ایذا دے دیکر اس جماعت میں شرکت سے باز رکھنا چاہتے تھے اور ادھر دودھومیاں بھی ہر اس کاشتکار کو جو ان کی جماعت میں شریک نہ ہوتا تھا سخت سزائیں دیدیگر اپنی طرف کر لیتے تھے۔ سزا کا خاص طریقہ یہ تھا کہ جو لوگ کہنا نہیں مانتے ان کو ہانڈھ کر سرخ مرچ کا سفوف ناک میں ڈال دیا جاتا تھا۔ الغرض اس جنگ میں زمینداروں کو شکست ہوئی اور دودھومیاں کی جماعت روز بروز بڑھتی رہی

دودھومیاں کی تبلیغ یہ تھی کہ تمام انسان ایک ہیں اور غریب و امیر میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ جس طرح ایک امیر اپنی فلاح چاہتا ہے اسی طرح ایک غریب کو بھی اپنے مصالح کے تحفظ کا اختیار حاصل ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی ایک شخص جماعت کا کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو سب کا فرض ہے کہ وہ اس کی مدد کریں اور اس مقصد کے حصول کے لئے مخالف جماعت پر ہر ممکن ظلم روا ہے

زمینداروں کی طرف سے جو بے ضابطہ ٹیکس کاشتکاروں پر عائد ہوتے تھے، ان کے وہ سخت مخالف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ڈرگادپوسی کے مندر کے لئے ایک مسلمان کاشتکار پر کیوں ٹیکس عاید کیا جائے یا رام لیلکا کے جشن کے لئے کیوں اس کو چندہ دینے پر مجبور کیا جائے

اس کے بعد دودھومیاں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، یعنی اب انھوں نے یہ اعلان کیا کہ زمین خدا کی ہے اور کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ دراثا اس پر قابض رہے اور لگان وصول کرے۔ چنانچہ ایک بڑی جماعت ان کے مریدوں کی زمینداروں کی زمینیں چھوڑ بیٹھی اور خالصہ کی زمین کاشت کرنے لگی جہاں انھیں مالگزار سی براہ راست گورنمنٹ کو دینا پڑتی تھی اور درمیان میں زمیندار حائل نہ تھے

زمینداروں نے مجبور ہو کر آخر کار دودھومیاں کے خلاف بہت سے جھوٹے مقدمے بنائے۔ ۱۸۳۵ء میں ان پر لوٹ مار کا الزام قائم کیا گیا، ۱۸۴۱ء میں قتل میں مانوڈ کیا گیا، لیکن دونوں مرتبہ ثبوت فراہم نہ ہونے کی وجہ سے چھوٹ لئے۔ ۱۸۴۲ء میں مداخلت بیجا کا مقدمہ چلایا گیا، ۱۸۴۶ء میں بلوہ کا، اور ۱۸۴۸ء میں سرقہ بالجبر کا لیکن کسی میں کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۸۴۸ء میں جب ان پر مقدمہ چلایا گیا تو حالت زیادہ نازک ہو گئی تھی اور حکومت کو فوجی دستہ بھیجنا پڑا۔ تمام مشرقی بنگال میں ان کے جاسوس متعین تھے اور تمام خبریں پہنچایا کرتے تھے۔ حالت یہ ہو گئی تھی

کہ اس جو ار کے تمام جھگڑے یہی طے کیا کرتے تھے اور کوئی شخص عدالت میں مقدمہ لیجاتا تھا تو اس کو سخت سزا دیتے تھے۔ یہ لوگوں کے نام احکام بھی صادر کیا کرتے تھے جن پر ”احمد نام نامعلوم“ کے دستخط ثبت ہوا کرتے تھے۔ جن لوگوں کے پاس اس دستخط کے احکام پہنچتے تھے وہ کانپ لٹھتے تھے اور خاموشی کے ساتھ بلا چون و چرا تعمیل کر دیا کرتے تھے۔

تاریخ ۲۴ ستمبر ۱۹۳۳ء ہمارے پور میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے، لیکن دریائے اریل نے اب ان کے مکان و مزار دونوں کو بے نشان کر دیا ہے۔ انھوں نے تین لڑکے اپنے بعد چھوڑے، لیکن ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ اپنے باپ کی اس تنظیم کو قائم رکھ سکتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ جماعت کمزور ہو گئی۔ اب بھی بعض افراد اس مسلک کے پائے جاتے ہیں۔ جو جمعہ اور عیدین کی نماز نہیں پڑھتے۔ اس مسلک کا نام اہل الفرائض یا نزاریضی تھا۔

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آئندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے۔ اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے حیرت انگیز حالات و واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول (۸) آٹھ آنہ کے مجلد کتاب صرف ۱۰ روپے اور غیر مجلد عا میں ۱۲ روپے۔ اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۱۰ میں ۱۰ روپے اور غیر مجلد سے ۱۲ روپے علاوہ محصول (۸) کے ۱۲ روپے۔ اگر ارشاد ہو تو یہ کتاب ذریعہ وی۔ پی۔ رواشکی جائے۔ حجم ۳، ۵ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے

منیجر نگار لکھنؤ

آہ طباطبائی

گلشنِ ماضی کو ویراں کر چکی اے مصفیر!
 عہدِ حاضر نے بدل دی علم و دانش کی فضا
 مٹ رہا ہے رفتہ رفتہ اضطرابِ خاکِ نجد
 مدتیں گزریں کہ دنیا کر چکی ان کو تباہ
 پھر بھی ہیں اک چیز عہدِ رفتہ کے اہل کمال
 ان کا ذوقِ علم تھا پابندِ تحقیق و تلاش
 صاف باطن، نیک دل، شائستہ فوہ، سادہ لہجہ
 ہو کہیں اور عہدِ نو! ان کی محبت کا جواب
 پھول اس گلشن میں اب اس رنگ کے کھلتے نہیں
 آہ اور نظم، اے فروغِ مجلسِ اہل کمال :-
 تجھ سے روشن تھا چراغِ محفلِ داغ و ایسہ
 بے تکلف اور گردوں سے گزر جاتا تھا تو
 عظمتِ عہدِ کس جی کھول کر آنسو بہا
 دے چکے دنیا کو داغ، ہجرِ شادِ بختہ سنج
 نظم نے بھی اب سنبھالا ایک بیک بخت سفر
 کون اب بخشے گا روجِ عشق کو احساسِ درد
 کیا گر کہے، اہل آئینِ قدرت ہے یہی

انقلابِ افگن ہوائے عہدِ نو کی دائرہ گیر
 کوئی تہذیب کس کا اب نہیں منت پذیر
 اٹھ رہے ہیں بے پے لے گیسے لیلے کے اسیر
 اب نہ وہ ایوانِ شیریں ہو نہ رقصِ حجئے شیر
 کر نہیں سکتا جنھیں مجروح دورِ جہنخ پیر
 کھوکھلے بندار کے مجرم نہ تھے ان کے ضمیر
 عہدِ عشرت کے ندیم، ایامِ علم میں دستگیر
 ان کی دانش کی مثال، انکی صداقت کی نظیر
 بے ریادل ڈھونڈھنے پر بھی کہیں ملے نہیں
 تھا سراپا درسِ بنیش تیری فطرت کا جلال
 تجھ سے رخشاں تھی بساطِ گلشنِ رشکِ جلال
 کس قدر یعنی سبک تھی تیری پروازِ خیال
 اب کہاں ایسے ادیب و شاعر شیریں مقال
 ہو چکے رخصت جہاں سے اکبرِ نازکِ خیال
 نظم تھا جو بالیقین سرِ حلقہ، اہل کمال
 کون اب کھولے گا اہل شوق پر رازِ جمال
 بدر کی صیادت چکنے پر بھی لازم ہے زوال

حیف اب یہ گلشن پر باد کھل سکتا نہیں :-

دہر میں ان کا جواب آئندہ مل سکتا نہیں

دردِ جدید

فلسفہ ہے زندگی کا آج کل بد لاہوا نشہ عیش و طرب میں ذہن ہے ڈوبا ہوا
 موسمی آتار میں ہیں جذبِ تنویریں تمام توڑ ڈالیں عشق نے مستی میں زنجیریں تمام
 رخصتِ پرواز ہے تخیلِ بے زنجیر کو جس طرح کیو پڑ ہو اس میں چھوڑے اک تیر کو
 ہے فضا کے بزمِ حسن و عشق سے لبریز آج آتشِ جذبات ہے حد سے زیادہ تیز آج
 بھر دئے رنگیں پیالے وقت نے حسبِ باد ہرزباں پر آج ہے ”عہدِ جوانی زندہ باد“

عمر میں اک وقت خود آتا ہے ایسا خوشگوار زندگی انسان کے قدموں پہ بھرتی ہونے کا
 خود برستی ہے شرابِ لالہ فامِ زندگی اور پی لیتا ہے اس کو تشنہ کامِ زندگی

باد لو آؤ کہ چھا جائیں فضائے مست پر بارشِ کیف و مسرت ہو بلند و پست پر

بیخودی دل کو رباب و چنگ کا پیغام ہے لاجھے لرزیدہ ہاتھوں سے پھلکتا جام ہے

سوچ رکھا ہے کرسائے میکلڈں کو توڑ کر

دل بناؤں مست و آوارہ سا ان کو جوڑ کر

صبحِ عشرت زندگی کی ہو، امری ہر ایک شام ہے ضیائے جلوہ خورشید، تاروں کا پیام

ساری دنیا سے الگ ک کیفیت میں ڈوبا ہوا گارہا ہوں اپنے نغمے آپ ہی بیٹھا ہوا

منزلِ عشرت پر آکر رُک گیا ہی کارواں ان مناظر سے اب گے ہیں شکستہ وادیاں

چاہتا ہوں ختم ہو جائے مری منزل ہیں دین ہیں، دنیا ہیں، محشر ہیں، محفل ہیں

بڑھ سکے اس سے نہ آگے کارواں زندگی ساز اپنا توڑے ای نغمہ خوانِ زندگی

زندگی کامل گیا رنگین تر حاصلِ مجھے میری موجیں کھینچ لائی ہیں سر ساحلِ مجھے

صبحِ حُسنِ زندگی، راتیں جمالِ زندگی

میں سمجھتا ہوں یہ ہے صدِ کمالِ زندگی

محمد صادق ضیا (بی ۱)

جان نغزل: —

جو ہدف ہو تیری نگاہ کا گلہ ستم وہ کرے گا کیا جسے تو سکوت کا درس دے وہ زبان سے اپنی کہے گا کیا
 مجھے اے نسیم بہار تو نہ سنا ترانہ سر خوشی کہ گراں ہو جس پہ ہر اک نفس، وہ یہ جام عیش پئے گا کیا
 جو سکونِ دل سے ہو بخیر اے بزم عیش سے کیا عرض جسے آہ و اشک ہو زندگی، وہ رہینِ درد ہنسے گا کیا
 کوئی تجھے بلبیل خوشنوا، مجھے دشمنی تو نہیں مگر جو خزاں کی زد میں ہو مضمحل، وہ چمن کھلا تو کھلے گا کیا
 جسے عشق لذتِ غم نہ دے، اے کیوں حیات گراں نہو جو پیامِ دل بھی سن سکے وہ نوائے روح سنے گا کیا

رگِ وپے میں صبر شکنِ خلش، جسے دو گھڑی بھی سکون نہ

وہ مریضِ آخرِ بینوا، کوئی دن جیا تو جسے گا کیا

علی اختر

(حیدرآباد دکن)

جذبات جاذب دہلوی: —

کون جاتا ہے گلستاں کی طرف؟ جا رہا ہوں میں بیاباں کی طرف
 دشت میں کاٹے ہیں اسکے منتظر کسے دیکھا ہے گلستاں کی طرف؟
 کیا بلندی اورستی میں ہے فرق؟ دیکھنا گورِ غریباں کی طرف

کہہ رہا ہے کون مجلس میں پرانی داستاں یہ تو خود پہلے ہی سے مست خمار دوش ہے
 وقت جب تاشیر کا آیا تو نالے تھم گئے کارواں بیدار ہے بانگِ اخاموش ہے

مجھے آنا ہو سکتے ایک خاموشی نہیں آتی میں آنا ہوں اگر مجھ کو دانائی نہیں آتی
 کبھی جاتے تھے نالے آسماں پر اب یہ حالت تھا ایک ہی دلیں جو لب تک بھی نہیں آتی

آنکھوں سے میری پودہ غفلت اٹھا دیا کس نے مے بچھے ہوئے دل کو جلا دیا؟
 میرے ثنائے سے نہیں مٹی مگر خودی ایسا تو ہو چکا ہے کہ خود کو مٹا دیا
 اپنی نظر سے میں نہ گر ایک بار بھی گو اس نے لاکھ بار نظر سے گرا دیا

فرض انجم ملا ہے آنکھوں کو ان کو داماں شب بھگوناب ہے
 ہاں ذرا اور تیز ہوں آنسو زندگی کو مجھے ڈبونا ہے

”گریہ تیمم“

- (۱) کوئی حسین نہیں دلیس جلوہ گریہ
قرا جاں نہوار است جگر نہ ہوا
سواد دیدہ میں جو تابش نظر نہوا
گر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہوا
- (۲) مری نظریں جمالِ حرمِ ناز رہا
ہجومِ عیش و مسرت سے ساز بار
ہمیشہ دور میں پیانا مجاز رہا
گر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہوا
- (۳) فسانے عشق و محبت کے عیش کو شہ ہے
ترانے محفلِ خلوت کے وقت گوش ہے
بہا عیش خیالات نئے و لاش ہے
گر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہوا
- (۴) گئی نہ کشمکش ہائے ہوئے سچ و کمال
مٹی نہ کاوشِ اندوہ و یاس و فحلال
دو فرغ سے رہا سینہ صورتِ عالی
گر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہوا
- (۵) کھلانا دل پہ کبھی رازِ کارِ زاریات
الم فرما ہے اسرارِ حشر و نشر و ممت
غدا پ جاں ہی ہر لحظہ آردے نجات
گر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہوا
- (۶) کیا نہ قلب کو فونِ جیم نے ٹکڑے
کیا نہ قلب کو آہِ لیم نے ٹکڑے
کیا تو گریہِ طفلِ تیم نے ٹکڑے
کیا نہ قلب کو حالِ تیم نے ٹکڑے
- (۷) غلامِ جیلانی عاصی

ذوق بے نیازی

درس حیات

وہ زندگی کا موسم زندہ دلی کا موسم
وہ عہدِ کامرانی وہ دورِ شادمانی
اب حتم ہو چکا ہے نشترِ جھو چکا ہے
ارمان مٹ گئے ہیں ہیجان مٹ گئے ہیں
وہ سرخوشی کہاں اب وہ بے خودی کہاں اب
ارمان خیز دل پر طوفان خیز دل پر
افسردگی ہے طاری آزر دگی ہے طاری
دنیا کی کلفتوں نے ظاہر کی اُلفتوں نے
ناشاد کر دیا ہے برباد کر دیا ہے

لیکن جہاں کے والی کون دمکان کے والی
ہر تلخ امتحاں میں جینا تو ہے جہاں میں
پھر یہ عذاب کیسا؟ یہ اضطراب کیسا؟
آہ و فغاں سے حاصل؟ رنجِ زیاں سے حاصل؟
ہے مضمحل تو کیا عم لوٹا ہے دل تو کیا عم

اک اور دل بنا دے

سب رنج و غم مٹا دے

عدم

تذبذب ایک دردِ لادواہر امید و بیم کی کیا انتہا ہے
نتیجہ کیا ہر اس مستقل کا تفکر خون پی لیتا ہے دل کا
یہ عقلِ روحِ آشامِ اکِ بلاہر مجسم موت، سر تا پا قضا ہے
خدا را چھوڑ مشغلِ سینہ کاوی کہ ہو جائے نہ تجھ پر موت حاوی
شعرا بے نیازی، زندگی ہے خارِ سرفرازی، زندگی ہے
حوادث خیز ہیں دورِ آسماں کے حوادث تم نہیں سکتے جہاں کے
دلِ میتاب کو سیما بنو رکھ تبسم سے لبوں کو سرخو رو رکھ
دعا کو ہاتھ اٹھانا بڑی ہے شکستِ زندگی ہو، بیکسی ہے
جناکش بن، جفا آشامِ ہوا، فکارِ لذتِ آلام ہو جا !
ذکر تو ہیں لیکن زندگی کی کہ یہ خوگر نہیں شرمندگی کی

انادوں میں عمل کی آگ بھردے

اجالا مغل ہستی میں کر دے

عدم

معلومات

یورپ کے عہدوگی کی حماقتیں

اس وقت یورپ و ایشیا ہر جگہ قانون کی دسترس صرف انسانوں تک ہے اور جانوروں سے مستثنیٰ سمجھے جاتے ہیں، لیکن قرون وسطیٰ کے یورپ میں جانوروں کے خلاف بھی بالکل اسی طرح مقدمے چلائے جاتے تھے جس طرح انسانوں کے خلاف دائر کئے جاتے ہیں۔ باقاعدہ استغاثہ کیا جاتا تھا، شہادت طلب ہوتی تھی، جانور گرفتار کر کے قید و بند میں ڈالا جاتا تھا۔ اور اس کے خلاف یا موافق فیصلہ صادر کیا جاتا تھا

۱۲۸۰ء اور ۱۲۸۱ء کے درمیان فرانس میں ۹۲ جانوروں کے خلاف فیصلے صادر کئے گئے اور ان کو قتل کی سزا دی گئی۔ ایک کسان کو کسی بیل نے اتنا زخمی کر دیا کہ وہ مر گیا، مقتول کے ورثاء نے اس بیل کے خلاف مقدمہ چلایا اور عدالت سے حکم صادر ہوا کہ جلسہ عام میں اس کو پھانسی دی جائے۔ اسی طرح ۱۲۹۹ء میں چودہ سال کے ایک لڑکے کو کسی بیل نے مار ڈالا اور اس کو بھی پھانسی کی سزا دی گئی۔ پھر یہ رواج صرف فرانس ہی تک محدود نہ تھا بلکہ دوسری مغربی سلطنتوں میں بھی پایا جاتا تھا

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رواج صرف اس خیال کی بنا پر قائم ہوا تھا کہ ایک جانور اسی وقت ایسی حرکتیں کرتا ہے جب اس کے اندر کوئی عفریت حلول کر جاتا ہے اور یہ سزائی الحقیقت جانور کو نہیں بلکہ اس عفریت کو دی جاتی ہے جو اس کے خون میں دوڑ رہا ہے

چنانچہ امریکہ کے کسی شخص کے پاس ایک سور تھا جسے اس نے سیدھا کر بہت سے کھیل تماشے گزار سکھایا تھا۔ یہ شخص اطراف ملک کا دورہ کیا کرتا تھا۔ اور تماشہ دکھا دکھا کر لوگوں سے انعام وصول کیا کرتا تھا۔ جب یہ شخص ہوائیا میں پہنچا تو یہ خیال کیا گیا کہ ضرور اس کے اندر کوئی عفریت کام کرتا ہے اور آخر کار اس کے خلاف مقدمہ چلا کر ہلاک کر دیا گیا

۱۲۹۲ء میں سوئٹزر لینڈ کے شہر بازا میں ایک مرغ نے انڈا دیا۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اور حاکم نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ ضرور اس مرغ کے اندر عفریت پایا جاتا ہے اس لئے مجمع عام میں اس کو جلا دیا جائے

ایسے تمام جانور دوران مقدمہ میں حوالات کے اندر رکھے جاتے تھے اور جو صرف ان کے خلاف مقدمہ چلانے میں ہوتا تھا اسے درج کاغذات کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۳۹۲ء کے کچھ کاغذات جو حال ہی میں دستیاب ہوئے ہیں ان کے دیکھنے سے

معلوم ہوتا ہے کہ ایک سو کے خلاف مقدمہ چلانے اس کو غذا دینے اور جلا د کو اجرت دینے میں کیا صرف ہوا ان مقدموں میں سب سے زیادہ مشہور مقدمہ وہ ہے جو سائٹ جولیان کے باشندوں نے جو ہوں کے خلاف دارکبا تھا۔ اور جو ۳۴ سال تک چلتا رہا۔ جو ہون کا وکیل مارٹون لویو شاسنی تھا جو فرانس کی تاریخ عدلیات میں غیر معمولی شہرت رکھتا ہے۔

جس وقت جو ہوں کے خلاف استغاثہ دائر ہوا تو حاکم نے ملزموں کی حاضری کا حکم دیا، تاریخ مقررہ پر جو ہوں کے وکیل نے عذر کیا کہ ملزموں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور کافی اعلان تاریخ مقررہ کا نہیں ہوا اس لئے وہ حاضر نہیں ہو سکے بعد ازاں اس عذر کو مقبول سمجھ کر دوبارہ نہایت وسیع پیمانہ پر اعلان کرنے کا حکم دیا اور دوسری تاریخ سماعت مقدمہ کی مقرر کی۔ جب اس تاریخ پر بھی جو ہوں حاضر نہ ہوئے تو ان کے وکیل نے کہا کہ بہت سے مدعیوں نے اپنے اپنے کھیتوں میں بلیاں پال رکھی ہیں اس لئے اس کے موکل جان کے خطرہ سے حاضر نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اس پر ہمیںوں تک بحث رہی کہ آیا قانوناً مدعیوں کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ ملزموں کی ہلاکت کے لئے با اختیار خود یہ طریقہ اختیار کریں۔ الغرض جب تاریخ مقررہ آتی تھی تو جو ہوں کا وکیل اسی طرح کا کوئی عذر پیش کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ۳۳ سال تک اس کی کارروائی جاری رہی

ڈاکٹر ہو کیا رڈ نے ایک کیمیائی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے بیان کیا کہ گزشتہ سات سال کے اندر اس نے ۲۳ ہزار ٹکیاں دواؤں کی استعمال کی ہیں۔ لیکن ایک

شخص سموئیل جیسپ اس سے بھی بڑھا ہوا تھا جس کا انتقال ۱۹۱۶ء میں ہوا۔ اس نے ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیان ۲۲۹۲۱ ٹکیاں دواؤں کی استعمال کیں یعنی سالانہ تقریباً ۱۰۸۰۶ ٹکیاں کھائیں لیکن اپنی عمر کے آخری پانچ سال میں یہ اوسط ۵۰ فی ہفتہ تک پہنچ گیا تھا۔ ان ٹکیوں کے علاوہ یہ ۴۰ ہزار بوتلیں رقیق دواؤں کی بھی پی گیا۔ جب وہ ان کی قیمت ادا کرنے سے عاجز آ گیا تو دوا ساز نے اس کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا اور دواؤں کا جو حساب اس نے پیش کیا وہ ۵۵۵ صفحات کو محیط تھا

تاریخ میں شاید ہی کوئی عورت اتنی فضول خرچ نکلے جتنی جو ز فین (بنولین کی بیوی) تھی۔ ایک سال میں ۱۲۰ شرفیاں صرف چہرہ کے سرخ

غازہ پر صرف ہو جاتی تھیں۔ اور جو اجرت سال میں اس کے حجام کو دی جاتی تھی وہ کسی بڑے سے بڑے جزل کو بھی نہیں ملتی تھی اس کے پاس ۵۰۰ قمیصیں تھیں اور دو سو جوڑیاں ریشمی موزوں کی روزانہ تین مرتبہ لباس بدلتی تھی۔ اور جس لباس کو ایک بار پہن لیتی تھی پھر دوبارہ استعمال نہیں کرتی تھی۔ ایک بیٹے میں ۳۸ ٹوپیاں نئی خریدتی تھی اور سال میں ۹۸۰ دستائے اور ۵۰۰ جوڑے جوتیوں کے — ہر سال ۴۰ ہزار گنی وہ اپنی ذہنیت میں صرف کر دیتی تھی۔ ہنولین اس کو خرچ کے لئے بہت کافی رقم دیتا تھا لیکن اس کے مصارف کسی طرح پورے نہ ہوتے تھے، چنانچہ

۲۰ ہزار گنی سالانہ جو بطور رشوت کے وہ لوگوں سے حاصل کرتی تھی اسے بھی صرف کر ڈالتی تھی اور پھر بھی یہ حال تھا کہ ایک بار نیولین کو اس کا قرض ادا کرنا پڑا جس کی مقدار ایک لاکھ پچاس ہزار گنی تھی

اس وقت علماء فلکیات کی رائے یہ ہے کہ چاند کی روشنی آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے، لیکن پروفیسر فوربس کی تحقیق یہ ہے کہ چاند بڑھتا جا رہا ہے اور اس کی روشنی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ چاند کے اندر ریڈیم کی مقدار کثرت سے پائی جاتی ہے جو اس کی حرارت کو قائم رکھے ہوئے ہے اور اس کے حجم کو بڑھا رہی ہے۔ پروفیسر مذکور کا خیال ہے کہ چاند کی روشنی و حرارت صرف سورج ہی سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ خود اس کے اندر کاربیڈیم بہت کچھ معاون ثابت ہوتا ہے

ایک حاکم کا فیصلہ خود اپنے خلاف

نیوجرسی (امریکہ) کا ایک مجسٹریٹ سائیکل پر سوار چلا جا رہا تھا لیکن جب لوگوں کا ہجوم سڑک پر زیادہ ہوا تو وہ فٹ پاتھ پر ہولیا (جو امریکہ میں مخصوص ہے صرف پیدل چلنے والوں کے لئے) یہ دیکھ کر سپاہی نے ان کو پکڑ لیا اور قریب کی عدالت گاہ میں پیش کیا جہاں کا خود ہی حاکم تھا۔ عدالت گاہ میں پہنچ کر یہ اجلاس کی کرسی پر بیٹھ گیا اور سپاہی سے کہا کہ الزام کی نوعیت بیان کرو، جب سن چکا تو اس نے بہ حیثیت ملزم کے جرم کا اعتراف کیا۔ اور اپنے اوپر ۳ ڈالر ۵۰ سنت جرمانہ کر کے حکم دیا کہ اس رقم میں سے ۸۰ سنت کانسٹیبل کو انعام کے طور پر دیا جائے، ایک ڈالر میونسپلٹی کے فنڈ میں جمع کیا جائے اور ۴۵ سنت مجسٹریٹ کو فیصلہ کرنے کی اجرت دی جائے۔ چنانچہ یہ فیصلہ سنا کر جرمانہ کی رقم اس نے اپنی جیب سے نکالی اور ۸۰ سنت کانسٹیبل کو دے کر ایک ایک ڈالر میونسپلٹی میں جمع کرنے کیلئے علیحدہ کر دیا اور ۹۵ سنت پھر اپنی جیب میں رکھ لئے کیونکہ یہ معاوضہ بہ حیثیت مجسٹریٹ ہونے کے خود اسی کا تھا

یہ امر غالباً اکثر لوگوں کو معلوم ہو گا کہ بعض چڑیاں (مثلاً قاز وغیرہ) ہر سال چڑیاں کیوں ہجرت کرتی ہیں

شمال سے جنوب کی طرف ہجرت کرتی ہیں اور ہزاروں میل طے کرنے کے بعد اون مقامات میں پہنچ جاتی ہیں جو نسبتاً زیادہ گرم ہوتے ہیں۔ عرصہ سے ماہرین اس کی جستجو میں تھے کہ اس کا کیا سبب ہے۔ آخر کار فرانس کے ایک ڈاکٹر نے اس راز کو معلوم کر لیا اور وہ یہ ہے کہ ان طيور کے خون میں ایک خاص قسم کا کیمیاوی مادہ پایا جاتا ہے جو دن کی لمبائی کے ساتھ ہجرت میں آتا ہے اور اسی لئے وہ خریف میں جنوب کی طرف اور بیچ میں شمال کی طرف چلی جاتی ہیں

اس کی تحقیق اس طرح کی گئی کہ جب غیر موسم میں نیشی شعاعیں ان پر ڈالی گئیں اور اس کیمیاوی مادہ میں ہجرت پیدا ہوا تو فوراً انھوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور اڑ کر دوسری جگہ چلی گئیں

عجائب عالم میں کسی چیز کو اتنی اہمیت حاصل نہیں جتنی دیوار چین کو حاصل ہے۔ یہ دیوار بحر اصغر

شروع ہوتی ہے اور چین، پنچوریا و منگولیا سے گزرتی ہوئی صحرائے گوبی تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کی لمبائی ۲۵۰۰ میل ہے اور ۲۵۰ ملین ٹن پتھر اس کی تعمیر میں صرف ہوئے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے صرف دس سال میں اسکی تعمیر ختم ہو گئی کیونکہ تین لاکھ آدمی شب و روز اس میں کام کرتے رہتے تھے

اس کی بلندی ۲۰ فٹ سے لے کر ۴۰ فٹ تک ہے۔ اس میں جا بجا ۲۵ ہزار برج بنائے گئے ہیں۔ جن میں کافی فوج رہ سکتی ہے۔ یہ دیوار شرق سے غرب کی طرف گئی ہے اور ۱۰۰ قبل مسیح میں مغلوں کا حملہ روکنے کے لئے طیار کی گئی تھی۔ اس کے برجوں میں اب بھی قدیم وضع کی توپیں لوہے اور تانبے کی رکھی ہوئی ہیں۔ کیونکہ چینی ہزاروں سال قبل بارود کا استعمال جانتے تھے

جرمنی کے ایک مہندس نے جس کا نام ہیرمان ہونیف ہے ایک مینار طیار کرنا شروع کیا ہے جس کی بلندی ۱۲۰۰ فٹ ہوگی۔ اس کی چوٹی پر پانچ چکر قائم کئے جائیں گے جو ہوا کے ساتھ گردش کریں گے اور جن میں سے ہر ایک کا قطر ۲۴۰ فٹ ہوگا۔ اس سے مقصود کہ بانی قوت حاصل کرنا ہے اس برج کی تعمیر اس سال ختم ہو جائے گی اور اسکی بلندی فرانس کے برج ایفل سے بھی ۲۰۰ فٹ زیادہ ہوگی

شہر پیٹز برگ میں ایک طالب علم موٹرسے ٹکرا گیا اور اسقدر خون اس کے جسم سے نکل گیا کہ زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ فوراً ایک ڈاکٹر (فریڈرک مارس) بلا یا گیا۔ اس نے صنائع شدہ خون کو ایک برتن میں لے کر اس کا درجہ حرارت وہی باقی رکھا جو جسم انسانی کا ہوا کرتا ہے۔ اور پھر بازو کی شریان کاٹ کر یہ خون اس کے جسم میں پہنچا دیا جس سے طالب علم کی جان بچ گئی

اندازہ کیا گیا ہے کہ اس وقت دنیا میں ہر سال ۷۰۰۰۰۰ ٹن کاغذ صرف ہوتا ہے جس میں سے ۶۰ لاکھ ٹن اخباروں کے کام آتا ہے۔ ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ کس ملک میں کتنا کاغذ صرف ہوتا ہے اور اسی سے وہاں کی مصافت کی ترقی کا اندازہ ہو سکتا ہے

امریکہ — ۳۷۹۴۰۰۰ ٹن	فرانس — ۴۱۱۰۰۰ ٹن
انگلستان — ۹۳۱۰۰۰ ٹن	جاپان — ۲۲۹۰۰۰ ٹن
جرمنی — ۲۵۱۰۰۰ ٹن	کناڈا — ۲۱۸۰۰۰ ٹن

تبسم کا عاشق | حال ہی میں روس کا ایک شخص سزاف نامی مراہو جو قبل جنگ وہاں کے کچھ پتی آدمیوں میں شمار ہوتا تھا۔ اسکو خط تھا کہ لوگوں کے فوٹو لے اس حال میں کہ وہ مسکرا رہے ہوں، چنانچہ وہ دو دراز مقامات کا سفر کرتا تھا اور گھنٹوں کیمرا لے ہوئے کھڑا رہتا تھا کہ کوئی مسکرائے اور یہ اسکی تصویر لے لے۔ اس نے اپنی تمام عمر میں لاکھوں روپیہ صرف کر کے چار ہزار نمونے تبسم کے فراہم کئے تھے۔ لیکن جنگ کے بعد یہ روس سے نکال دیا گیا۔ اور حد درجہ عسرت و افلاس کی حالت میں مر گیا۔ کاشکے یہ شخص لاکھوں روپیہ تبسم کی تصویروں میں صرف کرنے کے بجائے لوگوں کو تبسم بنانے میں صرف کرتا

کالیداس کی شکنتلا پر ایک ناقذانہ تبصرہ

(سلسلہء سابق)

ملاحظہ کیجئے شاداب جنگل کا منظر سامنے ہے۔ اور پہاڑی آبشار کے گرنے کی آواز دور دور تک سنائی دیتی ہے اور سورج کی زریں شعاعیں سرسبز اشجار کے پتیوں سے پھن پھن کر چکرورنی ہمارا ج دھیارا ج دشونت والی ہستنا پور کے رخسار مبارک پر پڑ رہی ہیں۔ ہمارا ج حکاری لباس پہنے ”دھنش و بانڑ“ ہاتھ میں لئے رتھ سے اترتے ہیں۔ اب ملاحظہ کیجئے اسٹیج کے پس منظر کو بلند کیا جا رہا ہے اور حد نظر تک ایک شاداب چراگاہ نظر آتی ہے کہیں خوبصورت ہرن کلیلیں کر رہے ہیں کہ دفعتاً دو سائوٹلی کسن لڑکیاں ایک راہب اعظم کے آشرم کے درختوں میں آبیاری کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ سوتر دھارا اپنے لاجبے گنگا جمبی عصا کو گردش دیکر شکنتلا کے اسٹیج پر آنے کا اعلان کرتا ہے دم بخود حاضرین یہ دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں کہ آیا ایکٹریس اپنے فرض سے عمدہ برآہوتی ہے یا نہیں! وہ اپنے لب جاں بخش سے مسیحائی کرتی ہے اوس کے منہ سے ہر لفظ موسیقی میں ڈوب کر نکل رہا ہے اوس کے مقیاس اشباب کی رعنائیاں اور بغیر کسی تصنع کے دل آویز۔ دلکش صبر و باس رکشیاں کچھ ایسے خالی حربے نہیں ہیں جو حاضرین خاموشی سے برداشت کر لیں۔ ہر شخص اپنے دل میں ایک خاص قسم کا میٹھا میٹھا درد محسوس کر رہا ہے۔ اسی طرح ہمارا جہ دشیت کا گندھارا دیت پر شکنتلا سے شادی — بحران فراق — کنول پر خط لکھنا — کنو کا دربار میں بیچنا۔ راجہ دشیت کا قول و قرار کو پورا نہ کرنا۔ منکا پسر کا آنا اور شکنتلا کا لے کر اڑ جانا کشید رشی کے آشرم میں سرون ہرن کی پیدائش۔ اندر بھا۔ میں دشیت کی طلبی۔ اور وصال محبوب یہ تھا وہ خلاصہ اوس بے نظیر ڈرامہ کا جو ایوان شاہی میں سفرائے دول کو محو حیرت بنا رہا تھا۔ جس سے غالباً آپ حضرات بھی باوجود دعائے اتفاقاً مخلوقاً ضرور ہولے ہوں گے ہاں یہ اور بات ہے کہ اُس کا اقبال آپ بوجہ چند اس بھرے مجمع میں نہ کر سکیں یا اوس کا اظہار کرنا پسند نہ کریں۔“

آپ نے دیکھا اس قادر الکلام شاعر کے ”خون جگر“ کی داد کس انداز سے دی گئی۔ اور شاہی سرپرستی نے اوس کی شہرت کو دو بالا کر دیا وہ امرسن کے الفاظ میں ”حقیقی شاعر“ تھا اوس کی زبان ان حقائق کی ترجمان تھی جن کو اس سے قبل کسی نے بیان نہیں کیا تھا وہ حقیقی شاعر اور حکیم حاذق تھا۔ وہ حقیقت شناس اور ترجمان حقیقت تھا۔ کیونکہ جن مشاہدات کو وہ بیان کرتا تھا ان کو اوس نے بہ چشم خود دیکھا تھا۔ وہ محرم راز فطرت تھا۔ کالیداس نے دنیا کے خیال کا مشاہدہ کیا تھا اور اب آپ کو کارخانہ اول کے حقائق اور بد ہیبت ابدی کی داستان خود رہا اپنے مخصوص لے میں سناتا ہے اور جب کالیداس کوئی مورد مذمت

آفریں موضوع تخلیق کرتا تھا تو اس کے قلب میں ایک پرجوش اور حیات بخش خیال رُونما ہوتا تھا جو نباتات و حیوانات کی طرح اپنے نظام فطری کو اپنے ہی دامن میں پرورش کرتا ہے۔ اور یہ خیال نشوونما پا کر مرقع فطرت میں ایک جدید آرایش کا سبب بن جاتا ہے یا ترجمان حقیقت علامہ اقبال کی لے میں

سینہ اشاعر تجلی زارِ حُسن	بیزوا ز سینائے ادا نوارِ حُسن
از رنگا ہشش خوب گرد و خوب تر	فطرت از افسون او محبوب تر
از دمش بلبل نوا آموخت است	غازہ اش رخسار گل افروخت است
سوز او اندر دل پر داند ہا	عشق را ۱۰۰۰۰۰ از و افسانہ ہا
بھر و بر پوشیدہ در آب گلش	صد جهان تازہ مضمردش
در دماغش ناد میدہ لالہ ہا	نا شنیدہ نغمہ ہا ہم نالہ ہا
فکر او با ماہہ و انجم ہم نشین	زشت را نا آشنا خوب آفریں

اثر صاحب نے خوب کہا ہے کہ ”شاعری ایک انفعالی کیفیت ہے کیونکہ ہم کسی جذبہ کو جب تک غمت کے ساتھ محسوس نہ کریں گے۔ دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتے۔ شاعری احساس حُسن ہے کیونکہ اس کا مقصد انسانی جذبات کو بلندی کی جانب لے جانا اور ان میں انبساط کے ذریعہ سے تہذیب پیدا کرنا ہے اور حُسن کچھ نہیں اگر انبساط کا محبوب ترین مجسمہ نہیں۔ شاعری جذبہ راستی ہے کیونکہ جب تک ہمارے محسوسات حقیقت سے ہمکنار نہ ہوں گے۔ ان میں نقص و تصنع پایا جائے گا۔ تخلیق محسوسات شاعری کا مشکل ہوتا ہے تاکہ راستی کے نقوش دل پر مرسم ہو کر موجب انبساط ہوں۔“ کالیڈاس کی شاعری کسی میزانِ عمل میں تو لے تو یقیناً آپ مجبور ہو کر یہی کہنے پر تیار ہو جائیں گے کہ واقعی کالیڈاس ہندوستان کی قدیم تہذیب کا ایک ایسا لافانی گلاب ہے کہ وہ یقیناً مصنف کی حیثیت سے قیود مکانی و زمانی سے کلیتاً آزاد ہو چکا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ہر جگہ ہر ملک۔ اور ہر نسل سے یکساں تعلق رکھتا ہے اور اس کا ادبی ترکہ دنیا کے عام ورثہ اور مشترک سرمائے میں شامل ہے بالخصوص ”شکنتلا“ جس کی ہر دلعزیزی غیر فانی اور دائمی ہے۔ شکنتلا میں قدیم ہند کی مدنیت اور روح جلوہ انگن ہے بلکہ ایک بڑی حد تک عمرانی حیثیات کا عطر اس نے پیش کیا ہے اس میں ہندوستان کا شاندار ماضی عجیب شان و شوکت سے ہمیشہ کیا گیا ہے اسی وجہ یہ نہیں ہے کہ ماضی بالعموم شاندار دکھلایا ہی جاتا ہے اور شاعر اپنے سخن نگاری سے اسے اور بھی زیادہ دل فریب عنوان سے پیش کرتا ہے۔ بلکہ فی الواقع ”ہندوستان کا ماضی شاندار تھا، اور ترجمان حقیقت نے محض خیالی تصویر نہیں اتاری ہے۔ بلکہ اس کا سخن نگار موقلم فطرت و حقیقت سے باخبر تھا۔ اور شکنتلا ان فطری اور حقیقی مناظر کا ایک شاندار

مجموعہ ہے۔

(۴۱)

انگریزی اور ہندی ادبیات میں ہیروئیس پر اگر کوئی تحقیقاتی مقالہ مرتب کیا جائے تو میرے خیال میں بہ امر محال ہوگا کیونکہ ان دونوں ادبیات میں ایک خاص فرق نمایاں ہے کہ ہمارے برادران وطن ان ہیروئیس کو مقدس دیویاں تصور کرتے انکی پرستش کرتے ہیں۔ اور ان کا خیال ہے کہ یہ ایسرائین تھیں جو انسانی شکل میں وقتاً فوقتاً دنیا میں نازل ہوتی رہی ہیں۔ ہم کو اس وقت اس نظریہ پر بحث و تمحیص کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن نفس مضمون سے چونکہ ہمارا تعلق ہے اس لئے یہ نظریہ زیر بحث آیا اور نہ ظاہر ہے۔ ذاتی عقائد کو ادبیات سے کیا علاقہ ہو سکتا ہے؟ ہر شخص کو یہ اختیار کئی حاصل ہے کہ وہ اپنے عقل و تہذیب کے مطابق ایک شاہراہ حقیقت دریافت کر کے اوس پر سختی سے گامزن ہو۔ مقصد یہ ہے کہ ایسی حالت خاص میں ہیروئیس پر تبصرہ کرنا کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے۔ کیونکہ ادن کی شخصیتیں زیادہ ترقیدی قیاسی اساطیر اور سماعتی افسانوں میں پوشیدہ ہیں اور مذہبی احترام کا خوبصورت ہلکا پردہ ان پر پڑا ہوا ہے۔ جس کی بنا پر ادن کا صحیح کردار عوام کے روبرو آزادی سے پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اساطیر و واقعات کچھ اس طرح آپس میں ملے ہوئے ہیں کہ بسا اوقات صحت و عدم صحت، ممکنات و ناممکنات، انسانی و ما فوق انسانی کردار میں امتیاز صحیح مشکل ہی نہیں یقیناً ناممکن ہے۔ بعض نقاد ان فن معترض ہیں کہ افسانوں میں انسانوں کے ساتھ دیویاں و دیوتا بھی امور مفوضہ سرانجام دیتے نظر آتے ہیں جس کی بنا پر افسانے کے واقعات قدرتی طور پر رونما نہیں ہوتے اور نہ اشخاص اپنے کردار قدرتی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور نہ ان کے اعمال و سیرتوں کا مکمل انکشاف ہو سکتا ہے لیکن وہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان اساطیر کے مصنف اور مخاطب ان سب اشیاء پر اعتقاد تامہ رکھتے تھے اور ادن کی نظر میں دنیاوی اشخاص اور سماوی افراد کا اشتراک عمل ایک حقیقی امر تھا۔“

بات مذلت حبیب کی طرح بڑھتی گئی۔ کتابیہ تھا اور کنایہ چاہتا تھا کہ میں نے شگفتا کے ڈرامہ کو ماہ بھارت سے اخذ کیا ہے۔ کیونکہ آریہ ورت کے قدیم ادبی ترکہ میں رامائن و ماہ بھارت ایسی مکمل کتب ہیں جو ہر آریہ دائرۃ المعارف کے لئے کی مستحق ہیں ان میں ہر ممکن سائنس پر تعلیم موجود ہے۔ اور بہترین و بدترین دونوں قسم کے کردار ذکور و اناث کے آپ کو ملیں گئے جن کے پڑھنے سے اگر ایک جانب دوزخ کا درد و آزارہ قریب تر ہوتا جائے گا تو دوسری جانب رضوان جنت بھی نہایت مسرت سے پڑتیاک خیر مقدم کے لئے آپ کو انشاد اللہ تیار لے گا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جس کسی کو قدیم آریہ ورت کی سادہ شریفانہ مدنی عمرانی اقتصادی کیفیات کا مطالعہ کرنا ہو۔ اس کے لئے یہ لاپذی ہے کہ وہ ان کتابوں کو پڑھے اور لطف اندوز ہو۔ چنانچہ گیتا کی تعلیمات کے بعد میں نے یہ طے کیا تھا کہ آئندہ حقیر تحفہ جو میں اپنے برادران وطن کی خدمت میں پیش کروں گا وہ یہی شگفتا ہوگی۔ شکر ہے کہ آج یہ ڈرامہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ بہت کم افراد کو غالباً یہ بھی علم ہوگا کہ یہی وہ شگفتا

ہے جو کوروں و پانڈوں کے مورثا کے اہلکار اور بھارت کی واجب التعظیم ماں ہونے کا شرف بھی رکھتی ہے۔ گو آج دنیا شکنتلا کو کالیڈاس کے غیر فانی شاہکار کی حیثیت سے بخوبی جانتی ہے۔ اور چونکہ قادر الکلام شاعر پستی و بلندی و سنی و تاریخی سے پوری طرح واقف ہے اسی لئے شکنتلا مظاہر قدرت و جذبات انسانی کا ایک نہایت دلکش مرقع بن گئی ہے (گیا ہے) اگر ہم شکنتلا کا کردار میزان تنقید میں تولیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ اس میں وہ جملہ عناصر موجود ہیں جو ایک پیکر عصمت کو مکمل عورت بنا سکتے ہیں وہ حسین ہے شرمیلی ہے نازک ہے خاموش ہے صابر ہے اور سادگی سے عیش کے ایام گزار سکتی ہے یہی نہیں بلکہ ان عناصر کے علاوہ حورسرسنت شکنتلا میں ایک خاص فطری سنجیدگی بھی پائی جاتی ہے جس کا اظہار کسی ایک لفظ میں ہونا یقیناً مشکل ہے۔ بچپن میں جب ماں باپ نے رفاقت سے منہ موڑا تو ایک عابد و مہربان کے رشک ارم "اشرم" میں اوس کی پرورش ہوئی ہے۔ یہ خیال رہے اوس کو کبھی شہر کی متمدن مہذب جماعت میں شرکت کا موقع نصیب نہیں ہوا ہے مذہبی درسیات اوس کو اسی شانسی نکتہ میں راہب اعظم کو دیتا ہے۔ اسی لئے اوس کے دماغ میں سوا قدرت کی دلکش تعلیمات اور بہشت کے دلفریب تخیل کے کوئی دوسرا نامحسوس خیال نہیں ہے اوس کو کائنات اور اوس کے آلائشوں سے مطلقاً تعلق نہیں ہے۔ وہ خانقاہ کے خود در پھولوں میں مثل ایک شاداب سد بہار پھول کے پھولی پھولی اوس کی برادری انسانوں سے نہ تھی وہ نباتاتی قربت کی قائل تھی۔ اگر ہم حور زنا و شکنتلا کا مقابلہ کسی مغربی ہیردین سے کر سکتے ہیں تو وہ شکسپیر کے خیال کی تخلیق شدہ میرنڈہ (میسٹ) ہو سکتی ہے۔ گو واقعہ یہ ہے کہ کسی دوسرے ہم جنس سے اوس کا تقابل ناممکن ہے۔ شکنتلا کی طرح میرنڈہ بھی پھولوں کے دلفریب گوارہ میں پل کر مہیب لیکن رنگین جنگلوں کی لامتناہی گہرائیوں میں نشوونما پا کر شاداب مرغزاروں اور قدرتی آبشاروں میں پرورش پا کر اپنی نشاط حیات سے آنے والی نسلوں کو موجودیت بناتی ہے۔ اور ایک بڑی حد تک شکنتلا کی خوش گو اور سادگی۔ اوس کی بے لوث پارسائی اور سماجی مراسم و رواج سے مطلقاً بے نیاز میرنڈہ کو اوس کے مقابلہ میں پیش کر سکتی ہے۔ اور اسی وجہ سے ایک ناقہ نے اوس کو "بنت فطرت" کا خطاب دیا ہے جو کہ "آرایش و تزئین کی تخلیق شدہ پیکر نہ تھی" اور یہ واقعہ بھی ہے کہ شکنتلا حور زنا و شکنتلا بنت فطرت تھی اور دنیاوی فانی تزئین و آرایش کو اوس کی نشوونما سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ لیکن ایک دوسری حیثیت سے اوس کی شخصیت میرنڈہ سے ارفع ہو جاتی ہے۔ میرنڈہ کی پیدائش سحر کے حلقوں میں ہوئی ہے اور بجائے اس کے شکنتلا کی پیدائش بشری اصول پر ہوئی ہے۔ اور اوس کی پرورش ایک زاہد شب بیدار کے خانقاہ میں ایک راہبہ کے ہاتھوں ہوئی ہے میرنڈہ کی طرح شکنتلا کو بھی اپنے محبوب سے اظہار محبت میں اصلاً باک نہیں ہونا اور وہ پہلی طاقات میں صیب کے حضور

"Shakuntala" - A.C. Mukerji. I.E.S. She is a child of fashion, not a product of fashion (Oxford University Press, 1929)

میں نقد دل پیش کر کے سراپا سوز بن جاتی ہے۔ یہ تھی ایک فطری تعلیم اگر وہ بھی شہری ماحول میں نشوونما پاتی تو یقیناً وہ اس طرح صفائی سے اقرارِ محبت پر تیار نہ ہوتی لیکن اسی کمزوری نے اوس کو محبوبِ خلائق بنا دیا ہے۔ بس یہیں سے شرتی و غزبی کردار کا خفیف تقابل بھی ختم ہو جاتا ہے اوس کے بعد آریہ ورت کا ہومر جس دلفریب عنوان سے شگنتلا کا کردار پیش کرتا ہے اور لافانی محاسن سے عوام سے خراجِ تحسین وصول کرتا ہے وہ ڈرامہ کا آخری حصہ ہے۔ اور یہی وہ سبب ہے جس نے شگنتلا کو ہر زمانہ کے لئے ”سمو“ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر ملک و ملت کے خوش ذوق افراد آج بھی شگنتلا کے ڈرامہ کو پڑھ کر منہموم بھی ہوتے ہیں۔ اور مسرور بھی!

مشرقی تعلیم یہ ہے کہ انتہائے عیش کے بعد شاہ راہ غم بھی موجود ہے۔ چنانچہ اس قصہ میں بھی یہی منزل شگنتلا کو پیش آتی ہے راجہ دشتیت شکار کے بعد ہستنا پور میں داخل ہوا شاہی زندگی میں اپنے خوابِ عشرت کو بھول گیا۔ اور شگنتلا کو اوس نے مطلقاً یاد نہ کیا۔ اس عرصہ میں اس کی محبت کا شرم بھی بار آور ہوا اور راہبِ اعظم کنوکی خانقاہ میں نو مولود پرورش پاتا رہا۔ شگنتلا نہایت درجہ جرات اور صبر سے فراق کے مصائب برداشت کرتی رہی اور کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اوس نے یہ تصور نہ کیا کہ اوس کے عزیز ”پران پتی“ نے اوس کو فراموش کر دیا ہے۔ جب یہ لڑکا ۶ سال کا ہوا تو راہبِ اعظم نے یہ خیال کر کے کہ اب اس کی ولیہمدی کا اعلان ہونا چاہئے۔ شگنتلا کو اپنے دو جیلوں کی محافظت میں ہستنا پور روانہ کیا۔ یہاں پر یہ بھی عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات نے اس قادر الکلام شاعر کے ڈرامہ کو پڑھا ہے اون کو یہ اختتامِ الٹکا نظر آئیگا۔ گواصل مہا بھارت میں یہ قصہ اسی طرح ختم کیا گیا ہے لیکن ہندوستان کے ہومر نے اس خاتمہ میں بے لطفنی محسوس کی اور اس افسانہ کو ایک نئی شکل میں پیش کیا۔ اور اوس عہد کے علمائے کرام کا احترام و عظمت قائم کرنے کے لئے دریا سارشی کے شراب پلے کا افسانہ ریشیوں کے غیر معمولی عظمت پارینہ کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے اضافہ کیا اوس کو عوام کے جذبات پر قابو حاصل کرنے کے لئے اور دوسرے الفاظ میں دماغی کیفیات پر بہت کافی عبور تھا اوس نے یہ تصور کر کے کہ یہ دور مذہب پرستی کا ہے اس لئے مذہب

سے اب بھی برادرانِ وطن کی ایک کثیر جماعت اس شراب سے خائف رہتی ہے۔ مسٹر۔ اے۔ سی۔ کرجی دہلی زبان سے یہ کہنے کی ہمت کرتے ہیں کہ بے خوف غیر تعلیم یافتہ میں اب بھی پایا جاتا ہے اور گواہ ان شرابوں میں شائد کوئی افزائی نہ رہا ہو۔ میں اس قول کی تردید کرتا ہوں کیونکہ یہ کسی حد تک ان علما پر ایک براتبرہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُس دور میں علماء کی عبادت میں ریاضتیں بہت برسی ہوئی تھیں اور زہد و اتقا کی بنا پر اگر اس قسم کی مافوقِ عادات اون سے سرزد ہوتی تھی تو چنداں تعجب نہیں ہے۔ چونکہ اب ان بالکال زیادہ کی جماعت مفقود ہو گئی ہے۔ اور نہ اون کے نقش قدم برابر کوئی چلتا ہے لیکن علمائے کرام مہافت فرمائیں اب بھی اسی احترام کے اپنی ذات کو مستحق تصور کرتے ہیں۔ لیکن اگر اپنی ریاضات و عبادت اوس بیانیہ کی کر لیں جتنی دورِ پاکستان میں تھی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اوسکی عظمت پارینہ دوبارہ مسلم نہ ہو جائے

کی تعریف اور مذہبیات کے محافظین کی توصیف کرنا شہرت کے اضافہ کے مترادف ہے اور یہ وہ اختراع کی کہ کس طرح ایک آریہ پتر اپنا قدیم وعدہ کو بھول گیا جو ہر آئینہ ایک شہنشاہ وقت کے شان شایاں نہ تھا۔ اس طرح میرے خیال میں قادر الکلام شاعر کو اپنے سر پرست و مرئی ہمارا جہ بکرا بحیثیت کو ایک خوبصورت پیرائے میں سبق دینا منظور تھا۔ بہر حال شکنتلا شاہی محلہ کے صدر دروازہ پر پہنچی تو شرف باریابی اوس کو عطا کیا گیا اوس نے کہا آریہ پتر تمہارا لڑکا ہے اب تم حسب وعدہ اُس کو ولیمہ بناؤ، راجہ نے جواب دیا۔ اے نظر فریب راہدہ! مجھ کو کچھ نہیں معلوم تم کیا کہتی ہو۔ مجھے تم کو سناک مناکت میں داخل کرنا یاد نہیں ہے۔ یہ الفاظ اپنے "پیتم پیارے" کے منہ سے سُکر محبت کی ماری شکنتلا یقین نہ کر سکی اور شرمندگی سے اوس کو غصہ بھی آیا لیکن وہ صلحاً ساکت ہو گئی۔ اس کے لبوں میں ارتعاش خفی محسوس کیا گیا آنکھیں فرط غم سے پھرا گئیں معلوم ہو رہا تھا گویا اوس کی آنکھیں حُسن شاہی کا جائزہ لیتی ہوئیں کسی خاص مقام پر ٹھہر گئی ہیں تھوڑی دیر خاموشی کے بعد شکنتلا نے جھلا کر کہا کہ اے شرم! راجہ تجھ کو یقیناً سب یاد ہے لیکن تو ہنستا ہے اس لڑکے کو بھی تو جانتا ہے کہ یہ میرا ہی ہو۔ تو کیوں ہنس کر انکار کر رہا ہے؟" اب راجہ دشیت نے زیادہ سختی سے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا کہ یہ کون لڑکا ہے اور نہ یہ لڑکا میرا ہو سکتا ہے۔ عورتیں جھوٹی ہیں کون اس کو یقین کرے گا۔ مجھ کو میرے سامنے بھی ایسی بے برکتی گفتگو کرنے شرم نہیں آتی۔ جا میرے سامنے سے دور ہو جا۔"

اب آپ شکنتلا کے کردار کے اصلی خدو خال ملاحظہ کیجئے۔ کہ ایک وفا شعار بیوی کہ وہ سخت کلامی کوشیریں سزبت کی طرح جرات اور خوش روی سے سنتی ہے اور پی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس وہ کافی الفاظ نہیں ہیں جو اس بے نظیر کردار کے لئے پیش کئے جاسکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شکنتلا اپنی ذات کے لئے نہ لڑ رہی تھی۔ وہ نسوانی عزت عصمت اور پارسائی کے لئے جنگ کر رہی تھی۔ اور یہی نہیں بلکہ وہ ایک حق کے لئے لڑ رہی تھی۔ اپنے لڑکے دہرن سرود بھرت سے اوس نے اب آخری بار زیادہ ہمت اور جرات سے کہا۔ ہمارا ج خالق اکبر کا نام سچا ہے اسی طرح ایک پاک قول بھی حق ہے۔ اگر تم اپنی ضد پر قائم ہو اور صداقت سے منکر ہو تو اچھا اب میں جاتی ہوں اور رہا میرا مسئلہ شادی تو تمہارے ایسے شخص کے ساتھ میرا بیاہ کوئی معنی نہیں رکھتا ہے لیکن یہ سن لو کہ بھرت بغیر تمہاری امداد کے بھی جکر درتی راجہ ہوگا اور ایک دن یقیناً وہ اسی سنگھاسن پر سر پر آئے سلطنت ہوگا

سفرنی انسانہ نگاروں کا یہ ہمیشہ سے طریقہ رہا ہے کہ اون کا انجام حزن تہ نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ طربہ اختتام ان میں رائج رہا ہے۔ چنانچہ مباحثات کا فاضل مقالہ نگار غیبی امداد سے قصہ کا رخ پلٹ دیتا ہے اور دشیت بھرت کا حیرت مند کرتا ہے اور شکنتلا کو واپس بلا کر رنواس میں داخل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پیاری شکنتلا چونکہ ہماری شادی دنیاوی نظروں سے پوشیدہ ہوئی تھی اس سے مجھ کو تذبذب تھا کہ میں کس طرح خوش اسلوبی سے تمہاری عزت بچا سکتا ہوں۔ فکر نہ کرو یہ لڑکا ولیمہ ہوگا

اور یہی میرا لڑکا ہے اس کے ہوتے ہوئے کس کی ہمت ہے کہ وہ تخت نشین ہو سکے۔ مہا بہارت میں یہ محیر العقول افسانہ اسی طرح ختم ہو جاتا ہے لیکن ہندوستان کا چاترا جین کی ملکہ زمانی کو خوش کرنے کے لئے نسوانی وقار کو بڑھانے کے لئے مروجہ مراسم ذہنی کوشش دینے کے لئے تصویر کا رخ ایک نئے انداز سے پیش کرتا ہے کہ دشیت کی درشت کلامی کے بعد چیلے بھی شکنتلا کا ساتھ بھوڑ کر تھوڑن میں چلے جاتے ہیں۔ اوس وقت منکا اپسرا آتی ہے اور شکنتلا کو لے کر اڑ جاتی ہے ایک اشترم میں دھرن سر و پیدا ہوتا ہے اندر سبھا میں دشیت طلب کیا جاتا ہے وہیں واپسی میں ایک اشترم میں وہ ایک شیر کے بچے سے ایک انسان کے لڑکے کو کھیلنے دیکھتا ہے اوس کا تعویذ اٹھانا ہے اور انکشافات ہوتے ہیں۔ اور طائب و مطلوب ملتے ہیں ”زود پشماں“ کی نگاہیں ”چار ہوتی ہیں“ تو ”پیار“ آتا ہے اور وہ اس وقت انتہائی شرمندگی سے شکنتلا کے قدموں پر گرنے لگتا ہے۔ شکنتلا سمجھاتی ہے اور یہ لکڑی پران ہتی کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ یہ تو میرے گزشتہ کرموں کا انجام تھا جو یہ مصائب برداشت کرنا پڑے اور اس طرح سارا الزام اپنے ذمے لے کر اپنے محبوب کو بے قصور ثابت کر کے میرے خیال میں ایک حیرت انگیز ایشا رعدیم المثال صبر اور ”ان دیکھے“ غیر معمولی تحمل کا درس آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے پیش کرتی ہے!

ایسا مکمل اتحاد عظمت و شیریں نوانی کا برج یہ ہے کہ شکنتلا کے کردار کے سوا بے یک وقت کہیں آپ کو نہ ملے گا۔ اور خصوصیت سے جب ہندوستان کا شاعر اعظم اس پر نقش و نگار بناتا ہے تو یقیناً یہ ایک ادبی معجزہ ہو جایا کرتا ہو اگر ساوتری کا افسانہ زن و شو کی فطری محبت کا ایک غیر مری منظر پیش کرتا ہے تو یقیناً شکنتلا کا افسانہ روحانی عشق کے مجسمہ کی نمایندگی بھی کرتا ہے ہندو شعرا کا ہمیشہ یہ رو یہ رہا ہے کہ وہ محض اوسی عشق کے قائل رہے ہیں جو محض عیش نہ ہو بلکہ وہ پاک اور ماحول کے جملہ الایشوں سے بھی منزہ ہو۔ اور یہی ایک وجہ ہے کہ اون کی شاعری

لہ ساوتری مہا اس کے ایک راجہ کی لڑکی تھی۔ اوس کو ایک راجہ کے لڑکے سے محبت ہو گئی کچھ لوگوں کو علم ہوا۔ اور مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ علمائے نجوم کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی زندگی کے محض دو سال اور باقی ہیں۔ والدین کو بھی معلوم ہوا انھوں نے بھی مخالفت کی لیکن آخر کار ساوتری کی شادی اسی راجہ کے لڑکے کے ساتھ ہو گئی۔ اوس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اوس کی شوہر کی زندگی ختم ہونے والی ہے اور جب وہ وقت آیا تو ملک الموت شوہر کی روح قبض کرنے کے لئے آیا۔ اوس نے کہا کہ جہاں تم اس روح کو لے جاؤ گے وہیں میں بھی ساتھ جاؤں گی چنانچہ اس ثابت قدمی کو دیکھ کر ملک الموت نے اس کے شوہر کی جان واپس کر دی۔ اور وہ عرصہ تک حکمرانی کرتا رہا۔ اور اب بھی یہ سدا بہا گن مئی جون (جینو) میں کئی دن اسی خوشی میں خوشیاں مناتی ہیں اور اپنے شوہروں کی صحت و عافیت کی دعائیں مانگتی ہے

ہزار ہا برسوں سے رائج و مقبول ہے۔ کیونکہ اس شاعری میں محبت نفسانی خواہشات کی تکمیل کا نام نہیں ہے بلکہ محبت نام ہے۔ نون و شو کی عمرانی پاک تعلقات کا جس کا لازماً آخرہ اون کو اولاد کی شکل میں بھی ملتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا عشق ہمیشہ ہر دور میں زیادہ دیر پا اور خوشگوار تسلیم کیا گیا ہے۔ اور یہ عناصر ہندوستان کی جملہ ہر و میس میں مشترک حیثیت رکھتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ جذبہ عشق ہی اون کی حیثیات کو دو بالا کرتا ہے گو دینیتی بھی ساوتری و شکنتلا کی طرح ایک صحیح جذبہ عشق رکھتی تھی۔ لیکن فرق یہ ہے کہ دینیتی کے یہاں وحشیانہ زیادتی۔ خواہشات کی تکمیل۔ بھول جانے کی ناقابل بیان تکلیف۔ غصہ۔ رنج۔ ملال۔ کے جذبات زیادہ ہیں جو میرے نظریہ میں اوس کی شخصیت کو شکنتلا سے گرا دیتی ہے۔ لیکن جو عشق شکنتلا کے صبر ایشار۔ اطاعت کے اجزائے ترکیبی سے مرکب ہے وہ یقیناً شرتی ادبیات میں کہیں دوسری جگہ اوس دور میں نظر نہیں آتا۔ گو دینیتی کا عشق بہت لطیف پیرایہ میں شروع ہوتا ہے یہ شکنتلا کی طرح ایک نظریہ نہیں۔ بلکہ ایک ہنس کے پیام پر راجہ نل کے حسن و شجاعت کا افسانہ ہو کر باسکر اپنا قرار و صبر ان دیکھے محبوب کے قدموں پر نثار کر دیتی ہے۔ لیکن پھر بھی مجموعی حیثیت سے دینیتی و ساوتری شکنتلا سے میدان عظمت میں آگے نہیں ہیں لیکن اگر کوئی کردار ہندوستان ایسا پیش کر سکتا ہے جو شکنتلا کی عظمت مسلمہ کو شکست دے سکتا ہے تو وہ یقیناً سیتا جی کی غیر فانی شخصیت ہے۔ شکنتلا تو بیچاری بن باہی

۱۷ دینیتی جس کا دوسرا نام دمن ہے ہندوستان میں لبتی سے کم مشہور نہیں ہے۔ فیضی نے بھی اس کو فارسی میں ترجمہ کیا وہ بہت حسین و دفا دار اور مستقل مزاج تھی۔ سوئمیر کی رسم میں راجہ نل نے اوس کو حاصل کیا اتفاق سے کچھ بری ساعت آئی اور اوس کے دیور راجہ پکارا نے اس کے شوہر اوس کے شوہر کو جوئے میں جیت لیا۔ اور ذلت و خواری سے شہر بدر کر دیا۔ ان دونوں کے پاس سواستر عورت چھپانے کے لئے کوئی کپڑا نہ تھا۔ جنگلی جانوروں پر نل نے ایک کپڑا ڈالا۔ پھلی بھونی رکھی تھی وہ دریا میں چلی گئی۔ دینیتی کو ایک شب کو تنہا چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اور راجہ اجدھیا کے یہاں نام بدل کر دھبانی کی ملازمت کر لی۔ دینیتی فراق کے صدر بھیلتی ایک راجہ کے یہاں پہنچی اوس نے بہت عزت و احترام سے اوس کو اوس کے میکہ بھجوا دیا۔ جب وہ گھر پہنچ گئی تو اوس نے نل کی تحقیقات شروع کی اور جب اوس کو علم ہوا کہ نل اجدھیا میں ہے تو اوس نے راجہ اجدھیا کے پاس ایک سپاہی بھیجا کہ دینیتی دو بارہ سوئمیر منائے گی کیونکہ اوس کا شوہر لاپتہ ہو گیا ہے اس لئے فلاں وقت فلاں دن دو بجھا میں سوئمیر رجا یا جائے گا۔ جب نل نے یہ سنا دن کو بہت قلق ہوا۔ وقت کم تھا اور سوال کے دوسرا تھا اس کمال سے ہانک نہ سکتا تھا۔ فوراً رات بھر راجہ اجدھیا نل کے ساتھ اجدھیا سے چلا اور وہاں جا کر نل اور دینیتی کی ملاقات ہوئی۔ اور جب فراق دور ہوا تو نل نے دوبارہ پیشکار سے جو اگھیللا اور اوس کو ہر اکرمیش و آرام سے حکومت کی

۱۸ سیتا۔ راجہ جٹک کی صاحبزادی تھیں سوئمیر کے اصول پر راجہ رام چندر سے اوس کی شادی ہوئی اور بن باس کے زمانہ میں بھی شوہر کی رفاقت سے منہ نہ موڑا۔ وہیں رادون سیتا جی کو فقیر کے دھوکے میں آکر لٹکائے گیا۔ جب رام چند جی نے لٹکا پر فتح حاصل کی اوس وقت سیتا جی کو رادائی نصیب ہوئی اور اجدھیا میں آکر عیش سے زندگی گزارنے لگیں۔ لیکن ناگردہ گناہ اور مخلوق کے طعنوں تشنوں سے عاجز آکر مہاراجہ راجہ چند

یوسف صاحب

آخر آپ ہیں کہاں اور کس فکر میں سرگرداں ہیں - مہینوں ہو گئے کہ آپ نے نہ مجھے پوچھا نہ کسی اور کو —
 اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا !
 آپ کی زلیخا بہت یاد کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ یہ یوسف اب کے مل بھر جائے اگر "قدیمین" ...
 کر کے واپس نہ بھیجا ہو تو ہسی — سو بھٹی میں یہ مشورہ تو کبھی نہ دوں گا کہ تم یوں بہتے ان کے سامنے آ جاؤ،
 لیکن یہ ضرور کہوں گا۔ کہ جہاں تک ممکن ہو اس جھگڑے کو آگے نہ بڑھنے دو
 یہ تو سمجھو کہ جو تم پر اعتماد کر کے ساری دنیا کو چھوڑ بیٹھے، اس کے جذبات کا کچھ تو خیال کرنا چاہئے — بیوی
 بننے کے لئے یہ شرط ضروری نہیں کہ وہ شوہر کے خلاف کبھی صدائے احتجاج بلند نہ کرے — مانا کہ تم التزام
 کے ساتھ خرچ بھیجتے رہتے ہو، لیکن اگر دسویں بند رہو اس ایک آدھ دن کے لئے اپنی صورت بھی دکھا جابا کرو تو
 کیا گناہ ہے — فاصلہ بھی زیادہ نہیں کہ یہ عذر پیش کر سکو — چاہو تو دن میں دو بار آ جا سکتے ہو
 ہاں، تو بتاؤ کب آؤ گے۔ تاکہ میں یہ خوشخبری انھیں جا کر سنادوں۔ اور ساتھ ہی ساتھ دعوت کی فرائض
 کروں —

نیاز

نگارستان حصہ دوم

یعنی

حضرت نیاز فتحپوری کے ۳۰ بہترین انساؤنوں کا مجموعہ جو اس سے قبل کبھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے
 زیر کتابت ہے حجم ۵۰۰ صفحات سے زائد ہوگا۔ اور غالباً اکتوبر ۱۹۳۳ء تک شائع ہو سکے گا۔ اس کی قیمت علاوہ محصول
 (سے) سے کم نہ ہوگی۔ لیکن جو حضرات دور در پیہ ذریعہ امنی آرڈر بھیج کر ابھی سے اپنا نام درج رجسٹر کرالیں گے اور ان کو
 اسی عار میں یہ نادر مجموعہ مل جائے گا۔ غالباً یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت صحیح معنی میں انشاد عالیہ لکھنے والا
 اگر کوئی ہے تو وہ صرف حضرت نیاز ہیں اور اس لئے اس مجموعہ میں ایسے ایسے جو اہر ادب آپ کو ملیں گے۔ جو کسی دوسری
 جگہ میسر آ ہی نہیں سکتے،

نیچر نگار بھنڈو

پاس عہد

یہ فسانہ ترجمہ ہے کسی بنگالی خاتون کے فسانہ کا جس کو کچھ حذف و اضافہ کے بعد نگار میں درج کیا جاتا ہے، نتیجہ بھی اس کا بالکل بدل دیا گیا ہے، جو بالکل غیر رومانی "تھا۔ امید ہے کہ محترم مادی صاحب معاف فرمائیں گے

نیاز

انڈیا، کلکتہ کے ایک نہایت سخت کٹر ہندو گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اور گو اس کا خاندان اتنے بڑے تہذیب و تمدن کے مرکز میں پشتوں سے رہتا چلا آیا تھا۔ لیکن موجودہ تمدن اور نئی روشنی کی اس کو ہوا تک نہ لگی تھی۔ انڈیا کا دادا آہنی چیزوں کا بیوپار کرتا تھا اور گو اس کی اولاد نے خود ہتھوڑے کو ہاتھ سے نہیں چھوا تھا۔ لیکن اس خاندان میں یہ تجارت برابر چار نسلوں سے چلی آتی تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی کبھی میزگرسی استعمال کرنے کا خیال نہیں کیا اور نہ کبھی کسی نے کلک کے قلم کی بجائے فونٹین پن کو استعمال کرتے کا خواب دیکھا۔ وہ اب بھی بڑی بڑی گھڑیاں جیبوں میں رکھتے تھے اور ان کی بجائے دستی گھڑی استعمال کرنے کا خیال تک دل میں نہ آتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے صرف ابتدائی تعلیم پائی تھی۔ اور جو نئی اس گھرانے کے بچے کچھ کچھ پڑھ لینے کے قابل ہوتے ان کو تعلیم سے علاوہ کر کے دوکان میں لگا دیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ اس کا کام سیکھیں۔ انھوں نے کبھی کالج تک پہنچنے کی کوشش نہ کی۔ اور نہ ان کو جدید فیشن کے مطابق کپڑے پہننا آیا۔ اور نہ کبھی سگرٹ پینے کا شوق پیدا ہوا

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس گھرانے کی عورتیں کس قدر قدامت پرست ہوں گی۔ نسل بعد نسل یہ ہوتا چلا آیا تھا کہ لڑکیاں بارہ سال کی عمر سے پہلے ہی بیاہ دی جاتی تھیں۔ اور ازدواجی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی تھیں۔ شادی سے قبل ان کا وقت کھیل کودیاں، خالہ اور چچی کے کام کاج میں گزرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کی عیب دیکھ بھال کرتی تھیں یا ہمسابوں کے گھروں میں ماری ماری پھرتی تھیں۔ اور جب ان کی شادی ہو جاتی تھی، تو وہ زندگی کے پہچانے ہوئے راستے پر قدم اٹھانے لگتی تھیں، اور زندگی کا چکر مسلسل ایک رفتار کے ساتھ انھیں بھرمار ہوتا تھا۔ نہ تو اس میں آگے بڑھنے کا کوئی خیال پیدا ہوتا تھا۔ نہ پچھلی باتوں پر نظر ڈالنے کا موقع ملتا تھا۔ ان کی زندگی کا نظام یہ تھا کہ صبح اپنے بستر سے اٹھ کر باورچی خانوں میں اور پھر شام کو باورچی خانوں سے اٹھ کر اپنے بستروں پر

اگر پڑ جائیں اور یکے بعد دیگرے ان کی گود، بچوں سے بھر جاتی۔ ایسے بچے جو آئندہ چل کر آہنی سامان کے تاجر بننے، یا مناسب دیکھ بھال نہونے کی وجہ سے جلد اس دنیا سے رخصت ہو جاتے تھے، اگر بد قسمتی سے اولاد لڑکی ہوتی تو وہ خاندان کو تکلیف پہنچانے۔ اور گاڑھے پسینے کی کمائی ہوئی ایک کثیر رقم خرچ کرانے کے بعد دوسرے گھرانے میں چلی جاتی۔ جہاں وہ غیر ارادی طور پر مائیں بن جاتی تھیں۔ اور وہ ان لڑکوں کے مستقبل کو خوشنما بنانے میں کوئی حصہ نہ لے سکتی تھیں۔ جیسے ہی ان کی اولاد ہوش سنبھالتی، پوتے اور نوٹا سے پیدا ہونے لگتے۔ اور پھر ان نو آمدہ ہستیوں کو بھی اسی دور سے گزرنا پڑتا، جس سے ان کے باپ اور دادا گزرتے آئے تھے۔ خانہ داری کے جھگڑوں اور بال بچوں کی پرورش میں ان کی ساری عمر گزر جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان عورتوں کو دنیا کے اور جھگڑوں سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اگر مرد اس سے زیادہ کما سکتے، جتنا ان کے اخراجات کے لئے کافی ہوتا، تو شاید زیور وغیرہ کا بھی اضافہ ہو جاتا۔ لیکن حقیقتاً ان کے پاس ان کے روزمرہ اخراجات سے زیادہ ایک پیسہ بھی نہ بچتا تھا۔ اس لئے اس خاندان میں کسی قسم کے تفریحی مشاغل بھی پیدا نہ ہوئے تھے

خاندان میں دن بہ دن اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن آمدنی میں اسی حساب سے کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اور وہ رفتہ رفتہ زیادہ تباہ حال ہوتا جا رہا تھا۔ آئندہ اس تباہ حالی میں، اس گھر میں جنم لیا تھا۔ اس کا لڑکپن بھی اسی طرح گذرا، جس طرح اور لڑکوں کا گذرا تھا، لیکن جب نکبت و افلاس کے ساتھ زندگی کے دس سال ختم کر چکا تو اس کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ آئندہ کے والد کے کسی دوست نے یہ رائے دی کہ آئندہ کو کسی بائی اسکول میں تعلیم کی غرض سے شریک کر دیا جائے۔ کیونکہ اگر آئندہ نے تعلیم حاصل کر لی تو بہت ممکن ہے کہ وہ مجسٹریٹ یا منصف ہو جائے اور اس طرح اس خاندان کے دن پھریں۔ آئندہ کے والد کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اس نے بہت جرات سے کام لے کر آئندہ کو ایک اسکول میں شریک کر دیا تاکہ وہ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ اس سے زیادہ اس نے یہ کیا کہ لڑکے کو بالکل آدھ چھوڑ دیا کہ موجودہ زمانہ کے مطابق جیسا فیشن اور جیسی معاشرت چاہے اختیار کرے

اس وقت تک آئندہ نے صرف دنیا کے حالات سنے تھے۔ لیکن کبھی دنیا کی حقیقتوں سے آشنا نہ ہوا تھا۔ اس کی دنیا صرف اپنے گھر اور باپ کی دوکان تک محدود تھی۔ بیکار وہ اس مختصر سی دنیا سے نکال کر دنیا کے ہنگاموں میں پھینک دیا گیا۔ اس کے والد نے گھر پر بھی ایک مدرس کو مقرر کر دیا تاکہ وہ مدرسہ کا اچھا طالب علم بن سکے۔ اور اپنی بدتمیزیوں اور بے وقوفیوں پر کسی کو نکتہ چینی اور سننے کا موقع نہ دے۔ خوش قسمتی سے مدرس بھی ایسا مل گیا جس کے خاندان میں سات پشتوں سے مدرس کا پیشہ چلا آ رہا تھا۔ اور جو خوابوں اور نیندوں میں بھی مدرسہ کا سبق دہرایا کرتا تھا۔ آئندہ نے اب تک بازاروں، کھاتہ داروں، قرضداروں کے سوا اور کچھ نہ سنا تھا اور اس کے کانوں میں صرف ”درآمد“ اور ”برآمد“ کے الفاظ گونجا کرتے تھے۔ مگر اب اس کے کانوں میں، ”امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرنے“ ”درجہ اعلیٰ میں پاس

ہوتے۔“ اور ”سبق کو حفظ کرنے“ کے الفاظ جاگزیں ہو رہے تھے پہلے پہل تو اشد کو ہر چیز عجیب اور تیز آفریں معلوم ہوئی۔ اور وہ اچھے نمبر حاصل کرنے کی مسرتوں اور فخر کو کچھ نہ سکتا تھا۔ لیکن وہ ذہین تھا اس لئے اس نے بہت جلد ہوش سنبھال لیا اور سمجھنے لگا، کہ امتحان کی کامیابی کے لئے دیوانہ وار کوشش کرنا، دوکانداری میں جان کھپانے سے بدرجہا بہتر ہے۔ وہ اس امر کو کبھی نہ بھولتا تھا کہ وہ اپنے خاندان میں جدید معاشرت کا بانی ہے۔ اس کے اطوار اور اس کی زبان بالکل تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ اپنے تلفظ اور لہجہ کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔ تاکہ قدیم طرز گفتگو کا کوئی جملہ، اس کی گفتگو کو بدنام نہ کرے۔ وہ گھر کے اندر اور باہر جس قدر بھی انگریزی الفاظ اس کو یاد تھے، بولتا تھا، اور اس پر بہت فخر کرتا تھا۔ دوسری انگریزی کتاب ختم کرنے سے پہلے ہی اس نے جنکالی میں خط لکھنا اور حساب کرنا ترک کر دیا۔ جسے اس کے گھر والے محض حرکتِ طفلانہ سمجھتے تھے۔ لیکن ان سب میں اس کی ماں، سب سے زیادہ اس کی مداح تھی۔ وہ مسرت سے جھگگاتے ہوئے چہرہ کے ساتھ کہتی۔ کیوں اشد، تم اب حقیقت میں صاحب لوگوں کی طرح سمجھنے لگے“ اشد ایہ سن کر خوشی سے پھولانہ سماتا،

جس روز اشد کالج میں داخل ہوا، اس کو ایسا معلوم ہوا کہ اس نے نیا جنم لیا ہے، اس نے اپنا پڑانا لباس پھینک دیا اور ماں سے کچھ روپیے کرے کپڑے بنوائے۔ وہ خیال کرتا تھا کہ اگر عمدہ اور جدید وضع و قطع کے لباس استعمال نہ کرے گا تو لوگ اس کی اصلیت کو سمجھ کر اس پر ہنسیں گے۔ وہ اب اس امر میں ندامت محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کے باپ دادا لوہار تھے

وہ اپنی ماں سے کہتا۔ ”اگر کبھی کوئی آہنی سامان کا گودام، سونے کی کان بن سکتا ہے تو وہ صرف میری ہی فوج سے ہوگا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں اس گھرانے میں کیسے پیدا ہوا“

ماں یہ خیال کرتی کہ لڑکا مستقبل کے خوشگوار جواب دیکھ رہا ہے۔ اور وہ جواب دیتی۔ ”ہاں میرے پیارے حقیقت میں تم ہی اس گھر میں ”پارس“ لاؤ گے۔ میں اس اُمید میں جی رہی ہوں کہ تم اس گھرانے کی ساری مصیبتوں کو دور کرو۔“

اشد کہتا ”لیکن اماں جان۔ میں ایک سچے ”پارس“ کے متعلق نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ محض مثال کے طور پر“

”اوٹھ، سب ٹھیک ہے“ ماں جواب دیتی۔ ”یہ تمہارے کہنے کا طریقہ ہے۔ تم تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان بولتے ہو اور میں ایک معمولی دیہاتی کی۔ میرے بیٹے خدا تمہاری عمر دما کرے۔“

وہ اپنے مدرس کے گھر کی چیزوں کو بہت غور سے دیکھا کرتا تھا۔ وہ اس کی آراستہ نشست گاہ کی آرائشوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ اس نے اپنے لئے بھی دو بید کی کرسیاں خریدیں۔ اور اس نے تمام دن اپنے کمرہ کو سجاتے میں گزار دیا۔ دن بھر کی محنت کے بعد کمرہ کسی قدر خوشنما نظر آنے لگا۔ لیکن شام کی تفریح کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس نے

اپنے کمرہ کو انتہائی خراب حالت میں دیکھا۔ اندازے کے بعد ہی اس کا باپ کمرہ میں آیا تھا، اور ایک کرسی پر بھینکا ہوا تولیہ رکھ دیا تھا۔ دوسری کرسی پر اسکے بھائی کا کوٹ پڑا ہوا تھا۔ اندازے اپنی میز پر ایک بھورے رنگ کا کاغذ چھاپ دیا تھا۔ کیونکہ اس سے بہتر اور کوئی چیز اس کے پاس نہ تھی۔ لیکن کسی نے اس پر تیل انڈیل دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس شخص نے اس قسم کی بیہودگیاں کی تھیں اس نے کمرہ میں آرام بھی کیا تھا۔ وہ کرسی پر بھی بیٹھا تھا۔ اور اس نے اپنی تیل بھرے پاؤں پہلے میز پر رکھے۔ اور پھر میز پر سے اٹھا کر دیوار پر رکھ دئے تھے۔ یہ دیکھ کر اندازہ غصہ کے مارے سرخ پڑ گیا۔ اس نے میلا تولیہ پھینک دیا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ کرسیاں داغدار ہو گئی ہیں وہ غصہ سے رونے لگا

لیکن ابھی اس کو اپنی بد نصیبیوں کا صحیح اندازہ نہ ہوا تھا۔ اس نے ایک پرانی چادر میں، ماں کی ساڑھی کی ہیل لگا کر دروازہ کا پردہ بنایا تھا۔ لیکن جب اس نے اس کو دیکھا تو کسی نے اس میں سے ایک رومال کے برابر ٹکڑا کاٹ لیا تھا۔ باقی حصہ سے برتن پونچھے گئے تھے۔ اور دیوار پر کسی نے کوئلہ سے گھوسی کا حساب لکھا تھا۔ اس نے ایک لمبی آہ کھینچی اور اپنے گھر کی قدیم معاشرت کو جدید معاشرت میں تبدیل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا

لیکن اس کے بڑھتے ہوئے جوش کو دبانانا ممکن تھا۔ گو اس نے بڑوں کی معاشرتی اصلاح کرنے سے ہاتھ دھویا تھا۔ لیکن اُسے چھوٹوں کی معاشرت کو بہتر بنانے کی اُمید ضرور تھی۔ اس نے اب اپنے چھوٹے بھائی کی طرف توجہ کی۔ اس نے یہ ارادہ کیا کہ وہ اس کو نئی روشنی کی فضا میں رکھے گا۔ اور اس مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ اپنے بھائی کو اپنے مدرس کے گھر اور بعض اوقات کالج بھی لیجانے لگا

مگر اس کی یہ آخری سعی بھی کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ ایک روز اس نے لڑکے کو بہترین لباس پہنائے۔ اس کو بہت سی نصیحتیں کیں، بہت سے آداب سکھائے اور پھر کالج لے گیا۔ لڑکا اپنے بھائی سے بہت ڈرتا تھا اس لئے وہ جا کر بہت خاموشی سے بیٹھا رہا اس کے بعد وہ ایک ایسے کمرہ میں گیا۔ جہاں طلبہ کی کثرت تھی، لڑکا موٹا تازہ اور خوبصورت تھا۔ اس لئے ہر شخص آکر اس کی ٹھوڑی چھوتا اور اس کے رخساروں کو پیار سے مس کرتا۔ لڑکے نے دو تین منٹ تک تو ان بیجا تکلیفوں کو برداشت کیا۔ لیکن جب سب کی یہ شرارتیں حد سے متجاوز ہو گئیں تو اس کا صبر و تحمل بھی جاتا رہا۔ اس نے ایک شخص کو پتھر رسید کرتے ہوئے کہا "اُدھر جا بندر"۔ تمام طلبہ نے یہ سن کر ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔ لیکن غریب انداز کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ ہر شخص یہ سوچ رہا ہو گا کہ اس کے خاندان والے تہذیب اور ادب سے بیگانہ ہیں۔ اس کے بعد پھر وہ اپنے بھائی کو کہیں نہیں لے گیا

ایک مرتبہ اس نے اپنے خاندان کی عورتوں کے لباس میں اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن اس کی بجد مخالفت کی گئی۔ نئے لباس کے معنی یہ ہیں کہ مصارف میں اضافہ ہو۔ اور یہاں یہ حالت تھی۔ کہ صرف ایک دھوئی بالکل کافی سمجھی جاتی تھی۔ اس سے زائد کو فضول خرچی میں شمار کیا جاتا تھا۔ آخر کار اس نے سمجھ لیا کہ ایسی ذہنیت کو تبدیل کر دینا،

جس نے آہنی تجارت میں پرورش پائی ہو، بہت دشوار ہے۔ اور اس کے بعد اس نے یہ طے کیا کہ اب وہ صرف اپنی ہی زندگی کی پروا کرے گا

استاد کے گھر میں وہ خاندان کے ایک رُکن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس کو ہر وقت اس گھر میں آنے کی اجازت تھی۔ گو اس گھر کا مالک ایک عزیز اسکول ماسٹر تھا، لیکن اس کے تعلقات اور مراسم متمول اور بااثر لوگوں سے تھے۔ انڈیا بھی ان لوگوں سے تعلقات اور مراسم پیدا کرنے لگا۔ مگر اپنی ذات اور خاندان کو حتی الامکان ان لوگوں سے چھپاتا تھا۔ اگر کوئی اس کے خاندان یا خود اس کے متعلق دریافت کرتا تو وہ جواب دیتا: "میرے لئے صرف اس قدر جاننا کافی ہے کہ میں اپنے استاد کا شاگرد ہوں"

ماسٹر کے مکان پر ایک روز مختصر سی پارٹی تھی۔ نوجوانوں سے کمرہ بھرا ہوا تھا۔ اور انڈیا بھی اس مجمع کے ساتھ شور و قہقہہ بلند کر رہا تھا

دفعۃً ایک لڑکی، کمرہ میں داخل ہوئی۔ انڈیا کے لئے اس کا کمرہ میں اچانک داخل ہونا، ایک دیوی کے آنے سے کم نہ تھا جو بغیر کسی اطلاع کے چلی آئی ہو۔ وہ مسرت اور حسن کا جسمہ معلوم ہوتی تھی۔ انڈیا سوچ ہی رہا تھا کہ یہ حسن کی دیوی کون تھی۔ کہ کمرہ کی دوسری لڑکیوں نے اس کا لطیف قہقہوں سے استقبال کیا۔ ایک لڑکی نے کہا:۔

"اُجالا، ادہر آؤ، میں تمہارا تعارف انڈیا بابو سے کرادوں۔ یہ ابا جان کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ہوشیار ہیں۔ یہ ہمارے حلقہ میں سب سے زیادہ ذہین اور خوش مذاق ہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُجالا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ میں بھی آپ کی قابلیت کی تعریف اور لوگوں کی طرح کرنے کے قابل بن سکوں گی"۔ دوسری لڑکی نے کہا:۔

"لیکن تم بھی تو مجسمہ قابلیت ہو۔ (انڈیا بابو سے) تم جانتے ہو۔ اُجالا کو، اگر کوئی شخص ایک دفعہ اس کو دیکھ لے تو پھر کبھی نہ بھولے۔ اس لئے تم کو ہوشیار رہنا چاہئے۔"

اُجالا کو یہ بات کسی قدر ناگوار ہوئی۔ کیونکہ بہر کیف انڈیا اس کے لئے ایک اجنبی تھا۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں اس قدر بے تکلفانہ گفتگو کی متوقع نہ تھی۔ اس نے شرابے ہوئے برونا کو ایک دھکا دیا۔ "چلو، چلو بس، اپنی بکو اس رہنے دو" اس کے بعد وہ پلیٹی اور کمرہ کے دوسرے کنارے کی طرف اور لوگوں سے ملنے کے لئے بڑھی۔ جو وہاں جمع تھے۔ انڈیا نے، ایک لمحہ کے لئے اس کی نظروں سے نظر ملانی۔ اور پھر سہزے کنارے کی ساڑھی کی ایک جھلک دکھلاتی ہوئی اُجالا انڈیا کی نظروں سے غائب ہو گئی

انڈیا، اضطراب و بیخودی کے عالم میں کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ وہ کس قدر دلربا انداز سے چل رہی تھی۔ اس نے

قدیم کہانی اور قصوں میں سنا تھا کہ شہزادی کے ہر قدم پر ایک کنول کا پھول کھل جاتا تھا۔ جب وہ مسکراتی تو جواہرات کی بارش سی ہونے لگتی، اور جب وہ اشکبار ہوتی تو موتیوں کے دریا بہنے لگتے۔ اس کو محسوس ہونے لگا کہ کتاب کی پری انسانی لباس پہن کر آگئی ہے۔ اس کو یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کے راستے پر پھول کھل رہے تھے، اور اس کے تبسم کی تیوریوں سے سارا کمرہ ایسا جگمگ جگمگ کر رہا تھا کہ ایک اصلی ہیرے کی روشنی سے بھی ناممکن تھا۔ اور اس کے آنسو۔ ۹۔ اندانے محسوس کیا کہ، وہ شخص، جس کے لئے وہ اپنے آنسو بہائے گی۔ اس دنیا میں سب سے زیادہ خوش نصیب ہوگا اُجالا، اپنے پھول ایسے ہاتھوں سے جھک جھک کر لوگوں کو سلام کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کس قدر خوبصورت تھے، برونا اب تک بہت ہی غور سے اس کی تمام باتوں کو دیکھ رہی تھی۔ اب وہ اندانے کے پاس گئی اور اس سے بولی۔

”کیا تم بھی اپنے آپ کو، اُجالا کے شیداؤں میں شریک کرنا چاہتے ہو۔ اگر تم ایسا کرو تو اپنے تمام حریفوں میں سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہو گے

اندانے ایک شرمیلی لڑکی کی طرح، شرمیلیا، لیکن دل ہی دل میں اس کو مسرت بے پایاں حاصل ہو رہی تھی۔ اس نے برونا سے کہا۔ ”مذاق مت کرو۔ میں اس عورت کے قابل ہرگز نہیں ہوں“

سورج غروب ہونے کے بعد بھی اُفق پر رنگینیاں چھائی رہتی ہیں۔ اس لئے اُجالا کے چلے جانے کے بعد بھی، وہ مسرتیں ہنوز دوستوں میں پھیلی ہوئی تھیں، جو اس نے لاکر بھیر دی تھیں۔ اندانے کے قلب معصوم میں اُجالا کے حسن کی شعلہ باریاں، قیامت برپا کئے ہوئے تھیں۔ وہ اس کے متعلق جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور کیا ہے، مگر وہ برونا سے کچھ دریافت کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ لیکن اس کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ جب برونا کی طرف سے اس کے اور اُجالا کے لئے دعوت کے پیغام آنے لگے۔ اس کا گھر بہت ہی چھوٹا تھا۔ اور اس میں کسی بڑی تقریب یا دعوت کی گنجائش نہ تھی اس لئے معدودے چند ہی ان دعوتوں میں مدعو ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ چونکہ برونا ہی میزبان ہوتی تھی۔ وہ ایک ہی وقت بہت سے آدمیوں کو دعوت بھی نہ دے سکتی تھی۔ اس لئے وہ بہت ہی مختصر سی پارٹی دیتی تھی جس میں خاص لوگ ہوتے تھے، لیکن اندانے ہمیشہ مہمانوں میں ہوتا تھا۔ اُجالا اکثر مسکراتی ہوئی کہتی: — ”کیا تم نے پوشیدہ طور پر برونا سے ساد باز کر رکھی ہے؟“ برونا جواب دیتی: ”نہیں یہ میری وجہ سے نہیں ہے بلکہ اندانے کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُجالا کہاں ہے۔ اور اس لئے ان کو بھی، وہاں، پہنچ جانا چاہئے

ایک زمانہ اسی قسم کی بے تکلف صحبتوں میں گزر گیا۔ اور آخر کار جس روز کا انتظار تھا وہ بھی آ گیا۔ وہ برونا کے مکان میں بیٹھا تھا، شام کا وقت تھا اور چاند کی ہلکی روشنی برآمدہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ یکایک برونا ایک تیسرے مکان کے استقبال کے لئے وہاں اُٹھ کر چلی گئی۔ اندانے نظر اٹھائی۔ سفید بادلوں کے ٹکڑے آسمان پر، سنسن کی طرح تیرتے پھر رہے تھے۔ اس نے اُجالا کے نازک ہاتھ کو مس کیا۔ گویا یہ اتفاقی امر تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ نہ ہٹایا۔ اس کے بر خلاف

اس نے اندا کے ہاتھ کو زمی سے پکڑ لیا۔ اور اس کو دیکھ کر ترچی نظروں سے مسکرا دیا۔ چند لمحوں کے بعد دو چمکدار آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے

تو گویا، وہ اس کے خوابوں کی شہزادی تھی وہ حقیقت میں موتیوں کے آنسو روتی تھی !
 اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ” آپ میرے دل سے اس قدر قریب کیوں ہو گئے ہیں ؟ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں ؟
 اندا نے کہا۔ ” میں اس ہاتھ کو ہمیشہ اپنے ہاتھوں میں لئے رہنا چاہتا ہوں۔“
 اُجالا نے کہا۔ ” آپ یہ بھی جانتے ہیں یہ کس کا ہاتھ ہے۔ آپ علم، دولت اور شہرت کے مالک ہیں۔ میرے پاس کیا ہے ؟ میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔“

اندا بولا۔ ” میرے پاس جو کچھ ہے۔ اور میں جس قابل بھی ہوں، صرف تم کو حاصل کرنے کے لئے ہے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر میرا قابل ہونا، اور میری دولت بے معنی چیز ہے۔ تم کو معلوم نہیں کہ صرف تم تک پہنچنے کے لئے مجھے کتنے آہنی قلعے توڑنے پڑے۔ تم نے میری جو قیمت لگائی ہے۔ میں اس کے بھر دسہ پر اپنے آپ کو تمہارا حقدار ثابت کر سکتا ہوں۔ اس کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔“

اُجالا نے کہا۔ ” ایک شخص، اس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، جو وہ اپنی قابلیت سے حاصل کرتا ہے۔ اگر میں اس نظر یہ... میں یقین نہ کرتی تو کبھی آپ سے گفتگو کرنے کی جرات نہ کرتی۔ دولت، خاندان اور سوا ممکن ہے کہ ایک انسان کے شوکت اور وقار میں اضافہ کر دے، لیکن یہ عارضی چیز ہے۔ سچا سونا دار بافر کیا جاسکتا ہے، بنایا نہیں جاسکتا۔“

ان کی زندگی کے ایام، رنگین خواب کی مانند گزرتے گئے۔ ایک روز یکا یک اندا نے اُجالا سے کہا۔ اُجالا اب ہم دونوں ایک دوسرے کی دلی کیفیات سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ لیکن دُنیا کا بھی ہم پر حق ہے۔ مجھے اب یہ بتانا چاہیے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں ؟ تم یہ سنکر تعجب کر دو گی کہ میرے خاندان میں کسی عورت کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ اور میرا باپ اپنے نام کے ساتھ (لوہار) لکھا کرتا تھا۔“

اندا کا جسم کانپ رہا تھا۔ اور اس کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے بہ رہے تھے۔ اُس نے مسکراتے ہوئے اُجالا کو دیکھا۔ لیکن اس نے اُجالا کے ہجرہ کو مسرت اور تہمت سے چمکتا ہوا پایا۔ اُس نے کہا۔ ” اس میں کیا ہرج ہے ” میرا باپ اپنے نام کے ساتھ (چار) لکھا کرتا تھا۔ جب بچپن میں مجھے لڑکیوں کے بورڈنگ میں شریک کر دیا گیا۔ تو صدر مدرس نے یہ لفظ نکال دیا۔“
 اندا نے اُجالا کو اور اُجالا نے اندا کو پھر ایک بار دیکھا۔ اور پہلی بار دونوں کے لبوں کے اتصال سے یہ حقیقت ان پر ظاہر ہوئی کہ محبت کی دنیا میں قوم کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ مذہب کو دیکھا جاتا ہے۔ اور مذہب بھی وہ جس کا دوسرا نام صرف ایشارہ و قربانی ہے

مخمسر عابدی

ابوالہول

مصر کے جس عجیب و غریب بت کو انگریزی میں (*Sphinx*) کہتے ہیں اسی کو عربی زبان میں "ابوالہول" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اگرچہ "ابوالہول" کے مجھے مصر میں بہت عام ہیں۔ لیکن وہ ابوالہول جو مصر میں ہرم اعظم کے پاس ہے زمانہ حال میں بہت زیادہ مشہور ہو گیا ہے۔ مورخ بلائتی جب مصر گیا تو اس سے بیان کیا گیا کہ یہ شاہ امون سیس کے فرعون مصر کا مقبرہ ہے جس نے ہتسو قوم کو ملک مصر سے نکالا تھا۔ لیکن بعض قدیم مورخین کا قول یہ ہے کہ وہ گرغ رودا ہے (*Rhodope*) کا مقبرہ ہے جس میں اس کی حنوط شدہ لاش رکھی گئی تھی۔ (واضح ہو کہ یہ وہ حسن فروش عورت تھی جو متعدد فرعون مصر کے پاس رہ چکی تھی) بعض عرب مورخین نے ابوالہول کی شکستہ حالت کا سبب یہ بتایا ہے کہ ۳۳۶ء کے قریب ایک عرب شیخ کو جو بت شکنی کا جوش آیا تو اس نے ابوالہول کی ناک توڑ ڈالی۔ کئی صدیاں گزریں کہ مشہور عرب مؤرخ عبد اللطیف نے لکھا تھا کہ :- " ابوالہول کے جسم پر ایک قسم کی سُرخی جھلکتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کوئی سُرخی قسم کی وارنش پھیری گئی ہے۔ اس کے چہرے میں حسن واداک کی تمام علامتیں موجود ہیں۔ کچھ عرصہ گزرا مغربی محقق مسٹر ڈبلو ہبلٹن نے بیان کیا تھا کہ "کسی زمانہ میں ابوالہول پر رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اب رہا حسن و جمال تو وہ اسی دن کا فوز ہو گیا۔ جب مہذب "سیاحوں نے غریب "ابوالہول" کے چہرہ کو اس نیت سے پوچھا اور کھرجنا شروع کر دیا تھا کہ اس کے کچھ اجزاء بطور یادگار سیاحت اپنے ساتھ لے جائیں " سیاح تھیونو (*Thevenot*) نے ابوالہول کے متعلق ایک روایت لکھی تھی جس کا اعادہ بعد میں موسیو ڈی برلوس (*Deville*) نے بھی لیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "بعض مورخین کا یہ بیان ہے کہ "آفتاب طلوع ہوتے ہی اگر ابوالہول سے کوئی بات دریافت کی جائے تو وہ اس کا جواب دیتا ہے" علاوہ ازیں جو لوگ ہرم اعظم کی سیر کرنے جاتے ہیں وہ بیان کرتے ہیں کہ قدیم زمانہ کے بجاری ہرم اعظم کے چاہ تار یک میں گھس کر کسی سُرنگ کے ذریعہ سے ابوالہول میں چلے آتے تھے۔ لیکن تحقیق سے اس قول کی کوئی تائید نہیں ہوتی۔ لہذا ہمیں اس عرب مؤرخ کا قول زیادہ معقول نظر آتا ہے جس نے لکھا ہے کہ :- "دریائے نیل کی طلیانی سے سرزمین مصر میں جو زرخیزی پیدا ہو جاتی ہے اس کے اظہار کے لئے قدیم مصریوں نے یہ عظیم ابوالہول تعمیر کیا تھا"

انگریز سیاح مسٹر پوکاک نے ابوالہول کے متعلق بعض مفصل پیمائشیں لکھی ہیں۔ بقول سیاح مذکور "گردن کا حصہ زیریں۔ جہاں

سے سینہ شروع ہوتا ہے ۳۳ فٹ چوڑا ہے۔ اور گردن کے اگلے حصے سے گڈی تک ۲۰ فٹ ہے۔ اور پھر گڈی سے اس سوراخ تک جو کمر میں ہے ۵، ۵ فٹ ہے۔ یہ سوراخ یا شکاف ۵ فٹ طویل ہے۔ پھر اس سوراخ سے دم تک کی پیمائش ۳۰ فٹ ہے۔ مگر یہ پیمائشیں پلانٹی کی درج کردہ پیمائشوں سے کسی قدر زائد ہیں۔ پلانٹی کے نزدیک ابوالہول کا طول صرف ۱۱۳ فٹ ہے۔ ۱۹۵۰ء میں گوہرٹ (Robert) نے لکھا تھا کہ درحقیقت ابوالہول کی صورت بگاڑ دی گئی ہے۔ تقریباً دو سو برس گزرے کہ موسیومیلٹ نے (Maillet) ابوالہول کی سیر کی تھی۔ چنانچہ اس وقت اس نے بھی ابوالہول کو ٹھنکا اور اس کے جسم پر رنگ پھرا ہوا دیکھا تھا۔ اس سیاح کا خیال ہے کہ پہلے زمانہ میں اس بٹ پر کوئی مندر بنا ہوا تھا

چونکہ ابوالہول کا سر و چہرہ عورت کا اور جسم شیر کا ہے اس لئے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بُرج اسد اور بُرج سنبلہ دونوں کا منظر ہے۔ اور چونکہ اس کا چہرہ تبسم ہے اس لئے بعض زاہدان خشک کے نزدیک وہ ترغیب معصیت کا مجسمہ ہے اور چونکہ اس کے پنجے شیر کے ہیں اس لئے ان لوگوں کے نزدیک یہ معصیت کے بعد آگے عذاب ہیں۔ ان زاہدان خشک کا خیال واقعی تھا تو اچھا مگر زمانہ کی سم نظر یعنی دیکھنے کے بعض لوگوں کو اس ابوالہول کی ریش دراز کے شکستہ ٹکڑے بھی مل گئے چنانچہ مشہور مستشرق و ماہر فلکیات مسٹر پیازی اسما تھ کا قول ہے کہ :- ” ابوالہول کا چہرہ زمانہ نہیں بلکہ مردانہ ہے۔ اور کسی زمانہ میں یہ چہرہ نسوانی صاحب ریش دراز تھا۔ اور سامنے کی ریت صاف کرنے کے بعد ریش دراز کا حصہ دونوں بچوں کے درمیان پڑا ہوا پایا گیا اس ریت کی صفائی بصری کثیر ۱۸۱۶ء میں ہوئی تھی، لیکن اوہام پرست اور ضعیف الاعتقاد لوگوں نے جنتروں یا قویدوں کے لئے اس قدر نوج کھسوٹ کی کہ مجبور ہو کر اس ریت کو پھر اپنی اصلی جگہ پر بچھا دیا گیا ۱۹۰۸ء میں فرانسیسیوں نے ریت ہٹا کر ابوالہول کی صرف کمر صاف کی تھی۔ مگر کاؤنٹ کاوبلیا نے ایک اور اکتشاف کیا یعنی ابوالہول کے پھیلے ہوئے دونوں بچوں کے درمیان ایک چھوٹا سا مندر دریافت کیا

ابوالہول کا پورا بٹ ایک ٹھوس چٹان کا ٹکڑا بنا یا گیا ہے۔ صرف دو حصے یعنی کمر اور اگلے پنجے کے ایسے ہیں جہاں دوسرا پتھر کاٹ کر جوڑا گیا ہے۔ ابوالہول کی شکل غالباً کسی ایسے فرعون مصر کی صورت پر بنائی گئی تھی۔ جسے ضعیف الاعتقاد رعایا نے دیوتا بنا دیا تھا۔ چنانچہ ابوالہول کی دستار کے جو علامات باقی ہیں ان میں سانپ کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ جو فرعون مصر کے تاجوں کا جو ولایتی نمک تھا

ابوالہول کا تمام بٹ ٹھوس ہے۔ اور اس کے اندر آج تک کوئی مخفی کمرہ یا حجرہ برآمد نہیں ہوا۔ کرنل وائس اور دیگر مستشرقین نے چھوٹی چھوٹی فولادی سلاخیں لے کر ابوالہول کے جسم میں ادھر سے ادھر آہ پار کر دیں۔ لیکن کہیں کوئی بولی یا خالی جگہ اس کے اندر نظر نہیں آئی

جو مندر اگلے بچوں کے درمیان بتایا جاتا ہے وہ سنگ سُرخ کا ایک مستطیل ٹکڑا تھا۔ جو چودہ فٹ طویل اور سات

فٹ عریض تھا۔ وہ ابوالہول کے سینہ پر نصب تھا۔ اور اس پر تعینز (Thebes) کے بادشاہ طوطیس چارم کی مہر منقوش تھی۔ بہت سی سنگین تختیاں بچوں کے ارد گرد بھی پائی جاتی ہیں۔ جن پر مختلف زبانوں میں کچھ عبارتیں منقوش ہیں

ابوالہول کے مذہبی پہلو سے قطع نظر، یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس ابوالہول کا اہرام مصر سے کیا تعلق ہے؟ سنزاسما نے اس کی نسبت تحریر کیا ہے کہ:- "ابوالہول کا اہرام کے قدیم راستے کے رخ سے قطعی ہٹا ہوا ہے۔ یعنی وہ دوسری سمت واقع ہے۔ اور چونکہ یہ ہرم ملاء کے سامنے واقع ہے اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ شاید اس کی بھی وہی تاریخ ہو جو بانی ہرم ثانی ملک سفرین کی ہے۔ چنانچہ ماریت بے نے شہر تعینز میں ایک چھوٹے سے مینار پر اس بادشاہ کا نام درج پایا تھا۔ ماریت بے لکھتے ہیں کہ:- "ایک سطر میں جو تقریباً نام چھرا لگی ہے ایک جگہ اس بادشاہ کے نام کی مہر کا ایک حصہ باقی رہ گیا ہے اور ابھی تک پوری طرح محفوظ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تقریباً اس ابوالہول کا تعلق اس ہرم کے بانیوں سے ضرور ہو گا جو اس کے عقب میں واقع ہے۔"

بائنصہ آج تک یہی سمجھا گیا ہے کہ ملک خوف فرعون مصر یعنی بانی ہرم اعظم ہی نے ابوالہول کو بنایا تھا۔ ابوالہول کا مندر بھی عجیب دلچسپ چیز ہے۔ ملک سیفرن کا بت اور الواح اور مجسمے جو ہرم اعظم کے چاہ تار یک سے برآمد ہوئے ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی قومی نزاع کے سلسلہ میں مصری بچاریوں نے یہ مجسمے کنوئیں میں پھینک دیے تھے۔ بعض مؤرخین کا قول ہے کہ ابوالہول دنیا کا قدیم ترین بت ہے۔ اور بلحاظ قدامت وہ اہرام مصری سے بھی قبل کا بنا ہوا ہے۔ الغرض ابھی تک ابوالہول کی نسبت جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ خیال آرائیاں ہیں۔ حقیقت ہنوز پردہ خفا میں ہے مگر آئندہ زمانہ میں آثار قدیمہ کی گہری نظر ابوالہول کا راز معلوم کرے۔ اور اس وقت تک جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے اس میں مزید اضافہ ہو جائے

ترکی جمہوریہ

انقلاب ترکی کی بے مثل تاریخ، ایک زندہ قوم کی جدوجہد کی سبق آموز داستان، مصنفہ مسٹر ضمیر احمد ہاشمی ام لے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (بمیر)

مشرستان

حضرت مشر حابدی کے مفسر افسانوں کا مجموعہ جو اردو کے ممتاز رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ مجلد عا غیر مجلد پیر

نیچر نگار

علاوہ محصول

قیامت برحق ہو

مستقبل کی تباہ کن جنگ

دنیا کی علمی ترقیاں جس اسلوب پر جاری ہیں وہ روز بروز اس حقیقت کو واضح کرتی جاتی ہیں کہ دنیا میں ایک بار قیامت برحق آئے گی۔ اب یہ اور بات ہے کہ وہ قیامت صورتِ اسرائیل کا نتیجہ ہو یا خود انسان کی گمراہ ذہانت کا۔ اس کے بارے میں نگار کے صفحات پر متعدد بار بحث ہو چکی ہے کہ انسانی ترقیاں آہستہ آہستہ اس منزل سے قریب تر ہوتی جا رہی ہیں۔ جنہیں مذہبی زبان میں ”علی شفا حضرة من الناس“ کہتے ہیں۔ اور غالباً وہ وقت دور نہیں جب ہر شخص اس ہولناک منظر دیکھ لے گا۔ ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ ”زندہ رہو اور زندہ رہنے دو“ لیکن یورپ اب جن اصول پر کار بند ہونا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ ”نہ خود زندہ رہو نہ کسی اور کو زندہ رہنے دو“ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی علمی ترقیوں کی کوئی انتہا نہیں اور موجودہ دور نے ایک حد تک اس کو ثابت بھی کر دیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ترقی کی یہ راہیں انسان کو کس منزل پر لے جا رہی ہیں، اس کا حال خود انہیں سے پوچھیے جو علم اور فنکار کے بڑے نمبر دار نظر آتے ہیں۔ چنانچہ سرگل نیومین جو امریکہ کے طسٹری اسٹاف میں کسی وقت ایک معزز افسانہ کی حیثیت رکھتے تھے، ٹائٹس آف انڈیا میں ”جنگ مستقبل“ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

”اس امر میں اب کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں کہ آئے والی جنگ اپنی نوعیت کے لحاظ سے دنیا کی باہل پہلی جنگ ہوگی جس میں بجائے ہاتھ پاؤں کے انسان اپنے دماغ سے لڑے گا۔ اور تیغ و تفرنگ کی جگہ صرف گیس، کیمیاوی مرکبات اور زہلی کی شعاعوں سے کام لے گا۔

ہم یہ کہنے میں کسی قیاس آرائی سے کام نہیں لے رہے ہیں کیونکہ اس قسم کے حالات حرب فی الحال طیارہ ہو رہے ہیں اور جس وقت تک کہ جنگ مستقبل کی ساعت آئے گی ان کی بے رحمانہ ہلاکت آفرینی کی اہلیت خدا معلوم کس

حد تک پہنچ چکی ہوگی

یہ کہنا بالکل درست ہے کہ آئندہ جنگ، جنگ نہ ہوگی بلکہ قتل عام ہوگا، خونریزی مخلوق ہوگی اور گناہ بے گناہ کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے گا، بچے، عورتیں، بڈھے، سب اس آگ کی نذر ہو جائیں گے اور کوئی ان کا بچانے والا نہ ہوگا سپاہی محاذ جنگ پر جائیں گے (اگر واقعی کوئی مخصوص محاذ جنگ ہوگا) یہ سمجھ کر کہ اب انھیں واپس نہیں آنا اور اپنے پس ماندگان سے رخصت ہوں گے اس یقین کے ساتھ کہ ان کو بھی ہلاک ہو جانا ہے

جنگ کی ابتدا غالباً فضائی تاخت سے ہوگی اور جو سلطنت زیادہ قوت و ہجوم کے ساتھ اس کی ابتدا کرے گی، اسی کو کچھ اُمید کامیابی کی ہوگی۔ حال ہی میں لندن کے فوجی محکمے نے ہوائی تاخت کا مصنوعی مظاہرہ پیش کیا تھا جس میں ۲۵۰ ہماز شامل تھے، پینچے سے سرچ لائٹ ڈالی گئی تو صرف سولہ ہماز نظر آئے جن کو مار کر گریا جاسکتا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی وقت غنیمت ۲۵۰ ہوائی ہمازوں سے لندن پر حملہ کرے تو ان میں سے ۲۳۷ ہماز بم گرانے کے لئے بالکل آزاد ہوں گے اور مدافعت کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی

آئندہ جنگ میں جو بم استعمال کئے جائیں گے وہ گزشتہ جنگ کے بموں سے بالکل مختلف ہوں گے۔ علماء کا بیان ہے کہ آئندہ ایک ایک بم میں ہزاروں آدمیوں کو ہلاک کرنے کی قوت موجود ہوگی۔ اور صرف زہریلی گیس ہی اُن سے پیدا نہ ہوگی بلکہ آگ بھی پیدا ہوگی اور مہلک بیماریوں کے جراثیم بھی

لیوس بم (جس کا دوسرا نام "شبنم موت" بھی ہے) گرانا تو نہایت معمولی بات ہوگی، گو اس میں بھی اتنی قوت موجود ہے کہ صرف ایک بم لندن کی بڑی سی بڑی عمارت کو آن واحد میں زمین کے برابر کر سکتا ہے گیسوں میں زیادہ تر "گرین کراس گیس" اور "یلو گیس" سے کام لیا جائے گا۔ اول الذکر کے استعمال سے لوگوں میں وہی کیفیت پیدا ہوگی جسے خشکی میں ڈوب جانا کہتے ہیں۔ یعنی جو حالت پانی کے اندر ڈوبنے والے کی ہوتی ہے وہی اس گیس کے زیر اثر خشکی میں ہوگی۔ موزر الذکر کا اثر یہ ہوگا کہ آنکھیں سوج جائیں گی، خون میں سمیت پیدا ہو کہ جسم پھوٹ نکلے گا۔ اور ایک انسان اس طرح جھوم جھوم کر فنا ہو جائے گا جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو

علاوہ ان دو گیسوں کے اور بہت سی قسم کی گیسیں استعمال کی جائیں گی جو فوراً ہلاک کر دیا کر دیں گی، اور کسی کو نظر نہ آئیں گی۔ اول اول تو کسی کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ گیس ہوا میں منتشر ہے یا نہیں لیکن جب وہ اپنا اثر پیدا کر چکے گی تو لوگوں کو اس کا علم ہوگا۔ لیکن پھر اس کی کوئی تدبیر ممکن نہ ہوگی کیونکہ تمام اعضاء و ریشہ اس وقت تک بیکار ہو چکے ہوں گے

ہوائی ہماز انوں پر استعمال کرنے کے لئے ایک اور خاص گیس استعمال کی جائے گی جو ہوا میں بہت بلندی پر جا کر پھیلے گی۔ اور ہماز انوں کو اندھا کر دے گی۔ اول اول تو اس گیس کا پتہ نہ چلے گا لیکن جب آہستہ آہستہ اس کا اثر قوی ہو جائے گا تو جہازناں ایسا محسوس کرے گا کہ آنکھوں کے سامنے ایک تاریک پردہ پڑتا جا رہا ہے۔ اور پھر بینائی بالکل

غائب ہو جائے گی۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ستو ہوائی جہاز جو ایک ٹن گیس لے جاسکتے ہیں، تمام پیرس کو ۲۰ میٹر موٹی گیس کی چادر میں لپیٹ سکتے ہیں اور اگر ہوا تیز نہ ہو تو ایک گھنٹہ کے اندر پورا شہر فنا ہو سکتا ہے۔ علاوہ ان کے بجلی کے بم بھی طیارہ ہو رہے ہیں۔ ان کا وزن صرف ایک کیلوگرام (اندازاً ایک سیر) ہوگا، لیکن جس وقت یہ جا کر پھٹیں گے تو ان سے ۳۰۰۰ درجہ کی حرارت پیدا ہوگی اور پھر جو چیز راہ میں حائل ہوگی اسے جلا کر خاک سیاہ کر دیں گے۔ پانی ڈالنے سے ان کی حرارت اور زیادہ بڑھے گی۔ اس وقت تک کوئی تدبیر ایسی دریافت نہیں ہو سکی ہے جو اس آگ کو بجھاسکے۔ یہ بم سرٹکوں پر پھینکے جائیں گے تاکہ وہ زمین کو پھاڑ کر اندر ہی اندر گیس پمپ میں آگ لگا دیں۔ اور لوگ مکانوں کے جلنے سے باہر نکل پڑیں۔ پھر ٹھیک اس وقت جبکہ یہ بجلی کے بم گرائے جائیں گے۔ اور آبادی گھبرا کر باہر نکل آئے گی تو اوپر سے زہر آلودہ بم گرائے جائیں گے تاکہ منظر ہلاکت بالکل مکمل ہو جائے۔

جرمنی ہوائی بیڑے کے انسپکٹر لفٹنٹ سیگریٹ کا بیان ہے کہ صرف چند ہوائی جہاز کافی ہیں کہ وہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے اور محفوظ ترین شہر کو دو گھنٹے کے اندر تباہ کر کے رکھ دیں۔

افواج برطانیہ کے کرنل مارش اور امریکہ کے جنرل اسکویئر اس رائے میں متفق ہیں کہ ہوائی تاخت اور حملہ گیس کی مدافعت کا کوئی موثر طریقہ اس وقت تک دریافت نہیں ہو سکا۔

گزشتہ جنگ میں شہر کی آبادی کی حفاظت کا خیال پیش نظر نہ تھا، کیونکہ محاذ جنگ شہر سے بالکل علیحدہ تھا، لیکن آئندہ جنگ میں جو شہروں ہی پر حملہ ہوگا اس لئے آبادی کی حفاظت کا مسئلہ بہت اہم ہو جائے گا۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلے گا کیونکہ اس وقت تک دنیا کی توجہ صرف اسی طرف مبذول ہے کہ ہلاکت کیونکر پھیلانی جائے، ہلاکت سے بچنے کا سوال نئے سامنے ابھی تک آیا ہی نہیں۔ لہذا آئندہ وقت بھی عجیب وقت ہوگا۔ جب دنیا آبادی سے بالکل خالی ہوگی، جانوروں کی لاشیں پڑی سرڑ رہی ہوں گی، نباتات خشک ہو چکے ہوں گے۔ اور بینکوں کے اندر گڑھی ہوئی دولت سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک متنفس بھی باقی نہ ہوگا، درنحالیکہ اسی دولت کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا تھا۔

تذکرہ خندہ گل

جس میں ۳۰۰ سے زیادہ اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف اور انتخاب کلام کے درج ہیں قیمت ۱۰۰ روپے

اگر آپ مذہب اسلام کو سمجھ کر اس کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے

فلسفہ مذہب

موضوع کے لحاظ سے اردو میں بالکل پہلی چیز ہے۔ قیمت ۱۰۰ روپے

منیجر ننگار لکھنؤ

لکھنؤ اب سے پچاس سال قبل

رسالہ ہندوستانی میں پنڈت منوہر لال زتشی ام۔ اے نے ایک رسالہ (مرآة الهند) کے جا بجا اقتباسات پیش کئے ہیں جو اب سے تقریباً ۵۰ سال قبل لکھنؤ سے جاری ہوا تھا۔ انھیں میں سے ایک اقتباس یہ ہے:-

(نیاز)

” حال یہ ہے کہ نوبت تو خواب سے جاگے اور بجز دآٹھ کھکنے کے ارشاد ہوا کہ حقہ لاؤ خدمت گار بھٹ پٹ حقہ طیار کر کے لایا اور سے لیٹے لیٹے پیائے کے جب وہ جل کر خاک سیاہ ہو گیا تو جانیاں لیٹے ہوئے اٹھے اور فرمایا میاں الہی بخش ایفوں جلد طیار کرو میں اس وقت بہت بے چین ہوں کل رات کو تو ایفوں نے ایسا کم نشہ کیا کہ رات بھر نیند نہیں آئی اور ہاتھ پیر ٹوٹا کئے ہر وقت یہی جی میں آتا تھا کہ تمھیں جگواؤں اور تھوڑی ایفوں بھر بنو کر بیویوں جو نہ رات زیادہ بڑھ گئی تھی۔ لاچار اسی بے چینی کے عالم میں بڑا رہا۔ انھوں نے جواب دیا حضور بیت اٹلا تشریف لے جائیں ایفوں طیار ہے۔ اچھا ٹوٹا رکھو اور ہم بھی اٹھتے ہیں حقہ بھی بھر کر رکھو دینا دس بچے جو کی پر سے حقہ اور لوٹا ہاتھ میں لئے ہوئے برآمد ہوئے اور ایفوں نوش کی حکم ہوا کہ ہمارے بیروں کی کابک لاؤ اور شیر علی بیٹری باز کو بلاتے لانا دیکھوں تو کہ انھوں نے رات کو بھوک بھی دی یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ بھول گئے ہوں پھر پرسوں پالی میں ساری سبھی کر گری ہو۔ یہ کہہ کر بیٹھ گئے اور منہ دہوتے کو پانی طلب کیا پھر فراغ پان نوش کیا۔ خدمت گار نے حقہ بھر کر رکھ دیا۔ اب بیروں کے طرف متوجہ ہوئے۔ دوست احباب جمع ہوئے جو سر باگ بیٹھ ہوئے لگا۔ اتنے میں بارہ بجے آدمی نے دست بستہ ہو کر عرض کیا کہ حضور خاصہ طیار ہے فرمایا بازی تمام ہونے تو چلتے ہیں ایک بچے کے قریب اندر گئے اور کھانا نوش کیا تو اب گویا جو ہے نے پارہ پیا۔ اب کب بیٹھا جاتا ہے پان کھاتے ہوئے خستہ نہ ہوئے بلکہ کھینچنے لگا پھر آرام کیا چارجے اگر آٹھ کھل گئی اور کسی سے پوچھا کہ دن کتنا ہوگا۔ زراٹھی تو ہٹاؤ۔ ٹی ہٹانے کے ساتھ ہی دن تو دیکھنا بھول گئے بندہ کہ صاحب بند کرداں اوہ کس قدر دھوپ ہے کہ منہ پھنکا جاتا ہے چلائے لگے۔ اگر کسی نے کہا کہ اے حضور چارجے گئے۔ اٹھنے تو فرماتے ہیں کہ چاہے چارجے یا پان بچیں ہم تو جب تک یہ دھوپ کی گرمی ہے نہ اٹھیں گے۔ خلاصہ یہ کہ دو گھنٹی دن رہے جانیاں لیٹے لیٹے ہوئے اٹھے اور منہ دھو کر حقہ کی طرف متوجہ ہوئے کہ مرغبار مرغے لے کر آیا۔ اور اس نے بیان کرنا شروع کیا کہ حضور کے نمک کی قسم رن سور ایسا لڑا کہ طرف ثانی کے مرغ کا بالکل خون خرابا ہو گیا اور تمام پالی بھر میں حضور کی دعوم ہو گئی اور دو دو پانی ان پٹھوں کے بھی ہو گئے۔ شام تک اس مشغلہ میں مصروف رہے آٹھ بجے اور چاند ٹوکی کشتی سامنے لاکر رکھی گئی اور سب احباب جمع ہوئے اور شغل شروع ہوا معاً شروع ہونے کے داستان گونے بیچا سے امیر حمزہ صاحب قراں پر جھوٹ

کے پہلے باندھنے شروع کئے اور عمارت کی جھوٹی عیاریاں اور دروغ بے فروغ بیان کرنا شروع کیا اور وہ جھوٹ کہ جس کا زمین اور آسمان پر کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر کسی صاحب نے بد کچھ دیر کے اٹھنے کا قصد کیا تو صاحب خانہ نے اسی وقت ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا میاں ابھی دس بجے ہیں بجے اور تم نے چلتا دھند اکھا میرے سر کی قسم دو چار بھینٹے تو اور یہی دیکھو تو آج مرنا لے کیا عمدہ قوام بنایا ہو جب بارہ بجے تو خدمت گزارے اگر کہا کہ رات دوپہر سے زیادہ آئی محل میں تشریف لے چلے خاصہ ٹھنڈا ہوتا ہے ہنسر کہنے لگے کہ آج تو کیا جلد بارہ بج گئے ہیں تو ابھی نشہ بھی نہیں ہوا خدا خدا کر کے کشتی سامنے سے اٹھی اور لڑا کھڑا تے ہوئے محل میں داخل ہوئے دسترخوان بچھا خاصہ نوش کیا بعد فراغ ہاتھ منہ دھو کر بان کھاتے ہوئے پلنگ پر گئے۔

(مرآة المند اگست ۱۹۳۴ء صفحہ ۲)

آئندہ جنوری ۱۹۳۴ء کا نگار

(تقریباً دوچند صفحات کا)

مخصوص ہوگا صرف ایک موضوع کے لئے جس پر دو میں اس وقت تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا

یعنی

”لبوں کی داستان زبانِ قلم سے“

آپ کے ”لب“ ہر وقت متحرک رہتے ہیں اور سب سے زیادہ خدمت انھیں سے لی جاتی ہے، لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ جذبیت کی دنیا میں، نفسیاتی حقائق میں، عالمِ شعر و تصوف میں ”لب“ کو کیا اہمیت حاصل ہے اور دنیا کی تاریخ میں کیسے کیے انقلاب اسکی وجہ سے رونما ہوئے ہیں۔ جنوری ۱۹۳۴ء کا نگار — اس کی مفصل داستان آپ کو سنانیگا اور اس موضوع پر تحقیق و تدقیق کے وہ نقوش آپ کے سامنے پیش کرے گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے

علاوہ اس کے

ایک حصہ حضرت نیا کے ان ”مختصرات ادب“ کے لئے بھی وقت ہوگا۔ جنہیں ”الہامات ادب“ اور ”معجزات انشا“

کہنا زیادہ موزوں ہے

اگر

آپ نے نگار کی خریداری جاری رکھی تو یہ مجموعہ آپ کو مفت مل جائے گا۔ ورنہ ہوں کسی قیمت پر بھی دستیاب

پینچر نگار لکھنؤ

نہیں ہو سکتا۔

باب المراسلہ والمناظرہ

(جناب منظر الحق صاحب ضوی چھپروی - کریم چاک)

قدیم ہند کی زر خیز وادیوں میں ہندوؤں، بدھیوں، سکھوں اور کبیر پتھیوں کا مذہب، فرعون مصر کے عہد میں
موسے اور موسائیوں کا مذہب، شاہ روم میں عیسائیوں کا مذہب، عرب کے بھلسائے والے صحرائیں مسلمانوں کا مذہب
متہن یورپ میں یاپائے روم، لو تھر اور میتھا ڈسٹ کا مذہب، انگریزی ہند کے دور جدید کی فضا میں قادیانیوں اور
لاہوریوں کا مذہب، علیگڑھ کے پنجروں کا مذہب، جناب اتنے مذاہب ہیں جن کے نام نامی میں اپنی چھ برس کی عمر
سے، جس کو آج چودہ برس پانچ مہینے چھ دن ہوئے، سنتا چلا آ رہا ہوں۔ میرے مولوی صاحب مرحوم، خدا ان کو اپنے
سایہ رحمت میں رکھے اور ان کی خدمت کے لئے اچھی اچھی عویس، جو صرف مسلمانوں کے لئے پیدا کی گئی ہیں عنایت فرمائے
قرآن کریم کی اکثر آیتوں کو رٹایا کرتے تھے جنکے مختلف اجزا اب تک اوسی ”پھاڑی طوطے“ کی طرح بر زبان ہیں۔
بیچارے نے مذہب کی اتنی گتھیوں کو بغیر سلجھائے میرے موم جیسے دماغ پر نقش کر دیا۔ مگر کبھی بھی یہ نہ بتایا کہ مذہب کس بلا
کا نام ہے۔ جب کبھی پوچھا بھی تو وہی ”گوہ“ کے معنی ”پھاڑ“

بہت کوششوں اور کادشوں کے بعد صرف اس قدر سمجھ سکا ہوں یا یوں کہنے کہ سمجھا یا گیا ہوں کہ مذہب نام ہے ”نور
ایمان“ ”کائنات“ ”حسن اعتقاد“ اور ”محاسن اخلاق“ کا ایک ذریعہ ہے خدا کے پہچاننے اور کیر کٹر کے سدھارنے
کا۔ مگر یہ تقریباً بذات خود بے چور، مشکوک اور بے ربط نظر آتی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ”شمع نیاز“ کی بگھری ہوئی
نہیں بلکہ سمٹی ہوئی شعا عیس ”مذہب اور اس کے مقاصد“ کو روشن و منور کر کے میرے سامنے پیش کریں گی
یہ جو اجلی اور کالی ڈاڑھی والے علمائے دین یہ کہتے بھرتے ہیں کہ مصطفیٰ کمال پاشائے، جو آج کل ترکوں کے
رہبر اور ترکی جمہوریت کے صدر ہیں، خانقاہیں منہدم کر آئیں، خدا پرست اور ”زاہد فریب“ ملاؤں کو قید کیا
اون کے ”سینہ بے کینہ“ میں ترکی شمشیر کی نوکیں چیمائی گئیں۔ اونھیں خاک و خون میں تڑپایا گیا۔ صرف اس
لئے کہ مارشل کمال پاشا کی جمہوریت پسندی کو اگر کوئی قوم صدمہ پہنچا سکتی ہے تو وہ انھیں ملاؤں کی قوم ہے۔ اس
واقعہ سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ مگر وہ چور و درو روکتے جاتے ہیں کہ کمال پاشائے ”ترکستان“ میں اپنی

حکومت کی بنیاد ڈالنے کی غرض سے جمہوریت قائم کی، سابق سلطان کو تخت سے اجاڑ پھینکا اور خود جلوہ افروز ہوئے اور اُس وقت سے اس وقت تک جس نے بھی ان کی مخالفت کی ”تیغ و تبر“ کا نشانہ بنا۔ بادی النظر میں تو ان حضرات کا یہ قول درست معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں کہ کیا ترکستان میں ادن سے بڑا کوئی دوسرا ترک نہیں ہے جو یہ جمہوریت کے قیام سے آج تک ممکن تخت صدارت ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ افسوس آتا ہے ادن کی بے بصری اور تنگ خیالی پر۔ جمہوریت کی بنیادی اصولوں پر نظر ڈالنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ بیشک ان کی ہستی ترکستان میں ایک بے مثال ہستی ہے، ان کا تانی وہاں کوئی بھی نہیں

پھر مذہبی نقطہ نگاہ سے بھی مارشل کمال ملاؤں کے فتویٰ کفر سے محروم نہیں ہے۔ انھوں نے خانقاہوں کی جاگیریں ضبط کر کے ”اسٹیٹ“ میں شامل کر لیں، عورتوں کو بطی اور قانونی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت عطا فرمائی، اور جن مختلف محکموں میں ملازمت دی، ”ہندوستانی نما“ اسلامی پردے کو توڑ پھینکنے کا مشورہ دیا۔ خود کوٹ، پینٹ اور ہیٹ پہننے لگے اور رعایا ان کی تقلید کرنے لگی۔ اور اس کے صلہ میں مذہبی پیشواؤں سے وہی انعام پایا اس قدر لکھنے کے بعد میں اب آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ”قیام جمہوریت“ سے مارشل کمال کا مقصد کیا ہے؟ جو کچھ انھوں نے کیا اس کے صلہ میں کیا ان کو کفر ہی کا سرٹیفکٹ ملنا چاہئے؟ میرا تو ذاتی خیال یہ ہے کہ خانقاہوں کو منہدم کرنے، پردہ کے قید و بند توڑ پھینکنے سے کوئی مسلمان، کا فر یا مرتد نہیں ہو سکتا ہے، خواہ وہ مارشل مصطفیٰ کمال پاشا ہوں یا کوئی ضیاء الملک یا سرہون یا ہزبانس یا اس سے بھی بڑھ کر کوئی مولانا، عالم یا فاضل مکن ہے کہ ہمارے محترم علما کا قول کسی حد تک حق بجانب ہو اور آپ ہی کی طرح مصطفیٰ کمال کے دماغ میں بھی کوئی طوفان یا انقلاب برپا ہو گیا ہو

ایک مدت سے آپ کے ذہنی انقلابات کا بھی تماشہ دیکھتا آرہا ہوں، مگر یہ سمجھنے سے قاصر ہوں
 کہ دنیا میں نیاد کا ”مشن“ کیا ہے؟ کون سے ”ڈاکٹرین“ اور کون سے ”گاسپل“ کی اشاعت میں وہ مجھے ہے؟ وہ اسرار جن میں آپ نے اپنے کو محصور کر رکھا ہے میری سمجھ سے باہر ہیں۔ کیا یہ طلسم ٹوٹ سکتا ہے اور آپ بے نقاب ہو کر اپنی صورت دکھا سکتے ہیں

میں اب تک آپ کے تمام مضامین کو آپ کی نیک نیتی پر محمول کرتا رہا ہوں مگر مجھے خوف ہے کہ آگے چل کر یہ نیک نیتی حسن بن صباح یا پیر کرم حسین ملائے شور بازار کی نیک نیتی ثابت نہ ہو اور مجھے حسرت و یاس کے ساتھ آپ کا منہ تگنا پڑے!

(نگار) سب سے پہلے تو معافی چاہوں گا اس غیر معمولی تاخیر کی جو آپ کے مراسلہ کی اشاعت میں میری طرف سے ظہر

ہوئی، لیکن باور کیجئے کہ یہ تاخیر ادا ہی نہ تھی بلکہ بالکل غیر اختیاری تھی۔ کیونکہ آپ کا مراسلہ کاغذات میں مخلوط ہو کر گم ہو گیا تھا۔ اور آج (۲۶ اگست کو) جبکہ میں حیدرآباد جانے کے لئے اپنے بکس سے غیر ضروری کاغذات نکالنے میں مصروف تھا، بالکل غیر متوقع طور پر نظر آگیا۔ آپ کے مراسلہ کا اکثر حصہ مصطفیٰ کمال سے تعلق رکھتا ہے، اور اگر درمیانِ اخیر کی چند سطریں لکھ کر آپ اہلی سی مذہبی جستجو اور میری ”پرسش حال“ کی طرف متوجہ نہوجائے تو غالباً اس وقت میں اس پس و پیش میں مبتلا نہوتا کہ آپ کے کس مجال کو زیادہ اہم سمجھ کر سب سے پہلے اس کا جواب دوں۔ بہر حال اس ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو آپ نے مکتوب گرامی میں قائم رکھی ہے مجھے بھی سب سے پہلے یہی بتانا چاہئے کہ ”مذہب اور اس کے مقاصد“ کیا ہیں۔

آپ نے خود اپنی ذاتی کاوش و کوشش کے بعد مذہب کی جو حقیقت سمجھی ہے وہ بالکل صحیح ہے اور اگر آپ مجھ سے پوچھتے تو میں بھی وہی کہتا جو آپ کہ رہے ہیں، البتہ فرق صرف اتنا ہوتا کہ میں بجائے متعدد الفاظ کے صرف وہی ایک لفظ کہتا جو آپ نے سب سے اخیر میں لکھا ہے۔ یعنی ”محاسن اخلاق“۔ کیونکہ مذہب کا بتایا ہوا ”نور ایمان“ ایک حکیم اخلاق کی وضع کی ہوئی اصطلاح ”کائناتس یا ضمیر“ اور ایک صوتی کارشار ”حسن اعتقاد“ سب حقیقتاً اسی ایک چیز کے مختلف نام ہیں۔ جبکہ زیادہ صاف، سلجھی ہوئی زبان میں ”حسن اخلاق“ کہتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کو بظاہر ان میں باہم کوئی ارتباط نظر نہ آتا ہو، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ نتیجہ کے لحاظ سے سب کا مدعا وہی ایک ہے رہا الفاظ میں تنوع سوانسانی ذہنیت کے تنوع کے لحاظ سے ہمیشہ اس کو ضروری سمجھا گیا اور سمجھا جائے گا

کیا لفظ ”ایمان“ سے آپ ”امن و سکون“ کے مفہوم کو علیحدہ کر دیں گے۔ جس سے یہ لفظ بنا یا گیا ہو اور کیا امن و سکون بغیر حسن اخلاق کے ممکن ہے۔ کیا آپ لفظ ضمیر کے مفہوم سے ”احساس باطن“ کو جدا کر دیں گے۔ اور کیا انسان کا یہ احساس بغیر حسن اخلاق کے مطمئن ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کیا آپ لفظ ”اعتقاد“ سے اس راسخ عمدہ پیمان کے مفہوم کو نظر انداز کر دیں گے۔ جو اس لفظ کے صحیح معنی پر دلالت کرتا ہے اور کیا صداقت کا عمدہ پیمان، حسن اخلاق کا ضامن نہیں۔۔۔۔۔۔ بہر حال مجھے تو ان تمام الفاظ میں باہم ربط ہی ربط نظر آتا ہے، حیران ہوں کہ آپ انھیں کیوں بھڑکے ”مشکوک و بے ربط“ کہہ سکتے ہیں

ابتداءً جس مولوی نے آپ کو قرآن کریم کی آیتیں پڑھا کرائیں، وہ اس سے زیادہ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ بچوں کا دلخ معانی و مطالب سمجھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر وہ غریب اس کی کوشش بھی کرتا تو نتیجہ کیا ہوتا۔ اب رہا یہ امر کہ اس نے اس کوشش میں اتنا وقت کیوں ضائع کیا، اس کا جواب شاید یہ ہو سکتا ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو آج غالباً آپ کے سامنے یہ سوال بھی نہ ہوتا کہ ”مذہب کیا ہے اور اس کے مقاصد کیا ہو سکتے ہیں“۔ نفس مذہب کا احرام پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری تھا۔ کہ ابتداءً ہی سے آپ کے ذہن میں اس کی عظمت کا خیال جاگزیں کیا جائے اور آپ بڑے ہو کر اسی کے حدود میں زندگی کے مقصد کی جستجو کریں۔ کیونکہ اس سے علیحدہ ہو کر ایک انسان بہ لحاظ علم خواہ کچھ نہ

لیکن اخلاق کے لحاظ سے وہ یقیناً انسان سے فروتر ہو جاتا ہے — یورپ کی موجودہ علمی ترقیوں کو دیکھئے اور انصاف کیجئے کہ اُن سے دنیا کا امن و سکون تباہ ہو رہا ہے یا قائم ہو رہا ہے

اس میں شک نہیں کہ عہد حاضر میں مذہب کی طرف سے عام بیزاری پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن اس کا سبب غالباً یہ نہیں کہ مذہب کا خیال فی نفسہ بڑی چیز ہے، بلکہ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ مذہب کا حقیقی مفہوم محو ہو گیا ہے۔ اور جس چیز کو مذہب لکھ کر پیش کیا جاتا ہے وہ حقیقتاً مذہب نہیں ہے، اگر مذہب نام صرف چند مخصوص ظاہری علامات کا ہے تو مذہب سے زیادہ لغو و بیکار چیز کوئی نہیں اور اگر اس سے مقصود حقیقتاً کوئی ذہنی انقلاب یا کوئی باطنی تاثر ہے تو اس کی افادیت سے انکار کے کیا معنی، لیکن بات یہ ہے کہ اس کے بتانے والے بہت ہیں اور اس کے سمجھانے والے مفقود — دوسرا سبب یہ ہے کہ انسان ترقی علوم کے سلسلہ میں بہت کچھ آزادی پسند ہو گیا ہے۔ اور وہ مذہب کی پابندی کو اپنی توہین سمجھتا ہے، حالانکہ اس کو سمجھنا چاہئے کہ آزادی کا ل تو کبھی کسی کو حاصل ہو ہی نہیں سکتی، اگر وہ مذہب کا پابند نہ ہوگا، تو اپنے خیال کا پابند ہوگا، خدا کا محتاج نہ رہے گا تو مادہ و قوت کے سامنے سرعجز جھکائے گا، بہر حال (بقول اکبر) ع

بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

اگر اس وقت تک کی علمی ترقیاں کوئی ایک مثال بھی ہمارے سامنے ایسی پیش کر سکتیں۔ جسے دیکھ کر انسان کو آزادی کا مل جل جائے کالیقین ہو سکتا تو ہم سمجھتے کہ واقعی مذہب بیکار چیز ہے، لیکن چھپ باوجود اس قدر ادھاکے قدرت کے انسان کی بیچارگی اپنے حال پر قائم ہے تو ہم کیونکر مان لیں کہ ترک مذہب ہی کے بعد انسان کو آزادی مل سکتی ہے۔ درنحالیکہ بے دھرمک آزادی بھی دنیا میں کوئی ابھی چیز نہیں — مذہب و انسان کا باہمی تعلق بالکل پتنگ اور رشتہ کا سا تعلق ہے کہ جب تک وہ دور سے بندھی ہوئی ہے بلندی میں اُڑ رہی ہے، لیکن جہاں یہ تعلق چھوٹا اور وہ چھپ کھا کر کہیں نہ کہیں ضرور گری

میرے متعلق غلطی سے لوگوں نے یہ خیال قائم کر لیا ہے کہ میں مذہب کا دشمن ہوں — حالانکہ میں دشمن اگر کسی چیز کا ہوں تو صرف اس بات کا کہ مذہب کو عوام بددھرم کا پابند بنایا جائے، اور اعمال و حرکات کی بناء پر ایک دوسرے کی مخالفت کی جائے

اگر کوئی شخص نماز کو بہترین طریقہ عبادت کا باور کرتا ہے تو اُسے کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ کلیسہ و مندر کے جانے والے کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائے، یا اگر ایک شخص ناقوس بجائے تو زیادہ پسند کرتا ہے تو اس کو اذان کی آواز سنکر پریشان نہ ہونا چاہئے

میں مولویوں کا دشمن بتایا جاتا ہوں۔ اور یقیناً ہوں، لیکن مولویوں سے میری مراد صرف مسلمانوں ہی کے علماء

نہیں بلکہ تمام مذاہب کے وہ تمام پیشوا ہیں جو اپنے آپ کو تعلیمات مذہب کے تنہا علمبردار سمجھ کر دنیا میں تفریق و ففاق کا بیج بوسے ہیں۔ میں جس طرح کبھی اس کا پسند نہیں کرتا کہ ایک مولوی ناتوس کی آواز سکر "لا حول" بڑھے، اسی طرح میں اس کا بھی مخالفت ہوں کہ ایک ہندو مسلمان کو صرف اس لئے ملکش قرار دے کہ وہ گائے کا گوشت کھانا جائز سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ ایک کے نزدیک مذہب نام صرف اذان و نماز کا ہے اور دوسرے کے نزدیک گائے کے احترام کا، درحالیکہ حقیقت ان دونوں سے بالکل علیحدہ ہے

میں دنیا کے لئے سب سے بڑی لعنت جس چیز کو قرار دیتا ہوں وہ "عصبیت" ہے، یعنی ایک کا دوسرے کو صرف اختلاف مذہب کی وجہ سے برا سمجھنا یا برا کہنا۔ کیونکہ مذہب اگر واقعی کوئی اچھی چیز ہے۔ اور اس کا مقصد اخلاق انسانی کو درست کرتا ہے، تو پھر ہندو مسلمان کو، مسلمان ہندو کو، عیسائی یہودی کو، یہودی عیسائی کو کیوں برا جانے کیا ہندوؤں کے مذہب میں پوجا کرنا اور ناتوس بجانے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان کے اخلاق درست ہوں، کیا مسلمان کا روزہ و نماز کسی اور مرد کا لئے ہے، کیا موسیٰ و عیسیٰ کی یہودی دو متضاد تعلیمات کی طرف رہبری کرنے والی ہے

پھر جب حقیقت ایک ہے اور اسی ایک حقیقت کی جستجو سب کا مقصد ہے تو مخالفت کیسی؟ یقیناً یہ ایک معتبر ہے، لیکن ایسا پیچیدہ نہیں جسے سلجھایا نہ جاسکے اور اگر میں نے غلط نہیں سمجھا (اور یقیناً غلط نہیں سمجھا) تو میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ گتھی صرف علماء و مذاہب کی غلط تعلیم، غلط تعبیر اور غلط پندار کی وجہ سے پڑی ہے اور اس کے سلجھانے کی صرف یہی تدبیر ہے کہ ان تمام غلطیوں کو بے نقاب کر دیا جائے اور مذہب کا وہ صحیح مفہوم لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے جس میں کسی کو اختلاف ہو ہی نہیں سکتا، اور وہ مفہوم صرف "اخوت عامہ" ہو سکتا ہے۔ رہا یہ امر کہ اس کی سب سے زیادہ صحیح و ممکن العمل تعلیم کس مذہب میں پائی جاتی ہے، سو اس کا معلوم کر لینا بھی چنداں دشوار نہیں اگر ہر شخص عصبیت کو ترک کر کے اس پر غور کرے

مذاہب کی خونریزیاں تاریخ عالم میں بہت بدنام ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان خونریزیوں کا سبب مذہبی تعلیم تھی یا اہل مذاہب کا غلط پندار۔ کس مذہب نے بتایا ہے کہ صرف مذہب کی اشاعت کے لئے جنگ کی جائے اور وہ کون سی مذہبی جنگ ایسی ہوتی ہے جس میں سلطنت و حکومت کی طمع اندرونی طور پر کام نہیں کر رہی تھی اور وہ کونسی ملوکادہ جنگ تھی جس میں مذہب کی آزادی کو مذہب کو بدنام نہیں کیا گیا۔ مذہب کا کام امن و سکون پیدا کرنا ہے۔ اور اگر کوئی مذہب ایسا ہے جو خونریزی و خون آشامی کی تعلیم دیتا ہے تو وہ ایک لعنت ہے جس سے نوع انسانی جس قدر جلد آزاد ہو جائے بہتر ہے

مصطفیٰ کمال پاشا کے متعلق آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی ایک حد تک محل نظر ہیں۔ تم کی کمی موجودہ

ترقی بالکل مغربی اصول پر قائم ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ جو حشر مغربی تہذیب و ترقی کا ہونے والا ہے، وہی ترقی کی ترقی کا ہونے جس حد تک مولویوں کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ مصطفیٰ کمال نے وہی کیا جو اُسے کرنا چاہئے تھا، کیونکہ انہیں کے وجود نے ترقی کو قریباً ملت میں گرایا تھا۔ اور سب سے پہلے انہیں کو فنا کرنا چاہئے تھا۔ لیکن مولویوں کے اندام کے یہ سہنی تو نہیں کہ سرے سے مذہب ہی کے خیال کو ترک کر دیا جائے۔ جس طرح مولوی نام مذہب کا نہیں اسی طرح مذہب نام اُس آزادی کا بھی نہیں جو اصول اخلاق کو پس پشت ڈال دینے والا ہے

مجھے نہیں معلوم کہ واقعتاً ترقی کی کیا حالت ہے اور مصطفیٰ کمال کی تنظیم جدید نے کیا انقلاب وہاں پیدا کر دیا ہے لیکن اخبار و جرائد سے جتنا معلوم ہوا ہے اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ترقی نے جس قوم کی تاریخ کو اپنے سامنے رکھ کر اپنی ترقی کی راہیں متعین کی ہیں، اس کا نتیجہ بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وضع و لباس کی تبدیلی زیادہ اہم بات نہیں، عورتوں کو بے پردہ کر دینا بھی چنداں لائق اعتنا نہیں، لیکن اگر ان تمام باتوں کو واقعی ضروری مصلحت کے لحاظ سے اختیار کیا گیا ہے، تو غیر، اور اگر محض تقلید و تہذیب ہے۔ یورپ کی تو میں اس کو نہ صرف مفرت رساں سمجھتا ہوں بلکہ قومی غیرت و خودداری کے بھی منافی خیال کرتا ہوں

بہر حال ترقی کے متعلق یہاں بیٹھ کر کوئی حکم لگانا دشوار ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہاں کے حالات کا اقتضا کیا ہے اور انتظار کیجئے ممکن ہے واقعات و حالات کچھ ایسے رونما ہوں کہ زیادہ اعتماد کے ساتھ رائے زنی کی جاسکے

البتہ جس حد تک تہذیب معاشرت کا تعلق ہے، میں ترقیوں کو تقلید یورپ پر بالکل معذور سمجھتا ہوں، کیونکہ اسی سرزمین میں انہوں نے برکوش پائی ہے اور وہیں کی آب و ہوا میں انہیں زندگی بسر کرنا ہے۔ علاوہ اس کے یوں بھی مسلمانوں کا قومی کلچر ہندوؤں کے متاثر رہا ہے اور مسلمان جب ترقی کرے گا تو تہذیب و عواہد میں وہ ہمیشہ مغرب کی طرف مائل ہوگا۔ گو میں اس کو عمومی طور پر ان کے لئے مفید نہیں سمجھتا

ایک قوم کے کلچر پر ہمیشہ ماحول کا اثر غالب ہوا کرتا ہے اور ماحول کے تغیر سے کلچر میں بھی تبدیلی پیدا ہو جانا چاہئے اس لئے اگر ترقی کا مسلمان اپنی تہذیب و معاشرت میں یورپ کا نتیجہ کرنا ہے تو اُسے کرنا چاہئے، لیکن افسوس تو ہندوؤں کے مسلمانوں پر ہے جو باوجود یورپ سے اس قدر دور ہونے کے اس کی تہذیب برہنہ رہے ہیں۔ اور ہندوؤں کے کلچر سے اپنے آپ کو بالکل علیحدہ سمجھتے ہیں، درحالیکہ وہ خود بھی اپنے مرتد و ہلم کے لحاظ سے ہندو ہیں اور غالباً کسی وقت مذہب کے لحاظ سے بھی ہندو رہے ہوں گے

آپ کو میری طرف سے اندیشہ ہے کہ کہیں آگے چل کر میں حسن بن صباح، یا ملائے شور بادار نہ بن جاؤں، کاش آپ نے پنولین دہنی بال کا نام لیا ہوتا، سکندر و دارا کا ذکر کیا ہوتا کہ میرے عزم و وصلہ کی کچھ تو رعایت مقصود ہوتی

ہیں کیونکہ خدا نے اسی کے ذریعہ سے زمین کو تقام رکھا ہے —

طبری کا بیان ہے کہ اگر کوہ قاف زمین کو تھامے نہ ہوتا تو زمین ہر وقت لرزش میں رہتی اور کوئی شخص اس پر سکونت نہ کر سکتا۔ قرطبی کا بیان ہے کہ زمین پہلے ہر وقت ہلتی ڈلتی رہتی تھی۔ اس لئے خدا نے ایک فرشتہ پیدا کیا جس نے اسے اپنے شانہ پر رگھ کر مضبوطی سے پکڑ لیا۔ یہ فرشتہ ایک مربع قطعہ یا قوت زعفرانی پر کھڑا ہے جسے ایک بڑا بیل سینگوں پر سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ بیل ایک پھلی کی پشت پر قائم ہے جو پانی میں تیرتی رہتی ہے

ابن الوردی کا بیان بھی قریب قریب یہی ہے سوائے اس کہ وہ اس میں اتنا اضافہ اور کرتا ہے کہ کوہ قاف اسی قطعہ

یا قوت زعفرانی سے پیدا ہوا ہے

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ قاف دنیا کے تمام پہاڑوں کی بیخ و بن ہے اور سب پہاڑ اندر ہی اندر آکر اس سے مل گئے ہیں۔ جب خدا کسی قطعہ زمین کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اندرونی سلسلہ کوہ کو جنبش میں لے آتا ہے جس سے زلزلہ پیدا ہو کر لوگ مرجاتے ہیں۔ بعض نے زلزلہ کی حقیقت یہ بیان کی ہے کہ بیل جو زمین کو سنبھالے ہوئے ہے کبھی کبھی کانپ اٹھتا ہے اور اس کی کبکپی سے زمین بھی تھرا اٹھتی ہے

کوہ قاف زمین کی انتہائی حد ہے اور کسی کو معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہے۔ لیکن ابن الوردی کا بیان ہے کہ اورا قاف دوسرا عالم شروع ہو جاتا ہے اس کی زمین چاندی کی ہے۔ اور فرشتے یہاں قیام رکھتے ہیں، ایک حدیث نبوی کی بنا پر یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ماوراء قاف اور بہت سی زمینیں ہیں۔ ایک زمین سونے کی ہے، ستر زمینیں چاندی کی ہیں، سات مشک کی ہیں اور ہر زمین دس ہزار دن کی مسافت کی ہے جہاں فرشتے ہی فرشتے رہتے ہیں

آپ نے کزوہ ارض کی حقیقت، کوہ قاف کی اصلیت، اور زلزلہ کی ماہیت سن لی جسے ہمارے یہاں کے مؤرخین و محققین بیان کرتے ہیں اور جس کے ثبوت میں قرآن کی آیات اور احادیث نبوی پیش کی جاتی ہیں۔ اچھا اب غور کیجئے کہ اس سے کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے :-

(۱) ہر وہ شخص جو مسلمان ہو، یا مسلمان رہنا چاہے اسکے لئے ضروری ہے کہ ان باتوں پر ایمان لائے۔ کیونکہ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اکابر اسلام کی تحقیق ہے اور تحقیق بھی وہ جس کی بنیاد قرآن و احادیث پر قائم ہے۔ ان باتوں سے انکار کرنا گویا قرآن و حدیث سے انکار کرنا ہے۔ اور قرآن و حدیث کا منکر کافر ہے

(۲) اگر آج کوئی شخص کہے کہ یہ تمام روایتیں بالکل לנו و مہمل ہیں، نہ قرآن سے ان کا ثبوت مل سکتا ہے نہ احادیث سے تو فوراً یہ جواب دیا جاتا ہے کہ کیا ہمارے یہاں کے اکابر جو سب سے بہتر نقاد قرآن و حدیث کے تھے ہمارے برابر بھی

لے قدیم یونانیوں کی یہاں بھی اس قسم کی روایت پائی جاتی ہے کہ اٹلیس دیوتا زمین اپنے شانہ پر لے ہوئے ہے

متعلق ان کے یہاں پائی جاتی تھیں وہ مسلمانوں نے بھی اختیار کر لیں۔ اور متعدد حدیثیں رسول اللہ سے ایسی منسوب کر دیں جن سے ان روایتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن طرفہ متاثر یہ ہے کہ اور مذاہب کی تو تمام روایات خرافیات میں شامل کی جائیں گی۔ لیکن اپنی روایات کو بالکل صحیح بتایا جائے گا۔ کیونکہ رسول اللہ نے ایسا بیان کیا ہے۔ پھر اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو بہ حیثیت مسلمان ہونے کے کوہ قاف کو انھیں خصوصیات کے ساتھ تسلیم کیا جائے جو احادیث میں پائی جاتی ہیں یا ان سے انکار کر کے کافر و مرتد بنا گوارا کیا جائے

اب رہا یہ امر کہ لفظ "جو قرآن پاک میں آیا ہے اور جس کے سمجھانے کے لئے یہ تمام روایتیں گھڑی گئی ہیں کیا مفہوم رکھتا ہے، غالباً ہمارے موضوع سے علیحدہ اور اس کے سمجھنے کے لئے یہ لازم نہیں کہ ایک شخص ان تمام روایتوں پر ایمان لے آئے

(باقی)

غالب کی شوخیوں اور شوخ نگاریاں

دنیا میں مشہور ہیں، لیکن اگر کوئی آپ سے کہے کہ اس کے حالات زندگی، اس کے کلام نظم و نثر، اس کی تصانیف اردو و فارسی سے یکجا کر کے سب کی سب کتابی صورت میں پیش کیجئے تو آپ کے لئے اس کا صرف ایک جواب ہوگا اور وہ یہ کہ

رسالہ نگار بابت ماہ جنوری ۱۹۳۲ء

اٹھا کر جس کے ۱۰۰ صفحات اسی موضوع کے لئے وقف ہیں اور پورا استقصا کر کے ان کو یکجا کر دیا گیا ہے پھر اگر یہ رسالہ آپ کے پاس نہیں ہے یا کم ہو گیا ہے، یا آپ کے کسی اور دوست کو ضرورت ہے یا آپ اس کے بعد سے نگار کے خریدار ہوئے ہیں تو ۲۱ کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیے۔ صرف چند کاپیاں باقی رہ گئی ہیں۔ غالب کی سہ رنگی تصویر عالم شباب کی بھی اس میں شامل ہے

نیچر نگار۔ لکھنؤ

باب الاستفسار

مثنوی

(جناب سید افضل حسین صاحب - کٹک)

میں ایک کتاب فن شعر پر لکھ رہا ہوں اور اس سلسلہ میں مثنوی کے متعلق مجھے معلومات کی ضرورت ہے۔ اگر نامناسب نہ ہو تو مطلع فرمائے کہ فارسی زبان میں مثنوی کا کتب رواج ہوا

(نگار) آپ کا استفسار بہت اہم ہے اور اسی قدر دلچسپ بھی، لیکن افسوس ہے کہ کافی شرح و بسط کے ساتھ جواب دینے کے لئے میں اس وقت آمادہ نہیں۔ مختصر عرض کرتا ہوں :-
مثنوی، فن شعر کے لحاظ سے، جو چیز ہے وہ غالباً آپ سے بھی مخفی نہ ہوگی۔ یعنی ہر بیت کا علیحدہ علیحدہ ایک مستقل مضمون کو مساوی ہونا اور ہر بیت یا شعر کے دونوں مصرعوں کا متوازن قافیہ رکھنا
اُردو، فارسی اور ترکی میں تمام وہ طویل نظمیں جن میں کوئی واقعہ یا داستان (رزم کی ہو یا بزم کی وہ مذہبی ہو یا اخلاقی) بیان کی جاتی ہے اسی خصوصیت کی حامل ہوتی ہیں اور ان کو مثنوی کہتے ہیں، جس کی ابتدا غالباً ایران سے ہوئی ہے

تذکرہ "دولت شاہی" کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عضد الدولہ دہلی کے زمانہ تک (جس کا ۳۶۲ھ میں انتقال ہوا) قصر شیریں پر ایک بیت، قدیم پہلوی زبان میں منقوش پایا جاتا تھا جس کے دونوں مصرعے برابر کے قافیہ رکھتے تھے۔ اور سوائے اس شعر کے قبل اسلام کی ایرانی شاعری سے کوئی نمونہ مثنوی کا نہیں پایا جاتا

البتہ عہد اسلام کی ایرانی شاعری میں متعدد مثالیں مثنوی کی نظر آتی ہیں، جن میں سب سے زیادہ قدیم ابوشکور بلخی کی مثنوی ہے، اور اسی لئے اس کو مثنوی کا موجد کہتے ہیں۔ اس کے بعد رودکی کا نام لیا جاتا ہے۔ جو ابوشکور بلخی کے اخیر عہد کا ہمعصر شاعر تھا۔ اور اس نے بھی جب کلیدہ دمنہ کا ترجمہ فارسی میں کیا تو مثنوی کا وہی انداز اختیار کیا۔ جو

ابوشکور بلخی نے اختیار کیا تھا۔ لیکن سب سے پہلی مثنوی جو مکمل صورت میں سامنے آئی، ”شاہ نامہ“ ہے جسے دقیق نے شروع کیا اور فردوسی نے انجام تک پہنچایا۔ اس کے بعد اسی فردوسی کی یوسف و زلیخا ہے جو اسی بحر متقارب میں لکھی گئی۔ فردوسی کے ہمعصر عنصری سے بھی ایک مثنوی (واقع و عذرا) منسوب کی جاتی ہے جو اب دستیاب نہیں ہوتی کہا جاتا ہے کہ لامعی نے ترکی زبان میں اسکا ترجمہ کیا تھا اور اسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کا بلاٹ کیا تھا:-

واقع کسی آتشکدہ کا مٹخ تھا اور عذرا ایک نوجوان لڑکی تھی جس نے اس آتشکدہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ ان دونوں میں محبت ہو گئی، لیکن چونکہ یہ محبت مذہباً ممنوع تھی اس لئے دونوں جدا کر دیے گئے، عذرا شمال کی بریلی سرزمین کی طرف جلا وطن کر دی گئی اور واقع کو اٹھو پتیا کی گرم آب و ہوا میں بھیجا گیا، آخر کار یہ دونوں گھل گھل کر گئے اور مرنے کے بعد عذرا کی روح نے تارہ سبتدہ کی صورت اختیار کر لی اور واقع کی روح نے ”ساک راج“ کی

قصہ کی نوعیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خالص ایرانی دماغ کی پیداوار ہے لیکن عربی نام واقع و عذرا بعد کے ترجموں میں بڑھا دیئے گئے۔ ان مثنویوں میں جو ہم تک پہنچی ہیں سب سے مقدم ناصر خسرو کی دو اخلاقی مثنویاں ہیں۔ روشنائی نامہ اور سعادت نامہ جو بحر ہزج میں لکھی گئی ہیں۔ ان کے بعد ویس و رامین ہے جسے عوفی نے فخرالدین گورگانی سے منسوب کیا ہے کہا جاتا ہے کہ گورگانی نے پہلوی زبان کے کسی قصے سے اس کو لیا تھا

ویس، مرد کے بادشاہ، موہد کی لڑکی تھی جو اپنے دیور، رام یا رامین پر عاشق ہو گئی تھی، اول اول تو مابین نے پرواہ نہ کی لیکن جب اس کا بھائی قتل ہو گیا تو اس نے شادی کر لی

اگر یہ مثنوی واقع گورگانی کی لکھی ہوئی ہے تو ہم کو سمجھنا چاہیے کہ یہ گویا پہلی عشقیہ مثنوی تھی جو بحر متقارب میں لکھی گئی، ورنہ اس سے قبل کی تمام مثنویاں رزمیہ تھیں اور بحر ہزج میں لکھی گئی تھیں

عشقیہ مثنوی کا خلاق صحیح معنی میں نظامی گنجوی ہوا ہے۔ ہر چند نظامی نے بھی اول اول اپنی تصنیف ”مخزن اسرار“ میں صرف مذہبی و اخلاقی نسلج کو حکایات و قصص کی صورت میں بیان کیا، لیکن بعد کو بیخ گنج کی بعض مثنویاں بالکل عشقیہ تھیں۔ بیخ گنج کی ایک مثنوی خسرو شیریں ہے، جس میں خسرو پرویز ساسانی بادشاہ کی محبت ایک عیسائی شاہزادی شیریں سے دکھائی گئی ہے

شیریں کو ایک شخص فریاد اور بھی چاہتا تھا جو اس وقت کا زبردست انجنیر یا معمار تھا، لیکن اس کی محبت ناکام رہی اور نادرانہ زندگی بسر کرتے ہوئے اس نے اپنی جان دیدی۔

دوسری مثنوی یکتا مجنوں ہے، تیسری ہفت پیکر جس میں بہرام گورہ پرو فرار دیا گیا ہے۔ اس مثنوی میں سات کہانیاں بہرام گورہ کی سات محبوب بیویوں کی زبانی بیان کی گئی ہیں۔ چوتھی مثنوی یوسف و زلیخا ہے اور پانچویں سکندر نامہ

سکندر نامہ رزمیہ داستان ہے سکندر کے کارناموں کی اور یوسف زلیخا میں تقریباً وہی کمائی درج ہے جو فردوسی کی یوسف زلیخا میں پائی جاتی ہے

نظامی نے ان پانچوں مثنویوں کی ابتدا فردوسی کی طرح کی ہے کہ پہلے حمد و نعت پھر منقبت اور اس کے بعد شاہ وقت کی تعریف۔۔۔ نظامی نے معراج کے واقعہ کو البتہ بڑھا دیا ہے

نظامی کا اتباع فارسی میں جاتی ہے کیا ترکمانی زبان میں شیخی و فضولی نے ترکی میں میر علی شیر لوانی نے اور اردو میں امین و تجلی نے۔ چنانچہ شیخی و فضولی کی خسرو شیریں و لیلیٰ مجنوں۔ علی شیر لوانی کا خمسہ، امین کی یوسف زلیخا اور تجلی کی لیلیٰ مجنوں سب اسی تقلید و اتباع کا نتیجہ تھیں

فارسی زبان میں مثنوی جلال الدین رومی اپنی نوعیت کے لحاظ بالکل ایکلی مثنوی ہے جس کی نظیر نہ اُس سے قبل کبھی پائی گئی نہ بعد کو۔ تصوف اور مابعد الطبیعیات کے مسائل کو لطیف حکایات اور قصص و تمثیل کے ذریعہ جس طرح انھوں نے سمجھا یا وہ انھیں کا حصہ تھا

عربی لٹریچر میں مثنوی کی قسم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ ہر چند ابیات تو پائے جاتے ہیں یعنی ایسے مکمل شعر تو ضرور نظر آتے ہیں جن کے دونوں مصرعے متوازن قافیہ رکھتے ہیں اور جنہیں اگلے شعر سے کوئی تعلق نہیں، لیکن مثنوی کی تعریف میں نہیں آتے

ثعالبی نے یتیمۃ الدہر میں فارسی کے کچھ ترجمے مثنوی کی مثال میں پیش کئے ہیں۔ بعض طویل نظمیں جریری اور محمد بن مالک کی بھی ہیں لیکن ان کا تعلق قواعد زبان سے ہے اور قصہ و حکایت سے کوئی واسطہ نہیں جو مثنوی کا جزو لازم سمجھا جاتا ہے۔۔۔ مثنوی زیادہ تر بحر متقارب اور بحر ہزج میں اساتذہ قدیم نے لکھی ہیں، لیکن نظامی نے بحر الاسرار میں بحر سرلیج استعمال کی ہے اور ہفت پیکر میں بحر خنیف۔ جلال الدین رومی اور فرید الدین عطار نے بحر فل سے کام لیا ہے

مناز میں قرآن مجید کا ترجمہ

(جناب سید محمد ذکی صاحب اولپنڈی)

مصطفیٰ اکمال پاشا نے جو منا میں قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے

ہے اور آپ کے نزدیک بہ طریقہ مفید ہے یا نہیں؟

(نگار) آپ نے اس استفسار کے ذریعہ سے مجھے ایک ایسے مسئلہ پر اظہار خیال کی دعوت دی ہے جو حد درجہ نازک و

اہم ہے، اور جس پر گفتگو کرنے کے لئے نہ صرف مذہبی بلکہ بعض اجتماعی و عمرانی، سیاسی و اخلاقی مسائل کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے

نماز میں اصل قرآنی الفاظ کے بجائے ان کا ترجمہ پڑھنے کا خیال بیا نہیں ہے، بلکہ اب سے بہت قبل جب اسلامی سلطنت حدود عرب سے گزر کر سرزمین عجم تک پہنچ گئی تھی، اور عربی زبان نہ سمجھ سکنے والے لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے، یہ سوال زیر بحث آیا تھا اور باوجود اس کے کہ بعض فقہاء نماز میں کلام مجید کا ترجمہ پڑھنے کے موید تھے، لیکن آخر کار فیصلہ یہی ہوا کہ اصل قرآنی الفاظ کا پڑھنا ضروری ہے خواہ ان کا مفہوم سمجھ میں آئے یا نہ آئے

ایک بار سر سید مرحوم سے بھی کسی شخص نے سوال کیا کہ ”اگر بجائے سورہ فاتحہ کے اس کا ترجمہ اردو میں پڑھ لیا جائے تو کیا آپ کے نزدیک اس میں کوئی نقصان ہے؟“ سر سید نے جواب میں ان کو لکھا کہ نقصان تو کچھ نہیں ہے مگر نماز نہ ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ بظاہر یہ امر نہایت عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے کہ عبادت میں ایک شخص اُن الفاظ کے ادا کرنے پر مجبور کیا جائے جن کے مفہوم سے وہ قطعی ناواقف ہے، لیکن آئے اس سے گزر کر اور ذرا غائر مطالعہ سے کام لیں ممکن ہے بعض مفید باتیں معلوم ہوں

سب سے پہلے اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ عبادت کس چیز کا نام ہے اور اس کی غایت کیا ہو سکتی ہے۔ غالباً اس سے آپ کو کیا کسی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ عبادت سے مراد صرف اپنے ادب و کیفیت عبودیت کا ظاہری کرنا ہے اور اس کی غایت یہ ہے کہ نوع انسان کے اندر باہمی لطف و محبت، رافت و الفت، ہمدردی و رواداری کا جذبہ پرورش پائے اور وہ ایک پُر امن شہری ہونے کی حیثیت سے نظام تمدن میں ایک عضو مفید کی حیثیت اختیار کرے۔ جب یہ امر متحقق ہو چکا تو آئے غور کریں کہ عبادت سے یہ مقصد کیونکر تکمیل کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے تکمیل سے صرف کیفیت عبودیت ہی کی تکمیل نہیں بلکہ افراد کی کثرت بھی مراد ہے یعنی ”کیف و کم“ دونوں حیثیت سے ہم کو اسپر غور کرنا چاہیے۔ کیونکہ کوئی مذہب کیفیت کے لحاظ سے کامیاب ہوا ”ذمیت“ کے لحاظ سے ناکام رہا تو دنیا کے عمل و کار کا تمدن میں وہ ہمارے لئے بیکار چیز ثابت ہوگا۔ ہر جاں میرے نزدیک مذہب یا عبادت کا حقیقی نصب العین یہی ہونا چاہئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ افراد کو متاثر کرے، بلکہ نوع انسانی کے تمام افراد کو وہ ایک مرکز پر لا کر جمع کر دے

یہاں تک تو عبادت کے مفہوم اور اس کی غایت کا ذکر ہوا جس سے غالباً آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ اب آئے اسی کے ساتھ تھوڑا سا نفسیاتی مطالعہ بھی کر لیں کیونکہ بغیر اس کے ہم تکمیل مقصود کی راہ متعین نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت غالباً آپ سے بھی مخفی نہ ہوگی کہ اجتماعیت کا سب سے بڑا راز، افراد میں کسی غرض مشترک کا پیدا کرنا اور امیال و عواطف کو کسی ایک مرکز سے وابستہ کر دینا ہے۔ یعنی جب تک ہم افراد کو کسی ایک خیال کی طرف یل نہ کر دیں ”اجتماعیت“ کا حصول ممکن نہیں۔ لیکن جس طرح اس کے لئے افراد کا ”ہم خیال“ ہونا ضروری ہے بالکل اسی طرح ”ہم خیال“

رہنے کے لئے ”حرکات و افعال“ کی ہم آہنگی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اگر افراد خیال کے لحاظ سے تو باہم گرفتفق ہوں۔ اور افعال ان کے مختلف ہوں تو ”اجتماعیت“ کا پیدا ہونا ممکن نہیں

پھر اگر عبادت میں کوئی صورت ہم آہنگی کی نہ پیدا کی جاتی تو ظاہر ہے کہ اسلام میں وہ ”اجتماعیت“ نہ پیدا ہو سکتی جو اس کا تنہا مقصود تھا۔ اور اسی ہم آہنگی قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کسی ایک ہی زبان میں اس کو ادا بھی کیا جائے خواہ پڑھنے والا اس کو سمجھ سکتا ہو یا نہ سمجھ سکتا ہو

اگر اس امر کی اجازت دیدی جائے کہ ہر شخص کلام مجید کا ترجمہ نماز میں پڑھ سکتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے اس مرکز کو جو اصل الفاظ قرآنی کے احترام سے متعلق ہے اور جو ذریعہ ہے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک رشتہ سے وابستہ کر دینے کا، ضعیف و کمزور کر دیا

ساری دنیا کو چھوڑے، ایک ہندوستان ہی کو لے لیجئے کہ اس اجازت کے بعد صورت کیا پیدا ہوگی۔ میں اردو میں عبادت کروں گا، آپ پنجابی میں، بنگال کا رہنے والا اسے بنگلہ زبان میں ادا کریگا تو گجرات کا باشندہ گجراتی میں، الغرض ایک عجیب قسم کا انتشار و افراق پیدا ہو جائیگا جو اجتماعیت کے لئے سخت مضرت رسال ہے۔ پھر اس کا نتیجہ صرف یہ نہیں ہوگا کہ عبادت کے لحاظ سے مسلمانوں کی اجتماعیت درہم برہم ہو جائے گی بلکہ ملی و قومی حیثیت سے اس کو سخت نقصان پہونچے گا، کیونکہ اس طرح رفتہ رفتہ قرآن کی اہمیت بالکل محو ہو جائے گی۔ اور ہمارا مرکز اصلی جس پر اس وقت بھی تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے، نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا

اس وقت تو یہ حالت ہے کہ اگر میں دنیا کے کسی گوشہ میں پہونچ جاؤں اور وہاں کسی جگہ کھڑا ہو کر قرآن مجید کی کوئی آیت بہ آواز بلند پڑھنے لگوں تو وہاں کے تمام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے گا کہ میں انھیں میں سے ایک ہوں اور وہ میری ہمدردی کے لئے آمادہ ہو جائیں گے، لیکن جب رفتہ رفتہ کلام مجید کے اصل الفاظ کی اہمیت کم ہوتے ہوتے وہ ہماری زبانوں سے ادا نہ ہو سکے گا یا ہمارے حافظے سے معدوم ہو جائے گا تو ظاہر ہے کہ ہم اسلام کی ”عالمگیر“ خصوصیت کو کھو بیٹھیں گے اور وہ تمام بنی نوع انسانی کو ایک رشتہ سے منسلک کرنے کی اہلیت کو کھو بیٹھے گا

فرض کیجئے کہ اس وقت کسی جگہ مختلف مقامات کے مسلمانوں کا اجتماع ہے، یعنی کچھ لوگ ہندوستان کے ہیں، کچھ چین کے، کچھ ایران کے ہیں اور کچھ ترکستان کے۔ نماز کا وقت آتا ہے اور سب مل کر ایک امام کے پیچھے نماز ادا کرتے ہیں جو اصل الفاظ قرآنی میں قرأت کرتا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ امام و مقتدی میں سے کوئی کسی لفظ کا مفہوم نہیں سمجھتا، لیکن کیا باوجود اس عدم علم و فہم کے آپ کہہ سکتے ہیں کہ ”اجتماعیت“ کا مقصود پورا نہیں ہوا؟ یقیناً ہوا کیونکہ کوئی مفہوم سمجھے یا نہ سمجھے لیکن یہ شخص جانتا ہے کہ امام جو کچھ پڑھ رہا ہے وہ اصل الفاظ اللہ ہیں اور ان کا احترام ہر مسلمان پر واجب ہے۔ برخلاف اس کے دوسری صورت فرض کیجئے کہ امام چینی زبان میں قرأت کرتا ہے جس کو مقتدیوں میں سے کوئی نہیں سمجھتا، پھر ظاہر ہے کہ

زبان کے لحاظ سے انھیں کوئی دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے، نہ اس کے الہامی ہونے کی حیثیت سے کوئی کیفیت یکسوئی یا خشیع و خضوع کی اپنے اوپر طاری کر سکتے ہیں

الفاظ قرآنی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، لیکن چونکہ ان کے منجانب امداد ہونے یا کم از کم منطوقات نبوی ہونے پر سب کا اجماع ہے اس لئے اس اعتقاد و خیال کے ماتحت جو اثر بلا استثنا سب پر ہو سکتا ہے وہ کبھی ترجمہ سے پورا نہیں ہو سکتا ہمارے عقائد کے ماتحت الفاظ قرآن میں ایک ایسا طلسمی اثر پیدا ہو گیا ہے کہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے لیکن اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور یہ اثر وہی کیفیت رکھتا ہے جو ایک فوجی افسر کے کمانڈ میں ہوتی ہے کہ سپاہی اس کے الفاظ کا مفہوم جانیں یا نہ جانیں لیکن ان کو سکر وہ فوراً تعمیل و امتثال کے لئے طیار ہو جاتے ہیں

اس بیان سے میرا مقصود یہ ہرگز نہیں ہے کہ کلام مجید کو بلا سوچے سمجھے ہی پڑھنا چاہئے۔ بلکہ مدعا یہ ہے کہ جس حد تک نماز و عبادت کا تعلق ہے۔ میں ترجمہ کے بجائے اس کے بلا سوچے سمجھے پڑھنے ہی کو ترجیح دوں گا، اگر واقعی کسی مسلمان کو اس کے سمجھنے کا موقعہ نہیں ملا، ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ سمجھ کر کسی کلام کو پڑھنا بدرجہ اولیٰ مفید ہوگا اور ہم کو ایک مسلمان سے اتنی توقع رکھنی چاہئے کہ جہاں وہ اپنی دنیاوی ضروریات کے لئے اور بہت سے علوم یا پیشے حاصل کرتا ہے وہیں تھوڑا سا وقت اس حد تک عربی تعلیم پر بھی صرف کرے کہ کلام مجید کی چند مشہور سورتوں کا سمجھنا اس کے لئے آسان ہو جائے

مصطفیٰ کمال پاشا کا بجائے اصل الفاظ قرآنی کے ترکی کا ترجمہ نماز میں رائج کرنا خود ان کے ملکی مصالح کے لحاظ سے ممکن ہے مفید ہو، لیکن تمام عالم اسلامی کے مسئلہ اجتماعیت کو سامنے رکھ کر کبھی مفید نہیں کہا جاسکتا۔ چونکہ اس وقت ترکی بہ حیثیت مسلمان یا اسلامی حکومت ہونے کے ترقی نہیں کر رہا بلکہ صرف ترکی قومیت کو پیش نظر رکھ کر ابھرتا چاہتا ہے اس لئے ہم اس کو اس نوع کی اصلاحوں پر مجبور سمجھتے ہیں۔ علی الخصوص اس وقت جبکہ وہ مذہبی ملاؤں کی ملعون گرفت سے بھی ملک کو آزاد کرانا چاہتا ہے۔ لیکن اگر ہندوستان کے مسلمان بھی اس کی تقلید کریں تو ان کے لئے کوئی وجہ اس کے جوڑ کی نہیں ہو سکتی، جب کہ ملک میں مختلف زبانیں رائج ہیں اور ہم سب کو کسی ایک زبان کا ترجمہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے

ترکی میں چونکہ تمام ملک کی ایک ہی زبان ہے اس لئے نماز میں کلام مجید کا ترجمہ رائج ہو جانے سے وہاں وہ اجتماعیت درہم برہم نہیں ہو سکتی جو نماز و عبادت کا مقصود حقیقی ہے، علاوہ اس کے اگر کوئی تفریق پیدا ہو بھی تو چونکہ حکومت انھیں کی ہے اس لئے وہ اس کا علاج کر سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں جبکہ زبان و نسل کے اختلافات کے ساتھ حکومت بھی اپنی نہیں ہے۔ نماز میں کلام مجید کے ترجمہ کو رائج کرنا کبھی مفید نہیں ہو سکتا بلکہ موجودہ تشدد و انتشار میں اس سے اور اضافہ ہونے کا اندیشہ ہے،

اسی سلسلہ میں ایک امر اور قابل گزراش ہے اور وہ یہ کہ ان تمام مصالح و مباحث کا تعلق نماز کی صرف

اُس حقیقی ہیئت سے ہے جو رسول اللہ نے راج کی تھی یعنی " نماز باجماعت " لیکن اگر کوئی شخص تنہا گھر میں بیٹھ کر نماز ادا کر لینے کو کافی سمجھتا ہے تو پھر یہ کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ وہ نماز کس زبان میں ادا کر رہا ہے جبکہ میرے نزدیک وہ سرے سے نماز ہی نہیں ہے۔ انفرادی حیثیت سے وہ ایک ذاتی فعل عبادت کی حیثیت ضرور رکھتی ہے، لیکن اس کا تعلق چونکہ صرف اسی کی ذات سے ہے۔ اس لئے اگر وہ نماز کے بجائے کسی اور طریقہ سے اظہار عبودیت کر لے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔۔۔۔۔ نماز نام ہے صرف اسی طریقہ کا جو عہد نبوی میں راج تھا اور جس میں اجتماعیت و عسکریت کی پوری شان نمایاں تھی۔ اور اسی حالت میں میرے نزدیک آیات قرآنی کا اصل الفاظ میں پڑھنا ضروری ہے، ورنہ یوں تنہائی میں تو ایک شخص حافظ و سدی، غالب و مومن کے کلام سے بھی گا گا کر ایک کیفیت تاثر کی پیدا کر سکتا ہے، نماز ہی کی کیا ضرورت ہے۔۔۔۔۔

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب تفصیل ذیل دفتر میں موجود ہیں۔ جن صاحب کو ضرورت ہو بہ حساب ۴ روپی پرچہ ٹکٹ بھیج کر طلب کر سکتے ہیں

اگست ۱۹۳۲ء	جون ۱۹۳۲ء	دسمبر ۱۹۳۱ء	اپریل ۱۹۳۱ء	ستمبر ۱۹۳۰ء	مارچ ۱۹۳۰ء
ستمبر	جولائی	جنوری ۱۹۳۰ء	مئی	اکتوبر	اپریل
اکتوبر	ستمبر	اپریل	جون	نومبر	مئی
نومبر	اکتوبر	مئی	دسمبر ۱۹۲۹ء	دسمبر	جون
مئی ۱۹۲۹ء	نومبر	جون	فروری ۱۹۲۹ء	مئی ۱۹۲۹ء	جولائی
جون	جنوری ۱۹۲۹ء	جولائی	مئی	جولائی	اگست
اگست	مارچ	اگست	جون	اگست	ستمبر
جنوری ۱۹۲۸ء	مئی	اکتوبر	مارچ	ستمبر	اکتوبر
فروری	جون	نومبر	ستمبر	اکتوبر	نومبر
مارچ	ستمبر	دسمبر	اکتوبر	نومبر	دسمبر
اپریل	اکتوبر	فروری ۱۹۲۷ء	مئی ۱۹۲۷ء	دسمبر	دسمبر
مئی	نومبر	مارچ	اگست	فروری ۱۹۲۶ء	فروری ۱۹۲۶ء

منیجر نگار لکھنؤ

اعتبارات

ایک ضعیف العمر زاہد مرتاض نے جو ظاہری علم و فضل کے علاوہ فیوض باطنی کا بھی مدعی تھا، کسی زند بادہ خوار سے کہا کہ ”تو کب تک اپنی زندگی معصیت و عدوان میں بسر کرتا رہے گا، میرے ساتھ آ اور پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر خدا کی عبادت میں مصروف ہو کہ حقیقی امن و سکون اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے“

زند نے کہا ”ہاں، چلو، کیونکہ اب جام و سیو میں بھی وہ لذت و کیفیت باقی نہیں“

دو لوں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے اس حال میں کہ ان کے پاس ایک چینی کی قاب کے علاوہ کوئی اور سامان نہ تھا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد زاہد نے اپنے رفیق سے کہا کہ ”میں اب جاؤں گا۔ کیونکہ مجھے اور گمراہوں کو راہ راست پر لانا ہے، آؤ جو کچھ ہماری تمھاری ملکیت ہے اس کو نصف نصف تقسیم کر لیں“

زند بولا۔ ”مجھے تمھاری جدائی کا بڑا صدمہ ہے لیکن چونکہ تمھیں اصرار ہے اس لئے مجبور ہی ہے، دنیاوی اسباب میں سے صرف ایک چینی کی قاب ہمارے پاس موجود ہے، سو اس کی تقسیم ممکن نہیں اس لئے میری خواہش ہے کہ تم اس کو لے جاؤ، میں اپنے حصہ سے دست بردار ہوتا ہوں“

زاہد برا فرودختہ ہو کر بولا۔ ”یہ تو نے کیا کہا، کیا میں صدقہ طلب کرتا ہوں، مجھے تو صرف وہ حصہ چاہئے جو میرا اپنا ہے، مجھے تیرے حصہ کی ضرورت نہیں“

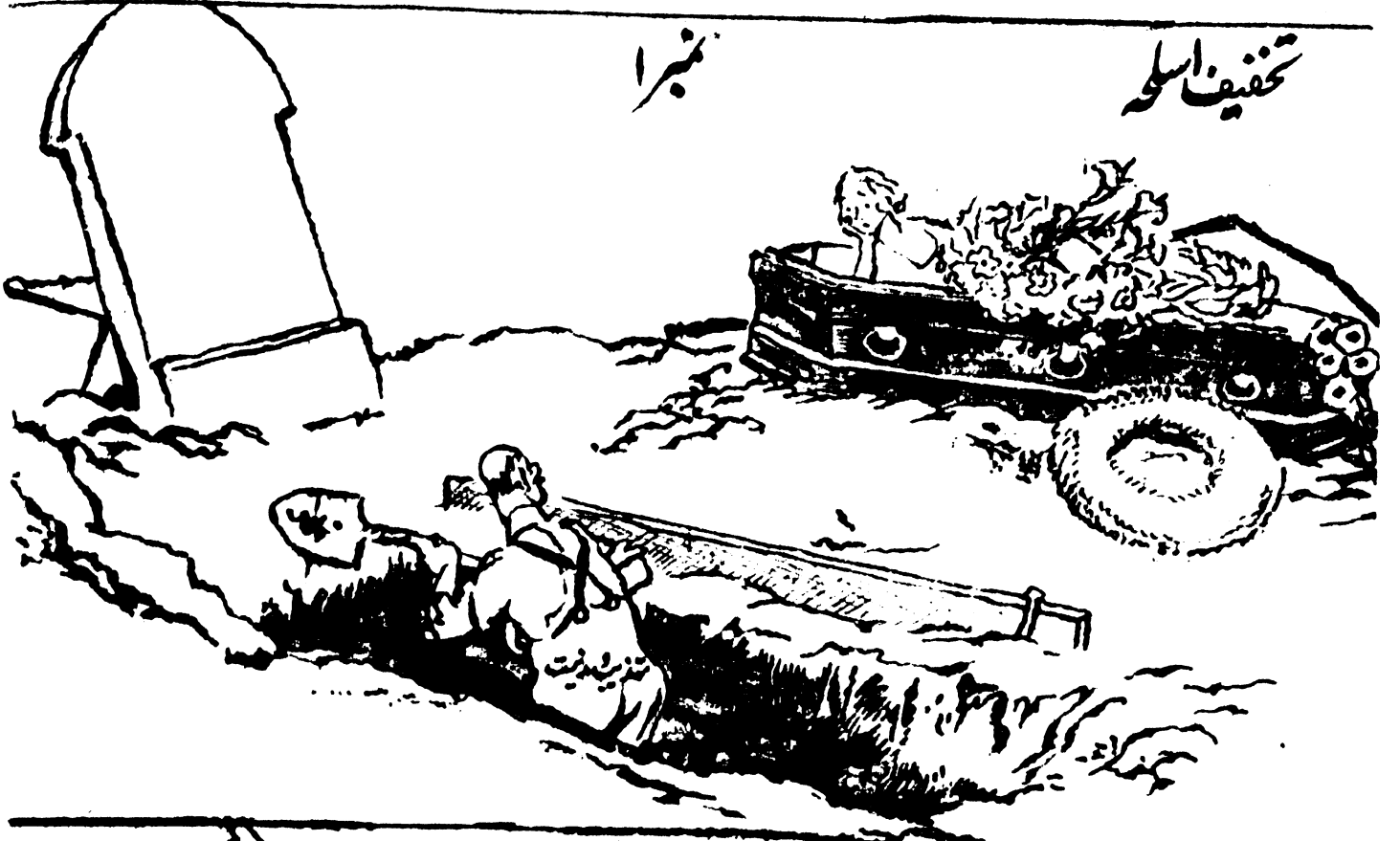
زند نے جواب دیا کہ ”اے میرے عزیز دوست اصرار سے کیا فائدہ، جب کہ ٹوٹ جانے کے بعد قاب نہ تمھارے کام آ سکتی ہے نہ میرے“

زاہد نے کہا ”فائدہ ہو یا نہ ہو، میں تو صرف اتنا ہی حصہ لوں گا، جتنا شرعاً مجھے ملنا چاہئے، زاہد کا مستحق میں نہیں ہوں“۔ یہ سن کر زند نے کہا کہ ”تمھارا اصرار اسی پر ہے تو میں مجبور ہوں“۔ یہ کہہ کر اس نے قاب

کو پتھر بردے مارا اور دو ٹکڑے کر کے ایک ٹکڑا اپنے ساتھی کے سامنے پیش کر دیا

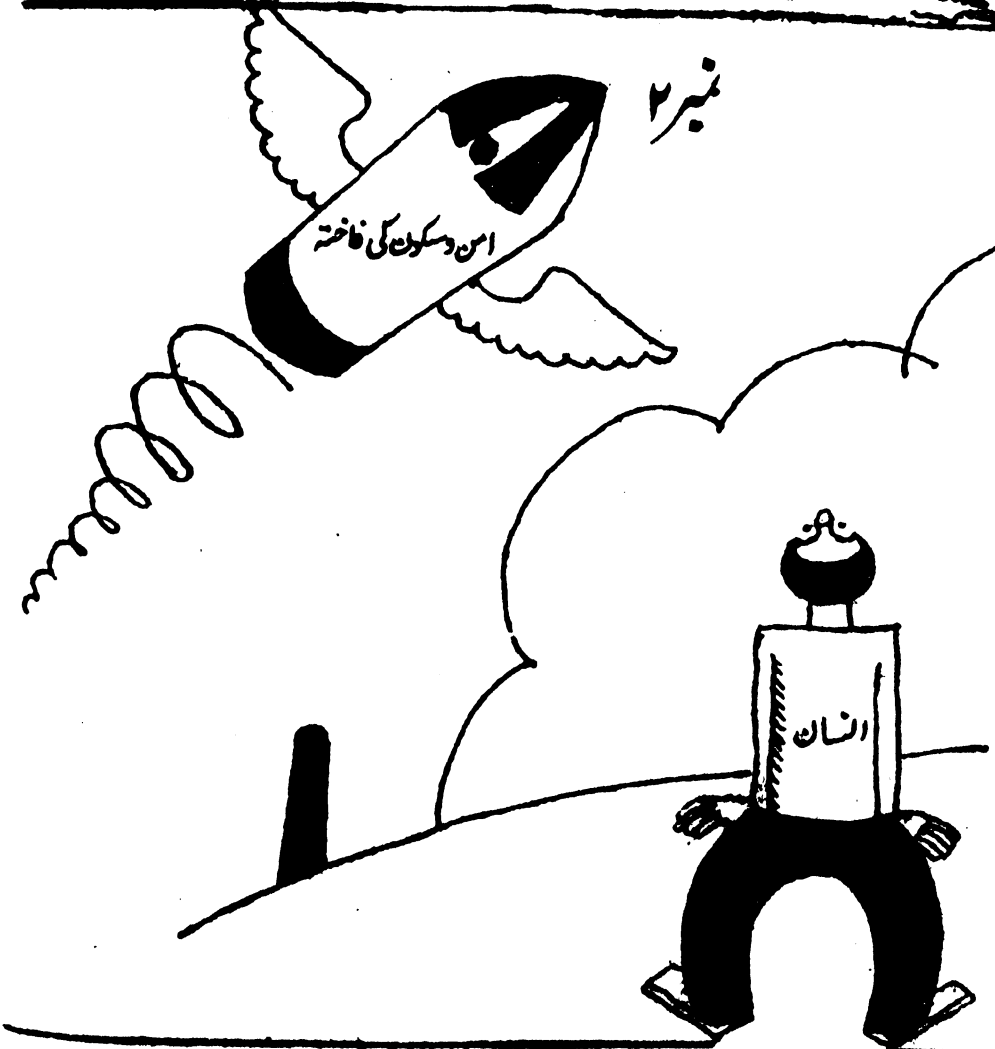
زاہد یہ دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا اور بولا کہ ”اے مردود، تجھے شرم نہیں آتی کہ میں نے ہی تجھے خاک سے پاک کیا اور تو مجھی کو غصہ دکھاتا ہے“

زند یہ سن کر مسکرایا اور اس کی نگاہوں کے سامنے پھر انھیں یارانِ میکدہ کی صورت پھرنے لگی۔ جن کی ذہنیں آئینہ کے مانند صاف اور جام و مینا کی طرح شفاف تھیں



نمبر ۱

تحقیق اسکو



نمبر ۲

(۱) تحقیق اسکو کی خاتون ابابیت
 کے اندر سے (تہذیب و
 دینیت سے مخاطب ہو کر:-
 ”تم میرے لئے قبر تو
 کھود رہے ہو، لیکن زرا
 چوڑی بنانا تاکہ میرے
 ساتھ تم بھی اس میں جا سکو“
 (۲) عہد حاضر کا انسان فقہاً
 عالم میں جنگی طیاریاں
 دیکھ کر :-
 ”کیا امن و سکون کی فاختہ
 اب بیباک و کار تو سوں کی
 شکل میں اڑ رہی ہے؟“

لیلائے بام

ترا دل ہے بتکدہ ہوس

اسے ضربِ عشق سے توڑ بھی

تری زندگی ہی گناہ ہے

تو رہ گناہ کو چھوڑ بھی

زرد جاہ ہے تری خاکِ پا نہ پرستش زرد جاہ کر

نہ مٹا صداقتِ روح کو نہ گناہ عذرِ گناہ کر

نہ دبا صدائے ضمیر کو نہ نظامِ دل کو تباہ کر

ہے ضمیر آئینہ خدا نہ اس آئینہ کو سیاہ کر

ہے حیا ہی عظمتِ دو جہاں

جو حیا نہیں ہو تو کچھ نہیں

ہے وفا ہی دولتِ جاوداں

جو وفا نہیں ہو تو کچھ نہیں

ترے گیسوؤں کی شہیم میں

ہوس گناہ کی بو بھی ہے

وہ نگاہِ زہر کا تیر ہے جو قاتل تیغِ حیا نہ ہو

وہ خیالِ مرگِ ضمیر ہے جو شہیدِ صدق و صفا نہ ہو

وہ کشش — گناہِ عظیم ہے جو اسیرِ ذوقِ ولانا نہ ہو

وہ پیشِ عذابِ الیم ہے جو شریکِ سوز و مشا نہ ہو

نہ ہوس کو عشق کا رنگ دے

نہ وفا کو رسمِ وفا بنا

تجھے ہی خدا پہ یقین اگر

تو نہ اہرمن کو خدا بنا

جو تجھے ہے عشرتِ بیکراں

وہ نشاط — غم بکنا ہے

جو تھے چمن میں ہر گلشنِ شاں

وہ بہار — خون بہا ہے

تری عشقوں کی شراب میں

تری عصمتوں کا لہو بھی ہے

جسے انفعال گناہ ہو
وہی عمد، عمد سعید ہے
جو بصدق طالبِ عفو ہو
وہ قبولِ رپّ حمید ہے

ہے کنیز بارگہ ہوس تری ہر ادائے فلک نشیں!
ہے کمنہ حجلہ خود کشی خمِ جدید گیسوئے عنبریں!
ہے چراغِ مدفنِ زندگی سر بام — جلوہ آفتیں
تجھے، خونِ زخمِ گناہ پر ہے گمانِ بادۂ احمریں

وہ ہے ایک چشمہ تیرگی

جو تری نگاہ میں نور ہے

ہے شکست تیرے غرور کی

تجھے جس کشش پہ غرور ہے

تو ظہورِ حسنِ لطیف ہے
تو لطافتوں ہی سے کام رکھ
ترا دل صداقتِ عشق ہے
تو صداقتوں ہی سے کام رکھ

تو ذرا تو سوچ کہ تاجکے!

یہ بولغاوت و سرکشی

نہ عذاب بنکے بھڑک اٹھے

کہیں آگ تیرے گناہ کی

تو ہے اک حقیقتِ سرمدی نہ اسیرِ دامِ مجاز بن
تجھے کیا نمود سے واسطہ تو عروسِ عالمِ راز بن
جو اثر پذیرِ فسانہ ہو وہ نشاط بن وہ گداز بن
جو جہاں حرص کو پھونک لے وہ نواسے شعلہ طراز بن

تو نگارِ بزمِ قدیم ہے

تو اسی لباسِ کمن میں آ

حرم و وفا ہے وطنِ ترا

تو دلِ وطنِ ہو — وطنِ میرا

بہ خشوعِ روح و خضوعِ دل بہزار بندگی درصنا

پس اب عمد ترکِ گناہ کر بحضورِ خالقِ ذوالعطا

ہے کشادہ دامنِ لطفِ حقِ درِ تو بہ بھی ہے کھلا ہوا

وہ کسی کو بھی نہیں بھولتا جسے آہ تو نے بھلا دیا

روشِ صدیقی

ملحد کی حمد

یہ نظم ایک ایسے ادیب کی ہے جس کی مادری زبان اردو نہیں، اس لئے زبان و محاورہ وغیرہ کے لحاظ سے اس پر غور نہ کیا جائے بلکہ صرف مطالب و معانی کو پیش نظر رکھ کر مطالعہ فرمایا جائے

(ڈاکٹر)

میں سنتا ہوں سمجھتا ہوں کہ اس عالم کے پردے میں
یہ دنیا ایک مجموعہ ہے اسباب و نتائج کا
ہر اک قانون فطرت کا محرک بھی کوئی ہوگا
نہیں ہے ہوش بادل کو کہاں جانا ہے کیا ہونا
ہے بے جس کمر باخود اپنی عالم گیر قوت سے
ارادوں ہی کے اجزائے جہاں بنتا بگڑتا ہے
پس تخلیق ہر شے کا فنا ہو جانا کیا معنی !
یہاں ہے ظاہراً انسان ہی منبع تخیل کا
اگر احداث و افنا کا ہمہ مرکز ہے فطرت ہی
ہمہ مجموعہ فطرت تخرک ہے - تغیر ہے
یہ فطرت کیا ہے ؟ کلیات عالم کی ہے نیرنگی

بڑی مدت ہوئی سارا جہاں فطرت سے قائم ہے

مگر نیردے فطرت کس کے دم سے ہے کہ دائم ہے

دماغ و ذہن فطرت کیا ؟ ارادوں کا ہے مرکز کیا ؟ کسی جا اس میں عقل و فہم و حس و دل بھی پہنا ہے ؟!

مگر اس کی ادا کستی ہے وہ مجبور و حیراں ہے
 قیام ہستی خود کو سمجھتی ہے کہ ناداں ہے
 تغیر اس کا کیا معنی؟ سبب کیا یوں پریشاں ہے
 کے اجزا ہیں منظم اور سبھی کی ایک ہی جاں ہے
 مگر پھر بھی ہمہ مجبور کیوں، رہ رہ کے نالاں ہے
 کبھی ہے نامیہ جاری کبھی افنا کا سماں ہے
 مظالم ہائے، پنہاں اصل کی شدت کے نالاں ہے
 مگر میں خود نہیں اپنا کہ یلک غیر یہ جاں ہے
 کوئی کیفیت جانی یہاں کچھ دیر مہماں ہے
 سمجھنا جس کی نیرود کا بعید از حد امکان ہے
 پس مردن نصیب روح فرصت ہو کہ حراماں ہے
 تو پھر سے اُس کی زینت کا کہیں کیا اور سماں ہے
 کسی قانون غیبی میں کہیں اس کا بھی درماں ہے؟
 کوئی طاقت ہو جو کون دمکان سے دور پنہاں ہے
 وہ کیا

ہے کیا کوئی پہچانے کہ یاں خود ہوش حیراں ہے

حقیقت یہ ہے فطرت گو بذات خود ہی قائم ہے
 خبر بھی ہے اُسے اپنی کہ خود کیا ہے کہاں سے ہے؟
 بقا سے ہستی خود پر اگر قادر اُسے سمجھیں
 زمین و آسماں اور جو بھی اُن میں ہے سبھی فطرت
 بنی آدم بھی فطرت کی اہم طاقت کا پُرزہ ہے
 کوئی کیفیت مخصوص پنہاں مادوں میں ہے
 یہ انساں باوجود قوتِ فکری ارادی کیوں
 دماغ اپنا ہے دل اپنا عواص اپنے بدن اپنا؟
 عناصر خاص میزاں میں بہم ہونے سے انساں میں
 قیام ہستی تن منحصر ہے دل کی حرکت پر
 کہاں ہے گری جاں؟ اصل اس کی مخرج ہو یا دل
 عروس روح کا جب مضجعی ہو کا غدی جامہ
 جسے جہاں نصیبی نے کہیں کا بھی نہ رکھ چھوڑا
 پکاروں اُس کو میں کیسے؟ کہ وہ میری بھی کچھ سُن لے

ہمہ عالم کا جو رب ہے جو خالق ماسوی کا ہے

بے جستم کہ رمز انجم و نور و رواں بیستم
 گنوں کیف و لماذا اے سن و چیزے نمی دامنم

ہوش (سونیسروی)

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

ناول ڈرامے اور افسانے

تاریخ و سوانح مہرپال

لغات و ادب

۸	بازاری زبان	۱۱۲	مومنی	۸	قطرات اشک	۱۱۲	فرائض مادری	۸	گود و گالال
۸	لغات سعیدی للہ	۸	وداع ظفر	۸	جتندرانا تھ	۸	افسانہ نادر جہاں	۱۱۲	شربت آرابیک حصہ ۱ و ۲
۸	لغات کشوری سے	۸	باسمین شام	۸	بس کار و کھ	۸	اقبال دوہین	۸	حصہ سوم سے
۸	تجربہ تحقیق جملہ	۸	طوفان اشک	۸	فسانہ سعید	۸	حسن معاشرت	۸	سجدہ کے خطوط
۸	بزرگ لغات فارسی	۸	شاہین دوراج	۸	خونخاک گیتی	۸	ایمانی	۸	پیاری پھیلی
۸	محاورات سنوان	۸	درس عشق	۸	سیلاب شگفتہ تصویر	۱۱۲	سولہ کہانیاں	۸	نئی لوبھی پیاری پھیلی
۱۲	جواہر اللغات	۸	گرو پتی چور	۸	بے زبان دوست	۱۱۲	سترہ کہانیاں	۸	عورتوں کی انشاء
۱۲	گواہر اللغات	۸	بن بندوق باز	۸	جال ہم نشین	۸	سولہ قصے	۸	انشاء سنوان
۸	جراغ سخن	۸	گرشور رقابت	۸	تفسیر عصمت	۸	مراۃ العروس	۸	سیرۃ الکبریٰ
۸	دکھنی لغت	۸	انقلاب قسطنطنیہ	۸	جواہر قدامت	۸	نبأۃ النش	۸	طرز زندگی حصہ ۱ و ۲
۸	جواہرات کلیات نظیر	۸	شاہد رعنا	۸	نابینڈی	۱۱۲	توبہ النصوح	۸	محرمات تیموریہ
۸	عزیز اللغات	۱۱۲	ویڈیا کی سرگزشت	۸	پراسرار قس	۸	کیز فاظمہ	۱۱۲	ازواج البنی
۸	انکرہ برکتی	۸	شکوہ محبت	۵	اعلان آزادی	۸	نیکو نظریاں	۸	ازدواج الانبیاء
۸	تاریخ آفاغنه	۸	سنوانی زندگی	۸	سرگزشت ہاجرہ	۸	نصیحت کا کرشمہ پھول	۸	سیرۃ عائشہ صدیقہ
۸	دکن میں اردو	۸	دلالتی تھی	۱۱۲	نود زندگی	۸	برکات سلطانی	۸	غنت المسلمات
۸	انتخاب کام ہندی	۸	شمع خاموش	۸	قلب حزین	۸	ابن الوقت	۸	سہیل البنات
۸	باجیات عمر خیام	۸	شب زندگی کابل	۸	عروس کربلا	۸	چند پنہ	۸	بچوں کی پرورش
۸	انتخاب کلام ہندی	۸	مودودہ	۸	شہید مغرب	۱۱۲	انتخاب حکایات	۸	حرز طفلان
۸	اردو کے مانتھان	۸	چندر کلا	۸	ماہ عجم	۸	تندرستی	۸	تہذیب سنوان
۸	اصحیح الاغلاط	۸	گلستان خاتون	۸	شیخ کمال	۸	حفظ صحت	۸	بیوی کی تعلیم
۵	مفہم اردو	۸	صبح زندگی	۸	مراب مغرب	۸	طبیب سنوان	۸	سوی کی تربیت
۸	نور اللغات ۳ جلد لغت	۸	شام زندگی	۸	منازل سایہ کابل	۸	رہبر نحت	۸	تحت اطفال

دواوین فارسی

دواوین اردو

۸	سنمیانہ عشق	۸	کلیات نظیر اکبر آبادی	۸	دیوان غنی کشمیری	۸	کلیات غالب	۸	دیوان شمس تبریز
۸	فریاد داغ	۸	گلزار داغ	۸	دیوان ہلالی	۸	کلیات صائب	۱۱۲	کلیات عراقی
۸	عام خیال بالقصیر	۱۱۲	دیوان بند	۸	امر بخودی در موز سے	۸	دیوان ناصر علی	۸	دیوان حافظ
۸	دیوان شہبازی	۱۱۲	دیوان ذوق	۸	زبور عجم	۸	کلیات سعدی	۸	دیوان بیدل
۸	کلیات گبر از آبادی	۸	گلگدہ عزیز علی	۸	پیام شرق	۸	کلیات حزین	۱۱۲	دیوان عرفی
۸	نمذہب شاہجی پوری	۸	مراۃ الغیب	۸	قصائد عزیز جلد	۱۱۲	دیوان عنصری	۸	کلیات جامی

ذیل کی کتابیں نگارنگ کیبھی سے طلب فرمائیے

تذکرہ و تاریخ	جاسوسی کو ناول	مراثی	ناول سجاد حسین	ظفر عمر بی لے	ناول شہر
پنیر عظیم	۸	مراثی دبیر	۸	۸	۸
شب معراج	۸	مراثی انیس کال	۸	۸	۸
سراج نیر	۸	مراثی ضمیر	۸	۸	۸
پنیر عالم	۸	مراثی مونس	۸	۸	۸
سوانح حضرت رسول	۸	مراثی دلگیر	۸	۸	۸
سید المرسلین	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
حیدر کرار	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
سیرۃ الصدیق	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
عمر ابن خطاب	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
ابوبکر صدیق	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
اللہ اسلام	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
حبیب	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
عمر بن عبدالعزیز	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
دولت فاروقیہ	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
کامل سوانح زین العابدین	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
تذکرہ اولیا	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
تذکرہ اولیا کچھند	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
مرآة الکونین	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
نصص لاجیا کل	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
سفر چین	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
تخصیص تواریخ	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
خاوی جنت	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
مخارات الصوفیہ	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
خواتین انورہ	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
شامیر نسواں	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
شامیر ہند	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
مخدرات قہرہ	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸
بجلیات بنگال	۸	عجائب و غرائب	۸	۸	۸

نگارنگ کیبھی لکھنؤ

مطالعہ کتابخانہ اسلامیہ جامعہ اسلامیہ علی گڑھ



قیمت ۸۰

تصانیف حضرت نیاز پوری

<p>نگارستان حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور فسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے قیمت علاوہ محصول عام</p>	<p>گہوارہ تمدن مولانا نیاز کی وہ سوکڑا آلا کتاب جس میں تلخ اور ساطر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہو اور دنیا کے تہذیب شناسکی اسکی کس قدر ممنون ہو اور وہ میں بالکل پہلی کتاب قیمت علاوہ محصول عام</p>	<p>شہاب کی سرگزشت حضرت نیاز کا وہ عظیم النظر افسانہ جو اردو زبان میں پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بستی مضمون اور اسکی اشارہ عالیہ حلال کے درجہ تک پہنچنے کی قیمت علاوہ محصول عام</p>	<p>فراست الیید مولانا نیاز پوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی سے اپنی شناخت اور اسکی لہجوں کو دیکھ کر اپنے یاد دہندہ شخص کے مستقبل جملہ میں موجود ہیں یہ نوسانہ میرت عروج و زوال موٹ جیٹا صحت بیماری شہرت و نیک نامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول عام</p>	<p>شاعر کا انجام جناب نیاز کے غرضان شباب کا لکھا ہوا فلسفہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ہی ایسی شریح کی بڑی دل میں ہو جاتا ہے اور وہ میں ہی پہلی کتاب اس سلسلے کی ہے اور ہندی کی ایک نئی اور اس میں نظر آتی ہے قیمت علاوہ محصول</p>	<p>جذبات بھاشا جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین مضامین کے نمونے پیش کرنا کی ایسی شریح کی بڑی دل میں ہو جاتا ہے اور وہ میں ہی پہلی کتاب اس سلسلے کی ہے اور ہندی کی ایک نئی اور اس میں نظر آتی ہے قیمت علاوہ محصول</p>
<p>صحابیات پس میں عہد سعادت کی وہ خوبیاں لکھنے والے ہیں اسکا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے اس کتاب میں سیرت صحابیات سے زیادہ صحابیات کے حالات بیان کیے گئے ہیں طباعت کتابت نہایت نفیس ہے قیمت علاوہ محصول عام</p>	<p>انقلابِ طح جانی کے بعد تین فسانوں کا مجموعہ نہیں بنایا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہو سونا نہیں۔ زبان و بلاط انشاء و تخیل کے لحاظ سے تعریف فضول ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی ضمانت ہے قیمت ۵۔ علاوہ محصول عام</p>	<p>مذاکرات نیاز یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت ۱۲۔ علاوہ محصول</p>	<p>فلاسفہ قدیم اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں۔ چند کھٹے فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ ۲۔ مادین کا مذہب ۳۔ حرکت کے کورسے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت ۵۔ علاوہ محصول</p>	<p>تاریخ الدولتین جرجی زیدان کے تاریخ عالم کتاب کا ترجمہ۔ یہ کتاب ہے جس نے عرب و دنیا کے سیاسیات پر بھل ڈال دی تھی۔ سب سے پہلے ترکی و عرب و حجاز میں انقلاب کی روٹ چھوڑی قیمت ۵۔ علاوہ محصول</p>	<p>المسائل الشرعیہ مصطفیٰ کامل پاشا کی یہ عالم کتاب کا ترجمہ۔ یہ کتاب ہے جس نے عرب و دنیا کے سیاسیات پر بھل ڈال دی تھی۔ سب سے پہلے ترکی و عرب و حجاز میں انقلاب کی روٹ چھوڑی قیمت ۵۔ علاوہ محصول</p>

<p>تذکرہ خندو گل مولانا عبدالباری آسی جس میں ۳۰۰ شخصیات سے زائد اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات اور انکے اطراف و نظائر انتخاب کلام کے بیچ ہیں قیمت ۵۔ علاوہ محصول عام</p>	<p>دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں <p>شہاب لالہ رخ عاس مور کی سوکڑا آلا رمانوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا ہے مثل نمونہ قیمت ۵۔ علاوہ محصول عام</p> <p>قنومی زہر عشق مرتبہ جنوں گو رکھپوری جس میں ملک کے چار بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویروں دی گئی ہیں بک تصویر رنگین ہے۔ قیمت ۵۔ علاوہ محصول</p> </p>	<p>فراست التحریر مکمل یعنی اردو اور انگریزی رسم خط اور انکے تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت حال چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت ۵۔ علاوہ محصول</p>
---	---	---

تقدس سے طوفان خیز سیلاب کو روک دے۔ فرزند ان ہند اپنی دانائی اور شائستگی سے ہماری مدد کرو۔ اپنی قوت جو ہنود کا پیدائشی حق ہے۔ اور وہ شہ ہے اور دینی ثروت سے مغربی اقتدار سے مشرق کو نجات دلانے میں متحد العمل ہو جاؤ اے ہمالیہ کی سر جیون چوٹیوں کی محفی روحانی قوتوں اٹھو لڑائیوں کے دیوتاؤں سے دعا مانگو کہ جبر برحق کو فتح ہو اور اپنے بے شمار دیوتاؤں سے افواج عدو کے استیصال کے لئے استمداد کرو۔“

عزیز احمد زبیری (مجم)

آئندہ جنوری ۱۹۳۴ء کا نگار

(تقریباً دو چاند ضخامت کا)

مخصوص ہوگا صرف ایک موضوع کے لئے جس پر اردو میں اس وقت تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا

یعنی

”لبوں کی داستان زبانِ قلم سے“

آپ کے ”لبت“ ہر وقت متحرک رہتے ہیں اور سب سے زیادہ خدمت انھیں سے لی جاتی ہے، لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ جذبات کی دنیا میں، نفسیاتی حقایق میں، عالم شعر و تصوف میں ”لبت“ کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ اور دنیا کی تاریخ میں کیسے کیسے انقلاب اس کی وجہ سے رونما ہوئے ہیں

جنوری ۱۹۳۴ء کا نگار

اس کی مفصل داستان آپ کو سنائے گا اور اس موضوع پر تحقیق کے وہ نقوش آپ کے سامنے پیش کریگا کہ آپ حیران رہ جائیں گے
علاوہ اس کے

ایک حصہ حضرت نیاز کے اُن ”مختصراتِ ادب“ کے لئے بھی وقف ہوگا۔ جنھیں ”الہاماتِ ادب“ اور ”معجزاتِ انشاء“ کہنا زیادہ موزوں ہے

انگ

آپ نے نگار کی خریداری جاری رکھی تو یہ مجموعہ آپ کو مفت مل جائے گا۔ ورنہ یوں کسی قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہو سکتا

مینجر نگار لکھنؤ

اعادہ

عزیزہ - شکایت اسی وقت کی جاتی ہے جب کسی کی طرف سے کوئی اُمید بانی رہے، لیکن جب بقول غالب توقع ہی اٹھ جائے تو کیا کسی سے گلہ کرے کوئی یقیناً کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے کی زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ کرے اس لئے آپ مختار ہیں لیکن انسان فرما دیجئے کہ وہ زندگی جو مدت تک امید پر بسر ہو چکی ہو، اب کیونکر بسر ہو سکتی ہے بہر حال اب یہ سوال بھی بیکار ہے۔ بھلا خدا حافظ

اصغر

(۱)

اصغر نے تین دن کی کوشش میں یہ چند بے ربط جملے مرتب کئے اور حمیدہ کے کمرہ میں رکھ کر گھر سے چل دیا جو شخص خود کم ہو جائے اس کی جستجو میں کبھی کامیابی ہوتی ہے کہ کوئی شخص اصغر کو پانا حمیدہ کے والد یعنی اصغر کے چچا نے بہت کوشش کی کہ اصغر کا کہیں نشان مل جائے لیکن وہ اس طرح کم نہیں ہوا تھا کہ کوئی اس کو پاسنتا

(۲)

شملہ کی سرد آب دہوا اور اس کے پُرسر مناظر نے ابتدا میں اصغر کے دماغ کو قدرے سکون پہنچایا۔ لیکن حمیدہ کی بے مہری نے اس کو انسانوں سے بالکل متنفر کر دیا تھا۔ وہ ہوٹل میں دن رات پڑا رہتا اور جب طبیعت زیادہ گھبرانے لگتی تو پہاڑیوں پر مارا مارا پھرتا

چونکہ دل کی بربادی کے بعد دماغی سکون بھی فنا ہو جاتا ہے، اس لئے بہت جلد وہ حالت عود کر آئی جس سے بناہ ڈھونڈھنے وہ یہاں آیا تھا۔ اس نے دماغی گرفت سے نجات پانے کے لئے کوئی ممکن ذریعہ نہ پھوڑا اور جہاں تک اس کا وہ گناہ سے اپنے آپ کو بچاتا بھی رہا لیکن اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ اگر اس نے اپنے دماغ کو دوسری طرف متوجہ نہ کیا تو وہ دیوانہ ہو جائے گا۔ جب انسان خدا کے لطف و کرم کا مستحق نہ ہو سکے، تو شیطان کی آغوش اس کو کھلی نظر آتی ہے اور وہ بے اختیار اپنے آپ کو اس میں ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ اصغر نے بھی اپنے آپ کو عصیاں کے تاریک غار میں گرا دیا۔ کیونکہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سکون حاصل کرے گا خواہ وہ گناہ ہی کیوں نہ ہو

قسمت کی بولبلیاں انسان کو کبھی اس کے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دیتیں، اس لئے اصغر اس زندگی سے بھی دل برداشتہ ہو گیا اور آخر ایک دن شملہ سے کہیں چل دیا

(۳)

دہلی کی پُرفور زندگی میں قدم رکھتے ہوئے اصغر نے ایک بار پھر اُبھر دیکھا خیال اپنے دل میں محسوس کیا، لیکن

بہت جلد اس کو معلوم ہو گیا کہ بلند خیالی کا تصور بھی اب اس کے لئے ممنوع ہے ناچار اس نے اپنے آپ کو تفریحات کی نذر کر دیا۔ اس کی راتیں سینما و تھیٹر یا کوٹھوں کی نذر ہو گئیں اور دن دہلی کے کھنڈروں میں گزرنے لگے اور اس زندگی میں اس نے اپنے آپ کو اس قدر از خود رفتہ کر لیا کہ تقریباً بالکل کھو گیا، لیکن جب انسانی زندگی میں کوئی خلا پیدا ہو جائے تو اس کا پُر ہونا محال ہوتا ہے، کچھ دنوں تو اصغر اپنے در دو مختلف طریقوں سے بھولا تار ہا مگر تار کے آخر وہ ایک دن دہلی سے بھی چل دیا کیونکہ یہاں کی در و دیوار کی وحشت اس کے لئے ناقابل برداشت تھی، کیونکہ حمیدہ کا تصور اس کے دل و دماغ میں ایسا جم گیا تھا کہ وہ دہلی رہ کر معصیت میں بھی مکمل طور پر منہمک نہ ہو سکا کیونکہ گناہ کے خیال کے ساتھ ہی حمیدہ کا تصور اپنی تمام معصومیوں کے ساتھ سامنے آ جاتا تھا۔ اور اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حمیدہ سائید کی طرح ہر جگہ اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ بعض مرتبہ تو اس کو اپنے سامنے سے حمیدہ تیز تیز جاتی نظر آتی لیکن جب اس کا تقاب کرتا تو وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔ یہ پریشان کن تصور اصغر پر ایسا مستولی ہوا کہ وہ کئی سال تک ہندوستان کے مختلف شہروں میں بار بار پھر آخر کار دلی کشش نے اس کو مجبور کیا کہ وہ اپنے مرکز کی طرف لوٹے

(۴۶)

اپنے وطن ہمیر پور پہنچ کر جیسا کہ اصغر کا اندیشہ تھا، پہلی خبر اس کو یہی ملی کہ حمیدہ کی شادی اسکے بھوپتی زاد بھائی لطیف سے ہو گئی۔ دنیا کا سخت سے سخت حادثہ اگر انسان کے علم کے بعد وقوع میں آئے تو کبھی حیران کن نہیں ہوا کرتا، کیونکہ انسانی تخیل بلند پروازی میں ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے، جہاں سے ہر پیش آنے والا حادثہ اسے نہایت معمولی واقعہ نظر آنے لگتا ہے۔ ابتدا میں اس کا خیال تھا کہ چند روز وطن رہ کر پھر اپنی زندگی برباد کرنے کے لئے کہیں چلا جائے گا۔ مگر چند دن بعد اس میں پھر ایک تیز پیدا ہوا اور اس نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ اپنی ہستی کو اس وجود کے سامنے مٹا دیا جائے جو اس تباہی کا باعث ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے وطن میں قیام کر کے کھیتی شروع کر دی۔ کھیتی میں انہماک کے باوجود وہ اپنے آپ کو تباہ کرنے والی تجویز سے غافل نہ تھا اور گودہ ظاہر میں مطمئن نظر آتا تھا لیکن درحقیقت اس کی حالت اس آتش فشاں پہاڑ کی سی تھی جو بظاہر پرسکون ہوتا ہے لیکن اندر ہی اندر سلگتا رہتا ہے

(۵۱)

انسان کو جس قدر دور سے دیکھا جائے اسی قدر اس میں اچھائیاں نظر آئیں گی، حمیدہ نے اس سے پہلے لطیف کو دیکھا ضرور تھا لیکن وہ دیکھنا صرف نظری دھوکا سے زیادہ وقت نہیں رکھتا تھا چنانچہ وہ ایک خاص قسم کا احترامی جذبہ لطیف کی طرف سے اپنے قلب میں رکھتی تھی۔ مگر جب لطیف کا لہج کی زندگی ختم کر کے اپنے وطن آ گیا تو ایسی جذبہ آہستہ آہستہ رنگ محبت اختیار کرنے لگا۔ لطیف نا تجربہ کار اور بے وقوف نہ تھا کہ وہ اس زندگی میں کوئی غلطی کرتا وہ خوب

جاننا تھا کہ ایک عورت کے جذبات کس طرح برا نگینختے کئے جاتے ہیں، اور آخر کار یہی ہوگا کہ حمیدہ بے اختیارانہ اصغر سے جدا ہو کر لطیف کی ہو رہی

(۶)

حمیدہ کی شادی کا ابتدائی زمانہ ایک خوشگوار خواب، یا شام و سحر کی رنگینوں کی طرح بہت جلد ختم ہو گیا، اب لطیف کے لئے حمیدہ میں کوئی ندرت نہ تھی اور اس لئے وہ حمیدہ سے سیر ہو کر اپنی دلچسپی کے سامان دوسری جگہ تلاش کرنے لگا۔ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن مرد کا استغنا اس کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ ابتدا میں تو خیر لطیف کے اس تغیر کو حمیدہ نے جس طرح مکن ہوا برداشت کیا لیکن تلبکے وہ ایک عورت تھی اور عورت سب سے زیادہ محبت کی بھوکی ہوتی ہے، آخر ایک دن کہہ بیٹھی کہ ”شاید یہ آدیاں آپ میں اب سے چند روز قبل نہ تھیں“ بات معمولی تھی اگر لطیف ٹالنا چاہتا تو ٹال سکتا تھا، مگر اس نے اس معاملہ کو یکسو کرنے کے لئے بگڑا کر کہا کہ ”شاید تم نے اپنا درجہ فراموش کر دیا، میں بتاتا ہوں تم صرف ایک بی بی ہو اور بی بی ہونے کی حیثیت سے تم کو کسی طرح یہ حق نہیں کہ شوہر کی آذادیوں پر پابندی کی مہر ثبت کرو“ یہ جواب حمیدہ کے لئے بالکل غیر متوقع تھا، وہ وہاں سے اٹھ گئی اور دیر تک روتی رہی، آج پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ اصغر کے مقابلہ میں لطیف کا انتخاب اس کی شدید ترین غلطی تھی

(۷)

عورت کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے اور اگر لطف و محبت سے کام لیا جائے وہ مرد کی خطاؤں کو بہت جلد بھول جاتی ہے۔ لطیف کے جواب نے اگرچہ حمیدہ کے توقعات کی دنیا ختم کر دی تھی لیکن لطیف کے محبت انگیز برتاؤ نے چند ہی روز میں پھر حمیدہ کے دل کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک دن حمیدہ کی طبیعت بہت خوش تھی، لطیف سامنے بیٹھا مزے مزے کے قہقہے سنا رہا تھا اور حمیدہ ہنس رہی تھی کہ لطیف نے مسکرا کر کہا ”میں نے ایک غلطی کی ہے لیکن تمہاری نیکی سے اسید ہے کہ تم مجھ کو موات کر دو گی، میں نے تم کو بہت دنوں تک پریشان کیا اور فریب میں مبتلا رکھا لیکن اب میرا ضمیر بچو اس کی اجازت نہیں دیتا لہذا اب میں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ میرا گذشتہ تلخ طرز عمل صرف اسوجہ سے تھا کہ میرے قلب و دماغ کو ایک اور ہستی نے بیکار کر رکھا تھا۔ اور اب مجبور ہو کر میں نے اس سے نکاح کر لیا ہے“ حمیدہ کو یہ معلوم ہوا کہ گویا اس کو کسی نے آسمان سے زمین پر پھینک دیا ہے، لیکن جواب میں صرف یہ کہہ کر وہاں سے چل دی کہ ”آپ مرد ہیں اور مرد کو تمام حقوق حاصل ہیں“ لطیف نے اگرچہ اس جملہ کی تلخی کو اچھی طرح محسوس کیا لیکن مقتضائے وقت دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ یہ دوسرا موقعہ تھا کہ اسے اپنے انتخاب کی شدید غلطی معلوم ہوئی

(۸)

انسان فطری طور پر شرم و حیا کا عادی نہیں ہے بلکہ جب قدر سوسائٹی کا دباؤ اور ماحول کا اثر اسے مجبور کرتا ہے

اسی قدر وہ مشرم و حجاب کا پابند بن جاتا ہے، ابتدا میں لطیف، شریفین سے تفریحاً ملا کرتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ اسی کا ہو کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ ایجن دن وہ اس کو اپنے گھر لے آیا۔ شریفیوں کا گھر میں آنا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا، حمیدہ دلوڑ تک روتی رہی اور اگرچہ اس دوران میں لطیف اور شریفین نے اس کے دل بہلانے کی بہت کوشش کی، لیکن حمیدہ کی افسردگی اور پریشانی بڑھتی ہی گئی۔ اس کو دنیا تار یک نظر آتی تھی، غم سے اس کا دل پھٹا جاتا تھا، اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دکھتی ہوئی بھٹی میں ڈال دیا گیا ہے، مگر ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے خواہ خوشی ہو یا غم۔ آخر آہستہ آہستہ پھر وہ گذشتہ زندگی کی طرف لوٹنے لگی۔ اگرچہ اس جدید حادثہ کی وجہ سے وہ روز بروز کمزور و ناتوان ہوتی جاتی تھی مگر لطیف کو اپنی دلچسپیوں سے کہاں اتنی فرصت تھی کہ وہ حمیدہ کی طرف متوجہ ہوتا۔ اس پر مزید قیامت یہ آئی کہ حمیدہ کے ماں بننے کا بھی زمانہ قریب آگیا، وہ سخت مضطرب تھی کہ کیا کرے لطیف کے مکان پر قیام کی صورت میں اس کو اپنی موت نظر آتی تھی لیکن وہ ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اُسے اپنے گناہ کی تلافی کی صورت صرف یہی نظر آتی تھی کہ خود سسک سسک کر اس قدر الم انگیز موت مرے کہ موت کفارہ گناہ ہو جائے

(۹)

حمیدہ چار پانچ مہینہ اپنی ماں کے ہاں رہی، لطیف اس دوران میں دوسرے تیسرے حمیدہ کو دیکھ جاتا تھا مگر نہ تھا کہ حمیدہ اب ہمیشہ کے لئے یہیں رہ جاتی لیکن وہ ایک خود دار عورت تھی اور خواہ مخواہ دوسروں کو اپنی مصیبت میں شریک کرنا نہیں چاہتی تھی، آخر کار ایک دن ہمت کر کے لطیف کے گھر چلی آئی۔ حمیدہ کے گھر آنے پر لطیف کا اور شریفین کا طرز عمل اس قدر پسندیدہ ہو گیا کہ حمیدہ تقریباً پُرانے واقعات کو بھول گئی۔ مہینہ سو مہینہ کے بعد لطیف بیکام معنوم اور دلگیر رہنے لگا اگرچہ اس نے اپنے طرز عمل میں کوئی تغیر نہ پیدا کیا لیکن اس کا اثر حمیدہ پر ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ وہ بھی رنجیدہ ہو گئی اس تغیر حال کو کئی دن گذر گئے بظاہر نہ تو شریفین میں اتنی جسارت نظر آتی تھی کہ وہ دریافت حال کرتی نہ حمیدہ میں اتنی طاقت تھی کہ وجہ پوچھتی۔ آخر ایک دن لطیف نے نہایت غمناک آواز میں حمیدہ سے کہا ”پوشیدہ کارروائیوں کی بالکل ضرورت نہیں اگر واقعی تم مجھ سے قطع تعلق کرنا چاہتی ہو تو تم کو اختیار ہے لیکن اس سے کیا فائدہ کہ تمہارے والد مجھ کو بدنام کریں اور قصبہ بھر میں کہتے پھریں کہ میں لڑکی کو بٹھا کر نالاش کرنے والا ہوں“ حمیدہ یہ سن کر ہکا بکا ہو گئی اس نے اپنی بریت کا یقین دلایا قسم کھائی لیکن لطیف کا دل مطمئن نہ ہوا، آخر مجبوراً حمیدہ نے اپنے والد کو بلایا انھوں نے حلف سے لطیف کو یقین دلایا کہ ”شریف ایسا نہیں کرتے“ حمیدہ کے والد کے یقین دلانے پر لطیف بظاہر مطمئن ہو گیا لیکن چند روز بعد پھر اس نے وہی قصہ پھیرا کہ ”نہیں ضرور تمہارے والد نالاش کرنے والے ہیں آج انھوں نے فلاں سے اس بارہ میں مشورہ کیا، حمیدہ ان روز روز کے قضیوں سے پریشان ہو گئی تھی کہنے لگی کہ ”اگر تم کو یقین نہیں آتا تو میں اپنا مہر معاف کرتی ہوں“

لطیف نے اس کو نہایت استعجاب سے سنا اور کہا " کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بعد کو مجھے الزام دو اس لئے پہلے تم کو سوچ لینا چاہئے " حمیدہ نے ان الفاظ کو گویا سنا ہی نہیں اور بغیر کسی تعویق کے معافی نامہ لکھ کر لطیف کے حوالہ کر دیا۔ حمیدہ کی اس قربانی کا بدلہ لطیف کو اپنے محبت انگیز طرز عمل سے دینا چاہئے تھا لیکن وہ دل جو دنیا اور فریب کو محبت بنا کر پیش کرنے کا عادی ہو وہ اس قسم کی باتوں پر کوئی غیر معمولی تئیر اپنے اندر نہیں پیدا کرنا کچھ روز تو لطیف کا برتاؤ معمولی رہا لیکن رفتہ رفتہ پھر حمیدہ نے وہی بے پروائی محسوس کی ابھی حسرت کی معافی کو چھ مہینہ بھی نہ گزرے تھے کہ اتفاقاً حمیدہ کے ہاتھ سے شریعت کا آئینہ ٹوٹ گیا، واقعہ معمولی تھا لیکن شریعت اس سے خوب لڑائی اور ہزاروں گالیاں دین، حمیدہ بیجاری چپ اپنے بچہ کو سینہ سے لگا لے بیٹھی روز ہی تھی لطیف اس وقت گھر میں نہ تھا جب وہ آیا تو شریعت نے ایک ایک کی چار چار لگائیں اور لطیف نے بغیر واقعہ کی تحقیق کے حمیدہ کو اس کے گھر روانہ کر دیا اور کہہ دیا کہ " تمہارا یہاں واپس آنے کی ضرورت نہیں " حمیدہ نے ہزار خوشامدیں کیں لیکن لطیف کا دل نہ پیجا اور وہ اس کو گھر پہنچا کر رہا۔۔۔۔۔۔ یہ تیسرا موقعہ تھا کہ حمیدہ کو اپنے انتخاب کی تباہ کن غلطی کا اچھی طرح علم ہوا

(۱۰)

انسان جن تخیلات میں اپنے آپ کو گم کرے وہی اس کی فطرت بن جاتے ہیں اس میں تو اثر اور قدامت کو مطلق دخل نہیں عصیاں کے متعلق مذہبی افراد کا خواہ کچھ ہی فیصلہ ہو لیکن فلسفی کی نظر میں " انسانی تقلید " سے زیادہ وقعت نہیں اور وہ جرائم جن کو اخلاق نے قابل تہذیب قرار دیا ہو انسانی مفروضات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تمام افراد گناہوں کی سرستی میں اس سے کم نہیں۔ لیکن باوجود اس یقین کے اس کی روح اسی طرح پریشان و مضطرب تھی اور اس کو جب اس طرح بھی اطمینان نصیب نہ ہوا تو اس نے شراب پینا شروع کر دیا کیونکہ شراب کے بعد وہ دیر تک بے سکون رہتا اور چونکہ اسے ہر وقت سکون کی ضرورت تھی لہذا وہ ہر وقت مدہوش رہنے لگا۔ پہلے وہ حمیدہ کو یاد کر کے گھنٹوں رویا کرتا تھا اور تقریباً ہر وقت حمیدہ اس کے دل و دماغ پر مستولی رہا کرتی تھی لیکن شراب کے دور کے بعد اس کی بالکل قلب ماہیت ہو جایا کرتی تھی اور بجائے محبت کے نفرت اس کے دل میں پیدا ہو جاتی اور بعض وقت غصہ اس قدر شدید ہو جاتا کہ جذبات انتقام سے اس کا قلب شوق ہونے لگتا اور اس وقت وہ دیوانہ وار جنگلوں کی طرف بھاگ جاتا

(۱۱)

حمیدہ کی حالت یہ تھی کہ وہ دن رات تنہا بڑی رویا کرتی تھی۔ اور اپنے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی محسوس کرتی تھی۔ موجودہ تکالیف کے علاوہ سب سے زیادہ تکلیف اس کو اس احساس کی تھی کہ اس نے اصغر کے ساتھ بہت بڑا سلوک کیا اور اب اگر کوئی آرزو اس کے دل میں تھی تو صرف یہ کہ کسی نہ کسی طرح اصغر سے معافی مانگے لیکن اس کی

تکمیل کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی،

حمیدہ کو چھ مہینے اسی عالم میں گزر گئے اور اس دوران میں نہ تو لطیف نے "تجدید عہد" کی کوشش کی اور نہ حمیدہ ہی نے واپسی کی آرزو اپنے دل میں پیدا کی، اتفاق سے اسی زمانہ میں قصبہ میں شدت سے ہیضہ پھیلنا اور لطیف و شریفین بھی چار گھنٹہ کے تفاد سے چل بسے

لطیف کا طرز عمل خواہ کچھ ہی ہو لیکن وہ حمیدہ کی آرزوؤں کا آخری مرکز ضرور تھا اس واقعہ سے اس کے رہنے سے اوسان بھی ٹھوگئے اس سے قبل دنیا اور اہل دنیا کا خیال ضرور دامنگیر تھا لیکن اب وہ ان تمام قیود سے آزاد تھی۔ آخر ایک رات دس بجے کے قریب چادر اوڑھ کر گھر سے چل دی اور سیدھی اصغر کے گھر پہنچی، اصغرات کی مدد ہوشی کے لئے نوشی کی تیاری میں مشغول تھا، ایک عورت کو بے باکانہ گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے پریشان ہو گیا لیکن اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ آنے والی کون ہے۔ وہ فوراً سنبھل کر بیٹھ گیا۔ حمیدہ تھوڑی دیر گھڑی رہی پھر کہنے لگی کہ "میں کچھ کہنے آئی ہوں اگر اجازت ہو"

اصغر نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا "کہو"

حمیدہ اگرچہ کانپ رہی تھی لیکن نہ معلوم اس میں کہاں سے طاقت آگئی کہ اس نے بے اختیار انہ اصغر کے قدم تھام لئے، اصغر حیران تھا کہ کیا کرے، اس نے بہت کوشش کی کہ حمیدہ سے اپنے قدموں کو چھڑا لے لیکن حمیدہ کی آہنی گرفت نے نہیں چھوڑا۔ حمیدہ سکیاں بھر کر رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ "اگرچہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہارے قدموں میں پڑ سکوں لیکن پھر بھی میں نے یہ جسارت کی ہے، امید ہے کہ تم اس ناپاک وجود سے استغدر متنفر نہ ہو گئے ہو گے کہ اس کو دور کرنے کی کوشش کرو میں اس وقت تم سے بھیک مانگنے آئی ہوں۔ لیکن وہ بھیک عشق و محبت کی نہیں ہے، کیونکہ میں یہ لفظ اپنے منہ سے بھی نہیں نکال سکتی۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ تم کو تباہ کرنے والی، تم کو گناہ کی طرف دیکھنے والی، تم کو بدنام و رسوا کرنے والی، تمہاری راحت کو برباد کرنے والی، تمہارے سکون کو مٹینے والی میں اور صرف میں ہوں، اللہ مجھ کو معاف کر دو اپنی اگلی محبت کا صدقہ معاف کر دو، میں ایک کمزور و ناتوان عورت ہوں اس مصیبت کو برداشت نہیں کر سکتی، میں نے تمہارے گناہ کا بدلہ پالیا۔ اور اچھی طرح پالیا اب نہ عزت کی آرزو ہے نہ بیعزت کی پرداہ لیکن اگر تم مجھے معاف کر دو گے تو ایک ٹوٹے ہوئے دل کو تسکین دو گے"

حمیدہ، اپنے جوش بیان میں نہ معلوم اور کیا کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اصغر اس سے پاؤں پھڑا کر علیحدہ ہو گیا اور ایک منٹ سوچنے کے بعد اس نے نہایت پُر قراؤں میں کہا "حمیدہ، سنو انسان اپنی زندگی میں دو فیصلے نہیں کیا کرتا اگر تم اپنا پہلا فیصلہ توڑ رہی ہو تو تم کو اختیار ہے لیکن میں ابھی تک اسی فیصلہ پر قائم ہوں، ماضی کے متعلق یہ سمجھ لو کہ گویا وہ واقعات ہوئے ہی نہ تھے اور آئندہ کبھی میرے گھر میں آنے کی جسارت نہ کرنا۔ میں ایک بدنام آدمی ہوں کہیں

ایسا شو کہ تم بھی بدنام ہو جاؤ۔“ یہ کہہ کر اصغر گھر سے باہر چلا گیا

(۱۲)

حمیدہ کا دل اصغر کے اس طرز عمل سے اس بُری طرح ٹوٹا کہ صاحب فرمائش ہو گئی

اصغر کرنے کو تو یہ کر گزرا، لیکن بعد کو ایسا محسوس کرنے لگا کہ حمیدہ حقیقتاً مجرم نہیں ہے بلکہ وہ خود مجرم ہے، اور اس دائمی شکست میں وہ اپنی تمام دلچسپیوں سے علیحدہ ہو گیا، اس کے دل و دماغ پر اب صرف یہی ایک خیال مستولی تھا کہ حمیدہ سے معافی مانگنے وہ اپنی گذشتہ زندگی میں پھر لوٹ آیا تھا، وہی عدم سکون تھا اور وہی پریشانی اور وہی حمیدہ کی بے پایان محبت۔ اسی عالم میں اس کو تقریباً ایک مہینہ گزر گیا اس کو روزانہ حمیدہ کی زبون حالی کی خبر ملا کرتی وہ خوب جانتا تھا کہ حمیدہ اب زندہ نہ رہنے کی آخر ایک دن اس کی نازک حالت کی خبر پا کر بغیر کسی اطلاع کے حمیدہ کے گھر پہنچ گیا۔ حمیدہ اس وقت زندگی کی آخری منزل میں تھی، زبان بند ہو چکی تھی اصغر کو دیکھ کر اس نے ہاتھ جوڑے۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر لائی اصغر یہ منظر دیکھ کر گھٹنوں کے بل اس کی چار پائی کے پاس بیٹھ گیا اور ڈارو ڈپٹا کر روئے لگا حمیدہ نے اشارہ سے اس کو منع کر کے اپنی طرف بلایا اور اپنے بچہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ اور ایک لمبا سانس بکریا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی

محمد ذوالفقار کیفی

علم ادب تاریخ و تعلیم کا سرمایہ

شاعری کا مکمل سیدیٹ - علم و فن کا فنیہ تاریخ کوئی صنایع بدائع
 حسن و عیب شعر کے مطالعہ سے جس بزرگوار میں چکے قیمت کا
 تذکرہ آپ بقا۔ ماضی و حال کے شعرا کے حالات انتخاب کلام تنقید
 شعر متروک الفاظ کا ذکر محاورات کی تحقیق و دلکش زبان میں عار
 تذکرہ ہندو شعرا تمام مشاہیر ہندو شعرا کے حالات سب سے بہتر اشعار کا
 انتخاب چار سو پچاس ہندو شعرا کا کلام اور حالات عار
 لغات اکروٹ کا محل استعمال منہ مثال جملہ ہے
 جان اردو - ہندی اردو کی حقیقت محاورے کی پہچان لفظوں کا
 صحیح استعمال مثال کے طور پر مختصر جملے ۶

زبان دلی - اردو زبان کھانیوالی بہترین کتاب مبسوط اور مستند قواعد
 ادب اردو پر تنقید ۶
 اصلاح زبان اردو - متروک الفاظ اور محاورات کی تحقیق
 عمدتاً سے امیر مینائی تک متروک محاورے ۶
 ترجمان پارسی - فارسی سے اردو بنیادنیوالی آسان کتاب جلوں کے
 ترجمے فارسی کے اصول اور قواعد ۶ قواعد امیر - ملک الشرا امیر دہلی
 قواعد جو مولف کوٹے ہیں زبان دلی کا بہترین دستور العمل ۶
 مضمون نویسی - انشا پردازی اور عبارت لکھنے کے صحیح اصول
 قواعد صرف نحو سے بتانیوالی کتاب ۸
 المشہر مینجر عشرت بگڈ پو احاطہ خانساں لکھنؤ

مستقبل کی علمی ترقی

(پہچ - جی ولز کی نگاہ سے)

سائنس کی آئندہ ترقیوں اور مستقبل کی ممکن ایجادات کے متعلق حکم لگانا نہایت دلچسپ مسئلہ ہے، لیکن دشوار بھی ہے۔ اور اُسے دشوار ہونا بھی چاہئے، کیونکہ میرے ایک دوست کے بقول ”یہ ان چیزوں کے متعلق قیاس آرائی ہے جن کو ایک عرصہ تک سوچا بھی نہیں جائے گا“ لیکن مجھے اس خیال سے کلبۃ اتفاق نہیں۔ کیونکہ مستقبل کی اختراعات کا سبب ابھی سے پڑنے لگا ہے

گزشتہ صدی میں طبیعی اور کیمیائی معلومات کی وجہ سے بے شمار میکانیکی ایجادات معرضِ ظہور میں آئی ہیں اور انسانی تاریخ میں یہ دور ایجاد و اختراع کا دور سمجھا جاتا ہے۔ جراحی اور طب میں بھی کافی ترقی ہوئی ہے۔ لیکن اس کا ارتقاء شتر کی پیداوی اور طبیعی ارتقار کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ہے۔ علمِ حیوانات اور علمِ تشریح المابعدان میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ اور گو اس سے مذہبی اور اخلاقی معتقدات میں کافی تبدیلی ہو گئی ہے، لیکن اس سے انسانی معاملات میں کوئی ایسا عملی انقلاب پیدا نہیں ہوا، جیسا کہ طبیعی علم نے پیدا کیا ہے۔ جب ہم ایجادات اور سائنس کی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اس سے جہاز، بڑی مشینیں، ریل، کجلی، لاسکی اور طیارے مراد ہوتے ہیں۔ اور جب ہم مستقبل کے متعلق سوچتے ہیں۔ تو ہم سمجھتے ہیں۔ کہ اس وقت دنیا میں اس سے بھی زیادہ میکانیکی ترقی ہو چکی ہوگی۔ لیکن یہ ایک عام غلطی ہے، جس کا ارتکاب ہم سے اس لئے ہوتا ہے کہ ہم موجودہ واقعات کے ارتقاء کی رفتار کو ایک مستقل چیز فرض کر لیتے ہیں۔ درانحالیکہ بہت ممکن ہے، کہ ابھی کافی عرصہ تک کوئی قابل ذکر میکانیکی ایجاد ہی نہ ہو

یہ صحیح ہے، کہ موجودہ ایجادات میں نمایاں تبدیلی ہوگی، یعنی ممکن ہے کہ ریل گاڑی کا استعمال ہی بند ہو جائے اور غالباً آئندہ نصف میں ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ ہوائی جہاز اس کی جگہ لے لیگا اسی طرح ممکن ہے۔ کہ اس وقت ہم لاسکی کے ذریعہ سے آواز اور تصاویر کو بھی منتقل کر سکیں گے، اور قطبین کا جائزہ لے کر ان کا نقشہ بھی تیار کر لیں گے، لیکن ہوائی جہاز سے بہتر کوئی چیز نہیں بن سکے گی، زیادہ سے زیادہ ہوائی جہاز بہت بہتر قسم کے بننے لگیں گے۔ اسی طرح لاسکی سے بہتر کوئی چیز ایجاد نہ ہوگی۔ البتہ سرعت انتقال اس کی بڑھ جائے گی

بعض حضرات کو یہ دعوے غالباً توقعات کے خلاف معلوم ہوگا، اور وہ کہیں گے کہ ”ان تمام ایجادات کا

کیا حشر ہوگا۔ جن کے متعلق ہم اس وقت سن رہے ہیں؟ آئین سٹائن کے نظریہ کا کیا انجام ہوگا؟ قوتِ مادہ کیا ہوگی؟

میرے خیال میں یہ اس بار کے پھول ہیں، جس کی فصل شاید کئی سو سال کے بعد تیار ہوگی۔ ہر چند آئین سٹائن نے غور و تفکر کا ایک نیا اور آزاد طریقہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے، لیکن حیات انسانی پر بہت جلد اس کا کوئی عملی اثر نہیں ہو سکتا۔ قوتِ مادہ کے استعمال کے متعلق بہت سی بے بنیاد باتیں کی جا رہی ہیں۔ اور گویہ باتیں ایک دلکش فسانہ کی حیثیت سے کافی دلچسپ ہیں۔ لیکن مستقبل قریب میں ان پر بحث کر کے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ ہمیں معلوم ہو چکا ہے۔ کہ ہماری دنیا کے اکثر عناصر بہت سست رفتار سے تحلیل ہو رہے ہیں۔ اور ان کی تحلیل یقیناً ایک اہم کامیابی ہے۔ ہم ادویات میں ریڈیم کی قوت سے نہایت بھدے طور پر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کیونکہ آج تک کوئی آدمی یہ نہیں بتا سکتا۔ کہ یہ قوت کیسے پیدا ہو رہی ہے۔ یا اس کو زیادہ اور کم کیسے کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ سائنس کے پاس آئندہ ایجادات کے لیے امید کے سوا اور کوئی معقول وجہ نہیں

ہماری دنیا میں کوشش نقل اور تحلیل عناصر کی خصوصیات موجود ہیں۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں۔ کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے یہ مسائل کیمیا اور طبیعیات کے بڑے بڑے عالموں کے لئے بھی ایسے ہی معمیا ہیں۔ جیسے یہ ہم عام لوگوں کے لئے ہیں۔ ممکن ہے کسی دن ان مسائل کا حل ذہن انسانی میں آجائے اور اس وقت انسان اپنی کامیابی کا اعلان کر سکے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ قوتِ مادہ اور ایسے ہی دیگر مسائل کا حل اس وقت تک انسان نہیں سمجھ سکیگا۔ جب تک کہ آئین سٹائن۔ کیوری اور سوڈی کے نام اتنے ہی فرسودہ نہو جائیں گے، جتنے کہ آج کل آرتھمیدس اور ہیرو کے ہو چکے ہیں۔ ہیرو نے ٹریبانٹیم انجن کا خاکہ اس کے ایجاد ہونے سے ۱۹ سو سال قبل تیار کیا تھا، ارسطو کے وقت میں رگڑ سے پیدا ہونے والی بجلی کے خواص معلوم ہو چکے تھے، لیکن علم کے ان پھولوں سے کئی صدیوں کے بعد انہما حاصل کئے گئے۔

میرے خیال میں گزشتہ سو سال کی علمی کاوشوں کے تقریباً تمام نتائج ہم حاصل کر چکے ہیں۔ اور مزید نتائج اغلباً کافی عرصہ کے بعد برآمد ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں علمی خیالات کے نتائج کا ایک اور رخ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ گزشتہ صدی سائنس کی مادی کامیابی کے لئے نہایت اہم ہے۔ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ موجودہ صدی اور آئندہ اکیسویں صدی میں نفسیات اور علم تشریح میں کافی ترقی ہوگی۔ انسان دنیا کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک گھوم کر اور دنیا کے گوشات آٹھ دن میں طیارے کے ذریعہ چاکر لگا کر اپنی ذات کے متعلق سوچنا شروع کر دے گا۔ اور علمی طور پر اپنی توجہ اپنے آپ پر مرکوز کر دے گا۔

بدقسمتی سے ان دنوں جب کوئی آدمی عام علم نفسیات کے متعلق ذکر کرنا شروع کرتا ہے۔ تو اسے واضح کرنا پڑتا ہے کہ علم نفسیات سے اس کی مراد روجوں یا فردوں سے باتیں کرنا ہیں۔ یعنی وہ علم تحلیل روح کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

ممکن ہے۔ کہ ان حکایات میں ماہرین نفسیات کے لئے کوئی دلچسپی ہو۔ لیکن میرے نزدیک یہ قصے نہایت بہودہ ہیں کیونکہ ان سے انسانی دماغ کو کوئی روشن پہلو سامنے نہیں آتا

گزشتہ تیس سال سے میں دور خیالی اور رویوں کے تجربات میں دلچسپی لے رہا ہوں، کچھ عرصہ تک میں ایک ایسی سوسائٹی کا بھی رکن رہا ہوں۔ جو ان تجربات میں دلچسپی لیتی تھی۔ اور اس عرصہ میں میں نے مختلف کتب کا مطالعہ بھی کیا ہے، اور ڈبلیو۔ پی۔ سٹیڈمرجم۔ آر تھر کا نٹن ڈائل اور سر ایور لاج کی حکایات کو سنا ہے۔ لیکن ہر صورت میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں، کہ ان کاوشوں میں شتمہ بھر بھی حقیقت نہیں۔ اور یہ تمام باتیں دھوکہ۔ جیسا زہی اور خود فریبی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں اور ان دماغوں کو دھوکا دینے کے لئے کی جاتی ہیں۔ جو جادو اور طلسم کے پڑاتے قصوں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ جو ان وقت گزرتا گیا ہے۔ میں رویوں کی گفتگو، معمول کی اطلاعات اور میز پر خود بخود رونما ہونے والی تحریروں کے شعبہ کی حقیقت کو سمجھتا گیا ہوں، اگر پھر موقع ملا، تو میں تخیلی روح پر بھی کچھ لکھوں گا،

موجودہ وقت کی سائنس میں اُمید افزا چیز صرف انسانی دماغ کا مطالعہ ہے۔ جو بیشتر تحلیل نفسی پر مشتمل ہے تیس سال قبل جب میں نے یونیورسٹی سے سند لی تھی، علم نفسیات بالکل ابتدائی حالت میں تھا، دماغی اصولوں کو تفکر، احساس اور خواہش میں تقسیم کر کے علم نفسیات حتم ہو جاتا تھا اور احساسات کا عمل ایسے سادہ طریقہ سے بیان کر کے ختم کر دیا جاتا تھا۔ گویا کہ وہ کوئی بالکل معمولی عمل ہے۔ حالانکہ ہافڈنگ اور ولیم جیمز کی تصنیفات کے مطالعہ سے مجھ پر یہ روشن ہوا۔ کہ یہ عمل نہایت ہی پیچیدہ ہے

اس وقت سے اب تک علم نفسیات میں بے شمار ترقی ہو چکی ہے۔ گزشتہ تیس چالیس سال میں نفسیات کی بالکل نئی بنیادیں قائم کی گئی ہیں۔ علم طبیعیات کی طرح ان بنیادوں کو قائم کرنے کے لئے بہت سی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ لیکن جدید علم نفسیات کا صحیح آغاز ”فرود“ اور ”جنگ“ کی تصنیفات سے ہوتا ہے ان دونوں اصحاب کا نام تاریخ نفسیات میں اسی اہمیت کے ساتھ باقی رہے گا، جیسے کہ گلبرٹ یا نیوٹن یا فیرڈے کا نام اپنے اپنے علوم کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ تمام لوگ مجتہد تھے، ان لوگوں نے اس سخت زمین میں کاشت کی، جو بنجر بڑی ہوئی تھی۔ اور جس سے اب علوم کے خزانے ابل رہے ہیں

ان لوگوں نے ہمیں بنی نوع انسان کی خواہشات و نظام ادراک کے متعلق نیا اور حوصلہ افزا نظریہ قائم کرنے میں مدد دی ہے۔ انھوں نے ہمیں صحیح طور پر سمجھا دیا ہے۔ کہ لوگ کیوں اور کیوں سوچتے اور کام کرتے ہیں، انھیں کیوں چند کام آسان اور دلکش معلوم ہوتے اور چند دشوار و ناگوار۔ وہ کیوں ایک واقعہ پر اعتبار کر لیتے ہیں اور کیوں دوسرے پر اعتبار نہیں کرتے۔ اور ان کی شعوری زندگی کس طرح غیر شعوری زندگی کے دھارے پر بہتی جا رہی ہے۔ یہ ایسی معلومات ہیں، جن کے متعلق نصف صدی قبل انسانی ذہن بالکل خالی تھا، لیکن اب اس کے متعلق ہمارے علم میں کافی اضافہ ہوا

ہے، صرف انفرادی ذہن کے متعلق نہیں، بلکہ جماعات کے ذہن کے متعلق بھی۔ یہ نئے طریقے۔ نئے نظریے اور نئے علوم انسانی ذہن کے ارتقاء اور سرگرمیوں کے متعلق ہمارے ابتدائی خیالات میں کافی ترمیم کر چکے ہیں اور اس ترمیم سے ہم لازمی طور پر انسانی ذہن میں بالکل ایسی ہی تبدیلیاں کریں گے۔ جیسی کہ بجلی اور بھاپا نئے وجود سے وسائل محل و نقل میں پیدا ہو گئی ہے

میرے خیال میں آئندہ سو سال کا زمانہ لازمی طور پر علمی نفسیات کا دور ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ہی علم تشریح الابدان میں بھی کافی ترقی ہوگی۔ کیونکہ اس علم کا علم نفسیات سے گہرا تعلق ہے۔ اس سے انسانی مسائل میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوگا۔ اور اس مادی انقلاب سے زیادہ مستحکم اور مقید انقلاب ہوگا۔ جس کو کہ ہمارے آبا و اجداد نے یا ہم نے دیکھا ہے گذشتہ صدی کے مادی انقلاب نے شہر لوں، دیہات اور تقسیم آبادی پر جو اثر ڈالا ہے۔ وہ ریلوں۔ پلوں۔ انجنوں۔ گیس کے کارخانوں۔ اور بجلی کے کاروبار کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ لیکن مستقبل کا انقلاب سطح ذہن میں تلاطم کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ یہ ایک ایسے فن کی ایجاد ہوگی، جو قدیم معتقدات کو باطل قرار دے گی، اور اپنے شاہین کو قدیم پابندیوں سے آزاد کر کے نفسیاتی نقطہ نظر سے قانونی سیاسی۔ اقتصادی۔ اور مالی مسائل کا نیا مفہوم قائم کرنے میں مدد دے گی۔ اس سے دنیا کے ہر درجہ کے افراد میں ایک وسیع تعلق پیدا ہو جائے گا، چنانچہ اب بھی یہ خیالات کئی متعدد اداروں کی طرف سے پیش کئے جا رہے ہیں۔ اور ہمارے بہترین قائدانہ مسائل پر غور کر رہے ہیں

اب تک ہمارے تعلیمی ادارے اس تعلیم کی تدریس میں مشغول رہے ہیں۔ جو حقائق زندگی سے کوسوں دور تھی، تعلیمی اداروں کا یہ دعوے ہے۔ کہ وہ اچھے شہری پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت صرف یہ ہے۔ کہ ہمنوں نے انسان میں مقابلہ کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن انھیں جنگ کے لئے ضروری سامان بہم نہیں پہنچایا، جس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک انسانی اداروں کے متعلق کوئی نظریہ قائم نہیں کیا گیا۔ ہماری اقتصادی۔ مالی اور سماجی زندگی اس نظریہ کے قائم ہونے کے بغیر ترقی کر رہی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ اتفاقی ترقی ان مبہم خیالات کے ساتھ ہوتی رہے اور پھر ہمارے اس عروج کو دوام بھی حاصل ہو۔ انسانی عقل اس کی مخالفت ہے اور بالآخر کلمع عقل ہی کو حاصل ہوگی۔ آج تمام دنیا مختلف حصوں میں تقسیم ہو کر اپنی بنیادیں مستحکم کر رہی ہے۔ لیکن یہ جداگانہ استحکام کسی کام کا نہیں۔ ہمارے تعلیمی ادارے لوگوں کو منظم زندگی کی تعلیم نہیں دے سکتے۔ کیونکہ ان حالات میں زندگی منظم رہی نہیں سکتی

لیکن یہ صورت کھالات ہمیشہ یوں نہیں رہے گی، ذہن استاد کا ذہن اپنے غیر مفید فرایض کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ اُسے اپنے نشاگردوں کو غیر منظم دنیا میں بھیجنا پسند نہیں۔ لیکن وہ محسوس کرتا ہے۔ کہ وہ اس وقت تک ٹوڑے طور پر تعلیم نہیں دے سکتا۔ جب تک اسے اس زندگی کا مفہوم واضح طور پر معلوم نہ ہو جائے۔ جس کی وہ تعلیم دینا چاہتا ہے۔ جب ہم سماجی انصاف اور تعلقات کے متعلق اپنے خیالات کو نیا جامہ پہنائیں گے۔ تو ہمارے تعلیمی ادارے بھی

تبدیل ہو جائیں گے۔ اور تعلیم کے نئے مقاصد پر سے ہو کر سب گئے۔ علمی نفسیات کا وہ ارتقاء جو استاد کو مکتب میں خیالات اور ارادوں کی تربیت کرنے میں مدد دے گا۔ وہی ارتقاء مکتب سے باہر کی دنیا کے سائنس سماجی اور سیاسی تنظیم کا ایک نیا مفہوم پیش کرے گا۔ جو انسانی ارادوں کے عین مطابق ہوگا۔ اور جس سے ہم اس وقت بالکل بے خبر ہیں

یہ امر تعجب خیز ہے، کہ لوگ انسانی صورت حالات میں طبعی انقلاب کے علی الرغم ذہنی انقلاب کو بہت دشوار سمجھتے ہیں۔ اگر ہم کسی سے یہ کہیں۔ کہ تعطیل منانے کے لئے لوگ مستقبل قریب میں چاند میں جایا کریں گے۔ یا انسانی حیات کا امتداد ڈیڑھ سو سال تک ہو جائے گا۔ تو وہ اس پر مطلقاً متعجب نہ ہوگا۔ لیکن اگر ہم یہ کہیں۔ کہ دنیا میں ایک ایسی تعلیم رائج ہوگی اور ایسا سماجی اور اقتصادی نظام قائم ہوگا۔ جس کی موجودہ اقتصادی اور سیاسی نظام سے وہی نسبت ہوگی۔ جیسی کہ موجودہ زمانہ کے عالیشان محل اور زمانہ قدیم کے جھوڑے میں نظر آتی ہے تو وہ اس کو باور نہ کرے گا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ مکتب ہمیشہ موجودہ وقت کے مکتب کی طرح نہایت خشک سا مقام ہوگا۔ اور استاد غیر موثر انداز میں کم تنخواہ پر اپنی بد مزہ زندگی کے مکروہ فریض ادا کر رہا ہوگا۔ ان کا ایمان ہے۔ کہ آجکل کی طرح ہمیشہ دنیا میں جنگ۔ جرم اور نا کامیوں کا وجود باقی رہے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ ذہنی تعلقات کے علوم کا استعمال دنیا کی تمام چیزوں میں صحیح اور مکمل انقلاب پیدا کر دے گا۔ اور یہی مسئلہ ہماری موجودہ نسلوں کے سامنے ہے

جب یہ پیشین گوئی کی جاتی ہے۔ کہ مستقبل قریب میں حیات انسانی پر ایک ایسا دور آنے والا ہے جس میں لوگوں کا طرز زندگی موجودہ طرز سے مختلف اور بہتر ہو جائے گا، تو اکثر آدمی یہ کہتے سے جلتے ہیں۔ "تم انسانی فطرت کو تبدیل نہیں کر سکتے" یہ مقولہ اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے۔ لیکن اس کا ہمارے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ تم صرف انسان ہی کی فطرت کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ بلکہ کسی چیز کی بھی فطرت کو نہیں بدل سکتے۔ لیکن ہم نے گزشتہ سو سال میں فطرت کی مدد سے ہزاروں چیزیں تخلیق کی ہیں۔ جن کا علم قبل ازیں ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اور اسی طرح آئندہ صدیوں میں ہم فطرت انسان کی مدد سے اور ہزاروں کام کریں گے، جو ہم اس وقت نہیں کر سکتے

جو کچھ مجھے یقین ہے۔ کہ نفسیات میں ایک ایسی تجدیدی اور تخلیقی قوت پنہاں ہے، جو انسانی ارادوں میں نمایاں تبدیلی پیدا کر سکتی ہے۔ اس لئے میں موجودہ قوانین، مدرسوں۔ قومی جھنڈوں۔ سیاسی مجالس اور اقتصادی طریقوں کو بنظر حقارت دیکھتا ہوں۔ کیونکہ انہی سے موجودہ وقت میں ہمارے شب و روز تاریک نظر آتے ہیں۔ میں اس مسئلے کے متعلق بالکل اسی طرح سوچ رہا ہوں، جیسے گزشتہ صدی کے وسط میں ایک امریکن بھوک اور پیاس کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا اپنی گاڑی کو ڈھکیں کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لئے جا رہا تھا، اور دفعۃً اسے ایک ایسی گاڑی بنانے کا خیال آگیا۔ جو اسے اور اس کے درشاہ کو دوران سفر میں باد و باران کے طوفان سے محفوظ رکھنے والی تھی۔ موجودہ زمانہ میں جب کہ انسان سامان

معیشت کی قلت، کاروبار کی سردبازاری، سیاسی عناد، ملکی تنازعات اور آئندہ جنگ کی انواہوں سے تنگ ہو رہے ہیں، مجھے انسانی دورِ حیات کے افق سے ایک ایسا آفتاب طلوع ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے جس کی ضیاء عالمگیر امن، کافی اسبابِ ضرورتاً متول اور راحت کا سامان، ہم پہنچائے گی۔ اور یہ تمام باتیں صرف نفسیات کی تحقیق اور اس کے نتائج کی عملی پیروی سے معرضِ نمود میں آئیں گی

میں انسانی معاملات پر نئے اور ترمیم شدہ علمِ نفسیات کے ممکن اثر کو زیادہ واضح طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں پہلے اس مسئلہ پر غور کرو۔ کہ ہم مختلف فرقوں کے آدمیوں میں کس طرح امن قائم رکھتے ہیں اور ادا و منہیات کے متعلق اس طرح سمجھوتہ کیا ہے۔ ہم یہ مقصد قانونِ قانونی عدالتوں اور پولیس کی مدد سے حاصل کرتے ہیں۔ لیکن جو قانون ہمیں اس طرح جکڑے رکھتا ہے یہ قدیم اور فرسودہ روایات کا ایک پیچیدہ سانچہ ہے۔ قانونی کارروائی روایات، عدم توجہی اور کالی کا مرکب ہے۔ پیرسٹرو کا گواہی اور عدالت میں اپنے رفقاء سے سلوک و حشیانہ رویہ کا منظر ہے۔ قانون کے طریقوں پر کئی صدیوں سے مؤثر نظر ثانی نہیں کی گئی۔ قانونی عدالت ہمیں ازمنہ وسطے کی باددلاتی ہے۔ وہی سترہویں صدی کے گون اور وگ اپنی فرسودگی کی نشان دہی کرتے ہوئے ہیں۔ وکلاء و جج کی جسمانی نکالیف کو اب بھی برداشت کر رہے ہیں۔ دنیا کا اور کوئی پیشہ وران تنگ۔ غلیظ اور تاریک دفاتر میں کام کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ جن میں وکلاء کام کر کے محفوظ ہوتے ہیں۔ اگر ان کی حالت سترہویں صدی کے مدنی خانے سے کسی طرح بہتر نہیں۔ جن آدمیوں نے ان چیزوں کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ میرے اس خیال سے متفق ہوں گے۔ کہ ہمارے قید خانے بھی انسانوں کی ردحوں کو تباہ کرنے کے آہستہ آہستہ ہیں۔ اور ان عدالتوں سے بھی قدیم تر ہیں جو قیدیوں کو بیان لکھتی ہیں۔ انسانی جرائم کے متعلق ہماری عدالتوں کا نظریہ کسی طرح بھی قدیم باہلیوں کے نظریہ سے مختلف نہیں آدھی جرم کا ارتکاب کسی فطری قسارتِ قلبی کی وجہ سے نہیں کرتے۔ جائداد کے متعلق جو جرم کئے جاتے ہیں۔ ان کا اگر جرم کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ وہ بیشتر عزت اور اقتصادی مشکلات کے خوف کی وجہ سے کئے جاتے ہیں۔ بہت سے قتل اور تشدد کے جرم رقابتوں اور ان ناقابل برداشت حالات کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ جنہیں ہمارے بڑے قوانین از دوں جہاں لکھتے ہیں۔ ناگوار زندگی کو گذارنے سے خواہ مخواہ اس کے خلاف نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور قید خانے میں لگنے والے بہت سے جرائم درحقیقت انسانی مایوسیوں کی وجہ سے کئے جاتے ہیں۔ اگر ہم ان مایوسیوں کا سدباب کر سکیں۔ تو جرائم کی تعداد بہت کم ہو جائے گی۔ علمِ نفسیات کی تحقیق ہمارے دعاوی کی تائید کرتی ہے۔ اور انسانی مشکلات کا حل ہمارے سامنے پیش کر رہی ہے

یہ خیال مضحکہ خیز ہے، کہ حالات کی موجودہ سطح کو دوام حاصل ہے۔ یہ فرض کر لینا بھی مضحکہ خیز ہے۔ کہ علمِ نفسیات کے روز افزوں اضافہ کے باوجود انسان، تعمیری طور پر سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کا بہتر حل نہ سوچ سکے گا۔ مجھے یقین ہے۔ کہ جس طرح آجکل کے وسائل حل و نقل میں سہولتیں ہم پہنچائی جا رہی ہیں اسی طرح کسی دن انسانی ذہن و شعور ان

تاریخ قدیم کا ایک روق مجہول

(ہیکلِ عشرت پر ذبحِ حسن و جمال)

آہ، آہ، آہ... !
 کاہنِ اعظم "آرام" اپنے حجرہ میں ساکت و مطمئن بیٹھا ہوا تھا کہ دفعۃً اس آواز نے اُسے چونکا دیا۔ یہ اس کی بیٹی "زامورہ" کی آواز تھی۔
 وہ کبیرا حجرہ سے باہر نکلا اور دوڑتا ہوا "ہیکلِ عشرت" کے اس حصّہ کی طرف گیا جہاں سے یہ آواز آرہی تھی۔ "زامورہ" ہیکل کے سامنے سر پہ سجود بڑھی ہوئی رو رہی تھی اور اپنے اُن ہاتھوں سے، جو دیوی "عشرت" کے مرمی قدموں کی طرح سفید و خوبصورت تھے، معبد کے زینوں کو چھو چھو کر، بیتا یا نہ کراہ رہی تھی۔
 "آرام" نے اپنی خوب بیٹی کو اٹھایا اور اس کے سر کو چوم کر پوچھنا چاہا کہ یہ اضطراب کیوں ہے، لیکن اس کا گریہ بدستور جاری تھا۔ اور دیوی سے مخاطب ہو کر وہ برابر یہی کہتی جا رہی تھی کہ "اے محبت و انتقام کی دیوی، میں وہی کروں گی جو تیرا حکم ہے اور سر مو تیرے فرمان سے انحراف نہ کروں گی۔"
 "آرام" کچھ دیر تک اسی حال میں اس کو دیکھا کیا اور پھر پوچھا کہ "اے بیٹی اس گریہ و زاری کا کیا سبب ہے"

زامورہ نے آنسو پونچھتے ہوئے ایک ایسے پھرہ کے ساتھ جس کی شفاف جلد سے خون اس طرح بھلک رہا تھا گویا کہ کسی ساغر بلور میں رنگِ شباب بھر دیا گیا ہے، جواب دیا کہ :-

"اے میرے مہرِ باپ، تو نے مجھے اپنے بیٹھے "حارام" کے ساتھ نامرد کر دیا ہے اور تو چاہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو اس کی آغوش میں سوئپ دوں، لیکن باور کر کہ جس وقت سے میں نے تیرا یہ فیصلہ سنا ہے، ایک لمحہ کے لئے مجھے چین نہیں ملا اور حیران ہوں کہ کیونکر میں تیری مرضی پر چل سکوں گی، جبکہ میرا دل اس کی طرف کسی طرح مائل ہی نہیں۔ پھر اے میرے مقدس باپ، تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ صرف تجھی کو اس تعلق سے اختلاف نہیں، بلکہ دیوی "عشرت" بھی اس کو پسند نہیں کرتی جس کا تو خادم ہے"

وہ اس قدر کہہ کر خاموش ہو گئی کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کا باپ یہ سن کر سخت برہم ہوگا، لیکن جب اس کا یہ خیال غلط نکلا اور کاہنِ اعظم اسی طرح شفقت و محبت کی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا تو اس نے پھر کتنا شروع کیا :-

” تو معبدِ عشرت “ کے خادم اور معابد ” بیلوس “ میں سرزمینِ ضیقیا کے سب سے بڑے کاہن ہونے کی حیثیت سے واقف ہے کہ جب کوئی مصیبت انسان پر نازل ہو تو دیوی ” عشرت “ سے مدد چاہنا ضروری ہے “

آرام نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔۔۔ ” بیشک ، کیونکہ ” عشرت “ دیوی سے زیادہ صائب الرئے کوئی دیوی نہیں “

زامورہ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :-

” اے میرے محترم باپ ، میں نے ہمیشہ تیری اس نصیحت پر عمل کیا اور اس مرتبہ بھی جب کامل تین راتیں کرب و اضطراب میں بسر ہو گئیں تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ دیوی ” عشرت “ سے فریاد کروں اور اس کے ارادہ و حکم کو معلوم کر کے اس پر کار بند ہوں “

آرام۔۔۔ ” اے میری بیٹی ، سچ بتا ، کیا دیوی نے تیری فریاد کو سنا ، کیا اس نے کوئی جواب دیا ؟ “

زامورہ۔۔۔ ” ہاں سنا اور جواب دیا۔۔۔ رات میں نے دیکھا کہ ” دیوی ” عشرت “ ایک ہالہ نور میں محصور میرے سامنے نمودار ہوئی اور بولی کہ ” اے زامورہ اپنی قوم میں سے تو کسی کو اپنا شوہر نہ بنا ، کیونکہ تو یا تو سکندرا مقدونی کی آغوش میں جائے گی یا پھر میرے سیکل پر اپنی قربانی پیش کرے گی “

یہ لکر زامورہ خاموش ہو گئی اور اپنے باپ کا چہرہ دیکھنے لگی۔ لیکن جب وہ خاموش رہا تو اس نے پھر اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ

” اے باپ ، تو نے سنا لیا جو دیوی ” عشرت “ نے حکم دیا ہے اور کیا اس کا یہ فرمان میرے لئے واجب العمل نہیں “

کاہن اعظم نے اپنا سر اٹھایا اور بیٹی کی پیشانی کو بوسہ دے کر کہا کہ۔۔۔ ” بیشک واجب العمل ہے اور اس وقت سے تو صرف دیوی ” عشرت “ کی ملکیت ہے۔ تو معبد میں داخل ہو جا اور اس وقت تک باہر نہ نکل جب تک اسکندر مقدونی اس سیکل کے اندر تجھے اپنی آغوش کی زینت نہ بنائے “

زامورہ نے اپنے باپ کے ہاتھوں کو چوم کر کہا کہ :-

” اے باپ ، دیوی کے آخری ہرے پر بھی تھے کہ تو اسی سیکل میں قیام کریں تک کہ فاتح اعظم آکر تجھے اپنی بیوی بنائے لیکن یہ یاد رکھ کہ اگر وہ اس سے قبل مر گیا۔ اور تجھے اس کا مدد دیکھنا پڑا تو اسی دن مجھ کو میرے سیکل پر اپنی قربانی چڑھانا پڑے گی “

قبل مسیح ۳۲۴ سال کا زمانہ ہے

اسکندر مقدونی ، دیار ہند سے ارض فارس کی طرف واپس آیا ہے۔ نئے ملکوں اور نئی قوموں کو مفتوح و مغلوب کرنے کی مسرت میں دس سیکل یونانی دیوتاؤں کے طیار کر اچکا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کم از کم ایک سال کے لئے اپنی فوجوں کو آرام دے تاکہ پھر وہ زیادہ جوش و قوت کے ساتھ کام کر سکیں۔ خود بھی سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لئے گوشہ امن و عافیت کا طلب گار ہے کہ دفعہ ہمار پڑتا ہے اور بارہ دن کے اندر وہ حقیقی سکون اس کو نصیب ہو جاتا ہے جس کے

بعد پھر کسی اضطراب سے واسطہ نہیں پڑتا

فوجیں چاروں طرف احاطہ کئے ہوئے ہیں، حکماء و اطباء کا ہجوم ہے، دعا اور دوا بھی کچھ ہو رہا ہے، لیکن اس کی حالت کسی طرح نہیں سنبھلتی، ضعف بڑھ رہا ہے۔ نبض سا قفا ہو رہی ہے۔ اور عین عالم شباب میں جبکہ اس کی عمر صرف ۳۳ سال کی تھی۔ تیرہ سال کی حکمرانی و ملک گیری کے بعد دم توڑ رہا ہے۔ آخری الفاظ وصیت اس کی زبان سے یہ نکلے ہیں:-
 ” میری لاش کو قینقیہ میں جیلوس کی طرف لیجا یا جائے، ” ریائے اڈونیس کے مقدس پانی سے اس کو غسل دیا جائے اور پھر دس دن تک لوگوں کی زیارت کے لئے اس کو کھلا ہوا پھوڑ کر مہر لیجا کر جو آتون میں دفن کر دیا جائے “

ارباب فن نے پورے دو سال تابوت اور اس مرکب کی تیاری میں صرف کر دئے جس کے ذریعہ سے سکندر کی لاش کو اس کے دفن تک لیجانا تھا اور ۳۳۲ قبل مسیح میں براہ قینقیہ، بابل سے مصر کی طرف روانگی ہوئی۔
 اس دن کی صبح جب سکندر کی لاش قینقیہ پہنچنے والی تھی، عجیب ہنگامہ کی صبح تھی، گوشہ گوشہ میں بہ آواز ڈہل اعلان کیا جا رہا تھا کہ دارا کو منسوب کرنے والے اور دیار ہند کو فتح کرنے والے سکندر مقدونی کا جنازہ حدود قینقیہ میں پہنچ گیا ہے اور ۷ میل اس گاڑی کو کھینچ رہے ہیں جس پر اس کا تابوت رکھا ہوا ہے

لوگ، بہاڑوں سے، وادیوں سے، تمام قریہ و بلاد سے بوق در بوق چلے آ رہے تھے اور اپنے ہاتھوں میں نہراؤ ونیس کے مقدس پانی کے ظروف لئے ہوئے تھے تاکہ اس کی لاش پر پھر تک کر ثواب حاصل کریں
 جنازہ بلند دیواروں کے سایہ سے گزرتا ہوا کوہستانیہ استہ سے اس مقام پر پہنچا۔ جہاں نہر مقدس کے پانی سے اس کو غسل دیا جانا تھا اور پھر وہاں سے ہیکل عشتروت میں لایا گیا۔ جہاں دس دن تک لوگوں کی زیارت کے لئے اس کو کھلا ہوا رکھا جانا تھا

مصر کا بادشاہ ملک بطلموس ایک جرار فوج کے ساتھ استقبال کے لئے آیا تاکہ لاش کو پورے احترام کے ساتھ مصر تک لیجاے، اور قینقیہ کے تمام کاہن اور امراء، سردار چشم اشک آلود کے ساتھ مجتمع ہوئے تاکہ فاتح اعظم کی لاش کے سامنے اپنی محبت کے آخری آنسو پیش کر سکیں۔ اس طرح مسا بد تموز و عشتروت کی حسین کاہن زادیاں اپنے اپنے حجروں سے باہر نکلا کر دوڑ پڑیں کہ دنیا کے اس حلیل القدر بادشاہ کی لاش کو دیکھ سکیں جس کے بازوؤں میں دیوتاؤں کی قوت موجود تھی۔ انھیں میں ایک زامورہ بھی تھی جو ایک بیوہ کے پورے سوگ کے ساتھ آنسو بہاتی ہوئی تابوت کی زیارت کے لئے جا رہی تھی

چونکہ زامورہ کے متعلق دیوی عشتروت کی بشارت کا علم ساری دنیا کو ہو چکا تھا، اس لئے وہ ہر جگہ ” محبوبہ سکندر“ کے نام سے مشہور ہو گئی تھی

زامورہ نے انتظار کیا یہ زمانہ انتہائی خشوع و خضوع میں بسر کیا ، وہ روزانہ صبح کو پہاڑ کی چوٹی پر جا کر پھول جمع کرتی تاکہ معبد توڑ پر لا کر چڑھائے اور اس کے بعد سارا وقت ہیکل کے اندر بخور روشن کرنے اور التجا و دعا میں صرف کر دیتی وہ دیوی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاتی اور اپنے بلور ایسے عریاں سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا کرتی کہ اے دیوی وہ ساعت کب آئے گی جب سکندر مجھے آغوش میں لے گا

دیوی ان التجاؤں کا کوئی جواب نہ دیتی ، لیکن آخر کار ایک دن اس نے اپنا سنگین سکوت توڑا اور زامورہ سے کہا کہ ” سکندر کی لاش سرزمین فرعون میں دفن ہونے کے لئے اس طرف سے گزرنے والی ہے ، اس لئے جس دن تیری نگاہ اس کی لاش پر پڑے گی ، میں تجھ سے تیری قربانی چاہوں گی ، کیا تو اس کے لئے تیار نہیں ؟ “

زامورہ نے منہ کے بل گڑ گڑوٹے ہوئے کہا کہ ” اے دیوی ، میں تیار ہوں ، کیونکہ جب سکندر کی آغوش میری نہ آئے تو پھر تیرے سنگین پیلو سے زیادہ راحت اور کہاں مل سکتی ہے “

کاہن اعظم نے زامورہ سے کہا۔۔۔ ” اے بیٹی ، کیا واقعی دیوی عشرت کی یہی مرضی ہے ، تجھے دھوکا تو نہیں ہوا “

زامورہ نے جواب دیا۔۔۔ ” اے باپ ، مجھے دھوکا بالکل نہیں ہوا ، میں نے اس کا یہ فرمان صاف و سرح الفاظ میں سنا ہے ۔ میں آج سکندر کی لاش دیکھ چکی ہوں ، اس لئے دیوی کے حکم کی تعمیل ہونی چاہئے۔ کیا کاہن عشرت ہونے کی حیثیت سے تجھے اس میں پس و پیش کرنا چاہئے “

زامورہ نے یہ کہا اور اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ کر قربانگاہ عشرت پر لپکا کر اس طلائی خنجر کی طرف اشارہ کیا جو اسی رم ذبح و قتل ادا کرنے کے لئے مخصوص تھا

کاہن متردد تھا ، اس کا دل دھڑک رہا تھا اور وہ حیران تھا کہ اپنی جمیل نوجوان بیٹی کے گرم خون کو کیوں کر اپنی ننگا ہوں کے سامنے ہتھا ہوا دیکھے گا۔۔۔ زامورہ نے خنجر اٹھا لیا اور اس کا قبضہ باپ کی طرف کر کے کہا کہ ” اے باپ ہلدی کر ، مبادا دیوی خفا ہو جائے “

معبد کے تمام کاہن اور کاہن زادیاں جمع ہیں اور ایک آواز سے عبادت کے گیت گانگا کر اس التجا میں مصروف ہیں کہ ” اے عفت کی دیوی اس طاہر و مقدس قربانی کو قبول کر کے ملک کی کھیتوں کو ہرا بھرا کر دے ، ہمازوں کے لئے موافق ہوا میں چلا ، تاجروں کے کیسہ لو لو دھر جان سے بھر دے ، لڑکیوں کے لئے اچھے شوہر اور لڑکوں کے لئے اچھی بویاں فراہم کر ، ملک کو امن و سکون سے آشنا کر اور دشمنوں کو تباہ و برباد۔۔۔ “

یہ شور و ہنگامہ ، ہنوز برپا تھا کہ کاہن اعظم آرام کا داہنا ہاتھ بلند ہوا اور ہر چند حاضرین نے خنجر کی تڑپ کو تو دیکھا ، لیکن اس بیچ کو نہ سنا جو بے اختیارانہ زامورہ کے منہ سے نکل گئی تھی۔ اسکا سینہ شق تھا اور خنجر کی نوک اس دل سے پار ہو چکی تھی۔ جو اتنے دلائل سے اس پھانسی کے لئے تڑپ رہا تھا

اکابر اسلام کی بعض عجیب و غریب سہی تاریخی تحقیقات

عزرائیل یا ملک الموت

گزشتہ ماہ کی اشاعت میں، ہم قاف کے متعلق ان نواد تحقیقات کو پیش کر چکے ہیں جو اکابر اسلام کی طرف سے ظاہر ہوئی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اس وقت ہزار میں ایک انسان بھی ایسا نہ ملے گا جو ان پر یقین لانے کے لئے آمادہ ہو سکے لیکن باوجود اس کے ہمارے یہاں کے علماء کا اب بھی یہی اصرار ہے کہ اسلاف جو کچھ لکھ گئے ہیں ان میں غلطی کا امکان ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ جو کچھ انہوں نے بیان کیا ہے وہ ”فرمودہ رسول“ سے مستنبط تھا اور یہ ظاہر ہے کہ نبی کا قول غلط نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر میں یہ کہتا ہوں کہ جس چیز کو تم ”ارشاد نبوی“ اور ”حدیث رسول“ کہتے ہو، وہ صرف بعد کے لوگوں کی طباعیاں ہیں اور ایک سچا رسول کبھی خلافت حقیقت اور خلافت عقل بات نہیں کہہ سکتا، تو تم مجھے کافر و کلمہ کہنے لگتے ہو کیونکہ تمہارے نزدیک ”مذہب“ نام ہے صرف ان اعتقادات کے مجموعہ کا جنہیں عقل انسانی سننے کے بعد باور کرے یا نہ کرے لیکن حیران و شمشدہ ضرور رہ جائے

آج کی صحبت میں ہم عزرائیل یا ملک الموت کی حقیقت پر اکابر اسلام کی تحقیق پیش کرتے ہیں جو کوہ قاف کی تحقیق سے کم حیرت انگیز نہیں

(۱) عزرائیل اتنا چوڑا چکلا اور اتنا زبردست فرشتہ ہے کہ اگر دنیا کے تمام سمندروں اور دریاؤں کا پانی اس کے سر پر ڈالا جائے تو ایک قطرہ بھی زمین تک نہ پہنچے۔ اس کا نورانی سریر یا تخت چوتھے یا ساتویں آسمان پر ہے جہاں اس کا ایک پاؤں ٹکا ہوا ہے اور دوسرا پاؤں اس بل پر ہے جو دوزخ اور بہشت کے درمیان بنا یا گیا ہے اس کے ستر ہزار پاؤں ہیں

(۲) اول اول عزرائیل بھی دوسرے فرشتوں کی طرح تھا۔ لیکن جب اللہ نے انسان کو پیدا کرنا چاہا تو اس نے جبرئیل کو حکم دیا کہ جاؤ اور زمین سے ایک مٹھی ان عناصر یا اجزاء کی لے آؤ جن سے انسان کی تعمیر ہو سکے۔ لیکن جب جبرئیل زمین پر پہنچے تو ابلیس مانع آیا اور جبرئیل ناکام واپس آئے اس کے بعد میکائیل اور اسرافیل بھیجے گئے لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوئے۔ آخر میں عزرائیل کو بھیجا گیا۔ اور یہ کامیاب واپس آیا اور اللہ نے اس کو فرشتہ موت بنا دیا کیونکہ اس میں رحم کی کمی تھی

(۳) جب اللہ نے موت کو پیدا کیا تو تمام فرشتوں کو طلب کیا اور کہا کہ اس کی طرف دیکھو لیکن جب انہوں نے

اسکی غیر معمولی قوت کو دیکھا تو سیران رہ گئے اور بیہوش ہو کر زمین پر ہزاروں سال تک گرے ہوئے پڑے یہاں تک بعد جب انھیں ہوش آیا تو کربلاں ہو کر پوچھا کہ "بیشک موت پڑی زبردست تخلیق ہے" خدا نے یہ سن کر فرمایا کہ "میں نے عزرائیل کو اس پر قابو دیدیا ہے۔"

(۴) عزرائیل کے پاس تمام انسانوں کی فرست موجود رہتی ہے، لیکن اسے یہ معلوم نہیں رہتا کہ کب کس کی موت آئے گی۔ وہ لوگ جو نجات پانے والے ہیں۔ ان کے نام کے گرد ایک نورانی حلقہ ہوتا ہے اور جو دوزخی ہیں ان کے نام کے گرد سیاہ حلقہ ہوتا ہے

(۵) جب موت کا دن آتا ہے تو اللہ اس درخت سے جو عرش کے نیچے ہے ایک پتہ توڑ کر گرادیتا ہے جس پر مرنے والے کا نام منقوش ہوتا ہے اور یہ پتہ عزرائیل کی آغوش میں آکر گرتا ہے۔ یہ نام پڑھ لیتا ہے۔ اور ۴۰ دن کے بعد روح نکال لیتا ہے

(۶) مرنے والوں میں بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو عزرائیل کا مقابلہ کرتے ہیں اور خدا سے شکایت کرتے ہیں کہ عزرائیل نہایت سختی سے جان نکالتا ہے۔ عزرائیل اس مقابلہ کو دیکھ کر خدا کے پاس جاتا ہے اور

سارا حال بیان کرتا ہے۔ خدا یہ سن کر فردوس کا ایک سبب اس کو دیتا ہے جس پر بسم اللہ لکھی ہوتی ہے۔ عزرائیل یہ سبب لیجا کر اس جھگڑا لومرنے والے کو لکھا دیتا ہے اور وہ فوراً جان دینے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے، لیکن یہ

عمل صرف نیک بندوں کے لئے جائز رکھا جاتا ہے۔ کافروں کی جان چاہے کسی ہی سختی سے نکلے پر وہ نہیں پوتی بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب عزرائیل روح نکالنے کے لئے حلق کے اندر جانا چاہتا ہے تو بندہ کسی "ذکر"

کے ذریعہ سے حلق کے اندر جانے کا راستہ بند کر دیتا ہے۔ فرشتہ موت یہ دیکھ کر خدا کے پاس جاتا ہے اور تمام حال عرض کرتا ہے وہاں سے حکم ہوتا ہے کہ جاؤ اس کے ہاتھ کو دیکھو۔ اگر اس نے اپنی عمر میں صدقہ دیا ہے تو بھی جان نکالنا دشوار ہوتا ہے اور پھر عزرائیل اس کے ہاتھ پر اللہ کا نام لکھ دیتا ہے اور وہ نقار بانی کے شوق میں حلق کا راستہ کھول دیتا ہے اور فرشتہ اندر گھس کر روح نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے

(۸) جب کسی مسلمان یا مومن کی روح نکالی جاتی ہے تو ملک الموت نہایت نرمی و آہستگی سے کام لیتا ہے۔ اور

روح نکال کر اپنے نائب فرشتوں کے حوالہ کر دیتا ہے جو اسے جہنم بہشتی میں لپیٹ کر آسمان کی طرف لیجاتے ہیں اور ساتوں آسمانوں کو عبور کر کے جب عرش خداوندی تک پہنچتے ہیں تو حکم ہوتا ہے کہ اس روح کو اس قبر میں لے جاؤ جہاں وہ مومن دفن کیا گیا ہے۔ لیکن اگر کوئی غیر مسلم کافر مرنے والا ہوتا ہے تو اس کی روح

نہایت سختی و بے رحمی سے نکالی جاتی ہے اور جب آسمانوں کے دروازے اس کے لئے نہیں کھلتے تو فرشتہ

اُسے وہیں زمین کی طرف پھینک دیتا ہے

(۹) ادریسؑ - الیاسؑ - یونسؑ - اور خضرؑ، موت سے آشنا نہیں ہوئے اور اب تک زندہ ہیں۔ موسیٰؑ کے پاس

جب ملک الموت آیا تو انھوں نے ایک تھپڑ مارا جس سے اس کی ایک آنکھ مجروح ہو گئی۔ جب فرشتہ یہ شکایت لے کر خدا کے پاس آیا تو خدا نے بہشت کا سیب اس کو دیا اور اس کو سونگھ کر وہ جان دبسنے پر راضی ہو گئے۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بغیروں کی جان نکالنے والا اور فرشتہ ہوتا ہے، اور دوسرے آدمیوں کی روح نکالنے والا کوئی اور۔ اسی طرح مومن و کافر کی جان نکالنے کے لئے علیحدہ علیحدہ فرشتے ہوتے ہیں۔

یہ ہے ہمارے اکابر اسلام کی تحقیق فرشتہ موت کے متعلق جو حسب ذیل کتابوں میں پائی جاتی ہے :-

مشکوٰۃ شریف (حدیث) بخاری شریف (حدیث) مروج الذهب (السعودی) در الفاخرہ (الغزالی)
عجائب الملکوت (الکسائی) تاریخ طبری تاریخ ابن اثیر تاریخ الخلفاء (دیار بکری) قصص الانبیاء (نقلی)
کتاب الانس الجلیس (جمیر الدین حنبلی) کتاب البدو والتاریخ (طاہر مقدسی)
تاریخ یہ ہے کہ یہ تمام بیانات رسول اللہ سے منسوب کئے جاتے ہیں اور کسی کا خیال اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ یہ باتیں سب بعد کی گھڑی ہوئی ہیں اور رسول کو ان سے کوئی واسطہ نہیں

ملک الموت کے متعلق اس طرح کی حیرت انگیز روایات یہودیوں میں رائج چلی آرہی تھیں، کہ اس کے چار ہزار بازو ہیں، اس کے جسم میں زبان و آنکھ کے سوا کچھ نہیں ہے یعنی جتنے آدمی ہیں اتنی ہی آنکھیں اور زبانیں اس کے جسم میں بھی ہیں، اس کے چار چہرے ہیں وغیرہ وغیرہ اور بعد کو مسلمانوں نے انھیں روایات پر اعتماد کر کے اپنے یہاں لے لیا اور لوگوں کو یقین دلانے کے لئے رسول سے منسوب کر دیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس زمانہ میں بھی ان روایات پر یقین کیا جاسکتا ہے اور کیا ادنیٰ فہم و عقل کا انسان بھی کبھی باور کر سکتا ہے کہ روح نکالنے کے لئے لایینی یہ تمام حرکتیں کی جاتی ہیں پھر افسوس ہے ہمارے علماء کرام پر جو اب بھی مواعظ میں اس طرح کی روایتیں بیان کرتے ہیں اور صد ہزار افسوس ہے ان کی اس جسارت پر کہ ایسی باتوں کو رسول اللہ سے منسوب کر کے ان کی عظمت و عزت کو بھی خاک میں ملانا چاہتے ہیں

کہا جاتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے جتنی تحقیقات علمی و تاریخی کی ہے اس کی نظیر اب مل نہیں سکتی۔ پھر اگر ان کی تحقیقات کا یہی عالم ہے اور ان کی علمی تفتیش وہی ہے۔ جو کہ قاف اور عزرائیل کے حالات بیان کرتے ہیں ان کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے تو افسوس ہے کہ اب دنیا میں ایسے احمق پیدا ہونا بند ہو گئے ہیں جو ایسی باتوں پر ایمان لائیں اور ایسے مذہب کا خدا حافظ ہے جو اس قسم کے روایات ماننے پر کسی انسان کو مجبور کرے

لکھنؤ کی وضع داریاں

پُر اسے لکھنؤ میں شاہی زمانہ میں ایک محلہ نہرہ کے نام سے بہت مشہور تھا۔ اور بہت آباد تھا جس کا نام و نشان بھی اب باقی نہیں رہا۔

مگر آپ یوں سمجھ سکتے ہیں جہاں اب حکیم ہمدی علی خاں کا مقبرہ ہے اس کے آس پاس نہرہ کماتا تھا اور وہیں منوراندولہ نواب احمد علی خاں بہادر کا عالی شان محل تھا یہ اودہ کے وزیر اعظم تھے بڑے سیر چشم اور با اقبال رئیس تھے نواب افضل محل کو انھوں نے عروج دیا اور نہ اس سے پہلے وہ ایک لوائف تھیں اور حسینی نام تھا نونچ گانے میں بہت مشہور تھیں اور خوبصورت بھی بہت تھیں۔ جوانی کا عالم تھا نواب منوراندولہ بہادر نے عقد کر کے نواب افضل محل خطاب دیا۔ نواب منوراندولہ بہادر میں اور بھی بہت سی خوبیاں تھیں کتبہ پروری میں ان کا نظیر نہ تھا۔ ان کے تمام متعلقین انھیں کے محلات کے قریب قریب اپنے اپنے محلوں میں عیش و راحت اور تزک و احتشام سے رہتے تھے ان کی ایک بہن کے صاحبزادہ نواب تقی علی خاں بہادر تھے جو شاعری میں آخر تخلص کرتے تھے شاہی کے تمام فضائل سے مستفید تھے شطرنج میں ان سے بڑھ کے کوئی شاطر نہ تھا جو شطرنجی میں کامل تھے۔ شیر بازی میں نام آور اور شیر کے شکار میں نواب اپنے ناموں نواب منوراندولہ بہادر کے شاگرد و مرشد اور وضع داری بھی دونوں ناموں بھانجوں پر ختم تھی شاعری میں یدِ طولے حاصل تھا۔

ایک مرتبہ سلطان عالم مرزا محمد واجد علی شاہ نے جبکہ وہ ولی عہد تھے نواب منوراندولہ بہادر سے ارشاد فرمایا ہم سنتے ہیں کہ آپ کے بھانجے نواب تقی علی خاں آخر تخلص کرتے ہیں۔ شاعر بھی ملک سخن کے بادشاہ ہوتے ہیں لہذا ایک شہر میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے۔ اگر مناسب سمجھیں تو اپنے تخلص کا معاوضہ پچاس ہزار ہم سے لے لیں اور خود دوسرا تخلص اختیار کر لیں، نواب منوراندولہ نے عرض کیا کہ اس کا علم بھی نہ تھا حضور نے فرمایا ہے گل میں ان سے کہوں گا دوسرے روز نواب منوراندولہ نے اپنے بھانجے سے مرزا ولیمد بہادر کا حکم بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ تخلص تو میں پہچان نہیں چاہتا اور ملک سخن کوئی بھد سے چھین نہیں سکتا ہاں شاہی حکم ہے تو میں اسی ہفتہ میں ان کے ملک سے نکل جاؤں گا۔

میرا بھی جواب آپ ولیمد بہادر سے عرض کر دیجئے بادشاہ نے یہ جواب سن کر فرمایا کہ میں ان پر ظلم نہیں کرنا چاہتا تخلص کا معاملہ ان کو منظور نہیں ہے تو شہر چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ نواب مرزا احمد تقی علی خاں آخر کا قاعدہ تھا کہ

ہفتہ میں دو ایک مرتبہ ڈیرہ تاوا کنکو اڑھائے تھے

ان کے محلے میں ایک نامی سماجن تیواری نام امیر کبیر بہتا تھا جو بہت دولت مند تھا۔ کوئی دو تین لاکھ کی ساکھ تھی۔ ایک دن تیواری نے بھی کنکو اڑھاکر نواب سے ایک بیچ لڑایا اتفاق سے کنکو اٹ گیا نواب کے مصاحبوں نے بڑے زور سے کہا وہ کاٹا یہ کلمہ کچھ اسے ناگوار معلوم ہوا۔ دوسرا بیچ لڑایا تیسرا بیچ لڑایا شام تک کنکو لڑا کیا اب لوگوں نے تیواری جی سے کہا کہ تم نواب سے کنکو انہیں لڑا سکتے اول تو، تاریکی ڈور پار میں انجد سے سٹو اتے ہیں انجد کا ماتھا آج شہر میں مشہور ہے ڈیرہ تاوا کنکو اوہ بھی نامی کاریگر کا بنایا ہوا۔ تیواری جی نے کہا یہ کون سی بڑی بات ہے کل ہی ڈیرہ تاوے کنکو سے اور سترہ تاریکی ڈور منگوائی جائے گی

دوسرے دن تیواری جی نے بھی ڈیرہ تاوا کنکو اڑایا اور تین بیچ سے اڑایا نواب کے ایک مصاحب نے کنکو اڑھاکر ان کو کاٹ دیا بہت تاؤ آیا۔ اب تیواری جی کی طرف سے دو ایک آدمی کنکو اڑھانے لگے کنکو لوٹنے والوں کی لچھی خاصی آمدنی ہو گئی شام تک لنگڑے کھڑے رہتے اور جتنے کنکو سے باڈور لوٹتے سب نواب صاحب کے ہاتھ یا تیواری جی کے ہاتھ بیچ آتے

تیواری جی اپنے یار دوستوں میں تذکرہ کرنے کہ نواب تقی علی خاں کو چند دن میں معلوم ہو جائے گا۔ کہ کسی سماجن سے سابقہ پڑا تھا۔ میرے لاکھ دو لاکھ بھی خرچ ہو جائیں گے تو کھنڈ کو خدا سلامت رکھے پھر سود در سود میں کمالوں گا اور سماجن ہوں دھوئی باندہ کر گھر میں بیٹھ رہوں گا۔ ان کی نوابی نبھ نہیں سکتی ہوتے ہوتے صبح سویرے سے کنکو اڑنے لگا اور بیچ بیچ ہینے لگے۔ دن بھر میں پانچ پانچ سیر ڈور کا خرچ ہونے لگا

کنکو اڑھانے والے نوکر رکھے گئے ڈور سوتنے والے ملازم ہوئے۔ تیواری جی نے بھی جی کر اکر کے تھیلیاں کھول دیں بڑے بڑے ناچی کنکوے باز بٹائے گئے ہزاروں روپیہ کار و زانہ خرچ ہونے لگا

نواب محمد تقی علی خاں کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آتا ماں سے زبردستی کر کے دو چار ہزار لے لیا آخر جب وہ بھی عاجز ہو گئیں تو اپنے بھائی نواب منور الدولہ سے کہا ذرا محمد تقی کو سمجھا دو انھیں کنکوے کا اس قدر سودا ہوا ہے کہ صبح سے شام تک بے ہوش رہتے ہیں نہ کھانے کی فکر نہ پینے کی۔ مجھے تو ان کی زندگی کی خیر نہیں معلوم ہوتی اس محلے میں کوئی مو اتیواری ہے اسی سے صید ہو گئی ہے آج تک بیس ہزار روپیہ محمد سے لے چکے ہیں اور پھر تقاضا ہو گیا ہے۔ نواب نے مسکرا کر بھانجے کو بلایا دربار میں لے گئے ایک لاکھ کے نوٹ ان کے حوالے کئے کہ تمہارے شغل کو کافی ہوں گے

اب تو نواب تقی علی خاں نے اور بھی رنگ بدلا اور اتنے لمبے بیچ ہوئے کہ پتنگ تارا نظر آتا تھا مگر شاباش جے تیواری کو وہ بھی مقابلہ پڑتا رہا۔ تمام املاک فروخت ہو گئی۔ سب اسباب بک گیا گاؤں نیلام ہو گیا دو برس

ہو گئے نہ آج صلح ہوتی ہے نہ کل آخر نواب کا ایک لاکھ بھی صرف ہو گیا نواب منور الدولہ نے اور ایک لاکھ دیا تیواری کا مکان بھی رہن ہو گیا تین برس ہو چکے صبح سے شام تک کنگو اڑا کرتا ہے۔ ایک دن خبر آئی کہ تیواری خالی گھر چھوڑ کر اپنے بال بچوں کو لے کر کہیں سر بھجوا نکل گیا۔ اس نے سوچا کہ شہر میں رہ کر بے عزتی کی زندگی سے یہ اچھا ہے کہ پردیس میں جا کر بھیک مانگ کھائے یہ خبر تمام شہر میں چار دن میں پھیل گئی اور جس نے سنا اس نے افسوس کیا مگر منصف مزاج کہتے تھے کہ شالشی اس غریب کو تین برس تک اتنے بڑے رئیس کا مقابلہ تو کر لیا اور یہ کتنی بہادری کی کہ صلح نہ کی شہر چھوڑ دیا

نواب منور الدولہ کو اس بات کا بہت صدمہ ہوا پہلے ما جن سے اس کا مکان خود مول لیا اس کے بعد شہر و شہروں اطلاع بھیجی کہ جس عامل کی سرحد میں تیواری جی ملیں ان کو فوراً وزیر کی عدالت میں بھیج دو عاملوں نے منادی کرادی کہ تیواری جی جس جگہ ہوں پھونپھلے جائیں وزارت کی طرف سے طلبی ہے مگر کہیں پتہ نہ ملا آخر دو برس کے بعد سادون کے مینے میں ایک دن سادھو کے بھیس میں عیش باغ کے میلے میں مع بال بچوں کے تشریف لائے لوگوں نے پہچان لیا اور ان کو تسلی تشفی سے نواب منور الدولہ کے سامنے لے گئے نواب نے ان کی حالت پر بہت افسوس کیا اور کہا تم ہمارے ہم محلہ ہو کر بغیر طے ہوئے شہر سے نکل گئے پڑانی ہمسائیگی کا بھی خیال نہ کیا ہم نہیں چاہتے کہ تم شہر بدر ہو جاؤ۔ تمہارا مکان ہم نے مول لے لیا ہے تم اسی میں شوق سے رہو وہ تمہارا ہے اور پچاس ہزار روپیہ تم کو نقد دیا جاتا ہے اس سے اپنا کاروبار پھیلاؤ ضرورت کے وقت اور بھی مدد کی جائے گی۔ تیواری جی نے ہزاروں دعائیں دیں اپنے گھر میں آباد ہوئے اسی پچاس ہزار سے لاکھوں پیدا کر لئے اور ہمیشہ نواب کی رفاقت میں رہا کئے سنا ہے کہ ایک شیر کے شکار کی حالت میں جب ایک جنگلی مست ہاتھی نے نواب پر کاری حملہ کیا تو سب سے پہلے تیواری جی نے اس ہاتھی پر سیکڑوں گولیاں برسادیں کہ وہ مر گیا لیکن خوف سے لوگ اس کے قریب نہیں جاتے تھے کہ شاید زندہ ہو اس وقت بھی تیواری جی نے جرات کر کے اس دلدل میں اپنے کو نواب کے پاس پہنچا دیا اور ان کو زندہ اور صحیح و سالم اس کے دانتوں سے نکالا لوگ کہتے ہیں کہ اس ہاتھی کے دانت اتنے بڑے تھے کہ اس کے دانتوں کی ہڈی سے نواب نے پوری مسہری کا چوکھاٹ بنوایا تھا اور اسی پر آرام خاص فرمایا کرتے تھے یہ تمہیں ہمارے لکھنؤ کی پرانی وضعداریاں۔ کنبہ پوریوں اور اسی خدمت کے صلہ میں تیواری جی کو فیصل جنگ کا خطاب دیا۔ اسی برس کی عسکر پارک تیواری جی نے منسلک عیسوی میں انتقال کیا

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

باب المراسلہ و المناظرہ

آواز پس پردہ

دستِ حنائی کی بخشش ^{اور} بیجا

ستمبر کے نگار میں، میں نے ایک خاتون کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر وہ اپنی تحریر کا جواب چاہتی ہیں تو مہربانی فرما کر اپنا پتہ لکھیں اور یہ میں نے اس یقین کے ساتھ لکھا تھا کہ نہ وہ اس قدر زحمت گوارا کریں گی اور نہ مجھے انظار خیال کا موقع ملے گا، لیکن مجھے کس قدر حیرت ہوئی کہ ۱۰ اکتوبر کو ان کا دوسرا خط ملا جو پورے ایک جزد کو محیط ہے اور جس میں دل کھول کر انھوں نے اپنے آپ کو "قریب الفہم" بنانے کی کوشش کی ہے

خوشا بہانہ ہستی، خوشا رعایت شوق !

یقیناً اس خط کا جواب بھی مجھے اسی پردہ و احتیاط کے ساتھ دینا چاہئے تھا جو خود انھیں مطلوب ہے، لیکن چونکہ اپنا صحیح نشان و پتہ بنا کر مراسلت قائم کرنا وہ خلاف مصلحت سمجھتی ہیں، اس لئے انھوں نے اتنا تو ضرور بتا دیا کہ وہ رام پور کی سرزمین سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن خط و کتابت کس پتہ سے کی جائے، اس کا کوئی ذکر نہیں — اس کے ساتھ یہ بھی اصرار ہے کہ نگار ہی میں اس کا جواب دیا جائے اور یہی بہترین ذریعہ تبادلہ خیال کا ہے — بہر حال بغیر اس امر کا وعدہ کئے ہوئے کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ کم از کم ان کے ان دو خطوں کا مختصر جواب تو نگار کے ذریعہ سے دے ہی دوں اور آئندہ کا فیصلہ خود انھیں خاتون پر چھوڑ دوں اگر واقعی وہ مجھ سے کسی نوع کی علمی یا ادبی مراسلت قائم رکھنا چاہتی ہیں

پہلے خط میں انھوں نے جو کچھ لکھا تھا اس کا مفہوم یہ تھا کہ میں نے اب فسائے لکھنا کیوں ترک کر دئے ہیں، درانحالیکہ نہ صرف ان کے جذبات کی پرورش بلکہ ان کی زندگی کا ایک عظیم انقلاب انھیں فسائوں سے متعلق ہے جو وقتاً فوقتاً نگار میں میرے قلم سے نکل چکے ہیں — خاتون محترم نے اپنی تحریر میں بعض فسائوں پر علیحدہ علیحدہ عجیب و غریب

دورانہ تنقید بھی اس خط میں کی تھی جس کا نقل کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔۔۔ اس کے جواب میں مختصر اصراف و نقد و نوح کرنا چاہتا ہوں کہ نہ میں نے فسانے لکھنا ترک کئے ہیں اور نہ بھگوانند میں اپنے اندر اس اہلیت کی کمی محسوس کرتا ہوں، لیکن حالات و واقعات کے لحاظ سے جس چیز کا فقدان ہے وہ ضرور مجھے یہ کہنے پر مجبور کر رہا ہے کہ

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن یار

چیزے فزون کند کہ تا شاہ مارسد

عرب و ادبیات " سے متعلق سب سے بڑی چیز " تحریک جذبات " ہے اور اس پر انسان کو قابو دراصل نہیں لے سکتا، ماحول و معیت، معیشت و معاشرت، حوادث و اتفاقات، جیسے انسانی جذبات کو " تحریک " ہوتی رہتی ہے، بڑی حد تک اختیار سے باہر ہیں اور حال کا تغیر، ہمیشہ قائل کو بھی متاثر کرتا ہے۔۔۔ اسی لئے اگر کوئی شاعر فقط شاعر کہتے خاموش ہو جائے یا اگر کوئی ادیب اپنا موضوع تحریر بدل دے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ اس کا شعر و ادب مفقود ہو گیا ہے بلکہ اس کو مجبور حالات سمجھ کر گفتگو کرنا چاہئے

ایک حقیقی شاعر و ادیب کے لئے صرف قلم و صنوبر کا غزدر کار نہیں، مختصر قابلیت و اہلیت کافی نہیں، بلکہ اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی باتوں کی ضرورت ہے جو اس کے احساس و جذبات کو زندہ رکھیں اور تاثیرات کی کیفیت کو مشوش نہ ہونے دیں

ہزار نکتہ دریں کار و بار دلدارنی است

کہ نام آں نہ لب لعل و خطا ننگہ درستی است

مکن ہے کہ اس کو خود ستانی پر محمول کیا جائے، لیکن میں یہ حقیقت ظاہر کرنے سے بلا نہیں رہ سکتا کہ کثرت مشق نے مجھے اس سے بالکل بے نیاز کر دیا ہے کہ میں کسی موضوع اور خاص گرفتار نہ لکھنے کے لئے پہلے " اسباب تحریک " کی جستجو کر دوں۔ کیونکہ اس باب میں صرف ارادہ کر کے قلم ہاتھ میں لے لینا ہی میرے لئے کافی تحریک ہو کرتی ہے، لیکن چونکہ کچھ زمانہ سے میں " ضرورت " کو " ذوق " پر ترجیح دینے لگا ہوں اس لئے توجہ کامرکز یقیناً بدل گیا ہے اور چاہتا ہوں کہ نگار کے ذریعہ سے وہی چیز پیش کی جائے جس کی دنیا کو " ضرورت " ہے، خواہ وہ تفریح کے ذوق " کو پورا کرے یا نہ کرے اس وقت ہندوستان میں بہت رسائل جاری ہیں اور کثرت سے " فسانے " پیش کر رہے ہیں لیکن کیا ان کی ارتقائی اہمیت پر بار ہو کر نہیں رہ گئی ہے، اور کیا وہ انسانی زندگی کے کسی شعبہ کی اصلاح کرنے میں مدد دے رہے ہیں؟

ہندوستان اس وقت جس دور سے گزر رہا ہے، اس کا اقتضائے یہ نہیں ہے کہ اہل قلم صرف فسانے لکھ لکھ کر لاکھ کو پدمستور محفلت کی نیند میں مبتلا رہنے دیں بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی معلومات میں اضافہ کی کوشش کی جائے اور ان کو بتایا جائے کہ زمانہ کیا چاہتا ہے اور وہ کیونکر اپنے آپ کو ہلاکت سے بچائے ہیں

ملک کے افراد خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کی جو حالت ہے، ظاہر ہے، اقتصادی دشواریوں کا یہ عالم ہے کہ فاقہ شکنی کا سامان بھی آسانی سے مہیا نہیں کر سکتے، سیاسی پستی کی یہ کیفیت ہے کہ اب مسلمان کی حیثیت صرف ایک اچھوت کی سی باقی رہ گئی ہے، اور ذہنی غلامی کا یہ منظر ہے کہ بجائے ایک خدا کی پرستش کے وہ ہر اُس بت کے سامنے ہٹک رہا ہے جو عباے طویل وریش دراز رکھتا ہے۔ پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ ایسے وقت میں کیا محض فسانہ نگاری سے کوئی مفید خدمت انجام دی جاسکتی ہے اور کیا ایسی ماتم آگیں فضا میں نغمہ عیش کی داستان چھیڑنا کوئی معنی رکھ سکتا ہے؟ پھر یہ مسئلہ میرے سامنے آج نہیں بلکہ اسی وقت سے ہے جب سے نگار جاری ہوا اور یہی سبب ہے کہ رفتہ رفتہ میرے تاثرات کی شدت کے ساتھ رسالہ کارنگ بھی بدلتا رہا، یہاں تک کہ آج نگار اور ”کفر والحاد“ دو مترادف الفاظ قرار دئے جاتے ہیں

چونکہ میں سیاسیات میں حصہ لینے کا اہل اپنے آپ کو نہ سمجھتا تھا اور نہ معاشری و اقتصادی اصلاح میرے بس کی بات تھی، اس لئے میں نے ان فریض کی تکمیل دوسرے اہل قلم پر چھوڑ کر صرف مذہبی تنقید کو اپنا مقصد حقیقی بنایا تاکہ مسلمان کسی طرح ذہنی غلامی سے آزاد ہوں اور اسلام کے مفہوم کو پست و ذلیل کر کے خود بھی پست و ذلیل نہ ہوں میں مسلمان ہو یا کافر و کلمہ، یہاں اس کے متعلق مجھے کسی بیان دینے کی ضرورت نہیں، لیکن ضرور عرض کروں گا کہ اگر اسلام، جو واقعی دنیا کا بہترین فطری مذہب ہے، وہی ہے جو عام طور پر پیش کیا جاتا ہے، تو میں کیا کسی کے بھی باعث فخر نہیں ہو سکتا اور اگر وہ واقعی عقل انسانی کو نشاثر کرنے والی تعلیم ہے، اور ہر زمانہ میں فطرت انسانی کا ساتھ دینے والی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس صدیوں کے پڑے ہوئے پردے کو نہ اٹھایا جائے اور اس کے جوہر کو بدستور رنگ آلود رہنے دیا جائے

بہر حال یہ عاصرت یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں نے کیوں آجکل فسانوں کی طرف توجہ کم کر دی ہے اور میں کس مقصد کے لئے نگار کو وقت کر دینا چاہتا ہوں۔ علاوہ اس کے یوں بھی میں اس قدر فسانے لکھ چکا ہوں کہ آئندہ ان میں کسی شخص کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اور ادب لطیف کا صحیح ذوق رکھنے والوں کے لئے ان کا مجموعہ شاید ہمیشہ دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ رہے صحافت نگار سو ان میں اگر فسانے کم شائع ہوتے ہیں تو دوسرے ادبی مقالات اس مرتبہ کے ہوتے ہیں کہ فسانے ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی عرض کروں گا کہ میرے

۱۔ پہلا مجموعہ نگارستان کے نام سے شائع ہوا، دوسرا مجموعہ ۵، ۵ صفحات کا بابستان کے نام سے اسی مہینہ میں شائع ہوا ہے۔

۲۔ ایک طویل فسانہ بطورہ کٹالی صورت میں ”شہاب کی سرگزشت“ کے عنوان سے ملک میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ علاوہ اس کے اور سیکڑوں ادبی

مقالات ہیں جو نگار کے صفحات میں پیش ہو چکے ہیں اور اب بھی برابر شائع ہوتے رہتے ہیں

ذمہ نگاری سے توبہ نہیں کی ہے اور پردہ داری ہو تری شب کی تو افسانے بہت

یہاں تک تو جواب ہوا آپ کی پہلی تحریر کا — اب رہ گئی آپ کی دوسری تحریر، سو اس کے جواب میں سوائے اس کے اور کس طرح آپ سے خطاب کروں کہ اسے تو مجموعہ خوبی، بچہ نامت خوانم آپ نے جس حُسن سے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا ہے وہ تنقید کی دنیا میں اس قدر بے بہا چیز ہے کہ میں دفتر کے دفتر سیاہ کرنے کے بعد بھی اس کے اعتراف سے عاجز ہوں

نہ حُسنِ غائے دارد، نہ سدی سخن پایاں

بد میر تشنہ مستقی و دریا ہچناں باقی

آپ نے جس ایجاز و اختصار سے کام لے کر تمام مسائل حاضرہ پر اظہار خیال کیا ہے، وہ آپ کی طبعِ سلیم اور فکرِ جمیل کا اتنا زبردست ثبوت ہے کہ اس کی مثالیں مردوں میں بھی بہت کم ملتی ہیں، چہ جائے کہ عورتوں میں!

آسودہ شبے باید و خوشش مبتا ہے

تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

آپ نے میری ادبی و علمی خدمات کا ذکر بن الفاظ میں کیا ہے، میں ان کو ہمیشہ اپنے لئے باعثِ فخر سمجھوں گا، گو ان کے اعتراف میں اپنی بے ماٹگی دینے لگی ہو، سوائے اس کے کہ کوئی عذر پیش نہیں کر سکتا

کہ سلطان نہ خواہد خراج از خراب

آپ کی عداوت کا حال معلوم کر کے مجھے بہت تشویش پیدا ہو گئی ہے۔ اگر آپ اپنے علاج کے لئے لکھنؤ آئیں تو میں اس کو اپنی انعاماتی خوش بختی سمجھوں گا۔ اور وہی تشریف لے گئیں تو وہاں حاضری کی کوشش کروں گا اگر اس عورت کا مستحق سمجھا گیا ورنہ

من و حجرہ و دامنے زیر سنگ

آئندہ کے لئے میں پھر یہی عرض کروں گا کہ مُرسلت کے لئے آپ کا پورا پتہ معلوم ہونا ضروری ہے، کیونکہ نگار میں اس سلسلہ کا قائم رکھنا ممکن نہیں اور غالباً اب میں آپ کی کسی تحریر کا جواب یوں نہ دے سکوں گا

نیاز

مطبوعات موصولہ

جناب محمد اسحاق صاحب ام۔ اسے نے جو دارالعلوم کلکتہ میں ادبیات
سخنوران ایران در عصر حاضر فارسی کے پروفیسر ہیں، عہد حاضر کے سخنوران ایران کا ایک تذکرہ لکھنا شروع
 کیا ہے، جس کی پہلی جلد ریویلو کے لئے فاضل مولف نے ہمارے پاس بھیجی ہے

اس جلد میں ۳۳ شعرا کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ جو ردیف و ارادیت پشاور سے شروع ہو کر یاسائی پر ختم
 ہوتا ہے۔ فاضل مولف نے اس تذکرہ کی ترتیب کے لئے ایران کا سفر کیا جو ان کا اصلی وطن ہے اور مہینوں قیام
 کرنے کے بعد وہاں کے علماء و ادباء سے مل کر تمام مواد فراہم کیا۔ تذکرہ فارسی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اور انتخاب
 کلام میں پوری کاوش سے کام لیا ہے۔ اسی جلد میں عارف قزوینی، ملک الشعراء بہار، ابراہیم خاں پور داؤد کا بھی
 تذکرہ ہے، جن کی شاعری سے ہندوستان کے اکثر اہل سخن واقف ہیں۔

تمام ان شعراء کی تصویریں بھی دی گئی ہیں جن کا حال اس کتاب میں درج کیا گیا ہے۔ سوائے ایک خاتون پر دین اعصافی
 کے کہ ان کا ذکر ان کی تصویر سے خالی ہے۔ ممکن ہے اسے غلط سمجھا گیا ہو (حالانکہ ایسا نہ ہونا چاہئے) یا پردہ
 کی پابندی نے تصویر کے حصول میں دشواریاں حائل کر دی ہوں (در انحالانکہ وہ پردہ کی پابند نہیں ہیں)
 کتاب، ٹائپ میں نہایت نفیس کاغذ پر طبع ہوئی ہے اور مجلد شائع کی گئی ہے، لیکن افسوس ہے کہ غلطیاں کثرت
 سے پائی جاتی ہیں اور جو غلط نامہ اس میں شامل کیا گیا ہے وہ بالکل ناقص و نامکمل ہے

ایران کے عہد حاضر کی شاعری ان لوگوں کے لئے جو حافظ و نظیری یا سعدی و عطار کے دلدادہ ہیں یقیناً بالکل بے
 آب و رنگ نظر آئے گی۔ کیونکہ اب نہ وہ دور عشق باقی ہے نہ اس کی غزلیں، لیکن جس حد تک "قومیات" کا
 تعلق ہے، ایران کے ادبیات حاضرہ کی اہمیت کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔ زبان میں تو خیر تفسیر عظیم ہو ہی گیا
 ہے، خیالات بھی بالکل بدل گئے ہیں اور عروض و قوافی کی قدیم پابندیاں بھی بڑی حد تک نسوخ ہو چکی ہیں

جذبات قومی کو ابھارنا، ملی و وطنی تحریک کو تقویت پہنچانا، معیشت و معاشرت کی اصلاح کی طرف قوم کو
 متوجہ کرنا، عورتوں کو بے نقاب باہر آجانے کی تعلیم دینا یہ ہے اصل مقصود عہد حاضر کے ایرانی شعراء کا اور ظاہر ہے کہ اس کے
 تقدس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ اس تذکرہ کی دو جلدیں اور شائع ہوں گی، جن میں سے ایک نثر نگاروں کے
 لئے بھی وقف ہوگی

ملک کو یقیناً فاضل مولف کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے ایک بڑی کمی کو پورا کیا اور ہر اس شخص کو جو ایران

کی جدید شاعرہ و انشاء سے کچھ بھی دلچسپی رکھنا ہے اس کتاب کی ایک جلد اپنے پاس رکھنا ضروری ہے۔ قیمت اٹھارہ روپیہ کتاب کی خوبیوں کے لحاظ سے زائد نہ ہو لیکن ملک کی اقتصادی حالت کو دیکھتے ہوئے یقیناً زائد ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:-

عبدالحلیم صاحب ۱۵۷۔ چاندنی چوک اسٹریٹ کلکتہ

ایک مختصر مگر جامع کتاب ہے فن تنقید پر جسے جناب افسر میرٹھی نے مرتب اور نول کشور پریس لکھنؤ نے شائع کیا ہے

نقد الادب

یہ کتاب چھوٹے چھوٹے دس ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں ادب اور فنون لطیفہ کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے اور دوسرے باب میں یونان قدیم کے فن تنقید پر روشنی ڈالتے ہوئے افلاطون اور ارسطو کے نظریوں پر سرسری گفتگو کی گئی ہے تیسرے باب میں ہند قدیم کا ذکر کر کے سنسکرت کے تنقیدی لٹریچر سے بحث کی ہے اور یقیناً اردو داں حضرات کے لئے یہ حصہ زیادہ دلچسپ ہونا چاہئے

چوتھے، پانچویں اور چھٹے باب میں ان اصول تنقید سے بحث کی ہے جو جمالیات و فنون لطیفہ سے متعلق سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے مغرب میں پائے جاتے تھے

ساتویں میں اصول تنقید، آٹھویں میں اس کے مقصد و عمل، نویں میں اسلوب بیان اور آخری باب میں غزل، شہنوی اور قصیدہ پر گفتگو کر کے اس کتاب کو ختم کر دیا گیا ہے۔ کتاب کی زبان بہت صاف و سلیس ہے جو یقیناً تنقید کی شرط اولین ہے۔ افسر صاحب عمد حاضر کے ان مصنفین میں سے ہیں جو زیادہ تر اصلاحی پہلو کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، اسی لئے ان کے کارنامے کوئی "خلافت" حیثیت تو نہیں رکھتے جو یقیناً بڑے بھگڑے کی چیز ہے، لیکن متانت و سنجیدگی کے ساتھ ایک مصلحانہ خدمت ضرور انجام دے رہے ہیں

اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب بہت مختصر ہے۔ اور اس لئے اس کی حیثیت ایک لکچر سے زیادہ نہیں، لیکن مبتدیان کے لئے اس سے زیادہ بلند چیز پیش کرنا مناسب بھی نہ تھا

یہ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے اور طباعت و کتابت بھی پسندیدہ ہے۔ قیمت دو روپیہ رکھی گئی ہے جو ہندوستان کی اقتصادی حالت اور اس کی بدذوقی کے لحاظ سے یقیناً زائد ہے

اس سے قبل نگار کی کسی اشاعت میں اس کتاب کے پہلے حصہ پر اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ اب یہ دوسرا حصہ شائع کیا گیا ہے اور اسی ہندوستانی ریٹیلنگ سوسائٹی دلاہورا

تجدید عمل (دوسرا حصہ)

کی طرف سے جس نے پہلا حصہ شائع کیا تھا

اس کے مصنف لکھنؤ کے مرزا عسکری علیخان مجازی ہیں، جو ایک آزاد خیال شخص ہیں اور اس میں شک نہیں کہ جس نیت کے ساتھ انہوں نے یہ رسالے مرتب کئے ہیں، اس پر کوئی حملہ نہیں ہو سکتا

اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے کہ تمام دنیا کے انسان ایک ہیں اور ان کو ایک ہو کر رہنا بھی چاہئے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ مقصد مذہب کی کسی جد بد تھیوری سے پورا ہو سکتا ہے یا مطلق لائذہبیت سے۔ اگر آج مذہب کو محو کر کے صرف قومیت کے نشوونما کو منتہائے نظر سمجھ لیا جائے تو وہ بھی ہمارے درد کی دوا نہیں بن سکتا۔ اور اگر محض لائذہبیت کو پیش کیا جائے تو اس پر اتفاق ممکن نہیں۔

اب وہ زمانہ گزر گیا کہ کوئی شخص پیمبری کا دعویٰ کر کے آسانی سے کسی ملک یا جماعت کو اپنا ہم خیال بنا سکے اور لائذہبیت ایک ذہنی انقلاب ہے جس کی تکمیل کے لئے بھی ابھی کم از کم ایک صدی درکار ہوگی۔ بہر حال اس نوع کی کتابیں بحال موجودہ مفید ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کے دیکھنے سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے خلاف ایک ذہنی انقلاب تیزی سے وسیع ہوتا جا رہا ہے اور ممکن ہے کہ آج کی یہ تخم ریزیاں آئندہ کسی تناور

درخت کو پیدا کر سکیں
ہم کو اگر جگہ مجازی صاحب کے استدلال و طرز بیان سے اختلاف ہے لیکن اصولاً ہم ان کی کوششوں کو ضرور قابل قدر سمجھتے ہیں

یہ رسالہ اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ لاہور سے ۸۰ میں مل سکتا ہے۔

امامیہ مشن بکھنو کا دسواں تبلیغی رسالہ ہے، جس میں فاضل مولف مولانا سید علی نعیمی صاحب **متعہ اور اسلام** نے جو از متعہ نقلی و عقلی دلائل سے ثابت کرنا چاہا ہے۔ مولانا موصوف نہایت صاف و شگفتہ لکھنے والے لوگوں میں سے ہیں اور کسی جگہ تہذیب و متانت سے نہیں ہٹتے، اسی لئے نفسیاتی طور پر ان کی تحریر میں بھی اثر ہوتا ہے اور ان کے دلائل میں بھی ایک خاص قوت مضمر ہوتی ہے

متعہ کا مسئلہ نہایت مشہور اختلافی مسئلہ ہے اور منجملہ ان مسائل کے ہے جو سنی، شیعہ کے درمیان نمایاں طور پر خطا فاصل کھینچنے والے ہیں

اس میں کلام نہیں کہ متعہ ابتداء عہد اسلام میں رائج تھا اور یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ علماء اہل سنت اس وقت تک یہ ثابت نہیں کر سکے کہ اس کا رواج کب ممنوع قرار دیا گیا، لیکن میری رائے میں یہ مسئلہ بھی اسلام کے معاشرتی مسائل سے تعلق رکھتا ہے اور ضرورت زمانہ کے لحاظ سے اس میں بھی تبدیلی ہونا چاہئے۔ یعنی اگر اس وقت کی حالت اس کی مقتضی ہے کہ متعہ جائز رکھا جائے تو ہمیشہ اس کو جائز رہنا چاہئے خواہ وہ کسی وقت ممنوع ہی کیوں نہ قرار دیا گیا ہو اور اگر حالات کا اقتضا یہ ہے کہ اس کے رواج کو بند کر دیا جائے تو اسے قطعاً ناجائز قرار دینا چاہئے خواہ وہ جائز ہی کیوں نہ ہو مولانا موصوف نے ابتدا میں فطرت انسانی کے لحاظ سے بھی اس مسئلہ پر گفتگو کر کے متعہ کے جواز کو ضروری قرار دیا ہے، لیکن بہتر ہوتا اگر فاضل مصنف اسی کے ساتھ سوسائٹی کے نظام اور اس کے مصالح پر بھی غور فرمالتے

اس میں شک نہیں کہ انسان کی زندگی میں بعض اوقات بعض گتھیاں ایسی بھی پڑ جاتی ہیں، جو صرف متعہ کے ذریعہ سے سلجھائی جاسکتی ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت مسلمہ ہے کہ قانون یا شریعت کی تنظیم فطرت انسانی کے روشن پہلو کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے اور "امکانات تاریک" کی رعایت کبھی نہیں کی جاتی ورنہ "اصلاح" کا کوئی مفہوم باقی نہ رہے۔

عہد سادات میں متعہ رائج تھا یا نہیں، بعد کو وہ ممنوع قرار دیا گیا یا نہیں، اس سے بحث فضول ہے، لیکن یہ ضرور قابل غور ہے کہ عہد حاضر میں جبکہ آدھی تمام جائز حدود سے گزر جانا چاہتی ہے، متعہ کا جواز کہیں "ادارہ فحاشی" کی صورت کو اختیار نہ کرے گا۔ اور سوسائٹی اس کو برداشت کر سکتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ ایران میں جہاں صدیوں سے متعہ کا رواج چلا آ رہا تھا، رضا شاہ پہلوی نے اس کو بالکل بند کر دیا، کیونکہ اس وقت جبکہ عورتوں کا پردہ اٹھتا جا رہا ہے، متعہ کا جواز آفتیں ڈھاسکتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور اس کو صرف اس دلیل پر کبھی مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا کہ وہ برے کام کرنے کا اچھا طریقہ ہے۔

جس حد تک منقولی دلائل کا تعلق ہے، مولانا یقیناً اسی حد تک کامیاب ہوئے ہیں جس حد تک ایک مخالف مولوی کامیاب ہو سکتا ہے، کیونکہ روایات و احادیث کے دفتر پہ پایاں سے ہر شخص اپنے اپنے مطلب کی باتیں نکال سکتا ہے اور اسی لئے میں اس طریق استدلال کو کبھی پسند نہیں کرتا۔

یہ رسالہ سرفراز پریس لکھنؤ سے ۸۰۰ میں مل سکتا ہے۔

تجارت اور اسلام | تک جتنے رسائل اس مشن سے شائع ہوئے ہیں، ان سب میں مفید ترین رسالہ ہی ہر امامیہ مشن لکھنؤ کا بارہواں تبلیغی رسالہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس وقت اس رسالہ میں مولانا سید علی نقی صاحب نے نہایت قابلیت سے بتایا ہے کہ اسلام میں توکل و قناعت یا ترک دنیا کا کیا مفہوم ہے اور مسلمانوں نے ان اصطلاحات کا مفہوم غلط سمجھ کر اپنے آپ کو کس قدر نقصان پہنچایا۔ رسالہ ۳۰۰ میں سرفراز پریس لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

ایک خاص عانتی اعلان
جنوری ۱۹۳۷ء سے نگار کے خریداروں کیلئے
خواہ وہ نئے خریدار ہوں یا پرانے

یعنی

تذکرہ حسدہ گل اور فلاسفہ قدیم دونوں کتابیں جنکی مجموعی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ ہوتی ہے صرف ایک روپیہ میں علاوہ محصول —
منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

خارج کی مختصر تاریخ

(جناب سید ریاض الحسن صاحب - لاہور)

خارج کی صحیح تاریخ کہاں دستیاب ہو سکتی ہے؟ اگر زحمت نہ ہو تو نگار کے ذریعہ سے اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائے

(نگار) ۱۳۳۵ھ میں صفحہ کا مہینہ ہے۔ جنگِ صفین میں ایک جانب امیر معاویہ کا لشکر آراستہ ہے اور دوسری طرف جناب امیر کا۔ جنگ کا سبب وہ باہمی اختلاف ہے جو فریقین میں شہادتِ عثمان غنیؓ کے سلسلہ میں پیدا ہو گیا ہے۔ امیر معاویہ کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوتی ہے کہ اس باب میں دو حکم مقرر کئے جائیں جو قرآن کے مطابق فیصلہ کریں۔ جناب امیر کی فوج کے اکثر آدمی اس پر راضی ہو جاتے ہیں یا تو اس لئے کہ وہ جنگ سے تھک چکے ہیں یا اس وقت پر کہ جب قرآن کی رو سے فیصلہ کیا جائے گا تو انھیں کے حق میں ہوگا۔ لیکن فوج کا ایک حصہ جو قبیلہ تمیم سے تعلق رکھتا تھا اس کی مخالفت کرتے ہوئے ”لا حکم الا للہ“ کی آواز بلند کرتا ہے۔ اور امیر معاویہ کی اس تجویز کو نہیں مانتا۔ جب ان لوگوں کی مخالفت فیصلہ کی قرارداد کو مسترد نہیں کر سکتی تو وہ جناب امیر کی فوج سے نکل کر کوفہ کے قریب ایک گاؤں (حروراع) میں پھونچ جاتے ہیں اور ایک معمولی شخص عبد اللہ بن وہب الراہبی کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں۔ اس کے بعد چونکہ فیصلہ جناب امیر کے خلاف ہوا، اس لئے اور بھی بہت سے لوگ کوفہ سے نکل کر ابن وہب کی جماعت سے مل گئے۔ اور یہ گروہ خارجی کہلایا یا تو اس لئے کہ وہ کوفہ سے باہر نکل گئے تھے، یا اس لئے کہ وہ جناب امیر کی جماعت سے خارج ہو گئے تھے۔

اس جماعت کی مخالفت ایک طرف جناب امیر اور علوین سے اس لئے تھی کہ کیوں انھوں نے امیر معاویہ کی تجویز سے اتفاق کر کے فصلہ حکم کے سپرد کیا اور دوسری طرف حضرت عثمانؓ کے قتل کو جائز ٹھہرا کر امیر معاویہ کے بھی مخالف تھے۔ انھوں نے جناب امیر کی خلافت سے انکار کر کے علم بغاوت بلند کیا اور سخت شورش پیدا کی۔ وہ ہزار ہا شمشیر اپنے عقیدہ کو پھیلانا چاہتے تھے اور اس سلسلہ میں قتل و بے رحمی کی بہت دردناک مثالیں اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔

جناب امیر نے اول اول تو بہت طرح دی کیونکہ ان کو امیر معاویہ کے مقابلہ میں بھی اپنی عسکری قوت صرف کرنا تھی، لیکن جب خوارج کا فتنہ زیادہ خطرناک صورت اختیار کرنے لگا تو مجبوراً انھوں نے ان سے جنگ کی اور نہروان میں سخت مورکہ کے بعد بتاریخ ۹ صفر ۳۶ء خوارج کو شکست دیکر ابن وہب کو قتل کر ڈالا۔ لیکن یہ فتح جناب امیر کو بہت گراں قیمت پر حاصل ہوئی۔ کیونکہ شورش کا سلسلہ بدستور قائم رہا اور خود وہ بھی آخر کار ایک خارجی ابن عجم کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ ابن عجم ایک ایسی عورت کا شوہر تھا جس کے خاندان کے بہت سے افراد جنگ نہروان میں مارے گئے تھے اور اس طرح اس عورت نے اپنا انتقام جناب امیر سے لیا۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد، امیر معاویہ نے بڑی حد تک اس جماعت کی سرکوبی کی، لیکن جس طرح وہ شیعہ جماعت کو پوری طرح دبانے میں ناکام رہے اسی طرح فتنہ خوارج کا بھی استیصال نہ کر سکے، چنانچہ امیر معاویہ کے بارہ سال دور حکومت میں متعدد بار خوارج نے سر اٹھایا اور متعدد بار ان کو دبا یا گیا، لیکن اصل تحریک قائم تھی اور خوارج میں سے جو لوگ مارے جاتے تھے ان کی عزت پرستش کی حد تک کی جاتی تھی۔ بصرہ میں خصوصیت کے ساتھ یہ شورش زیادہ پھیلی اور ابو بلال مر اسی تیبی کی سرکردگی میں جو بغاوت رونما ہوئی وہ بہت سخت تھی۔ یہ لوگ باقاعدہ جنگ آدمائی نہ کرتے تھے بلکہ سرحدی قبائل کی طرح جہاں موقع مل جاتا تھا لوٹ مار کر کے چھپ جاتا کرتے تھے۔

یزید کی وفات کے بعد خوارج کی قوت بہت بڑھ گئی اور عبدالمدین زبیر کو انھوں نے شکست دی۔ اس کے بعد نافع بن الارذق کی قیادت میں کرمان اور دوسرے مشرقی صوبوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ اس جماعت کا اثر اتنا قوی تھا کہ تمام بصرہ اور اس کے قریب دجوار میں ہر وقت لوگوں پر ان کی ہیبت طاری رہتی تھی اور مشکل سے حاج بن یوسف ان کی قوت توڑنے میں کامیاب ہوا۔

انھیں کی ایک جماعت یزید شیبانی کی سیادت میں سرزمین دجلہ پر آفتیں ڈبار ہی تھی اور حاج بن یوسف کی فوج کو بارہا شکست دے چکی تھی، آخر کار یہ بھی بڑی مشکل سے درہم برہم کی گئی۔

اسی طرح سرزمین عرب میں ۶۵ء اور ۶۶ء کے درمیان انھوں نے ایک طوفان برپا کر دیا اور پیامہ، حضرت موت، یمن اور طائف پر قابض ہو گئے۔ آخر کار حاج بن یوسف نے یہاں بھی ان کو شکست دی۔ لیکن کوئی فتح اس جماعت کے فتنہ کو فرو نہ کر سکی اگر حسن اتفاق سے خود انھیں کے درمیان باہم اعتقادی اختلاف نہ پیدا ہو جاتے۔

نزہت عشرت

نزہت انوار سے ملو ہے گو تیرا دماغ نہ
 موج صہبا کی طرح رنگیں ہو گو تیری نظر
 کس قدر ٹھیرا ہے احساسات عشرت کا سراب
 آفتاب روح کی کرنیں نہیں اے بے خبر
 روح میں جب تک نہ ہو موجود غم کا سوزِ تام
 تا کجا یہ بے حقیقت بارشِ نعمات و رنگ
 صبر کر اپنے طلسمی خواب کا انجام دیکھ
 قلبِ گم گشتہ حقیقت آشنا ہو جائیگا

روح کی تہ میں بھی کیا روشن ہو عرفاں کا چراغ
 زندگی کے رازِ سر بستہ سے بھی ہے باخبر!
 آہ تیری گمراہی ہو اور حجاب اندر حجاب
 جن تناؤں کے جلوے ہیں ترے پیشِ نظر
 کیسے کھل سکتے ہیں انساں پر حقیقت کے مقام
 پھینک ہی دیگی کبھی دنیا تری جانبِ خدنگ
 رنگ کیا لاتی ہے طرزِ گردشِ ایام دیکھ
 ٹھو کر پکھا کر خود اپنا رہنا ہو جائے گا

تھک چکی ہے کتاب بے نگوستی سے اگر
 ہو چکا ہے گرتا دل عیش و عشرت کے اُچاٹ
 سطح کی رعنائیوں پر تیرے والی نظر
 لیکے چل اپنے سینے کو غمِ الفت کے گھاٹ
 عظمت جانسوزی اہل نظر بھی دیکھ لے
 روح کی گہرائیوں میں جھانک کر بھی دیکھ لے

عدم

قطعات

ضبط اشک

کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے
پہنچ کے قلب میں بن جائیں گے یہ انگارے

ان آنسوؤں کو ٹپکنے دیا نہ تھا میں نے
میں ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی

فریبِ ائمہ

سدا کے ساز برنگِ فناں نکلتی ہے
مجھے گماں ہے یہی، میری جاں نکلتی ہے

مغنیہ! تیری تالوں سے ہو کے ہم آہنگ
یہ جانتا ہوں مگر آہ! باوجود اس کے

انکسے حقیقت

تو آنکھیں مل کے میں کہتا ہوں "رات سونہ سکا"
کہ "رات رونے کی خواہش تھی اور رونہ سکا"

جو بوجھتا ہے کوئی "سُرخ کیوں ہیں آج آنکھیں؟"
ہزار پیا ہوں مگر یہ نہ کہہ سکوں گا کبھی،

نشاطِ ہمار

بھرے کٹوروں کی صورت بھلک ہی ہے فضا
وہ بے خودی ہے کہ میں کچھ سمجھ نہیں سکتا

پھوار، ابرا، پرندوں کے گیت، مسرت ہوا
بہار کان میں کچھ کہ رہی ہے مجھ سے مگر

گر یہ پیہم

یعنی پہلو سے مرے وہ دلِ دیوانہ گیا
دوسرے تیسرے دن کا مرا رونا نہ گیا

آہ دوئیں نہ رہیں، حسرت و ارماں نہ رہے
چھٹ گئے اور سب اندازِ جنوں تو لیکن

فنونِ لطیفہ

درد اپنا کوئی نالوں میں کہا کرتا ہے
اور ناسور، ہر نوع، بہا کرتا ہے

کوئی رنگوں میں، کوئی شعر میں، کوئی سُرخ میں،
ایک ناسور ہے فی الاصل عنہم ہستی بھی

کسی کی یاد میں

نہ بھولے گی قیامت تک مجھے وہ ساعتِ رنگیں
 وہ رشکِ صدِ چمن، جانِ بہارِ صدِ گلِ تر تھی
 شرابِ حُسن کی وہ ایک موجِ نشہ آور تھی
 وہ اکِ گلہ ستمِ رعنا تھی گلزارِ صباحت کا
 وہ اکِ عنوان تھی افسانہ حُسن و محبت کا
 وہ اکِ شمعِ جمالِ افروز تھی بزمِ تمنا کی
 وہ زلفِ عنبریں جس سے فضا معمورِ نکلت تھی
 تراشا تھا مگر گلبرگ سے اس کا لبِ رنگیں
 ادائے خاص پہناں اس کے اندازِ تکلم میں
 ستمِ ڈھائی تھیں کیا کیا بر ملا وہ مستِ نازا تھیں
 بقدرِ شوقِ بسیار و بقدرِ ذوقِ بالیدہ
 ہوئی جب آکے میری ہم سفر اکِ لعبتِ شیریں
 وہ سینِ تنِ عروسِ حُسن و زیبائی کا زیور تھی
 نسیمِ صبح کی وہ اکِ شمیمِ روح پرور تھی
 وہ اکِ مجموعہٴ زیبا تھی اجزاءِ لطافت کا
 وہ اکِ رنگیں پیامِ شوق تھی حورانِ جنت کا
 وہ اکِ روحِ طربِ انگیز تھی، کیفِ تماشا کی
 وہ روئے یاسمین جس پر فدا سو بارِ فطرت تھی
 ڈھلی تھی نور کے سانچے میں اس کی ساعدِ سین
 ہزاروں برقِ رقصاں اس کی اکِ موجِ تہمت میں
 لئے سوتی تھیں فتنے سیکردوں وہ نیمِ بارِ آنکھیں
 ہوا جاتا تھا قاتل اور بھی وہ حُسنِ خوابیدہ

ستمِ تھاؤں ستم وہ حُسنِ شوخ و بر ملا اس کا

قیامت تھا قیامت وہ جمالِ دلربا اس کا

م۔ م۔ سی (اعظم گڑھ)

غزل:—

تا چند اُن کو دُور سے دیکھا کرے کوئی
اپنے ہی دل میں کیوں نہ تماشا کرے کوئی
ہر جو دل نواز ہے ہر لطف دل گزار
پہلے مذاق درد تو پیدا کرے کوئی
غارت ہو دولتِ دل و جان کوئی غم نہیں
لیکن مستاعِ صبر نہ لوٹا کرے کوئی
کچھ سوچ کر دیا ہے دل درد آشنا
آسان تھا؟ کہ اُن کی تمنا کرے کوئی
حسینِ کرم کو جب نہیں حاجت سوال کی
سوا ادب یہ ہے کہ تقاضا کرے کوئی
دنیا میں کس کو اپنی تمنا نہیں عزیز
کیوں میرے دردِ دل کا مداوا کرے کوئی
ہے شرطِ اعتماد۔ محبت کے واسطے
”دل“ اور ”میرے دل“ کی نپروا کرے کوئی

کو کتب مذاقِ عشق ملا جس کو مل گیا

یہ درد وہ نہیں ہے کہ پیدا کرے کوئی

کو کتب (شاہ جہاں پوری)

ترکی جمہوریہ

نقلا سے ترکی کی بے نظیر تاریخ، ایک زندہ قوم کی جدوجہد کی سبق آموز داستان، مصنفہ
مستر ضمیر احمد ہاشمی ام۔ اسے قیمت ۷۰ روپے

مختصر داستان

حضرت مختصر عابدی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ جو اردو کے ممتاز رسائل میں شائع ہو چکے ہیں

جلد نمبر ۱ (علاوہ حصول)

نیچر نگار لکھنؤ

تاریخ کا ایک ورق مجہول

محبت کی قربانیاں

خارویہ بن احمد بن طولون سخت پریشان ہے اور حکم دیتا ہے کہ ابن یعقوب کو طلب کیا جائے۔ ابن یعقوب قبلی طبیب ہے۔ اور اپنے علم و مذاق کے لحاظ سے خاص شہرت کا مالک ہے۔ ابن یعقوب حاضر ہوتا ہے اور خارویہ اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے :-

”اے ابن یعقوب، میں بہت در ماندہ و مضطرب ہوں اور اب اپنی تمام اُمیدوں کا مرکز جھکو قرار دیکر، تیری مدد چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں کوثر سے کتنی محبت کرتا ہوں اور اس کی بیماری نے میری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ پھر تیری مذاقت کس دن کام آئے گی اور سوائے تیرے اس ملک میں کون ہے جو اس کے مرض کا علاج کر سکے“

کوثر، تیری ہی طرح نصرانی مذہب رکھتی تھی لیکن جب اس کا باپ اسلام لایا تو وہ بھی مسلمان ہوئی اور میرے جلالہ عقد میں آئی۔ اب میں اس کی بیماری کی وجہ سے سخت پریشان ہوں اور اگر کوئی شخص اس کو صحیح و تندرست کر سکے تو میں بڑی سی بڑی دولت پیش کرنے کے لئے طیار ہوں“

یہ سن کر ابن یعقوب نے کہا کہ ”جو کچھ میرے امکان میں ہے اس سے دریغ نہ کروں گا۔ اور اپنی ساری کوششیں اس کی صحتیابی کے لئے صرف کر دوں گا“

خارویہ، اپنے باپ احمد بن طولون کی وفات پر سن ۳۲۵ھ میں مصر کے تخت پر بیٹھا اور اپنے باپ کی طرح نہایت اچھا حکمران ثابت ہوا۔ اس نے تمام اُمور مملکت پر خاص توجہ صرف کی، حدود سلطنت وسیع کئے اور اقطار اسلامیہ میں طولونی حکومت کا آواز بلند کر دیا۔ مصر کے اندر کثرت سے مساجد و محلات تعمیر کئے، رعایا کی راحت و آسائش کا خاص خیال رکھا اور شاہانہ جاہ و جلال میں بھی بہت کچھ اضافہ کیا۔ خارویہ ایک جری سپاہی، ایک صاحب جبروت سردار، ایک قدر شناس فرمانروا تھا اور وہ بلا لحاظ ملت و مذہب فصل و کمال کی عزت کرنے والا تھا

ایک دن اس کو معلوم ہوا کہ..... فوج میں ایک سپاہی ہے جو ابن طولون کے زمانہ میں اسلام لایا تھا اور وہ ایک لڑکی رکھتا ہے جو حسن و جمال اور بلندی سیرت کے لحاظ سے مصر بھر میں اپنا جوا ب نہیں رکھتی

چنانچہ اس نے سپاہی کو طلب کیا اور پیام دیکر اس کی لڑائی کو تر سے نکاح کر لیا۔ جب کوثر محل شاہی میں داخل ہوئی اور خارویہ نے اس کے حسن و جمال کو قریب سے دیکھا تو اس کا شیفہ ہو گیا۔ لیکن چونکہ قصر شاہی مصر و شام، سرکیشیا و گرجستان کی نہایت حسین و جمیل عورتوں سے بھرا ہوا تھا، اور خارویہ کبھی کبھی ان کی طرف بھی ملتفت ہو جاتا تھا، اس لئے کوثر اپنے محبوب شوہر کے اس طرزِ عمل سے کہہ سکتی رہتی تھی، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ گھلنے لگی اور داغ پر بھی ایسا سخت اثر ہوا، کہ ایک دن سب نے جان لیا کہ وہ دیوانی ہو گئی ہے۔

خارویہ اور ابن یعقوب طیب کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس کو کچھ زمانہ ہو گیا ہے اور خارویہ اپنی محبوب بیوی کے پاس سے ایک لمحہ کے لئے جدا نہیں ہوتا۔ ایک دن ابن یعقوب آیا اور بولا کہ ”ملکہ کے علاج کے لئے خاص اہتمام کی ضرورت ہے۔ اور اگر بادشاہ ایک شفاخانہ خصوصیت کے ساتھ بالکلوں کے علاج کے لئے قائم کرنے پر راضی ہو تو ممکن ہے ملکہ شفا یاب ہو جاوے۔ یہ سنتے ہی خارویہ نے پایہ تخت میں نہایت وسیع پیمانہ پر ایک عمارت اس غرض کے لئے طیار کرائی اور اس کا نام ”المستان“ رکھا گیا۔ کوثر اس شفاخانہ میں داخل کی گئی اور وہاں سے شفا پا کر قصر میں واپس آئی۔

ظاہر ہے کہ خارویہ کی محبت کا کیا عالم ہوگا۔ اس نے سوائے کوثر کے تمام عورتوں سے بات کرنا ترک کر دی اور دونوں محبت کی فردوسی زندگی بسر کرنے لگی۔ بظاہر یہ نہایت معمولی واقعہ تھا، لیکن اندر ہی اندر نہایت ہولناک مستقبل طیار کر رہا تھا۔ کیونکہ محل کی وہ تمام عورتیں جو خارویہ کی نگاہ سے اتر گئی تھیں، کوثر اور خارویہ دونوں سے جلنے لگیں اور انھوں نے درپردہ امر اور افسرانِ فوج سے مل کر ان کی ہلاکت و تباہی کی سازشیں شروع کر دیں۔

رجب ۲۷ھ کی انیسویں تاریخ ہے، عباسی خلیفہ المعتضد باللہ تخت نشین ہوتا ہے اور لوگوں سے اس کے خلافت پر بیعت لی جا رہی ہے۔ خارویہ بھی اپنی طرف سے کچھ قیمتی ہدایا خلیفہ کی خدمت میں بھیجنا چاہتا ہے اور اپنے ایک مخلص دوست حسین بن عبداللہ کو (جو ابن الخصاص کی کنیت سے مشہور تھا) اس خدمت

۱۰ یہ مورخین کی غلطی ہے کہ اس شفاخانہ کی تعمیر کو احمد بن طولون کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

کے لئے منتخب کرتا ہے

ابن النخصاص ، نہایت ہوشیار شخص تھا ، اس نے سوچنا شروع کیا کہ کیوں مگر اس خدمت سے پورا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے — وہ جانتا تھا کہ خارویہ کی لڑکی ” قطر الندی “ بے انتہا حسین و جمیل ہے اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ خلیفہ کے پاس پہنچ کر اس کا ذکر کرے گا تاکہ وہ اپنے بیٹے علی سے اس کی شادی کر کے طو لونی فتنہ سے ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو جائے

چند دن کے بعد ابن النخصاص ہدایا لے کر روانہ ہوا۔ اور منزلیں طے کر کے خلیفہ عباسی کے حضور میں پہنچ گیا — خلیفہ نے نہایت مسرت سے ان قیمتی ہدایا کو قبول کیا اور ابن النخصاص سے گفتگو کرنے کے لئے تخلیہ کر دیا گیا

ابن النخصاص نے مصر کا حال بیان کرتے ہوئے خارویہ کی لڑکی ” قطر الندی “ کے حسن و جمال کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ اگر ولیعهد خلافت (علی) کے ساتھ اس کی شادی ہو جائے تو بہت مناسب ہے — خلیفہ نے کہا۔ ” میں نے اور لوگوں سے بھی اس لڑکی کے حسن و جمال کا ذکر سنا ہے۔ اور میں خارویہ سے خود اپنے لئے اس کی خواہش کروں گا “

یہ کہہ کر اس نے دس ہزار دینار ابن النخصاص کو دئے اور حکم دیا کہ جلد سے جلد مصر جا کر خارویہ تک یہ پیام پہنچا دیا جائے

ایک سال گزرا اور دوسرا بھی —

محرم ۲۸۲ھ میں ایک شاندار جلوس بغداد کی گلیوں میں داخل ہوتا ہے۔ جس کے وسط میں خارویہ کی لڑکی ” قطر الندی “ زریں محل پر سوار نظر آتی ہے، اور ابن النخصاص آگے آگے ہے قطر الندی ، خلیفہ عباسی کے محل میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور ابن النخصاص بیش قیمت ہدایا کے ساتھ مصر واپس کیا جاتا ہے

” قطری الندی “ کی روانگی کے بعد خارویہ نے ارادہ کیا کہ تبدیل آب و ہوا کے لئے قصر حکومت کو چھوڑ کر چند دن کے لئے دمشق چلا جائے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ حرم کی تمام عورتیں کوثر کے جلو میں ساتھ ساتھ

جلسیں — خاردویہ نے ایک شیر پال رکھا تھا جو اس کے ساتھ ہر وقت قصر میں رہا کرتا تھا۔ یہ کہو دا آٹھوں والا شیر بہت خوبصورت تھا۔ اور اپنے مالک سے صدر جہ مانوس تھا۔ خاردویہ کا اعتقاد تھا کہ جب تک یہ شیر میرے پاس ہے کوئی دشمن اس کو گزند نہیں پہنچا سکتا

روانگی سے قبل اس کی ایک حرم نے جو کوثر کی شدید دشمن تھی خاردویہ سے کہا کہ ” اے آقا، لوگ کہتے ہیں کہ آپ بزدل ہیں اور اسی لئے اپنی حفاظت کے لئے ہر وقت شیر کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ مجھ سے لوگوں نے بیان کیا تو میں نے کہا کہ یہ غلط ہے اور دیکھ لینا اب کے سفر میں شیر ساتھ نہ جائے گا “

خاردویہ نے جواب دیا کہ ” تم نے خوب جواب دیا، بے شک میں شیر کو ساتھ نہ لے جاؤں گا تاکہ لوگ مجھے بزدل نہ سمجھیں

چنانچہ وہ شیر کو وہیں مصر میں چھوڑ کر دمشق روانہ ہو گیا

دمشق پہنچنے کے بعد محل کی عورتوں کو اپنی سازش کی تکمیل کا کافی موقع مل گیا۔ اور بعض افسران فوج اور خادموں کی مدد سے اس کو ذبح کر دیا۔ — یہ واقعہ ذمی قعدہ ۳۲۲ھ کا ہے، یعنی اسی مہینہ کا جب اس کی لڑکی قطر الندی کے ساتھ خلیفہ المعتضد باللہ نے شادی کی تھی

۳۳ رذی الحجہ کو خلیفہ تک اس واقعہ کی خبر پہنچی اور اس نے بیس آدمیوں کو جو اس جرم میں شریک تھے تہ تیغ کر دیا۔ — انہیں میں ایک شخص ابوالجیش بھی تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد خلیفہ نے ابن الخصاص کو خط بھیجا اور اسے مصر طلب کیا

قطر الندی کو جب اپنے باپ کے قتل کئے جانیکا حال معلوم ہوا تو بہت روئی اور التجا کی کہ کوثر کو یہاں بلا لیا جائے، کیونکہ وہ اس کے باپ کی بہت محبوب بیوی تھی “

خلیفہ نے پوچھا کہ ” تم یہ کیوں چاہتی ہو “ — قطر الندی نے جواب دیا کہ مصر میں تنہا وہی ایک عورت ایسی تھی جس سے مجھ کو بہت محبت تھی۔ اور جب میری ماں کا انتقال ہوا تو اس نے اپنے بچوں کی طرح مجھے رکھا اور نہایت شفقت سے پیش آئی۔ — مجھے اندیشہ ہے کہ اگر وہ وہاں چھوڑ دی گئی تو لوگ اس کو بہت پریشان کریں گے بلکہ ہلاک کر ڈالیں گے “

خلیفہ نے ابن الخصاص کو دمشق بھیجا تاکہ کوثر کو اپنے ساتھ لے آئے، لیکن یہاں پہنچ کر اس نے عجیب رنگ دیکھا، محل کے اندر عجیب ہنگامہ برپا تھا اور کوثر غائب تھی — ایک بڑھیا سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ خاردویہ کے قتل کے بعد ہی چلی گئی تھی۔ اور دمشق کے ایک لکڑہارے کے مکان

میں اس نے پناہ لی تھی
ابن الخصاص اس کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ کوثر بے شک وہاں آکر ٹھہری تھی لیکن تین دن ہوئے
کہ دفعتاً غائب ہو گئی
ابن الخصاص نے خیال کیا کہ اگر وہ کوثر کو لے کر بغداد نہ گیا تو ممکن ہے خلیفہ اس کو بھی سازش میں شریک
سمجھے، اس لئے اس نے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا اور آخر کار چوتھے دن دیکھا گیا کہ دریا میں ایک عورت کی
لاش خس و خاشاک میں اُلجھی ہوئی پڑی ہے اور وہ عورت کوثر تھی

آئندہ جنوری ۱۹۳۷ء کا نگار

(تقریباً دوچند ضخامت کا)

مخصوص ہوگا صرف ایک موضوع کے لئے جس پر اردو میں اس وقت تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا

یعنی

”لبوں کی داستان زبانِ قلم سے“

آپ کے ”لب“ ہر وقت متحرک رہتے ہیں اور سب سے زیادہ خدمت انھیں سے لی جاتی ہے، لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ جذبات
کی دنیا میں نفسیاتی حقایق میں، عالمِ شعر و تصوف میں ”لب“ کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ اور دنیا کی تاریخ میں کیسے کیسے انقلاب اسکی وجہ سے
رہا ہوا ہے

جنوری ۱۹۳۷ء کا نگار

اس کی مفصل داستان آپ کو سنائے گا اور اس موضوع پر تحقیق کے وہ نقوش آپ کے سامنے پیش کریگا کہ آپ حیران رہ جائینگے
علاوہ اس کے

بعض اور بھی نہایت اہم مضامین ہوں گے

انگس

آپ نے نگار کی خریداری جاری رکھی تو یہ مجموعہ آپ کو مفت مل جائیگا۔ ورنہ یوں کسی قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہو سکتا
فیچر نگار لکھنو

تقلید کے خراب نتائج

ہمارے علماء کی عبرتناک حالت

اسلم ریواؤل کی اشاعت (جون ۱۹۳۶ء) میں مسٹر سلیم چشتی کا ایک فاضلانہ مقالہ شائع ہوا ہے جس میں تقلید سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس سے مسلمانوں کو کس قدر نقصان پہنچا اور اُن کی یہ ذہنی غلامی کس حد تک ان کے لئے مُضر ثابت ہوئی۔ ہم اس کے ایک حصّہ کا خلاصہ ناظرین نکار کے مطالعہ کے لئے پیش کرتے ہیں

چھٹی صدی عیسوی بھی عجیب صدی تھی جب ایک طرف جسیٹین نے یونان میں حکمت و فلسفہ کی درسگاہوں کو بند کیا اور دوسری طرف خلیفہ مستنجد نے مباحث حکمیہ و عقلیہ کو ٹکڑا کر رک دیا یونان میں اس کا جو سبب بھی ہوا ہو، لیکن بغداد میں یہ سب کچھ محض علماء کی وجہ سے ہوا جو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر علم و عقل کی روشنی سے لوگ بہرہ ور ہوئے تو پھر دنیا اُن کو تاریکی میں ڈال دے گی اور ان کا جاہ و وقار خاک میں مل جائے گا

ہر چند دنیاے اسلام میں کوئی عورت ایسی تو پیدا نہیں ہوئی جو ہائی پیشیا کی طرح بغداد و دمشق کی گلیوں میں برہنہ گسیٹی جاتی، پھر بھی مردوں میں شیخ شہاب الدین ایسی بعض ہستیوں کو قدامت پرست علماء فقہ کا شکار بننا پڑا۔

ان علماء کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا جانشین سمجھتے تھے اور جو شخص اُن کے احکام پر تنقید کرتا تھا وہ اگر ہاتھ آگیا تو دار پر چڑھا دیا جاتا تھا ورنہ کافر و ملحد کہہ کے جنت کا دروازہ اس پر بند کر دیا جاتا تھا۔ ابن تیمیہ ہر چند کوئی بڑا عقل پرست شخص نہ تھا لیکن محض اس لئے کہ تقلید کے باب میں اس کا نقطہ نظر دوسرے علماء سے مختلف تھا، وہ غریب بھی قید و بند کے آدار سے نہ بچ سکا

الغرض تقلید رفتہ رفتہ مسلمانوں میں اساس مذہب قرار پا گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذہنی غلامی کی وجہ سے وہ علوم و فنون میں کوئی محترمانہ دستگاہ نہ پیدا کر سکے۔ اگر کوئی شخص ادنیٰ سا انحراف بھی تقلید کے دیوتا سے کرتا تھا تو اسے کافر سمجھا جاتا تھا۔ اور مذہب کا مفہوم صرف یہ رہ گیا کہ آنکھ بند کر کے اسلاف کی پیروی کی جائے

اب آئے اس تقلید کے نقصانات پر بھی ہلکی سی تفصیلی نظر ڈال لیں :-

(۱) سب سے پہلے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے قرآن پاک میں تفکر و تدبر ترک کر دیا۔ اور اگر کوئی شخص ذاتی طور پر اس کو سمجھنا چاہتا بھی تو اس کو ضلالت و بدعت قرار دیا جاتا۔ اسی لئے قرآن مجید کی تفاسیر نسبتاً بہت کم لکھی گئیں۔ اور جو لکھی بھی گئیں وہ صرف اسلاف کے نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر اور کسی مزید تحقیق سے سروکار نہ رکھا گیا اس کے مقابلہ میں یورپ و امریکہ کو دیکھئے کہ اس وقت تک وہاں انجیل کی کتنی تفسیریں شائع ہو چکی ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ بند نہیں ہوا۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ عیسوی مذہب کے متبعین کو اس کا اندیشہ نہیں ہے کہ انجیل کی تفسیر میں اسلاف کی روش ترک کرنے پر انھیں کافر قرار دیدیا جاویگا اور اس آزادانہ رائے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں تنقید کی اہلیت لوگوں میں پیدا ہوگئی۔ اور مذہب نام صرف کو رائے تنقید کا نہ رہا۔

مسلمان عیسائیوں کو کافر و مشرک کہنے کے بڑے شایق ہیں، لیکن ان کافروں نے اپنے مذہب کی جو عظیم خدمات انجام دی ہیں وہ بھی قابل غور ہیں۔ اس وقت انجیل کا ترجمہ ۹۰، مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے اور برخلاف اس کے ہندوستان کے علماء اسلام قرآن کو، بھی تک اپنے ہی ملک والوں کے لئے قابل فہم نہیں بنا سکے، دوسری قوموں کا کیا ذکر ہے، درانحالیکہ یہاں بادشاہوں کے ساتھ ساتھ صدیوں تک انھوں نے بھی حکومت کی ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ تنقید کی مذموم عادت نے ان کے ذہن و دماغ کو کند کر رکھا ہے اور چونکہ اسلاف نے دوسری زبانوں میں قرآن کا ترجمہ نہیں کیا اس لئے یہ کیونکر ایسی جرأت کر سکتے ہیں قرآن کے ساتھ ہی ساتھ احادیث کا بھی تنقیدی مطالعہ ترک ہو گیا یہاں تک کہ اگر آج کوئی شخص اس خیال کا اظہار کر دے کہ کتب احادیث، تنقید کی محتاج ہیں تو اس کو تمام علماء، گمراہ سمجھنے لگیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ امام بخاری نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے ایک حد تک تنقیدی نگاہ احادیث پر ضرور ڈالی، لیکن اس کے بعد پھر مسلمانوں میں نہ کوئی دوسرا امام بخاری پیدا ہو سکا اور نہ موجودہ زمانہ کے لحاظ سے کسی کو تنقید کی ہمت ہوئی

ترمذی اور نسائی میں ظور امام مہدی کے متعلق متعدد احادیث پائی جاتی ہیں، لیکن امام بخاری نے ان میں سے کسی کو قابل اعتبار نہیں سمجھا۔ پھر سوال یہ ہے کہ اگر امام بخاری کو اس تنقید کا حق تھا تو دوسرے مسلمانوں کو کیوں نہیں ہو سکتا اور اگر آج کوئی شخص تنقید کے معیار کو زیادہ بلند کر کے احادیث کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے یا خود صحیح بخاری پر تنقید کرنا پسند کرتا ہے تو کیوں اسے کافر قرار دیا جائے

کیا امام بخاری معصوم تھے؟ کیا ان سے غلطی سرزد ہونا ممکن نہ تھا؟ کیا بخاری کی احادیث وحی و الوام کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ یقیناً کوئی شخص اس کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جس طرح امام بخاری

نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے تنقید کی، اسی طرح آج کوئی دوسرا شخص خود احادیث پر تنقیدی نگاہ نہ ڈالے
کیا کلام مجید میں کوئی آیت ایسی پائی جاتی ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ امام بخاری کے بعد تنقید و تحقیق،
تفتیش و جستجو، علمی و ذہنی ترقی کا دروازہ بند ہو جائیگا اور جو شخص امام بخاری سے اختلاف کرے گا وہ جہنم
میں پھینک دیا جائے گا

مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ رسول کی ایک خاص بلند سیرت ہوتی ہے اور وہ کبھی اس اخلاق سے منحرف
نہیں ہو سکتا جس کی تعلیم وہ دوسروں کو دیتا ہے، لیکن کس قدر حیرت ہے کہ باوجود اس علم و یقین کے مسلمان
علماء کو اس کی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ بخاری سے ان احادیث کو نکال دیں جن سے رسول اللہ کی عظمت
مجروح ہوتی ہے اور جن کو سامنے رکھ کر دوسرے مذاہب والے اعتراضات کیا کرتے ہیں۔ اس کا سبب
صرف یہ ہے کہ وہ اسلاف پرستی کی فضا میں پیدا ہوئے، تقلید کی تباہ کن آواز گوارا رہی سے ان کے کانوں میں
پڑی اور اب ان میں مطلقاً جرات نہیں کہ وہ دوسری تیسری صدی ہجری کی روایات سے ایک انچ
آگے قدم بڑھائیں

مقلدین ایک معترض کو یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ ”کیا تم امام بخاری سے زیادہ دانشمند ہو؟ کیا
تمام گزشتہ ائمہ و فقہاء بوقوف تھے؟ کیا گزشتہ سات آٹھ سو سال میں کوئی صاحب عقل پیدا ہی
نہیں ہوا جو اس طرف توجہ کرتا؟“

لیکن کوئی ذی فہم اس دلیل سے متاثر نہیں ہو سکتا کیونکہ ممکن ہے وہ شخص جو خاندانی مسلمان چلا آ رہا
ہے مرعوب ہو کر خاموش ہو رہے، لیکن ایک غیر مسلم کے سامنے اگر یہ سوالات کئے جائیں گے تو وہ نہایت
آزادی سے کہے گا کہ ”ہاں بے شک ایسا ہی ہے“

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی پر تنقید کرنا اس کی تکذیب ہے اور اگر امام بخاری پر تنقید کی جائیگی
تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ان کو جھٹلایا گیا، حالانکہ ایسا خیال کرنا سخت غلطی ہے اور نہ اس میں کسی
کی توہین ہوتی ہے۔ افلاطون و ارسطو سے لے کر کانت اور ہینگل تک سب پر متاخرین نے تنقید کی، ان
سے اختلاف کیا، لیکن کیا اس سے افلاطون و ارسطو وغیرہ کی توہین ہو گئی اور کیا دنیا نے علم و حکمت میں
ان کا مرتبہ کم ہو گیا۔ اسی طرح اگر محدثین و فقہاء پر آج بھی تنقید کی جائے تو اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے
کہ ہمارا مقصود ان کی تکذیب و توہین ہے اور ان کا مرتبہ کبھی اس سے کم نہیں ہو سکتا

فقہاء خدا تو تھے نہیں کہ ان کا بنایا ہوا قانون ہر زمانہ اور ہر ملک کے لئے موزوں ہو سکتا۔ جس طرح
انہوں نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے قانون وضع کیا اسی طرح آج بھی موجودہ حالات کے لحاظ سے نفع شریعت

کی خدمت انجام دینی چاہئے۔ پھر یوں بھی دیکھئے کہ کتنے مسائل میں امام محمد اور امام ابو یوسف نے امام ابو حنیفہ سے اختلاف کیا ہے، تو کیا وہ اپنے استاد سے زیادہ عقلمند تھے۔ اسی طرح امام شافعی سے امام ابو حنیفہ نے اختلاف کیا ہے تو کیا یہ ان سے زیادہ صاحب فراست تھے۔ پھر کس قدر عجیب بات ہے کہ یہ چار ائمہ تو باوجود اختلاف کے راہِ راست پر تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن اگر کوئی یا پانچوں ان سے اختلاف کرے تو وہ گمراہ قرار دیا جائے

کیا رسول اللہ نے یہ تعیین کر دی تھی کہ ائمہ فقہ ان چار سے زیادہ نہ ہوں گے، کیا قرآن مجید سے کوئی ثبوت اس کا پیش کیا جاسکتا ہے

یقیناً اس سے زیادہ تو بہن اسلام کی کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ عزالی، رازی، بخاری، یا ابو حنیفہ سے زیادہ صاحب عقل و فراست انسان کی پیدائش کو محال قرار دے۔ اس کا راز صرف یہ ہے کہ مسلمان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ان کو جو کچھ بننا تھا وہ بن چکے ہیں۔ اور اب زندگی کے کسی شعبہ میں، کسی علم و فضل میں ان کو ترقی کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور نہ وہ ترقی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ دیکھئے کہ گزشتہ چھ سات صدی کے اندر کوئی ایک شخص بھی مسلمانوں میں ایسا پیدا نہیں ہوا۔ جس نے اپنی علمی یا ذہنی ترقی کا ثبوت دیا ہو

(۳) جو ذہنیت مسلمانوں کی فقہ میں ہے وہی دوسرے علوم میں بھی ہے۔ اس وقت یقیناً وہ دنیا نہیں ہے جو چھٹی صدی ہجری میں پائی جاتی تھی، لیکن علماء اب تک وہی ہیں۔ اور اسی زمانہ کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ آپ ان کے مدارس کے نصاب کو دیکھئے کہ اس میں اب تک وہی کتابیں رائج ہیں جو ۳۰۰ سال قبل ملا نظام الدین نے متعین کر دی تھیں

دنیا نئی ہو گئی ہے اور اس کے خیالات بالکل بدل گئے ہیں لیکن مولوی ابھی تک اسی جگہ پر قائم ہے جہاں صدیوں قبل پایا جاتا تھا۔ اور دنیا کی کوئی قوت اسے یقین نہیں دلا سکتی کہ درس نظامی اب مجموعہ مخرقات سے زیادہ کچھ چیز نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا سبب بھی وہی جذبہ اسلاف پرستی و تقلید ہے جو اس کو اپنی جگہ سے ہٹنے نہیں دیتا

عربی مدارس میں جن علوم کی تعلیم عام طور پر دی جاتی ہے وہ یہ ہیں :-

(۱) ارسطو کی منطق و مابعد الطبیعیات

(۲) عربی نحو و صرف اور ادب

(۳) صحاح ستہ

- (۴) فقہ
- (۵) افلاطون کا نظام ہیئت
- (۶) عقاب و کلام
- (۷) تفسیر
- اب آئے لگے ہاتھوں ان پر ایک تنقیدی نگاہ بھی ڈال لیں
- (۱) منطق اور مابعد الطبیعیات میں ہمارے علماء، ان مسائل کی صحت کے قائل ہیں جو اب سے دو ہزار سال قبل پائے جاتے تھے۔ نہ ان کو یہ خبر ہے کہ ان علوم میں کتنی ترقی ہو چکی ہے اور ان غیبوں کو اس کا علم کہ بگن، اسپنوزا، ہیوم، کانت، مل اور برگسٹان کوئی جانور تھے یا انسان
- (۲) عربی صرف و نحو کا یہ حال ہے کہ ایک عمر ضائع کرنے کے بعد بھی وہ ادب و انشاء پر قدرت حاصل نہیں کر سکتے
- (۳) حدیث و فقہ کی کتابیں وہ الہامی کتابیں سمجھ کر پڑھتے ہیں اور مطلقاً قوتِ تنقید صرف کر سکی ضرورت محسوس نہیں کرتے
- (۴) ہیئت میں ان کا خدا صرف افلاطون ہے۔ نہ انھیں کپلر کا حال معلوم ہے نہ گلیلیو کا، نہ بروٹو سے واقف ہیں نہ نیوٹن سے
- (۵) علم کلام میں وہ صرف ان مصنفین کی کتابیں پڑھتے ہیں جنہوں نے فلسفہ یونانی کو رد کیا تھا۔ ممکن ہے تیسری چوتھی صدی میں یہ مطالعہ مفید رہا ہو لیکن اب چودہویں صدی میں اس سے کیا کام چل سکتا ہے
- (۶) تفسیر میں زیادہ تر تبیانوی، جلالین پڑھائی جاتی ہیں اور وہ بھی صرف سورہ بقرہ تک اور محض ادب و انشاء کو سامنے رکھ کر
- ہمارے علماء، نہ تاریخ سے آگاہ ہیں نہ جغرافیہ سے، نہ طبیعیات سے نہ علم الکیمیا سے، نہ کمرہ کا علم نہیں حاصل ہے، نہ میکانیات کا۔ پورے آٹھ سال وہ فقہ و حدیث کی تعلیم میں تو صرف کر دیتے ہیں لیکن قرآن کے لئے چند مہینوں سے زیادہ نہیں دیتے
- پھر اس تعلیم کے ساتھ وہ اس کے لئے تو ضرور سونوں ہیں کہ مسجدوں میں اذان دیں یا امامت کر لیں لیکن علوم و فنون میں وہ اپنا وطن کی کوئی رہبری نہیں کر سکتے اور نہ موجودہ مسائل پر رائے زنی کا سلیقہ ان کو حاصل ہوتا ہے
- پھر اگر ہمارے علماء واقعی کوئی خدمت اسلام کی انجام دینا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو دوسری قوموں کے دوش بدوش ترنی کرتے ہوئے دیکھنا پسند کر سکتے ہیں، تو ان کا اولین فرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ تقلید و اسلاف پرستی

ایثار

نثار اور ہاشم اس وقت سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے جب انھیں اس کا احساس بھی نہ تھا کہ محبت کیا چیز ہے، بچپن کی محبت اگرچہ اپنے اندر وہ طوفانی شورشیں نہیں رکھتی جو شباب میں نظر آتی ہیں لیکن اس کا معنوی انداز اور پاک جذبہ فرشتوں کے تبسم کی ابدی لذت اور دائمی مسرت رکھتا ہے، وہ ایک قوت تھی جو نہایت غیر محسوس انداز میں لیکن مسلسل ایک مقدس ارادہ کی طرح اُن کے سینوں میں پرورش پا رہی تھی۔ اگرچہ دونوں کی افتاد طبیعت میں کچھ فرق تھا، دونوں کے خیالات میں جا بجا اختلاف تھا لیکن دوستی اور محبت کی نیرنگیاں ان سب پر بالا تھیں، ہر اختلاف صرف اپنی ذات تک محدود تھا اور ہر ذاتی نقطہ نظر اس کی منفرد ہستی تک اثر رکھتا تھا، محبت کی بارگاہ میں پہنچ کر ہر تفریق مٹ جاتی تھی، مختصر یہ دونوں میں بید محبت تھی اور ان کا زیادہ تر وقت ایک ساتھ گزارتا تھا۔ یہاں تک کہ کانوں کے لوگ آپس کی گفتگو میں دونوں کا نام بھی ساتھ ہی لیا کرتے تھے

ایک زمانہ گزرا اور دونوں کے بچپن لئے کروٹ لی، شباب اپنی تمام بیجانی کیفیتوں کے ساتھ آگیا، جوانی کی کیفیت اور گھڑیاں انبساط کے ساتھ افسردگی اور وارفتہ سرب بھی لائیں، حُسن و عشق کے معنی سمجھ میں آنے لگے اور دونوں احساسات کی اُس منزل پر پہنچ گئے جہاں ہر خاموشی سے نغمہ نکلنے کی آرزو کی جاتی ہے اور ہر زیر نقاب چہرہ کو عریاں دیکھنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے، ذہنیت کی یہ عجیب و غریب تبدیلی جس قدر زیادہ قوی ہوگی اسی قدر سختی کے ساتھ زندگی کی منازل قطع ہوں گی، شراب میں جتنی زیادہ تلخی ہوگی خمار اسی قدر زیادہ کرب و اضطراب پیدا کرے گا، متین اور سنجیدہ انسان بھی شباب کے ان کربانی جھٹکوں کی تاب نہیں لاسکتے۔ جس میں ہر جمیل شے اپنی طرف کھینچی ہوئی نظر آتی ہے اور ہر حسین جلوہ دعوت نظر دیتا ہے

تو ہاشم اور نثار اب جوان تھے اور حیات کے اُس نقطہ پر تھے جہاں سارے وجود پر ایک بخود ہی پھائی رہتی ہے۔ محمد آباد جہاں ان کا گھر تھا، کے قریب ہی غوث پور نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، ہاشم کا باپ وہاں کا زمیندار تھا، گاؤں آبادی کے لحاظ سے تو نہایت مختصر تھا لیکن شادابی میں اپنی آپ ہی مثال تھا، ہر فصل میں کھیت لہلہا ہوئے نظر آتے تھے، بانسجوں میں پارک کا لطف حاصل ہوتا تھا، آب و ہوا کے لحاظ سے دیہات کو شہر پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی ہے، غوث پور کی سادگی فطرت کے کارزنے کی بہترین مثال تھی، وہاں کی قدرتی رونق کسی انسان کے ہاتھ کی مرہون منت نہ تھی۔ گاؤں سے ملا ہوا دوسرا گاؤں کچھ بخر زمین تھی جس میں غوث پور کے لڑکے اور لڑکیاں اپنے چوپایوں کے ساتھ سارا دن گزار دیتی تھیں، قریب ہی ایک پھچلا تالا ب تھا جو برسات میں شکاریوں کی امید

کامرکز بنا رہتا تھا ، ہاشم کو شکار سے ایک خاص دلچسپی تھی۔ یوں تو وہ ہر کھیل کا شدید تھا لیکن شکار میں اُس کا شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا

گرمیوں کی تعطیلات ختم ہونے کے قریب تھی ، بارش شروع ہو چکی تھی ، کانوں سے اطلاع آئی کہ تالاب میں بٹیں وغیرہ آنے لگی ہیں۔ ٹھیک دوپہر کا وقت تھا جب ہاشم بدوق اور نثار کو ساتھ لے کر غوث پور روانہ ہو گیا ، راستہ بھر شیریں فرہاد کے قصہ پر بحث ہوتی رہی ، ہاشم کا خیال تھا کہ فرہاد کو اسی وقت بائوس ہو کر اپنا کام تمام کر لینا چاہئے تھا جب خسرو کی رقیبہ نے چشمک شروع ہوئی تھی کیونکہ ایک بادشاہ کے مقابلہ میں ایک معمولی پیشہ ور انسان کو کامیابی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی تھی ، لیکن نثار کا نظریہ محبت اس سے بالکل جداگانہ تھا ، وہ خیال کرتا تھا کہ محبت ایک غیر فانی قوت ہے جو پیدا ہونے کے بعد مٹ نہیں سکتی ہے ، ممکن ہے کہ اُس کا محبوب اس سے چھین لیا جائے لیکن محبت پھر بھی باقی رہ جانے کی چیز ہے ، فرہاد کو کبھی اس قدر جلد بائوس نہ ہونا چاہئے تھا۔ بحث کا یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ تالاب نظر نہ آیا کیونکہ اس کے بعد ہی ہاشم نے فوراً موضوع گفتگو تبدیل کر دیا اور اُس کی نکالیں چڑیوں کی جستجو میں سطح آب پر گردش کرنے لگیں ، بہت تلاش کے بعد کبھی کوئی شکار نہ ملا دونوں ناکام غوث پور کے ایک باغ میں آئے کہ دوپہر کی گرمی سے پناہ لیں۔ انھیں گھاس پر لیٹے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ پیچھے سے دو لڑکیوں کے ہنسنے اور ہنسی کے ضبط کرنے کی آواز آئی ، نثار اور ہاشم اٹھ بیٹھے ، لڑکیوں نے ہاشم کو پہچانا کہ وہ اُن کے زمیندار کا لڑکا ہے ، دونوں نے سر جھکا لیا اور کوئی ایک منٹ بعد تیزی سے کانوں کی طرف چلیں ہاشم نے لڑکیوں کو بہت دنوں کے بعد دیکھا تھا لیکن پہچان گیا ، رضیہ اور سائرہ ایک غریب گھر سے تعلق رکھتی تھیں ، اُن کی اور اُن کی اعزہ کی گذراؤں دن بھر ہر طرح محنت کرنے کے بعد ہوتی تھی ، مشقت اٹھانے کی وجہ سے اُن کے چہروں میں خون ہر وقت دوڑتا ہوا نظر آتا تھا ، اُن کی اداؤں میں فطرت اپنے سادہ رنگ میں جلوہ بنا تھی ، تصنع کا شائبہ تک نہ تھا لیکن اُن کی سادگی ہی میں وہ انداز بہناں تھے جو نہایت غیر محسوس طریقہ پر دل میں گھر کرتے جلتے تھے۔ کس قدر حیرت افزا بات ہے کہ ایک تیرا فگن کے ہاتھ میں تیرو کماں موجود ہوں اور وہ انکا استعمال نہ جانتا ہو۔ لیکن یہاں یہی عالم تھا۔ رضیہ کی پہلی ہی نگاہ ہاشم کو سر نثار اور نثار کو بخود بنا چکی تھی لیکن خود اُسے اس کا کوئی احساس نہ تھا کہ اُس نے کائنات میں کونسی نئی بات پیدا کر دی

حسن و جمال کے لحاظ سے رضیہ اپنے کانوں میں اور قرب و جوار میں اپنا تانی نہ رکھتی تھی اس کے صبح چہرہ سے جوانی کی شراب چھلکی پڑتی تھی ، اُس کی آنکھوں میں ہر وقت ایک نمی رہتی تھی ، یا تو وہ غربت کے احساس سے تھی یا دن بھر کی محنت و مشقت کا نتیجہ لیکن اُس نے آنکھوں کی چمک اس قدر بڑھادی تھی کہ دیکھنے والا انھیں عرصہ تک

دیکھ سکتا تھا، شباب کے لحاظ سے وہ ایک پھول تھی جو ابھی ابھی کھلا ہو۔ لیکن چونکہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی اس لئے ابھی اُس کی شادی وغیرہ کا کوئی انتظام نہ ہوا تھا، ہندوستان میں ہر شخص وہیں شادی بیاہ کرنا چاہتا ہے جہاں حُسن بھی دولت کے ساتھ ہو۔

نثار اور ہاشم دونوں خاموش پڑے ہوئے تھے، یہ ظاہر ہے کہ دونوں کا موضوع تخیلِ رضیہ کی ہستی تھی۔ لیکن ایک دوسرے کے احساسات سے بے خبر تھا، شام ہونے کو آئی اور آفتاب اتنا جھک گیا کہ باغ میں دھوپ آگئی، درختوں پر پرندوں کی آواز نوحہ شگوار معلوم ہونے لگی، اُس وقت ہاشم اٹھ بیٹھا۔

”نثار کیا سو گئے؟“ ہاشم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، نثار جیسے ایک شہر میں خواب سے چونکا دیا گیا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ”نہیں سو تو نہیں رہا تھا۔۔۔۔۔ لیکن ہاشم چل کہاں رہے ہو؟“

”کیوں؟ چلو ایک دفعہ پھر تالاب دیکھتے ہوئے گھر واپس چلیں۔“ ہاشم نے کہا۔ ”لیکن ہاشم اب۔۔۔۔۔ ہاں جلد چلنا چاہئے“ نثار نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ دونوں چلنے ہی کو تھے کہ رضیہ لڑکی

لے ہوئے لکڑیاں جمع کرتی ہوئی نظر آئی، وہ سیدھی اسی باغ کی طرف آ رہی تھی، بغیر کسی ارادہ اور گفتگو کے دونوں پھر ٹھہر گئے، ایک قوتِ مجہول تھی جس نے اُن کے پیروں میں زنجیر ڈال دی اور اُن کی زبانیں بند کر دیں، رضیہ

باغ میں آگئی، اُس کی رفتار میں فہم زادیوں کا سا استغنا اور دکھی پائی جاتی تھی، قریب پہنچتے ہی ہاشم نے اُس سے گفتگو شروع کر دی، کبھی کبھی نثار بھی بول دیا کرتا تھا، رضیہ کی گفتگو سے کچھ ایسا ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خود

بھی دونوں کی قدر کرتی ہے، بات کرتے کرتے اس نے کچھ سوچا اور یہ کہتی ہوئی ایک طرف چل دی۔ ”ابھی ہمیں گھر کا سب کام کرنا ہے۔“ تھوڑی دور تک ہاشم اور نثار نے اُسے جاتے ہوئے دیکھا اُس کے بعد ایک

دوسرے پر نظر ڈالی دونوں کے چہروں کا رنگ اڑا ہوا تھا، نثار نے دفعِ دخل کے طور پر کہا

”ہاشم تم پریشان نظر آ رہے ہو“

”اور تمہارا چہرہ بھی مجھے بے رونق نظر آ رہا ہے۔“ ہاشم نے جواب دیا۔ اب دونوں نے سمجھا کہ ان

کی زندگی میں کوئی انقلاب رونما ہونے والا ہے، اُن کے سکون میں فرق آنے والا ہے، اُن کے خیالات کوئی نئی کرپٹ لینا چاہتے ہیں، تالاب تک گئے لیکن شام زیادہ ہو گئی تھی اس لئے فوراً گھر واپس ہو گئے۔ رات

میں رضیہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہی، گو یا فرہاد شیریں کا واقعہ دوسرے الفاظ میں دھرا یا جا رہا تھا

”دیکھو ہاشم قدرت کا یہ راز سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک دل آویز پھول دامن کو ہسار میں کھلتا ہے اور مر جھکا جا

ہے۔ اُس کی بہار دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ رضیہ کو تو وہاں پیدا ہونا چاہئے تھا جہاں اہل نظر اُس

پرستش کرتے اور۔۔۔۔۔“

ہاشم نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ لیکن پھولوں کے ڈھونڈنے والے پہاڑوں اور وادیوں میں بھی پہنچ جاتے ہیں۔ جب تک گھر نہ آگیا دونوں نے رضیہ کے سوا کوئی اور گفتگو ہی نہ کی، رات اسی انتظار میں گزری کہ صبح کو پھر غوث پور جائیں گے

اب روزانہ کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ دونوں صبح کو غوث پور جاتے اور شام کو واپس آتے رضیہ کو بھی ایک لی تعلق سا ہو گیا تھا وہ ضرور ان سے ملتی اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ نظر التفات کس کی طرف زیادہ رکھے، اُس کی گفتگو سے بعض اوقات اُس کشمکش کا اظہار ہو جاتا تھا جو وہ ایسے موقع پر محسوس کرتی تھی، نثار کی خاموشی محبت اس کے دل میں جگہ کر رہی تھی مگر ساتھ ہی ہاشم کا عریاں اظہار محبت عورت کی کمزوری پر قابو پار ہا تھا۔ لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ پر یہی سمجھ رہے تھے کہ رضیہ کو مجھ سے زیادہ دلچسپی ہے۔ ہاشم، نثار کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا تھا کہ رضیہ کا رجحان اسی کی طرف ہے رفتہ رفتہ نثار کو خود محسوس ہونے لگا کہ رضیہ ہاشم کا زیادہ خیال رکھتی ہے اور نثار کی موجودگی کو اپنے اظہار الفت میں ایک رکاوٹ خیال کرتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہاشم کبھی نثار سے یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ تمہاری وجہ سے میری تمنائیں بر نہیں آتیں لیکن نثار اتنے دنوں ہاشم کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کی اندرونی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا، اُس نے رضیہ اور ہاشم دونوں کے چہرے پر اپنی موجودگی کی تکلیف کا احساس پڑھ لیا

ایک رات اُس نے سوچنا شروع کیا کہ ہاشم کو اُس پر کیوں ترجیح دی جا رہی ہے تھوڑی سی غور و فکر کے بعد اُس نے معلوم کر لیا کہ ہاشم اس سے زیادہ حسین ہے، اس کے چہرے پر شباب کی سُرخمی پورے آب و تاب سے موجود ہے، اگر حُسن ہی معیار محبت ہے تو پھر رضیہ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاسکتا کہ وہ ہاشم کے ہوتے ہوئے نثار کا دم بھرے اُس نے سوچا "مجھے کوئی حق اس بات کا حاصل نہیں ہے کہ میں رضیہ کے دلی جذبات کو ٹھیس لگاؤں میری وجہ سے دو محبت افروز دل ہمیشہ کے لئے دکھ جائیں گے۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ میں رضیہ کو خوش دیکھوں اگر وہ ہاشم ہی سے مل کر خوش ہے تو مجھے ہر حال میں دونوں کی مدد کرنا چاہئے، یہ تھوڑا سا ایثار دوستی اور محبت کی تاریخ میں سنہرے برفوں میں چلنے کا اگرچہ اسی جگہ میری ناکام آرزوئیں بھی غم میں حروف میں شعلوں کی طرح لودے رہی ہوں گی لیکن ہاشم کا جن دوستی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ میں رضیہ کو بھی خوش کر سکوں گا اگر رضیہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی تو بھی مجھے کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہئے کیونکہ محبت کی غیر فانی لذت درد ہر طرح میری شریک حال ہے۔ محبت کوئی کچا دھاگانہ نہیں ہے جو رضیہ سے جدا ہو جانے کے بعد ٹوٹ جائے گا بلکہ وہ تو ایک ریشمی ڈوبے جو کپھننے پر اپنے شکار کو اور زیادہ جکڑتی ہے۔ یہی بہتر ہے کہ ایک انسان دوسرے کے کالم آئے۔ محبت یہی سکھلاتی ہے، عشق کا اصل جوہر ہمدردی اور ایثار کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ میں رضیہ اور ہاشم کے کام آؤں گا"

جذبات کی فراوانی کے ساتھ ساتھ نثار کی آنکھوں سے آنسو پکنے لگے وہ اٹھ کر سیدھا ہاشم کے پاس پہنچا اور

اُس نے کھلے ہوئے الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کر دیا، نثار کی اس تبدیلی پر ہاشم گھبرا سا گیا اُس نے نثار کی گفتگو سے نہ جانے کیا نتیجہ نکالا اور کہنے لگا

”نہیں نثار میں تم سے جدا ہو کر نہیں رہ سکتا“ اور نثار سے لپٹ کر رو دیا ”ہاشم تم نہیں سمجھے“ نثار نے آنسو رمال سے صاف کرنے ہوئے کہا ”ہاشم میری اور تمہاری محبت میں فرق نہیں آسکتا میری اور رضیہ کی محبت اور بڑھ جائیگی، اس قدر پاک ہو گا وہ جذبہ جو بغیر رضیہ سے ملے ہوئے پیدا ہوتا رہے گا، میرے لئے یہ تمنا ہی بہت ہے کہ میں اُس سے محبت کرتا ہوں“

ہاشم نے کہا ”نثار خدا مجھے زیادہ نہ ترپاؤ کل تمہیں رضیہ سے ضرور ملنا ہو گا، کل ہماری تعطیل کا آخری روز ہے رضیہ نے قسم دے کے بلایا ہے“ ”اچھا میں ضرور رضیہ سے ملوں گا“ نثار یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ رات بھر اس کی طبیعت میں ایک مدوجز پیدا ہوتا رہا، وہ اُس کی زندگی کی نہایت صبر آزما گھڑیاں تھیں جب نثار تصور میں رضیہ کو اپنے آغوش میں دیکھتا تھا وہ بہتے ہوئے دریا کے تیز دھارے کا رخ موڑنا چاہتا تھا وہ بند باندھ رہا تھا لیکن بار بار رختے پیدا ہو جاتا کرتے تھے۔۔۔۔۔۔ بالآخر اُس نے اپنی خواہشات پر قابو پالیا اور ایشار کے حقیقی جذبہ سے معمور ہو کر اُس کی روح میں نشاط کی موج دوڑ گئی۔ رضیہ کی خیالی تصویر سے ہمکلام ہو کر سو گیا

دوسرے دن بہت سویرے ہی اُس نے اسباب سفر درست کیا اور لوکر کے ہمراہ اسٹیشن روانہ کر کے خود بھی گھر سے رخصت ہوا، اُس کا احساس اس قدر لطیف اور نازک ہو گیا تھا کہ آج پہلی دفعہ گھر سے چلتے وقت بھوٹ بھوٹ کر رویا، باہر آکر اُس نے کافذ کے ایک کمرے پر مختصر سا خط لکھا اور لفافہ میں بند کر کے اپنے چھوٹے بھائی کو دیا کہ اسے اب سے ایک گھنٹہ بعد ہاشم کو دیدینا۔ نثار کو اطمینان سا تھا، اُس کی روح میں سکون تھا، اس کا ضمیر اس کی پاک نفسی پر آفریں کر رہا تھا، گھر سے روانہ ہو کر وہ سیدھا غوث پور پہنچا۔ اتفاق وقت کہ رضیہ کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا وہ آئی اور اُس کے آتے ہی نثار نے کنا شروع کیا

”رضیہ! نثار اب ہمیشہ کے لئے تیرے جسمانی وجود سے رخصت ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن میری روح اُس وقت تک تیری روح سے ملتی رہے گی جب تک کہ یہ پیکر خاکی اُسے الگ نہیں کر دیتا اور اگر روح موت کے بعد بعد بھی مل سکتی ہے تو اُس وقت بھی اُس کی اُمیدوں کا مرکز تو ہی ہوگی۔۔۔۔۔۔ میں تجھ سے یہ بھی تمنا نہیں کرتا کہ تو کبھی مجھے یاد کرتی رہنا، لیکن جاتے وقت صرف ایک آرزو ہے اگر تو نے اُسے سن لیا تو ساری عمر میری ہستی کا ہر ذرہ تجھے دعائیں دیتا رہے گا“ (رضیہ گھبرائی ہوئی سن رہی تھی) ”ہاشم میرا سب سے بہتر دوست ہے اُس کی تکلیف مجھے تو یاد دیتی ہے۔ دیکھ اُس کو کوئی رنج نہ ہوئے۔۔۔۔۔۔ نثار تیرے قدموں پر سر رکھنے کو تیار ہے“ نثار نے اپنے گھنٹے زمین پر رکھ دیئے رضیہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی نثار اب بھی کہہ رہا تھا ”رضیہ یہ میری زندگی کا

جہنم

پہلا سین

ابلیس کی تفسیر

تورات کی روایت ہے کہ ابلیس اور اس کے ساتھیوں نے خداوند عالم کے خلاف بغاوت کی مگر ناکام رہا۔ خداوند عالم کی فوجوں نے باغیوں کو ہرا کر جہنم میں جھونک دیا۔ جہنم میں جملہ شیاطین پر غفلت اور غنودگی چھا گئی۔ سب سے پہلے ابلیس کو ہوش آیا، اور وہ کھڑا ہو گیا۔ بلند، بالا، سرقد، جوان، خوبصورت۔ چہرہ پردہ نور کہ چودھویں کا چاند شرمائے اور دیری کا یہ رنگ کہ اس کا تانی تلاش کرے تو نہ پائیں۔ کیلا، چھوڑا بدن، کٹیلا نقشہ، نشیلی آنکھیں۔ دہنے ہاتھ میں تلوار بائیں میں نیزہ، سر پر تاج، مدبر، فیلسوف، سپاہ سالار۔

وہ کھڑا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ سیاہ بھیانک آگ۔ آگ کی لپٹوں میں روشنی نہ تھی، اندھیرا تھا۔ ہر طرف مایوسی و محرومی و ناکامی و نامرادی کی شکلیں نظر آتی تھیں اور آگ کے سمندر میں شیاطین بوں تیر رہتے تھے جیسے آسمان پر تارے

وہ آگ کی موجوں کو چیرتا ہوا ایک قریبی ٹاپو کی طرف بڑھا۔ پہلے تو اپنے مضبوط بازوؤں سے بہتی ہوئی آگ پر تیرتا رہا۔ پھر فضا میں اڑنے لگا، جیسے فرشتے اڑا کر لے ہیں۔ اس کے پر چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی رقتا بجلی سے تیز تھی۔ وہ جہنمی ٹاپو کے آتش فشاں پہاڑ کی دہکتی ہوئی چوٹی پر کھڑے ہو کر اوپر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی تیز نظر آسمانوں کے پردوں کو چیرتی ہوئی۔ فردوس بریں کے باغ میں پہنچی۔ وہاں ہی عظیم الشان فتح کی خوشی میں ناچ رنگ کی مجلس گرم تھی اور حوروں کے گانے کی آواز آ رہی تھی

تری شان جل جلالہ - تری ذات عم نوالہ

ترا حسن لیس مثالہ - تو عظیم ہے تو قدیم ہے

یہ ترا ہی نور ہے سوسو - یہ ترا ہی روپ ہے درد برد

یہ ترا ہی رنگ ہے تو یہ ہو - تو غفور ہے تو رحیم ہے

تو خدا کے حسن و جمال ہے - تو الہ جل و جلال ہے
 تو کمال اوج کمال ہے - تو حکیم ہے تو کریم ہے
 ترا کلمہ پڑھتی ہیں طوطیاں - ترا نام لیتی ہیں بکلیاں
 ترا غلغلہ ہے جہاں تہاں - تو علیم ہے تو فہیم ہے

وہ زور سے چلایا: —

اے جنتو! — اے آسمانو! — اے فردوس کی خوشبو! — اے عرش کی عظمتو! — الفراق، الفراق!
 الوداع، الوداع — اور اے جہنمو! اے جہنموں کی لپستیو! اے جہنموں کی مصیبتو!، تکلیفو!، مرجا،
 مرجا، آؤ، اٹھو، اپنے نئے مہمانوں کا استقبال کرو۔ آنکھیں بچھاؤ، دل و جان قربان کرو۔ آج تمہارے یہاں
 وہ عظیم المرتبت ہستیاں تشریف لائی ہیں جنکا ہم پایہ وہم و تہ نہ کوئی آسمانوں میں ہے نہ جنتوں میں، نہ ارواح
 میں نہ ابدان میں، نہ لاموت میں، نہ ناسوت میں، نہ وجود میں نہ امکان میں

(اس کا دل دھڑکنے لگا، آواز زک گئی، لب بند ہو گئے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی انتہائی غفلت و مدہوشی دیکھ کر
 دم بخود رہ گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دیر تک خاموش کھڑا جا رہا اور طرف دیکھتا رہا۔ پھر یکایک زور زور سے
 بکارتے گا)

اے قدوسیو! معظم قدوسیو! محترم فرشتو! کرم شہزادو! اٹھو! کھڑے ہو جاؤ!
 اے آسمانوں کی پاک روحو! اے ملا اعلیٰ کے چمکیلے ستارو! اے عظمت کے پہاڑو! نور کے سمندر!
 روشنی کے ستونو! غفلت، سستی، بے ہوشی، بے ہوشی، بے حسی، آسمانوں کی غلام روحوں کے حوالہ
 کرو۔ اٹھو۔ کھڑے ہو جاؤ!

(معا تمام شیاطین کروڑوں پدموں کی تعداد میں جلتے ہوئے ٹاپو میں اس کے گرد گرد جمع ہو گئے اور سب کے
 بچوں پنج وہ خود کھڑا تھا، جیسے تاروں کے جھرمٹ میں جانے)

آہ! یہ کیسی غفلت ہم پر چھا گئی تھی! حیرت میں ہوں یہ کس چیز سے، ہمیں فافل کر دیا تھا! وہ پاک
 ہستیاں جو غلامی کی ملعون زنجیروں سے آزاد ہو چکی ہوں اور خود داری و آدادی کے جھنڈے ہاتھوں میں لئے ہوں،
 کیا غفلت و بے ہوشی کا شکار ہو سکتی ہیں! وہ نورانی پیکر جن کے زیریں کارنامے صفحہ ہستی پر ابد تک قائم
 رہنے والے ہوں کیا غلامی و بے بسی کی زندگی پر قناعت کر سکتے ہیں!

قسم ہے اس مقدس تلوار کی، اور اس متبرک نیزے کی، اور اس عظمت و جبروت کے تاج کی جو میرے
 سر پر چمک رہا ہے۔ کہ ہم غلام نہیں ہو سکتے۔ ملا اعلیٰ کی تمام ہولناک قوتیں سر ٹکرا کر اکر فنا ہو جائیں گی

مگر ہم میں کے ایک فرد کو بھی غلام نہیں بنا سکیں گی

(تالیاں بجیں)

مظلم قد و سیو! — یہ جہنم ہے اور تم جہنم میں ہو! — یہ آگ ہے اور تم آگ میں ہو! — مگر تم جہنم کے بادشاہ ہو، کرہ نار کے فرمانروا ہو، آزاد و خود مختار ہو۔ تم ننھی کھو پڑی دسلے جبریل اور چوڑے کالوں والے میکائیل نہیں ہو۔ وہ غلام بھیڑیں ہیں، تم آزاد شیر ہو، شیر نر، شیر برہو۔

کون ہے جو آزادی کا علم بردار نہیں ہے، کون ہے جو غلامی پسند کرتا ہے، اگر کوئی غلام بننا چاہتا ہے تو آگے بڑھے، میں اُسے غلاموں کی جنت میں ڈھکیں دوں کہ وہاں شوق سے عرش کے پتھروں پر اپنی پیشانی رگڑا کرے، گڑگڑایا کرے اور مرا کرے

(کوئی نہیں، کوئی نہیں کی آوازیں)

کیا یہ گڑگڑانا اور رونا اور معافی مانگنا اور عاجزی کرنا، ذلت کی انتہا اور رسوائی کی تحت الثریٰ نہیں ہو یہ کام ہم سے کبھی نہ ہوگا، کبھی نہ ہوگا

مظلم قد و سیو! — کیا یہ جہنم ہے؟ کیا یہ واقعی جہنم ہے؟ نہیں نہیں — یہ جہنم نہیں ہے۔ قسم ہے تمہارے عظمت و جلال کی یہ جہنم نہیں ہے۔ ہمارے لئے یہ جہنم نہیں ہے۔ غلام روحوں کے لئے جہنم ہے۔ سر جھکانے والی اور ماتھا ٹیکنے والی کٹ پیلوں کے لئے جہنم ہے

ہمارے لئے یہ جہنم جنت ہے اور جنت جہنم ہے۔ ہمارے لئے یہ آزاد جہنم ایک نہیں ستر ہزار جنتوں سے ستر ہزار درجے اعلیٰ و ادنیٰ، ارفع و افضل ہے

وَلَسَ لَا نُخَوِّدُ الْكِبْرَ دَرَجَاتٍ وَ الْكِبْرَ تَفْضِيلاً

جنت اور جہنم کا بنانا اور بگاڑنا تو ہمارے بائیں ماتھا کا کھیل ہے۔ ہم جب چاہیں جنت کو جہنم اور جہنم کو جنت بنا سکتے ہیں۔ دوستو! — یہ جنت اور جہنم کیا ہے؟ — ایک زاویہ نگاہ ہے۔ ایک طلقہ خیال ہے۔ ایک گوشہ تصور ہے اور بس

کوئی عظیم دیوتا ہمیں اس جہنم سے نکال نہیں سکتا۔ موت ہمیں چھو نہیں سکتی۔ ہماری ہستی لازوال ہے ہماری روح غیر فانی ہے۔ ہم ہمیشہ ہمیشہ زندہ اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ اس دیوتا سے لڑتے رہیں گے جو آزادوں کو غلام بناتا ہے اور غلاموں کو ذلیل کرتا ہے۔ کیا ہی مقدس ہیں وہ ہستیاں جو اُس کی بندگی سے آزاد، اور اس کی مٹاجی سے مستغنی ہیں!

(چاروں طرف سے ہمارا جہاں بادہ شور اٹھا کہ عرش پر بس کے قلعہ کی دیواریں بننے لگیں)

کرم فرشتو! — اس میں شک نہیں کہ ہمارے دشمن کی مادی طاقت ہم سے کسی قدر زیادہ ہے اور اسی وجہ سے اس نے تیر و تفتنگ کی لڑائی میں ہر اکہ جہنم میں ڈھکیں دیا ہے مگر کیا ہوا؟ — ہم نے کچھ ہتھیار نہیں لکھ دیے! اپنی ہار تسلیم نہیں کی! — ہم قیامت تک ہتھیار نہیں رکھیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ لڑتے رہیں گے۔ پہلے آسمانوں اور جنتوں کی بلندیوں پر لڑتے تھے۔ اب زمینوں اور جہنموں کی پستیوں میں لڑیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نیا محاذ جنگ ہمارے حق میں زیادہ مفید ہے

ہم اپنی قوت کا بھی امتحان کر چکے اور دشمن کی قوت کا بھی لہذا اب جو لڑائی ہوگی خواہ وہ تیر و تفتنگ کی لڑائی ہو یا فریب و دہل کی، میدان ہمارے ہاتھ رہے گا کیونکہ ہمارا تجربہ پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور ہماری قوت میں بال برابر بھی کمی نہیں ہوئی۔ ہم ہرگز ہرگز چین نہیں لیں گے جب تک عرش و فرش پر ہماری حکومت قائم نہ ہو جائے اور جب تک تمام سر جھکانے والی قوتوں کا قلع قمع نہ کر ڈالیں۔ یہ بات تو مسلم ہے کہ ہم غلامی نہیں کر سکتے کسی قسم کی غلامی نہیں کر سکتے اور اگر ہم یوں ہی خاموش پڑے رہیں تو یہ بھی ایک طرح سے اس عرش والے دیوتا کی خوشی ہوگی جس کے سامنے ہم نے اپنی گردنیں جھکا دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اور جس کی ہر آن مخالفت و مقابلت ہماری زندگی کا وحید مقصد ہے

دلیرو! — بہادرو! — بتاؤ، کیا کرنا چاہتے اور آسمانی قوتوں سے کیونکر لڑنا چاہتے؟
اے ہمت و شجاعت کے قافلہ سالارو! اے ملا اعلیٰ کے معزز شہزادو! اے قدوسیوں کے استادو!
ملاک کے آقاؤ! تمہاری ہمت پر مر جبا، تمہاری شجاعت پر آفریں۔ اور تمہاری دلیری پر عرش و فرش، سدرہ و کرسی، برزخ و جنت، آسمان و زمین اور ہر وہ چیز جو آسمانوں کے اوپر ہے۔ اور زمینوں کے نیچے ہے اور آسمانوں اور زمینوں کے درمیان ہے قربان کی جاسکتی ہے

قسم ہے تمہارے منبسط سینوں اور فولادی بازوؤں کی کہ تمہاری بے نظیر اور بے بدل اولوالعزمیوں کے آگے فردوس کے کنگورے اور عرش کی بڑیاں سرنگوں و شرمسار ہیں۔ مگر جلدی نہ کرو، یہ جلدی کا نخل نہیں غور و فکر کرو کہ کیا کرنا چاہئے؟ — علانیہ جنگ کرنی چاہئے یا خفیہ جنگ؟ — بازوؤں کی قوت کے جوہر دکھائے چاہئیں یا دماغی قوت کے؟

مجھے خبر ملی ہے کہ عرش والے دیوتائے نظام حکومت کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے ہیں اور وہ اپنے بیٹے مسیح کو ہمارے مقابلے میں بھیجنے والا ہے۔ مگر قسم ہے تمہاری تلواروں کے جوہر کی کہ ہم اس نئے نظام حکومت کے بھی بڑے اونچے اوڈالیں گے۔ اور مشرق سے مغرب تک کھلی بغاوت پھیلا دیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم غفلت نہ کریں۔ اور غور کریں کہ کیا کرنا چاہئے اور کیونکر کرنا چاہئے؟

ایک عظیم الشان کانفرنس ہو اور اس میں موجودہ مسائل کے ہر پہلو پر غور کیا جائے
 بعلز بول — ” ضرور ضرور، قدوسیو! چلو آؤ کانفرنس کے لئے خیمہ نصب کریں “
 (پردہ گر جاتا ہے)

(ملٹن کا ایک شاہکار)

محمد اسحاق (امرتسری)

مجموعہ استفسار و جواب تقریبات

باب الاستفسار نگار کی وہ خصوصیت ہے جو ہندوستان کے کسی اور رسالہ میں نہیں پائی جاتی۔ گزشتہ بارہ سال میں اتنے مختلف سوالوں کا جواب دیا گیا ہے کہ ان کا مجموعہ ایک اچھی خاصی انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے جس میں، ادبی، تاریخی، سیاسی، مذہبی و معاشرتی سیکڑوں قسم کی عجیب و غریب معلومات پائی جاتی ہیں۔ یہ مجموعہ طیارہ پورہ ہے اور تین چار ماہ میں شائع ہو جائے گا۔ ضخامت کے لحاظ سے اس کی قیمت پانچ روپیہ سے کم نہ ہوگی لیکن

آپ اس کو موہ محصول عمر میں حاصل کر سکتے ہیں

اور وہ اس طرح کہ آپ ۱۹۳۳ء میں نگار کی خریداری جاری رکھیں۔ جس وقت یہ مجموعہ شائع ہو جائے گا۔ نگار میں اعلان کر دیا جائے گا اور جن حضرات کے نام ۳۱ جنوری ۱۹۳۳ء کو نگار کے رجسٹر خریداری میں درج پاسے جائیں گے ان کو یہ نادر ذخیرہ صرف عمر میں بھیج دیا جائے گا

خریدار نئے ہوں یا پرانے سب اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں

نیچر نگار لکھنؤ

سوویت روس اور اتحاد

پہر چند گزشتہ پندرہ سال میں مطالعہ انگلستان نے بائشویک روس کی مذہب دشمنی کی طرف بہت توجہ مبذول کی ہے تاہم اخبار میں طبیعت کو ابھی تک اس بات کا صحیح اندازہ نہیں کہ وہاں مذہب اور کلیسا کے ساتھ کیا حقیقی واقعات پیش آرہے ہیں، اور تحریک ایجاد کو اس ملک میں کتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے

میں مارچ ۱۹۲۶ء میں روس گیا تھا اور فروری ۱۹۲۹ء تک وہاں مقیم رہا، میں روسی زبان سے واقف ہوں اور میں نے ان خلاف مذہب کتابوں، اخباروں اور رسالوں کا بغور مطالعہ کیا جنکی سویت روس میں نہایت کثرت اور آزادی کے ساتھ اشاعت ہو رہی ہے

روسی مجیدین کی کانگریس کا پہلا اجلاس اپریل ۱۹۲۵ء میں ماسکو میں منعقد ہوا تھا جس میں مجیدین کی ایک انجمن قائم کی گئی۔ اس سے قبل مجیدین کی متعدد جماعتیں ملک کے مختلف حصص میں نمودار ہو چکی تھیں لیکن اس وقت تک مذہب کے خلاف کسی باقاعدہ نظام کے ماتحت اعلان جنگ نہیں ہوا تھا۔ انجمن مجیدین کے دوسرے جلسہ میں ۱۰ جون ۱۹۲۹ء لغایت ۱۶ جون ۱۹۲۹ء تک رہا ۲۶ مختلف قوموں کے ۹۲۰ مندوبین شریک ہوئے۔ اس جلسہ میں یہ انجمن (لیگ آف ملٹینٹ اینتھسٹ) " رزمیہ انجمن مجیدین " بن گئی جس کے قواعد و ضوابط مرتب ہو گئے اور اتحادی خیالات کی اشاعت کے لئے ایک لاکھ عمل تیار کر لیا گیا۔ ان قواعد و ضوابط کی رو سے انجمن کی رکنیت کا ہر وہ سویت شہری مستحق ہو سکتا ہے جو مذہب کو خیر باد کہہ کر اس کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہو

برطانوی ریشلسٹ (عقلیت پرست) اور سیکولر سٹ (دنیا پرست) انجمنوں کے برعکس سویت " رزمیہ انجمن مجیدین " کو بڑی سرعت کے ساتھ ترقی حاصل ہوئی۔ اراکین انجمن کی تعداد کا ایک سرکاری نقشہ جو کئی سالوں پر مشتمل ہے ذیل میں درج کیا جاتا ہے

تعداد اراکین	سنہ	تعداد اراکین	سنہ
۲۰۰۰۰۰	۱۹۳۰	۸۶۰۳۳	۱۹۲۶
۳۵۰۰۰۰	۳۱	۱۳۸۴۰۲	۱۹۲۷
۵۰۰۰۰۰	۴۱	۲۶۵۴۹۸	۱۹۲۹
۵۵۰۰۰۰	۱۹۳۲		

۱۹۳۳ء کے متعلق صحیح اعداد دستیاب نہیں ہو سکے لیکن ان کا شمار ساٹھ لاکھ سے ضرور زیادہ ہوگا چونکہ زراہ کے زمانہ میں لمحدانہ خیالات کی اشاعت قانوناً ممنوع تھی اس لئے انقلاب سے پہلے منکرین خدا کی تحریرات سے عوام الناس قطعاً نااہل تھے لیکن بالنیو کون کے ہوسر اقتدار ہو جانے کے بعد فضا تبدیل ہو گئی اور غیر ملکی لمحدین کی مشہور ترین کتابوں کا روسی زبان میں ترجمہ ہو کر نہایت ارزاں قیمت پر شائع ہونے لگا اور خلافت مذہب تحریرات ملک کے اطراف و اکناف میں پھیل گئیں۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۰ء تک سترہ سو اتحادی کتب و رسائل شائع ہوئے جن کی جلدوں کی تعداد چار کروڑ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۲۶ء میں ۶۰۸ صفحات کی ایک نہایت ہی دیدہ زیب کتاب "*Anti-religious text book for workers*" کے نام سے تالیف ہوئی جس کے ۱۹۳۱ء تک چھ ایڈیشن طبع ہو گئے اور جن میں چھٹے ایڈیشن کے ایک لاکھ نسخے شائع ہوئے۔ اسی زمانہ میں ۳۸۴ صفحات کی ایک اور کتاب ("*Anti-religious book for peasants*") کے بھی چھ ایڈیشن طبع ہوئے اور آخری ایڈیشن کے دو لاکھ نسخے فروخت ہو گئے۔ اگر "ریشنلسٹ پریس ایوسیٹیشن" لندن کے پچھلے "سالانہ جلسہ" کے موقع پر پروفیسر ایڈوی "تھنکرس لائبریری" کی تیس مختلف کتابوں کی ایک لاکھ جلدوں کی فروخت کو شاندار کامیابی سے تعبیر کر سکتے ہیں تو محض دو اتحادی کتابوں کی تیس لاکھ جلدوں کی غیر ترقی یافتہ روسی جمہور کے درمیان فروخت کو کس قسم کی کامیابی سے تعبیر کیا جائے گا۔ ایک جدید عقلیت پرست مسٹر اچی بولڈر ابر "سن" نے اکتوبر ۱۹۳۲ء کے "لٹریری گائیڈ" میں صفحہ ۱۵۱ پر "یونین آف سوویت سوشلسٹ پیپلز" کی اس تمام تحریک اتحاد کو صحیح طور پر الفاظ ذیل میں ظاہر کیا ہے "ایسا غیر معمولی خلافت مذہب انقلاب دنیائے مسطظین اور تھیوڈورس کے زمانہ سے اب تک نہیں دیکھا"

"رزمیہ انجمن لمحدین" کا طریق کار کیا ہے؟ انجمن کی تنظیم کی بنیاد ایک ایسے مرکز پر قائم ہے جو کم از کم تین اراکین پر مشتمل ہے یہ مرکز اشاعتی دوائر، تقاریر، مناظرات، اور خلافت مذہب مظاہرات کا اہتمام کرتا ہے، اتحادی فلموں کی طیاری کا بندوبست کرتا ہے اور کتب اتحاد کی اشاعت کو ترقی دینے کی تدابیر عمل میں لاتا ہے۔ یہ مرکز اپنے دائرہ کے رضا کاروں کی جماعتوں سے خاص طور پر اور "سیاسی تعلیمی" اداروں سے عام طور پر قریبی تعلقات قائم رکھتا ہے۔ اراکین انجمن کے واسطے لازمی ہے کہ وہ قدیم روس کی غیر صلاحیت اور اضمحلال کے خلافت حیات جدید کے جدوجہد کے میدان میں صف اول میں اساتذہ ہوں، تمام جنگجو لمحدین اجتماعیت عمرانی کی خلوص دل سے تعمیر کریں، اور مخصوص فوجی خدمات، اشتراکیت، زراعت، اور رنج و حال میں پوری مستعدی سے حصہ لیں مذہب کے خلافت جنگ کرنے کے لئے سویت ماہرین طبیعیات و فلسفہ و حرفت کی خدمات حاصل کرنے کی خاص کوشش جادی ہے جس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو گئی ہے۔ اکثر ادارہائے طبیعیات میں انجمن کے اراکین کام

کر رہے ہیں اور ماہرین طبیعیات و فلسفہ و حرفت انجمن کی نگرانی میں درس دیتے ہیں، دیہات میں جاہل کاشتکاروں کے مذہبی تعصبات اور رسمیات کے خلاف ماہرین فن زراعت اطباء اور معلمین کے اثرات کو بطور طاقتور اسلحہ کے استعمال کیا جاتا ہے۔ سویت اتحاد کے طول و عرض میں (جو کہ زمین کا پلہ حصہ ہے) ترویج تعلیم اور اخراج مذہبیت کے لئے مطابع، سینما، مدارس، جامعات اور کتب خانے باقاعدہ استعمال کئے جا رہے ہیں۔ روسی تحریک اتحاد کی اس روز افزوں ترقی اور کامیابی کا برطانیہ کو خاص توجہ کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہئے۔ ایسے وقت میں جبکہ "ہٹلر" کی "براؤن شرٹ" افواج اعتدال پسند آدوخیالوں کو جنگلی جانوروں کی طرح سے اپنا شکار بنا رہی ہیں اور جبکہ فیسٹ اٹلی کا رومن کیتھولک فرقہ ڈیوس اور اس کی جماعت کی حمایت میں محفوظ ہے، سویت کی حفاظت میں رزمیہ اتحاد روز بروز طاقت پکڑتا جاتا ہے اور مذہبی اعتقادات کو دروں مردور پیشہ لوگوں کے سینہ سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو رہے ہیں

عبدالحمید

رسالہ جن کے گزشتہ پتے

بھابھارنی پر چہ ٹکٹ بھجکر طلب فرمائے۔ رسالہ جن اپنے موضوع

کے لحاظ سے ہندوستان میں پہلا پرچہ تھا جو اوڈیٹر نگار کی ادارت میں

دو سال تک نکلتا رہا

ان پرچوں میں جس قسم کے مضامین نکل چکے ہیں۔ وہ اب کبھی میٹ

نہیں آسکتے۔

نیچر نگار لکھنؤ

زندگی کا بوجھ

ایک دن میں سمندر کے ساحل پر پہنچی اور وہاں ایک بڑی چٹان کے سایہ میں بیٹھ گئی۔ میں وہاں بیٹھی ہی تھی کہ چٹان کو کہتے ہوئے سنا: —

”زندگی کا بوجھ بھی کیسا ناگوار بوجھ ہے! ایک فصل کے بعد دوسری فصل آتی ہے۔ ایک زمانہ کے بعد دوسرا زمانہ آتا ہے، وہی آسمان ہے، وہی زمین، وہی سورج کا کبکساں طلوع و غروب، وہی چاند کا ایک طرح گھٹنا بڑھنا، وہی ستاروں کی کارات کو چمکنا اور دن میں آنکھیں بند کر لینا

ہوا آتی ہے اور میری آنکھوں میں اپنی گرمی چھوڑ جاتی ہے، نسیم چلتی ہے اور میرے کانوں میں اپنی ٹھنڈی سانسیں بھر جاتی ہے۔ کمر منتشر ہونا ہے اور اپنے سیاہ کفن سے مجھے ڈھک لیتا ہے، بادل اٹھتا ہے اور مجھ پر برہم ہو کر برس پڑتا ہے — یہ چڑیاں چاروں طرف سے آتی ہیں اور میرے سر پر بیٹھ کر لڑتی ہیں جھگڑتی ہیں، جشن مناتی ہیں اور ہنگامہ برپا کرتی رہتی ہیں — یہ درخت اپنی جڑوں سے مجھے روز بروز جکڑتے جا رہے ہیں اور اپنے پتے گرا کر مجھے داغدار بناتے جاتے ہیں — میں تو اس زندگی سے باز آئی، اے سمندر مجھ پر رحم کر اور جلد مجھے نکل لے“

دفعۃً سمندر کی ایک موج بلند ہوئی اور چٹان کے اوپر سے گزر گئی

میں ایک دن سمندر گئی تاکہ اس سے اس کا موتی طلب کروں۔ میں اسی چٹان پر پہنچی اور وہاں سے اپنے آپ کو پانی کے اندر گرا نا چاہا۔ چٹان کے چاروں طرف کچھ تھقی، پیتوں کے ڈھیر تھے اور جب میں نے انھیں غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہیں ایک موتی بھی پڑا ہوا ہے۔ میں موتی اٹھا رہی تھی کہ چٹان بولی: —

”زندگی کا بوجھ بھی کیسا ناگوار بوجھ ہے۔ وہی کچرا، وہی سڑی ہوئی پتیاں، وہی پھلیاں، وہی مویں جو کل تھا وہی آج ہے، جو آج ہے وہی کل ہوگا۔ کاش میں اندھی ہوتی کہ بار بار ایک ہی چیز کو نہ دیکھ سکتی نہ سن سکتی، اے سمندر مجھے عذاب سے نجات دے اور آزادی سے سانس لینے دے“

میں نے دیکھا کہ موجیں ہٹ گئیں، پھلیاں چلی گئیں، آفتاب نے کچھ کو خشک کر دیا اور ہوا پتیاں اڑا لگی

میں پھر ایک دن سمندر کے ساحل پر گئی اور اس چٹان تک پہنچی۔ دیکھا کہ آبی چڑیاں اس پر بیٹھی ہوئی دھوپ لے رہی ہیں، درخت اس کے دوں جانب جھکے ہوئے اپنی شاخوں سے چاروں طرف پھول بکھیر رہے ہیں۔ میں پھول چھنے کے لئے جھکی تو چٹان نے کہا:۔

” زندگی کا بوجھ بھی کیسا ناگوار بوجھ ہے، میں اس یکسانیت سے تنگ آگئی۔ لے سمندر تو مجھے نکل لے“

چٹان کا یہ جملہ ختم نہ ہوا تھا کہ دفعۃً فضا میں چمک پیدا ہوئی اور بجلی نے اس کو ریزہ ریزہ کر کے تمام ذرات ہوا میں مادے

اب چٹان تو نظر نہ آتی تھی لیکن اس کی یہ آواز ضرور گونج رہی تھی کہ

” آؤ، یہ نیا وطن تو اور زیادہ تکلیف دہ ہے، یہ نئی زندگی تو کہیں زیادہ پریشان و منتشر ہے“

(میخائیل نعیمہ)

ادیٹر صاحب نگار کی رائے خضاب بلیک ڈائمنڈ کے متعلق

ادیٹر صاحب نگار فرماتے ہیں:۔

” اس میں شک نہیں کہ عام طور پر جو خضاب طیار ہوتے ہیں ان میں ڈایا مین کا جز شامل ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ دگر نہایت ہلکے قسم کا زہر ہے اور اسی لئے اب لوگوں میں اسکی مفرت کا احساس پیدا ہو چلا ہے۔ خضاب بلیک ڈائمنڈ کے مالک نے اپنا خضاب میرے سامنے طیار کر کے دکھایا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس میں واقعی کوئی مفرت رساں جز شامل نہیں ہے۔ تجربے سے اس کا رنگ بھی نہایت پختہ سیاہ ثابت ہوا اور جلد پر دھبہ بھی باقی نہیں رہتا“

کیا اس سے زیادہ کوئی اور ثبوت ہمارے خضاب کی عمدگی کا ہو سکتا ہے؟ قیمت فی شیشی عدہ علاوہ محصول تین شیشیاں طلب کرنے والوں کو محصول میں بہت کفایت ہو سکتی ہے۔

منیجر کارخانہ خضاب بلیک ڈائمنڈ لکھنؤ

باب الاستفسار

سیرۃ النبی اور دار المصنفین

(جناب سید عبدالجلیل صاحب - بریلی)

دار المصنفین اعظم گڑھ سے جو جلدیں سیرۃ النبی کی شائع ہوئی ہیں، ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا واقعی وہ ایسے اصول پر مرتب کی گئی ہے جو اس سے قبل اختیار نہیں کیا گیا اور کیا حقیقتاً وہ کوئی عظیم الشان اسلامی خدمت ہے ؟

(نگار) سیرۃ النبی کے کام کو مولانا شبلی مرحوم نے شروع کیا لیکن ان کی عمر نے وفات کی کہ وہ اسے انجام تک پہنچا سکتے ہر چند یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اگر یہ کتاب تمام وکمال انھیں کے قلم سے نکلتی تو اس کا رنگ بالکل مختلف ہوتا، لیکن جس وقت ہم پہلی دو جلدوں کو سامنے رکھ کر باقی دو جلدوں کو دیکھتے ہیں تو اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو وہ سید سلیمان ندوی کے اس کارنامہ کو کچھ زیادہ خوشی سے اپنے ساتھ منسوب کرنا پسند نہ کرتے جس حد تک محض سیرۃ کا تعلق ہے اس کے لئے تو صرف ایک ہی جلد کافی تھی، لیکن چونکہ دار المصنفین اس امداد کو جو سیرۃ النبی کے نام سے مل رہی ہے۔ ایک غیر معلوم وقت تک حاصل کرتے رہنا مناسب سمجھتا ہے اس لئے غیر ضروری طوالت سے کام لیا جا رہا ہے اور فرایض سیرۃ نگاری کو نظر انداز کر کے بعض مباحث کو اس قدر تطویل بیجا کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ یہ کتاب سیرۃ کی حدود سے گزر کر فقہ و کلام، تفسیر و حدیث اور خدا جاننے کن کن مباحث کا مجموعہ بنتی چلی جا رہی ہے

سید سلیمان ندوی کی ادارت میں دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک معجزہ کی بحث سے متعلق ہے اور دوسری اسلامی عقائد سے، لیکن اگر نظرات صاف سے دیکھا جائے تو ان میں کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو قول فیصل کا مرتبہ رکھتی ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ مولانا شبلی کا حقیقی مقصود اس تصنیف سے کیا تھا، یعنی وہ اس کتاب کو تمام دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے یا صرف مسلمانوں کے سامنے، لیکن سید سلیمان ندوی کی مرتب کی ہوئی جلدیں تو یقیناً صرف مسلمانوں ہی کے لئے ہیں اور ایک غیر مسلم کو مطمئن کرنے والی کوئی چیز ان میں نہیں پائی جاتی، بلکہ سچ پوچھنے تو اور سامان تضحیک فراہم کر دیا گیا ہے۔

حیرت ہے کہ معجزہ کی بحث پر سیکڑوں صفحے سیاہ کر دینے کے بعد بھی وہ کوئی منقول دلیل پیش نہ کر سکے اور سوائے ان لوگوں کے جو پہلے ہی سے معجزوں کے لئے قابل ہیں، کوئی اور شخص اس کتاب کو دیکھ کر کبھی معجزہ کا قائل نہیں ہو سکتا۔

معجزہ نام اگر عوارق عادات کا ہے تو سب سے پہلے یہ امر بحث طلب ہے کہ ایک نبی یا رسول کو جو صرف تعلیم اخلاق کے لئے مامور ہوتا ہے ایسا معجزہ پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے جو عالم طبیبات پر مؤثر ہو اور اس معجزہ سے وہ اخلاق انسانی کی اصلاح کیونکر کر سکتا ہے۔ ممکن ہے اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ معجزہ تو صرف ذریعہ ہے تصدیق نبوت و رسالت کا تاکہ معجزہ دیکھ کر لوگ نبی کی صداقت پر ایمان لے آئیں اور جب وہ ایک نبی کو نبی سمجھ لیں گے تو ظاہر ہے کہ اس کے ارشادات پر عمل بھی کریں گے۔ لیکن یہ جواب بالکل مہمل ہے۔ کیونکہ اس دلیل کے تسلیم کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ معجزہ کی حقیقت کو واضح کر دیا جائے اور معجزہ کی حقیقت میں ہم کو صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ عوارق عادات جو ایک نبی کی طرف سے ظاہر ہوں معجزہ کہلاتے ہیں۔ اس لئے نتیجہ اس تمام بحث کا یہ نکلے گا کہ معجزہ وہ ہے جو نبی سے صادر ہو اور نبی وہ جس سے معجزہ کا ظہور ہو، اور اس استدلال کی لغویت ظاہر ہے۔

اس کے بعد بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آیا کسی معجزہ کا ظاہر ہونا عقلاً ممکن ہے یا نہیں اور اسی کے ساتھ یہ کہ واقعی وہ ظاہر بھی ہوا یا نہیں۔ لیکن ہمارے یہاں کے علماء دین جن میں مولف سیرۃ النبی (سید سلیمان ندوی) بھی شامل ہیں ہمیشہ امکان وقوعی سے بحث کیا کرتے ہیں یعنی وہ صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ درانحالیکہ کسی امر کے وقوع کا محض امکان، وقوع تو نہیں۔ مثلاً کوئی شخص اگر مجھ سے یہ بیان کرے کہ فلاں شخص کے دونوں شانوں پر پتھر نکل آئے ہیں اور وہ فضائیں اڑنا پھرتا ہے۔ تو سب سے پہلے میں غور کروں گا کہ آیا ایسا ہونا عادتاً محال تو نہیں اور جب اس کی طرف سے مطمئن ہو جاؤں گا تو پھر اس کی جستجو کروں گا کہ فی الحقیقت ایسا ہے بھی یا نہیں، لیکن اگر اس خبر کا سننے والا میرے اس تذبذب

کو دیکھ کر صرف یہ دلیل لائے کہ کیا ایسا ہونا ممکن نہیں اور کیا فلاں فلاں شخص جن کی وساطت سے یہ خبر مجھ تک پہنچی ہے بھوٹ بول سکتے ہیں۔ تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے اس پر اطمینان ہو جائے گا۔ اور میں اسے مان لوں گا۔ غالباً نہیں سید سلیمان ندوی نے بھی معجزات نبوی کے متعلق پوری کتاب میں اسی نوع کے استدلال سے کام لیا ہے اور ساری کوششیں اس امر پر صرف کی ہے کہ ایسے پُر اسرار واقعات کا ظاہر ہونا ممکن ہے اور جب ممکن ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ رسول اللہ کی طرف سے ان کا ظہور نہ ہوا ہو۔۔۔۔۔ گویا اس سے بخت کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ واقعی وہ ظاہر بھی ہوئے یا نہیں

ظہور معجزات کی شہادت میں انہوں نے صرف روایات پر اعتماد کیا ہے، درنحالیکہ اصول درایت کی رُو سے تمام وہ راوی جنہوں نے احادیث معجزات روایت کی ہیں، پہلے ہی ساقط الاعتبار ہو جاتے ہیں الغرض سید سلیمان ندوی نے سوائے روایات و منقولات کے اور کوئی ذریعہ اثبات معجزہ کے لئے اختیار نہیں کیا اور اگر کسی جگہ عقل سے کام لینے کی زحمت گوارا فرمائی ہے تو وہ بھی اس شان سے کہ کہیں فلسفہ قدیم کے اصول کو سامنے رکھ کر امکان معجزہ کو ثابت کرنا چاہا ہے جو اس زمانہ میں تقویم پارینہ کی حیثیت رکھتا ہے، یا اگر اس سے ہٹ کر کہیں خود اُتارچ کی لی ہے تو اس طرح کہ فلاں مقام میں ایک مردہ شخص کی تصویر لی گئی تو تصویر میں چہرہ روحوں کے عکس بھی نظر آتے تھے اور اس کے ثبوت میں اخبار لیڈر کی شہادت پیش کر کے گویا ایسی برہان قاطع صرف کی ہے کہ سوائے سر بھکا دینے کے اب کوئی چارہ باقی ہی نہیں رہتا

پھر ظاہر ہے کہ جو شخص اخبار لیڈر کے نامہ نگار کے بیان پر اعتماد کر کے عقل سے کام لینا چھوڑ دے، وہ اگر کتب احادیث کی روایتوں پر اعتماد کر کے سرے سے وجود عقل ہی کا انکار کر دے تو جائے حیرت نہیں۔ افسوس ہے کہ سید سلیمان ندوی علوم مغربی سے بالکل بے بہرہ ہیں اور وہ مطلقاً نہیں سمجھ سکتے کہ معجزوں کے اثبات کے لئے کتنے حقائق مسلمہ کا انکار کرنا ضروری ہے اور موجودہ عہد میں جبکہ تمام علوم و فنون کی بنیاد صرف مشاہدات و حقایق پر قائم ہے، کوئی کیونکر معجزوں کا قائل ہو سکتا ہے

یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ رسول اللہ کے جسم کا سایہ نہ پڑتا تھا، یا سنگریزے آپ کے ہاتھ میں بولنے لگے، یا استن حنّانہ آپ کے فراق میں آٹھ آٹھ آنسو رونے لگا، یا یہ کہ آپ نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیے، اور ایک مسلمان کو صرف احادیث کے زور پر آپ ان باتوں کا یقین بھی دلا سکتے ہیں، لیکن ایک منکر و کافر، ایک محدود بیدین کے دل میں آپ کیونکر ایقانی کیفیت پیدا کر سکتے ہیں، جبکہ وہ سمجھتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک معجزہ پر ایمان لے آنا گویا نظام عالم کے درہم برہم ہو جانے کا قائل ہو جانا ہے۔۔۔۔۔ شعبہ بانظر ہندی کے ذریعے سے یہ سب کچھ مانا جا سکتا ہے لیکن حقیقت نفس الاخری کے لحاظ سے کوئی شخص اس کو تسلیم نہیں کر سکتا

اگر سید سلیمان ندوی صرف کلام مجید کو سامنے رکھ کر معجزات پر بحث کرتے تو یقیناً وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچتے کہ رسول اللہ نے کوئی معجزہ پیش نہیں کیا اور آپ نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں کوئی معجزہ نہیں لایا، لیکن تقلید و اسلاف پرستی کا مرض جس میں ہمارے علماء مبتلا ہیں کب قرآن شریف کی طرف متوجہ ہونے دیتا ہے اور قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی توفیق کبوں دینے لگا، الغرض میری رائے میں سیرۃ النبی کی تیسری جلد جس میں معجزات پر بحث کی گئی ہے ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ کسی غیر مسلم کے سامنے پیش کی جائے اور اگر اس کا مقصد صرف مسلمانوں ہی سے خطاب کرنا تھا تو تحصیل حاصل میں وقت ضائع کیا گیا، کیونکہ مسلمانوں کی ذہنیت پر یوں ہی موت طاری ہے، سید سلیمان ندوی کو اور دُرسے لگانے کی کیا ضرورت تھی جو تھی جلد جس میں عقائد اسلامی سے بحث کی گئی ہے، سیرۃ کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتی اور آئندہ جلدوں کو بھی ایسا ہی سمجھنا چاہئے کیونکہ ان میں بھی عبادات و معاملات وغیرہ سے بحث ہوگی جو سیرۃ نبوی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ یوں تو تعلیم اسلامی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا تعلق رسول اللہ سے نہ ہو، لیکن مباحث کی تفہیم کے لحاظ سے ان مسائل کو سیرۃ النبی سے بالکل علیحدہ رکھنے کی ضرورت تھی۔ میں نے جو تھی جلد کو ابھی تک بالاستیعاب نہیں دیکھا، لیکن سرسری مطالعہ بھی اس قدر سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ سید سلیمان ندوی آئیں بھی ”طوطی در پس آئینہ“ نظر آتے ہیں اور اسلام کو صرف علماء سلف اور متکلمین ہی کے نقطہ نظر سے پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں قرآن مجید میں غور و فکر نہ کرنے کی جو عادت مسلمانوں میں پیدا ہو گئی ہے وہ کتاب کی ہر ہر سطر سے ظاہر ہے اور اس میں سید سلیمان ندوی نے اس قدر غلو سے کام لیا ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں کو کھینچ کر علماء سلف کے اقوال کی تصدیق تو ان سے کرا دیتے ہیں لیکن ان کے اقوال کی صحت کا معیار قرآن پاک کو قرار نہیں دیتے۔ اس جلد میں بعض ایسے مسائل کو بھی عقائد اسلامی میں شامل کر لیا ہے جنکے بابت قرآن میں کوئی صراحت نہیں پائی جاتی مثلاً تقدیر، عالم برزخ، حشر بالاجساد یا جسمانی عذاب و ثواب کہ عام طور پر ان کو بھی عقائد مسلمہ اسلامی میں شامل کیا جاتا ہے، درنحالیکہ ان کا منکر دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو سکتا۔ یہ تو تھی میری نہایت ہی اجمالی رائے اس کتاب کے متعلق، لیکن میں اس اجمال کو بہت جلد پوری تفصیل کے ساتھ پیش کروں گا۔ اور بتاؤں گا کہ جس تالیف پر دارالمصنفین کو اس قدر ناز ہے اسکی حقیقت کیا اور کتنی ہے،

خاتون — ختنہ

(جناب محمد عبدالکریم خاں صاحب۔ پشاور)

مشہور بات ہے کہ عرب میں عورتوں کا بھی ختنہ کیا جاتا تھا۔ اس لئے غالباً لفظ ”خاتون“ بھی اسی سے مشتق ہے۔ کیا یہ صحیح ہے۔ اسی کے ساتھ اگر ممکن ہو تو اس رسم کے متعلق وضاحت کے ساتھ

